

محسن انسانیت



نعیم صدیقی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور

صلى الله عليه وسلم  
مُحْسِنِ انْسَانِيَّتٍ

نعيم صديقي

اسلامک پبلیشرز لمیٹڈ

۱۳-ای - شاہ عالم مارکٹ ، لاہور (پاکستان)

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

58638

طابع \_\_\_\_\_ اشفاق مرزا، مینجنگ ڈائرکٹر  
 ناشر \_\_\_\_\_ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ  
 ۱۳-ای، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور  
 مطبع \_\_\_\_\_ شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

۲۰۰۰	اکتوبر ۱۹۶۹ء	اشاعت: سوم
۱۰۰۰	جولائی ۱۹۶۲ء	چہارم
۱۰۰۰	جولائی ۱۹۶۴ء	پنجم
۱۰۰۰	فروری ۱۹۶۶ء	ششم
۲۰۰۰	جون ۱۹۶۸ء	ہفتم

۲۵ روپے

قیمت:-



— اُن حَتّاس جانوں

کے نام —

— جو —

••• ہر دور میں

••• باطل کی طوفانی لہروں سے

••• الجھنے کے لیے

••• اُبھر آتی ہیں



وَابْيَضَ يَتَشَقَّى الْغَمَّاءُ بِوَجْهِهِ  
تِيَالِ الْيَتَمَى عِصَّةً لِلْأَرَامِلِ

ابوطالب

○

وہ گورے مکھڑے والا  
جس کے روئے زیبا کے  
واسطے سے ابر رحمت کی  
دنائیں مانگی جاتی ہیں  
وہ۔ یتیموں کا سہارا  
وہ۔ بیواؤں اور مسکینوں  
کا سرپرست۔

○

وہ دانائے سُبُل، مولائے کُل ختم الرسل جس نے  
غبارِ راہ کو بخشنا فروغِ وادی سینا  
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر  
وہی قرآن وہی فرقاں، وہی لیسین وہی ظا

اقبال



## مُحَمَّد !

خدا کا فرستادہ !  
 اور وہ درفقاٹے مقصد، جو اس کے ساتھ ہیں،  
 (حق کی) مخالفت کرنے والوں کے مقابلے میں مضبوط ہیں،  
 اور آپس میں نرم خو !  
 تو انہیں (خدا کے حضور) رکوع و سجود کرتے ہوئے دیکھتا ہے،  
 یہ لوگ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کے جو یا ہیں،  
 ان کی پیشانیوں پر سجدوں کے نشان نمایاں ہیں،  
 ان کا یہی نقشہ تورات میں بھی پیش کیا گیا ہے اور ان کا یہی نقشہ انجیل میں بھی ہے۔

گویا کہ یہ ایک پروان پر ہستی ہوئی فصل ہے،  
 جس نے ایک کونپل نکالی،  
 پھرتنے کو مضبوط کیا،  
 پھر زور پکڑ گئی،

پھر اپنی نال پر سیدھی کھڑی ہو گئی،  
 یہ کاشتکاروں کو کیا ہی بھلی لگتی ہے  
 اور اس کی وجہ سے حق کا انکار کرنے  
 والوں کے جی (مارے حسد کے) جلے  
 جا رہے ہیں۔ (الفخ - آیت ۲۹)



رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا :

اللہ کی راہ میں مجھے ڈرانے دھمکانے کے لیے وہ  
کچھ کیا گیا کہ کسی دوسرے کے لیے نہیں کیا گیا۔

○

اللہ کی راہ میں مجھے اتنا دکھ دیا گیا ہے کہ کسی  
دوسرے کو نہیں دیا گیا۔

○

اور مجھ پر تیس دن رات (مسلل) ایسے گزرے  
ہیں کہ میرے اور بلال رضی اللہ عنہ کے لیے کوئی ایسا کھانا  
نہیں ہو سکا، جسے جاندار کھاتے ہوں۔۔۔۔۔  
بجز اس شے کے، جسے (چھوٹی سی پوٹلی بنا کر)  
بلالؓ اپنی بغل میں داب لیتے۔“

○

[روایت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ  
مشکوٰۃ جلد ۲ - کتاب الرقاق]

## فہرست ابواب

و پیغام - نصب العین اور تاریخی مقام

و شخصیت ایک نظر میں

و محسن انسانیت — مکی دور میں

و محسن انسانیت — مدنی دور میں

و واقعات سیرت پاک کی ترتیب زمانی

و اولیات و ہدایات





## ترتیب مضامین

۱۳	عرض ناشر
۱۴	چند الفاظ
۱۵	دیباچہ
۱۶	تقریظ

### ۱۔ (مقدمہ) پیغام، نصب العین اور تاریخی مقام

۲۱	نیا انسان	۲۱	نئی نوع انسان کا نجات دہندہ
۲۶	مُحسِن انسانیت کا عظیم اشارہ	۲۶	وقت، مقام اور انسانی مواد
۵۰	ہم کہاں کھڑے ہیں ؟	۲۹	انقلابی کلمہ حق
۵۳	مطالعہ سیرت کا نقطہ نظر	۳۲	اصلاح تمدن کے لیے حضور کا نصب العین
۶۲	بنام مغرب	۳۹	ایک دین، ایک تحریک
۶۲	یہ کتاب	۴۲	زندگی کی ہم آہنگی
		۴۴	انقلاب کی روح

### ۲۔ شخصیت ایک نظر میں (تعارف)

۸۱	خطابت	۸۲	ایک جملک
۱۰۳	عام سماجی رابطہ	۸۷	ایک جامع لفظی تصویر
۱۰۷	خالص نجی زندگی	۸۸	لباس
۱۱۱	اکل و شرب	۹۲	وضع قطع اور آرائش
۱۱۵	نشست و برخواست	۹۴	رفتار
۱۱۶	بشری حاجات	۹۴	تکلم

۱۱۸	تفریحات	۱۱۴	سفر
۱۲۰	چند متفرق ذوقیات	۱۱۴	بذبات
۱۲۱	اخلاق	۱۱۶	ذوق مزاج
۱۲۳	۳ — محسن انسانیت — مکی دور (مد و جزر)		
۱۲۴	فنون لطیفہ کا محاذ	۱۲۴	دہ نوجوان
۱۲۶	سود ابازی کی کوششیں	۱۲۸	قریش کے وجوہ مخالفت
۱۲۴	لشکر اپنے جوہن پر	۱۳۰	تاریک ماحول میں چند شرارے
۱۲۸	ہجرت حبشہ	۱۳۴	دعوت کا پہلا خفیہ دور
۱۸۳	عمر مفتوح ہو جاتے ہیں	۱۳۶	دعوت عام
۱۸۶	تحریک اسلامی کی نئی جست	۱۳۸	انتشار انگیزی
۱۸۸	اسلام حمزہؑ	۱۳۹	گنڈاپرہ پیکنڈا
۱۸۸	مقاطعہ اور نظر بندی	۱۴۶	کٹ جھنپیاں
۱۹۰	سال اندوہ	۱۴۹	دلائل
۱۹۶	طائف میں دعوت حق	۱۵۰	غندہ گردی
۱۹۶	نوید سحر	۱۵۲	حمایتیوں کو توڑنے کی کوششیں
۱۹۹	الوداع! اے مکہ!	۱۵۴	منظم منفی محاذ
		۱۶۱	اٹا اثر

۲۰۴	۴ — محسن انسانیت — مدنی دور — (تاریخ مؤثر مرقی ہے)		
۲۲۲	مدینہ — ہمہ تن انتظار	۲۰۹	مدینہ کی مختلف فضا
۲۲۴	تعمیری اقدامات	۲۱۱	تحریک اسلامی مدینہ میں
۲۲۴	اسلامی ریاست کی تالیس	۲۱۳	بیعت عقبہ اولیٰ
۲۲۸	نظام مواخات	۲۱۴	دولیدروں کا قبول اسلام
۲۲۸	پھر وہی کشمکش	۲۱۶	بیعت عقبہ ثانیہ
۲۲۹	یہود کا تاریخی مقام اور پارٹ	۲۱۷	مدینہ میں تحریک نیا مد و جزر
۲۳۲	کھچاؤ	۲۱۸	تحریک کا نیا مرکز

۲۸۷	اخلاقی نظام جماعت کی پیچیدگیاں	۲۴۰	مناظرانہ سوالات
۲۸۵	حضرت عائشہؓ کی آپ مینتی	۲۴۳	طوفان اُمڈ پڑا
۲۵۵	تبصرہ، تجزیہ اور تزکیہ	۲۴۹	بدتمیزیاں اور یہودگیاں
۳۰۳	قانون حرکت میں آتا ہے	۲۵۴	مضحکہ انگیز مطالبہ
۳۰۴	عدو شر سے برا نگینہ کہ خیر مادراں باشد	۲۵۶	یہود کا شایلا کی طرز عمل
۳۰۷	شر انگیزیاں	۲۶۵	یہود کا پیدا کردہ پانچواں کالم
۳۰۱	نظام انصاف میں رخنہ اندازی	۲۶۹	مفسدانہ پروپیگنڈے کا محاذ
۳۰۷	خانہ نبوت میں چنگاریاں	۲۷۰	ہوس منصب کا الزام
۳۱۵	قتل کی سازشیں	۲۷۱	مسلمہ مذہبی شعائر کی بے حرمتی کا الزام
۳۲۰	فتح خیمہ	۲۷۳	— دین کے پردے میں نفسانیت کا الزام
۳۲۹	ہزکت انگیز خدایاں	۲۷۹	ایک اور گندے بہتان کا طوفانِ عظیم
۳۳۸	قریش کی ذلیل انتقامی حرکات	۲۷۹	فتنہ آرائی کے لیے سازگار فضا

### ۳۵۳ — تلواروں کی چھاؤں میں —

۳۸۸	قریشی قافلہ تجارت جنگ کا دیباچہ	۳۵۵	اسلامی نظریہ جہاد
۳۸۵	معرکہ بدر کا نتیجہ	۳۵۸	قرآن کا فلسفہ جنگ
۳۹۱	دو قوتوں کا فرق	۳۶۳	تم نہیں یا ہم نہیں
۳۹۷	معرکہ بدر کے بعد	۳۶۴	مدینہ کی جنگی کارروائیوں کی نوعیت
۳۵۵	دوسرا بڑا معرکہ	۳۶۶	حضورؐ کی جنگی پالیسی
۳۷۱	معرکہ احد کے چند خاص	۳۷۰	ایک وسیع غلط فہمی
۳۷۰	احد کے بعد	۳۷۱	قریش کی جارحانہ ذہنیت
۳۷۵	تیسرا بڑا معرکہ خندق	۳۷۵	مدینہ کا دفاعی نظام
۳۷۱	غزوہ خندق کے اہم نکات	۳۷۶	حضورؐ کی دفاعی تدابیر
۳۷۶	معرکہ خندق سے فتح مکہ تک	۳۸۰	طلایہ گردی کا نظام اور اس کے مقاصد
۳۳۵	چوتھا بڑا معرکہ فتح مکہ	۳۸۳	دو واقعاتی محرکات
۳۳۷	چند اہم اشارات	۳۸۳	قریش کی سہ گانہ ضروریات

۴۵۷	دو غیر ملکی لڑائیاں	۴۵۰	فتح مکہ کی تکمیل
۴۶۱	تبصرہ	۴۵۵	فتح مکہ کے بعد
۴۶۳	— اور اُجالا پھیلتا ہی گیا —		
۵۳۵	تحریک اسلامی کا اجتماع عظیم	۴۶۵	دلیل کی قوت
۵۳۶	بیعت عقبہ	۴۶۸	خیر خواہانہ اپیل
۵۴۹	دستوری معاہدہ	۴۷۰	مشرکین مکہ سے خطاب
۵۷۱	متفرق قبائل سے معاہدات	۴۷۰	اہل کتاب سے خطاب
۵۷۹	معاہدہ حدیبیہ	۴۷۳	تنقید
۵۸۱	عمرۃ القضا	۴۸۰	مسلم کردار کی اخلاقی قوت
۵۸۹	محسن انسانیت کے بعد	۴۹۲	معاہداتہ روابط
۵۹۶	اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ	۴۹۴	جہاد کا اثر رائے عام پر
۵۹۸	کام ابھی باقی ہے	۴۹۶	حکومت خود معلم انقلاب تھی
۶۰۱	ضمیمہ واقعات سیرت پاک کی	۵۰۱	عوام کی معاشی فلاح
۶۰۱	ترتیب زمانی	۵۰۷	قائد ریاست کے وسیع تعلقات
۶۲۱	ضمیمہ اولیات و تقدیمات	۵۱۹	نسبی علائق
۶۳۲	ضمیمہ تحریک اسلامی کا عدوی نشوونما	۵۲۲	عوام خود آگے بڑھتے ہیں
۶۳۹	چند کتب حوالہ	۵۲۷	بین الاقوامی دعوت کا آغاز
		۵۳۰	ردِ عمل کی آخری لہر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## عرض ناشر

سیرۃ نبویؐ پر اب تک بے شمار کتب شائع ہو چکی ہیں۔ کچھ مفصل ہیں اور کچھ مختصر۔  
 نعیم صدیقی صاحب کی یہ تالیف "محسن انسانیت" ان میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔  
 اس کی مقبولیت کا اندازہ لگانے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ ایک قلیل عرصہ میں اس  
 ضخیم کتاب کے اڈیشن نکل چکے ہیں۔ طباعت و اشاعت کے اخراجات میں ہوشربا  
 اضافہ کے باوجود اب ہم اس کو آفسٹ کی حسین کتابت و طباعت پر اپنے راہی میار  
 کے مطابق شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ قارئین اس کو اس نئے جامہ میں پسند  
 فرمائیں گے اور سب سابق ہمیں ان کا قیمتی تعاون حاصل ہے گا۔

نیارمنڈ  
 اشفاق مرزا اینجنگ ڈاکٹر  
 اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

لاہور ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ  
 مطابق ۲۸ جون ۱۹۶۹ء

# چند الفاظ

## از مؤلف سے

اسلام کا تحریکی شعور برابر اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان —  
 مُحَمَّدٌ صَلَّی اللہ علیہ وسلم — کی زندگی کا مطالعہ نئے انداز سے کیا جائے۔ ایک ایسا انداز جو سرور عالم  
 صَلَّی اللہ علیہ وسلم اور آج کے انسان کے درمیان حامل ہونے والے مختلف پردوں کو اٹھا دے۔ وہ مقدس  
 زندگی مجرد ایک فرد کی سوانح نہیں ہے۔ بلکہ وہ عظیم ترین تہذیبی تحریک کی آئینہ دار ہے۔ اسی کے واسطے  
 سے ہم قرآن کا ترجمہ عمل کی زبان میں پڑھ سکتے ہیں اور اسی کی روشنی میں ہم اجتماعی انقلاب کی کٹھن راہوں  
 کو طے کر سکتے ہیں۔ جن پر سے ہو کر انسانیت اسلامی نظام کی جنت تک پہنچ سکتی ہے۔

یہ ضرورت تو اپنے ہم مسلک بزرگوں اور رفیقوں کی طرح ہمیشہ میرے سامنے رہی، لیکن اپنے  
 متعلق یہ گمان بھی نہ گزرا تھا کہ میں اس میدان میں اپنی کوتاہی علم و عمل کے ساتھ کوئی مفید خدمت بھی سرانجام  
 دے سکوں گا۔ یہ جو کچھ میں تیار کر کے پیش کر سکا ہوں یہ محض توفیقِ الہی کا ظہور ہے۔ اس وقت سیرت پاک  
 پر کام کرنے کا ایک مستقل نقشہ میرے ذہن میں ہے۔ مجوزہ نقشہ پر کام ہو سکے گا یا نہیں، کتنا ہو سکے گا اور  
 کب تک ہو سکے گا، یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کا صحیح جواب مشیتِ الہی ہی کے پاس ہے۔

اس کتاب کے مطالعہ سے حضور کی پوری حیاتِ طیبہ پر ایک اجمالی نظر ہو جاتی ہے اور حالات  
 اور واقعات اس ترتیب سے سامنے آتے ہیں کہ آدمی خود اس دور میں شریک ہو جاتا ہے، اور اپنے آپ  
 کو حق و باطل کی کشاکش میں حصہ دار محسوس کرتا ہے۔ پھر ان فضاؤں سے لوٹتا ہے تو ایمان و کردار کی نئی روح  
 اپنے ساتھ لاتا ہے۔

خدا اس کوشش کو قبول فرمائے اور اسے مسلمانوں اور تمام انسانوں کے لیے ذریعہ خیر و برکت بنائے۔

نعیم صدیقی

لاہور، یکم جنوری ۱۹۶۰ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## دیباچہ

اسلام کی نعمت ہر زمانے میں انسان کو دو ہی ذرائع سے پہنچی ہے۔ ایک اللہ کا کلام۔ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی شخصیتیں جن کو اللہ نے نہ صرف اپنے کلام کی تبلیغ و تعلیم اور تقسیم کا واسطہ بنایا، بلکہ اس کے ساتھ عملی قیادت و رہنمائی کے منصب پر بھی مامور کیا تاکہ وہ کلام اللہ کا ٹھیک ٹھیک منشاء پورا کرنے کے لیے انسانی افراد اور معاشرے کا تزکیہ کریں اور انسانی زندگی کے بگڑے ہوئے نظام کو سنوار کر اس کی تعمیر صالح کر دکھائیں۔

یہ دونوں چیزیں ہمیشہ سے ایسی لازم و ملزوم رہی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کسی سے الگ کر کے نہ انسان کو کبھی دین کا صحیح فہم نصیب ہو سکا، اور نہ وہ ہدایت سے بہرہ یاب ہو سکا۔ کتاب کو نبی سے الگ کر دیجیے تو وہ ایک کشتی ہے۔ ناخدا کے بغیر، جسے بیکر انٹری مسافر زندگی کے سمندر میں خواہ کتنے ہی بھٹکتے پھریں۔ منزل مقصود پر کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ اور نبی کو کتاب سے الگ کر دیجیے، تو خدا کا راستہ پانے کی بجائے آدمی ناخدا ہی کو خدا بنا بیٹھنے سے کبھی نہیں بچ سکتا۔ یہ دونوں ہی نتیجے پھیلی قومیں دیکھ چکی ہیں۔ ہندوؤں نے اپنے انبیاء کی سیرتوں کو گم کیا۔ اور صرف کتاب میں سے کر بیٹھ گئے۔ انجام یہ ہوا کہ کتابیں ان کے لیے لفظی گورکھ دھندوں سے بڑھ کر کچھ نہ رہیں۔ حتیٰ کہ آخر میں خود انہیں بھی وہ گم کر بیٹھے۔ عیسائیوں نے کتاب کو نظر انداز کر کے نبی کا دامن پکڑا۔ اور اس کی شخصیت کے گرد گھومنا شروع کیا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی چیز انہیں نبی اللہ کو ابن اللہ بلکہ عین اللہ بنا کے سے باز نہ رکھ سکی۔

پہلے ادوار کی طرح اب اس نئے دور میں بھی انسان کو نعمت اسلام میسر آنے کے وہی دو ذرائع ہیں جو ازل سے چلے آ رہے ہیں، ایک خدا کا کلام جو اب صرف قرآن پاک کی صورت ہی میں مل سکتا ہے دوسرے اسوۂ نبوت جو اب صرف محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک ہی میں محفوظ ہے۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی اسلام کا صحیح فہم انسان کو اگر حاصل ہو سکتا ہے تو اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ قرآن کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن سے سمجھے۔ ان



دونوں کو ایک دوسرے کی مدد سے جس نے سمجھ لیا۔ اس نے اسلام کو سمجھا۔ ورنہ فہم دین سے بھی محروم رہا اور نتیجتاً ہدایت سے بھی۔

پھر قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں چونکہ ایک مشن رکھتے ہیں ایک مقصد و مدعا کو لیے ہوئے آئے ہیں اس لیے ان کو سمجھنے کا انحصار اس پر ہے کہ ہم ان کے مشن اور مقصد و مدعا کو کس حد تک سمجھتے ہیں اس چیز کو نظر انداز کر کے دیکھیے تو قرآن عبارتوں کا ایک ذخیرہ اور سیرت پاک واقعات و حوادث کا ایک مجموعہ ہے، آپ لغت اور روایات اور علمی تحقیق و کاوش کی مدد سے تفسیروں کے انبار لگا سکتے ہیں اور تاریخی تحقیق کا کمال دکھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور آپ کے عہد کے متعلق صحیح ترین اور وسیع ترین معلومات کے ڈھیر لگا سکتے ہیں، مگر روح دین تک نہیں پہنچ سکتے، کیونکہ وہ عبارات اور واقعات سے نہیں بلکہ اس مقصد سے وابستہ ہے جس کے لیے قرآن اتارا گیا اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی علم برداری کے لیے کھڑا کیا گیا۔ اصل مقصد کا تصور جتنا صحیح ہوگا، اتنا ہی قرآن اور سیرت کا فہم صحیح، اور جتنا وہ ناقص ہوگا، اتنا ہی ان دونوں کا فہم ناقص رہے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن اور سیرت محمدی علی صاحبہما الصلوٰۃ والسلام دونوں ہی بحرِ ناپیدا کنار ہیں۔ کوئی انسان یہ چاہے کہ ان کے تمام معانی اور فوائد و برکات کا احاطہ کرے تو اس میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ البتہ جس چیز کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ وہ بس یہ ہے کہ جس حد تک ممکن ہو آدمی ان کا زیادہ سے زیادہ صحیح فہم حاصل کرے اور ان کی مدد سے روح دین تک رسائی پائے۔

ان سطور سے میرا مقصد نعیم صدیقی صاحب کی کتاب پر کوئی تقریظ یا تنقید لکھنا نہیں ہے۔ وہ جتنی اور جیسی داد کی مستحق ہے، انشاء اللہ ناظرین خود دیں گے اور اس کے عیب و صواب سے بھی علم و بصیرت والے ناواقف نہ رہیں گے۔ میرے پیش نظر صرف یہ ہے کہ نعیم صاحب نے ایک طویل مدت اور محنت شاقہ برداشت کر کے سیرت پاک کے چشمہ صافی سے خلقِ خدا کو سیراب کرنے کی جو کوشش کی ہے اس میں کچھ تھوڑا سا حصہ لے کر میں بھی کسی حد تک سعادت کا مستحق بن سکوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی کتاب پڑھنے سے پہلے ہر ناظر اچھی طرح سمجھ لے کہ سیرت پاک کا مطالعہ اس کو کس مقصد کے لیے اور کس نقطہ نظر سے کرنا چاہیے۔ اس کے بعد مجھے امید ہے کہ نعیم صاحب کی محنت سے لوگ زیادہ بہتر طریقہ سے مستفید ہو سکیں گے۔

ابوالاعلیٰ

لاہور  
۱۸ مئی ۱۹۶۰ء

## تقریظ

—: ناصر القادری :—

مرحمتِ رسولؐ میں نارسا شاعری کا یہ مصرعہ :

سہ بعد از خدا بزرگ توئی قصۂ مخضر

ضرب المثل بن چکا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نعمت و منقبت کا عنوان اور مرحمتِ رسولؐ کا مضمون اختصار و اجمال نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ شرح و اطناب کا تقاضا کرتا ہے۔ اس مبارک ذکر کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کے بعد بھی دل کی سیری نہیں ہوتی، اور جی یہی چاہتا ہے کہ یہ مقدس داستان دراز تر ہوتی چلی جائے۔

زبان و قلم کی سب سے بڑی سعادت یہی ہے کہ یہ سیرتِ نبویؐ کے اعدان و اظہار کا ذریعہ قرار پائیں اور سالہا سال کی زمزمہ خوانی اور ہزاروں صفحوں کی کتابت و املا کے بعد بھی وجہ و ضمیر اس مجرور و مانگ کا اعتراف کریں کہ :

ما ہمچناں در اول وصف تو مانده ایم

غالب نے روح القدس کی تائید کے بعد ہی اتنا سچا شعر کہا ہے :

غائب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم

کائنات پاک مرتبہ دان محمد است

کس کی مجال ہے جو خلاصہ کائنات، فخر موجودات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کی رحمت سرائی اور

سیرت نگاری کا حق ادا کر سکے، یہ غلط دعویٰ نہ کسی زبان سے نکل کر فضا میں پھیلا اور نہ کسی قلم نے اُسے صفحہ قرطاس پر ثبت کیا۔ اس بارگاہِ قدس میں جس نے بھی لب کشائی کی تو اس کا مقصود حصولِ سعادت کا ہوا اور کچھ نہ تھا۔

سیرت ابن اسحق کے شارح عبدالرحمن سہیلی (وفات ۱۸۵۷ء) کی ”روض الائف“ ہو یا حافظ عبدالحمید المومنی (وفات ۱۸۶۷ء) کی ”سیرت ومیاطی“ گازرونی (۱۸۹۲ء) اور مغلطائی کی سیرت پر کتابیں ہوں یا حافظ ابن الجوزی کی ”شرف المصطفیٰ“ سیرت ابن البر ہو یا ابن سید الناس کی ”عیون الاثر“ قسطلانی کی مواہب لدینہ اور اس کی شرح ”ذرقانی علی المواہب“ ہو یا سیرت حلبی! شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی سیرت پر تالیفات ہوں یا قاضی سلیمان منصور پوری کی ”رحمۃ للعالمین“ ان تمام سیرت نگاروں کی کوششیں مستحقِ تبریک اور لائقِ تحسین ہیں۔ ان بزرگوں نے تاریخ و سیرت کا عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔ مگر یہ کسی نے نہیں کہا کہ سیرت نگاری کا ہم نے حق ادا کر دیا۔ یا ہماری کتاب سیرت کے موضوع پر ”حرفِ آخر“ کی حیثیت رکھتی ہے۔

سیرت کی تمام کتابیں ثقاہت و صحت کے اعتبار سے ایک جیسی نہیں ہیں، کسی سیرت نگار نے تو چھان پھٹک کے بغیر ہی رطب و یابس کو اکٹھا کر دیا ہے یہاں تک کہ موضوع روایتوں کو نقل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا، اسی قسم کی غلط روایتوں کو عوامِ مسلمانوں میں قبول حاصل ہوا اور میلاد کی محفلوں میں عام طور پر مسلمان اپنی ”موضوعات“ کو سن سن کر جھومتے ہیں۔

اُردو زبان و ادب کے مشہور اہل قلم جناب نعیم صدیقی نے بھی سیرت کے موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بارگاہِ رسالت میں اپنی بساط کے مطابق نذرِ عقیدت پیش کر کے دین و دنیا کی سعادت حاصل کی ہے! یہ بہت بڑا شرف ہے جس کی توفیق اللہ تعالیٰ کے فضل سے انہیں نصیب ہوئی ہے۔ ایک ایسا ”شرف“ جس پر رشک کیا جاسکتا ہے! اس شرف میں زورِ بازو سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و عطا کا ہاتھ ہے!

اس دنیا میں مسلمان ادیبوں اور شاعروں کی کمی نہیں ہے مگر ان میں بہت کم ایسے نکلیں گے جن کے زبان و قلم اسلام کی ترجمانی کے لیے وقف ہو کر رہ گئے ہیں۔ نعیم صدیقی چاہتے تو اپنے قلم سے فلمی کہانیاں اور دہائی افسانے لکھ کر، بہت کچھ شہرت اور دوست حاصل کر سکتے تھے، مگر ان کے قلم کو بدوشعور اور آغازِ تصنیف و تالیف ہی سے طہارت میسر آئی ہے اور وہ ان اُلوہِ گیوں سے دُور رہے ہیں، جن پر بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی شہرت کے محلِ قائم ہیں! نعیم صدیقی نے سستی شہرت اور ناجائز و مشتبہ دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا! انہوں نے حق کی خاطر قید و بند کی سختیاں بھی اٹھائی ہیں اور معاش کی تنگی سے بھی ان کا سابقہ پڑا ہے، ان کا ”آزمائشوں“ نے ان کی زندگی میں نکھار، ان کی زبان

میں تاثیر اور ان کی تحریر میں سوز پیدا کر دیا ہے۔

”محسن انسانیت میں نعیم مدلیقی کے قلم کی طہارت، فکر کی پاکیزگی، دل کا سوز اور دینی شغف پوری طاقت کے ساتھ ابتر ہوا دکھائی دیتا ہے، ایک ایک سطر محبت رسول کی خوشبو میں بسی ہوئی اور ایک ایک ورق پر عقیدت کے نعل و گٹر جگمگ کرتے ہوئے! ظاہر ہے کہ کوئی سیرت نگار واقعات میں تو اپنی طرف سے اضافہ کر نہیں سکتا، جہاں تک واقعات کے قلم بند کرنے کا تعلق ہے ہر سیرت نگار کی حیثیت مصنف Author کی نہیں۔ مؤلف (Compiler) کی ہوتی ہے! سیرت نگار کی شخصیت کے جوہر واقعات کے انتخاب و ترتیب اور ان کو خاص اسلوب کے ساتھ پیش کرنے میں کھلتے ہیں! اس اعتبار سے یہ کتاب نعیم صدیقی کے ادب و انشاء اسلوب نگارش، انداز فکر، دینی رجحان، مورخانہ بصیرت اور ذوق انتخاب کا نہایت حسین تعارف ہے!

سیرت نگاری کا وہ ذوق اور عقیدت کا وہ جوش کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ”ما فوق الانسان“ کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ جہاں سارا کام خرق عادت اور معجزوں کے زور سے چلتا ہو، اور زندگی کا یہ رنگ دیکھ کر آدمی اطاعت کی ہمت نہ کر سکے۔

## مگر

نعیم مدلیقی عقیدت کے اس غلو کی خرابیوں پر نگاہ رکھتے ہیں اس لیے انہوں نے سیرت مقدسہ کے واقعات کے انتخاب میں بڑی دیدہ ریزی اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اپنے امکان بھر پوری کوشش کی ہے کہ سچے موتیوں کے ساتھ خرف ریزے نہ آنے پائیں جو واقعہ بھی ان کی کتاب میں درج ہو وہ درایت و روایت کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہو۔ اور اس ”انسانِ کامل“ کی پاک سیرت کے خط و خال پڑھنے والوں کے سامنے آئیں۔ جس کی اتباع و اطاعت ”کشف و کرامت“ کے بغیر کی جاسکتی ہے، اور جس کی مقدس زندگی دہشت ناک نہیں بلکہ دلکش و محبوب ہے!

نعیم صدیقی معجزات کے خدا نخواستہ منکر نہیں ہیں مگر وہ اس حقیقت کو پاگتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ”خرق عادات“ کے لیے نہیں، بلکہ انسانی عادات کو مربوط اور متوازن بنانے کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے، جس کا بہترین اور کامل ترین نمونہ خود حضور کی زندگی تھی!

”محسن انسانیت“ لالہ و گل کی طرح رنگین، آبشاروں کی مانند مہترم اور کشاں کی طرح روشن اور تابناک ہے اس کی زبان میں بڑی سلاست و روانی پائی جاتی ہے اور اسلوب نگارش بہت دلکش اور بعض مقامات پر تو وجد آفرین ہے!

اُردو زبان ہی نہیں بلکہ دوسری زبانوں میں بھی جن اہل نظر اور ادب علم کی نگاہ سے سیرت پر کتابیں گزری ہیں۔ وہ محسن انسانیتؐ کو پڑھ کر اس کی انفرادیت کو ضرور محسوس کریں گے۔ غیب کا حال تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا، مگر میرا وجدان پیش گوئی کر رہا ہے کہ اس کتاب کو انشاء اللہ قبولِ عام حاصل ہوگا۔

جناب نعیم مدنی نے کاغذ پر جو نقوش بنائے ہیں، وہ انشاء اللہ دلوں پر منتقل ہوتے رہیں گے اور اس طرح ان کا نام اور کام باقی رہے گا!

کراچی

۵ اکتوبر ۱۹۵۹ء

ماہر القادری

## مقدمہ

### پیغام، نصب العین اور تاریخی مقام

پیشتر اس کے کہ ہم حضور کی سیرت کا مطالعہ کرنے چلیں، ہمارے سامنے اس کام کا کوئی واضح تصور ہونا چاہیے جسے سرانجام دینے کے لیے محض انسانیت تاریخ کی جنگاہ میں نمودار ہوتے ہیں اور عمر بھر ایک فیصلہ کن معرکہ سر کرنے میں گزار دیتے ہیں۔ حضور کی زندگی ایک بین الانسانی مشن کی داستان ہے۔ وہ قرآن کے ابدی اصول کی تفسیر ہے جسے عمل کی زبان میں مرتب کیا گیا ہے۔ وہ اس مقدس پیغام کی تکمیل ہے جس کی مشعل آدم، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور مجملہ انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے دور میں روشن کرتے رہے ہیں۔

ہم سیرت پاک کو مربوط نہیں کر سکتے، واقعات کی توجیہ نہیں کر سکتے، مطالعہ سیرت کا مقصد متعین نہیں کر سکتے اور اس سے جو کچھ ہمیں اخذ کرنا ہے وہ کچھ اخذ نہیں کر سکتے، تا وقتیکہ ہم حضور کے کام کی نوعیت، اس کے اقبازی پہلوؤں اور اس کے دائرہ کی وسعتوں کو پیش نظر نہ رکھ لیں۔

### بنی نوع، انسان کا نجات دہندہ :

تاریخ کے وسیع دائروں پر نظر ڈالیں، تو اس میں ہمیں طرح طرح کے مصلحین دکھائی دیتے ہیں۔ شیریں مقال واعظ اور آتش بیان خطیب سامنے آتے ہیں، بہت سے فلسفہ طراز ہر دور میں ملتے ہیں، بادشاہوں اور حکمرانوں کے انبؤہ ہمیشہ موجود رہے ہیں جنہوں نے عظیم الشان سلطنتیں قائم کیں، جنگجو فاتحین کی داستانیں ہم پڑھتے ہیں، جماعتیں بنانے اور تمدن میں مدد جرز پیدا کرنے والوں سے ہم تعارف حاصل کرتے ہیں۔ انقلابی طاقتیں لگا ہوں میں آتی ہیں جنہوں نے نقشہ حیات کو بار بار زیروزبر کیا ہے۔ رنگا رنگ مذاہب کی نیو ڈالنے والے بکثرت سامنے آتے ہیں۔ اخلاقی خوبیوں کے داعی بھی ایٹھج پر آتے ہیں۔

ہیں۔ کتنے ہی مقنن ایوان تہذیب میں جلوہ گرہ چکے ہیں۔ لیکن جب ہم ان کی تعلیمات ان کے کارناموں اور ان کے پیدا کردہ مجموعی نتائج کو دیکھتے ہیں تو اگر کہیں خیر و فلاح دکھائی دیتی ہے تو وہ جزئی قسم کی ہے۔ اس کے اثرات زندگی کے کسی ایک گوشے پر اُبھرتے ہیں۔ پھر خیر و فلاح کے ساتھ طرح طرح کے مفاسد ترکیب پائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انبیاء کے ماسوا کوئی عنصر تاریخ میں ایسا نہیں دکھائی دیتا جو انسان کو — پورے کے پورے انسان کو — اجتماعی انسان کو — اندر سے بدل سکا ہو حضورؐ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ آپؐ کی دعوت نے پورے کے پورے اجتماعی انسان کو اندر سے بدل دیا اور صبغۃ اللہ کا ایک ہی رنگ مسجد سے لے کر بازار تک، مدرسہ سے عدالت تک اور گھروں سے لے کر میدانِ جذب تک چھا گیا۔ ذہن بدل گئے۔ خیالات کی رو بدل گئی۔ نگاہ کا زاویہ بدل گیا، عادات و اطوار بدل گئے، رسوم و رواج بدل گئے۔ حقوق و فرائض کی تقسیمیں بدل گئیں، خیر و شر کے معیارات اور حلال و حرام کے پیمانے بدل گئے۔ اخلاقی قدریں بدل گئیں دستور اور قانون بدل گیا، جنگ و صلح کے اسالیب بدل گئے، معیشت اور ازدواج کے اطوار بدل گئے اور تمدن کے ایک ایک ادارے اور ایک ایک شعبے کی کاپیا پٹ گئی۔ اس پوری کی پوری تبدیلی میں جس کا دائرہ ہمہ گیر تھا، ایک سرے سے دوسرے سرے تک خیر و فلاح کے علاوہ کچھ نہیں ملتا۔ کسی گوشے میں شر نہیں کسی کوٹے میں فساد نہیں، کسی جانب بگاڑ نہیں۔ ہر طرف بناؤ ہی بناؤ، تعمیر ہی تعمیر اور ارتقا ہی ارتقا ہے۔ درحقیقت محسنِ انسانیت کے ہاتھوں انسانی زندگی کو نشاۃ ثانیہ حاصل ہوئی اور حضورؐ نے ایک نظامِ حق کی صبح درخشاں سے مطلع تہذیب کو روشن کر کے بین الاقوامی دوزخ تاریخ کا افتتاح فرمایا۔ یہ اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی! محسنِ انسانیت کا ظہور ایسے حالات میں ہوا جب کہ پوری انسانیت تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی — کہیں دورِ وحشت چل رہا تھا۔ اور کہیں شرک اور بت پرستی کی لعنتوں نے مدنیت کا ستیاناس کر رکھا تھا مصر اور ہندوستان، بابل اور نینوا، یونان اور چین میں تہذیب اپنی شمعیں گل کر چکی تھی۔ لے دے کے فارس اور روم تمدنی عظمت کے پھریرے ہوا میں لہرا رہے تھے رومی اور ایرانی تمدنوں کی ظاہری چمک دکھ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی تھی۔ مگر ان شیش محلوں کے اندر بدترین مظالم کا دور دورہ تھا اور زندگی کے زخموں سے تعفن اُٹھ رہا تھا۔ بادشاہِ خدا کے اوتار ہی نہیں، خدا بنے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ جاگیردار طبقوں اور مذہبی عناصر کی ملی بھگت قائم تھی۔ روم اور ایران کے دونوں خطوں میں اس تلگوم نے عام انسان کا گلا اچھی طرح دبوچ رکھا تھا۔ یہ لوگ ان سے بھاری ٹیکس، رشوتیں خراج اور نذرانے وصول کرتے تھے اور ان سے جانوروں کی طرح بیگاریں لیتے تھے۔ لیکن ان کے مسائل سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ان کی

58638

مصیبتوں میں ان سے کوئی ہمدردی نہ تھی اور ان کی گنہگاروں کا کوئی حل ان کے پاس نہ تھا۔ ان بلاؤں سے  
 طبقات عیاشیوں اور نفس پرستیوں نے اخلاقی رُوح کو ہلاک کر دیا تھا۔ بادشاہوں کے اول بدل بنتے  
 فاتحین کے ظہور اور خون ریز جنگوں کی وجہ سے حالات میں جو توج پیدا ہوتا تھا۔ اس میں بھی کوئی راہ نجات  
 عام آدمی کے لیے نہ نکلتی تھی۔ عام آدمی کو ہر تبدیلی کی پٹی اور زیادہ تیزی سے پستی تھی۔ ہر قوت اسی  
 کو آلہ کار بنا کر اور اسی کا خون صرف کر کے اور اسی کی محنتوں سے استفادہ کر کے اپنا جھنڈا بلند کرتی تھی  
 اور پھر غلبہ و اقتدار پانے کے بعد وہ پہلوں سے بھی بڑھ چڑھ کر ظالم ثابت ہوتی تھی۔ خود  
 روم و ایران کے درمیان مسلسل آویزش کا چکر چلتا تھا اور مختلف علاقے کبھی کبھی حکومت کے  
 قبضے میں جاتے اور کبھی دوسری سلطنت ان کو نگل لیتی۔ لیکن ہر بار فتح و فتوح جو مہم کے کسی  
 کسی طبقے کو خوب اچھی طرح پامال کرتی۔ مثلاً رومی حکومت آتی تو آتش کدے کھیسازوں میں  
 جاتے اور ایرانی راج چھا جاتا تو پھر کلیسا آتش کدے بن جاتے پھر دنیا کے اکثر حصوں میں موافق  
 الملوک کا دور دورہ تھا۔ نت ٹکراؤ ہوتے۔ بار بار کشت و خون ہوتے بغاوتیں اٹھتیں۔ مذہب فرقے  
 خون ریزیاں کرتے اور ان ہنگاموں کے درمیان انسان بہ حیثیت انسان بڑی طرح پامال ہو  
 رہا تھا۔ وہ انتہائی مشقتیں کر کے بھی زندگی کی ادنیٰ ضرورتیں پوری کرنے پر قادر نہ تھا۔  
 اُسے مظالم کے کوہوں میں پیدا جاتا تھا۔ مگر تشدد کی خوف ناک فضا میں وہ سدائے  
 احتجاج بلند نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تلخ احساسات رکھتا ہوگا۔ مگر اُسے ضمیر کی آزادی  
 کسی ادنیٰ درجے میں حاصل نہ تھی۔ اُس کی مایوسیوں اور نامرادیوں کا آج بھی مشکل ہی  
 سے تصور کر سکتے ہیں کہ وہ ماحول کے ایک ایسے آہنی قفس میں بند تھا۔ جس میں  
 کوئی رازن کسی طرف نہیں کھلتا تھا۔ اُس کے سامنے کسی اُمید افزا اعتقاد درسی  
 فلسفے یا نظریے کا جگنو تک نہیں چمکتا تھا۔ اُس کی رُوح پیچھتی تھی، مگر پکار کا کوئی جواب  
 کسی طرف سے نہ ملتا تھا۔ کوئی مذہب اس کی دستگیری کے لیے موجود نہ تھا۔ کیونکہ انبیاء کی تعلیمات تحریف و  
 ناول کے غبار میں گم کی جا چکی تھیں اور باقی جو شے مذہب کے عنوان سے پائی جاتی تھی اسے مذہبی  
 طبقوں نے متاع کاروبار بنا لیا تھا۔ اور انہوں نے وقت کی ظالم طاقتوں کے ساتھ سودے کا نٹھ لیے  
 تھے۔ یونان کا فلسفہ سکتے میں تھا۔ کنفیوشس اور مانی کی تعلیم دم بخود تھی، ویدانت اور بدھ مت  
 کے تصورات اور منو شاستر کے نکات سر بگریاں تھے۔ جٹینن کا ضابطہ اور سولن کا قانون بے بس  
 تھا۔ کسی طرف کوئی روشنی نہ تھی۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان حالات کے ایک آہنی قفس



میں بند ہو جاتا ہے اور اسے کسی طرف سے نجات کا راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ تو تمدنی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ خوف ناک ترین بحران کا ایک عالم گیر دور تھا۔ جس کی اندھیاریوں میں محسنِ انسانیت کی مشعل یکایک آٹھرتی ہے۔ اور وقت کے تمدنی بحران کی تاریکیوں کا سینہ چیر کر ہر طرف اُجالا پھیلا دیتی ہے۔

خود عرب کا قریب ترین ماحول جو حضورؐ کا اولین میدانِ کار بنا، اس کا تصور کیجئے تو دل دہل جاتا ہے۔ وہاں عاد و ثمود کے ادوار میں سبا اور عدن اور یمن کی سلطنتوں کے سائے میں کبھی تہذیب کی روشنی نمودار بھی ہوئی تھی تو اب اسے گل ہوئے مدتیں گزر چکی تھیں۔ بقیہ عرب پر دورِ وحشت کی رات چھاٹی ہوئی تھی۔ تمدن کی صبح ابھی تک جلوہ گر نہیں ہوئی تھی۔ اور انسانیت نیند سے بیدار نہ ہو پائی تھی۔ ہر طرف ایک انتشار تھا۔ انسان اور انسان کے درمیان تصادم تھا۔ جنگ و جدل اور لوٹ مار کا دور دورہ تھا۔ شراب اور زنا اور جوئے سے ترکیب پانے والی جاہلی ثقافت زوروں پر تھی۔ قریش نے مشرکانہ اور بت پرستانہ مذہبیت کے ساتھ کعبہ کی مجاوری کا کاروبار چلا رکھا تھا۔ یہود نے کلامی اور فقہی موشگافیوں کی دکانیں کھول رکھی تھیں۔ باقی عرب فکر کے لحاظ سے ذہنی پریشانی میں مبتلا تھا۔ مکہ اور طائف کے مہاجرینوں نے سود کے جال پھیلا رکھے تھے۔ غلام سازی کا منحوس ادارہ دھوم دھڑلے سے چل رہا تھا۔ حاصلِ مرعاہ کہ انسان خواہش پرستی کی ادنیٰ سطح پر گر کر درندہ اور چوپایوں کی شان سے جی رہا تھا۔ جو زور والا تھا اس نے کمزوروں کو بھیڑ بکریوں کے گلوں کی طرح قابو میں کر رکھا تھا۔ اور کمزور قوت والوں کے قدموں میں بندہ پاش تھے۔

یہ تھے حالات جن میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم عظیم ترین تبدیلی کا پیغام لے کر یہ و تنہا اُٹھتے ہیں ایسے مایوس کن حالات میں کوئی دوسرا ہونا، تو شاید زندگی سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ دنیا میں ایسے نیک اور حساس لوگ بکثرت پائے گئے ہیں جنہوں نے بدی سے نفرت کی، مگر وہ بدی کا مقابلہ کرنے پر تیار نہ ہو سکے۔ اور اپنی جان کی سلامتی کے لیے تمدن سے کنارہ کش ہو کر غاروں کھو ہوں میں پناہ گزیں ہوئے اور جوگی اور راہب بن گئے۔ مگر حضورؐ نے انسانیت کی نیا کو طوفانی موجوں میں چکولے کھاتے چھوڑ کر اپنی جان،

لہ عالمِ انسانی کے اس تاریخی دور پر قرآن نے چند الفاظ میں ایسا مکمل تبصرہ کیا ہے کہ بڑی سے بڑی عبارت آرائی اس سے سامنے سرنگوں ہے فرمایا: **ظہر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لئلا یقہم**

بعض الذی عملوا لعلہم یرجعون (الروم ۴۱)

سچانے کی فکر نہیں کی، بلکہ ہدی کے ہلاکت انگیز گردابوں سے لڑ کر ساری اولادِ آدم کے لیے نجات کا راستہ کھولا۔ تمدن کی کشتی کی تیوارِ سنہالی اور پھر اسے ساحلِ مراد کی طرف رواں کر دیا۔  
 روم اور ایران کی دو بڑی ٹکراتی ہوتی تمدنی طاقتوں نے جو بحران پیدا کر دیا تھا، اسے توڑنے کے لیے آپ ایک تیسری طاقت بن کے اٹھے اور آہستہ آہستہ یہ تیسری طاقت جب اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئی۔ تو اس نے روم و ایران دونوں کو چیلنج کیا، دونوں کی مرعوب کُن قیادتوں کے تختِ اُلٹ دیے اور عوام الناس کو خوفناک تمدنی قفس سے نکال کر آزاد فضاؤں میں اڑان کا موقع دیا! اولادِ آدم کے سامنے

۱۱ اس دور کا بہترین محترم جائزہ لینے کے لیے ملاحظہ ہو: انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، زمین سید ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما - باب اول - نیز ملاحظہ ہو: رسول اکرم کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ - باب: بعثت نبوی کے وقت دنیا کی حالت مزید ملاحظہ ہو - سیرت النبیؐ از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم ج ۴

۱۲ ملاحظہ ہو: ارض القرآن - از علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم - ابواب معتقہ

۱۳ ملاحظہ ہو: سیرت النبیؐ - از علامہ سید سلیمان ندوی - ج ۴ - باب ظہور اسلام کے وقت عربوں کی مذہب و اخلاقی حالت۔

۱۴ القرآن: اِنْ هُمْ اِلَّا كَا لَانْعَاهِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا (الفرقان - ۲۰)

۱۵ حضور کی حدیث ہے: بعثت من بعدی یقرءون بخی الامم فترون فقرنا حتی کنت من لقیا الذی کنت منه (بخاری روایت ابو ہریرہ) دوسری حدیث ہے: ان الله صلحنا کناننا من اول اسمعیل، واصطفیٰ قریشاً من کنانہ، واصطفیٰ من قریش بنی ہاشم، واصطفا فی من بنی ہاشم (مسلم - روایت داؤد بن اسحاق) ملاحظہ ہو: ترمذی: باب المناقب و المواقب لدنیۃ قسطلانی ج ۱ ص ۱۳ - اس سلسلہ کی تیسری حدیث ہے: ان الله خلق الخلق وجعلنی فی خیر فرقہم وخیر الفریقین، ثم تغیر القبائل فجعلنی فی خیر القبیلۃ ثم تغیر البیوت فجعلنی فی خیر بیوتہم، اننا خیر ہم لیسۃ، وندبہم بدیۃ۔ (ترمذی - روایت عباس ان کی تائید میں مزید روایات بھی ہیں۔

حظاً ایک راہِ نجات کھل گئی، کاروانِ زندگی جو رہزنوں کے درمیان گھرا کھڑا تھا۔ وہ پھر فلاح و ارتقا کی راہوں پر گامزن ہو گیا!

یوں رسولِ پاک خلقِ خدا کے لیے نجات دہندہ بن کر تشریف لائے۔

### وقت، مقام اور انسانی مواد:

مشیتِ الہی نے جہاں انسانیت کو صراطِ مستقیم پر لانے کے لیے حضور کی بہترین ہستی کا <sup>صلی</sup>اصطفیٰ

کیا، وہاں وقت کے بدترین حالات کے باوجود حضور کے لیے بہترین زمانہ، مقامِ دعوت اور بہ حیثیت اولین مخاطب کے بہترین قوم کا انتخاب بھی کیا۔

مجموعی لحاظ سے زمانہ یوں موزوں ترین تھا کہ قبائلی دور ختم ہو کر جلد ہی بین الاقوامی دور شروع ہونے والا تھا۔ اور تاریخ کچھ ہی گردشوں کے بعد سائنس کے عہد میں داخل ہونے والی تھی۔ حضور کا زمانہ بعثت گویا دو دوروں کے درمیان خطِ فاصل تھا۔ آنے والے وسیع تر اور روشن دور کا افتتاح کرنے کے لیے ضروری ہوا کہ انبیاء کی دعوتِ حق کو ایک بار پوری طرح اجاگر کر دیا جائے۔ دین کی روح کو ابھار دیا جائے۔ خدا پرستانہ تہذیب کی بنیادیں مضبوطی سے جمادی جائیں اور عدل و مساوات کا نظام رحمتِ کامل شکل میں پیش کر دیا جائے تاکہ حضور کے اس کارنامے کی روشنی سے بعد کے ادوار منور کیے جاسکیں اور پھر یہ زمانہ اس لحاظ سے بھی موزوں ترین تھا کہ عام لوگوں کے سامنے کوئی دوسری امید گاہ باقی نہ تھی، اور ان کے دل میں قبولِ اسلام کے دروازے آسانی سے کھل سکتے تھے۔

مقامِ دعوت کے لحاظ سے دیکھیں تو عرب باوجود بے آب و گیاہ خطہ ہونے کے اس وقت کی متمدن دنیا میں وسطی حیثیت رکھتا تھا، مشرق و مغرب اور شمال سے آنے والے تمام کاروانی

۱۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو: زاد المعاد از علامہ ابن القیم ج ۱ تفسیر آیہ وربك یخلق ما یشاء و یختار۔ ص ۵ تا ۱۵۔ نیز ملاحظہ ہو: حجة البالغة۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ج ۱۔ بحث ۶ باب ۱۵۳، ۵۴ ج ۱۲ باب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ فصل: حضور کی عادات و خصائل کے بیان میں۔

۲۔ ملاحظہ ہو: سیرت النبی: از سید سلیمان ندوی مرحوم۔ ج ۲۔ باب: عربوں کی خصوصیات۔ علاوہ بریں ملاحظہ ہوں احادیثِ تنجیر و اصطفیٰ، مندرجہ جامع ترمذی۔ باب المناقب۔

۳۔ عرب کی مرکزی حیثیت پر ملاحظہ ہو: ڈاکٹر حمید اللہ کا نوٹ مندرجہ ”رسول اکرم کی سیاسی زندگی“ باب: عرب اور مکہ معظمہ کا انتخاب دعوتِ اسلام کے مرکز کے طور پر۔

راستے عرب کی سرزمین میں آ کے ملتے تھے۔ اور مختلف ممالک کے درمیان جتنی تجارت خارجہ ہوتی تھی اس کا واسطہ عرب ہی کے تجارت تھے۔ عمان اور یمن صنعا اور مکہ، جدہ اور یمنوع، مدینہ اور دومتہ الجندل کے درمیان کاروانوں کی آمد و رفت رہتی، جو عربی رہنماؤں، قریش کے پروانہ ہائے راہداری اور اہم قبائل کے بدرقوں کے بغیر سلامتی سے گزر نہ سکتے تھے۔ اس طرح عرب کی سرزمین خصوصاً مکہ، طائف، مدینہ، یمنوع اور دومتہ الجندل— کارابطہ ہند، چین، ایران، عراق، مصر، روم اور حبش کے تمام علاقوں سے تھا۔ یہاں کسی بین الاقوامی دعوت کا مرکز دوسرے ہر علاقے سے زیادہ کامیاب ہو سکتا تھا۔ پھر سرزمین عرب میں مکہ اور مدینہ کے مقامات یہ اہمیت رکھتے تھے کہ مذہبی اور تجارتی اور تمدنی حیثیت سے ان کی قیادت کا سکہ چلتا تھا۔

عرب کا غیر متمدن اور بتلاشے انتشار ہونا اور اقتصادی حیثیت سے کمزور ہونا اگرچہ کئی مشاغل کا باعث تھا مگر اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی تھا کہ یہ علاقہ بیرونی تسلط سے بھی بڑی حد تک آزاد تھا۔ اور داخلی طور پر بھی کوئی طاقت ایسی نہ تھی جو باقاعدہ سیاسی اقتدار پورے ملک پر جما چکی ہوتی اور پھر اقتدار، قانون اور تعلیم سے کام لے کر انسانوں کو ایک نئے نقشے پر ڈھال چکی ہوتی۔ یہی طاقت اگر کوئی موجود ہوتی تو وہ اسی طرح دعوت حق کو کچل دے سکتی تھی جیسے پہلے بعض نظام بادشاہوں نے انبیاء کی دعوتوں کو تکمیل تک پہنچنے سے قبل روک دیا۔ بلاشبہ قریش کا بڑا گہرا اثر موجود تھا۔ اور یہ پورے زور سے رکاوٹ بنا۔ لیکن قریش کو پورے عرب پر باقاعدہ سیاسی تسلط حاصل نہ تھا۔ ان کا مذہبی و تجارتی اثر کتنا بھی گہرا رہا ہو۔ منظم حکومت کا بدل نہیں ہو سکتا۔

دینی لحاظ سے دیکھیں تو اس سرزمین کے چاروں طرف انبیاء و باقی کی دعوتوں کے چراغ روشن رہ چکے تھے اور ان کی اقوام کے آثار آنکھوں کے سامنے موجود تھے۔ شمال میں خاور براہیمہ میں اُرتھتھا۔ اسی کے قریب کچھ اور اُرد پر نوح علیہ السلام کا علاقہ تھا، پھر یوحنا علیہ السلام کا علاقہ تھا، پھر مدائن صالح تھا پھر فلسطین و یروشلم کا علاقہ تھا جہاں بنی اسرائیل نے عروج و زوال کے دور گزارے اور جہاں عیسیٰ علیہ السلام نے سچائی اور نیکی کا پیغام سنایا۔ جنوب میں غادر ثمود کی بستیاں تھیں۔ سدناہ کی جس کے ٹوٹنے سے سیلِ عرم کا عذاب اُٹا اور سبکی سلطنت تھی۔ سمندر پار مصر کی سرزمین تھی جہاں

۱۰ القرآن - آیت: اَفَلَمْ يَهْدِيَهُمْ لَعَلَّ يَسْتَدْرِكُوهُمْ اَمْ يَحْسُبُونَ اَنْ يَكُونُوا يَسْتَدْرِكُوهُمْ

۱۱۰۰ والسجد ۲۷

ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام نے مرکزِ توحید کو مستحکم کیا اور عبودیت و طاعت کی روشن یادگاریں چھوڑیں  
خدا پرستی اور توحید اور اصلاح انسانیت کے فروغ کے لیے آخر اس سے بہتر علاقہ اور کونسا ہو سکتا  
تھا۔ یہاں دعوتِ حق کی آواز اٹھانے سے انسانی ذہن میں سابق انبیاء کے چھوڑے ہوئے دھندلے  
نقوش باسانی تازہ ہو سکتے تھے۔

انسانی مواد (Human Material) بھی بہترین وہ تھا جو عرب کی سرزمین میں موجود تھا۔ اس  
کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے خزانے ابھی تک غیر استعمال شدہ  
اور محفوظ پڑے تھے۔ یہ لوگ ابھی ان ملکِ روگوں سے محفوظ تھے جو روم و ایران کے بہیمانہ تمدنوں  
نے پیدا کر دیے تھے۔ ان میں وحشیانہ طرزِ زندگی کی خرابیاں موجود تھیں مگر دوسری طرف خوبیاں بھی کچھ  
کم نہ تھیں۔ یہ لوگ بددیت کی وجہ سے مزاج میں فطری سادگی رکھتے تھے اور تکلفات اور تصنیفات  
سے پاک تھے۔ آثارِ فطرت، کا قریبی مشاہدہ رکھنے کی وجہ سے کائنات میں آیاتِ حقیقت کو پڑھ سکتے  
تھے۔ گرم آب و ہوا، لو کے پتھیروں، دن رات کے سفروں، بھوک اور پیاس کے تجربوں اور آٹے  
دن کے قتل و غارت کی وجہ سے ان میں سخت جانی موجود تھی اور وہ جذبہ شجاعت کو بہرہ بردار چڑھانے  
میں ممد بنی۔ ایک عالمی تحریک کو لے کر اٹھنے کے لیے شجاعت مند عنصر ہی مفید ہو سکتا تھا۔ ان میں  
نبیاضی موجود تھی اور ایک بڑا کام کرنے کے لیے کوئی بخیل قوم موزوں نہ ہوتی۔ اس قوم کا حافظہ بلا کا  
تھا اور یہ اپنے انساب کے علاوہ اپنے گھوڑوں تک کے سلسلہ ہائے نسب محفوظ رکھتے تھے۔ ایسے  
لوگ ایک نظامِ زندگی کی تعلیم کو اخذ کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کے لیے بہترین کارکن بن سکتے  
تھے۔ ان میں غیرت و حمیت کا جذبہ بھی پوری طرح برسرِ کار تھا اس لیے یہ جوہر خودی کا تحفظ کر  
سکتے تھے۔ ان کی زبان ایک اعلیٰ اور وسیع اور ترقی پذیر زبان تھی۔ جس میں فصاحت و بلاغت کا  
جوہر خوب نکھر چکا تھا۔ لہذا اعلیٰ حیثیت سے وہ باسانی آگے بڑھ سکتے تھے۔ نیز دوسروں کو کسی  
انقلابی پیغام سے متاثر کرنے میں زیادہ اچھی طرح کامیاب ہو سکتے تھے۔

عرب عزم اور دھن کے پکتے تھے۔ وہ اگر غلط روش پر چلتے تو پورے شرح صدر سے چلتے  
اور مزاحمتوں اور مخالفتوں کا مقابلہ کرتے لیکن ان میں یہ صلاحیت بھی تھی کہ اگر انہیں راہِ راست  
پر ڈال دیا جائے۔ تو پھر ان کے قدم کبھی نہ ڈگمگائیں۔ ایسے مختلف وجوہ ہیں، جو یہ تسلیم کرنے پر مجبور

کرتے ہیں کہ حضور جہاں اپنی ذات میں اپنے مشن کے لیے بہترین داعی و قائد تھے۔ وہاں آپ کو بہترین انسانی مواد بھی فراہم کیا گیا۔

پھر یہ انسانی مواد ہر لحاظ سے ارتقاء کا قدم آگے بڑھانے کے لیے بے چین تھا۔ مذہبی لحاظ سے ذہن عناصر میں سخت اضطراب پیدا ہو چکا تھا۔ اور خاص لوگ حقیقت کی روشنی اور الہامی رہنمائی کے پیاسے تھے۔ سیاسی لحاظ سے مکہ اور مدینہ جیسے شہروں میں سیاسی ہیئت کی تشکیل کا آغاز ہو رہا تھا۔ اور کسی قدر جمہوری رنگ کے ساتھ ایک شہری ریاست کا بے ترتیب سا ڈھانچہ بن رہا تھا۔ پھر عرب کے معاشی ذرائع کی محدودیت زور کر رہی تھی کہ آبادی اپنے ریگزار سے باہر پھیلاؤ اختیار کرے یوں بھی مثبتیت کا ایک تاریخی کلیہ یہ ہے کہ جب راجح الوقت تمدنوں میں بحران آجاتا ہے اور ان کی قیادتیں ناسد ہو جاتی ہیں۔ تو کسی نئی قوت کو بددیت کے گوارے سے اٹھا کر میدان میں لایا جاتا ہے۔ جیسے کہ خدرا کی مشیت نے فرعونی اقتدار کے مقابل میں بنی اسرائیل کو اٹھا کھڑا کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان سارے پہلوؤں سے اہل عرب کو رہنما دہ بہترین مواد تھے جس کے ذریعے زندگی کا اساسی اور ہمہ گیر انقلاب برپا کیا جاسکتا تھا۔

### انقلابی کلمہ حق :

پیغمبر انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی اعتقاد، کسی نظریہ، در کسی نقشہ فکر کے بغیر صلوات رحیمہ کا کام یونہی شروع نہیں کر دیا۔ محض ایک مبہم ہدیہ نہ تھا، کوئی چند جملہ نہ تھا، بلکہ حضور کون و مرہان کی عظیم ترین سچائی کی مشعل لے کے اٹھے۔ انتہائی حساس تہذیب کے سامنے رسول خدا نے زندگی کے معنی پر کاوشیں کی تھیں، غارِ حرا کی نزوتوں میں مدعوں پہنچانے، اندرون مکہ کی مساعیر، یا اہل بیت پر بھی غور کیا۔ تمدن کے صورت و نساد کے سروں کو بھٹنے میں بس دماغ کھپایا۔ لیکن عملی قدم

۱۔ ملاحظہ ہو: رسول اکرم کی سیاسی زندگی، از ڈاکٹر حمید اللہ، باب: عرب اور مکہ کا انتخاب، فصل: عمرانی دور

نیز ملاحظہ ہو: سیرت النبی ص ۴۲ - باب: عربوں کے تصویبات۔

۲۔ القرآن - آیہ: ونبیدان فمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلہم ایۃ و

نجعلہم الوارثین و نمکن لہم فی الارض و نری ذریعہ و ہامان و حنودہما مہم ما کانوا

یحذرون (القصص ۵، ۶)

۳۔ یہی شرح بخاری میں ہے کہ حرام کی غلطیوں میں آپ کا منشاء غور و فکر اور عبرت اندوزی تھا۔

اس وقت تک نہیں کیا جب تک کہ علم الہی نے آپ کے قلب کو حقیقت سے منور نہیں کر دیا۔ او سب سے بڑی سچائی پوری طرح آپ کے سامنے بے نقاب نہیں ہو گئی۔ سب سے بڑی سچائی یہ ہے کہ کائنات کا ایک خدا ہے اور انسان اس کا بندہ ہے! یہی کلمہ حق حضور کے انقلاب کا بیج تھا۔ اس بیج سے صالح زندگی اور صحت مند تمدن کا وہ شجرہ طیبہ نمودار ہو سکتا تھا۔ جس کی شان یہ ہے کہ اس کی جڑیں زمین میں گہری اُتری ہوئی ہیں۔ اور اس کی شاخیں فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

حضور کا کلمہ حد درجہ کا انقلابی کلمہ تھا: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ! لفظی پہلو سے انتہائی مختصر، معنوی لحاظ سے بے حد عمیق: ایک اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں۔ صرف وہی ایک الہ ہے۔ اِلٰہُ اس طاقت یا ہستی کو کہتے ہیں جس کی غلامی کی جائے، جس پر آدمی دالمانہ طور پر فدا ہو۔ جس کی عظمت مان کر پرستش کرے جس کی تحمید و تقدیس کرے۔ جس کے گن گائے۔ جس کی تسبیح کرے۔ جس کو نذر پیش کرے، جس سے بھلائی کی امیدیں لگائے اور جس کی گرفت سے ڈرے جس سے نیکی کی جزا کا اُمیدوار ہو اور جس سے برائی کی سزا کا اندیشہ رکھے جس کو اپنا مالک و مختار سمجھے، جس کو فرمانروا اور قانون ساز مانے، جس کے مطالبوں کو پورا کرے۔ اور جس کے منع کردہ امور سے باز رہے۔ جس کے دیے ہوئے اصولوں کو پندائے زندگی بنائے۔ جس کی مقررہ حدوں کی پابندی کرے۔ جس کے عنایطہ حلال و حرام کو بے چون و چرا مانے، جس کو اپنے لیے سرچشمہ ہدایت تسلیم کرے، جس کی مرضی کے مطابق نظام حیات کی تشکیل کرے۔ جس کے پسندیدہ لوگوں کا احترام کرے اور جس کے مخالفوں کی مخالفت کرے۔ جس کے اشاروں پر تن من دھن کی بازی لگا دے اور جس کی رضا کو زندگی کا نصب العین قرار دے۔ الوہیت کا یہ وہ وسیع مفہوم تھا جو ایک لفظ میں پنہاں تھا۔

الوہیت کے یہ حقوق خدا سے واحد سے الگ کر کے بہت سی انسانی طاقتوں نے پارہ پارہ کر کے بانٹ رکھے تھے۔ اور بے شمار اللہ تمدن پر سوار تھے۔ انسان کا اپنا نفس اور اس کی خواہشیں، خاندان اور برادری کی رسمیں، نسلی، قومی اور قبیلوی وحدتوں کی روایات، جاگیر دار اور پجاری طبقوں

۱۔ القرآن آیت وجدی ضالافہدای۔ تمہیں راہ حق کے لیے سرگردان پا کر ہدایت کی راہ دکھائی (الغنی)،

۲۔ القرآن۔ ابراہیم۔ ۲۴۔ ۲۵)

۳۔ ملاحظہ ہو: قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ بحث الہ۔

۴۔ القرآن۔ آیت: وتقطعوا امرہم بینہم (الانبیاء۔ ۹۳) نیز آیت فقطعوا امرہم بینہم

(المومنون۔ ۵۳)

کی بالادستی، شاہی خاندانوں اور درباری اشراف کی کبر پسندی، یہ مختلف طبقہ بر طبقہ الودین تھیں۔ جن کے نیچے عام آدمی پس رہا تھا "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ" کی شاہ ضرب ان سب پر یکدم پڑتی تھی۔ اس کلمہ کا کہنے والا گویا یہ اعلان کرتا تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عظمت مجھے تسلیم نہیں، کسی کی بالادستی قبول نہیں، کسی کا بنایا ہوا ضابطہ و قانون منظور نہیں، کسی کے حاصل کردہ فوق الانسانی حقوق جائز نہیں، کسی کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کیا جائے گا۔ کسی کی رضا جوئی اب نہ کی جائے گی اور کسی کے اشارہ ابرو پر اب زندگی کا نظام نہیں چلے گا، خدا کے سوا ہر دوسری خدائی توڑ دی جائے گی۔ یہ کلمہ گویا انسان کی سچی آزادی کا اعلان تھا۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ اسے دھڑکا کر ہی است

اس کلمہ کے دوسرے جز میں یہ اقرار شامل تھا کہ انسانی ہدایت اور تمدن کی اصلاح کے لیے واحد ذریعہ وہ سلسلہ نبوت و رسالت ہے جو اللہ نے قائم کیا ہے، زندگی کا اصل علم وہ ہے جو وحی کے ذریعے آیا ہے اور اسی سے عقل انسانی کو سوچنے کے لیے رہنما اصول ملتے ہیں۔ پھر یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلہ رسالت کی تکمیل فرمانے والے ہیں اور اب زندگی کی رہنمائی اسی ہستی کے واسطے سے حاصل ہو سکتی ہے اور اسی ہستی کی قیادت میں قافلہ انسانیت فلاح و ارتقاء کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

اس کلمے کی یہی اہمیت تھی کہ جس کی وجہ سے اس کا قرار اسلام میں داخلہ کی شرط اول ٹھہرا۔ اس کلمے کو موزنون نے بلند آواز سے پکارا، اس کلمے کو نماز میں شامل کیا گیا اسے نفس الذکر قرار دیا گیا۔ اور ہر لحاظ سے یہ کلمہ تحریک اسلامی کا طغریٰ یا سلوگن بن گیا۔

۱۴۰ - القرآن - (الاحزاب - ۱۴۰)

۱۴۱ - حدیث: من شهد ان لا اله الا الله وان محمداً رسول الله حرم الله عليه النار - (روایت عبادہ بن صامت مندرجہ صحیح مسلم - ملاحظہ ہو مشکوٰۃ ج ۱، کتاب الایمان) نیز حدیث: امرت ان قتل الناس حتی یشهدوا ان لا اله الا الله وان محمداً رسول الله . . . الخ - (روایت ابن عمر - متفق علیہ - ملاحظہ ہو: مشکوٰۃ ج ۱، کتاب الایمان) اس سلسلے کی دیگر کثیر احادیث مختلف کتب میں دیکھیے۔

۱۴۲ - ملاحظہ ہو حدیث، روایت کردہ حضرت جابر - مندرجہ ترمذی وابن ماجہ - ملاحظہ ہو مشکوٰۃ - باب ثواب التبیح والتحمید والتہلیل والتکبیر۔



حضور کا انقلابی کلمہ حق جس دل میں اترتا اس کی کایا پلٹ دی، جس زندگی میں داخل ہوا اس کا نقشہ بدل دیا اور اس بیج سے نئی انسانیت پیدا ہوئی اور نشوونما پانے لگی۔

**اصلاح تمدن کیلئے حضور کا نصب العین :**

سیرت پاک سے صحیح استفادہ کرنے کے لیے اس اہم سوال کا جواب ضرور سامنے ہونا چاہیے کہ حضور کے پیش نظر تبدیلی کا دائرہ اور کام کا پیمانہ کیا تھا؟ تمدنی نظام میں حضور کوئی جزوی اصلاح چاہتے تھے یا ہمہ گیر؟ دعوت مذہبی و اخلاقی تھی یا وہ سیاسی اہمیت بھی رکھتی تھی؟ بالفاظ دیگر تمدنی دائرہ میں نصب العین کیا تھا؟

اس سوال کا جواب خود قرآن کریم میں بڑی وضاحت سے موجود ہے اور مختلف پیرایوں میں تکرار سے اسلامی دعوت کا مدعا واضح کیا گیا ہے۔ یہاں ہم صرف دو آیات کو لیتے ہیں۔ ایک مقام پر جملہ انبیاء و رسل کی بعثت کا مقصود یوں بیان کیا ہے :-

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ  
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ - (الحمدید - ۲۵)

ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل دے کر جس مقصد کے لیے بھیجا ہے اور جس غرض کے لیے بھیجا ہے اور جس غرض کے لیے ان پر کتابیں نازل کی ہیں اور ان کو صواب و حق کی میزان عطا کی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ انصاف پر قائم ہو جائیں۔

بات نہایت ہی صاف ہے کہ دعوت حق کا منشا انسانی زندگی کو نظامِ قسط کے سانچے میں ڈھالنا اور تمدن میں عملاً عدل و توازن پیدا کرنا ہے۔ اس آیت میں متصلاً آہنی اسلحہ کو بھی اسی مقصد کے لیے استعمال کرنے کا اشارہ موجود ہے۔ یعنی نظامِ حق کی اقامت، اس کے تحفظ اور اس کے فروغ کے لیے سیاسی اور فوجی قوت بھی ناگزیر ہے۔

خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غایت اور زیادہ صراحت سے بیان کی گئی اور وہ بھی ایک سے زیادہ بار بیان کی گئی۔ ملاحظہ ہو :

۱۰ آیت محولہ پر اسمعیل بن کثیر دمشقی کا نوٹ ملاحظہ ہو: تفسیر ابن کثیر ج ۱، ص ۲۱۲، ۲۱۵۔ نیز حدیث پاک نگاہ میں رہے: "بعثت بالسیف.... الخ روایت کردہ ابن عمر (احمد والبوداؤد) نیز ارشاد رسالت: لَقَدْ جِئْتَكُمْ بِالذِّبْحِ - (سیرت ابن ہشام - ج ۱ ص ۲۱۰)

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظَاهِرَهُ عَلَى  
الَّذِينَ كَفَرُوا ۗ وَلَوْ كَفَرُوا الْمُشْرِكُونَ ۝

(الصف - ۹)

وہی (اللہ) ہے جس نے اپنے رسول کو عنابطہ ہدایت اور دین حق دے کر اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ ہر دین کے مقابلے میں اسے (پوری انسانی زندگی پر) غالب کر دے! اگرچہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو!

مدعا یہ کہ قریش اور عرب کے دوسرے مشرکین تو اپنے جاہلی نظام حیات کو برقرار رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔ اور جاہلیت کے خلاف جو آواز اٹھے گی وہ انہیں سخت ناگوار ہوگی۔ مگر ان کی ناگواریوں کی پروا کیے بغیر ان کے محاذِ مخالفت کو توڑ کر حضور کو امتِ دین کرنا ہے۔ اور خدا کے عنابطہ ہدایت کو عملاً جاری کرنا ہے۔ یہ مدعا اگر دعوتِ حق میں مضمر نہ ہوتا تو کشمکش اور جہاد اور ہجرت کے ابواب کہاں سے آتے؟ جان و مال کی قربانیاں کا جس کے لیے مانگی جاتیں؟ کس مقصد کے لیے کونو انصار اللہ کی صلواتے عام دی جاتی؟ کس غایت کے لیے "حزب اللہ" یا اللہ کی پارٹی تشکیل پاتی؟ کس نصب العین کے لیے شہداء چنے جاتے؟ قرآن اور سیرت دونوں کا فہم دعوتِ حق کے منتہا کو ذہن نشین کیے بغیر ممکن نہیں رہتا۔

آئیے اب ہم خود حضور کے ابوابِ سیرت کا مطالعہ کر کے اس نصب العین کا سراغ لگائیں جو پیش نظر تھا!

حضور نے بالکل ابتدائی مرحلے میں خاندانِ بنی ہاشم کی ایک ضیافت اپنا پیغام سنانے کے لیے منعقد کی تھی۔ اس میں اجمالاً بیان فرمایا تھا کہ یہ دعوت دینا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی ضامن ہوگی۔ بہت عرصہ بعد قریش کے ایک وفد سے گفتگو کرتے ہوئے اسی بات کو دہرایا اور فرمایا:

۱۱ من جملہ آیات کثیرہ کے، ملاحظہ ہو آیت: وَتَجَاهِدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (الصف ۱۱)

۱۲ القرآن (الصف ۱۲)

۱۳ القرآن المائدہ - ۵۶: والمجادلہ - ۲۲

۱۴ القرآن (آل عمران - ۱۱۳)

فَإِنْ تَقْبَلُوا مِنِّي مَا جِئْتُكُمْ بِهِ فَهُوَ عِظْكُمْ فِي الدُّنْيَا وَ فِي  
الْآخِرَةِ - ۱۷

تم اگر میری دُہ دعوت قبول کر لو، جسے میں پیش کر رہا ہوں تو اس میں تمہاری دنیا اور  
آخرت دونوں کی بہتری ہے۔

دنیا کی بہتری اور بھلائی کے سادہ الفاظ سے کسی جزوی بھلائی کو مراد لینا کوئی معنی ہی  
نہیں رکھتا۔ جزوی بھلائی تو ہر دعوت میں موجود ہوتی ہے۔ اور ہر نظام شر میں بھی کچھ اچھے پہلو  
ہوتے ہیں۔ مطلب زندگی کا سنور جانا اور تمدن کا درست ہو جانا۔ نظام قسط کا قائم ہو جانا  
اور حیاتِ طیبہ کا حاصل ہو جانا ہے۔

پھر ابتدائی دور کشمکش میں ایک اور موقع پر حضور سے گفت و شنید ہوتی ہے تو اس  
کے دوران میں آپ فرماتے ہیں۔

كَلِمَةٌ وَاحِدَةٌ تَعْطِي دُنْيَاهُمْ تَمْدُونَ بِهَا الْعَرَبَ وَ تَدِينُ لَكُمْ  
بِهَا الْعَجَمُ ۱۸

بس وہ ایک کلمہ ہے، اسے اگر مجھ سے قبول کر لو۔ تو اس کے ذریعے تم سارے عرب  
کو زیرِ نگیں کر لو گے اور سارا عجم تمہارے پیچھے چلے گا۔

میلوں اور حج کے موقعوں پر قبائل کے کیمپوں میں جا جا کر حضور نے یہی بات ہر سردار  
قبیلہ سے کہی۔ فرماتے مجھے ساکنہ لے چلو، مجھے کام کرنے کا موقع دو، اور مجھ سے تعاون کرو  
یہاں تک کہ خدا کی طرف سے اس پیغام کو میں واضح کر دوں جس کے لیے مجھے مبعوث کیا گیا ہے۔

۱۷ سیرت ابن ہشام۔ ج ۱۔ ص ۳۱۶۔

۱۸ القرآن الحدید ۳۵

۱۹ القرآن النحل۔ ۶۷

۲۰ سیرت ابن ہشام ج ۲۔ ص ۲۷

۲۱ بنو عامر بن صعصعہ نے حج سے واپسی پر حضور کی دعوت کو یوں بیان کیا کہ: یدعوننا الی ان نمنعہ و

نقومہ، و نخرج بہ الی بلادنا۔ (سیرت ابن ہشام ج ۲۔ ص ۳۲)

۲۲ اصل الفاظ یہ ہیں: تو منوا بی، و تصدقوا بی، و تمنعونی، حتی آیین عن اللہ ما لبعثنی بہ سیرت ابن ہشام  
ج ۲۔ ص ۳۲

چنانچہ بنو عامر کا سردار، بخیرہ بن فزاس حضور کے پیغام کی شخصیت اور حضور کی والہانہ سرگرمی کار سے اتنا متاثر ہوا، کہ اس نے کہا کہ اگر یہ نوجوان میرے ہاتھ آجائے تو میں سارے عرب کو نکل جاؤں۔ اس کی نگاہیں حضور کی دعوت کے منتہا اور کام کے نتائج تک پہنچ گئیں۔ اور اسی لیے اس نے ایک سو اگانٹھنا چاہا۔ حضور کو وہ اپنا تعاون اس قیمت پر پیش کرتا ہے کہ جب آپ کو مخالفین پر غلبہ حاصل ہو جائے، تو آپ کے بعد اقتدار ہمیں حاصل ہو۔ ماننا پڑتا ہے کہ بخیرہ کی نگاہ بڑی دور رس تھی۔ اب اگر حضور محدود مذہبی تصور کے محض واعظ اور مبلغ ہوتے اور کوئی سیاسی منتہا آپ کے سامنے سرے سے نہ ہوتا تو صاف صاف کہہ دیتے کہ بھائی میں تو ایک اللہ والا ہوں، مجھے اقتدار کے بکھیرے سے کیا مطلب اور میرے کام میں حکومت اور قیادت کا کیا سوال! مگر حضور کا جواب یہ نہ تھا، حضور نے یہ فرمایا "الامر الی اللہ، یشاء" اقتدار کا معاملہ خدا کے اختیار میں ہے۔ اور وہ جس کے قبضے میں چاہے گا رکھے گا اور سو اچکانے سے انکار کر دیا ہے

حضور کی دعوت کے سلسلے میں "عرب و عجم کے اقتدار" کا چرچا اتنا عام ہو گیا تھا، جیسے کہ وہ تحریک اسلامی کا سلوگن ہو۔ بچے بچے کی زبان پر یہ بات رہتی تھی، حتیٰ کہ مخالفین نے اسی کو بناتے طنز بنایا تھا، اسلام کے سائے میں جو غلام اور غریب طبقوں کے نوجوان آئے جمع ہو رہے تھے، اور جن کو قریش تشدد کے گہو میں پھیل رہے تھے ان کو دیکھتے تو اشارے کر کر کے طنزاً کہتے کہ واہ کیا کہنے ہیں ان ہستیوں کے، یہ ہیں جو عرب و عجم کے حکمران اور سردار بننے والے ہیں۔

طنز و تمسخر اور مخالفت و مزاحمت کے سارے طوفان اٹھانے کے باوجود قریش کے سمجھدار لوگ دیوں کی گہرائیوں میں یہ ضرور محسوس کرتے تھے کہ یہ دعوت کوئی معمولی چیز نہیں بلکہ اس سے بڑے بھاری نتائج پیدا ہونے والے ہیں۔ ایک مرتبہ عقبہ کو سرداران مکہ نے حضور سے گفت و شنید کے لیے بھیجا، عقبہ نے حکومت، مال و دولت اور دنیوی مفاد کی ہر ممکن پیش کش حضور کے سامنے بیان کی کہ کسی طرح آپ اس انقلابی مہم سے باز آجائیں حضور نے جواب میں سورۃ حصر کی آیت سنائیں۔ عقبہ جو تاثر اس مجلس سے لے کر گیا۔ اس نے اس کے چہرے کا رنگ بدل دیا تھا۔ اس نے جا کر کہا، کہ اس دعوت میں تو ایک "بنیاد عظیم" مضمر ہے۔ یعنی یہ ایک بہت بڑی تبدیلی کی حامل ہے

کوئی انقلاب آنے والا ہے اور زندگی کا نقشہ زیرِ زبر ہو جائے گا۔ اس لیے اس نے مشورہ دیا کہ محمدؐ کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ تم درمیان میں حائل نہ ہو، اگر اہل عرب نے اس شخص کا خاتمہ کر دیا۔ تو تم سب سے چھوٹے اور اگر اُسے غلبہ حاصل ہو گیا، تو مکہ، ملککم و عزکم و کنعہ اسعد الناس۔ اس کی سلطنت تمہاری سلطنت ہوگی، اس کا اقتدار تمہارا اقتدار ہوگا اور تم لوگوں میں سب سے بڑھ کر معزز ہو جاؤ گے۔ یعنی عقبہ تک یہ حقیقت پا گیا کہ اس دعوت کے پردے میں ایک سلطنت چھپی ہوئی ہے۔ اور یہ اقتدار پر منتج ہوگی۔ تو آخر خود حضورؐ اور حضور کے رفقا اس منتہا سے کیسے غافل ہو سکتے ہیں۔

ایک موقع پر جب تشدد کی بھٹی خوب گرم تھی۔ حضور کے رفقاء نے اپنا دکھڑا بیان کیا اور دعا کی درخواست کی۔ حضور نے پہلے تو ان کو بتایا کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کی گھاٹیاں کتنی کٹھن ہوتی ہیں۔ اور ماضی میں جن جوانوں نے یہ فرض ادا کیا ہے انہیں کیا کچھ پیش آیا۔ اور پھر پورے وثوق سے مژدہ سنایا کہ "خدا کی قسم! اس مہم کو اللہ تعالیٰ ضرور اس کے مرحلہ تکمیل تک پہنچائے گا۔" پھر اس مرحلہ تکمیل کی کیفیت بیان کی کہ:

"ایک سوار صنعا سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا اور کسی کا ڈر نہ ہوگا یعنی ایک ایسا نظامِ عدل اور دورِ رحمت چھا جانے والا ہے اور ایسا پُر امن ماحول قائم ہونے والا ہے کہ آج جہاں ڈاکے پڑ رہے ہیں اور قتل ہو رہے ہیں، جہاں آدم زاد دن دہاڑے زمین سے اُچک لیے جاتے ہیں، اور جہاں کھلم کھلا عصمتیں ٹٹ رہی ہیں، وہاں مسافر کل تن تہنا اس سرزمین میں بے کھٹکے سفر کرے گا۔ کسی کو اس کی جان اُس کے مال اور اس کی عزت سے تعرض کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔ ایک بار حضور نے یوں بھی فرمایا کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا کہ مکہ کو بے نگہبان کے قافلہ جایا کرے گا۔"

نصب العین کا کتنا واضح اور اُجلا تصور ہے!

ایک مرتبہ عثمان بن طلحہ کلید بردارِ کعبہ سے حضور نے کعبہ کا دروازہ کھلوانے کے لیے کہا تو

سک سیرت ابن ہشام ج ۱ - ص ۳۱۴

۲۵. آیت ابی عبد اللہ جناب بن الارت - مندرجہ بخاری - ملاحظہ ہو: ریاض الصالحین - باب الصبر -

۲۶. آیت: تخافون ان ینخطفکم الناس (الانفال ۲۶) و آیت: وینخطف الناس من حولہم (العنکبوت - ۶۷)

۲۷. میر تقی میر - شبلی نعمانی ج ۲ - ص ۳ -

اس نے انکار کر دیا۔ بظاہر سخت ناسازگار مایوس کن حالات کے درمیان کھڑے ہو کر اس وقت حضور نے فرمایا۔ کہ ایک دن آنے والا ہے جب کہ یہ کٹنجی خود ہمارے ہاتھ میں ہوگی اور ہم جسے چاہیں گے تفویض کریں گے۔

عقبہ کے مقام پر انصارِ مدینہ سے جو تاریخی بیعتیں واقع ہوئیں ان کا مطالعہ کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ انصار تک نے اس سیاسی کشمکش کی وسعتوں کو سمجھ لیا تھا جو دعوتِ حق کے نتیجے میں نمودار تھی۔ اور جس کا فیصلہ آگے چل کر میدانِ جنگ میں ہونے والا تھا، ایک طرف انصارِ حضور کی حمایت میں سرخ و سیاہ سے معرکہ آرا ہونے کا پیمانہ باندھ رہے ہیں اور اپنے اشراف کی بلاکت اور مالوں کی تباہی کو لبیک کہتے ہیں۔ دوسری طرف حضور سے عہد لیتے ہیں، کہ جب یہ خبر آپ کو غلبہ عطا کر دے تو آپ ہمیں چھوڑ کر واپس نہ چلے آئیں گے۔ جنگ، قربانیاں، اور غلبہ۔ کیا ان تصورات میں وہ نصب العین نمایاں اور واضح نہیں ہے جو حضور کے سامنے تھا۔

ہجرت کی راہ میں قدم رکھنے سے پہلے جو دعا آپ کو سکھائی جاتی ہے اس دعا کا تیسری جز یہ ہے کہ **وَاجْعَلْ لِي مِنْ لَدُنْكَ سُنْطًا نَصِيرًا** حضور کو خدا سے سلطانِ نصیر کی طلب سکھائی گئی ہے۔ یعنی مقدس مشن کی پشت پناہی کرنے کے لیے اقتدار اور فرمازدائی درکار تھی۔

جناب ابوطالب پر جب حضور کی حمایت ترک کرنے کے لیے دباؤ ڈالا تھا، تو انہوں نے حضور سے گفتگو کی کہ میرے لیے مشکلات نہ پیدا کرو۔ اس پر حضور نے وہ مشہور جواب دیا تھا کہ خواہ یہ لوگ میرے دامنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب کیوں نہ لا کر رکھ دیں۔ میں اپنے مشن سے باز نہیں رہ سکتا۔ حضور نے اپنی بات ان الفاظ سے مکمل کی تھی کہ :

..... یہاں تک کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس مشن کو غالب کر دے گا، یا اس میں اپنی جان کھپا دوں گا۔

یہاں لفظ **يُتِمُّهُ** نہیں، **يُظَهِّرُهُ** استعمال فرمایا۔ جس میں کش مکش کا تصور شامل ہے

۱۵۸ ص ۱ - ج ۱ - تفسیر تفسیر اللدینہ - قسطلانی

۱۵۹ ملاحظہ ہو: سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۵۰، ۵۱ - زاد المعاد ج ۱، ص ۵۰، ۵۱۔

۱۶۰ القرآن - بنی اسرائیل (۸۰)۔

۱۶۱ سیرت ابن ہشام - ج ۱ ص ۲۷۸

اور آگے کا جملہ بتاتا ہے کہ کشمکش بھی ایسی ہے جس میں جان جوکھوں میں ڈالنے کا معاملہ ہے۔ مدنی دور میں عدی بن حاتم حاضر ہو کر حضور کی شخصیت کا جائزہ لیتا ہے۔ دعوت کی نوعیت سمجھنا چاہتا ہے۔ ناقدانہ نگاہ سے حضور کے اطوار کی جانچ کرتا ہے اور دل میں متاثر ہوتا ہے۔ اس کے طرز فکر کا لحاظ کرتے ہوئے حضور اس سے گفتگو کرتے ہوئے جہاں یہ بتاتے ہیں کہ عنقریب بابل کے سفید محلات اسلام کے تسلط میں ہوں گے عنقریب یہاں دولت کی ریل پیل ہوگی اور عنقریب مسلمانوں کی عدوی قوت بہت ہی بڑی ہوگی وہاں اسے اسلامی نظام عدل کی اس شان سے بھی آگاہ کرتے ہیں کہ عنقریب تم دیکھو گے کہ ایک عورت قادسیہ سے اونٹ پر تین تہا اس مسیٰ تک آنے کے لیے نکلی اور خیر دعائیت سے پہنچی۔

بظاہر بے سرو سامانی کے عالم میں سفر ہجرت کرتے ہوئے جو نگاہ مراقبہ کے بانظروں میں کسریٰ کے کنگن دیکھ لیتی ہے، کیسے یہ کہتے ہو کہ اسے اپنی دعوت کے منتہا اور اپنے تمدنی نصب العین کا پتہ نہ تھا! کیسے یہ سوچتے ہو کہ اسلامی ریاست بطور مقصد کے پیش نظر نہ تھی۔ اس کے لیے تیاریاں نہیں کی گئیں، اس کے لیے جدوجہد عمل میں نہیں آئی اور وہ اچانک بطور انعام حضور کی جماعت کو تفویض کر دی گئی۔ کہہ سکتے ہو تو یہ کہہ سکتے ہو کہ حکومت محض برائے حکومت مطلوب نہ تھی۔ کہہ سکتے ہو کہ حکومت ذاتی اقتدار اور دینوی فوائد کے حصول کے لیے مطلوب نہ تھی۔ مگر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اقامت دین کے لیے، عدل کے قیام کے لیے، انسانیت کی نجات کے لیے، معاشرہ کی تعمیر کے لیے بھی حکومت مطلوب نہ تھی!

درحقیقت حضور کے پیش نظر جہاں اعتقادی اور اخلاقی انقلاب تھا، وہاں پوری اہمیت کے ساتھ سیاسی انقلاب بھی تھا۔ جہاں فرد کی اصلاح مطلوب تھی، وہاں تمدن کی درستی بھی مقصود تھی۔ دوسرے لفظوں میں حضور نے انسان کو ایک اجتماعی وجود کی حیثیت سے سامنے رکھا۔ اور اس کی اصلاح اس کے جملہ تمدنی ربطوں سمیت کرنا چاہی۔ حضور نے انسان کو تمدن سے منقطع فرد کی حیثیت سے نہیں لیا اور اپنی دعوت اس کی بنی زندگی تک محدود نہیں رکھی۔ یہ حقیقت سامنے رکھیے اور حضور کے نصب العین کی پوری وسعت کو ذہن نشین کر لیجیے تو پھر واقعات سیرت میں پورا تسلسل دکھائی دینگا اور ہر واقعہ اور اقدام اور تدبیر کی توجیہ ہوتی جائے گی۔ بصورت دیگر نہ سیرت پاک کے اسرار کھکتے ہیں اور نہ قرآن مقدس کے نکات واضح ہوتے ہیں۔

## ایک دین — ایک تحریک !!

فلسفہ کا دائرہ ہمیشہ فکر کا دائرہ ہے۔ فلسفی کو عملی زندگی اور تاریخ کے مدد جزر سے براہ راست واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ واقعات و احوال سے نتائج تو نکالتا ہے۔ لیکن واقعات و احوال کا رخ بدلنے کے لیے کسی عملی جدوجہد میں حصہ نہیں لیتا۔ مذہب (مروجہ محدود معنوں میں) ذرا سا آگے بڑھتا ہے، وہ کچھ اعتقادات دینے کے ساتھ ساتھ فرد کو تمدن سے الگ کر کے اسے ایک اخلاقی تعلیم بھی دیتا ہے۔ لیکن مذہب کا راستہ نظام اجتماعی سے باہر باہر ہو کے گزرتا ہے اور وہ نہ سیاسی ہیئت سے کوئی تعرض کرتا ہے، نہ معاشرے کے ادارات میں کوئی جامع تبدیلی چاہتا ہے۔ اور نہ وقت کی قیادت کو چیلنج کرتا ہے۔ مذہب کی دعوت ہمیشہ وعظ کے اسلوب پر ہوتی ہے۔ واعظ نے نرم و شیریں انداز سے کچھ نصیحتیں کیں۔ اور اپنا راستہ لیا۔ اسے نہ اس کی فکر کہ اس کے مخاطب حالات کے کس قفس میں گرفتار ہیں۔ نہ اس کی پروا کہ کون سے طبقے اور عناصر کن اقدامات اور سرگرمیوں سے لوگوں کے ذہن و کردار کو کس رخ پر لے جا رہے ہیں، نہ اس طرف توجہ کہ روزمرہ حالات و واقعات کی رو کیا اثرات چھوڑ رہی ہے نہ یہی کاوش کہ میرے وعظ کے حق میں اور اس سے خلاف کیا کیا افکار و نظریات کس کس جانب سے کتنا اثر ڈال رہے ہیں نہ یہ پیش نظر کہ میرے مذہبی سانچے میں ڈھلنے والے متقی ترین افراد کیسے نظام تمدن کے پرنسے بنے ہوئے ہیں۔ کوئی اجتماعی نصب العین نہیں ہوتا۔ تبدیلی کا کوئی منصوبہ نہیں ہوتا۔ کسی سیاسی اور قائدانہ بصیرت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ زندگی کے ایک چھوٹے سے خانے میں جزوی نیکی پیدا کرنے کے لیے جو کچھ بن آیا کر دیا اور بقیہ وسیع دائرہ میں بری اپنا جھنڈا اطمینان سے لہراتی رہے۔ کسی اللہ والے کو اس سے کیا مطلب!

حضورؐ نہ تو ایک فلسفی تھے کہ محض چند اونچے اور گہرے خیالات دے دیتے، اور واقعاتی احوال سے تعرض نہ کرتے، اور نہ ایک واعظ تھے۔ جو اجتماعی فساد سے آنکھیں بند کر کے محض فرد کو مخاطب بناتے اور ٹھنڈے اور میٹھے وعظ سنایا کرتے اور نتائج پر سرے سے سوچا ہی نہ کرتے۔ انسانیت کے اس محسن نے پورے تمدنی شعور کے ساتھ حیات انسانی کی کامل تبدیلی پیش نظر رکھی۔ ان قوتوں اور عناصر کو پہچانا جو نظام حیات پر حاوی تھیں۔ اس تبدیلی کی نظر دکھا جو جاہلی تمدن کی گاڑی چلا رہی تھی۔ اسے دلائل کے ساتھ دعوت بھی دی۔ اس پر تنقید بھی کی اور اسے چیلنج بھی کیا۔ تاریخ کے دھارے پر نگاہ رکھی۔ حالات و واقعات کی ایک ایک



لہر پر توجہ دی۔ ہر واقعے کو قائدانہ بصیرت اور سیاسی شعور کے ساتھ دیکھا کہ وہ کس پہلو سے اصلاح کی ہم کے لیے مفید پڑتا ہے۔ اور کس پہلو سے خلاف جاتا ہے۔ معاشرے کے مجملہ عناصر پر توجہ رکھی کہ دعوت کے لیے کس موقع پر کس سے کیا امیدیں کی جاسکتی ہیں۔ اپنی قوت اور رفتار کو حریفوں کی قوت و رفتار کے مقابل میں ملحوظ رکھا۔ ہر اقدام کے لیے صحیح ترین وقت کا انتظار صبر سے کیا اور جب موزوں گھڑی آگئی تو جرات سے قدم اٹھا دیا۔ راستے عام کے ہر مدور رہا کامل فہم حاصل کیا اور مخالفین کے ہر پروپیگنڈے کا مقابلہ کر کے ان کے اثرات کو توڑا۔ شعر اور خطابت کے مخالفانہ محاذ قائم ہوئے۔ تو ان کے جواب میں اپنے شعراء اور خطیبوں کو کھڑا کیا۔ اپنے اصولوں کی کڑی پابندی کی مگر آنکھیں بند کر کے نہیں، بلکہ احوال و ظروف کو دیکھا وقت کی مصلحتوں کو سمجھا اور حکیمانہ نقطہ نگاہ اختیار کیا۔ جہاں قدم آگے بڑھانے کا موقع ملا۔ آگے بڑھایا۔ آگے بڑھنا جب موزوں نہ دیکھا تو قدم روک لیا۔ دو بلائیں سامنے آ گئیں تو ایک سے بچ کر دوسری کا مقابلہ کیا۔ جنگی کارروائی کی ضرورت پڑی تو دریغ نہیں کی۔ مصالحت کی راہ ملی تو دست صلح بڑھا دیا۔ اور پھر کمال یہ کہ اس ساری جدوجہد میں خدا پرستی کی روح اور اخلاقی اقدار کا نہ صرف تحفظ کیا بلکہ ان کو مسلسل نشوونما دی۔ اس پورے نقشہ کار اور اس پورے طریق کار کو اگر قرآن اور سیرت پاک کے اوراق سے اخذ کر کے سامنے رکھیے تو وہ فرق بین طور پر معلوم ہو جائے گا۔ جو مذہب اور دین میں، وعظ و انقلابی دعوت میں، انفرادی تزکیہ اور تمدنی تحریک میں ہوتا ہے۔

حضور نے چونکہ ایک مکمل دین کو برپا کرنے کے لیے تحریک برپا کی تھی، اس لیے آپ نے ایک ایک کر کے سلیم الفطرت انفراد کو تلاش کیا۔ پھر جس کے سینے میں بھی کلمہ حق کی شمع روشن ہو گئی اسے ایک تنظیم میں پرو دیا۔ اس کی تربیت کی۔ اسے اپنے ساتھ کشمکش کی بھٹی میں ڈالا۔ اور پھر جس مرحلے میں جتنی منظم قوت حاصل تھی، اسے اپنی قیادت کے تحت جاہلی نظام کے خلاف معرکہ آراء کیا۔ فکری میدان میں بھی۔ سیاسی میدان میں بھی۔ اور بالآخر جنگ کے میدان میں بھی!

جو لوگ حضور کے گرد جمع ہوئے ان کو آپ نے صوفی اور درویش نہیں بنا دیا، راہبوں اور بزرگیوں کے نقشے پر نہیں ڈھالا، بدی سے بھاگنے اور غالب قوتوں سے خوف کھانے اور دولت و اقتدار سے مرعوب ہونے والی ذہنیت انھیں نہیں دی۔ وہ لوگ بھولے بھالے اور معذورانہ شان کے زہا

نہیں تھے۔ وہ جری اور بے باک، باشعور اور بصیرت مند، خوددار اور غیور، ذہین اور زیرک، فعال اور متحرک، پیش رو اور تیزگام تھے۔ وہ پادریوں اور سادھوؤں کے سے انداز نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ کارفرما بننے کی صلاحیتوں سے آراستہ تھے۔

بہترین فطرت کے لوگ بہترین تربیت پا کر، بہترین تنظیمی رشتے سے بندھ کر اور بہترین قیادت کے ہاتھوں میں جا کر ایک ناقابل شکست قوت بن گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں نے ایک چھوٹی سی اقلیت میں ہونے کے باوجود سارے عرب کی عظیم ترین اکثریت کو اپنے ساتھ لے لیا۔ جب مکہ میں جماعت اسلامی کی تعداد چالیس تھی۔ تو مکہ اور اردگرد کی آبادیوں میں اس تعداد نے ایک ہمہ وقتی مدد جزر پیدا کر دیا۔ اور پھر برسوں تک گھر گھر اور کوچہ کوچہ اگر کوئی موضوع گفتگو تھا تو وہ حضور کی دعوت اسلامی تھی۔ مدینہ میں جا کر ابھی تحریک اسلامی کے علم برداروں کی تعداد چند سو سے زیادہ نہ تھی کہ غیر مسلم اکثریت کے علی الرغم اسلامی ریاست کی نیو ڈال دی گئی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضور کی جماعت کا طرز یہ نہیں تھا کہ پہلے سارا عربی معاشرہ اسلام قبول کر لے یا اس کی اکثریت کی اصلاح ہو جائے تو پھر جا کر نظام اجتماعی کی تاسیس کی جائے۔ نہ نقطہ نظر یہ تھا کہ بس دعوت دیتے رہو، خیالات و اعتقادات کی اصلاح کرتے رہو، بالآخر ایک صالح نظام خود بخود برپا ہو جائے گا۔ یا بطور انعام اللہ تعالیٰ حق کو غلبہ دے دیں گے۔ وہاں تاریخ کی یہ حقیقت سامنے تھی، کہ عوام کی بھاری اکثریت جمود میں پڑی رہتی ہے، اور معاشرے کا ایک قلیل عنصر فعال ہوتا ہے۔ جس میں سے ایک حصہ اصلاح یا انقلاب کی دعوت کا علمبردار بنتا ہے اور ایک حصہ مزاحمت کرتا ہے۔ اصل بازی اسی فعال عنصر کی دونوں صفوں کے درمیان ہوتی ہے۔ اور اس کا جب فیصلہ ہو جاتا ہے تو پھر عوام خود بخود حرکت میں آتے ہیں۔ یہ شعور پوری طرح کارفرما تھا کہ عوام کے راستے میں جب تک ایک فاسد قیادت حائل رہتی ہے اور ان کی زندگیوں کو بگاڑنے کی مہم جاری رکھتی ہے یا کم از کم ان کو جمود میں ڈالے رکھتی ہے، وہ نہ کسی دعوت کو بڑے پیمانے پر قبول کر سکتے ہیں نہ اپنی عملی زندگیوں میں تبدیلی لاسکتے ہیں۔ خود دعوت پر لبیک کہنے والوں کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ فاسد قیادت کے بنائے ہوئے گندے ماحول میں اپنی زندگی کو حد کمال تک سنوار سکیں۔ بلکہ اُلٹا اگر تبدیلی برپا ہونے میں بہت زیادہ تاخیر ہو تو بسا اوقات اس مقام کو برقرار رکھنا بھی کٹھن ہو جاتا ہے۔ جس پر داعیان حق لمبی محنت سے پہنچتے ہیں۔ کیونکہ مخالف حالات سمجھیے دھکیلنے کے لیے پورا

زور صرف کر رہے ہوتے ہیں پس کس اجتماعی تحریک کے لیے راہ عمل یہی ہوتی ہے کہ وہ معاشرے کے فعال عنصر میں سے سلیم الفطرت افراد کو چھانٹ کر جتنی زیادہ سے زیادہ قوت جمع کر سکتی ہو اسے کشمکش میں ڈال کر مقابل کی قیادت کا محاذ توڑ دے۔ تاریخ گواہ ہے کہ تمام انقلابات فعال اقلیتوں کے ہاتھوں واقع ہوئے ہیں۔ معاشرے کے فعال عنصر میں سے تعمیر و اصلاح کی دعوت چونکہ نسبتاً زیادہ سلیم الفطرت افراد کو کھینچتی ہے ان میں ایک مثبت جذبہ بیدار کرتی ہے، اور ان کی تربیت کر کے ان کی اخلاقی قوت کو بڑھا دیتی ہے اس لیے مقابل میں رہ جانے والا طبقہ شراقتدار، مال و جاہ اور کسی قدر عادی کثرت رکھنے کے باوجود مقابلہ میں ذک اٹھاتا ہے معرکہ بدر۔ اس کا ایک نمایاں ثبوت ہے پس جب حضورؐ کے گرد عربی معاشرہ کے فعال عنصر میں سے سلیم الفطرت افراد کی اتنی تعداد جمع ہو گئی کہ وہ اخلاقی قوت سے سرشار ہو کر جاہلی قیادت اور اس کے حامیوں کا مقابلہ کر سکے تو حضورؐ نے اپنے سیاسی نصب العین کی طرف کوئی ضروری قدم اٹھانے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔

فتح مکہ کا اصل مفہوم یہی ہے کہ اس موقع پر جاہلی قیادت کا پوری طرح خاتمہ ہو گیا اور اس رکاوٹ کے ہٹتے ہی عوام صدیوں پرانے جوثے سے آزاد ہو کر دعوتِ حق کو لبیک کہنے کے لیے از خود آگے بڑھنے لگے۔

تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں ہے کہ فاسد قیادت کے زیر سایہ کوئی نظامِ فلاح پنپ سکا ہو اور بغیر سیاسی کشمکش کے محض وعظ و تبلیغ اور انفرادی اصلاح کے کام سے اجتماعی انقلاب نمودار ہو گیا ہو۔ ورنہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں خلافتِ راشدہ کے بعد وعظ و ارشاد، تبلیغ و تذکیر، تعلیم و تزکیہ کے عنوان سے عظیم الشان مساعی، مساجد، مدارس اور خانقاہوں کے ادارات کے تحت عمل میں آتی رہی ہیں اور آج بھی علماء و صوفیاء، اصحابِ درس اور اربابِ تصانیف زبان و قلم سے جتنا کام کر رہے ہیں اس کی وسعت حیران کن ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ اس حدِ مطلوب تک افراد کا تزکیہ ہو سکا ہے اور نہ کبھی معاشرہ کی اتنی اصلاح ہو سکی ہے جس کے نتیجے میں اجتماعی نظام بدل جائے۔ اور محمد رسول اللہؐ کا انقلاب دوبارہ رونما ہو سکے۔ صاف ظاہر ہے کہ طرزِ فکر اور نقشہ کار اور نظریہ انقلاب میں کوئی بڑا جھول ہے وہ جھول یہی ہے کہ قیادت کی تبدیلی کے لیے سیاسی کشمکش کیے بغیر افراد کو نظامِ تمدن سے منقطع کر کے دعوت کا مخاطب بنایا جاتا رہا ہے۔

لوگ جب یہ کہتے ہیں کہ دین کی اقامت اور اسلامی نظام کا برپا ہو جانا تو اصل مطلوب نہ تھا۔ اور یہ محض انعام خداوندی کے طور پر لیکاریک بیج میں آنیو دار ہوا تو وہ حضور کے کارنامے اور آپ کی جدوجہد کی سحت ناقدری کرتے ہیں اور حضور کی قائدانہ بصیرت اور سیاسی عظمت پر غبار ڈال دیتے ہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ اس ہستی نے کتنی تنگ و دو کر کے تاریخ کے مختلف عناصر کو چن بیاہ کے اندر اندر دستوری معاہدہ کے تحت جمع کیا۔ کس عرق ریزی سے ارد گرد کے قبائل سے حلیفانہ تعلقات قائم کیے۔ کس مہارت سے مٹھی بھر مسلمانوں کے بل پر ایک مضبوط فوجی نظام اور طلا یہ گروہی کا سلسلہ قائم کیا۔ کس کاوش سے قریش کی تجارتی شاہراہ کی ناکہ بندی کر لی۔ کس عزیمت کے ساتھ قریش کے خنجر برآں کا مقابلہ کیا۔ کس زیرکی سے یہود اور منافقین کی سازشوں کی کاٹ۔ کس مہارت سے مدینہ کا معاہدہ باندھا کس ہمت سے یہود کے مراکز فتنہ کی بیخ کنی کی۔ کس بیدار مغزی کے ساتھ شہر شریںد قبائل کی علاقائی شورشوں کی سرکوبی کی۔ اس سارے کام میں قائدانہ بصیرت، سیاسی مہارت اور مضبوط حکمت عملی کے جو حیرت ناک شواہد پھیلے ہوئے ہیں ان سے لوگ کس طرح صرف نظر کر لیتے ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ سب کچھ خدا کا انعام تھا بالکل ٹھیک ہے لیکن اس معنی میں کہ ہر بھائی خدا کا عطیہ و انعام ہوتی ہے تاہم انسانوں کو کوئی انعام ملتا جھپی ہے کہ وہ اس کے بیسے ضروری محنت عقل و بصیرت کے ساتھ کر دکھائیں۔ اقامت دین کو خدا کا انعام کہہ کہ اگر کوئی شخص رسول خدا کی جدوجہد، جانفشانی، حکمت و بصیرت اور سیاسی شعور کی نفی کرنا چاہتا ہے تو وہ بڑا ظلم کرتا ہے۔

بدقسمتی سے حضور کے کارنامے کا سیاسی پہلو اتنا اوجھل رہ گیا ہے کہ آج حضور کی دعوت اور نصب العین کا صحیح تصور باندھنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس پہلو کو جب تک پوری سیرت میں سامنے نہ رکھا جائے وہ فرق سمجھ میں آہی نہیں سکتا، جو محدود مذہبیت اور دین کے وسیع تصور میں ہے۔ حضور پورا دین لائے تھے۔ حق کی بنیادوں پر ساری زندگی کا نظام قائم کرنے آئے تھے۔ خدا کے قوانین کو عملاً جاری کرنے آئے تھے۔ اس لیے ہمیں یہ شعور ہونا چاہیے کہ حضور جامع اور وسیع معنوں میں تمدنی اصلاح اور انسانیت کی تعمیر نو کی تحریک چلانے آئے تھے۔ اور اس تحریک کو چلانے کے لیے بہترین قائدانہ بصیرت اور اعلیٰ درجہ کے سیاسی شعور سے آپ کی ہستی مالا مال تھی۔ جس طرح کسی اور پہلو میں حضور کا کوئی ہمسر نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح سیاسی قیادت کی شان میں بھی آپ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ جس طرح آپ زندگی کے ہر معاملہ میں اسوہ و نمونہ ہیں۔ اسی طرح سیاسی جدوجہد کے لیے

بھی آپ ہی کی ذات ہمیشہ کے لیے اسوہ و نمونہ ہے۔

حضور کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے نیکی کی دعوت دی۔ نیکی کے غلبہ کے لیے جدوجہد کی۔ اور نیکی کا ایک مکمل نظام قائم کر دیا۔ یہ کام مذہب کے محدود تصور کے دائرے میں سما نہیں سکتا۔ یہ دین تھا یہ تحریک تھی !!

زندگی کی ہم آہنگی :

محسن انسانیت کی مقدس تحریک نے انقلاب لاکر جو نظام زندگی قائم کیا اس کی امتیازی شان یہ تھی کہ اساسی کلمہ کی روح زندگی کے تمام شعبوں میں یکساں سرایت کیے ہوئے تھی۔ پورے تمدن میں ہم آہنگی تھی۔ سارے ادارے یک رنگ تھے۔ جس خدا کی عبادت مسجد کی چار دیواری میں ہوتی اسی کی اطاعت کھیت اور بازار میں بھی ہوتی تھی۔ جو قرآن نماز میں پڑھا جاتا تھا اسی قرآن کے قانون کے ذریعے عدالت میں معاملات کے فیصلے ہوتے تھے۔ جو اخلاقی اصول گھروں کی محدود فضاؤں میں کارفرما تھے۔ وہی بین الاقوامی دائرہ ربط میں بھی چھائے ہوئے تھے۔ جن صدائقوں کی تعلیم منبر سے دی جاتی تھی۔ انہی صدائقوں پر حکومت کا نظم و نسق چلتا تھا۔ جو اعتقادات افراد کے ذہن نشین کرائے جاتے تھے وہی اعتقادات اجتماعی بیٹوں پر بھی غالب تھے۔ جو طرز فکر نظام تعلیم میں کام کرتا تھا اسی کے مطابق پوری ثقافت تشکیل پا رہی تھی۔ جو رمضانے الہی نماز روزہ میں مطلوب تھی، وہی میدان جنگ میں تیر کھانے اور تلوار چلاتے ہوئے بھی مطلوب تھی۔

یہ ایک ایسا نظام تھا جس میں پوری انسانی زندگی ایک ہی خدائی ضابطہ ہدایت کے تحت تھی۔ اور مختلف دائروں میں مختلف اقتدار اور ضابطے نہیں چلتے تھے۔ اس نظام میں تضاد نہ تھے۔ اس کے اجزاء آپس میں ٹکرانے والے نہ تھے۔ اس کے مختلف عناصر میں الجھاؤ نہ تھا۔ اس میں کوئی پیوند کاری نہیں کی گئی تھی۔ اسے معجون مرکب نہیں بنایا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تحت انسان نے جس رفتار سے ترقی کی اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

## انقلاب کی روح :

انسانیت کی شاید سب سے بڑی بد نصیبی یہ رہی ہے کہ جس کسی کو بھی برسر قوت آنے کا موقع تاریخ میں ملا ہے۔ تلوار کے زور سے، سازش کے بل پر، جمہوری انتخاب کے راستے سے یا کسی اتفاقی حادثے کے تحت — اسی کو اپنے متعلق پر زعم ہو گیا ہے کہ وہ نوع انسانی کا معلم اور زندگی کا مصلح بھی ہے۔ ایسے مبلغین و مسبین کے ہاتھوں میں جب اقتدار کا لمٹھ آجاتا ہے تو وہ

عقل کل بن بیٹھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بہترین مفکر سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ ہر سرچشمہ علم سے بے نیاز ہو کر اور معاشرہ کے بہترین زیرک اور حساس عناصر کو برطرف رکھ کر اندھا دھند محیر العقول اقدامات کرنے لگتے ہیں جن میں سے ہر اقدام ایک خوف ناک حادثہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ تشدد کے ہتھیاروں سے انسان کو انسان بنانا چاہتے ہیں اور زندگی کی پیٹھ پر کوڑے برس برس کرنا اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ بسا اوقات اصلاح و انقلاب کے ایسے مدعیوں کو سرے سے انسان کی فطرت کا پتہ نہیں ہوتا۔ انہیں زندگی کے بناؤ اور بگاڑ کے موجبات کا مبتدیانہ علم بھی نہیں ہوتا۔ انہوں نے کبھی یہ کاوش ہی نہیں کی ہوتی کہ انسان کو انسانیت سکھانے کے صحیح طریقے کیا ہیں اور بگاڑ کا سرچشمہ کہاں واقع ہے اور اس کی اصلاح کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے۔ اور اس کی تکمیل کہاں جا کے ہوتی ہے۔ وہ سابق تجربات سے فائدہ اٹھاتے بغیر اپنا تجربہ الف با سے شروع کرتے ہیں۔ وہ مشورہ و تنقید کے دروازے بند کر دیتے ہیں تاکہ ان کا کوئی خیر خواہ اور انسانیت کا کوئی محبت ان کے مہلک تجربہ کی تکمیل میں رکاوٹ نہ ڈال سکے۔ ان کے پاس ہر دور کی ایک ہی دوا ہوتی ہے۔ جبر و تشدد! سخت ترین قوانین بنانا، نت نئے کرے احکام جاری کرنا، عوام الناس کے چاروں طرف قد غنیں کھڑی کر دینا اور پھر ان کی تواضع بار بار اپنے غیظ و غضب کے تازیانے سے کرتے رہنا۔

محسن انسانیت نے جو انقلاب برپا کیا اس کی روح تشدد کی روح نہ تھی، محبت و خیر خواہی کی روح تھی۔ حضور انسانیت کے لیے حد درجہ رحم دل تھے اور انبائے آدم کے ساتھ آپ کو سچا پیار تھا۔ اپنی دعوت کی نوعیت کو آپ نے مثال دے کر سمجھایا۔ کہ تم لوگ پروانوں کی طرح آگ کے گڑھے کی طرف پکتے ہو اور میں تم کو کمر سے پکڑ پکڑ کر بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ قرآن نے اسی لیے آپ کو پیغامبر رحمت قرار دیا۔ ذرا اس حقیقت پر غور کیجیے کہ وہ ہستی اتنا عظیم انقلاب آتی ہے مگر تشدد سے کام لینے کی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی، مدینہ حضور کی دس سالہ زندگی میں سنگین درجے کی ایمر جنسی کے زیر سایہ رہا ہے۔ برآن حملے کا خطہ رہتا، قریش نے تین بار بڑے بڑے حملے کیے، چھوٹی چھوٹی جھڑپوں اور سردی آویزشوں کے واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے، متفق قبائل مدینہ پر دھاوا بولنے کے لیے کبھی ادھر سے سہرا اٹھاتے کبھی ادھر سے، بار بار ہلاک گردی کرنے، درختوں کی سرکوبی کے لیے مدینہ سے فوجی دستوں کی تزیین ہوتی۔ راتوں کو فوجی پہرہ لگایا جاتا۔ غصینہ ایک جنگی کیمپ کی سی زندگی تھی۔ اس پر مستزاد یہود اور منافقین کی سازشیں تھیں۔ جنگ کی سازشیں اسلامی معاشرہ کو پھاڑ دینے اور مختلف عناصر کو ٹکڑا دینے کی سازشیں، حضور کی قیادت کو ناکام کرنے

کی سازشیں، اور پھر اس زندگی بخش ہستی کو قتل کر دینے کی سازشیں ایمر جنسی کا اس سے بڑھ کر اور کیا عالم ہو سکتا ہے۔ مگر حضورؐ نے نہ کبھی اپنے لیے کوئی مستبدانہ اختیار حاصل کیا، نہ کوئی ہنگامی آرڈی نینس جاری کیا۔ نہ کوئی جابرانہ ایکٹ نافذ کیا، نہ کسی ایک فرد کو نظر بندی میں ڈالا نہ کوئی ہنگامی عدالتیں بٹھائیں، نہ تازیانے برسا کر لوگوں کی کھال اُدھیر پی۔ نہ جرمائے اور تاوان ڈالے۔ نہ کسی شہری پر کوئی بار خدائی قانون سے تجاوز کر کے ڈالا۔ نہ اختلاف اور تنقید کا حق سلب کیا۔ نہ کسی کی زبان بندی کی۔ اور نہ کسی پر پابندی عائد کی۔ حتیٰ کہ عبداللہ بن اُبی جیسے فتنہ پرداز تک سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ سارا دار و مدار اپنی دعوت کی صداقت اور اپنے کردار کی پاکیزگی پر رکھا۔ کبھی کسی پر دھونس نہیں جمائی، کبھی رعوت نہیں دکھائی۔ کبھی کسی کی انسانیت کی تحقیر نہیں کی۔ کبھی اکڑیوں سے کام نہیں لیا بلکہ دوسروں کی — جو درحقیقت کمزور اور بے بس تھے — رعوتوں کو صبر سے برداشت کیا۔ یہی وجہ تھی کہ دشمنوں کے دل مسخر ہو جاتے تھے۔ ساتھ آنے والے دید و دل فراش راہ کرتے تھے۔ مخالفت کرنے والے اپنے آپ کو پست اور ذلیل محسوس کرتے تھے۔ اور پھر جب حضورؐ کی صداقت و شرافت کے آگے سر جھکا دیتے تھے تو ان میں ایسی تبدیلی آتی تھی کہ گویا کایا کلپ ہو گئی۔

حضورؐ کے سینے میں خدا کی جو محبت کار فرما تھی اسی کا دوسرا روپ یہ تھا کہ حضورؐ انسانیت سے گہری محبت رکھتے تھے۔ اس محبت انسانی کا اگر ہم اندازہ کرنا چاہیں جو محسن انسانیت کے سینے میں کار فرما تھی۔ تو ہم اس واقعہ سے کر سکتے ہیں کہ وہی مکہ جس کے باسی جنگ کی تلوار لیے آپ کے مقابلے میں کھڑے تھے۔ اس پر قحط کا زمانہ آتا ہے تو آپ غلہ کی رسد جاری کراتے ہیں۔ اور اسی شہر کے عزباء کے لیے پانچ سو اشرفی نقد بھجواتے ہیں۔ آپ کی محبت انسانی کا اندازہ ہم اس واقعہ سے بھی کر سکتے ہیں کہ بدر کے قیدیوں کی کراہیں گوش مبارک تک پہنچیں تو حضورؐ کی نیند اڑ گئی۔ اور آپ اس وقت تک آرام سے سو نہ سکے۔ جب تک کہ اُن کے بندھن ڈھیلے کر کے انہیں آرام نہ پہنچا دیا گیا۔ آپ کی محبت انسانی کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ بنو ہوازن کے چھ ہزار قیدی ایک اپیل پر حضورؐ کے اشارے سے رہا کر دیے جاتے ہیں۔ اور پھر آپ کی محبت انسانی کا اندازہ کرنا ہو تو فتح مکہ کے موقع پر اس کا عظیم الشان مظاہرہ دیکھیے۔ انسانیت کا محسن مکہ میں کامل فاتحانہ شان سے داخل ہوتا ہے۔ اور اس کے خلاف بیس برس تک لڑنے والے دشمن اس کے سامنے بے بس ہو کر کھڑے ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ایک ایک واقعہ کا انتقام لیتا۔ قتل عام

کا حکم جاری کرتا۔ اور خون کی ندیاں بہا دیتا۔ گشتوں کے پشتے لگائے بغیر نہ ملتا۔ وہ لوگ عرفاً، قانوناً  
 اخلاقاً ہر لحاظ سے مجرم تھے اور دین و سیاست دونوں پہلوؤں سے گرد زدنی۔ مگر اس لمحے حضور  
 کی محبت انسانی اُبھرتی ہے اور قریش کے منالہ کی ساری تاریخ پر خطِ عفو پھیر کر کہتی ہے کہ  
 لا تثریب علیکم الیوم اذہبوا انانکم اطلتہاء!! اٹھا ان کی تالیفِ قلب کے لیے  
 حضور ان کو مال و دولت عطا کرتے ہیں اور ان کو ذلیل اور مسترد کرنے کے بجائے ان کو ذمہ داریاں  
 سونپتے ہیں اور گلے لگا لیتے ہیں۔ حضور پر یہ حقیقت روشن تھی کہ جو انقلاب انتقام پر اُتر آتا  
 ہے۔ وہ اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔ اور جو انقلاب عفو اور دلبری سے کام لیتا ہے وہ دشمنوں  
 کو رام کرتا ہے اور مزاحمت کرنے والوں کو خادم بنا لیتا ہے۔

یہ قریش کا ذوقِ تشدد تھا جس کے تحت اُنھوں نے محسنِ انسانیت کو مجبور کر دیا کہ ان  
 کی تیغِ خونِ آشام کی دھار توڑ دی جائے اور جنگ کے سر آ پڑنے پر حضور نے نظامِ حق کے  
 بچاؤ میں پوری طرح بازی لگا دی۔ حضور کی محبتِ انسانی نے جنگی پالیسی اور دفاعی تدابیر  
 ایسی نکالیں کہ کم سے کم جانی نقصان، اور کم سے کم خون بہے، نیز حضور نے کڑا انتہام کیا کہ  
 میدانِ جنگ میں بھی انسانیت کا احترام برقرار رہے۔

محبتِ انسانی کی ایسی روشن اور وسیع مثال کسی دوسرے انقلاب میں نہیں ملتی حضور  
 کا انقلاب خاص تعلیمی انقلاب تھا۔ اور اس کی اساس بنی آدم کی خیر خواہی پر تھی۔

## نبی انسان :

بے شمار اصلاحی اور تعمیری اور انقلابی تحریکیں ہمارے سامنے ہیں۔ مگر ان میں سے  
 ہر ایک نے انسان کو جوں کا توں رکھ کر خارجی نظام کو بدلنے کی تدبیریں کی ہیں۔ لیکن ہر وہ  
 تبدیلی حقیقی مسائلِ حیات کو حل کرنے کے لحاظ سے بالکل رائیگاں رہی جو انسان کو اندر سے  
 نہیں بدل سکی۔ محسنِ انسانیت کے کارنامہ کا مہوت کر دینے والا یہ پہلو بڑا ہی اہم ہے کہ  
 انسان اندرون سے بدل گیا اور یکسر بدل گیا۔ انسانی روپ میں جو خواہش پرست حیوان پایا  
 جاتا تھا کلمہ حق کے اثر سے وہ بالکل مٹ گیا اور معاً اس کی راہ سے خدا پرست اور با اصول  
 انسان اُبھر آیا۔ اس نئے انسان کے کردار کی درخشانی دیکھیے تو آنکھوں میں چکا چوند آ جاتی ہے  
 حضرت عمرؓ جیسا مکہ کا ایک میخوار نوجوان بدلا تو کہاں پہنچا! فضالہ میں تبدیلی آئی تو کس شان  
 سے آئی! ذوالبجادیں کو دیکھیے کہ کس طرح دوست و آسائش کو لات مار کے درویشانہ زندگی



اختیار کرتا ہے! حضرت ابوذرؓ کو لیجیے کہ کیا انقلابی جذبہ ہے کہ کعبہ میں کھڑے ہو کر جاہلیت کو چیلنج کیا۔ اور خوب مار کھائی۔ کعبہؓ بن مالک کا کردار دیکھیے، ابو خثیمہؓ کا رنگ ملاحظہ فرمائیے۔ بُئینہؓ اور سمیہؓ جیسی کنیزوں کی انقلابی شجاعت و عزیمت پر نگاہ ڈالیے، ماعز بن مالک اسلمی اور غامدیہ پر توجہ کیجیے۔ نجاشی کے دربار میں جعفرؓ طیار کی جرأت سے سبق لیجیے۔ ایرانی سپہ سالار کے دربار میں ربیعؓ بن عامر کی شانِ استغنا سے روح اخذ کیجیے — اور تاروں کے اس جھرمٹ میں سے کون ہے جس کا ایمان لمعہ افگن نہیں ہے۔

ان ہستیوں سے وہ معاشرہ بنا اور ایسے قائدین اور کارکنوں کے ہاتھوں وہ نظامِ حق چلا جس نے اگر بندشِ شراب کی منادی کی تو ہونٹوں سے لگے ہوئے پیالے فوراً الگ ہو گئے اور بہترین شرابوں کے مٹکے گلیوں میں لندھا دیے گئے۔ جس نے اگر عورتوں کو سر و سینہ ڈھانپنے کا حکم دیا تو حکم ملتے ہی کسی تاخیر کے بغیر دوپٹے اور اوڑھنیاں بنالی گئیں، جس نے اگر جہاد کے لیے پکارا تو نو عمر لڑکے تک ایڑیوں پر کھڑے ہو ہو کر یہ کوشش کرتے دکھائی دیے کہ وہ لوٹائے جانے سے بچ جائیں جس نے اگر چندہ طلب کیا تو جہاں حضرت عثمانؓ جیسے دولت مند تاجروں نے سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کی قطاریں لالا کر کھڑی کر دیں اور حضرت ابو بکرؓ جیسے فزائیوں نے گھر کی ساری متاع تحریک کے قدموں میں ڈال دی۔ وہاں ایسے مزدور بھی تھے جنہوں نے دن بھر کی مزدوری سے حاصل شدہ کھجوریں جنگی فنڈ میں دے کر دامن جھاڑ دیا۔ جس نے اگر مہاجرین کی بحالی کے لیے انصار کو پکارا تو انھوں نے اپنے مکان اور کھیت اور باغ آدھوں آدھ بانٹ دیے اور اخوت کا ایک بے مثل سماں پیدا کر دیا جس نے اگر عمودوں کو خدمت کی روح سے بالاتر کر کے سول سروس کے لیے کارکن طلب کیے تو ایک دم روز کے قلیل معاوضے پر گورنری کے فرائض انجام دینے والے حکام دنیا کے سامنے نمودار ہوئے۔ جس نے اگر مالِ غنیمت کو سپہ سالار کے پاس جمع کرانے کا حکم دیا، تو اس شان سے تعمیل کی گئی کہ فوج ایک ایک سوٹی اپنے افسر کو پیش کر دیتی تھی۔ اور یہ واقعہ ہمیشہ تاریخ میں درخشاں رہے گا۔ کہ مدائن کے اموال کا ایک قیمتی حصہ عامر نامی سپاہی کے ہاتھ آتا ہے۔ اور بغیر اس کے کہ کسی کو بھی اس خزانہ زرد و جواہر کا علم ہو، وہ رات کی تاریکی میں چپکے سے اپنے سردار تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ ہستیاں تھیں جنہوں نے نیکی کا ایسا ماحول تیار کیا کہ جس میں شاذ و نادر ہی جرائم ہوتے تھے اور حضورؐ کے پورے وہ سالہ دور میں گنتی کے مقدمات عدالتوں میں آئے۔ یہ نیکی کا ایسا ماحول تھا جس میں کوئی سی آئی ڈی نہیں

رکھی گئی۔ بلکہ لوگوں کے ضمیر ہی ان کے پاس بان اور نگران بن گئے۔

یہ تھا وہ انقلاب جس نے باہر کے نظام کے ساتھ ساتھ اندر سے انسانی قلب و ذہن کو بدلا اور نیا کردار پیدا کر دیا۔ اسی لیے وہ حقیقی اور بنیادی مسائل حیات کو حل کرنے میں کامیاب ہوا اور اس کے ذریعے وقت کے تمدنی بحران میں راہ نجات پیدا ہوئی۔

### محسن انسانیت کا عظیم ایثار :

یہ انقلاب اس لحاظ سے بھی لاجواب ہے کہ اُسے برپا کرنے والے نے اگرچہ بے انتہا قربانیوں سے اس کی تکمیل کی، لیکن اس نے کوئی صلہ اور عوضانہ نہیں لیا۔ اپنا سب کچھ انسانیت کی بھلائی کے لیے دے دیا اس نے اتنا کچھ بھی نہیں لیا جتنا اگر لیا جاتا تو عقلاً، شرعاً، عرفاً ہر طرح جائز اور روا ہوتا۔ اتنے بڑے کارنامے پر ذاتی غرض و لوٹ کا خفیف سا دھیہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ہے کوئی اس کی مثال؟

معاشی لحاظ سے دیکھیے کہ حضور نے اپنی کامیاب تجارت قربان کی۔ اس سے حاصل شدہ سہرا پہ اپنے مشن پر بچھا دیا اور جب کامیابی کا دور آیا تو دوست کے ڈھیر اپنے ہاتھوں سے صرف اور تقسیم کیے مگر اپنے گھر کے لیے فقر و فاقہ اور سادہ سی گزران کا عالم پسند کیا۔ اپنے گھر والوں کے لیے کوئی امر و نہی نہیں چھوڑا، کوئی جائداد نہیں بنائی اور ان کے کوئی بالائے ترالی حقوق قائم نہیں کیے۔ اور ان کے لیے کسی عہدے کی مستقل موروٹی گدی نہیں چھوڑی۔ دربان اور خادم بھرتی نہیں کیے، سواریاں جمع نہیں کیں کوئی سامان آرائش گھر میں پسند نہیں کیا۔

سیاسی لحاظ سے دیکھیں۔ تو اپنے لیے کوئی ترجیحی حقوق حاصل نہیں کیے۔ کسی کے خلاف خدا کے احکام و حدود سے تجاوز کر کے کوئی اختیار استعمال نہیں کیا۔ اپنا سیاسی مقام اونچا کرنے کے لیے کوئی من مانا قانون جاری نہیں کیا۔ مدینہ میں شدید امیر جنسی موجود رہی اور یہود و منافقین کی نٹ نٹی شرارتوں سے سابقہ رہا۔ مگر کسی کو نظر بند نہیں کیا۔ کسی پر پابندیاں نہیں لگائیں کوئی ضمیر کش احکام نافذ نہیں کیے۔ ہنگامی عدالتیں نہیں بٹھائیں اور لوگوں کی چمڑی تازہ یالوں سے نہیں ادھیڑی۔ بخلاف اس کے لوگوں کو تنقید اور رائے زنی کا حق دیا۔ اختلاف کرنے کی آزادی دی اپنے اعلیٰ مشوروں کو قبول نہ کرنے کا حق بھی دیا۔ یہ حقوق محض کاغذ پر لکھے ہوئے نظری حقوق نہ تھے۔ بلکہ لوگوں نے ان حقوق کو عملاً استعمال کیا۔ بسا اوقات حضور نے اپنی قیمتی رائے ترک کر کے اختلافی رائے قبول فرمائی۔ اگر کسی کو کوئی رعایت دینا چاہی تو جماعت سے اجازت طلب کی۔ مثلاً ایسے داماد جناب

ابو العباس قیدی بن کر آئے تو ان کے ندیہ میں حضرت زینب نے وہ ہار بھیجا جو حضرت خاریجہ کی بہن تھیں۔ اس ہار کی واپسی کے لیے حضور نے مجلس عام میں اپیل کی۔ اسی طرح ان کا مال بطور غنیمت لایا گیا تو وہ جماعت کی اجازت سے واپس آیا۔ جعرانہ کے مقام پر معرکہ حنین کے قیدیوں کو چھوڑنے کے لیے ایک وفد آیا جس نے حضور کی رضاعی قرابت کا واسطہ دلا کر اپنی درخواست پیش کی۔ قیدی تقسیم ہو چکے تھے۔ حضور نے ثوبان کے حصے کے قیدی چھوڑنا تو بطور خود منظور کیا لیکن بقیہ کے لیے فرمایا کہ مجمع عام میں مسلمانوں سے درخواست کرو، لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ حضور نے اپنے خاندان کے حصے کے قیدی چھوڑ دیے ہیں تو سب نے قیدیوں کو رہا کر دیا۔ ایسے معاملات میں حضور نے کبھی بھی دباؤ اور جبر سے کام نہیں لیا۔

سماجی اور مجلسی لحاظ سے دیکھیے تو اپنے لیے مسادات پسند کی۔ امتیاز پسند نہیں کیا۔ نہ کھانے پینے، رہن سہن، لباس اور وضع قطع میں کوئی غیر معمولی پن رکھا، نہ مجالس میں نمایاں مقام پر نشست پسند کی۔ نہ یہ مرغوب تھا کہ لوگ تعظیم کے لیے کھڑے ہوں اور نہ آقا اور سردار اور اسی طرح کے القاب احترام استعمال کرنے کی حوصلہ افزائی کی۔ جنگ اور سفر میں بھی، خندق کی کھدائی میں بھی اور مساجد کی تعمیر میں بھی اپنے رفقا کے ساتھ مل کر مٹی ڈھونے، گارا اٹھانے، پتھر توڑنے اور لکڑیاں چننے کے کام اپنے دست مبارک سے سرانجام دیے۔ قرصخواہوں کو عالم واقعہ میں اپنے خلاف درستی سے تقاضا کرنے کا اذن دیا۔ اپنے آپ کو مجلس عام میں انتقام کے لیے پیش کیا کہ جس کسی کے خلاف مجھ سے کوئی زیادتی ہوئی ہو تو وہ مجھ سے اپنا بدلہ لے لے۔

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

محسنِ انسانیت کا یہ مقدس انقلاب تھا جس کے ہم پاسبان بنائے گئے تھے۔ یہ پیغام تھا جس کے لیے ہمیں شہداء علی الناس اور امت وسط ہونے کے بلند ترین منصب پر فائز کیا گیا تھا، یہ تھا کلمہ حق جس کی امانت ہمیں اس لیے تفویض کی گئی تھی کہ حضور کی نیابت میں ہم قیامت تک انسانیت کے نجات دہندہ بنیں اور جب بھی زندگی اپنے مسائل میں الجھ جائے اور تمدن بحران میں گھر جائے، تو ہم اس کے لیے سہارا بنیں لیکن ہم نے اس کلمہ حق کی مشعل کو بلند رکھنے میں کوتاہی کی اور اس نظام حق کا اپنے ہاتھوں ستیاناس کر کے رکھ دیا۔ نتیجہ یہ کہ دورِ حاضر کا قافلہ فکر بھٹک کے غلط موڑ مڑا، تو ہم اپنا فرض ادا کرنے کے اہل نہ تھے۔ اور ہماری ہی کوتاہیوں کا کرشمہ ہے کہ آج پوری حیاتِ انسانی بحران کا شکار ہے۔ متضاد مادہ پرستانہ نظریات کی آویزش

ذہنی سکون کو بر باد کر رہی ہے۔ عالمی قیادت خدا ناسخاتوں کے ہاتھ میں ہے اور ہم خود تہی طاقتوں کے در یوزہ گرن کے رہ گئے ہیں۔ حالات کی ٹھوکر پی سہیں بیدار نہیں کر سکیں۔ ذلتیں اور نامر ادیاں ہمارے اندر احساس ندامت ابھار نہیں سکیں۔ عالم اسلام کا انتشار اور انسانیت کا بحران اسی کرنے کے اصل کام پر توجہ نہیں دلا سکا۔

آؤ سوچیں اور جائزہ لیں کہ انسانیت تاریخ کے کس مہلے سے گزر رہی ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں ؟

اس کتاب کے مؤلف نے اپنے مختصر سے دور عمر میں اپنے آپ کو بھی، اپنے قریبی ماہوں کے اہلئے نوع کو بھی، اور اس سے آگے گزر کر دنیا بھر کے انسانوں کو بھی مسلسل ایک پریشانی، ایک اضطراب، ایک تنگی، ایک تشویش اور ایک خوف کی رستہ میں گرفتار دیکھا ہے۔ گھروں سے لے کر بین الاقوامی تنظیموں تک ہر جگہ بدگمانی، کھچاؤ، کشمکش اور تصادم کا سماں سامنے آیا ہے۔ اس پورے دور میں تاریخ ایک ہنڈیا کی طرح ابال کھاتی رہی ہے اور اس ہنڈیا کے کھولتے ہوئے پانی میں اپنے جیسے کروڑوں انسانوں کے اہوہ کے ساتھ خود کو بھی مہر یا چاول کے ایک دانے کی مانند زیر و زبر ہوتے پایا ہے۔ جس انسانی دنیا سے اب تک سابقہ رہا ہے وہ دو عالمی جنگوں کے درمیان پس کر اور بے شمار علاقائی جنگوں کے چر کے کھا کھا کر، بھی سنبھلنے بھی نہیں پائی کہ ایک اور قیامت خیز جنگ، کی توار اس کے سر پر لہرائی دکھائی دے رہی ہے۔ اس مختصر سے دور میں توڑ پھوڑ کے بے شمار ہنگامے نظارے گزرے، بار بار انقلابوں کے بھونچال آتے رہے، سلطنتوں کو ابھرتے اور مٹتے دیکھا۔ نظریات کی لہروں کی آویزش دیکھی۔ سازشوں کی سرنگین چھپتی اور پھپھتی دیکھیں۔ علاقوں کے ٹکڑے ہوتے دیکھے۔ انسانی گلوں کو اجڑ چڑھ کر نسل مکانی ارنے دیکھا۔ خود پرنسپل ہندو پاک میں بین صبح آزادی کے ظہور کے ساتھ بالکل اپنے سے سے موج خون گزرتی دیکھی۔ اور اس موج خون میں انسانی جانوں، عسکتوں اور آبروؤں اور قیمتی روایات و اقدار کو غرق ہوتے دیکھا۔ موجودہ عالمگیر مادہ پرستانہ تمذیب کے نا ہر فریب پردوں کے پھپھے جھانڈ کر انسانیت کا جائزہ لیجیے۔ تو وہ حال نزار سامنے آتا ہے کہ روح کا نپ باقی ہے۔ پوری اولاد آدم کو چند خوب بات نے اپنے شکنجے میں کس یا ہے اور ہر طرف دولت و اقتدار کے لیے ہاتھا پائی ہو رہی ہے۔ آدمیت کے اخلاقی شعور کی مشعل کل ہے۔ جرائم تمدنی ترقی نے ساتھ ساتھ تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ نفسیاتی الجھنوں کا نذر ہے اور ذہنی سکون یکسر غائب ہو چکا ہے۔ انسانی ذہن دگردار میں ایسا بنیادی فساد آ گیا ہے کہ

زندگی کا کوئی گوشہ اس کی منحوس پرچھائیں سے محفوظ نہیں رہا۔ فلسفہ و حکمت سے سچائی کی روح کھو گئی ہے۔ اعتقادات و نظریات میں توازن نہیں رہا۔ روحانی قدریں چوپٹ ہو چکی ہیں۔ قانون روح عدل سے خالی ہو رہا ہے۔ سیاست میں جذبہ خدمت کی جگہ اعراض پرستی گھس گئی ہے۔ معیشت کے میدان میں ظالم اور مظلوم طبقے پیدا ہو گئے ہیں۔ فنون لطیفہ میں جمال کی ساری رنگ آمیزیاں جنسی جذبوں اور سفلی خواہشوں سے کی جانے لگی ہیں۔ تمدن کے سارے عوامل میں چپہ چپہ پر تضادات اُبھر آئے ہیں جن کے درمیان تصادم برپا ہے۔ اور پوری تاریخ ایک خوفناک ڈرامے میں بدل گئی ہے۔ عقل ترقی کر گئی ہے مگر اس کی حماقتیں ہمارے درپے آزار ہیں۔ علم کے سوتے اُبل رہے ہیں۔ مگر اسی کی پروردہ جہالتوں کے ہاتھوں آدم زاد کا ناک میں دم ہے۔ دولت کے خزانے ہر چہار طرف بکھرے پڑے ہیں۔ مگر خاکی مخلوق بھوک، ننگ اور محرومی کے عذاب میں گھری ہے۔ ہزار گونہ تنظیمیں اور سیاسی ہتتیں، نظریاتی وحدتیں اور معاہداتی رابطے نمودار ہیں۔ مگر انسان اور انسان کے درمیان بھائی بھائی کا سا تعلق نہیں۔ چیتے اور بھیڑیے کا سا معاملہ ہے۔ عقلی، سیاسی، اخلاقی اور تہذیبی شعور کی ترقی کے چرچے ہیں، مگر ظلم اور تشدد کے انتہائی ناپاک حربے آج بھی انسانیت کے خلاف کام میں لائے جا رہے ہیں۔ تاریخ ایک وسیع اکھاڑا ہے جس میں کہیں امپیریلزم اور حریت پسندی کے درمیان، کہیں کمیونزم اور سرمایہ داری کے درمیان، کہیں جمہوریت اور آمریت کے درمیان کہیں فرد اور اجتماعیت کے درمیان اور کہیں مغربیت اور ایشائیت کے درمیان ایک خونخوار آویزش ہو رہی ہے۔

ایسی ہے یہ دنیا جس میں ہم اپنی زندگیاں گزار رہے ہیں!

مصنوعی سیاروں اور میزائلوں کے اس دور میں سائنس الہ دین والے روایتی چراغ کے جن کی طرح مادی قوتوں کے نئے نئے خزانے انسان کے ایک ایک اشارے پر ہم پہنچا رہا ہے۔ قدرت کے سر بستہ رازوں کے ازلی قفل حکمت کی کنجی سے کھل رہے ہیں ہیبت ناک رفتار میں انسان کو زمان و مکان پر وسیع تصرف دلا رہی ہیں، جوہری توانائی نے تباہ کار دیووں کے لشکر انسان کے سامنے مسخر کر کے کھڑے کر دیے ہیں۔ جو بس ایک اشارہ ابرو کے منتظر ہیں۔ دوسری طرف خود اس انسان کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ شیطانی اور تخریبی قوتوں کے پنجے میں پہلے سے زیادہ بے بس دکھائی دیتا ہے، جو بار بار اسے اپنے ہی خلاف محشر آرا کرتی رہی ہیں۔ اور جنہوں نے ہر دور تاریخ میں اس کے عظیم تعمیری کارناموں اور اس کے شاندار تمدنوں کو خود اسی کے ہاتھوں ملیا میٹ کر لیا ہے۔

فدا کسی ایسے کارواں کا تصور کیجیے جو کسی پہاڑ کی چوٹی پر ڈیرہ ڈالے اور زربفت کے نیچے نصب کر کے کھانے پینے، رقص و موسیقی اور شعر و شراب میں مگن ہو، اس کے پاس کاروباری اموال کے انبار ہوں، اس کے ساتھ روپے سے بھری ہوئی تھیلیاں ہوں، جانوروں اور سوار یوں کی کثرت ہو، اس کے اسلحہ چمکدار اور اس کا پہرہ مضبوط ہو — لیکن عین اس کے قالینوں اور بستروں اور مسندوں کے نیچے کی زمین میں چند فٹ کی گہرائی پر خوف ناک لاوا کھول رہا ہو۔ اور تھوڑا ہی وقفہ اس میں باقی ہو کہ پہاڑ پھٹ پڑے۔ اور آگ کا طوفان اُٹنے لگے۔ کچھ ایسا ہی حال ہمارے قافلہ تمدن کا ہے۔ جو موجودہ لمحہ تاریخ کی پہاڑی پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ اس پہاڑی کے سینے میں ہولناک ترین بحران کا لاوا کھول رہا ہے۔

ہمارے سامنے مشیت عالمی بحران کا چیلنج ایسے کھڑی ہے وقت کے راستہ پر چھپے بھاگنے کا امکان نہیں۔ چیلنج کا جواب دینے کی صلاحیت موجودہ مادی تہذیب اور اس کے بنائے ہوئے انسان میں نہیں ہے۔ کوئی نیا فلسفہ نہیں اُبھر رہا ہے جو کم سے کم ایک چھلاوے کی طرح وقتی طور پر ہی سرمایہ اطمینان بن سکے — کسی طرف کوئی راہ نجات کھلتی نظر نہیں آتی۔

اضطراب کے اس لمحے میں جب میں چاروں طرف نگاہیں گھاتا ہوں تو تاریکی کا ایک سمندر شش جہت سے محاصرہ کیے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ اس سمندر میں دور — تیرہ صدی کی دُوری پر — ایک نقطہ نور دکھائی دیتا ہے۔

یہ انسانیت کے سب سے بڑے محسن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کی مشعل ہے! وہی مشعل جس کی روشنی کو خود ہم نے — محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیاؤں نے — اپنے افکار پریشان اور اپنے اعمال پر اگندہ کے غبار میں گم کر رکھا ہے!!

### مطالعہ سیرت کا نقطہ نظر :

میرے نزدیک سیرت پاک کے مطالعہ کا ایک ہی مقصود ہے — حضور کے پیغام کی مشعل ہمارے سامنے اور پوری انسانیت کے سامنے ایک بار پھر نورِ پاش ہو اور ہر فائدہ زندگی ددرِ حاضہ کی تاریکیوں میں اسی طرح جادہ فلاح کا سراغ پالے جس طرح اسے چھٹی صدی عیسوی کے بحران سے نجات پانے کا راستہ ملا تھا!

بدقسمتی سے سیرت نبوی کا مطالعہ ہمارے ہاں اس اسپرٹ اور اس نقطہ نظر سے کم ہو رہا ہے۔ جس سے ہونا چاہیے۔ ہماری دلچسپی اس میدان میں یوری طرح یہ نہیں رہی کہ ہمیں وہاں

سے ایک نقشہ زندگی حاصل کر کے اپنے آپ کو اس کے سانچے میں ڈھالنا ہے بلکہ بعض دوسری دپسپیاں بیچ میں آگئی ہیں اور روز بروز بڑھ رہی ہیں۔

بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ساری دلچسپی مجرد حصولِ ثواب کے لیے رکھتے ہیں (اس سے انکار نہیں کہ حضور سے قرب کی ہر کوشش خدا کی بارگاہ میں پسندیدہ ہے اور اس پر اجر کی توقع رکھنی چاہیے۔ لیکن ایسی کوشش کا اولین مدعا زندگی کو سنوارنا بھی تو ہو، دھوم دھام سے میلاد کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ اور اس اعتقاد سے کی جاتی ہیں کہ ان مجالس میں حضور کی روح پر نور جلوہ گر ہوتی ہے اور اپنے پیروؤں کی محبت کے مظاہروں کو دیکھ دیکھ کر خوشنود ہوتی ہے۔ شیرینی کے طشت، پھولوں کے گجرے اور ہار، قوالی اور نعت خوانی کے اہتمام، اگر بتیوں اور لوبان کی خوشبوؤں کے مرغولے، قمقموں اور فانوس کی لمعہ پاشیاں، یہ سب کچھ اسی اعتقاد کے ترجمان ہیں۔ سیرت نبوی سے اس انداز کی عقیدت جو نقشہ سامنے لاتی ہے۔ وہ کسی انسان کا نقشہ نہیں۔ گوشت پوست سے بنے ہوئے کسی آدم زاد کی شخصیت نہیں بلکہ ہم ایک فوق الانسان ہستی سے متعارف ہوتے ہیں جس کا پیکر نور سے ڈھلا ہے جس کے جسم کا سایہ نہیں جس کے کارنامے میں سارا پارٹ معجزوں کا ہے، جو عالم اسباب کے قوانین سے بالاتر ہے جس کے سارے کام فرشتے سرانجام دیتے ہیں اور جس کی ہر بات، اور ہر چیز پر اسرار ہے۔ انکار نہیں کہ ابنائے نوع کے مقابلہ میں حضور کا روحانی و اخلاقی پایہ بدرجہا بلند ہے۔ وہاں بہت سی فوق العادت چیزیں بھی ملتی ہیں، وہاں معجزے بھی ہیں اور وہاں فرشتے بھی حرکت کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر بہر حال وہ پاک زندگی ایک انسان کی زندگی ہے اور اس کی عظمت کی اساس ہی یہ ہے کہ ایسی لامثال زندگی ایک انسان نے پیش کی۔ وہاں قوانین فطرت اور نوامیس تاریخ و مدنیت ہی کے دائرے میں سارا کام ہوتا ہے اور کامیابی کی راہ کے ایک ایک چپے پر قربانیاں پیش کی جاتی ہیں۔ وہ ایک انسان کی زندگی ہو کہ ہی ہمارے لیے اسوہ بنتی ہے اور اسی کے تصور کے ساتھ ہم اس سے اکتساب کر سکتے ہیں۔ اس سے عزم و ہمت کا درس لے سکتے ہیں۔ اس سے اصول کی پابندی اور فرض شناسی کا سبق سیکھ سکتے ہیں، اس سے انسانیت کی خدمت کا جذبہ اخذ کر سکتے ہیں۔ اور اس سے بدی کی طاقتوں کے خلاف معرکہ آرا ہونے کے لیے ایک تڑپ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں۔ سیرت نبوی کو اگر تم معجزہ بنا دو گے اور اگر اسے فوق الانسانی کارنامے کا رنگ دے دو گے تو پھر مٹی کے بنے ہوئے انسانوں کے لیے اس میں نمونہ کیا رہے گا۔ ایسی ہستی کے سامنے ہم مرغوب اور حیرت زدہ تو ہو سکتے ہیں، اس کا

ہوتی پر تو اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے اس سے ہم عقیدت تو رکھ سکتے ہیں اس کا اتباع نہیں کر سکتے چنانچہ جہاں جہاں عقیدت مندی کا یہ خاص رنگ پہنچا ہے وہاں جتنا جتنا یہ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ عملی زندگیوں اتباع نبوت سے اتنی ہی آزاد ہوتی جاتی ہیں۔ بلکہ اس حالت پر بے گناہانہ معاشی اور معاشرتی جرائم کے میکرے میں جو لوگ خم کے خم لندھاتے ہیں۔ وہ اس سستے طرز سے مظاہرہ عقیدت کر کے اپنے مضطرب ضمیر کو اطمینان دلاتے ہیں کہ یہ ”کچھ بھی ہیں، لیکن ترے محبوب کی امت نہیں ہیں“

دوسری طرف مغرب سے ایک دوسرا رجحان آگھسا ہے جسے اعظم پرستی کہا جاتا ہے۔ یہ رجحان اپنی اصل روح کے اعتبار سے قوم پرستانہ جذبات کا ترجمان ہے۔ ایک طرح کا قومی تفاخر ہے جو دوسروں کے سامنے ماضی کی نمایاں شخصیتوں کا مظاہرہ کراتا ہے۔ یہ رجحان گویا یہ کہتا ہے کہ دیکھو ہمارے پاس ایسی اور ایسی بستیاں ہیں، ہماری تاریخ میں اتنے اتنے بڑے پائے کے بزرگ ہو گزرے ہیں اور ان کے یہ یادگار کارنامے ہیں جن کے ہم وارث ٹھہرے ہیں اور جو ہمارے لیے سرمایہ افتخار ہیں۔ اس رجحان کی علامت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ کھوکھلا ہوتا ہے اس کے تحت ہر قوم متعدد شخصیتوں کے ایام وفات، ایام پیدائش اور دوسرے یادگاری دن بڑے ٹھاٹھ سے مناتی ہے مگر یہ ایام کہیں بھی ان شخصیتوں سے استفادہ کا ذریعہ نہیں بنتے۔ انسانیت کے جن نمونوں کو ہر صدی تفاخر دوسروں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا کوئی پر تو پیش کرنے والوں کی اپنی زندگیوں میں دکھائی نہیں دیتا اور نہ کبھی اس پر تو کو اخذ کرنے پر توجہ ہوتی ہے اس رجحان کے تحت حضور کی یاد تازہ کرنے کے لیے جو تقاریر منعقد ہوتی ہیں کہنے کو تو ایک خاص طرح کی باتیں ہمیشہ کہی جاتی ہیں مگر زندگی پر ان کا کوئی اثر نمودار نہیں ہوتا۔

تیسرا غلط نقطہ نظر وہ ہے جو حضور کے پیغام کو ایک نظام حیات کا پیغام نہیں سمجھتا بلکہ ایک مذہب کا پیغام قرار دیتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے جو لوگ متاثر ہیں ان کا تصور یہ ہے کہ حضور بس چند اعتقاد، چند رسوم عبادات، چند اوراد و وظائف چند اخلاقی سفارشیں اور چند فقہی احکام پہنچانے آئے تھے اور آپ کا منشا ایسے افراد پیدا کرنا تھا۔ جو شخصی طور پر مسلمانی کی شان پیدا کر کے ہر گندے سے گندے نظام کے لیے بہترین کارکن ثابت ہوں۔ ایسا عنصر حضور سے بس طہارت نماز روزے نوافل و اذکار اور انفرادی اخلاق کی حد تک اکتساب فیض کرتا ہے۔ لیکن تمدنی زندگی کے وسیع تر معاملات میں وہ پوری شان بے حسنی کے ساتھ ہر باطل کے کام آتا ہے اور ہر فساد کے ساتھ سازگاری



کر لیتا ہے۔ اس عنصر نے گویا سیرتِ نبویؐ کی مقدس کتاب کے بے شمار ذریعے ابواب کو فراموشی کی سرزمین میں دفن کر دیا ہے اور بس ایک مقدمہ کی فصل کو لے کر اسی میں کھو گئے ہیں۔ اس عنصر نے اب تک حضورؐ کی جو ترجمانی کی ہے اس سے متاثر ہو کر دورِ حاضر کی کوئی غیر قوم تو کجا، خود تعلیم یافتہ نوجوان مسلم تک یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حضورؐ ان کے لیے قافلہ سالار تمدن بھی ہو سکتے ہیں اور ان کی بارگاہ سے تازہ ترین کٹھن مسائل کا کوئی اطمینان بخش حل بھی مل سکتا ہے یہ نقطہ نظر بھی حضورؐ کی ہستی کے لیے ایک مقدس حجاب بن گیا ہے۔

یہ غلط نقطہ ہائے نظر پنپ اس لیے رہے ہیں کہ فضا ان کے لیے سازگار ہے۔ فضائیوں سازگار ہے کہ جس نظام سیاست و تمدن اور جس ہیئت معیشت و معاشرت سے ہم دوچار ہیں اسے ایک خاص نقشے کا انسان دکا رہے، اس مشین کو خاص ڈھنگ کے پرزوں کی ضرورت ہے۔ وہ بالکل دوسری ہی سیرت افراد میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا کام ایک اور ہی طرز کے ذہن و کردار سے چلتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں عملی زندگی کو سرے سے اس نونہ انسانیت کی ضرورت ہی نہیں ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پیش کرتی ہے اور اس منڈی میں اس متاع فکر و عمل کی مانگ ہی نہیں ہے۔ جو آنحضورؐ کی زندگی سے اخذ کیا جاسکتا ہے موجودہ دنیا کا اجتماعی نظام جس طرز کے وزیر اور حکام جج اور وکیل، لیڈر اور صحافی، سپہ سالار اور سپاہی، کو تو ال اور پیادے، تحصیل دار اور پٹواری، ڈپٹی کمشنر اور نمبردار، زمیندار اور مزارع، مصنف اور ادیب اور عام قلی اور مزدور مانگتا ہے ان کا نقشہ انسانیت اس سے بالکل متضاد قسم کا ہے جس کا مظاہرہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریخ کے ایٹج پر فرمایا۔ چھائے ہوئے نظام کی مانگ کے مطابق گھر گھر میں ماؤں کی محبت کی گودیں اور باپوں کی شفقت کی نگاہیں اولادوں کو پال رہی ہیں۔ اس کی ضروریات کا لحاظ رکھ کر ادارہ ہائے تعلیم و تربیت بیس بیس سال تک ایک ایک فرد پر صرف کر کے کام کے پُرزے بنا رہے ہیں، اور اسی کے تقاضوں کے تحت ہر صاحب شعور خود اپنے ذہن و کردار کو ایک خاص شکل دینے میں ساری عمر مصروف رہتا ہے۔ یہ نظام جن جن چیزوں کو پسند کرتا ہے انہی کو معاشرہ اپنے افراد میں از خود پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور یہ جن جن چیزوں کو حقارت و کراہت سے دیکھتا ہے ماحول کی پوری طاقت ان کو مٹانے کے درپے رہتی ہے۔ یہ نظام جس بولی کو پسند کرتا ہے زبانیں آپ سے آپ اسی بولی کو بولنے لگتی ہیں۔ یہ جس لباس کو پسند کرتا ہے وہ لباس از خود زیب بدن ہونے لگتے ہیں، یہ ایک اشارہ کرتا ہے تو قدیمی حیا دار گھرانوں کی بوہٹیوں کے چہروں سے نقابیں اٹھ جاتی ہیں۔ عزت کی روش وہ ٹھہرتی ہے

جسے مروجہ نظام راسخ کرنا چاہیے۔ اور ذلت کا طرز وہ قرار پاتا ہے جسے چلتا ہوا تمدن ناپسند کرے۔ جن فنون کو یہ پسند کرتا ہے وہ ذریعہ مقبولیت بنتے ہیں اور جن مشاغل کو یہ مسترد کرتا ہے وہ نذر تغافل ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنی اقدار خود بناتا اور تمام افراد سے انہیں منواتا ہے۔ اور دوسری تمام روایات، اقدار اور شعائر کو مرجھا جانا پڑتا ہے۔ کچھ حمیت دار افراد اور خاندان ماحول کے جبری دھارے کے خلاف زور کرتے ہیں۔ مگر معاشی محرومی، ثقافتی پس ماندگی اور احساس کہتری کا دباؤ اتنا سخت ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیراک مضمحل ہو کر اپنے آپ کو ماحول کے حوالے کرتے جاتے ہیں۔ وہ ان کی اگلی نسل ہمت چھوڑ بیٹھتی ہے۔ اب ایک دنیا کی دنیا جو اپنی سیرت کی تشکیل شعوری طور پر بھی اور غیر شعوری طور پر بھی ماحول کے منشا کے مطابق کرنے میں لگن ہے۔ وہ سرورِ عالم کی سیرت پر کتابیں اگر لکھے اور پڑھے گی اور وعظ سنائے اور سنے گی تو اسوۂ حسنہ کا ذوق لوگوں کے اندر آئے گا کہاں سے؟

سچی بات یہ ہے کہ سیرت نبوی میں ان لوگوں کے لیے کوئی پیغام ہے ہی نہیں جو کسی غیر اسلامی نظام سے یہ بات بنا رکھنا چاہتے ہوں اور جن کے مفاد کے سودے کسی باطل سے چک گئے ہوں۔ یہ لوگ سیرت پڑھ کر سردھنتے ہوں گے۔ ان کو ذہنی حظ ملتا ہو گا۔ ان کی معلومات میں اضافہ ہو گا۔ لیکن ان میں یہ تحریک کہاں سے آئے گی کہ وہ اس سیرت کے سانچے میں زندگی کو ڈھالیں۔ ان کا جمود کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی داستانِ حیات رستم و سہراب کا قصہ نہیں، الف بیلہ کی کہانی نہیں اور کسی خیالی کردار کا افسانہ نہیں، اس کا مقام یہ سرگز نہیں کہ اسے ہم علم و ادب کی تفریحی چوپال کا محض ایک سرمایہ رونق بنائیں، اس کی قدر و قیمت اجازت نہیں دیتی کہ ہم اسے محض ذہنی لذت حاصل کرنے کے لیے استعمال کریں۔ اس کا احترام روکنا ہے کہ ہم اسے مجرد قومی تفاخر کے جذبہ کی تسکین کا ذریعہ بنائیں۔

یہ مختلف غلط نقطہ ہائے نظر ہمارے یہاں مل جل کر کام کر رہے ہیں اور یہی اصل مقصد میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔ کون شمار کر سکتا ہے کہ ہر سال کتنی مجالس میلاد اور جلسہ ہائے سیرت ہمارے ملک میں منعقد ہونے ہوں گے؟ ایک بیچ الاؤل ہی کے ہینے میں کتنے وعظ اور کتنی تقریریں ہوا ہیں لہریں اٹھا دیتی ہوں گی؟ کتنے مقالے اور کتابیں لکھی جاتی ہوں گی؟ کتنے جرائد کے خاص نمبر اس موضوع پر شائع ہوتے ہوں گے؟ شعراء کتنی نعمتیں لکھتے ہوں گے۔ اور قوال ان کو کہاں کہاں گاتے پھرتے ہوں گے؟ اکابر کی طرف سے کتنے ہی پیغامات اور بیانات نشر ہو جاتے ہوں گے؟ دعوتوں اور رضیافتوں کی کیسی

کچھ بہت ستر خواتین پر آتی ہوں گی؛ باز اردوں کو سجانے اور دروازے اور محرابیں بنانے میں کتنا کچھ کھپا دیا جاتا ہوگا؟

لیکن دوسری طرف یہ بھی ذرا سوچیے کہ ایک اچھے مقصد پر قوتوں اور روپے کے اس صرف کا واقعی نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ جائزہ کی ترازو کے ایک پلڑے میں اپنی ایک سال کی ان سرگرمیوں کو رکھیے۔ اور دوسرے پلڑے میں حاصل شدہ نتائج کو رکھ کر جانچیے کہ کیا وزن ٹھیک نکلتا ہے؟ کتنے افراد ہونگے جو ان نیک مساعی کی بدولت سیرت نبوی کے سانچے میں اپنی زندگیاں ڈھالنے کی ہم میں ہر سال لگ جاتے ہوں گے؟ اگر ایک جلسے اور ایک مقالے اور ایک نعت کے ذریعے صرف ایک ہی آدمی بدلا ہوا تو اندازہ کیجیے کہ گزشتہ دو سو سال کا کیا حاصل ہونا چاہیے تھا۔ اور اگر عملاً حاصل وہ نہیں ہے تو کہیں ہماری مساعی میں کوئی کوتاہی موجود ہے اور وہ کوتاہی بڑی بنیادی قسم کی ہے۔ رونا اسی کا نہیں کہ وہ کچھ حاصل نہیں ہو رہا جو مطلوب ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ماتم اس کا ہے کہ ہمارے پتے وہ کچھ پڑ رہا ہے جو محض انسانیت کے پیغام اور کارنامے سے کھلم کھلا ٹکراتا ہے۔ ہمارے اندر آج ایسے عناصر پروان چڑھ رہے ہیں جو حضور کے مشن کو زمانہ حال کے لیے ناکارہ اور حضور کے عطا کردہ نظام زندگی کو ناقابل عمل قرار دیتے ہیں، ایسے عناصر جو حضور کی تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہیں، ایسے عناصر جو سیرت اور سنت اور حدیث کا سارا ریکارڈ دریا برد کر دینا چاہتے ہیں، ایسے عناصر جو قرآن کو قرآن پیش کرنے والی ہستی کی ۲۳ سالہ جدوجہد اور لازوال تحریکی کارنامے سے بے تعلق کر دینا چاہتے ہیں۔ اور حضور کی ہستی کو بطور عملی نمونہ انسانیت کے ہماری نگاہوں سے گم کر دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ تعبیر و تاویل کے نام پر ہمارے ہاں یہ کوشش ہو رہی ہے، کہ حضور کی شخصیت، پیغام اور کارنامے کو موجودہ فاسد تہذیب کے فکری سانچے میں ڈھال دیا جائے اور محسن انسانیت کی بالکل نئی تصویر عالمی طاقتوں کے ذوق کے مطابق تیار کر دی جائے۔

میرا حاصل مطالعہ و تحقیق یہ ہے کہ ہم نے مطالعہ سیرت کا صحیح بنیادی نقطہ نظر گم کر دیا ہے اور اُدپر کے غلط نقطہ ہائے نظر کارفرما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سردارِ دو عالم کی محبت و عقیدت

۱۔ آہستہ آہستہ نبی اکرم کی یادگار تقریبوں میں سرت و تفریح اور کھیل تماشوں کا عنصر بہت بڑھتا جا رہا ہے بلکہ کھلے کھلے ہنگامہ ہائے فسق و فجور بھی عمل میں آنے لگے ہیں یعنی معاشرہ ٹھیک اس پیغام کے الٹی سمت چل پڑا ہے جو سیرت میں مضمر ہے۔

کے بے شمار مناسرا موجود ہونے کے باوجود اور سیرت پر دماغی کاوشیں صرف ہونے کے باوجود ہماری تاریخ کے افق سے وہ نیا انسان طلوع نہیں ہو رہا جس کا نمونہ کامل حضور نے پیش فرمایا تھا۔

حضور کی سیرت ہمارے اندر بجز اس کے کسی طرح جلوہ گر نہیں ہو سکتی کہ ہم اسی نسب <sup>العین</sup> کے لیے ویسی ہی جدوجہد کرنے اٹھیں جس کے لیے حضور کی پوری زندگی کو ہم وقف پاتے ہیں۔ وہی جدوجہد اپنے ڈھب کی سیرت پیدا کرنے کا ذریعہ ہی ہو سکتی ہے اور سیرت ہی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ایک فرد کی سیرت نہیں ہے، بلکہ وہ ایک نیا نیا وقت کی داستان ہے۔ جو ایک انسانی پیکر میں جلوہ گر ہوئی۔ وہ زندگی سے کئے ہوئے کسی اور زندگی کی داستان نہیں ہے جو کنارے پیٹھ کر محسن اپنی انفرادی تعبیر میں مصروف رہا ہو۔ بلکہ وہ ایک ایسی سیرت ہے جو اپنی جہت سے اجتماعی تحریک کی روح رواں تھی۔ وہ محسن ایک نشان کی نمونہ بلکہ ایک نیا نیا زمانہ کی روداد ہے۔ وہ عالم نو کے معمار کے کارٹے پر تفصیل اپنے اندر بیٹے ہوئے ہے۔ سرور عالم کی سیرت غارِ حرا سے لے کر غارِ ثور تک، حرم کعبہ سے لے کر طائف کے بازار تک، مہماتِ نبویہ کے حجروں سے لے کر میدان ہاتے جنگ تک چاروں طرف پھیلی ہوئی۔ ہر اس کے نقوش بے شمار فردوں کتاب حیات کے اوراق کی زینت ہیں: ابو بکر و عمر و عثمان، علی، عمار و یاسر، خالد و خولید و دیگر صحابیہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) سب کے سب ایک ہی کتاب سیرت کے اوراق ہیں۔ ایک چمن کا چمن ہے کہ جس کے لالہ گل اور زگس و نسترن کی ایک ایک پتی پر اس چمن کے مالی و زعفران مرقوم ہے۔ وہ ڈانڈ بہاری وقت کی جس سر زمین سے گزرا ہے اس کے ذرے ذرے پر نعمت کی نہریں ثبت کر گیا ہے۔

دنیا کی اس بلند ترین شخصیت کو اگر سیرت نگاری میں مجرد ایک فرد کے پیش کیا جائے اور سیرت نگاری کے مروجہ طرز پر اس کی زندگی کے بڑے بڑے کاموں، اس کی نمایاں مہمات اور اس کے نمائندہ عادات کو بیان کر دیا جائے، کچھ تاریخوں کی چھان بین اور کچھ واقعات کی کھوج کر یہ کر دنی جیسے تو ایسی سیرت نگاری سے صحیح منشا ہرگز پورا نہ ہوگا۔

پھر سرور عالم کی زندگی کی مثال ایک جوہر کے کھڑے پانی کی نہیں ہے کہ جس کے ایک کنارے کھڑے ہو کر ہم بیک نظر اس کا جائزہ لے ڈالیں۔ وہ ایک بہتا ہوا دریا ہے جس میں حرکت ہے، روانی ہے، کشمکش ہے، موج و حباب ہیں، سپیاں اور موتی ہیں۔ اور جس کے پانی سے مردہ کھیتوں کو مسلسل زندگی مل رہی ہے اس دریا کا رمز آشنا ہونے کے لیے اس کے ساتھ ساتھ رواں رہنا پڑتا ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ سیرت کی بہت سی کتابیں پڑھ کر نادر معلومات ملتی ہیں لیکن ہمارے اندر تحریک پیدا نہیں ہوتی۔ جذبے انگڑائی نہیں لیتے، عزم و ہمت کی رگوں میں نیا خون نہیں دوڑتا ذوقِ عمل میں نئی حرارت نہیں آتی، ہماری زندگیوں کا جمود ہمیں ٹوٹتا۔ وہ شرابِ آرزو ہم اخذ نہیں کر پاتے جس کی گرمی نے ایک یکہ و تنہا اور بے سرو سامان فرد کو قرونوں کے جھے ہوئے فاسد نظام کے خلاف معرکہ آرا کر دیا۔ وہ سوز و سائے ایمان ہمیں نہیں ملتا۔ جس نے ایک یتیم بے نوا کو عرب و عجم کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والا بنا دیا۔

اصل میں حضورِ معروف اصلاح کے محدود تصور کے مطابق فقط ایک ”بڑے آدمی“ نہ تھے آپ کی سیرت ایک ایسے ”بڑے“ یا ”مشہور“ آدمی کی داستان نہیں ہے۔ جیسے لوگوں کو مشاہیر کے سوانحی سلسلوں میں گنوا یا جاتا ہے۔ یہ ہستی ”بڑے“ اور ”مشہور“ آدمیوں سے بہت اوپر کی ہے۔ دنیا میں بڑے آدمی بہت پیدا ہوئے اور ہوتے ہیں۔ بڑے لوگ وہ بھی ہیں جنہوں نے کوئی اچھی تعلیم اور کوئی تعمیری فکر پیش کر دی۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے اخلاق و قانون کے نظام سوچے، وہ بھی ہیں جنہوں نے اصلاحِ معاشرہ کے کام کیے۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے ملک فتح کیے اور بہادرانہ کارناموں کی میراث چھوڑی۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے سلطنتیں چلائیں۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے فقر و بددستی کے عجیب عجیب نمونے ہمارے سامنے پیش کیے۔ وہ بھی ہیں جنہوں نے دنیا کے سامنے انفرادی اخلاق کا اونچے سے اونچا معیار قائم کر دکھایا۔ مگر ایسے بڑے آدمیوں کی زندگیوں کا جب مطالعہ کرتے ہیں تو بالعموم یہی دیکھتے ہیں کہ ان کی قوتوں کا سارا رس زندگی کی کسی ایک شاخ نے چوس لیا۔ اور باقی ساری ٹہنیاں سوکھی رہ گئیں۔ ایک پہلو اگر مثبت زیادہ روشن ملتا ہے تو کوئی دوسرا پہلو تاریک دکھائی دیتا ہے ایک طرف افراط ہے تو دوسری طرف تفریط! لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر گوشہ دوسرے گوشوں کے ساتھ پوری طرح متوازن بھی ہے۔ اور پھر ہر گوشہ ایک ہی طرح کے کمال کا نمونہ ہے۔ جلال ہے تو جمال بھی ہے۔ روحانیت ہے تو مادیت بھی ہے۔ معاد ہے تو معاش بھی ہے، دین ہے تو دنیا بھی ہے، اک گونہ بے خودی بھی ہے مگر اس کے اندر خودی بھی کارفرما ہے۔ خدا کی عبادت ہے تو اس کے ساتھ بندوں کے لیے محبت و شفقت بھی ہے۔ کڑا اجتماعی نظم ہے تو فرد کے حقوق کا احترام بھی ہے۔ گہری مذہبیت ہے تو دوسری طرف ہمہ گیر سیاست بھی ہے۔ قوم کی قیادت میں انہماک ہے مگر ساتھ کے ساتھ ازدواجی زندگی کا بکھیرا بھی نہایت خوبصورتی سے چل رہا ہے مظلوموں کی داد رسی ہے تو ظالموں کا ہاتھ پکڑنے کا اہتمام بھی ہے۔

آپ کی سیرت کے مدرسے سے ایک حاکم، ایک امیر، ایک وزیر، ایک افسر، ایک ملازم، ایک آقا، ایک سپاہی، ایک تاجر، ایک مزدور، ایک جج، ایک معلم، ایک واعظ، ایک لیڈر، ایک ریفارمر، ایک فلسفی، ایک ادیب، ہر کوئی یکساں درسِ حکمت و عمل لے سکتا ہے، وہاں ایک باپ کے لیے ایک ہمسفر کے لیے ایک پروسی کے لیے یکساں مثالی نمونہ موجود ہے۔ ایک بار جو کوئی اس درس گاہ تک آ پہنچتا ہے پھر اسے کسی دوسرے ددازے کو کھٹکھٹانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ انسانیت جس آخری کمال تک پہنچ سکتی تھی وہ اس ایک ہستی میں جلوہ گر ہے، اسی لیے میں اس ہستی کو "انسانِ اعظم" کے لقب سے پکارنے پر مجبور ہوا۔ تاریخ کے پاس انسانِ اعظم صرف یہی ایک ہے جس کو چراغ بنا کر ہر دور میں ہم ایوانِ حیات روشن کر سکتے ہیں۔ کروڑوں افرادِ انسانی نے اس سے روشنی لی، لاکھوں بزرگوں نے اپنے علم و فضل کے دیے اسی کی نو سے جلائے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں اس کا پیغام گونج رہا ہے اور دیں دیں کے تمدن پر گہرے اثرات اس کی دی ہوئی تعلیم کے پڑے ہیں کوئی انسان نہیں جو اس "انسانِ اعظم" کا کسی نہ کسی پہلو سے زیرِ بار احسان نہ ہو۔ لیکن اس کے احسان مند اس کو جانتے نہیں۔ اس سے تعارف نہیں رکھتے۔

اس کی ہستی کے تعارف اور اس کے پیغام کے فروغ کی ذمہ داری اس کی قائم کردہ جماعت پر تھی لیکن وہ جماعت خود ہی اس سے اور اس کے پیغام سے دُور جا پڑی ہے۔ اس کے پاس کتابوں کے اوراق میں کیا کیا کچھ موجود نہیں، لیکن اس کی کھلی ہوئی کتابِ عمل کے اوراق پر انسانِ اعظم کی سیرت کی کوئی تصویر دکھائی نہیں دیتی، اس جماعت اور قوم کی مذہبیت، اس کی سیاست، اس کی معاشرہ اس کے اخلاق، اس کے قانونی نظام اور اس کے کلچر پر اس سیرت کے مثبت ہی دُھندے نشانات باقی رہ گئے ہیں اور وہ بھی بے شمار نئے نئے نقوش میں خلط ملط ہو کر مسخ ہو رہے ہیں۔ اس جماعت یا قوم کا اجتماعی ماحول زمین کے کسی ایک چتے پر بھی یہ نہیں گواہی دیتا کہ میں محمدؐ کے دیئے ہوئے اصولوں اور اس کی قائم کردہ روایات و اقدار کا آئینہ دار ہوں، بلکہ الٹا یہ جماعت اور یہ قوم دنیا کے مختلف فاسد نظاموں کے دروازوں پر بھیک مانگتی پھرتی ہے اور ہر قائم شدہ طاقت سے مرعوب ہو ہو کر اپنے سرمایہ افتخار پر شرمسار ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے قرآن کو غلافوں میں لپیٹ دیا اور انسانِ اعظم کی سیرت کا گلدستہ بنا کر طاقِ نسیان پر رکھ دیا۔

دوسرا غضب یہ ڈھایا کہ اپنے آپ کو ایک مذہبی و قومی جتھے میں بدل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو محض اپنے قومی و مذہبی رہنما کی حیثیت دے دی اور اس بین الاقوامی ہستی کے پیغام اور نمونہ جیتا

کو گروہی اجارہ بنایا۔ حالانکہ آپ ساری انسانیت کے رہنما بن کر آئے تھے اور ساری انسانیت کے لیے پیغام اور نمونہ لائے تھے۔ ضرورت سیرت، کو اس انداز سے پیش کرنے کی تھی کہ انسانیت کا یہ ایک نمونہ ہے کہ جس کے سانچے میں ڈھل کر انسان اپنے اور اپنے انباتے نوع کی فلاح کا ذریعہ بن سکتا ہے اور مسائل کے گونا گوں خازنوں سے نجات پا کر ایک پاکیزہ نظام زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ حضور کا پیغام اور اسوہ درحقیقت سورج کی روشنی اور بارش کے پانی اور ہوا کے جھونکوں کی طرح کا فیضانِ عالم تھا لیکن اسے ہم نے اپنی نااہلی سے گروہی خول میں بند کر دیا آج انڈیوں، سقراط، ڈارون، میکیا ویلی مارکس، فرائڈ اور آئنسٹائن سے تو ہر ملک و مذہب کے لوگ، حضور ایاہبت استفادہ کرتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے کسی کے خلاف کسی گروہ میں اندھا تعصب کا فرما نہیں ہے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور اور علم اور ہمتی سے استفادہ کرنے میں بے شمار تعصبات حائل ہیں۔ لوگ یوں سوچتے ہیں کہ محمد تو مسلمانوں کے ہیں اور مسلمان ہم سے الگ اور ہم مسلمانوں سے الگ ہیں لہذا مسلمانوں کے ہادی اور رہبر سے ہمارا کیا واسطہ! انہوں نے کہا کہ اس تاثر کے پیدا ہونے اور غیر معمولی حد تک جانچنے میں ہمارے اپنے طرز عمل کا بہت بڑا حصہ ہے یہ خود ہم ہیں کہ جنہوں نے محسن انسانیت کی نہایت غلط نمائندگی کی ہے۔

## بنام مغرب :

سرورِ عالم کی ہستی تاریخِ انسانی کے دو بڑے ادوار کے درمیان واقع ہے۔ بعثتِ محمدی کے مقام سے کھڑے ہو کر دیکھیں تو ہمارے پیچھے قبائلی، جاگیردارانہ، بادشاہتی اور روایتی وادہامی دورِ تمدن پھیلا دکھائی دیتا ہے، سامنے دیکھیں تو آفاقی و بین الاقوامی، عوامی و جمہوری، عقلی و استدلالی ترقیاتی و ایجادی دورِ تمدن کی پہلی شعاعوں کا قافلہ دور کے اُفق سے اُٹتا دکھائی دیتا ہے اور اس دورِ عقل و ترقی کا افتتاح خود سر تاج انسانیت ہی کے ہاتھوں کر آیا گیا اور آنے والے دور کے لیے ایسے اصول دنیا کو فراہم کر دیے گئے جو قیامت تک کارگر ہو سکیں اور ان اصولوں کے ساتھ ایک ایسا انسان تیار کر کے دکھا دیا گیا، جو آنے والی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قابل ہو سکے۔ حضور کے ذریعے اسی آنے والے دور کی ضروریات کے لحاظ سے رُوح اور بدن، اخلاق اور مادیت، عقلیت اور جذبات، اعتقاد اور عمل، خواہش اور فرد اور جماعت کے احوال اور تقاضوں کے درمیان معجزانہ نوعیت کا توازن قائم کر دیا گیا۔ آپ کے ہاتھوں ایک ایسی جماعت کی تاسیس کرائی گئی جو ایک طرف دنیا سے بے نیاز تھی اور دوسری طرف دنیا پر حکمرانی کرتی تھی۔ ایک طرف خدا پرستی میں بے مثال تھی

اور دوسری طرف مادہ پر کار فرمائی کرنے کے لحاظ سے پیش پیش تھی۔ ایک طرف حوت کے مقابل میں تانی عاجزی سے سرسجکادینے والی تھی اور دوسری طرف باطل کا زور توڑنے کے لیے جان مال کی بازی لگانے والی تھی۔ ایک طرف اپنے آپ کو رضائے الہی کی تحویل میں دیے ہوئے تھی اور دوسری طرف فطرت کی قوتوں کو رام کر کے ان سے کام لینے میں چاق و چوبند تھی۔ یہ طاقت جو نہی تاریخ کے ایوان میں داخل ہوئی اس نے علم و حکمت کے فانوس روشن کر دیے۔ اس نے ایجادات کے دروازے کھول دیے اور اس نے ادارات کی تنظیم کے لیے نئے نئے تجربات و غنایات تیزی سے کر ڈے اور اس کی ساری حرکت، اس کی ساری ترقیات اس کے علوم اور ایجادات، اس کے تمدنی و تہذیبی کارناموں کا اصل کریڈٹ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں جاتا ہے۔

افسوس ہے کہ مغربی قویوں جن کے قبضے میں آگے چل کر اس عقلی و جمہوری دور کی باگ ڈور آئی، محمد اور اس کے پیغام اور اس کے پیش کردہ نظام کو نہ سمجھ سکیں۔ وہ ہستی جس کا وہ نامہ مغرب کی نشاۃ ثانیہ کے پس منظر میں جگمگا رہا ہے اور وہ ہستی جو جمہوریت اور بین الاقوامیت کے پردوں کے پیچھے مسکرا رہی ہے اور وہ ہستی کہ جس کا ہاتھ مذہبی اصلاح (Reformation) کی تحریک کی ڈور ہانے والا تھا اس کو یورپ کا روشن دماغ انسان نہ دیکھ سکا۔ اور نہ سمجھ سکا۔ اس کے کئی اسباب ہیں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں اجمالاً ان اسباب کا ذکر کریں۔

۱۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنا پیغام لے کر اٹھے تو آپ کو یہودیوں و عیسائیوں دونوں سے سابقہ پیش آیا۔ دونوں مذہب اس وقت نساہ اور انحطاط کے افسوس ناک دور سے گزر رہے تھے۔ ایمانی و اخلاقی روح سے خالی ایک رسمیتی ڈھانچہ شانِ تقدس کے ساتھ دونوں کے ہاں کھڑا تھا۔ دونوں گروہوں میں مذہبی مہنقات پیدا ہو چکے تھے اور انھوں نے وہ روہاری ذہن کے ساتھ اپنے مفاد کی دکانیں کھول لی تھیں۔ فکر و عمل کی حقیقی متاع ٹٹ چکی تھی سرف باہر چمک دار سامن ہوئے آویزاں تھے۔ سارا زور اپنی اپنی گروہ بندی کو قائم رکھنے اور اپنے اپنے آدمیوں کو اس کے دائرے میں روک رکھنے پر تھا۔ تہذیب کی اصلاح اور آدمیت کا بھلا کسی کے سامنے نہ رہا تھا۔ ان عادات و برہنیت مجموعی یہودیوں اور عیسائیوں کی ذہنیت اتنی بگڑ چکی تھی کہ انھوں نے محمد کی قیمتی شخصیت کو جانچنے اور اس کے پیغام کو پرکھنے اور اس کے پیش کردہ نظام کا جائزہ لینے کے بجائے اس کے خلاف ضد اور تعصب اور حسد اور کینہ کے محاذ قائم کر لیے۔ اس کی دعوت کا مقابلہ کیا۔ اس کی تحریک کے راستے میں روڑے اٹکائے۔ اس کے ساتھ عہد شکنیاں اور غداریاں کیں۔ اس کی تہذیب



کو ڈھا دینا چاہا۔ اور اس کے قتل کی تدبیریں کیں۔ پھر اپنے ان کرتوتوں کے فطری نتائج سے جھولیاں بھریں۔ اس طرح تاریخ کے بہتے پانی کو گندے جذبات اور گھٹیا خیالات سے گدلا کیا اور یہی گدلا پانی بہ بہ کر بعد کی نسلوں تک پہنچا۔ انہوں نے کینے اور تعصب کی ایک میراث پیدا کی اور وہ میراث بعد کے یہودیوں اور عیسائیوں کے لیے محفوظ چھوڑ گئے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر یہودیوں اور عیسائیوں کا یہی فاسد جذباتی ردِ عمل آج تک ان کے اخلاف کے ذہنوں میں منعکس ہو رہا ہے۔

۲۔ اسلام سے قبل کی انسانی دنیا کے اندر مذہبی دائرے میں بھی اور سیاسی میدان میں بھی عیسائیوں کو نمایاں غلبہ حاصل تھا اور پھیلاؤ کی اُمنگیں کام کرنے کے لیے بڑی وسیع جولانگاہ سامنے رکھتی تھیں لیکن اسلام کے اُبھرنے سے گویا ان کی نگاہ میں ایک حریف طاقت آ اُبھری اور آہستہ آہستہ نشوونما پا کر دنیا بھر میں ایک فیصلہ کن طاقت بن گئی۔ اس وجہ سے عیسائیت کے سینے میں رقیبانہ جذبات پیدا ہو کر بڑھتے ہی چلے گئے۔ پھر عملاً اسلام کی طاقت نے عیسائیت کے ہاتھوں سے تسلط و اقتدار کی باگیں کرۂ ارضی کے مختلف حصوں میں چھین کر اس کے ردِ عمل کو اور زیادہ شدید بنا دیا۔ تاریخ کے میدان میں کھلے اور برابر برابر کے مقابلے میں عیسائیوں نے اسپورٹس میں سپرٹ دکھانے کے بجائے اپنے اندر ایک کد اور ایک چڑ پیدا کر لی۔ یہ کد اور چڑ بنیادی طور پر مسلمانوں کے خلاف تھی اور بالواسطہ طور پر اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کھچاؤ بڑھتا گیا۔ یہ کھچاؤ صلیبی جنگوں کے دور میں اپنی آخری انتہا تک جا پہنچا اس دور تک آتے آتے چونکہ خود مسلمانوں میں انحطاط اپنا عمل کر چکا تھا اس لیے ان کی خاص خاص کمزوریاں اور بے راہ رویاں اسلام اور سرورِ عالم کے ساتھ منسوب کی جانے لگیں اور مسلمانوں کے عمل و کردار کے رنگوں سے سیرتِ محمدی کی ایک غلط تصویر تیار کی جانے لگی۔

۳۔ اسلام اور عیسائیت کے اس لمبے دورِ کشمکش کے ابتدائی حصے میں پادری گروہ چونکہ اپنے عیسائی عوام کو ذہنی لحاظ سے کامل طور پر اپنے تصرف میں لیے ہوئے تھا اور اسلام اسی گروہ کے طبقاتی مفاد پر ضرب لگانے کا موجب ہوا تھا اس لیے اس گروہ نے محسنِ انسانیت اور اس کے پیغام کا ایک جھوٹا تصور گھڑا اور گھڑ گھڑ کر اسے گلی گلی پھیلا یا قرون کے اس پروپیگنڈے نے مغرب کے ذہن کو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا چنانچہ آج بھی سرے سے مذہب کا انکار کرنے والے اور عیسائیت سے آزاد ہو کر سوچنے والے اربابِ عقل تک جب اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اظہارِ رائے کرتے ہیں تو وہ آج سے چھ صدی قبل کے تنگ دل اور تاریک خیال پادریوں

سے ذہنی سطح میں کچھ بھی بلند نہیں ہوتے۔ چنانچہ اٹھاکے دیکھ لیجئے منتشر قہن کی کتابوں کو کہ کتنی غلط اور ناقص معلومات کس مفسدانہ طریق سے مرتب کر کے لائی گئی ہیں اور دنیا کے سب سے بڑے انسان کی تصویر کس نامعقولیت سے کھینچی گئی ہے۔ کوئی ایک آدھ استثنائی مثال مل جاتا اور چیز ہے یہاں تو اس عمومی انداز کا ذکر ہے جو اہل مغرب کے ہاں پایا جاتا ہے۔

۴۔ گزشتہ دو صدی کا عہد مغربی امپیریلزم کا شیطانی عہد ہے۔ اس عہد میں مسلمان قومیں اسلام کے انحراف خدا سے بغاوت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں سے گریز کی سزا پانے کے لیے ایک ایک کر کے مادہ پرست مغرب کے شہنشاہی عزائم کی شکار ہونے لگیں مغرب کے شہنشاہی عزائم کو مسلمانوں کے اندر ہر جگہ ایک سخت درجہ کی مزاحم روح کار فرما ملی اور یہ روح ہر جگہ مذہبی روح تھی۔ اسلام نے توحید کا جو تصور دیا ہے وہ حریت و آزادی اور مساوات کے ایسے تصورات ابھارتا ہے کہ جو اسلام کے ماننے والوں کو غلامی پر رضامند نہیں ہونے دیتے۔ چنانچہ مسلمانوں کے اندر مغربی امپیریلزم کے خلاف جتنی بھی تحریکیں برپا ہوئی ہیں ان کے اندر اسلام کی حرارت کام کر رہی تھی۔ ہر جگہ دینی شخصیتیں رہنمائی کرتی نظر آتی ہیں اور ہر جگہ نظام اسلامی کے احیاء کے دلولے کار فرما رہے ہیں۔ اسی طرح مسلمان ممالک کی تمام تحریکات آزادی میں دینی داعیہ پورے زور سے برسر عمل ملتا ہے چنانچہ مغرب کے شہنشاہی صیادوں میں اس قوت کے خلاف از سر نو ایک چوڑا پیدا ہوئی جو قدم قدم پر ان کا راستہ روکتی تھی۔ اور بار بار ناقابل تسخیر دلولے ابھارتی تھی۔ چنانچہ اس چوڑ کی وجہ سے مسلمانوں کی مذہبیت کو جنونی پن سے تعبیر کیا گیا۔ اور ”ملازم“ کو ایک خوفناک ہوا بنا کر پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کی روح دینی کچھ ایسی سخت جان پائی گئی کہ جو آسانی سے مغربی فکر اور کلچر کے سامنے شکست کھانے والی نہیں تھی بلکہ جس نے ہر ہر دیس میں اس کا مقابلہ کیا ہے۔ تعلیم اور لٹریچر اور اثر اندازی کی پوری قوتیں صرف کر کے مغربی امپیریلزم نے برسوں میں جا کر مسلمان قوموں کے اندر سے اپنے حق میں ایک معمولی سی اقلیت حاصل کی۔ اور اسے سہارا دے کر اقتدار تک پہنچایا اور پھر اُسے مسلمانوں کے اسلامی رجحانات کے خلاف فکری سیاسی و تہذیبی معرکے میں خوب خوب استعمال کیا۔ ان حالات میں اسلام اور اسے پیش کرنے والی ہستی سے مغرب کا کھپوڑا بڑھتا رہا۔

۵۔ مغربی قومیں جب مسلمانوں کو غلام بنانے میں کامیاب ہو گئیں تو ان کے لیے یہ مشعل ہو گیا کہ جو طاقت سیاسی و مادی اور تنظیمی و تہذیبی لحاظ سے ان سے پست ہے وہ اس سے نظریہ فضولگی اور نظام حیات کا درس لے سکیں۔ اور اسے بھوپا کرنے والی ہستی کا احترام کر سکیں۔ پھر

جب مسلمانوں کو انہوں نے اپنی ذہنی تقلید میں مبتلا دیکھا اور ان پر مرحوبیت کی کیفیت کی پرچھائیں پڑی دیکھی تو اس چیز نے اور بڑی رکاوٹ پیدا کر دی۔ انہوں نے جب اپنے تیار کردہ روشن خیال مسلمانوں کو اسلام کو مغربی نقطہ نگاہ کے مطابق ڈھالتے دیکھا تو اسلام اور اس کے داعی کی وقعت ان کی نگاہوں میں اور کم ہو گئی۔ مسلمانوں کے معذرت خواہانہ نقطہ نظر نے اسلام کے وقار اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو بڑا نقصان پہنچایا۔

ان سارے وجوہ و اسباب کے تحت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مغرب کے انسان کے درمیان آہنی دیواریں کھڑی ہو گئیں۔

آج مغرب محسن انسانیت کو محض مسلمانوں کے گروہی رہنما کی حیثیت سے لیتا ہے اور سمجھنے سمجھانے کے نقطہ نگاہ کے بجائے معترضانہ اور مخالفانہ اور مناظرانہ ذہن کے ساتھ سیرت کا مطالعہ کرتا ہے۔ چنانچہ مغرب نے اس بلند مرتبہ ہستی کی جو تصویر اپنے لٹریچر میں تیار کی ہے۔ وہ ایک ایسے آدمی کا نقشہ سامنے لاتی ہے جو نفسیاتی صحت و توازن سے محروم ہے، جس کی ساری تگ و دو لا شعوری محرکات کے رد عمل سے پیدا شدہ خبط کا نتیجہ ہے۔ وہ تیغ و خونخوار ہاتھ میں لیے بدھ بڑھتا ہے قتل عام کرتا چلا جاتا ہے اس پیکر رحمت کو ایک دنیا طلب اور جاہ پسند جنگجو کا مرتبہ دے دیا گیا ہے۔ اور اس کے مخلصانہ کام کو ایک فراڈ بنا دیا گیا ہے۔ یہ دکھایا گیا ہے کہ تخریک اسلامی میں جو جو کچھ اچھے پہلو تھے وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے مستعار لیے گئے تھے۔ ورنہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر اپنا کوئی جوہر قابل نہ تھا۔ یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ روحانیت و مذہبیت کا سارا رنگ تو محض ہنس مٹتی تھا، اور محض ڈرامائی تدابیر سے تسخیر عوام کر کے اپنی مطلب براری کی گئی تھی۔ آپ جسے بھی چاہیں دنیا پرست اور حیلہ ساز آدمی کہہ سکتے ہیں، مگر سوال یہ ہوگا کہ ایسی شخصیت کے اندر اس طرح کا اعلیٰ اور بے داغ کردار کس طرح کھپایا جا سکتا ہے۔ جس کا تجربہ ہمیں سرورِ عالم کی پوری زندگی میں ہوتا ہے۔

پھر ظلم یہ ڈھایا جاتا ہے کہ اس صاحبِ دعوت ہستی کے پیش کردہ پیغام کا مطالعہ جڑ سے شردھا کر کے ٹہنیوں اور برگ و بار تک نہیں پہنچایا جاتا بلکہ اساسی نظریہ کو سمجھے بغیر اور فکر کی جڑ کی ماہیت متعین کیے بغیر مناظرہ باز پادریوں کے بیچ پر پڑ کر جزئیاتی مسائل کی چند کونپوں کو لے لیا جاتا ہے مثلاً یہ کہ داعی اسلام نے تعدد ازواج کو جائز رکھا۔ مذہب کے لیے تلوار اٹھائی۔ جنگی قیدیوں کو غلام بنانا اچھا تر قرار دیا۔ اور فلاں موقع پر یوں کیا اور فلاں معاملے میں یوں کیا۔ یہ طریق مطالعہ ہمیشہ متعصب اور

مخالفانہ ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔ اور اس کے ذریعے کسی نظام زندگی کو اور کسی دین کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ بلکہ اس کے ذریعے تو بات کو سمجھنے کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ دیکھنے اور جاننے اور سمجھنے کی اصل چیز نظریہ اساسی ہے کہ وہ کہاں تک برحق ہے اور اس سے زندگی کی بگڑی کہاں تک بنتی ہے۔ پھر اس نظریہ سے ماخوذ ہونے والے اصول دیکھے جاتے ہیں کہ جن پر زندگی کے مختلف شعبے استوار ہوتے ہیں۔ پھر ان اصولوں کے فریم میں جزئیات کی ترتیب دیکھی جاتی ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک قائم ہوتی ہے کہ نہیں ایک شخص آپ کے سامنے زندگی کا ایک فلسفہ لے کے آتا ہے۔ آپ اس فلسفہ پر غور کرنے کے بجائے چند ایسے جزئی مسائل چھیڑ دیتے ہیں۔ جن کے بارے میں آپ کے معاشرہ کا ایک خاص ذہن بنا بنایا چلا آتا ہے اور اس ذہن سے باہر نکل کر آپ سوچ نہیں سکتے۔ نتیجہ یہ کہ خود مغالطوں میں پڑتے ہیں اور ہزار ہا لوگوں کو تعصب میں مبتلا کرتے ہیں۔ ایک شخص انسانیت کا ایک مکمل نیا نقشہ اپنی ذات میں بنا کر سامنے لاتا ہے۔ آپ اس نقشے کو مجموعی طور پر سمجھنے سے قبل اس کی دو ایک لکیروں اور نشانوں کو پکڑ کر بحث شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لکیریں اور یہ نشان یوں کیوں لگائے گئے ہیں۔ حالانکہ اگر نقشے کی مجموعی ترتیب کو ڈھنگ سے سمجھا گیا ہوتا تو ان لکیروں اور نشانوں کی ماہیت بھی از خود سمجھ میں آ جاتی۔ معرب نظریات اور نظاموں کو سمجھنے کے لیے ادنیٰ تاریخی شخصیتوں کا جائزہ لینے کے لیے جو انتہائی سائٹیفک انداز بالعموم استعمال میں لاتا ہے۔ وہی اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالعہ کرتے وقت بالکل بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ ایک باغ پر رائے قائم کرنے کے لیے اس کو مجموعی حیثیت سے سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ نہ کہ اس کے اندر کی گھاس کی دو ایک پتیوں اور کسی پودے کی کوپلوں کو سارے باغ سے الگ کر کے زیر مطالعہ لایا جاتا ہو۔ آپ سیرت محمدی اور پیغام محمدی کے پورے چمن کو دیکھیں۔ اور اس کی مجموعی ترتیب کو سمجھیں پھر آپ کو اس کے اندر ایک ایک شاخ اور ایک ایک پتی کا مقام خود ہی سمجھ میں آ جائے گا۔ اگر کسی نظام یا نظریے یا تحریک یا قائدانہ شخصیت میں چند چیزیں آپ کے ذوق اور آپ کی پسندیدہ روایات اور عادات کے خلاف ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ بس وہاں کوئی قابل قدر چیز ہے ہی نہیں۔ اور وہ پورا مجموعہ مسترد کر دینے کے قابل ہے۔ آپ کا ذوق اور آپ کی پسند کوئی عالمی تاریخی معیار نہیں ہے۔ ممکن ہے بلکہ لازم ہے کہ ایک نظریہ، نظام، تحریک اور قائدانہ شخصیت اپنا معیار خیر و شر اپنے ساتھ لائے اور سرے سے اس کے بھلے برے کے پیمانے ہی آپ سے الگ ہوں لہذا سب سے پہلے تو معیار اور پیمانوں کو بالقابل رکھ کر جانچنا چاہیے

اور معیار اور پیمانوں کو جانچنے سے قبل اساسی نظریہ کی قدر و قیمت مشخص ہونی چاہیے۔

قرآن، اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو لٹریچر ارباب کلیسا اور مستشرق مؤرخین نے اب تک پیدا کیا ہے وہ ایک طرف غلط فہمیوں اور جہالتوں سے بھرا پڑا ہے۔ اور دوسری طرف معاندانہ تعصب کا زہر اس کی رگ رگ میں پھیلا ہوا ہے بلکہ حد یہ ہے کہ جن لوگوں نے وسیع قلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اعتراف حقیقت کیا بھی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر تعریفی انداز تک اختیار کیا ہے انہوں نے بھی ایسے ایسے میٹھے ڈنک سحر آگین الفاظ کے پردوں میں رکھ دیے ہیں کہ آدمی فریب نگارش کے اس انداز کی داد دیتا رہ جاتا ہے۔ دو چار درخشاں مثالیں ایسی ضرور ملتی ہیں کہ جنہوں نے حضور کے پیغام اور کارنامے کو دلی اعتراف کے ساتھ بیان کیا ہے مگر خود انہیں مغرب کے دل و دماغ نے کچھ زیادہ قدر و قیمت نہیں دی۔ مثلاً حال ہی میں ایک کتاب ذرا بہتر انداز کے ساتھ آئی ہے تو اسے "دردِ مسلمان" (Pro-Mohammaden) قرار دے کر اس کی وقعت گھٹاتی جا رہی ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ مسلمان مملکتوں سے آج مغرب کی ڈپلومیٹک اغراض وابستہ ہو رہی ہیں ان کے تحت ان اقوام کی تالیفِ قلب کے لیے جانے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ لیکن کہیں بھی اس ظلم کی تلافی کی فکر نہیں کی گئی جو سرورِ عالم کے ساتھ اب تک روا رکھا گیا ہے۔

تقاضا یہ نہیں کہ آپ صمیمی کی آواز کے خلاف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نظریہ و نظام کی صداقت کی گواہی دیں، نہیں آپ اختلاف کریں اور پورے زور سے کریں۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ تاریخ نویسی اور سوانح نگاری کے لپنے ہی بنائے ہوئے اپنے ہی تسلیم کردہ اصولوں اور معیارات کو توڑ کر حقائق کو مسخ نہ کریں۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ ایسے ماخذ سے روایات نہ لیں جو ایک طرف مسلمانوں کی نگاہ میں بالاتفاق ناقابل استناد ہیں اور جنہیں تاریخی تحقیق کے مسلمہ معیارات قبول نہیں کر سکتے۔ تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ ایک واقعہ کے اچھے محرکات کو ہٹا کر انکی جگہ دانستہ مکروہ محرکات لالا کر نہ رکھیں، تقاضا اس بات کا ہے کہ آپ دلائل سے بات کہیں، طنز و تعریف اور توہین و تذلیل کا غیر شریفانہ ڈھب اختیار نہ کریں۔

اس گفتگو سے ہمارا مدعا ایک ناخوشگوار جذبہ باقی فضا پیدا کرنا نہیں بلکہ اب تک جو فضا موجود رہی ہے ہم چاہتے ہیں کہ اسے ختم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے شرط اول یہ ہے کہ مغرب اسلام قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اپنے نقطہ نظر کو صاف کرے۔ ایک نئے ذہن کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے اور وہ نیاز ذہن اس کلمہ سواد یا نقطہ اشتراک کو سمجھنے سے پیدا ہو سکتا ہے

جو اہل مغرب اور مسلمانوں کے درمیان واقع ہے۔ ہمارا کلمہ سوا ذیل کے مشترک نکات سے بنتا ہے۔

عیسائی، یہودی اور مسلمان تینوں خدا پرست گروہ ہیں، تینوں کے ہاں آخرت کا تصور موجود ہے، تینوں کی عبادات کا طرز ملتا ہے، تینوں کے نزدیک بنیادی اخلاقی اقدار یکساں ہیں۔

تینوں کی مذہبی تعلیمات ایک ہی الہامی سرچشمہ سے ماخوذ ہیں اور مسلمان جملہ انبیاء کو ایک ہی عظیم صداقت اور ایک ہی دین کے علمبردار مانتے ہیں۔  
تمدنی حیثیت سے دیکھیں تو اہل مغرب اور مسلمانوں کے درمیان ذیل کے نقطہ ہائے اتحاد موجود ہیں :-

مغربی تمدن نے علم اور سائنس کی ترقی کی جو راہیں کھولی ہیں۔ مسلمانوں کا خالص مذہبی نقطہ نظر ان ترقیوں کا قدر شناس ہے اور اسلامی نظریات روحانیت کے ساتھ ساتھ اپنے تمدن میں اس مادیت کو جگہ (تھوڑی سی حدود کے ساتھ) دے سکتا ہے۔ جس میں مغرب نے عروج حاصل کیا ہے۔ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام دین اور نظام ہونے کی وجہ سے زیادہ وسعت ظرف رکھتا ہے۔

جمہوریت کے جن اصولوں کے ساتھ مغربی تمدن نے سیاسی ہمتیں استوار کی ہیں پیروان اسلام کی فکر میں وہ پہلے سے شامل ہیں، بلکہ ان کا مکمل ترین مظاہرہ کرنے میں اسلامی تمدن ہی نے سبقت کی ہے۔ نمائندگی، انتخاب، شورا، ائیت، قانون کی عملداری، شہری حقوق اور ان میں مساوات کے سارے تصورات کو مسلمانوں نے مغرب سے پہلے جامہ عمل پہنایا ہے اگرچہ وقت کے تمدنی و معاشرتی ماحول کی مطابقت میں!

عالمی کھچاؤ اور بحران کو پیش نظر رکھیے تو اس کا حل تلاش کرنے میں بھی دو وجوہ سے مسلمانوں ہی کا تعاون مغرب کے اصلاح پسندوں کے لیے زیادہ قیمتی ہو سکتا ہے :-

۱۔ بریٹانیا اور یسٹ انڈیا کی شہادتیں موجود ہیں کہ جمہوریت کی روح مسلمانوں ہی سے منتقل ہو کر مغرب تک پہنچی

اگر مغرب سنجیدگی و اخلاص سے سوچے تو امنِ عالم کے مسئلے میں جتنا تعاون مسلمان بہم پہنچا سکتے ہیں اتنا اور کسی عنصر سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہی گروہ اعتقاداً اتنی محبت انسانیت رکھتا ہے اور جہانی وحدت کے لیے ایسی اصولی بنیادیں رکھتا ہے کہ اگر اسے پوری طرح کام کرنے کا موقع ملے، تو بین الاقوامی تصادموں کا انسداد ہو سکتا ہے۔ مستقبل کے عالمی نظام کی تعمیر کے لیے اصول و اقدار کا مسالہ اسلام سے وافر حد تک مل سکتا ہے۔

مادیت کی دو انتہا پسندانہ اشکال — یعنی سرمایہ پرستی اور کمیونزم — دونوں کا مقابلہ کرنے اور ایک درمیانی راہِ عدل پر انسانیت کو لانے کے کام میں اسلام اور اس کے پیروؤں ہی سے کچھ زیادہ اُمیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

غور و فکر کے لیے یہ مشترک نکات سامنے رکھ کر ہم کہتے ہیں کہ کیوں نہ اہل مغرب اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بدلیں۔ کیوں نہ وہ پادریوں اور مستشرقین کے حائل کردہ پردہ ہائے تعصبات کو پارہ پارہ کر دیں۔ آج جب کہ ایک طرف مادی نظریہ کا تجربہ دل کھول کر کیا جا چکا ہے۔ اور اب اس تجربہ کو اسی ڈھب سے آگے جاری نہیں رکھا جاسکتا۔ پھر یہ شاخسارِ حکمت اب نئی کوئی چیز بھی نہیں چھوڑ رہا ہے جن کو مرکزِ امید بنا کر کچھ اور وقت گزارا جاسکے۔ دوسری طرف جو مذاہب موجود ہیں ان میں سے ہر ایک فرد کی زندگی کے ایک گوشے میں سکر کر رہنا پسند کرتا ہے۔ مگر آگے بڑھ کر زمام تمدن ہاتھ میں لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ گویا ہم نظریاتی لحاظ سے ساری پونجی ختم کر کے بالکل دیوالیہ ہوئے کھڑے ہیں۔ سب سے دے کے ایک مرکزِ توجہ باقی ہے جہاں سے شعاعِ امید پھوٹتی ہے۔ اس لیے بھی اگر دلوں کے دروازے بند کر لیے جائیں۔ تو آخر مزینخ سے تو کوئی رہنمائی در آمد نہیں کی جاسکتی۔

وقت ہے کہ آپ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک تاریخ ساز، ایک محسنِ انسانیت، ایک قائدِ تمدن، اور ایک انسانِ اعظم کی حیثیت سے جانیں۔ جو روشنی وہاں سے ملتی ہے اس کے لیے دل و دماغ کے دریچے کھول دیں۔ یہ ہستی مستحق ہے کہ اسے آپ سائنٹفک طریق سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ چاہیے یہ کہ آپ اسلام کو عیسائیت کے ایک حریف مذہب کی حیثیت سے نہ لیں۔ بلکہ جمہوریت، اشتراکیت اور دوسری اصولی تحریکوں کی طرح کی ایک تحریک اور زندگی کے ایک تہذیبی نظام کی حیثیت سے لیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس تحریک کے قائد اور اس نظام کے موسس کی

حیثیت سے دیکھیں جنہوں نے ایک عظیم اور روشن دورِ تاریخ کا افتتاح کیا۔ اس ہستی کے پیش کردہ اصولوں کو آپ اس لحاظ سے جانچیں کہ وہ ایک جہانی ریاست چلانے کے لیے آج کہاں تک مفید اور ناگزیر ہیں۔ اس کے تیار کردہ نمونہ انسانیت کا مطالعہ اس مقصد سے کریں کہ یہ نمونہ جوہری تہذیب کا کل پڑہ بننے کے لیے کس حد تک موزوں ہے۔

آج جب کہ گھٹا ٹوپ اندھیرا ہمارے سامنے ہے اور دورِ دور تک کوئی شر بھی چمکتا دکھائی نہیں دیتا، پیچھے پلٹ کر نظر ڈالتے ہیں تو محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں میں ایک مشعل جھلملاتی دکھائی دیتی ہے جو گزشتہ پونے چودہ صدیوں سے آندھیوں اور طوفانوں کے درمیان ایک ہی شان سے جل رہی ہے۔ کیا محض خود پیدا کردہ تعصبات اور غلط فہمیوں کی بنا پر اس مشعل کی روشنی کو قبول کرنے سے انکار کر دینا اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لینا کوئی اچھا نتیجہ دے سکے گا؟ کیا انسانیت و تہذیب کو اس اندھیرے میں تباہ و برباد ہونے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ خوب سوچ لیجئے کہ حالات ہمارے سامنے کتنا خوف ناک چیلنج لیے کھڑے ہیں اور آیا آپ میں اس کا جواب دینے کی سکت موجود ہے۔

لیکن حق یہ ہے کہ اصل مجرم ہم خود ہیں۔ اور ہم ہی محسنِ انسانیت کی شخصیت، پیغام اور کارنامے کو دنیا سے بھی اوجھل رکھنے والے ہیں اور اپنی نگاہوں سے بھی چھپانے والے۔ آج محسنِ انسانیت کی ہستی کا از سر نو تعارف کرانے کی ضرورت ہے اور یہ خدمت شاید جوہری توانائی کے انکشاف سے بڑی خدمت ہوگی!

## یہ کتاب :

سیرتِ پاک پر اعلیٰ درجہ کی علمی و تحقیقی کتابوں کے موجود ہوتے ہوئے میں نے اس کٹھن وادی میں اپنی بے بضاعتی کے باوجود اس جذبے سے قدم رکھنے کی جسارت کی ہے کہ محسنِ انسانیت کی ہستی اس حیثیت سے ایک بار پھر بے نقاب ہو جائے کہ وہی زندگی کے شعور کا واحد سرچشمہ ہے سیرتِ نگاہی کے نہایت ہی قابلِ احترام شاہکار جو ہمارے سامنے موجود ہیں ان میں پورا واقعاتی مواد ضرور موجود ہے لیکن قاری کہیں تو روایات کے اختلاف اور تحقیقی بحثوں میں کھوجاتا ہے۔ کہیں واقعات کے ربط و تسلسل کا سررشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ کہیں اس کے سامنے جزئیات آتے ہیں کہ جس کی واضح معنویت اور قابلِ اطمینان توجیہ اس کے ہاتھ نہیں آتی۔ کہیں علمی نکات اور تحقیقی مواد اور حوالوں کی کثرت اسے مرعوب کر دیتی ہے لیکن دفتروں کے دفتر بھی وہ اگر



پڑھ جاتا ہے تو اس کے باوجود وہ ایک تحریک کو اپنے سامنے موجزن نہیں دیکھتا۔ وہ کشمکش کے اس منظر کو دیکھ نہیں پاتا جو حضور کی دعوت سے برپا ہوئی۔ وہ اپنے آپ کو اس دور میں نہیں پاتا، جس کی مدحِ رواں نبی اکرمؐ کی ہستی تھی۔ وہ مطالعہ کی وادیوں سے یہ احساس لے کے نہیں پلٹتا کہ میں بھی حضور کی تحریک کا ایک موجبِ بیتاب ہوں اور اپنے ماحول کی تیرگیوں کے خلاف جدوجہد کرنے کا فرض مجھ پر بھی عائد ہوتا ہے۔ مجھے بھی حضور کے کلمہ حق کی مشعل کو فضاؤں میں بلند رکھنا ہے۔ اور اس کی روشنی کو اتنا فروغ دینا ہے کہ تمدن کی دنیاؤں میں ایک صبحِ عالم تاب جلوہ فرما ہو جائے۔ یہی ایک پہلو ایسا ہے جس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ ناچیز سی تصنیفی کوشش کی گئی ہے۔

مطالعہ تاریخ کے لیے میں نے قرآنی زاویہ نگاہ اختیار کیا ہے۔ میرے نزدیک ہر چہار جانب پھیلی ہوئی دنیا حرکت اور گردش کی دنیا ہے۔ تغیر اور تنوع کی دنیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسابقت اور کشمکش اور جہاد اور معرکے کی دنیا ہے۔ اس میں کشش بھی کام کرتی ہے، مزاحمت بھی! اس میں عمل بھی پایا جاتا ہے ردِ عمل بھی! اس میں تخریب بھی ہے، تعمیر بھی! اس میں روشنی اور ظلمت ایک دوسرے کے درپے ہیں! اس میں رات اور دن ایک دوسرے کا تقاب کر رہے ہیں! اس میں موت اور زندگی دست بہ گریب ہیں! اس میں آگ اور پانی باہم دگر آویزاں ہیں! اس میں خزاں اور بہار ایک دوسرے کی گھات میں بیٹھے ہیں! غرضیکہ اس دنیا کے کسی بھی عالم اور کسی بھی گوشے پر نظر ڈالیے۔ اعداد کے جوڑے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آکر مصروفِ جہاد دکھائی دیتے ہیں۔ اس کائنات کے ایک حقیر سے مکانی گوشے میں انسانی زندگی کی سب سے زیادہ پُرہنگامہ رزم گاہ واقع ہے۔ ہمارا نظامِ تمدن و معاشرت ایک طوفانی سمندر ہے جس میں موجوں سے موجیں، جابلوں سے جاب اور قطروں سے قطرے ہر ہر آن ٹکرا رہے ہیں۔ یہاں حق اور باطل، خیر اور شر، سچ اور جھوٹ، انصاف اور ظلم اور نیکی اور گناہ کے درمیان از آدم تا ابنِ دم ایک لمبا معرکہ لڑا جا رہا ہے۔ اس معرکہ کی باگ ڈور انسانی روح و نفس کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے سرچشموں سے گونا گوں خیال اور عقیدے اور نظریے پے پے اتر رہے ہیں۔ متنوع کردار نمودار ہو رہے ہیں۔ اور متضاد فطرت کے اجتماعی نظام ظہور کر رہے ہیں۔ ہر خیال، عقیدہ، نظریہ، کردار اور نظام اپنی ضد ایک ہمزاد کی طرح ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر طاقت جو ابھرتی ہے اپنی حزب اختلاف کو جلو میں لے کے آتی ہے۔ اس اختلاف و تضاد سے وہ بہر جہتی اور ہمہ گیر تضاد پیدا ہوتے ہیں جنہوں نے ہماری ساری تاریخ کو ایک داستانِ جہاد

بنایا ہے اور آج یہ داستانِ جہاد ہمارے اپنے ہی خون کی روشنائی سے باب در باب اور فصل در فصل لکھی ہوئی ہمارے سامنے موجود ہے۔

تمدنِ انسانی کی باہم ترکیب یافتہ دنیاؤں میں جو ہر آنی اور ہر جہتی جہاد کہیں دلائل اور کہیں تلواروں سے لڑا جا رہا ہے۔ اس میں انسان کے دو ہی پارٹ رہے ہیں۔ ایک طرف سے وہ شر و فساد کا علمبردار بن کے اٹھتا ہے۔ دوسری طرف سے وہ خیر و فلاح کا داعی بن کر میدان میں اترتا ہے کبھی وہ تخریب اور بگاڑ کی قوتوں کا سرگرم آلہ کار بنتا ہے کبھی تعمیر اور بناؤ کے داعیات پر لبیک کہتا ہوا سامنے آتا ہے۔ انسانیت کے کچھ شیطانی پیکر وہ ہیں جو زندگی کو دکھوں اور مصیبتوں سے بھر دینے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف کچھ پیکر وہ بھی ہوتے ہیں جو امن و مسرت کی ایک ارضی جنت تعمیر کر دینے کے لیے اپنا سارا سرمایہ حیات کھپا دیتے ہیں۔ معرکہ حیات کے کچھ جانباز وہ ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں بدی اور جھوٹ اور ظلم کا ہر طرف دور دورہ ہو جاتا ہے اور جہاد ہستی کے کچھ وہ سپاہی ہوتے ہیں جو نیکی اور سچائی اور انصاف کا سکہ چلا کے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں۔

یہی نیکی اور سچائی اور انصاف کے سپاہی ہیں کہ جنہوں نے زندگی کو وہ کچھ دیا ہے جس کے ہوتے ہوئے یہ بسر کیے جانے کے کچھ قابل ہوئی ہے۔ تمدن میں آج جو جو پہلو بھی کسی قدر قیمت سے مالا مال دکھائی دیتے ہیں وہ انہی مایہ ناز ہستیوں کا فیضان ہیں۔ انہوں نے انسان کے سامنے نمونہ کی زندگی پیش کی ہے، انہوں نے تمدن و معاشرت کا ایک معیار اور آئیڈیل ہمارے سامنے رکھا ہے، انہوں نے ہمیں ذریعہ اصول اور مقاصد دیے ہیں۔ انہوں نے تاریخ کی رگوں میں زندہ و پائیدار روایات کا خون دوڑا دیا ہے، انہوں نے اخلاقی اقدار کے تارے آسمانِ تہذیب پر جگمگا دیے ہیں۔ انہوں نے آدمی کو حوصلے اور ارمان اور امیدیں اور دلوں سے دیئے ہیں۔ انہوں نے اصول و مقاصد کے لیے قربانی اور جدوجہد کا درس دیا ہے۔ یہی ہستیاں ہیں کہ جن کے روشن کارناموں کے طفیل تاریخ اس قابل ہوئی کہ اس کا ریکارڈ محفوظ رکھا جائے اور اس سے قیامت تک نوعِ انسانی نئی نئی روح عمل اخذ کرتی رہے۔ پھر جب کبھی بدی اور جھوٹ اور ظلم کی طاقتوں نے ایک سنگین نظام اور ایک آہنی ماحول بن کر زندگی کو خوب اچھی طرح گھیر اور بھینچ لیا ہے اور آدمی ہمت ہار کر مایوسی کے گڑھوں میں جا گر رہا ہے تو ایسے موقعوں پر تاریخ کے یہی ہیرو نوعِ انسانی کے کام آئے ہیں اور انہوں نے سوتوں کو جگایا۔ گرتوں کو اٹھایا۔ بزدلوں کو شجاعت کا آبِ حیات پلایا اور ہتھیار ڈال دینے والوں کو از سر نو میدانِ کارزار

کی اگلی صفوں میں کھڑا کر کے شرفِ نساد کی قوتوں سے لڑا یا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان مایہ ناز ہستیوں نے تاریخ کے جمود کو توڑا ہے۔ تمدن کے بیخ بستہ سمندر میں پھر حرکت پیدا کی ہے، فکر و عمل کی رُک ہوئی ندیوں کو نئے سرے سے بہاؤ دیا ہے۔ اور تغیر کی رو اٹھا کر سنگین نظام اور آہنی ماحول کو الٹ کر رکھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ روانِ انسانیت اپنے ارتقا کے صراطِ مستقیم پر بے روک ٹوک رواں دواں ہو گیا!

خیر و فلاح اور تعمیر اور بناؤ کی ہم میں حصتہ لینے والوں کی صفوں کا جب بھی جائزہ لیا جائے۔ ان میں خدا کے انبیاء و رسل کی صفیہ اول ہی اپنی امتیازی شان کی وجہ سے ہم سے بیش از پیش خراجِ عقیدت حاصل کرتی ہے۔ باقی جتنی بھی صفیں صدیقین اور شہداء اور صالحین کی آراستہ نظر آتی ہیں وہ سب کے سب اسی صفِ اول کے کارناموں کی خوشہ چین اور اسی کی کمانڈ میں کام کرنے والی ہیں اور انبیاء و رسل کی صفِ مقدس میں نگاہِ بے اختیار جس ہستی پر سب سے پہلے جا کر ٹکتی ہے وہ سیدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک ہے! یہ ہے تاریخ کا سب سے بڑا محسنِ انسانیت! اس ہستی کو جس پہلو سے دیکھیے اس کی گونا گوں عظمتیں درخشاں نظر آتی ہیں اور ان عظمتوں کی قصیدہ خوانی کرتے کرتے گزشتہ پونے چودہ صدیوں میں نہ جانے نسلاً بعد نسل کتنے عقیدت مند ان رسالتِ دنیا سے رخصت ہو گئے مگر حق یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو سکا! اور آئندہ بھی یہ حق کس سے ادا ہو گا؟ محض ایک جذبہ شوق کا تقاضا ہے کہ جس سے پہلے بھی سرشار رہے اور پچھلے بھی سرشار رہیں گے، جناب ماہر کی اکساہٹ سے اسی جذبہ شوق کے تحت راقم الحروف کے جی میں آتی کہ آنحضرت کی سیرت کے اس عظیم پہلو کو اجمالاً نمایاں کیا جائے کہ آپ نے اپنی قوم اور انسانیت کی تعمیر و فلاح کے لیے جب میدان میں قدم رکھا تو کس ظلم و تشدد سے آپ کا غیر مقدم کیا گیا اور کس طرح ساری عمر ایک بے مثال محسن کے احسان کا جواب اندھی مخالفتوں اور ذلیل قسم کی شرادوں سے دیا جاتا رہا، اور دوسری طرف اس ظلم و تشدد اور ان مخالفتوں اور شرادوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے رسولِ پاک نے کس سیرت و کردار کا مظاہرہ کیا! — حدیثِ دلبر کے اس درد بھرے پہلو میں ان کے لیے بھی ایک سبق ہے جو نیکی کا راج قائم کرنے کی جدوجہد میں حصتہ لیں اور ان کے لیے بھی ایک سبق ہے جو ایسی کسی جدوجہد کی مزاحمت کرنے کے لیے اٹھیں۔

یہ ہے تاریخِ انسانیت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام! — تاریخ گواہی دیتی ہے کہ وہ

سب سے بڑا تاریخ ساز تھا۔

انسانی فلاح و بہبود کے سب سے بڑے اس کام کو کرنے کے لیے جب حضرت خاتم النبیینؐ

تشریف فرما ہوئے۔ تو وہ ساری عقوبتیں اور ایذائیں جو مجملہ انبیاء و رسل پر مختلف زمانوں میں آزمائی گئی تھیں۔ شیطان بیک دم ان سب کو جمع کر کے لایا اور ایک یکہ و تنہا ینیم نو جوان کو چوکھی پڑتے رہنے پر مجبور کر دیا! سیرت نبوی کا منظر کچھ ایسا ہے جیسے تاریکی کے طوفانی سمندر میں بغیر کشتی اور پتوار کے کوئی پیراک ہو چوں گردابوں اور نہنگوں سے لڑ رہا ہو۔ زفیریں بجاتی ہوئی تیز و تند ہوائیں چل رہی ہوں، کالی گھٹاؤں کا غیظ و غضب برق و رعد کی چمک اور کرکٹک بن کر اٹھ اڑتا ہو، اولوں کی بوچھاڑیں پڑ رہی ہوں۔ لیکن شاد و پھر بھی اپنا راستہ نکالتا آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا ہو! کیا تاریخ کے پاس رقت انگیز مظلومیت اور ایسے عزم آموز استقلال کی کوئی مساویانہ مثال ہے؟

معرکہ خیر و شر کا ڈرامہ جب بھی ایٹیج ہوتا ہے۔ اس کے بنیادی کردار ہمیشہ ایک ہی ہوتے ہیں۔ زمانہ بدل جاتا ہے۔ جغرافیائی ماحول نیا پیدا ہو جاتا ہے، اشخاص کے نام بدل جاتے ہیں، لیکن ان کا مقررہ پارٹ نہیں بدلتا! ایک کردار صاحبِ دعوت کا کردار ہوتا ہے۔ دوسرا کردار سوسائٹی کے اس جوہرِ خالص کا ہوتا ہے جو سچائی اور نیکی کی لپکار سنتے ہی آواز کو اپنے فطری ذوق سے پہچانتا اور اس پر بے دھڑک لبیک کہتا ہے اور سابقوں اور اولوں کا موقف سنبھالتا ہے۔ تیسرا کردار اخلاق کے ساتھ اختلاف کرنے والوں کا ہوتا ہے جو بات کو سنتے ہیں، سوچتے ہیں مگر علم و شعور کی کوتاہی اور بعض ذہنی نفسیاتی رکاوٹوں کی وجہ سے حقیقت کو پوری طرح سمجھنے میں دیر لگاتے ہیں۔ چوتھا نہایت ہی سرگرم اور ہنگامہ آرا کردار دشمنانِ حق کا ہوتا ہے جو اپنے مفاد اور اپنے مناصب اور اپنے مرتبے اور اپنی بگڑی ہوئی عادات کی وجہ سے اول روز سے جانتے بوجھتے ضدِ ضد کے اسلوب پر مخالفت کی مہم چلاتا ہے اور روز بروز اس کمزور میں بہتا ہی چلا جاتا ہے، پانچواں کردار کمزور عوام کا ہوتا ہے جو معاشرہ کے اونچے طبقوں کے زبردست ہونے کی وجہ سے کوئی جرأت مندانہ اور فعالانہ اقدام نہیں کر سکتے اور نہ ذہنی طور پر آسانی سے کسی دعوت کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہ بالعموم داعیِ حق اور دشمنانِ حق کی کشمکش کو سالہا سال تک تڑپ کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں اور جب آخر کار پانسہ کسی طرف پلٹ جاتا ہے تو پھر یہ سیلابِ قوت بھی حرکت میں آتا ہے اور اسی رخ بہ نکلتا ہے۔ پس معرکہ خیر و شر کے ڈرامے کی گرما گرمی دوہی کرداروں کی مرہون منت ہوتی ہے! یعنی داعیِ حق اور اس کے رفقاء کا کردار، اور جوابی اور منفی طوفان اٹھانے والے فعال مخالفین کا کردار! ناممکن ہے کہ دعوتِ حق کا کھیل کھیلا جائے اور یہ دونوں کردار آمنے سامنے نہ آجائیں! ناممکن ہے کہ سچائی اور نیکی کی آواز اٹھائیے تو اس کے جواب میں جھوٹ اور برائی کی ساری طاقتیں اٹھ کر نہ آجائیں! ناممکن ہے کہ

انسانیت کی بھلائی اور خدمت کے لیے کام شروع کیجئے۔ تو دنیا گالیوں اور الزامات اور پروپیگنڈوں اور سازشوں اور تشدد کے مختلف ہتھیاروں کے ساتھ ہجوم کر کے نہ آجائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اگر محض کچھ اچھی باتیں سوچتے اور کہتے رہتے، اپنے پسندیدہ طریقے پر خدا کی رکوع و سجود کے ساتھ صرف عبادت کرتے رہتے، کسی خلوت میں بیٹھے ذکر و اذکار فرماتے رہتے بلکہ اچھے اچھے وعظ بھی فرماتے رہتے اور مریدوں کا ایک حلقہ یا اپنے متبعین کی ایک بے مزد سی انجمن بھی بنا ڈالتے تو زمانہ یہ سب کچھ برداشت کر لیتا ہے۔ لیکن آپ ساری زندگی کو بدلنے چلے تھے آپ تمدن کی ساری عمارت کی تعمیر نو چاہتے تھے۔ آپ نظام اجتماعی کو ادھیڑ کر بہترین نقشے پر از سر نو بنانے پر مامور تھے، آپ مفاد اور حقوق کے اس سارے توازن کو درہم برہم کر دینے کے لیے تھے جو آپنی مضبوطی کے ساتھ قائم تھا۔ آپ انسان کو ایک نئے اعتقادی و اخلاقی سانچے میں ڈھالنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ پہلے دن سے آپ نے اسی چیز کی دعوت دی اور پہلے دن سے قوم نے آپ کی دعوت کا یہی مفہوم سمجھا۔ چنانچہ سارے کا سارا جوانی رو یہ اسی مفہوم کے فطری ردِ عمل سے پیدا ہوا۔

نیکی اور سچائی کی ہمہ گیر تحریک کے مخالفین کا کسی بھی دور میں جائزہ لیجیے۔ تو دیکھیے گا کہ ان کے منفی ہنگاموں کی تدریج اور تکنیک ہمیشہ ایک ہی رہی ہے۔ سب سے پہلے ہمیشہ معمولی سی استہزاء و تضحیک سے کام لیا گیا۔ پھر اگلے مرحلے میں گالیوں اور طعنوں، جھوٹ، افتراء اور نکتہ آفرینیوں اور بدنام کن القابات کا طوفان اٹھایا گیا۔ پھر عوام میں غلط فہمیاں پھیلانے کے لیے جھوٹے پروپیگنڈے کا زور باندھا گیا۔ معاملہ اور آگے بڑھا تو ایک طرف تو می مفاد اور اتحاد کے خطرے میں پڑنے کا واسطہ دلایا گیا۔ اور دوسری طرف مذہبی بنیادوں پر جاہل عامی طبقے میں اشتعال پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ بیچ بیچ میں عقلی دلائل کے تیرتکے لڑائے جاتے رہے۔ اعتراضات اور سوالات کی بوچھاڑ ہوتی رہی۔ جب محسوس ہوا کہ ایک خطرناک دعوت زور پکڑ رہی ہے تو سودا بادی کی کوششیں کی گئیں۔ سارے حربے ناکام دیکھ کر تشدد کے نہایت ذلیل طریقے اختیار کیے گئے۔ اور معاشی اور سوشل بائیکاٹ کا دباؤ ڈالا گیا۔ قید و بند اور جلا وطنی کے منصوبے عمل میں لائے گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر داعی حق کے قتل کے ارادے کیے گئے۔ اگر معاملہ اس مرحلے سے بھی آگے نکل گیا۔ تو معرکہ کارزار گرم کر کے دعوت مبارزت دی گئی۔ یہ سارے مراحل حضرت سیدنا خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کو یکے بعد دیگرے پیش آئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر مرحلے سے شاندار کامیابی کے ساتھ آگے بڑھایا

اور وہ دن آیا کہ سارا عرب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں تھا :

اس کتاب میں سیرت پاک کے مستند واقعاتی مواد کو پورے ربط و تسلسل کے ساتھ ایسے انداز سے لایا گیا ہے کہ اس عظیم معرکہ خیر و شر کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جسے تاریخ کا جمود توہ کر حضور نے فرمایا۔ اور پھر عمر کی ایک ایک گھڑی اسی میں لکھپادی۔ مجھے امید ہے کہ قاری اس کا مطالعہ کرتے ہوئے ساڑھے تیرہ صدیوں کا فاصلہ عبور کر کے اپنے آپ کو محسن انسانیت کے قریب محسوس کرے گا۔ اسے واقعات کی روا اپنے سامنے چلتی معلوم ہوگی، وہ تحریک اسلامی کی لہروں کو اپنے عالم تصور میں امنڈتے دیکھے گا۔ وہ حق و باطل کی اس کشمکش کا غیر جانب دار تماشائی بن کے کنارے بیٹھا نہ رہ سکے گا۔ بلکہ اس کے اندر مثبت جذبے ابھریں گے۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ تاریخ انسانی میں میرا حصہ کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے !

مجھے اُمید ہے کہ اس کتاب سے عزیمت و استقلال کا درس حاصل کیا جاسکے گا۔ اور مشکل ترین حالات میں ادا نئے فرض کا حوصلہ پیدا ہوگا۔ اس کے مطالعہ سے اپنے سب سے بڑے محسن (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحیح قدر دیوں میں پیدا ہوگی۔ ایک گہرا جذبہ سپاس ابھرے گا۔ ایک دالہیت و عقیدت آپ کی ذات کے لیے پیدا ہوگی جو مطوہ دین ہے۔ یہ اندازہ کیا جاسکے گا کہ آج جس نورِ حق سے ہمارے سننے و دشن ہیں اس کو لانے والا کیسی کیسی آزمائشوں سے گذر کر کیسی کیسی مخالفتوں کا مقابلہ کر کے کیسے کیسے رہنمائی کے حملوں کی زد پر آکر اور خون اور آنسوؤں کے کیسے کیسے سمندروں کو پار کر کے اسے ہم تک پہنچا سکا ہے۔ اس سے یہ شعور حاصل ہوگا کہ سچائی اور نیکی کے علمبرداروں کی راہ پر آشوب گھاٹیوں سے ہو کر نکلی ہے اور اس راہ کو جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسی مقبول بارگاہ اور یکتائے روزگار ہستی کے لیے کانٹوں سے صاف کر کے پھولوں کے فرش سے آراستہ نہیں کیا۔ تو اب اور کس کے لیے کوئی ایسا خفیہ شارٹ کٹ نکال دیا جائے گا کہ آدمی اپنے گوشہ عافیت سے اٹھے تو بغیر پاؤں پر گرد پڑے سیدھا جنت میں جا پہنچے۔ سوانح رسالت مآب کی دکھ بھری کہانی پڑھنے سے وہ سارے مغالطے اور من سمجھوتے کا نور ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے آدمی عافیت اور خدا پرستی کو جمع کیسے امن چین سے پڑا رہتا ہے۔ ہمیں سیرت نبوی کی روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ اگر وہ سنگ میل کہیں دکھائی نہیں دیتے، وہ نشاناتِ راہ سامنے نہیں آتے۔ وہ موڑ اور نشیب و فراز پیش نہیں آتے۔ وہ کانٹے اور پتھر راستے میں نہیں پڑتے، وہ رہزن اور غول بیابانی حملہ آور نہیں ہوتے۔ وہ ٹھوکریں نہیں لگتیں۔ وہ چر کے نہیں آتے، جن کے تذکرے سے قرآن کے صفحے اور سیرت کے ابواب بھرے پڑے ہیں۔ تو ہمیں اپنی سمت سفر پر، اپنی منزل مقصود پر اپنی اختیار کردہ

راہِ عمل پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ "کہیں راہ کہ تو میری بہ ترکستان است" اس کے مطالعہ سے ہر مسلمان پیشتر سے خبردار رہ سکتا ہے کہ اس اُمت میں جب کبھی بھی کوئی شخص یا گروہ دعوتِ نبویؐ اور تحریکِ نبویؐ کو لے کے اُٹھے گا اور اسی طریقے پر کام کرنا چاہے گا۔ تو اس کے خلاف استہزاء و تحقیر، دشنام طرالی، الزام تراشی، نکتہ آفرینی، اشتعال انگیزی، تکفیر و تفسیق، جھوٹے پروپیگنڈے، سازش اور شرارت، ظلم اور تشدد کے وہ سارے طوفان اُٹھ کھڑے ہوں گے جو اس کام کے لیے مقدر ہیں۔ ان طوفانوں میں گھرے ہوئے کسی بھی دور میں اُٹھنے والے داعیِ حق کو پہچاننا اور اس کی بات کو سمجھنا اور اس کی پکار پر لبیک کہنا صرف ایسے ہی لوگوں کے لیے آسان ہو سکتا ہے جو قرآن اور سیرتِ نبویؐ کے مطالعے سے معرکہِ خیر و شر کے ڈرامے کے پیش آئندہ ہر ایکٹ اور منظر کا صحیح تصور پہلے سے رکھتے ہوں۔ ہر مسلمان کو یہ جانتا چاہیے۔ کہ باطل کی وہ طاقتیں جنہوں نے نبی اکرمؐ جیسی بے داغ شخصیت کو نہ بخشنا اور جنہوں نے بعد میں حضور کی پیروکار ہستیوں — امام حسینؑ، امام مالکؑ، امام احمد بن حنبل، امام ابوحنیفہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ کو بچ کے نہ جانے دیا۔ وہ کسی اور کو کہاں اپنی کرم فرمایوں سے مستثنیٰ رکھنے پر تیار ہو سکتی ہیں۔ سیرتِ نبویؐ ہمیں ہر دور میں داعیانِ حق اور دشمنانِ حق کے کردار میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔ ان سارے کرداروں کو اس کتاب میں نمایاں کر دینے کی کوشش کی ہے جو معرکہِ خیر و شر میں کام کرتے ہیں!

مجھے امید ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اس خوف ناک تضاد کا احساس دلائے گا جو ہمارے ایمان بالرسالت اور ہماری عملی زندگیوں میں پیدا ہو گیا ہے۔ آج کوئی ایک سر زمین بھی ایسی نہیں ہے جہاں محسنِ انسانیت کا نظامِ حیات برپا ہو کر کام کر رہا ہو۔ عالمِ اسلام پادشاہتوں اور آمرتوں کی جوا لنگا بنا ہوا ہے جن کے دم سے ایک طرف قدیم ظلمتیں ہمارے گرد محیط ہیں اور دوسری طرف جدید دور کی تاریکیاں ہم پر مسلط ہیں، ذہنی لحاظ سے ہم جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ معاشی لحاظ سے مفلوک الحالی میں مبتلا ہیں۔ ثقافتی لحاظ سے دوسروں کے بھکاری ہیں اور بین الاقوامی حیثیت سے ہم دونوں بلاکوں کے لیے ستا شکار ہیں۔ یہ ہے اس تضاد کی سزا جسے ہم بھگت رہے ہیں!

اس کتاب کا اصل پیغام یہ ہے کہ ہم محسنِ انسانیت کی دعوت کا احیاء کریں۔ حضورؐ کے قائم کردہ خطوط پر تبدیلی احوال کے لیے جدوجہد کریں اور نظامِ عدل و رحمت کو ٹھیک اس عملی نقشہ پر استوار کریں جو قرآن کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اس قائدِ انسانیت نے وضع کیا تھا! وقت آ گیا ہے کہ ہم اور ہمارے نوجوان تہذیبِ حاضر کی مرحوبیت کا بوجھ پیروں سے اتار پھینکیں، اور اس مادہ پرستانہ دور

کے خلاف فکری بغاوت کا علم اٹھائیں۔ محمّد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو کتابوں کے صفحات سے نکال کر نئے سرے سے عملی زندگی کے اوراق پر رقم کریں۔ اسے ایک اجتماعی نظام کی صورت میں مرتب کر دیں۔ اور راہِ نجات کھولنے والی وہ تیسری طاقت بنیں جس کی جگہ تاریخ میں خالی پڑی ہے۔

خدا نے رحیم اس ناچیز سچی کو قبول کرے اور اسے اپنے مقاصد میں کامیاب کرے!

نعیم صدیقی

یکم دسمبر ۱۹۵۹ء





# مُحْسِنِ الْإِنْسَانِيَّةِ ﷺ

مُخَالَفَتُورِ كَطُوفَانِ سَيِّغُزْرَتِ هُوْنِ

## تعارف

### شخصیت ————— ایک نظریں

وَإِذَا أَنْظَرْتُ إِلَىٰ أَسْرَةٍ وَجْهِهِ  
بَرَقَتْ كَبَرْقِ الْعَارِضِ الْمُتَهَلِّكِ

ابو کبیر ہندلی

جب میں نے اس کے مُوئے تاباں پر نگاہ ڈالی، تو اس کی  
شانِ رخشندگی ایسی تھی جیسے کہ کسی لکڑے میں بجلی کو ندرہ بجی ہو!!

---

۱۰ رنگ تغزل سے ملویہ شعر دورِ جاہلیت کے ایک مشہور شاعر ہندلی کا کہا ہوا ہے، اور حضرت عائشہ صدیقہ نے بے تکلفی کے  
ایک موقع پر بڑے لطیف انداز سے حضور کو اس کا مصداق کھنڈیا۔

عَبْدُ اللَّهِ بْنِ سَلَامٍ

یہ چہرہ ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔

## ایک جھکٹ :

دنیا میں عظیم کارنامے انجام دینے والی ہستیاں (خصوصاً انبیاء علیہم السلام) ہمیشہ غیر معمولی درجے کی شخصیتوں سے آراستہ ہوتی ہیں۔ اصلاح کے کام، تحریکوں کی رہنمائی، تہذیبوں کی تعمیر نو کرنے والوں کی اصل قوت ان کی شخصیت ہی ہوتی ہے جو خاص طرح کے انکار و کردار سے بنتی ہے۔ سیرت پاک کے مطالعہ کی ایک غایت یہ بھی ہے کہ محسن انسانیت کی شخصیت کو سمجھا جائے۔

کسی بھی شخصیت کو سمجھنے میں اس کی وجاہت بہت بڑی مدد دیتی ہے۔ آدمی کا سراپا، اس کے بدن کی ساخت، اس کے اعضاء کا تناسب خاص، اس کے ذہنی اور اخلاقی اور جذباتی مرتبے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ خصوصاً چہرہ ایک ایسا قرطاس ہوتا ہے جس پر انسانی کردار اور کارناموں کی ساری داستان لکھی ہوتی ہے اور اس پر ایک نظر ڈالتے ہی ہم کسی مقام کا تصور کر سکتے ہیں۔

ہم بعد کے لوگوں کی یہ کوتاہی قسمت ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے انسان کا رونے زیبا ہمارے سامنے نہیں ہے اور نہ ہم عالم واقعہ میں سر کی آنکھوں سے زیارت کا شرف حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم حضور کے حسن و جمال کی جو کچھ بھی جھک پائے ہیں، وہ حضور کے پیغام اور کارنامے کے آئینے ہی میں پائے جاسکتے ہیں۔

حضور کی کوئی حقیقی شبیہ یا تصویر موجود نہیں ہے۔ خود ہی حضور نے امت کو اس سے باز رکھا۔ کیونکہ تصویر کا فتنہ شرک سے دے دے نہ رک سکتا۔ حضور کی اگر کوئی تصویر موجود ہوتی تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا کیا کرامات اور اعجاز منسوب ہو جاتے۔ اور اس کے اعزاز کے لیے کیسی رسمیں اور تقریبیں نمودار ہو چکی ہوتیں بلکہ بعید نہ تھا کہ اس کی پرستش ہونے لگتی۔ یورپ میں حضور کی فرضی تصاویر بنائی جاتی رہی ہیں لیکن کونسا آرٹسٹ ایسا ہے کہ جو حضور کے عالم خیال اور کردار کا شوشہ بہ شوشہ کامل اور جامع تصور رکھتا ہو اور پھر اس تصور کو لکیروں اور رنگوں میں پوری طرح جلوہ گر کر سکے۔ فرضی تصویریں جو کچھ بھی بنتی ہیں وہ اس مخصوص پیکر کی نہیں

۱۔ دوسری کتابیں بھی سامنے ہیں لیکن اس موضوع کے لیے مؤلف زیادہ تر شمائل ترمذی کا منت کش رہا۔

ہوتیں جس کا اسم مبارک محمد تھا بلکہ کسی موبوم وجود کا خاکہ گھڑ کر اس کو حضور کا نام دے دیا جاتا ہے۔ معاملہ دیانت کے تابع بھی نہیں رہتا، بلکہ دانستہ ایسی تصویریں پیش کی جاتی ہیں جن سے ایک کمزور اور ناقص شخصیت کا تصور پیدا ہو۔ ان تصاویر کے لیے رنگ انہی متعصبانہ تصانیف اور تذکروں سے لیا جاتا ہے جو عناد اور کج فہمی اور حقیقت ناشناسی کی مظہر ہیں۔ انبیاء اور صلحاء کی فرضی تصاویر بنانے یا ان کے کردار ڈراموں میں لانے سے نقصان یہی ہے کہ ان کے اصل کردار ان پردوں کے پیچھے بالکل گم ہو کے نہ رہ جائیں۔

لیکن حضور کے صحابیوں نے کم سے کم پردہ الفاظ میں حضور کی شبیہ کو مرتب کر دیا ہے اور اسے محفوظ حالت میں اصحاب روایت نے ہم تک پہنچا دیا ہے یہاں ہم اس لفظی شبیہ کو پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین حضور کے کردار کا مطالعہ کرنے سے پہلے اس عظیم انسان کی ایک جھلک دیکھ لیں۔ یہ گویا ایک نوع کی ملاقات ہے۔ ایک تعارف!

حضور کے چہرہ اقدس، قد و قامت، خدو خال، چال ڈھال اور وجاہت کا جو عکس صدیوں کے پردوں سے چھین کر ہم تک پہنچتا ہے وہ بہر حال ایک ایسے انسان کا تصور دلاتا ہے جو ذہانت، شجاعت، صبر و استقامت، راستی و دیانت، عالی ظرفی، سخاوت، فرض شناسی، وقار و انکسار اور فصاحت و بلاغت جیسے اوصاف حمیدہ کا جامع تھا، بلکہ کہنا چاہیے کہ حضور کے جسمانی نقشے میں روح نبوت کا پرتو دیکھا جا سکتا ہے۔ اور آپ کی وجاہت خود آپ کے مقدس مرتبہ کی ایک دیسی تھی۔ اس موقع پر آپ کا ایک ارشاد یاد آیا۔ فرمایا۔ **وان تقوی اللہ تبیض الوجوہ**۔ خدا کا تقوی ہی چہروں کو روشن کرتا ہے۔ نبوت تو ایمان و تقویٰ کی معراج ہے، نبی کا چہرہ تو نور افشاں ہونا ہی چاہیے۔

سو یہ ہے اس آفتاب حق کی ایک جھلک!

وجاہت۔

”میں نے جو نبی حضور کو دیکھا تو فوراً سمجھ لیا کہ آپ کا چہرہ ایک جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔“ (عبداللہ بن سلام)

”میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر حاضر ہوا تو لوگوں نے دکھایا کہ یہ میں خدا کے رسول!

۱۰ یہود کے ایک بڑے عالم تھے جن کا نام حصین تھا۔ سرور عالم کے مدینے آنے پر یہ دیکھنے کو گئے، دیکھتے ہی ان کو جو تاثر ہوا۔ بعد میں اُسے انہوں نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ایمان لانے اور عہد اللہ نام تجویز ہوا (سیرۃ المصطفیٰ

مولانا محمد ادریس کاندھلوی ج ۱ ص ۳۲۹ - ۳۵۰)

بیٹھے ہی میں نے کہا۔ واقعی یہ اللہ کے نبی ہیں۔ (ابوہریرہ تمیمی)

”مطہن رہو، میں نے اس شخص کا چہرہ دیکھا تھا جو چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن تھا وہ کبھی تمہارے ساتھ بد معاملگی کرنے والا شخص نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا آدمی (اونٹ کی رقم) ادا نہ کرے تو میں اپنے پاس سے ادا کر دوں گی۔“ (ایک معزز خاتون)

”ہم نے ایسا خوب رو شخص اور نہیں دیکھا۔ ہم نے اس کے منہ سے روشنی سی نکلتی دیکھی ہے۔“

(ابو قرمانہ کی والدہ اور خالہ)

”حضور سے زیادہ خوب رو کسی کو نہیں دیکھا۔ ایسا لگتا، گویا آفتاب چمک رہا ہے۔“ (ابوہریرہ)

”اگر تم حضور کو دیکھتے تو سمجھتے کہ سورج طلوع ہو گیا ہے۔“ (ربیع بنت معوذ)

”دیکھنے والا پہلی نظر میں مرعوب ہو جاتا۔“ (حضرت علیؓ)

”میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں حضور کو دیکھ رہا تھا، آپ اس وقت سرخ جوڑا زیب تن کیے

ہوئے تھے۔ میں کبھی چاند کو دیکھتا تھا اور کبھی آپ کو، بالآخر میں اس فیصلے پر پہنچا کہ حضور اکرم چاند سے

کیوں زیادہ حسین ہیں۔“ (حضرت جابر بن سمرہ)

”خوشی میں حضور کا چہرہ ایسا چمکتا گویا چاند کا ٹکڑہ ہے۔ اسی چمک کو دیکھ کر ہم آپ کی خوشی کو پہچان

جاتے تھے۔“ (کعب بن مالک)

”پھرے پر چاند کی سی چمک تھی۔“ (مہد بن ابی ہالہ)

پھرہ

”بدر کی طرح گولائی لیے ہوئے۔“ (براد بن عازب)

”چہرہ بالکل گول نہیں تھا۔ ہلکی گولائی لیے ہوئے۔“ (حضرت علیؓ)

”پیشانی کشادہ۔ ابرو خمدار۔ باریک اور گنجان۔ (دونوں جُدا جُدا۔ دونوں کے درمیان میں ایک

رگ کا اُبھار جو عَصَہ آنے پر نمایاں ہو جاتا۔“ (مہد بن ابی ہالہ)

۱۔ شامل ترمذی۔

۲۔ مدینہ میں ایک تجارتی قافلہ وارد ہوا۔ اور شہر سے باہر ٹھہرا۔ حضور کا اتفاقاً اس طرف گزر ہوا۔ ایک اونٹ کا سودا کر لیا اور یہ

لکرا اونٹ ساتھ لے آئے کہ قیمت بھجواتے دیتا ہوں، بعد میں قافلے والوں کو تشویش ہوئی کہ بغیر جان پہچان کے معاملہ کر لیا۔ اس پر سردار

قافلہ کی خاتون نے مذکورہ فقرہ کہا۔ یہ واقعہ طارق بن عبد اللہ نے بیان کیا جو خود شریک قافلہ تھے بعد میں حضور نے طے شدہ قیمت سے

زیادہ مقدار میں کھجوریں بھجوا دیں۔ (سیرت النبیؐ مولانا شبلی مرحوم جلد دوم صفحہ ۳۸۰۔ الموابب اللدینہ جلد ۱ ص ۲۴۲)

۳۔ یہ خواتین حضور کی خدمت میں ابو قریظہ کے ساتھ بیعت اسلام کے لیے گئی تھیں اور لوٹتے ہوئے انہوں نے اپنے تاثرات بیان کیے

الموابب اللدینہ ج ۱ ص ۲۵۵

” مسرت پیشانی سے جھلکتی تھی “ (کعب بن مالک)  
 رنگت —————

” نہ چونے کی طرح سفیدی . نہ سالنولاپن . گندم گوں جس میں سفیدی غالب تھی “  
 (حضرت انسؓ)

” سفید سُرخ مائل “ (حضرت علیؓ)

” سفید مگر ملاحظت دار “ (ابوالطفیل)

” سفید — چمک دار “ (ہند بن ابی ہالہ)

” گویا کہ چاندی سے بدن ڈھلا ہوا تھا “ (حضرت ابوہریرہ)  
 آنکھیں —————

” آنکھیں سیاہ — پلکیں دراز “ (حضرت علیؓ)

” پتیلیاں سیاہ — نظریں نیچی — گوشہ چشم سے دیکھنے کا حیا دارانہ انداز “ (ہند بن ابی ہالہ)  
 ” سفید حصے میں سُرخ ڈھلے — آنکھوں کا خانہ لمبا — قدرتی سرگیں “ (جابر بن سمرہ)  
 ناک —————

” بلندی مائل — اس پر نورانی چمک — جس کی وجہ سے ابتدائی نظریں بڑی معلوم ہوتی “  
 (ہند بن ابی ہالہ)

رُخسار —————

” ہموار اور ہلکے — نیچے کوندا سا گوشت ڈھلکا ہوا “  
 (ہند بن ابی ہالہ)  
 دہن —————

” فراخ — “ (جابر بن سمرہ)

” بہ اعتدال فراخ “ (ہند بن ابی ہالہ)

دندان مبارک —————

” باریک — آبدار — سامنے کے دانتوں میں خوش نما ریشیں “ (حضرت ابن عباسؓ)  
 ” تکلم فرماتے تو دانتوں سے چمک سی نکلتی ہوتی “ (حضرت انسؓ)  
 ریش —————

” بھر پور اور گنجان بال “ (ہند بن ابی ہالہ)

گردن —

”پتلی لمبی — جیسے مورتی کی طرح خوب صورتی سے تراشی گئی ہو۔“  
 ”گردن کی رنگت چاندی جیسی اجلی اور خوشنما“ (ہند بن ابی ہالہ)

سر —

”بڑا — مگر اعتدال اور مناسبت کے ساتھ“ (ہند بن ابی ہالہ)

بال —

”قدرے خمدار“ (حضرت ابوہریرہ)

”نہ بالکل سیدھے تنے ہوئے — نہ زیادہ پیچ دار“ (قنادہ)

”ہلکا خم لیے ہوئے“ (حضرت انسؓ)

”گنجان — کبھی کبھی کانوں کی ٹوٹک لمبے! کبھی شانوں تک“ (براء بن عازب)

”درمیان سے نکلی ہوئی مانگ“ (ہند بن ابی ہالہ)

”بدن پر بال زیادہ نہ تھے — سینہ سے ناف تک بالوں کی باریک لکیر“ (حضرت علیؓ - ہند بن ابی ہالہ)

”کندھوں، بازوؤں اور سینہ کے بالائی حصہ پر محفوظے سے بال تھے“ (ہند بن ابی ہالہ)

مجموعی ڈھانچہ —

”بدن گٹھا ہوا — اعضاء کے جوڑوں کی بڑیاں بڑی اور مضبوط“ (ہند بن ابی ہالہ)

”بدن موٹا نہیں تھا“ (حضرت علیؓ)

”قد — نہ زیادہ لمبا تھا، نہ پست! میانہ“ (حضرت انسؓ)

”قامت مثل یہ درازی! — مجمع میں ہوں تو دوسروں سے قد نکلتا ہوا معلوم ہوتا“

(براء بن عازب)

”پیٹ باہر کو نکلا ہوا نہ تھا“ (امم معبد)

”دینیوی نعمتوں سے بہرہ اندوز ہونے والوں سے حضورؐ کا جسم (باوجود فقر و فاقہ کے) زیادہ

(المواہب ج ۱ ص ۳۱)

تروتازہ اور توانا تھا“

۱۰ مشہور واقعہ ہے کہ حضورؐ نے عمرہ کیا تو سوادنٹ بہ نفس نفیس لانگے اور ان میں سے ۶۳ کو بدست خود نخر کیا اور بقیہ کو حضرت علیؓ کے سپرد کیا۔

”میں نے رسول اللہ سے بڑھ کر کوئی بہادر اور زور آور نہیں دیکھا“ (ابن عمر)  
 کندھے اور سینہ

”سینہ چوڑا — سینہ اور پیٹ ہموار“ (ہند بن ابی ہالہ)

”سینہ چوڑا“ (براد بن عازب)

”موندھوں کا درمیانی فاصلہ عام پیمانے سے زیادہ“ (ہند بن ابی ہالہ - براد بن عازب)

”کندھوں کا درمیانی حصہ پُر گوشت“ (حضرت علیؓ)

بازو اور ہاتھ

”کلاٹیاں دراز — ہتھیلیاں فراخ — انگلیاں موزوں حد تک دراز“ (ہند بن ابی ہالہ)

”ریشم کا دبیر یا باریک کوئی کپڑا یا کوئی اور چیز ایسی نہیں جسے میں نے چھوا ہو اور وہ حضورؐ کی

ہتھیلیوں سے زیادہ نرم و گداز ہو“ (حضرت انسؓ)

قدم

”پنڈلیاں پُر گوشت نہ تھیں — ہلکی ہلکی سستی ہوئی“ (جابر بن سمرہ)

”ہتھیلیاں اور پاؤں پُر گوشت — تلوے قدرے گہرے — قدم چکنے کہ پانی نہ ٹھہرے۔“

(ہند بن ابی ہالہ)

”ایڑیوں پر گوشت بہت کم“ (جابر بن سمرہ)

## ایک جامع لفظی تصویر :

یوں تو حضورؐ کے متعدد رفقاء نے حضورؐ کی شخصیت کے مرقعے لفظوں میں پیش کیے ہیں لیکن اہم معنی

نے جو تصویر مرتب کی ہے اس کا جواب نہیں، وادی ہجرت کا سفر طے کرتے ہوئے مسافر حق جب اپنی منزل

۱۔ مکہ میں رکاز نامی ایک پہلوان تھا جو اکھاڑوں میں کشتیاں لڑتا۔ ایک دن حضورؐ کسی طحہ وادی میں اس سے ملے اور

اپنی دعوت دی۔ اس نے دعوت کے لیے کوئی معیارِ صدق طلب کیا۔ اس کے ذوق کے پیش نظر حضورؐ نے کشتی کرنا پسند

کر لیا۔ تین بار کشتی ہوئی اور تینوں بار آپ نے اسے پچھاڑ دیا۔ اسی رکاز پہلوان کے بیٹے ابو جعفر محمد کی یہ روایت نام

نے متدرک میں لی ہے۔ اور ابو داؤد اور ترمذی نے اسے پیش کیا ہے اور بیہقی نے سعید بن جبیر کی دوسری روایت

کی ہے جس میں آتا ہے کہ حضورؐ نے بعض دوسرے لوگوں کو بھی کشتی میں پچھاڑا ہے جن میں ایک ابو الاسود جمہی بھی تھے

(المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۳۰۳-۳۰۴)



اول (غارِ ثور) سے چلا تو پہلے ہی روزِ قومِ خزاعہ کی اس نیک ہناد بڑھیا کا خمیہ راہ میں پڑا۔ حضورؐ اور آپ کے ہمراہی پیاسے تھے۔ فیضانِ خاص تھا کہ مرہل سی بھوکی بکری نے اس لمحہ وافر مقدار میں دودھ دیا۔ حضورؐ نے بھی پیا، ہمراہیوں نے بھی، اور کچھ بچ رہا۔ امِ معبد کے شوہر نے گھر آ کر دودھ دیکھا، تو اچنبھے سے پوچھا کہ یہ کہاں سے آیا۔ امِ معبد نے سارا حال بیان کیا۔ وہ پوچھنے لگا کہ اچھا اسی قریشی نوجوان کا نقشہ تو بیان کرو۔ یہ وہی تو نہیں جس کی تمنا ہے۔ اس پر امِ معبد نے حسین ترین الفاظ میں تصویر کھینچی۔ امِ معبد کو نہ تو کوئی تعارف تھا۔ نہ کسی طرح کا تعصب، بلکہ جو کچھ دیکھا من و عن کہہ دیا۔ اصل عربی میں دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کا جو ترجمہ مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے اسی کو ہم یہاں لے رہے ہیں۔

” پاکیزہ رو، کشادہ چہرہ، پسندیدہ نحو، نہ پیٹ باہر نکلا ہوا۔ نہ سر کے بال گرے ہوئے، زیبا، صاحبِ جمال، آنکھیں سیاہ و فراخ، بال لمبے اور گھنے، آواز میں بھاری پن، بلند گردن، روشن مردمک، سرگیں چشم، باریک و پوسنہ ابرو، سیاہ گھنگھریالے بال، خاموش وقار کے ساتھ، گویا دلہنگی لیے ہوئے، دور سے دیکھنے میں زیندہ و درلرب، قریب سے نہایت شیریں و کمال حسین۔ شیریں کلام، واضح الفاظ، کلام کمی و بیشی الفاظ سے معرا، تمام گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پروٹی ہوئی، میانہ قد کہ کوتاہی نظر سے حقیر نظر نہیں آتے۔ نہ طویل کہ آنکھ اس سے نفرت کرتی۔ زیندہ نہال کی تازہ شاخ، زیندہ منظر والا قد، رفیق ایسے کہ ہر وقت اس کے گرد و پیش رہتے ہیں۔ جب وہ کچھ کہتا ہے تو چپ چاپ سنتے ہیں جب حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لیے جھپٹتے ہیں، مخدوم، مطاع، نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو!“

لباس :

آدمی کی شخصیت کا واضح اظہار اس کے لباس سے بھی ہوتا ہے اس کی وضع قطع قصر و طول، رنگت، معیار، صفائی اور ایسے ہی مختلف پہلو بتا دیتے ہیں کہ کسی لباس میں بلوس شخصیت کس ذہن و کردار سے آراستہ ہے۔ نبی اکرمؐ کے لباس کے بارے میں حضورؐ کے رفقاء نے جو معلومات دی ہیں وہ بڑی حد تک حضورؐ کے ذوق کو نمایاں کر دیتی ہیں۔ حضورؐ نے لباس کے معاملہ میں درحقیقت اس آیت کی عملی شرح پیش فرمائی ہے :

۱۰ ملاحظہ ہو : زاد المعاد جلد ۱ ص ۳۰۷

۱۱ زاد المعاد جلد ۱ ص ۳۰۷

يَلْبَسِي اِذْ مَ قَدَّ اَنْتَرْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يَّسَّوَارِي سَوَاتِكُمْ وَرَيْشًا وِلْبَاسِ  
التَّقْوَى ذَلِكَ خَيْرٌ : (اعراف - ۲۶)

اے اولادِ آدم: ہم نے تمہارے ستر ڈھانکنے والا اور تمہیں زینت دینے والا لباس  
تمہارے لیے مقرر کیا ہے۔ اور لباسِ تقویٰ بہترین لباس ہے۔

دوسرا پہلو لباس کا "سرابیل تقيکم الحدوس" تقيکم باسکم" (تمہیں گرمی سے  
بچانے اور جنگ میں محفوظ رکھنے کے لیے قمیصیں اور زریں فراہم کیں) (النحل) کے الفاظ میں  
بیان ہوا ہے۔

سوحضور کا لباس ساتر تھا، زینت بخش تھا اور بایں ہمہ لباسِ تقویٰ تھا۔ اس میں ضرورت  
کا بھی لحاظ تھا، وہ چند کڑے اخلاقی اصولوں کی پابندی کا منظر بھی تھا اور ذوقِ سلیم کا ترجمان بھی۔  
حضور کو کبر و ریا سے بُعد تھا۔ اور ٹھاٹھ باٹھ سے رہنا پسند نہ تھا۔ فرمایا: اِنَّمَا اَنَا عَبْدٌ اَلْبَسُ كَمَا  
يَلْبَسُ الْعَبْدُ۔ میں تو بس خدا کا ایک بندہ ہوں اور بندوں کی طرح لباس پہنتا ہوں۔ ریشم۔ دیبا اور حریر  
کو مردوں کے لیے آپ نے حرام قرار دیا۔ ایک بار تحفہ میں آئی ہوئی ریشمی تباہینی اور پھر فوڑا اضطراب  
کے ساتھ اتار پھینکی (مشکوٰۃ) تب بندہ، نمیس اور عمامہ کی لمبائی چونکہ علامت کبر تھی اور یہ طریق لباس متکبرین میں رائج  
تھا اس لیے اس سے سخت تنفر تھا۔ دوسری قوموں خصوصاً مذہبی طبقوں کے مخصوص فیشنوں کی تقلید اور نقالی  
کو بھی حضور نے ممنوع ٹھہرایا تاکہ اُمت میں اپنی خودی اور عزت نفس برقرار رہے، نیز فیشن اور لباس کی تقلید  
نظریات و کردار کی تقلید پیدا کرنے کا سبب نہ بن سکے چنانچہ حضور نے اسلامی تمدن کے تحت فیشن آداب اور  
ثقافت کا ایک نیا ذوق پیدا کر دیا۔ لباس میں موسمی تحفظ، ستر، سادگی، لطافت و نفاست اور وقار کا حضور  
کو خاص لحاظ تھا۔ اگر ہم حضور کے لباس کو وقت کے تمدنی دور، عرب کی موسمی اور جغرافیائی اور تمدنی ضروریات  
و مروجات کے نقطے میں رکھ کر دیکھیں تو وہ بڑے معیاری ذوق کا آئینہ دار ہے۔ آئیے حضور کے لباس پر ایک  
نگاہ ڈالیں۔

۱۔ الواہب اللدینی ج ۱ ص ۳۲۸۔

۲۔ بہت سی روایات ہیں مثلاً سالم کی روایت اپنے والد سے، مندرجہ ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، لباس شہرت پر وعید  
از ابن عمر۔ مندرجہ ترمذی۔ احمد۔ ابو داؤد، ابن ماجہ۔

۳۔ مثلاً روایت ابن عمر مندرجہ احمد و ابو داؤد۔

۴۔ تفصیل کے حوالے نہیں دیے جاسکتے۔ آئندہ کے طور پر زیادہ تر شمائل ترمذی، زاد المعاد اور الواہب اللدینی سامنے ہیں۔

کرتا قمیص، بہت پسند تھا۔ کرتے کی آستین نہ تنگ رکھتے نہ زیادہ کھلی۔ درمیانی ساخت پسند تھی۔ آستین کلائی اور ہاتھ کے جوڑ تک پہنچتی۔ سفر (خصوصاً جہاد) کے لیے جو کرتا پہنتے اس کے دامن اور آستین کا طول ذرا کم ہوتا۔ قمیص کا گریبان سینہ پر ہوتا جسے کبھی کبھار (موسمی تقاضے سے) کھلا بھی رکھتے اور اسی حالت میں نماز پڑھتے کرتا پہنتے ہوئے سیدھا ہاتھ ڈالتے، پھر الٹا۔ رفیقوں کو اسی کی تعلیم دیتے۔ داہنے ہاتھ کی فوقیت اور اچھے کاموں کے لیے داہنے ہاتھ کا استعمال حضور کی سکھائی ہوئی اسلامی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے۔

عمر بھر تہ بند (سنگی) استعمال فرمایا جسے ناف سے ذرا نیچے باندھتے اور نصف ساق تک (ٹخنوں سے ذرا اونچا) سامنے کا حصہ قدم سے زیادہ جھکا رہتا۔

پاجامہ (سراویل) دیکھا تو پسند کیا۔ آپ کے صحابی پہنتے تھے ایک بار خود خرید فرمایا (اختلاف ہے کہ پہنایا نہیں) اور وہ آپ کے ترکہ میں موجود تھا۔ اس کی خریداری کا قصہ دلچسپ ہے، حضرت ابوہریرہؓ کو ساتھ لیے ہوئے حضور بازار گئے اور بزازوں کے ہاں تشریف لے گئے۔ چار درہم پر پاجامہ خریدا۔ بازار میں اجناس کو تولنے کے لیے ایک خاص وزن مقرر تھا۔ وزن کرانے گئے اور اس سے کہا کہ اسے جھکتا ہوا تو لو اتزن درجہ وزن کہنے لگا کہ یہ الفاظ میں نے کسی اور سے کبھی نہیں سنے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے توجہ دلائی۔ الا تعرف نبیک؟ تم اپنے نبیؐ پاک کو پہچانے نہیں۔ وہ ہاتھ چومنے کو بڑھا تو آپ نے روکا کہ یہ عجمیوں کا (یعنی غیر اسلامی) طریقہ ہے۔ بہر حال وزن کرایا اور پاجامہ خرید کر لے چلے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ آپ اسے پہنیے گا؟ تعجب غالباً اس بنا پر ہوا ہوگا کہ ایک تو دیرینہ معمول میں ایسی نمایاں تبدیلی عجیب لگی۔ دوسرے پاجامہ اہل فارس کا لباس تھا۔ اور تشبہ سے حضور کا اجتناب۔ حالانکہ دوسرے تمدنوں کے اچھے اجزا کو حضور قبول فرماتے تھے، آپ نے جواب دیا: ہاں پہنوں گا۔ سفر میں بھی، حضر میں بھی، دن کو بھی، رات کو بھی۔ کیونکہ مجھے حفظ ستر کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے زیادہ ستر پوش لباس کوئی اور نہیں۔<sup>۱</sup>

سر پر عامہ باندھنا پسند خاص تھا، نہ بہت بھاری ہوتا تھا۔ نہ چھوٹا۔ ایک روایت کے لحاظ سے، گز لمبائی ہوتی تھی۔ عامہ کا شملہ بالشت بھر ضرور چھوڑتے جو کچھ کی جانب دونوں شانوں کے درمیان اڑس لیتے۔ نمازت آفتاب سے بچنے کے لیے شملہ کو پھیلا کر سر پر ڈال لیتے۔ اسی طرح موسمی حالات تقاضا کرتے تو آخری بل ٹھوڑی کے نیچے سے لے کر گردن کے گرد لپیٹ بھی لیتے۔ کبھی عامہ نہ ہوتا تو کپڑے کی ایک دھبی (رومال) پٹی کی طرح سر سے باندھ لیتے۔ بر بناٹے نظافت عامہ کو نیل کی چکنائی سے بچانے کے لیے ایک خاص

<sup>۱</sup> المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۴-۳۳۶۔

<sup>۲</sup> ایک رائے یہ ہے کہ ایسا بیماری (خصوصاً درد سر) کی حالت میں ہوا۔

کپڑا (عربی نام قناع) بالوں پر استعمال کرتے جیسے کہ آج کل بھی بعض لوگ ٹوپوں کے اندر کا غذا یا سلولائیڈ کا ٹکڑا رکھ لیتے ہیں۔ یہ دھجی چکنی تو ہو جاتی مگر نظافت کا حال یہ تھا کہ (روایات میں تصریح ہے) اسے کبھی میلا اور گندہ نہیں دیکھا گیا۔ سفید کے علاوہ زرد غالباً میلا، خاکستری مائل یا شتری رنگ کا عمامہ بھی باندھا ہے۔ اور فتح مکہ کے موقع پر سیاہ بھی استعمال فرمایا۔ عمامہ کے نیچے کپڑے کی ٹوپی بھی استعمال میں رہی۔ اور اسے پسند فرمایا۔ نیز روایات کے بہ موجب عمامہ کے ساتھ ٹوپی کا یہ استعمال گویا اسلامی ثقافت کا مخصوص طرز تھا اور اسے آپ نے مشرکین کے مقابلے پر امتیازی فیشن قرار دیا۔

عمامہ کے علاوہ کبھی خالی سفید ٹوپی بھی اوڑھتے۔ گھر میں اوڑھنے کی ٹوپی سر سے چھٹی ہوتی ہوتی۔ سفر پر نکلنے تو اٹھی ہوئی باڑو اور ٹوپی استعمال فرماتے۔ سوزنی نماسے ہوتے کپڑے کی دبیز ٹوپی بھی پہنی ہے۔ اور اوڑھنے کی چادر ۴ گز لمبی ۲ گز چوڑی ہوتی تھی۔ کبھی پھیٹ لیتے، کبھی ایک پتو سیدھے بغل سے نکال کر اٹے کندھے پر ڈال لیتے، یہی چادر کبھی کبھار بیٹھے ہوئے ٹانگوں کے گرد لپیٹ لیتے اور بعض مواقع پر اسے تہ کر کے تکیہ بھی بنا لیتے۔ معزز ملاقاتیوں کی تواضع کے لیے چادر اتار کر بچھا بھی دیتے۔ یمن کی چادر جسے جبرہ کہا جاتا تھا بہت پسند تھی، اس میں سرخ یا سبز دھاریاں ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضورؐ کے لیے سیاہ چادر (غالباً بالوں کی) بھی بنوائی گئی اسے اوڑھا تو پسینے کی وجہ سے بُو دینے لگی۔ چنانچہ نظافت کی وجہ سے پھر اسے نہیں اوڑھا۔ نیا کپڑا خدا کی حمد اور شکر کے ساتھ بالعموم جمعہ کے روز پہنتے۔ فاضل جوڑے بنوا کر نہیں رکھتے تھے کپڑوں میں چونڈ لگاتے تھے۔ ان کی مرمت کرتے، احتیاطاً گھر میں دیکھ لیتے کہ مجمع میں بیٹھنے کی وجہ سے (مجاہد اور نمازوں میں میلے کچیلے لوگ بھی آتے تھے اور صفائی کا عام معیار بھی آپ ہی نے مسلسل تربیت کر کے رسولؐ میں بلند کیا) کوئی جوں وغیرہ نہ آگھسی ہو۔

جہاں ایک طرف فقر و سادگی کی وہ شان تھی۔ وہاں دوسری طرف آپؐ کو رہبانیت کا سدباب بھی کرنا تھا اور اس اصول کا مظاہرہ بھی مطلوب تھا کہ "اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ اس کی عطا کردہ نعمت (رزق) کا اثر اس کے بندے سے عیاں ہو"۔ سو حضورؐ نے کبھی کبھار اچھا لباس بھی زیب بدن فرمایا۔ آپؐ کا مسلک اعتدال تھا اور انتہا پسندی سے امت کو بچانا مطلوب تھا۔ چنانچہ تنگ آستین کا رومی جُبہ بھی پہنا (بخاری و مسلم) سرخ دھاری کا اچھا جوڑا بھی زیب بدن کیا۔ طلیسانی قسم کا کسروانی جُبہ بھی کبھی کبھی پہنا (المواہب اللدنیہ)۔

۱۔ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ (ترمذی) (عن ابی الاحوص عن ابیہ (نسائی)

۲۔ روایت اسماء بنت ابی بکر (مسلم)

جس کے گریبان کے ساتھ ریشمی گوٹ لگی تھی۔ ایک بار ۲۷ اونٹنیوں کے بدلے میں ایک قیمتی بوڑا خرید فرمایا۔ اور پہنا اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھی۔ یہ تفسیر تھی اس قول قرآنی کی کہ پوچھو کون ہے اللہ کی عطا کردہ زینت کو حرام کرنے والا؟ بس یہ ہے کہ معمول عام سادگی تھا۔

کپڑوں کے لیے سب سے بڑھ کر سفید رنگ مرغوب خاطر تھا۔ فرمایا ”حق یہ ہے کہ تمہارے لیے مسجدوں میں بھی اللہ کے سامنے جانے کا بہترین لباس سفید لباس ہے“ فرمایا۔ سفید کپڑے پہنا کرو اور سفید ہی کپڑے سے اپنے مردوں کو کفن دو، کیونکہ یہ زیادہ پاکیزہ اور پسندیدہ ہیں۔

سفید کے بعد سبز رنگ بھی پسندیدہ تھا۔ لیکن بالعموم اس شکل میں کہ ہلکی سبز دھاریاں ہوں۔ اسی طرح خاص شوخ سرخ رنگ بہت ہی ناپسند تھا لباس کے علاوہ بھی اس کے استعمال کو بعض صورتوں میں ممنوع فرمایا، لیکن ہلکے سرخ رنگ کی دھاریوں والے کپڑے آپ نے پہنے، ہلکا نرد (ٹیالا یا شتری) رنگ بھی لباس میں دیکھا گیا۔ حضورؐ کا ہوتا مرد جو عربی تمدن کے مطابق چپل یا کھڑاؤں کی سی شکل کا تھا جس کے دو تسمے تھے۔ ایک انگوٹھے اور ساتھ والی انگلی کے درمیان رہتا۔ دوسرا چھنگلیا اور اس کے ساتھ والی انگلی کے بیچ میں ہوتے پر بال نہ ہوتے تھے۔ جیسے کہ معمولی ذوق کے لوگوں کے جوتوں پر ہوتے۔ یہ ایک بالشت ۲ انگل لمبا تھا تلوے کے پاس سے سات انگل چوڑا اور دونوں تسموں کے درمیان پنجے پر سے دو انگل کا فاصلہ تھا۔ کبھی کھڑے ہو کر پہنتے، کبھی بیٹھ کر بھی، پہنتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں ڈالتے پھر بائیں اور اتارتے ہوئے پہلے بائیں پاؤں نکالتے پھر دایاں۔

جراہیں اور موزے بھی استعمال میں رہے۔ سادہ اور معمولی بھی اور اعلیٰ قسم کے بھی۔ شاہ نجاشی نے سیاہ رنگ کے سادہ موزے بطور تحفہ بھیجے تھے۔ انہیں پہنا اور ان پر مسح فرمایا۔ اسی طرح دجیہ کلی نے بھی موزے تحفہ میں پیش کیے تھے ان کو آپ نے پھٹنے تک استعمال فرمایا۔

چاندی کی انگوٹھی بھی استعمال فرمائی جس میں کبھی چاندی کا نگینہ ہوتا تھا، کبھی حبشی پتھر کا بعض روایات میں آتا ہے کہ لوہے کی انگوٹھی پر چاندی کا پتھر یا پالش چڑھا ہوا تھا۔ دوسری طرف یہ واضح ہے کہ لوہے کی انگوٹھی (اور زیور) سے آپ نے کراہت فرمائی ہے۔ انگوٹھی بالعموم دباہنے ہی ہاتھ میں پہنی۔ کبھی کبھار بائیں میں بھی۔ درمیانی اور شہادت کی انگلی میں نہ پہنتے۔ چھنگلیا میں پہننا پسند تھا۔ نگینہ اوپر کی طرف رکھنے کے بجائے

۱۔ ابو داؤد ابن ماجہ

۲۔ عن سمروہ (احمد)، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ

ہیلی کی طرف رکھتے۔ انگوٹھی پر "محمد رسول اللہ" کے الفاظ ترتیب وار نیچے سے اوپر کو تین سطروں میں کندہ تھے۔ اس سے حضور خطوط پر مہر لگاتے تھے۔ محققین کی یہ رائے قرین صحت ہے کہ انگوٹھی مہر کی ضرورت سے بنوائی تھی۔ اور سیاسی منصب کی وجہ سے اس کا استعمال ضروری تھا۔

## وضع قطع اور آرائش :

حضور اپنے بال بہت سلیقے سے رکھتے، ان میں کثرت سے تیل کا استعمال فرماتے، کنگھا کرتے، مانگ نکالتے، لبوں کے زائد بال تراشنے کا اہتمام تھا۔ ڈاڑھی کو بھی طول و عرض میں قینچی سے ہموار کرتے اس معاملہ میں رفقاء کو تربیت دیتے۔ مثلاً ایک اصحابی کو پرانگندہ مودیکھا تو گرفت فرمائی۔ ایک صحابی کے ڈاڑھی کے زائد بال بہ نفس نفیس تراشنے۔ فرمایا۔ کہ جو شخص سر یا ڈاڑھی کے بال رکھتا، ہوا سے چاہیے کہ ان کو سلیقے اور شائستگی سے رکھے۔ مثلاً ابو قتادہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا "اگر مہما" (ان کو سنوار کے رکھو)

یہ تاکیدیں حضور نے اس لیے فرمائی تھیں کہ بسا اوقات مذہبی لوگ صفائی اور شائستگی کے تقاضوں سے غافل ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً رنگ تصوف جب بڑھتا ہے اور رہبانیت اُبھرتی ہے تو غلیظ رہتا علوی مرتبت کی دلیل بن جاتا ہے۔ اس عطرے کا سدباب فرمایا۔

سفر و حضر میں سات چیزیں ہمیشہ ساتھ رہتیں اور بستر کے قریب (۱) تیل کی شیشی (۲) کنگھا (باقی دانت کا بھی) (۳) سرمہ دانی (سیاہ رنگ کی) (۴) قینچی (۵) مسواک (۶) آئینہ (۷) لکڑی کی ایک پتی کھچی۔

سرمہ رات کو سوتے ہوئے (تاکہ زیادہ نمایاں نہ ہو) تین تین سلائی دونوں آنکھوں میں لگاتے۔ آخر رات میں حاجات سے فارغ ہو کر وضو کرتے، لباس طلب کرتے، اور خوشبو لگاتے، ریحان کی خوشبو پسند تھی۔ مہندی کے پھول بھی بھینی خوشبو کی وجہ سے مرغوب تھے۔ مشک اور عود کی خوشبو سب سے بڑھ کر پسندیدہ رہی۔ گھر میں خوشبودار دھونی لیا کرتے، ایک عطر دان تھا جس میں بہترین خوشبو موجود رہتی اور استعمال میں آتی (کبھی حسرت عائشہ اپنے دست مبارک سے خوشبو لگاتیں) مشور بات ہے کہ آپ جس کوچے سے گزر جاتے تھے۔ دیر تک اس میں مہک رہتی تھی اور فضا میں باقی تھیں کہ گزر گیا ہے ادھر سے وہ کاروان بہار خوشبو مہر کی جاتی تو ضرور قبول فرماتے اور کوئی اگر خوشبو کا ہدیہ لینے میں تامل کرنا تو ناپسند فرماتے۔ اسلامی ثقافت کے محضوس ذوق کے ماتحت آپ نے مردوں کے لیے ایسی خوشبو پسند فرمائی جس کا رنگ محضی رہے اور مہک پھیلے اور عورتوں کے لیے وہ جس کا رنگ نمایاں ہو، مہک محضی رہے۔

## رفتار :

حضور کی چال عظمت، وقار، شرافت اور احساسِ ذمہ داری کی ترجمان تھی۔ چلتے تو مضبوطی سے قدم جما کر چلتے۔ ڈھیلے ڈھالے طریق سے قدم گھسیٹ کر نہیں۔ بدن سمٹا ہوا رہتا۔ دائیں بائیں دیکھے بغیر چلتے۔ قوت سے آگے کو قدم اٹھاتے۔ قامت میں آگے کی طرف قدرے جھکاؤ ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اونچائی سے نیچے کو اتر رہے ہیں، ہند بن ابی ہالہ کے الفاظ میں گویا زمین آپ کی رفتار کے ساتھ ساتھ پیٹتی جا رہی ہے۔ "رفتار تیز ہوتی، قدم کھلے کھلے رکھتے آپ معمولی رفتار سے چلتے مگر بقول حضرت ابو ہریرہؓ "ہم مشکل سے ساتھ دے پاتے" حضور کی رفتار یہ پیغام بھی دیتی جاتی تھی کہ زمین پر گھمنڈ کی چال نہ چلو۔" (لفظ **تکلم**)

تکلمِ اِشَان کے ایمان، کردار اور مرتبے کو پوری طرح بے نقاب کر دیتا ہے۔ موضوعات اور الفاظ کا انتخاب، فقروں کی ساخت، آواز کا اتار چڑھاؤ، لہجہ کا اسلوب اور بیان کا زور، یہ ساری چیزیں واضح کرتی ہیں کہ تکلم کس پائے کی شخصیت کا علمبردار ہے۔

حضور کے منصب اور ذمہ داریوں کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کا بھاری بوجھ اگر کسی دوسری شخصیت پر ڈالا گیا ہوتا۔ تو وہ تفکرات میں ڈوب کر رہ جاتا اور اسے خلوت محبوب ہو جاتی۔ لیکن حضور کے کمالات خاص میں یہ بات بھی شامل ہے، کہ ایک طرف آپ تفکرات اور مسائلِ مہمہ کا پہاڑ اٹھانے ہوئے ہوتے اور طرح طرح کی پریشانیوں سے گزرتے، لیکن دوسری طرف لوگوں میں خوب گھلنا، ملنا بھی رہتا اور دن رات گفتگوؤں کا دور چلتا۔ مزاج کی سنجیدگی اپنی جگہ تھی اور تبسم و مزاح اپنی جگہ۔ اصدا میں عجیب توازن تھا جس کی مظہر حضور کی ذات تھی۔ ایک عالمی تحریک کی ذمہ داری، ایک سلطنت کے مسائل، ایک جماعت اور معاشرہ کے معاملات اور پھر اپنے خاصے بڑے کنبے کی ذمہ داریاں اچھا خاصا پہاڑ تھیں جنہیں حضور کے کندھے اٹھائے ہوئے تھے۔ چنانچہ امام حسنؑ اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ کے حوالہ سے بتاتے ہیں کہ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم متواتر پریشانیوں میں رہتے۔ ہمیشہ مسائل پر غور کرتے، کبھی آپ کو بے فکری کا کوئی لمحہ نہ ملا۔ دیر دیر تک خاموش رہتے اور بلا ضرورت فضول بات چیت نہ کرتے"۔

لیکن آپ ایک داعی تھے۔ اور ایک تحریک کے سربراہ، اس لیے تبلیغ و تعلیم اور تزکیہ اور سیاسی انتظام چلانے کے لیے لوگوں سے رابطہ ضروری تھا جس کے لیے سب سے اہم ذریعہ تکلم ہے۔ لہذا

دوسری صورتِ حال حضرت زید بن ثابت کے الفاظ میں یوں رہتی کہ جب ہم ذہنی معاملات کا ذکر کر رہے ہوتے تو حضور بھی اس ذکر میں حصہ لیتے، جب ہم آخرت پر گفتگو کرتے تو حضور بھی ہمارے ساتھ اسی موضوع پر تکلم فرماتے۔ اور جب ہم لوگ کھانے پینے کی کوئی بات چھیڑتے تو حضور بھی اس میں شامل رہتے۔ اس کے باوجود آپ نے خدا کی قسم کھا کر یہ اصولی حقیقت بیان فرمائی کہ میری زبان سے حق کے ماسوا کوئی بات ادا نہیں ہوتی قرآن نے بھی وما یطق عن الہویٰ کی گواہی دی۔

گفتگو میں الفاظ اتنے ٹھہر ٹھہر کر ادا کرتے کہ سننے والا آسانی سے یاد کر لیتا بلکہ الفاظ ساتھ ساتھ گنے جا سکتے تھے۔ ام معبد نے کیا خوب تعریف بیان کی کہ ”گفتگو موتیوں کی لڑی جیسی پر دنی ہوتی“ الفاظ نہ ضرورت سے کم نہ زیادہ — نہ کوتاہ سخن، نہ طویل گو“ تاکید، تقسیم اور تسہیل حفظ کے لیے خاص الفاظ اور کلمات کو تین بار دہراتے تھے۔ بعض امور میں تصریح سے بات کرنا مناسب نہ سمجھتے تو کناہ میں فرماتے، مکردہ اور فحش اور غیر حیا دارانہ کلمات سے تنفر تھا۔ گفتگو میں بالعموم ایک مسکراہٹ شامل رہتی۔ عبداللہ بن عمارت کا بیان ہے کہ ”میں نے حضور سے زیادہ کسی کو مسکراتے نہیں دیکھا“ یہ مسکراہٹ حضور کی سنجیدگی کو خشونت بننے سے بچاتی تھی۔ اور رفتار کے لیے وجہ جاذبیت ہوتی، بات کرتے ہوئے بار بار آسمان کی طرف دیکھتے۔ گفتگو کے دوران میں کسی بات پر زور دینے کے لیے ٹیک سے اٹھ کر سیدھے ہو بیٹھتے اور غاص حبوب کو بار بار دہراتے، حاضرین کو کسی بات سے ڈراتے تو تکلم کے ساتھ ساتھ زہن پر اٹھ مارتے۔ بات کی وضاحت کے لیے ہاتھوں اور انگلیوں کے اشارات (Gestures) سے بھی مدد دیتے۔ مثلاً دو چیزوں کا کچھ ہونا واضح کرنے کے لیے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو مل کر دکھاتے کبھی دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو باہم دگر آہ پار کر کے مضبوطی یا جمعیت کا مفہوم نمایاں کرتے، کسی شے یا سمت میں اشارہ کرنا ہوتا تو پورا ہاتھ حرکت میں لاتے۔ کبھی ٹیک لگائے ہوئے اہم معاملات پر بات کرتے تو سیدھے ہاتھ کو اٹھے ہاتھ کی پشت پر رکھ کر انگلیوں میں انگلیاں ڈال لیتے۔ تعجب کے موقعوں پر ہتھیلی کو اٹھ دیتے کبھی سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی اٹھے ہاتھ کے انگوٹھے کے اندرونی حصے پر مارتے، کبھی سر ہلاتے اور ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے۔ کبھی ہاتھ کو ران پر مارتے۔

— قریش مکہ کے ایک مہذب خاندان کا یہ منازہ فرد قبیلہ بنو سعد کی فضاؤں میں عرب کی فصیح ترین زبان سے آراستہ تو تھا ہی، وحی کی لسانِ مبین نے حسنِ گفتار کو اور بھی صیقل کر دیا تھا۔ حق یہ ہے کہ حضور افضح العرب تھے۔ حضور کے کلام کا جہاں ادبی معیار بہت بلند تھا۔ وہاں اس میں عام فہم سادگی بھی تھی

۱۰ شہادت ترمذی باب ماجاء فی خلقِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



اور پھر کمال یہ کہ کبھی کوئی گھٹیا اور بازاری لفظ استعمال میں نہیں لیا اور نہ کبھی مصنوعی طرز کی زبان پسند فرمائی کہنا چاہیے کہ حضور نے اپنی دعوت اور اپنے مشن کی ضروریات سے خود اپنی ایک زبان پیدا کی تھی، ایک اسلوب بنایا تھا۔ چنانچہ حضور کے ایک قول (الحرب خداعة) پر بحث کرتے ہوئے ثعلب کا کہنا تھا کہ ہی لغة النبیؐ یہ نبی اکرم کی مخصوص زبان تھی، بے شمار اصطلاحات بنائیں، تراکیب پیدا کیں، تشبیہیں اور تشلیں وضع کیں، خطابت کا نیا انداز نکالا اور بہت سے مروج الفاظ و اسالیب کو متروک کیا۔ ایک مرتبہ بنو ہند کے لوگ آئے تو گفتگو ہوتی رہی۔ جس کے دوران میں آنے والوں نے تعجب سے کہا: "اے اللہ کے نبی ہم آپ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، ایک ہی مقام میں پرورش پائی ہے، پھر یہ کیا بات ہے کہ آپ ایسی عربی میں بات کرتے ہیں کہ جس کی لطافتوں، کوہم میں سے اکثر نہیں سمجھ سکتے؟" فرمایا اور خوب فرمایا "ان اللہ عزوجل اذ بنی فاحسن ادبی و نشأت فی بنی سعد بن بکر" (میری لسانی تربیت خود اللہ عزوجل نے فرمائی ہے۔ اور میرے ذوق ادب کو خوشتر بنا دیا۔ نیز میں نے قبیلہ سعد کی فصاحت آموز فضا میں پرورش پائی ہے، ایک موقع پر کسی ملاقاتی سے بات ہوئی۔ حضرت ابو بکرؓ تعجب سے سن رہے تھے۔ پوچھا اس شخص نے آپ سے کیا کہا اور آپ نے کیا فرمایا؟ حضور نے وضاحت کی۔ اس پر جناب صدیق کہنے لگے۔ "میں عرب بن گھوما پھرا ہوں اور فصحاء عرب کا کلام سنا ہے۔ لیکن آپ سے بڑھ کر کلام فصیح کسی اور سے نہیں سنا یہاں بھی وہی بات حضور فرماتے ہیں۔ ادبی ربی و نشأت فی بنی سعد" اسی طرح حضرت عمرؓ ایک بار کہنے لگے۔ "اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے کہ آپ فصاحت میں ہم سب سے بالاتر ہیں، حالانکہ آپ ہم سے کبھی الگ نہیں ہوئے؟" فرمایا۔ گانت لغت اسمعیل، قد درست فجاء فی بہا جبریل ففطینھا" (میری زبان اسمعیل علیہ السلام کی زبان ہے جسے میں نے خاص طور سے سیکھا ہے اسے جبریل مجھ تک لائے اور میرے ذہن نشین کر دی، مطلب یہ ہے کہ حضور کی زبان معمولی عربی نہ تھی۔ بلکہ خاص پیغمبرانہ زبان تھی جس کا جوڑ اسمعیلی زبان سے ملتا تھا، اور جبریل جس زبان میں قرآن لاتے تھے وہ بھی وہی پیغمبرانہ زبان تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر سامنے رہنا چاہیے کہ اکابر تاریخ خصوصاً انبیاء جو ایک مشن لے کر ماحول سے کشمکش کرتے ہیں اور ان میں ہر آن سچے جذبات کی موجیں اٹھتی ہیں وہ بات کرتے ہیں تو اس میں مقصد کی عظمت معنوی گہرائی پیدا کرتی ہے، مخلصانہ جذبے سے ادبی جاشنی دیتے ہیں اور کردار کی بلندی اسے پاکیزہ بناتی ہے۔

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: الواہب اللدینہ ج ۱ ص ۲۵۶

۔۔۔ حضور کی امتیازی شان یہ تھی کہ آپ کو "جوامع الکلم" عطا کیے گئے تھے۔ خود فرمایا کہ "اعطیت بجوامع الکلم"۔ جوامع الکلم حضور کے وہ مختصر ترین کلمے ہیں جو معنوی لحاظ سے بڑی وسعت رکھتے ہیں۔ کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ معانی پیش کرنے میں سرورِ عالم اپنی مثال آپ تھے۔ اور اُسے خصوصی عطیاتِ رب میں شمار کیا۔

یہاں ہم چند مثالیں بیان کریں گے۔

(۱) الْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ : آدمی کا حشر اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت رکھتا ہو۔

(۲) أَسْلِحْ تَسْلِمًا : تم اسلام لاؤ تو سلامتی پاؤ گے۔

(۳) إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ : اعمال نیتوں پر منحصر ہیں۔

(۴) نَبِيٌّ لِلْعَامِلِ مِنْ عَمَلِهِ إِلَّا مَا نَوَاهُ : کسی عمل کرنے والے کو اپنے عمل میں سے بجز اس

کے کچھ نہیں ملتا ہے جو کچھ کہ اس نے نیت کی ہے۔

(۵) الْوَلَدُ مَنْفَرٌ شَوْلًا لِّلْعَاهِدِ : بچہ بیٹا اس کا جس کے بستر پر دکھریں، وراثت پائے اور

زانی کے لیے پتھر!

(۶) الْحَرْبُ خُدْعَةٌ : جنگ پابوں سے لڑی جاتی ہے۔

(۷) نَبِيٌّ نَخْبَرُكَ لِنُعَايَتِكَ : شنیدہ کے بودمانِ دیدہ۔

(۸) الْمَجَالِسُ بِالْأَمَانَةِ : مجالس کے لیے امانت (رازداری) لازم ہے۔

(۹) تَرَكَ الشَّرَّ صَدَقَةً : برائی سے باز آنا بھی صدقہ (نیکی) ہے۔

(۱۰) سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ : قوم کا سردار وہ ہے جو اس کی خدمت کرے۔

(۱۱) كُلُّ ذِي نِعْمَةٍ مَحْسُودٌ : ہر نعمت پانے والے سے حسد کیا جاتا ہے۔

(۱۲) الْكَلِمَةُ لَطِيبَةٌ صَدَقَةٌ : حُسن گفتار بھی ایک صدقہ (نیکی) ہے۔

(۱۳) مَنْ لَا يَرْحَمُ : لَا يَرْحَمُ : جو مغبوق پر، خصوصاً انسانوں پر، رحم نہیں کرتا اس پر خدا کی

بارگاہ سے، رحم نہ کیا جائے گا۔

ارشاداتِ رسالتِ نبویؐ بلحاظ الفاظ، بلحاظ اسلوب، بلحاظ روح بالعموم پہچانے جاتے ہیں۔ اور حدیث

۱۰ روایت ابو ہریرہ (مسلم)

۱۱ نامہ دعوت بنام ہرقل روم۔

اور سیرت کے ریکارڈ میں حضور کے جو اجزائے کلام ہیں، وہ موتیوں کی سی لمعانی رکھتے ہیں۔ تھوڑے الفاظ، ان کا خوش آئند گٹھاؤ، ان میں معنوی گہرائی، دل پر اثر کرنے والی روحِ اخلاص کلامِ نبوی کے امتیازات میں سے ہے۔ مناسب ہوگا کہ دو تین پارہ ہائے فصاحت یہاں درج کیے جائیں۔

” میں تم کو اللہ سے ڈرتے رہنے کی وصیت کرتا ہوں، نظامِ اجتماعی کے لیے سمع و طاعت کی تاکید کرتا ہوں۔ خواہ اسے چلانے کے لیے، کوئی جلتی غلام ہی (برسرِ قیادت) کیوں نہ ہو۔ کیونکہ تم میں سے جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ بہت سے اختلافات سے دوچار ہونگے۔ پس ایسے حالات میں، تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو اختیار کرو۔ اس کو مضبوطی سے تھامو، اسے ڈاڑھوں سے پکڑے رکھو۔ خبردار! دین میں نئے نئے شگوفے چھوڑنے سے پرہیز کرنا کیونکہ ہر نیا شگوفہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔“

عمر بن عَبَسَہ نے حضور سے کچھ باتیں کیں۔ جن کے بہت ہی مختصر مگر جامع جوابات حضور نے دیے۔ اس چھوٹے سے مکالمہ کو ملاحظہ کیجیے:

” اس (دعوت و تحریک کے) کام میں ابتداً کون کون آپ کے ساتھ تھا؟“

” ایک مرد آزاد (مراد حضرت ابوبکرؓ) اور ایک غلام (مراد حضرت بلالؓ)“

” اسلام (کی اخلاقی حقیقت) کیا ہے؟“

” پاکیزہ گفتار اور (بھوکوں کو) کھانا کھلانا۔“

” ایمان (کا جوہر) کیا ہے؟“

” صبر اور سخاوت۔“

” کیسا اسلام افضل (معیاری) ہے؟“

” اس شخص کا جس کی زبان اور جس کے ہاتھ کی زیادتیوں سے مسلمان محفوظ رہیں۔“

” کیسا ایمان افضل (معیاری) ہے؟“

” جس کے ساتھ پسندیدہ اخلاق پایا جائے۔“

” کیسی نماز افضل (معیاری) ہے؟“

” جس میں دیر تک عاجزی سے قیام کیا جائے۔“

”کیسی ہجرت افضل (معیاری) ہے؟“

ایسی کہ تم ان چیزوں سے کنارہ کش ہو جاؤ جو تمہارے پروردگار کو ناپسند ہیں“

”کیسا جہاد افضل (معیاری) ہے؟“

”اس شخص کا جس کا گھوڑا بھی میدان میں مارا جائے اور خود بھی شہادت پائے“

”کوئی گھڑی (عبادت کے لیے) سب سے بڑھ کر ہے؟“

”رات کا پچھلا پہرہ“

ایک بار دریافت کیا گیا کہ انسانوں کو دوزخ تک پہنچانے کے موجبات زیادہ تر کیا ہیں؟ فرمایا :  
الغمر والفرسجہ۔ یعنی دہن اور شرمگاہ۔ دہن سے اشارہ ہے کلام اور طعام دو چیزوں کی طرف۔ شرمگاہ سے  
اشارہ ہے جنسی واعیات کی طرف۔ یعنی کلام کا فاسد ہونا، روزی کا ناپاک ہونا اور جنسی جذبات کا بے راہ  
ہونا انسانوں کی عاقبت کو سب سے زیادہ برباد کرنے والا ہے۔ بیشتر جھگڑے اور تصادم اور زیادتیاں اور  
ظلم بھی انہی خرابیوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

حضرت علیؑ نے ایک بار سوال کیا کہ آپؑ اپنے مسلک کی وضاحت کریں۔ آپؑ نے مختصراً جس فصیح  
انداز سے جواب دیا اور اس جواب میں اپنے طرز فکر، اپنے کردار اور اپنی روحانیت کی جامع تصویر کھینچ دی وہ  
بجائے خود انسانی کلام کی تاریخ میں ایک اعجاز ہے ملاحظہ ہو :

”المعرفة راس مالي . والعقل اصل ديني ، والحب اساسي . والشوق

مركبي ، و ذكر الله انيسي . والثقة كنزى والحزن رفيقى . و تعلم

سلامى ، والصبر رداقى ، والرضاء غنيمتى . والعجز فخرى . والزهد

حرفتى ، واليقين قوتى ، والصدق شفيعى ، والطاعة حبسى . ولجهد

خُلقتى وقرة عيني فى الصلوة“

ترجمہ :- عرفان میرا سرمایہ ہے، عقل میرے دین کی اصل ہے، محبت میری بنیاد ہے۔ شوق میری

سواری ہے ذکر اللہ میرا مونس ہے۔ اعتماد میرا خزانہ ہے حزن میرا رفیق ہے۔ علم میرا ہتھیار

۱۔ مشکوٰۃ۔ کتاب الایمان۔

۲۔ روایت ابوہریرہؓ ترمذی۔

۳۔ ملاحظہ ہو : روایت حضرت علیؑ مندرجہ ”الشفاء“ از قاضی عیاض۔

ہے، صبر میرا لباس ہے، خدا کی رضا میری غنیمت ہے، عاجزی میرے لیے وہ اعزاز ہے، زہد میرا پیشہ ہے یقین میری طاقت ہے (لفظ قوت ہو تو غذا ہے) صدق میرا سفارشی ہے۔ طاعت میرا بچاؤ ہے۔ بہاد میرا کردار ہے۔ اور میری آنکھوں کی ٹنڈک نماز میں ہے۔“

حسن تمثیل کی بے شمار مثالیں آپ کے کلام میں محفوظ ہیں، جن کی مدد سے بڑے بڑے حقائق آپ نے بدوئوں کے ذہن نشین کر دیے۔ ان میں یہاں ایک ہی کو لیجیے۔

”مجھے خدا نے ہدایت اور علم کا جو کچھ سرمایہ دے کر اٹھایا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ زمین پر موسلا دھار بارش ہو، پھر اس زمین کا جو ٹکڑا بہت ہی زرخیز ہے اس نے پانی کو پوری طرح جذب کیا اور مرجھایا ہوا سبزہ اس سے تروتازہ ہو گیا اور نئی بوٹیاں کثرت سے اُگ آئیں۔ پھر زمین کا کچھ سخت حصہ ایسا بھی تھا جس نے پانی کو اندر جمع کر رکھا اور اللہ نے اسے لوگوں کے لیے مفید بنایا۔ انہوں نے اس کو پیا پلایا۔ اور کھیتوں کو اس سے سیراب کیا۔ پھر یہ پانی ایک اور قطعہ پر برسنا جو چٹیل میدان تھا اور نہ اس نے پانی جمع کر کے رکھا، نہ جذب کر کے روئیدگی دکھائی۔ پس اس میں ایک مثال تو ان لوگوں کی ہے جنہوں نے علم دین میں سوجھ بوجھ پیدا کی اور جو کچھ ہدایت مجھے دے کر اللہ تعالیٰ نے اٹھایا ہے اس سے اسے فائدہ پہنچا۔ اس نے خود علم حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا۔ دوسری مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے اس دعوت کو سن کر سر نہیں اٹھایا اور نہ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کیا جو میرے ذریعے بھیجی گئی ہے۔“

— آپ کے انداز گفتگو کا کوئی عنوان باندھا جاسکتا ہے تو قرآن کے اس جملے سے کہ ”قولوا للناس حسناً۔ لوگوں کو حسن تکلم سے خطاب کرو۔ آپ کا حسن کلام سادگو، کی نشان دہی ہوئے تھا، بناوٹی کلام سے آپ کو بُعد تھا۔ فرمایا :

أَبْعَدَكُمْ مَنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الثَّرَاوَنُ الْمُتَشَدَّقُونَ الْمُتَفِيهَقُونَ ۚ

تم میں سے قیامت کے روز وہ لوگ مجھ سے انتہائی دوری پر ہوں گے جو بڑے بول بولنے والے باتوئی اور گھمنڈ جتنا نبواے ہیں۔

اسی طرح آپ کو سنجیدگی اور پاکیزگی کی حدود سے نکل کر فحش کے دائرے میں داخل ہونے والی گفتگو سخت ناپسند تھی۔ حضور کے چہ زار تکلم میں ہمیشہ تبسم کی شبنم معانی دکھاتی تھی۔ سب سے بڑھ کر خندہ روئی سے

آپ ہی کا چہرہ آراستہ رہتا تھا، باوجودیکہ ذمہ داریوں اور مشکلات و مصائب اور ہرآن کی پریشانیوں کے خازن درپیش تھے۔

### خطابت :-

تکلم ہی کا ایک اہم جز خطابت ہے۔ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم پیغام کے حامل تھے۔ اور اس کے لیے خطابت ناگزیر ضرورت تھی۔ خطابت یوں بھی عربوں کی دوست تھی۔ پھر قریش تو اس صفت سے خاص طور پر مالا مال تھے۔ عرب اور قریش کے خطیبانہ ماحول سے حضور بہت بلند رہے، فریضہ قیادت نے جب بھی تقاضا کیا آپ کی زبان کبھی نسیم سحر کی طرح، کبھی آبِ جنوں کی طرح اور کبھی تیغِ بقیہ دم کی طرح متحرک ہو جاتی۔

وعظ و تقریر کی کثرت سے آپ نے پرہیز کیا۔ اور معاشرہ کی ضروریات اور اس کے ظرف و دیکھ کر اعتدال سے قوتِ خطابت کا استعمال کیا۔ مسجد میں خطابت فرماتے تو اپنی چھتری پر سارا لیتے اور میدانِ جنگ میں تقریر فرمانا ہوتی تو کمان پر ٹیک لگاتے۔ کبھی کبھار سواری پر سے خطاب کیا ہے۔ تقریر میں جسم دایں میں جھوم جاتا۔ ہاتھوں کو حسبِ ضرورت حرکت دیتے۔ تقریر میں بعض مواقع پر دل کی نفسی بیداری و لذی نفس محمد بیدار۔ (قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یا محمد کی جان ہے) کہہ کر قسم کھاتے۔ لہجے میں بھی اور چہرے پر بھی دل کے حقیقی جذبات جھلکتے اور سامعین پر اثر انداز ہوتے۔ اس سنانِ اعظم کے خطابات دلوں کو ہلا دیتے تھے۔ ہم یہاں صرف دو مثالیں دیں گے۔ حنین و طائف کے معرکے کے بعد حضور نے مالِ غنیمت تقسیم کیا۔ تو مولفۃ القلوب کی قرآنی مد کے تحت نو مسلم روسانے کہا کہ اس میں بہت سا حصہ دیا تاکہ ان کے دل مزید نرم ہوں اور وہ احسان کے رشتے سے اسلامی ریاست کے ساتھ مربوط ہو جائیں انصار میں کچھ لوگوں نے عجیب سے احساسات کی رد و ڈاڈی، کہا کیا کہ :

رسول اللہ نے قریش کو خوب انعامات دیے اور ہمیں محروم رکھا، حالانکہ ہماری تلواروں

سے اب تک خون کی بوندیں ٹپک رہی ہیں :

”مشکلات میں ہم یاد آتے ہیں اور حاصلِ غنیمت دوسرے لوگ لے جاتے ہیں“

یہ چہرے حضور کے کانوں تک بھی پہنچے۔ ایک چرمی خیمہ نصب کیا گیا۔ وہ ساری انصار کا اجتماع بلایا

گیا۔ حضور نے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں نے ایسی اور ایسی باتیں کہی ہیں، جو اب ملانہ ”آپ نے جو سن وہ صحیح ہے

مگر یہ باتیں ہم میں سے ذمہ دار لوگوں نے نہیں کیں، کچھ نوجوانوں نے ایسے فقے کہے ہیں، واقعہ کی تحقیق کے بعد آپ نے یہ تقریر کی :

”کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم لوگ پہلے گمراہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو ہدایت دی؟ تم منتشر اور پرگندہ تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو متحد اور متفق کیا؟ تم مفلس تھے، خدا نے میرے ذریعے سے تم کو آسودہ حال کیا؟ (ہر سوال پر انصار کہتے جاتے تھے کہ بلاشبہ اللہ اور رسولؐ کا بہت بڑا احسان ہم پر ہے،

— نہیں تم یہ جواب دو کہ اے محمدؐ! تم کو جب لوگوں نے جھٹلایا تو ہم نے تمہاری تصدیق کی، تم کو جب لوگوں نے چھوڑ دیا تو ہم نے پناہ دی۔ تم جب مفلس ہو کر آئے تھے تو ہم نے ہر طرح کی مدد کی۔ تم جواب میں یہ کہتے جاؤ، اور میں یہ کہتا جاؤں گا کہ ہاں تم سچ کہتے ہو۔ لیکن اے گروہ انصار! کیا تم کو یہ پسند نہیں، کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمدؐ کو لے کر اپنے گھروں کو جاؤ؟

کلام کا اتنا چڑھاؤ دیکھیے، خنجر خطابت کی اس دھار کو دیکھیے جو نازک جذبات سے صیقل کی گئی تھی، پھر اس کی روانی دیکھیے، مطالب کے موڑ دیکھیے، پھر یہ غور کیجیے کہ کس طرح خطیب نے بالآخر مطلوبہ کیفیت سامعین میں پوری طرح ابھار دی۔ انصار بے اختیار چیخ اٹھے کہ ”ہم کو صرف محمدؐ درکار ہیں“ ابتدائی دعوے دعوت میں کوہ صفا کے خطبہ کے علاوہ متعدد بار آپؐ نے قریش کے سامنے تقاریر فرمائی ہیں۔ اس دور کے ایک خطبہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

إِنَّ السَّائِدَ لَا يَكْذِبُ أَهْلَهُ، وَاللَّهُ لَتُوكَذِبْتُ النَّاسَ جَمِيعًا مَا كَذَبْتُكُمْ، وَلَا كَوَّعَرْتُ النَّاسَ جَمِيعًا مَا عَزَّرْتُكُمْ. وَاللَّهُ الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الَّذِي لَرَسُولِ اللَّهِ إِلَيْكُمْ، خَاصَّةً وَإِلَى النَّاسِ كَافَّةً. وَاللَّهُ لَتَمُوتُنَّ كَمَا تَنَامُونَ وَلَتَنْبَعَثُنَّ كَمَا تَسْتَيْقِظُونَ وَلَتَمَاسِبُنَّ بِمَا تَعْمَلُونَ وَلَتَجْزُونَ بِإِحْسَانٍ إِحْسَانًا وَبِالسُّؤِءِ سَوْءًا أَوْ لِنَهَا جَنَّةً أَبَدًا أَوْ لِنَارٍ أَبَدًا.

ترجمہ: قافلے کا دیدبان اپنے ساتھیوں کو کبھی غلط اطلاع نہیں دیا کرتا۔ خدا کی قسم اگر (بفرض محال) میں اور سب لوگوں سے جھوٹ کہنے پر تیار بھی ہو جاتا تب بھی تم سے غلط بات ہرگز نہ کہتا۔ اگر (بفرض محال) میں دوسرے تمام لوگوں کو ہلاکت و خطرہ سے دوچار کر دیتا تو بھی تم کو کبھی خطرہ میں

بتلا نہ کرنا۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا اور کوئی اللہ نہیں میں تمہاری طرف خصوصیت سے اور تمام انسانوں کی طرف جامع طور سے خدا کا مقرر کردہ رسول ہیں۔ بخدا تم کو لازماً مرنے جیسے کہ تم سو جاتے ہو اور پھر مرنے کے بعد تم کو جی اٹھتا ہے . . . . . جیسے کہ تم نیند سے بیدار ہو جاتے ہو، تم سے لازماً تمہارے کاموں کا حساب لیا جانا ہے اور تمہیں بھلے کا بدلہ بھلا اور برے کا بدلہ ضرور ملنا ہے پھر یا تو ہمیشہ کے لیے جنت ہوگی یا ہمیشہ کے لیے دوزخ۔“

کیا ہی سادہ انداز بیان ہے، کتنا عقلی اور جذباتی اپیل ہے۔ داعی کی خیر خواہی ایک ایک لفظ سے ٹپکی پڑتی ہے پھر یقین کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ چھوٹے سے اس خطبے میں تمہیل سے بھی کام لیا گیا ہے، توحید، رسالت اور آخرت کی بنیادی دعوت پوری طرح سموتی ہوئی ہے۔

حضور کے معرکہ اللہ اخطبے دو اور ہیں جن میں سے ایک فتح مکہ کے موقع پر اور دوسرا حجۃ الوداع کے موقع پر دیا گیا ان خطبوں کا مزاج انتہائی انقلابی ہے اور ان میں ایمان، اخلاق اور اقتدار تینوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ حجۃ الوداع کا خطبہ تو گویا ایک دورِ نو کے افتتاح کا اعلان ہے۔

### عام سماجی رابطہ :

بڑے بڑے کام کرنے والے لوگ بالعموم رابطہ عام کے لیے دقت نہیں نکال سکتے اور نہ ہر طرف توجہ دے سکتے ہیں۔ بعض بڑے لوگوں میں خلوت پسندی اور خشکی مزاج پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی شکار ہو کر اپنے لیے ایک عالم بالا بنا لیتے ہیں۔ مگر حضور انتہائی عظمت کے مقام پر فائز ہو کر اور تاریخ کا رخ بدلنے والے کارنامے انجام دے کر عوامی حلقوں سے پوری طرح مربوط تھے۔ اور جماعت اور معاشرہ کے افراد سے شخصی اور نجی تعلق رکھتے تھے علیحدگی پسندی یا کبر یا یبوست کا شائبہ تک نہ تھا وہ حقیقت آپ نے جس نظامِ اخوت کی تاسیس فرمائی تھی، یہ اس کا اہم تقاضا تھا کہ لوگ باہم دگر مربوط رہیں۔ ایک دوسرے کے کام آئیں اور ایک دوسرے کے حقوق پہچانیں۔ بخلاف اس کے آج جو تمدن مغرب میں نشوونما پا گیا ہے اس میں ”کسے را با کسے کارے نباشد“ کی فضا بڑی انسانیت کش ہو گئی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں اس فضا کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ آئیے ہم حضور کو نام سماجی رابطوں کے دائرے میں دیکھیں۔

آپ کا معمول تھا کہ راستہ میں ملنے والوں سے سلام کہتے اور سلام کہنے میں پہل کرتے۔ کسی کو پیغام بھیجاتے تو ساتھ سلام ضرور کہلاتے۔ کسی کا سلام پہنچایا جاتا تو بھیجنے والے کو بھی اور لانے والے کو بھی جدا جدا سلام کہتے۔ ایک بار لڑکوں کی ٹولی کے پاس سے گزرے تو ان کو سلام کیا۔ عورتوں کی جماعت کے



قریب سے ہو کر نکلے تو ان کو سلام کیا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اور گھر سے نکلنے کے لوگوں کو بھی سلام کہتے۔ احباب سے معاف بھی فرماتے اور مصافحہ بھی۔ مصافحہ سے ہاتھ اس وقت تک نہ کھینچتے جب تک دوسرا خود ہی اپنا ہاتھ الگ نہ کرتا۔

مجلس میں جاتے تو اس امر کو ناپسند کرتے کہ صحابہ تعظیم کے لیے کھڑے ہوں مجلس کے کنارے ہی بیٹھ جاتے۔ کندھوں پر سے پھاند کر بیچ میں گھسنے سے احتراز فرماتے۔ فرمایا: **أَجْلِسْ كَمَا يَجْلِسُ الْعَبْدُ**۔ (روایت عائشہؓ) اپنے زانو سا تھپیوں سے بڑھا کر نہ بیٹھتے، کوئی آتا تو اعزاز کے لیے اپنی چادر بچھا دیتے۔ آنے والا جب تک خود نہ اٹھتا آپ مجلس سے الگ نہ ہوتے۔

اہل مجلس کی گفتگو میں غیر متعلق موضوع نہ چھیڑتے بلکہ جو سلسلہ کلام چل رہا ہوتا اسی میں شامل ہو جاتے۔ چنانچہ نماز صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں صحابہ سے خوب باتیں ہوتیں۔ جاہلیت کے قصے چھیڑ جاتے اور ان پر خوب ہنسی بھی ہوتی۔ صحابہ شعر بھی پڑھتے۔ جس موضوع سے اہل مجلس کے چہروں سے اکتانے کا اثر محسوس ہوتا اسے بدل دیتے۔ ایک ایک فرد مجلس پر توجہ فرماتے تاکہ کوئی یہ نہ محسوس کرے کہ کسی کو اس پر آپ نے فوقیت دی ہے۔ دورانِ تکلم کوئی شخص غیر متعلق سوال چھیڑ دیتا تو اسے نظر انداز کر کے گفتگو جاری رکھتے اور سلسلہ پورا کر کے پھر اس کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ خطاب کرنے والے کی جانب سے اس وقت تک رخ نہ پھیرتے جب تک وہ خود منہ نہ پھیر لیتا۔ کان میں کوئی سرگوشی کرتا تو جب تک وہ بات پوری کر کے منہ نہ ہٹا لیتا آپ برابر اپنا سر اسی کی طرف جھکاتے رکھتے۔ کسی کی بات کو کبھی نہ کاٹتے۔ الایہ کہ حق کے خلاف ہو۔ اس صورت میں یا تو ٹوک دیتے یا پھرے پر ناگواری آجاتی یا اٹھ کر چلے جاتے۔ ناپسند تھا کہ کھڑے کھڑے کوئی اہم بحث چھیڑ دی جائے ناپسندیدہ باتوں سے یا تو اعراض فرماتے ورنہ گرفت کرنے کا عام طریقہ یہ تھا، کہ براہ راست نام لے کر ذکر نہ کرتے۔ بلکہ عمومی انداز میں اشارہ کرتے یا جامع طور پر نسبت کر دیتے۔ انتہائی تکرار کی صورت میں جو فقط دینی امور میں ہوتا تھا احباب کو احساس دلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ طریق اظہار تھا کہ یا تو شخص متعلق کے آنے پر سلام قبول نہ کرتے یا عدم التفات دکھاتے۔ ناپسندیدہ آدمی کے آنے پر بھی خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ چنانچہ ایک بار کوئی آیا جسے آپ بشش اخوالعشیرہ یابشش ابن العشیرہ (اپنے گروہ کا بڑا آدمی) سمجھتے تھے۔ مگر آپ نے بے تکلفی سے بات چیت کی۔

۱۔ روایت جابر بن سمرہ (مسلم)

حضرت عائشہؓ کو اس پر تعجب ہوا تو آپؓ نے فرمایا: ”قسم ہے کہ قیامت کے دن خُدا کے حضور وہ شخص بدترین آدمی کا مقام پائے گا جس سے لوگ اس کی بدسلوکی کے ڈر سے ملنا جلنا چھوڑ دیں۔“

کسی کی ملاقات کو جاتے تو دروازے کے دائیں بائیں کھڑے ہو کر اطلاع دینے اور اجازت لینے کے لیے تین مرتبہ سلام کرتے۔ جواب نہ ملتا تو بغیر کسی احساسِ تکبر کے واپس چلے آتے۔ رات کو کسی سے ملنے جاتے تو اتنی آواز میں سلام کہتے کہ اگر وہ جاگتا ہو تو سُن لے اور سو رہا ہو تو نیند میں خلل نہ آئے۔

بدن یا لباس سے کوئی شخص تنکا یا مٹی وغیرہ مٹاتا تو شکر یہ ادا کرتے ہوئے فرماتے مَسَحَ اللہُ عِنْدَكَ صَانِكُوہ (خدا تم سے ہر اس شے کو دُور کرے جو تمہیں بُری لگے) ہر یہ قبول کرتے اور جو بآہدیر دینے کا خیال رکھتے۔ کسی شخص کو اتفاقاً کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو اسے بدلہ لینے کا حق دیتے اور کبھی عوض میں کوئی ہدیہ دیتے۔ کوئی شخص نیا لباس پہن کر سامنے آتا تو فرماتے: حَسَنَةٌ حَسَنَةٌ اَبِلٌ وَاخْلُقُ یعنی خوب سے خوب دیر تک پہنو، بوسیدہ کرو، بدسلوکی کا بدلہ بُرے سلوک سے نہ دیتے بلکہ عفو و درگزر سے کام لیتے۔ دوسرے کے قصور معاف کر دیتے تو اطلاع کے لیے اپنا عامہ علامت کے طور پر بھیج دیتے کوئی پکارتا تو خواہ وُد گھر کا آدمی ہو یا رفقہ میں سے ہمیشہ لبیک“ (حاضر ہوں) کہتے۔

بیماروں کی عیادت کو اہتمام سے جاتے۔ سر ہانے بیٹھ کر پوچھتے: كَيْفَ بِنَدْوِكَ يَا اُمَّمَارِي حَبِيبَتِ كَيْسِي ہے؟، بیمار کی پیشانی اور نبض پر ہاتھ رکھتے۔ کبھی سینے اور پیٹ پر دستِ شفقت پھیرتے اور کبھی چہرے پر۔ کھانے کو پوچھتے۔ بیمار کسی چیز کی خواہش کرتا تو اگر مضر نہ ہوتی تو منگوا دیتے۔ تسلی دیتے اور فرماتے: لَا يَأْسُ اِنَّشَاءَ اللہِ طَهْمُوْرًا (فکر کی کوئی بات نہیں۔ خدا نے چاہا تو جلد صحت یاب ہو گے) شفا کے لیے دُعا فرماتے۔ حضرت سعد کے لیے تین بار دُعا کی۔ مشرک چچاؤں کی بیماری پر سی بھی کی۔ ایک یہودی بچے کی عیادت بھی فرمائی (جو ایمان لے آیا) اس کام کے لیے کوئی دن اور وقت مقرر نہ تھا۔ جب بھی اطلاع ملتی اور وقت ملتا تشریف لے جاتے۔

ایک بار حضرت جابرؓ بیمار پڑے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفیقِ خاص حضرت ابو بکرؓ کو اپنے ساتھ لیے ہوئے پیدل ناصی دُوری تک چل کر گئے (مدینہ کی آبادی پھیلی ہوئی تھی) حضرت جابرؓ بے ہوش پڑے تھے۔ آپؐ نے دیکھا۔ پھر وضو کیا۔ پانی کے چھینٹے دیے، دُعا کی اور مریض کی حالت سنبھلنے لگی خیاں چہ حضرت جابرؓ نے بات چیت کی اور اپنے ترکہ کے متعلق مسائل پوچھے۔

تواضع کی انتہا یہ تھی کہ منافقین کے لیڈر عبداللہ بن ابی تک کی عبادت فرمائی۔

جب کسی شخص کی وفات ہو جاتی تو تشریف لے جاتے، عالم نزع میں بلایا جاتا یا از خود اطلاع پا کر پہنچتے تو توحید اور توبہ الی اللہ کی تلقین کرتے۔ میت کے لواحقین سے ہمدردی کا اظہار فرماتے، صبر کی نصیحت کرتے اور چلانے اور بکا کرنے سے روکتے۔ سفید کپڑوں میں اچھا کفن دینے کی تاکید کرتے اور تجہیز و تکفین میں جلدی کرتے۔ جنازہ اٹھتا تو ساتھ ساتھ چلتے۔ مسلمانوں کے جنازے خود پڑھاتے اور مغفرت کے لیے دعا کرتے۔ کوئی جنازہ گزرتا۔ تو چاہے وہ غیر مسلم کا ہو۔ کھڑے ہو جاتے (بیٹھے رہنے کی روایت بھی ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ قیام کا طریقہ منسوخ ہو گیا تھا۔ ملاحظہ ہو زاد المعاد ج ۱ ص ۱۴۵) تلقین فرماتے کہ میت کے گھر والوں کے لیے لوگ کھانا پکوا کر بھجوائیں (کجا آج یہ الٹی رسمیت مستط ہے کہ میت والے گھر میں دوسروں کی ضیافت ہوتی ہے) ناپسند تھا کہ باقاعدہ مجلس تعزیت کا سلسلہ ایک رسمی ضابطے کے طور پر کئی روز جاری رہے۔

کوئی مسافر سفر سے واپس آتا اور حاضری دیتا تو اس سے معافقہ کرتے، بعض اوقات پشانی چوم لیتے کسی کو سفر کے لیے رخصت فرماتے تو کہتے کہ بھائی ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔

محبت آمیز بے تکلفی میں کبھی کبھی احباب کے ناموں کو مختصر کر کے بھی پکار لیتے، جیسے یا اباہریرہ کے بجائے "اباہر" حضرت عائشہ کو کبھی کبھار "عائش" کہہ کر پکارتے۔

بچوں سے بہت دلچسپی تھی۔ بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتے، پیار کرتے، دعا فرماتے، ننھے بچے لانے جاتے تو ان کو گود میں لے لیتے۔ ان کو بہلانے کے لیے عجیب سے کلمے فرماتے یعنی خرقۃ خرقۃ فی عین کلّ بفتہ۔ ایک معصوم بچے کو بوسہ دیتے ہوئے فرمایا اِنَّهُ لَمِنْ رِیْحَانِ اللّٰهِ (یہ بچے تو خدا کے باغ کے پھول ہیں) بچوں کے نام تجویز کرتے بچوں کو قطار میں جمع کر کے انعامی دوڑ لگواتے کہ دیکھیں کون ہمیں پہلے چھو لیتا ہے بچے دوڑتے ہوئے آتے تو کوئی سینہ پر گرتا، کوئی پیٹ پر۔ بچوں سے دل لگی بھی کرتے۔ مثلاً حضرت انسؓ کو کبھی کبھی پیار سے کہا "یا ذَا الدّٰدِیْنِ" (داؤ، دوکانوں والے) حضرت انسؓ کے بھائی ابو عمر کا پالا ہوا مولا مر گیا۔ تو وہ ادا اس بیٹھا تھا حضورؐ آئے تو پکار کر کہا "یا ابا عمیر! ما فعل النّٰغیر" (ابو عمر! تمہارا مولے کو کیا ہوا) عبداللہ بن بشیر کے ہاتھ ان کی والدہ نے ہدیہ کے طور پر انگور حضورؐ کی خدمت میں بھیجے۔

۱۔ بعض لوگوں نے معنی نکالنے کی کوشش کی ہے (ہر پھر کی آنکھ میں ٹڈی کا جبرہ ہے) مگر بظاہر ویسے ہی کلمات ہیں جیسے ہر تک میں بچوں کو بہلانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

جزادے میاں راستے میں کھا گئے۔ بعد میں معاملہ کھلا تو آپ پیار سے عبداللہ کے کان پکڑ کر کہتے یاغندر ! یاغندر! (اودھو کے باز، اودھو کے باز) سفر سے آرہے ہوتے تو جو بچہ راستے میں ملتا اسے سواری پر بٹھالیتے پھوٹا ہوتا تو آگے بڑا ہوتا تو پیچھے، فصل کامیوہ پہلی بار آتا تو دعائے برکت مانگ کر کم عمر بچے کو دے دیتے، آپ کے پیش نظر تھا کہ یہی نئی پود آئندہ تحریک اسلامی کی علمبردار ہوگی۔

بوڑھوں کا احترام فرماتے۔ فتح مکہ کے موقع پر حضرت ابو بکر صدیق اپنے متعین العمر والد کو (جو بنیانی سے بھی محروم ہو چکے تھے) بیعت اسلام کے لیے آپ کی خدمت میں لائے۔ فرمایا۔ انہیں کیوں تکلیف دی۔ میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔

مرقت کی انتہا یہ تھی کہ مدینہ کی ایک عورت جس کی عقل میں کچھ فتور تھا آتی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے کچھ کہنا ہے آپ اُسے فرماتے ہیں کہ تم چلو، کسی کوچے میں انتظار کرو، میں ابھی آتا ہوں۔ چنانچہ اس کی بات جا کر سنی۔ اور اس کا کام کر کے دیا۔ ایسا ہی ایک واقعہ عدی بن حاتم نے دیکھا تھا۔ اور حضور کی مرقت کو نبوت کی علامت کے طور پر لیا۔

میل جول کی زندگی میں آپ کے حسن کردار کی تصویر حضرت انسؓ نے خوب کھینچی ہے وہ فرماتے ہیں :  
 میں دس برس تک حضورؐ کی خدمت میں رہا اور آپ نے مجھے کبھی اُف تک نہ کہی۔ کوئی کام جیسا بھی کیا، نہیں کہا کہ یہ کیوں کیا۔ اور کوئی کام نہ کیا تو نہیں کہا کہ کیوں نہیں کیا جی معاذ آپ کا خادموں اور کنبزوں کے ساتھ رہا۔ آپ نے ان میں سے کسی کو کبھی نہیں مارا۔ اس کی تصدیق حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اندراج یا خادموں میں سے نہ کبھی کسی کو مارا، نہ کسی سے کوئی ذاتی انتقام لیا۔ بجز اس کے کہ آپ خدا کے راستے میں جہاد کریں یا قانونِ الہی کے تحت اس کی مقرر کردہ حرمتوں کے تحفظ کے لیے کارروائی کریں۔

### خالص نجی زندگی :

اکثر بڑے لوگ وہ کہاتے ہیں جو پبلک لائف کے لیے ایک مصنوعی کردار کا چغہ پہنے۔ کہتے ہیں جو نجی زندگی میں اُتر جاتا ہے باہر دیکھیے تو بڑی آن بان ہے، گھر پہنچے تو انتہائی پستی میں جاگڑے۔ باہر سادگی اور تواضع دکھائی، گھر کو پلٹے تو عیش و تنعم میں ڈوب گئے۔ پبلک اور پرائیویٹ زندگی میں کسی شخص کے ہاں جتنا زیادہ اختلاف اور فاصلہ ہوتا ہے، اتنا ہی اس کا مرتبہ ادنیٰ ہوتا ہے۔ حضورؐ کو دیکھیے تو ایک ہی رنگ گھر میں بھی ہے۔ دیکھ کر

سے باہر بھی۔

حضرت عائشہ سے کسی نے دریافت کیا کہ رسول خدا اپنے گھر میں کیا کیا کرتے تھے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا۔ آپ آدمیوں میں سے ایک آدمی تھے۔ اپنے کپڑوں کی دیکھ بھال خود ہی کر لیتے۔ دکہ ان میں کوئی جوں وغیرہ نہ چڑھ آئی ہو، بکری کا دودھ خود دوہتے اور اپنی ضرورتیں خود ہی پوری کر لیتے۔ نیز اپنے کپڑوں کو خود ہی پیوند لگا لیتے۔ اپنے جوتے کی مرمت کر لیتے اور یہ کہ اپنے ڈول کو ٹانگے لگا لیتے، بوجھ اٹھاتے، جانوروں کو چارہ ڈالنے، کوئی غلام ہوتا تو اس کے ساتھ مل کر کام کر دیتے (مثلاً، اسے آٹا پسوا دیتے۔ کبھی اکیلے ہی مشقت کر لیتے۔ بانار جانے میں غار نہ تھی۔ خود ہی سودا سلف لاتے اور ضرورت کی چیزیں ایک کپڑے میں باندھ کر اٹھا لاتے۔ لوگوں نے یہ بھی دریافت کیا کہ رسول خدا جب گھر میں ہوتے تو کیا رنگ رہتا؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا: میں: اَلْبَيْنُ النَّاسِ بِسَامًا صَاحِكًا (سب سے زیادہ نرم خو، متبسم، خندہ چین!) اور اس لینت کی شان یہ تھی کہ کبھی کسی غلام کو جھڑکا نہیں تھا، حق یہ ہے کہ رسول خدا سے بڑھ کر کوئی بھی اپنے اہل و عیال کے لیے شفیق نہ تھا (مسلم)

ایک بار حضرت امام حسینؑ کے پوچھنے پر حضرت علیؑ نے بیان کیا کہ رسول خدا گھر میں آتے تو اپنا وقت تین طرح کی مصروفیتوں میں صرف کرتے۔ کچھ وقت خدا کی عبادت میں صرف ہوتا۔ کچھ وقت اہل و عیال کے لیے تھا اور کچھ وقت اپنے آرام کے لیے۔ پھر انہی اوقات میں سے ایک حصہ ملاقاتیوں کے لیے نکالتے جن میں مسجد کی عام مجالس کے علاوہ خصوصی گفتگو کرنے والے اصحاب یا مہمان آ کر ملتے یا کچھ لوگ ضروریات و حاجات لے کر آتے تھے دیکھا جائے تو آرام کے لیے بہت ہی کم وقت رہ جاتا تھا۔

ازواجِ مطہرات کے نان و نفقہ اور مختلف ضروریات کا انتظام بھی آپ کو کرنا ہوتا پھر ان کی تعلیم و تربیت بھی آپ کے ذمے تھی۔ پھر انہی کے ذریعے طبقہ خواتین کی اصلاح کا کام جاری رہتا۔ عورتیں اپنے مسائل لے کر آتیں اور ازواجِ مطہرات کی معرفت دریافت کرتیں۔ اس کے باوجود گھر کی فضا کو آپ نے کبھی خشک اور بوجھل نہ بننے دیا۔ اور نہ اس میں کوئی مصنوعی انداز پیدا ہونے دیا۔ گھر ایک انسانی گھر کی طرح تھا جس کی فضا میں فطری جذبات کا مد و جزر رہتا۔ اس میں آنسوؤں کی چمک بھی ہوتی اور ہنسون کی لمعانی بھی محبتیں بھی کار فرما تھیں اور کبھی کبھار رشک کا کھچاؤ

۱۔ ملاحظہ ہو: شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی توابع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۳

۳۔ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۳

۴۔ شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی توابع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بھی پیدا ہوتا۔ پریشانیاں بھی رہتیں اور تفریح کے لمحات بھی آتے حضور اس بارغ میں آتے تو نسیم کے جھونکے کی طرح آتے اور ایک عجیب شگفتگی پھیل جاتی۔ بات چیت ہوتی۔ کبھی کبھی قصہ گوئی بھی ہوتی۔ اور دلچسپ لطائف بھی وقوع میں آتے، مثلاً اپنا ایک واقعہ حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے خزیرہؓ کو گوشت کا قیمہ کر کے پانی میں پکاتے اور پھر اس پر آٹا چھڑکتے جو ساتھ ہی پکتا، تیار کیا۔ حضرت سوڈہ بھی موجود تھیں اور رسول خداؐ دونوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ بے تکلفی کی فضا تھی۔ میں نے سوڈہ سے کہا کہ کھاؤ انہوں نے انکار کیا پھر اصرار سے کہا کہ کھاؤ۔ انہوں نے انکار کیا۔ پھر اصرار سے کہا کہ تمہیں ضرور کھانا ہوگا۔ انہوں نے پھر انکار کیا۔ ادھر سے پھر کہا گیا کہ اس میں سے کھاؤ ورنہ میں اٹھا کر تمہارے منہ پر مل دوں گی۔ حضرت سوڈہ نے بھی ہٹ دکھائی۔ حضرت عائشہؓ نے خزیرہؓ میں ہاتھ ڈالا۔ اور واقعی حضرت سوڈہؓ کے چہرے پر لپ پ دیا۔ اس بے تکلفی پر حضورؐ خوب ہنسے اور سوڈہ سے کہا کہ تم اس کے منہ پر ملو، کہ صاب برابر ہو جائے چنانچہ سوڈہ نے ایسا ہی کیا۔ حضورؐ مگر ہنسے۔

ایک موقع پر حضرت ابو بکرؓ آئے تو حضرت عائشہؓ کو حضورؐ کے ساتھ شوخی سے بات کرتے پایا۔ عصب ناک ہو کر مارنے کو چلے۔ حضورؐ نے ان کو ٹھنڈا کیا کہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ سی غصے میں غائب صدیق چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد آپؐ نے بڑے تیکھے انداز میں حضرت عائشہؓ سے کہا کہ تم نے تمہیں اس شخص سے بچا لیا۔

گھر ملی زندگی کے اس فطری آثار چہرہ عاؤ کو بعض لوگ سلامیت کے تصور سے ذرا تپتے ہیں۔ وہ نسیم سا نبی کریمؐ کے گھر کا نقشہ کچھ ایسا ذہن میں رکھتے ہیں کہ اس میں کوئی غیر انسانی پتے رہتے تھے جن میں۔ کوئی جذبہ تھا، نہ خواہش — حالانکہ وہ گھر انسانوں کا گھر تھا۔ اور اس میں سارے انسانی جذبات کا مہ کرتے تھے مگر اس گھر میں معصیت نہ تھی۔ اس لحاظ سے وہ نمونے کا گھر تھا۔ راتوں کو جب حضورؐ بستر پر ہوتے تو اہل و عیال سے نام باتیں ہوتیں۔ کبھی گھر یلو امور پر، کبھی نام مسلمانوں کے مسائل پر۔ یہاں تک کہ کبھی قصہ گوئی بھی سنا تے۔ ایک بار آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے امر زرع کی کہانی بیان کی۔ اس کہانی میں کیا، عورتیں اپنے اپنے ناندروں کا کردار آپس میں بیان کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک عورت امر زرع اپنے ناندروں کو امر زرع کا من موٹھا کر دیا پیش کرتی ہے۔ یہ کہانی ادبی لحاظ سے بڑی دلچسپ ہے۔ ناندروں کے چہرے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میں بھی تمہارے حق میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ ابو زرع امر زرع کے لیے تھا۔ اسی طرح کسی دوسرے

موقع پر کوئی قصہ سنایا تو سننے والیوں میں سے ایک نے کہا کہ یہ تو خرافہ کے قصوں جیسا ہے دُرب میں خرافہ کی ایک روایتی شخصیت تھی جس سے بہت سے حیرت ناک قصے منسوب تھے، حضور نے کہا کہ جانتی بھی ہو کہ خرافہ کی کیا حقیقت تھی۔ پھر آپ نے خرافہ کی روایتی شخصیت کا قصہ بھی بیان کیا کہ بنو عدزہ کے اس آدمی کو جن پکڑ کر لے گئے تھے اور کچھ عرصہ کے بعد واپس چھوڑ گئے۔

عمر بھر معمول رہا کہ رات کے دوسرے نصف حصے کے اوائل میں بیدار ہو کر مسواک اور وضو کے بعد تہجد ادا فرماتے۔ قرآن پڑھ کر پڑھتے ہوئے بعض اوقات اتنا لمبا قیام فرماتے کہ قدم مبارک متوڑم ہو جاتے۔ صحابہ نے اس مشقت پر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ کو غفران خاص سے نوازا ہے۔ قَدْ غَفَرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَفَعَّلَ مَرَمِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ، پھر اس قدر حضور جان کیوں گھلاتے ہیں۔ فرمایا: اَفَلَا اَكُوْنَ عَبْدًا اشْكُوْدًا! کیا میں خدا کا احسان شناس اور شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

گھر اور اس کے ساز و سامان کے متعلق آپ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ زندگی اس طرح گزارنی چاہئے۔ جیسے مسافر گزارتا ہے فرمایا کہ میری مثال اس مسافر کی سی ہے جو تھوڑی دیر کے لیے سائے میں آرام کرے اور پھر اپنی راہ لے۔ مراد یہ ہے کہ جو لوگ آخرت کو منہتا بنائیں اور دنیوی زندگی کو ادائے فرض یا امتحان کے طور پر گزاریں۔ اور جنہیں یہاں کسی بڑے نصب العین کے لیے جدوجہد کرنی ہو ان کے لیے کیا موقع ہے کہ اعلیٰ درجہ کے مسکن بنائیں اور ان کو ساز و سامان سے آراستہ کریں اور پھر ان میں گن رہ کر لطف اٹھائیں۔ چنانچہ آپ اور آپ کے ساتھیوں نے نہ اعلیٰ درجہ کی عمارتیں بنائیں۔ اور نہ ان میں اسباب جمع کیے اور نہ ان کی زمینت آرائش کی۔ ان کے گھر بس "بہترین مسافرانہ قیام گاہیں تھیں۔ ان میں گرمی سردی سے بچنے کا اہتمام تھا، جانوروں کی مداخلت سے بچاؤ کا انتظام تھا، پردہ داری (Privacy) کا بندوبست تھا۔ اور حفظانِ صحت کے ضروری پہلو ملحوظ تھے۔ حضور نے مسجد کے ساتھ ازدواج کے لیے حجرات (چھوٹے چھوٹے کمرے) بنوائے تھے۔ بجز صفائی کے اور کسی طرح کی آرائش نہ تھی۔ صفائی میں ذوقِ نبوت یہاں تک تھا کہ صحابہ کو تاکید فرمائی۔ "گھروں کے

۱۔ شمائل ترمذی، باب ماجاء فی کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی السمر  
۲۔ زاد المعاد۔

۳۔ شمائل ترمذی، باب ماجاء فی عبادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
۴۔ شمائل ترمذی، باب ماجاء فی عبادت رسول اللہ۔  
۵۔ زاد المعاد۔

## آگن صاف رکھو

ساز و سامان میں چند برتن نہایت سادہ قسم کے تھے۔ مثلاً ایک لکڑی کا پیالہ (بادیہ) تھا۔ جس پر لہجے کے پتر لگے تھے اور کھانے پینے میں اس کا بکثرت استعمال ہوتا تھا۔ خوراک کا سامان جمع تو کیا ہوتا روز کا روز بھی کافی مقدار میں میسر نہ ہوا۔ بستر چمڑے کے گدے پر مشتمل تھا۔ جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ بان کی بنی ہوئی چارپائی رکھتے۔ ٹاٹ کا بستر بھی استعمال میں رہا۔ جو دوہرا کر کے بچھایا جاتا۔ ایک بار چوہرا کر کے بچھایا گیا تو صبح دریافت فرمایا کہ آج کیا خصوصیت تھی کہ مجھے گہری نیند آئی اور نہج چھوٹ گئی۔ معلوم ہونے پر حکم دیا کہ بستر کو پہلے ہی حال پر رہنے دیا جائے۔ زمین پر چٹائی بچھا کر بھی لیٹنے کا معمول تھا۔ بعض اوقات کھری چارپائی کے نشانات بدن پر دیکھ کر رفقاءے خاص (مثلاً حضرت عمرؓ و عبداللہ بن مسعود) رو دیے۔

ذرا حضرت عمرؓ کا چشم دید نقشہ سامنے لائیے۔ واقعہ ایلام کے زمانے میں انہوں نے حضورؐ کو اس عالم میں دیکھا کہ آپؐ کھری چارپائی پر لیٹے ہیں اور جسم پر نشان پڑ گئے ہیں۔ ادھر ادھر دیکھا تو ایک طرف مٹھی بھر بٹو رکھے ہیں۔ ایک کونے میں کسی جانور کی کھال کیلی سے لٹک رہی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضورؐ نے رونے کا سبب پوچھا تو عرض کی کہ قیصر و کسریٰ تو عیش کریں اور آپؐ کا یہ حال رہے فرمایا "عمر! کیا تم اس پر خوش نہیں کہ وہ لوگ دنیا لے جائیں اور میں آخرت لے لے۔"

## اکل و شرب

کھانے پینے کا ذوق بہت نفیس تھا۔ گوشت سے خاص رغبت تھی۔ زیادہ ترجیح دست، گردن اور پیٹھ کے گوشت کو دیتے، نیز پہلو کی بڑی پسند تھی۔ شہید (گوشت کے شوربے میں روٹی کے ٹکڑے بھگو کر یہ مخصوص عربی کھانا تیار کیا جاتا تھا) تناول فرمانا مرغوب تھا۔ پسندیدہ چیزوں میں شہد، سرکہ، خرپورہ، لکڑی لوکی، کھجور، مکھن وغیرہ اشیاء شامل تھیں۔ دودھ کے ساتھ کھجور (بہترین مکمل غذا بنتی ہے) کا استعمال بھی اچھا لگتا اور مکھن لگا کے کھجور کھانا بھی ذوق میں شامل تھا۔ کھجور (تدیگی) سے بھی انس تھا۔ لکڑی نمک لگا کر اور خرپورہ شکر لگا کر بھی کھاتے۔ مرینوں کی پرہیزی غذا کے طور پر حریرہ کو اچھا سمجھتے اور تجویز بھی فرماتے۔ میٹھا پکوان بھی مرغوب خاص تھا۔ اکثر تجویز کے ساتھ بھی استعمال فرماتے۔ ایک مرتبہ بادام کے ستوپیش لیے گئے تو یہ کھرا لگا کر دیا کہ یہ امراد کی غذا ہے۔ گھر میں شور با پکنا تو کہتے کہ ہمسائے کے لیے ذرا زیادہ بنا یا جائے۔

۱۔ روایت ابن المصیب (ترمذی)۔

۲۔ ملاحظہ ہو: شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی فراش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۳۔ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۱۱، نیز صحیح مسلم باب فی الرجل یطلق امرأته۔ روایت عبداللہ ابن عباس۔



پینے کی چیزوں میں نمبر ایک پر بیٹھا پانی تھا۔ اور بطورِ خاص دو روز کی مسافت سے منگوا یا جاتا۔ دودھ پانی ملا دودھ (جسے کچی لسی کہا جاتا ہے) اور شہد کا شربت بھی رغبت سے نوش فرماتے۔ غیر نشہ دار نبید بھی قرینِ ذوق تھی۔ مشکیزے یا پتھر کے برتن میں پانی ڈال کر کھجور بھگو دی جاتی اور اسے متواتر دن بھر استعمال کرتے لیکن وقت زیادہ ہونے پر چونکہ نشہ ہونے کا اندیشہ ہو جاتا لہذا پھنکوا دیتے۔ ہر روایت ابوالک اشعری یہ فرمایا بھی کہ میری امت میں سے بعض لوگ شراب پئیں گے اور اس کا نام بدل کر کچھ اور رکھ دیں گے رچناچہ سلاطین مابعد نے نبید کے نام سے منشیات کا استعمال کیا،

افراد کا الگ الگ بیٹھ کر کھانا ناپسند تھا، اکٹھے ہو کر کھانے کی تلقین فرمائی، میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو اپنی شانِ فقر کے خلاف سمجھتے، اسی طرح دسترخوان پر چھوٹی چھوٹی پیالیوں اور طشتریوں میں کھانا رکھا جانا بھی خلافِ مزاج تھا۔ سونے چاندی کے برتنوں کو بالکل حرام فرما دیا تھا۔ کاج، مٹی، تانبے اور لکڑی کے برتنوں کو استعمال میں لاتے رہے۔ دسترخوان پر ہاتھ دھونے کے بعد جوتا اتار کر بیٹھتے۔ سیدھے ہاتھ سے کھانا لیتے اور اپنے سامنے کی طرف سے لیتے۔ برتن کے وسط میں ہاتھ نہ ڈالتے۔ ٹیک لگا کر کھانا پینا بھی خلافِ معمول تھا دو زانو یا اکڑوں بیٹھتے۔ ہر لقمہ لینے پر بسم اللہ پڑھتے۔ ناپسندیدہ کھانا بغیر عیب نکالے خاموشی سے چھوڑ دیتے۔ زیادہ گرم کھانا نہ کھاتے کبھی کبھار چھری سے پکا ہوا گوشت کاٹ کاٹ کر بھی کھایا ہے۔ مگر یہ پُر تکلف طریقہ مرغوب نہ تھا یہ کھانا ہمیشہ تین انگلیوں سے لیتے اور ان کو تھپانے نہ دیتے۔ کبھی کبھار میوہ یا پھل کھڑے ہو کر یا چلتے ہوئے بھی کھالیا۔ دو پھل اکٹھے بھی کھائے۔ مثلاً ایک ہاتھ میں خرپوزہ لیا اور دوسرے میں کھجور۔ کھجور کی گٹھلی اٹھے ہاتھ سے پھینکتے۔ دعوت ضرور قبول فرماتے اور اگر اتفاقاً کوئی دوسرا آدمی (بات چیت کرتے ہوئے یا کسی اور سبب سے) ساتھ ہوتا تو اسے لے تو جاتے مگر صاحبِ خانہ سے اس کے لیے اجازت لیتے۔ مہمان کو کھانا کھلاتے تو بار بار اصرار سے کہتے کہ اچھی طرح بے تکلفی سے کھاؤ۔ کھانے کی مجلس سے بہ نقاشائے مروت سب سے آخر میں اٹھتے۔ دوسرے لوگ اگر پہلے فارغ ہو جاتے تو ان کے ساتھ ہی آپ بھی اُٹھ جاتے۔ فارغ ہو کر ہاتھ ضرور دھوتے۔ دعا کرتے جس میں خدا کی نعمتوں کے لیے ادائے شکر کے کلمات ہوتے، نیز طلبِ رزق فرماتے اور صاحبِ خانہ کے لیے برکت چاہتے۔ کھانے کی کوئی چیز آتی تو حاضر دوستوں کو باصرار شریک کرتے اور غیر حاضر دوستوں کا حصہ رکھ دیتے۔ پھل وغیرہ کھانے کی مجلس میں ایک ایک دانہ لینے کی ترسیت آپ نے دی۔ پانی غٹ غٹ کی آواز نکالے بغیر پیتے اور بالعموم تین بار پیالہ منہ سے الگ

۱۔ روایت عمر بن امیہ (بخاری و مسلم) نیز روایت عائشہؓ (ابوداؤد و بیہقی)

کئے۔ انس لیتے اور ہر بار آغاز "بسم اللہ" سے اور اختتام "الحمد للہ والشکر للہ" پر کرتے۔ عام طریقہ بیٹھ کر پانی پینے کا تھا۔ مگر کبھی کبھی کھڑے ہو کر بھی پیا۔ پینے کی چیز مجلس میں آتی تو بالعموم داہنی جانب سے درج پلاتے اور جہاں ایک دور ختم ہوتا دوسرا وہیں سے شروع کرتے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو ترجیح دیتے، مگر داہنے ہاتھ والوں کے مقررہ استحقاق کی بنا پر ان سے اجازت لے کر ہی ترتیب توڑتے احباب کو کوئی چیز پلاتے تو خود سب سے آخر میں پیتے اور فرماتے کہ "ساقی آخر میں پیا کرتا ہے" کھانے پینے کی چیزوں میں پھونک مارنا یا ان کو سونگھنا ناپسند تھا۔ سانس میں بو کا ہونا چونکہ خلاف مزاج تھا اس لیے کچی پیاز اور لہسن کا استعمال ہمیشہ ناپسند رہا۔ کھانے پینے کی چیزوں کو ڈھانکنے کا حکم دیا ہے۔ کوئی نیا کھانا سامنے آتا تو کھانے سے پہلے اس کا نام معلوم فرماتے۔ زہر خورانی کے واقعہ کے بعد معمول ہو گیا تھا کہ اگر کوئی اجنبی شخص کھانا کھلاتا تو پہلے ایک آدھ لقمہ خود اسے کھلاتے۔

ذوق کی اس نفاست کے ساتھ دوسری طرف اکثر اوقات فقر و فاقہ کا عالم درپیش رہا۔ جس کی تفصیل ہم دوسری جگہ دیں گے۔ فرمایا اکل کما یا کل العبد۔ میرا کھانا پینا ایسا ہے جیسے خدا کے کسی بندے کا ہونا چاہیے۔

## نشست و برخاست :

کبھی اکڑوں بیٹھتے، کبھی دونوں ہاتھ زانوؤں کے گرد حلقہ زن کر لیتے کبھی ہاتھوں کے بجائے کپڑا دیاور وغیرہ لپیٹ لیتے۔ بیٹھے ہوئے ٹیک لگاتے تو بالعموم اٹھے ہاتھ پر۔ نکر یا سوچ کے وقت بیٹھے ہونے زمین کو لکڑی سے گڑیتے۔ سونے کے لیے سیدھی کر دٹ سوتے اور دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر داہنا رخسار رکھ لینے۔ کبھی چپت بھی لیٹتے اور پاؤں پر پاؤں بھی رکھ لیتے۔ مگر ستر کا اہتمام رکھتے۔ پیٹ کے بل اور دعا بیٹنا سخت ناپسند تھا اور اس سے منع فرماتے تھے۔ ایسے تاریک گھر میں سونا پسند نہ تھا جس میں چراغ نہ بولا یا کب ہو۔ کھلی چھت پر جس کی پردے کی دیوار نہ ہو سونا اچھا نہ سمجھتے، ورنہ کر کے سونے کی عادت تھی اور سوتے وقت مختلف دنیا میں پڑھنے کے علاوہ آخری تین سویتیں (سودہ اخلاص اور معوذتین) پڑھ کر بدن پر دم کر لیتے تھے سوتے ہوئے لمبی آواز سے خراٹے لیتے۔ رات میں قنائے حاجت کے لیے اٹھتے تو نارغ ہونے کے بعد ہاتھ منہ نرزہ دھو لیتے تھے۔ سونے کے لیے ایک تہ بند علیحدہ تھا۔ کرتا اتار کر ٹانگ دیتے۔

۱۔ ملاحظہ ہو شامل ترمذی (ابواب متعلقہ)

۲۔ مختلف ادکار و ادعیہ کو ہم دوسرے موقع پر لائیں گے۔

۳۔ شامل ترمذی۔

## بستری حاجات :

ضرورت کے لیے چونکہ اس دور میں گھروں میں بیت الخلاء نہ تھے اس لیے حضور جنگل ہاتے۔ عموماً اتنی دُور تک جاتے (۲،۲ میل تک) کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔ ایسی نرم زمین تلاش کرتے کہ چھینٹے نہ اڑیں۔ موقع حاجت پر پہلے بائیں قدم رکھتے پھر دایاں۔ بیٹھتے ہوئے زمین کے بالکل قریب ہو کر مقام ستر سے کپڑا کھولتے۔ کسی ٹیلے وغیرہ کی اڑ ضرور لیتے۔ ضرورت کے لیے ہمیشہ جوتا پہن کر اور سر ڈھک کر نکلتے۔ قبلہ کی طرف منہ پائنت کرنے سے اجتناب تھا۔ رفع حاجت کے وقت انگوٹھی الگ کر دیتے۔ (واضح رہے کہ اس پر غدا اور رسول کے اسماء کنہہ تھے) ابدست بالالتزام بائیں ہاتھ ہی سے کرتے۔ جائے ضرورت سے الگ ہوتے ہوئے پہلے دایاں پاؤں اٹھاتے پھر بائیں۔

غسل کے لیے پردہ ضروری قرار دیا تھا۔ گھر میں نہاتے تو کپڑے کا پردہ تانا جاتا۔ کبھی بارش میں نہاتے تو تیز بند باندھ لیتے۔

چھینک پست آواز سے لیتے اور ہاتھ یا کپڑا منہ پر رکھ لیتے۔

## سفر :

سفر کے لیے جمعرات کو روانگی زیادہ پسند تھی۔ سواری کو تیز چلاتے۔ پڑاؤ سے صبح کے وقت کوچ کرنا معمول رہا۔ سفر (Camp Life) میں جو اجتماعی کام درپیش ہوتے ان میں ضرور حصہ لیتے۔ چنانچہ ایک بار کھانا تیار کرنے کی ہم تھی۔ سارے ساتھیوں نے کام تقسیم کیے۔ آپ نے بھی لکڑیاں چننا اپنے ذمہ لیا۔ کہا گیا کہ آپ تکلیف نہ کریں، ہم سب اس کام کے لیے کافی ہیں۔ فرمایا کہ مجھے امتیاز پسند نہیں ملے۔ سفر میں اپنی سواری پر باری باری کسی نہ کسی پیادہ ساتھی کو شریک کرتے سفر سے رات میں واپس آنا پسند نہ تھا۔ آتے تو سیدھے گھر جانے کے بجائے مسجد میں جا کر نفل ادا کرتے۔ گھر میں اطلاع ہو جانے کے بعد اطمینان سے جاتے۔

## جذبات :

انسانیت کا کوئی تصور ہم جذبات کو الگ رکھ کر نہیں کر سکتے۔ حضور میں بھی انسانی جذبات بہترین اسلوب پر کار فرما تھے۔ آپ بہت ہی صاحبِ احساس ہستی تھے اور خوشی میں خوشی اور غم میں غم سے متاثر ہوتے۔ حضور ان نام نہاد بڑے لوگوں میں سے نہ تھے۔ جو دنیا جہان کے غم میں گھٹے جاتے ہیں لیکن گھر کے لیے سنگ دل اور تغافل کیش ثابت ہوتے ہیں۔ باہر کی زندگی پر ہنگامہ ہوتی ہے۔ گھر کی پھینکی اور بد مزہ۔ آپ

ازواج کے ساتھ سچی محبت تھی۔ حضرت عائشہ کے ساتھ ایک ہی پیالہ میں پانی پینے اور جہاں وہ منہ لگاتیں وہیں منہ لگاتے۔ انصار کی بچیوں کو بلواتے تاکہ وہ ان کے ساتھ کھیلیں۔ جہنشیوں کے درز شی کرتے اس انداز سے دکھائے کہ حضرت عائشہ کی ٹھوڑی آپ کے کندھے پر تھی۔ بار بار پوچھتے، کہ کیا تم سیر ہو گئی ہو؟ وہ کہتیں "ابھی نہیں"؛ دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ حضرت صفیہ کو ارنٹ پر سوار کرنے کے لیے آپ اپنا گھٹنا بڑھا دیتے اور اس پر آنجناب اپنا پیر رکھ کر سوار ہو جاتیں۔ ایک مرتبہ سفر میں آنجناب کا پاؤں پھسلا اور حضور اور جناب صفیہ دونوں گر پڑے۔ ابو طلحہ ساتھ تھے۔ دوڑے ہوئے آپ کے پاس آئے۔ آپ نے فرمایا پہلے خاتون کی طرف توجہ کرو۔ ایک بار ساربان نے انٹوں کو تیز چلایا۔ تو نہ ہانے لگے۔ دیکھو! آگینے ہیں آگینے! ذرا احتیاط سے اسے اسی محبت کی وجہ سے ایک بار شہدہ نہ کھانے کی قسم کھالی تھی جس پر عتاب آیا کہ حد دل شے کو حرام نہ کرو تھے!

اپنے بچوں کے لیے بھی حضور کے جذبات بڑے گہرے تھے۔ حضرت ابراہیم کو رضاعت کے لیے ایک بوہار کے گھر میں مدینہ کے بالائی حصے میں رکھ گیا تھا۔ ان کو دیکھنے کے لیے نمازہ فاصلا چل کر تشریف لے جاتے۔ گھر میں دھواں بھرا ہوتا مگر وہاں بیٹھے اور بچے کو گود میں لے کر پیار کرتے۔ حضرت فاطمہؓ آتیں تو اٹھ کر استقبال کرنے۔ خود تشریف لے جاتے۔ اپنی کہتے، ان کی سنتے ان کے صاحبزادوں امام حسنؓ و امام حسینؓ سے بہت ہی پیار تھا۔ ان کو گود میں لیتے، ان کو کندھوں پر سوار کرتے ان کے لیے گھوڑا بنتے۔ حالت نماز میں بھی ان کو کندھوں پر بیٹھنے دیتے ایک بار اقرع بن حابس نے آپ کو جناب حسنؓ کا بوسہ لینے دیکھا تو تعجب سے کہا کہ میرے گود میں بیٹے ہیں میں نے کبھی کسی کو پیار کیا۔

۱۔ المواہب اللدنیہ ج ۱ ص ۲۹۶

۲۔ مسلم و بخاری۔

۳۔ مغربی اہل قلم نے حضور کی اس صاف ستھری ازدواجی زندگی کو مخالفت کا ہدف بنایا ہے، حالانکہ خود ان کے تمدن نے جو بلند ترین اور عمدہ دارترین شخصتیں پیدا کی ہیں وہ نہ صرف گھر کے دائرے میں رکانتے تھے بلکہ اس دائرے سے باہر بھی انہیں نفسانیت گھنڈاؤنی پستیوں میں گراتی رہتی ہے۔ حضور کا حال یہ تھا کہ ساری دلچسپیاں دائرہ ازدواج تک محدود تھیں اور ان میں بھی رنگ پائیزگی نمایاں تھا آپ نے فطرت کے تقاضوں کو شائستگی کی حد میں رکھ کر باحسن طریق پورا کیا، اور ازدواجی محبت کا ایک مہذب اسلوب پیدا کیا۔

۴۔ بروایت السنن۔

کیا مگر آپ بوسہ لیتے ہیں۔ فرمایا جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

انہی ابراہیم صاحبزادے کی وفات ہوئی تو صدمہ سے آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اسی طرح ایک صاحبزادی کی وفات آپ کی موجودگی میں ہوئی۔ اُمّ امین (کنیز) چلا چلا کے رونے لگیں۔ حضور نے منع فرمایا۔ تو وہ کہنے لگیں کہ آپ، خود بھی تو در رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا رونا منع نہیں ہے۔ یہ رونا جس رقت کی وجہ سے ہے وہ اللہ کی ایک رحمت ہے۔ اپنی صاحبزادی اُمّ کلثوم کی قبر پر کھڑے ہوئے تو اس وقت بھی آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ عثمان بن مظعون کی میت کے سامنے بھی آپ کی آنکھیں اشکبار تھیں اور آپ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اپنے رونے کی کیفیت کو خود بیان فرمایا۔ ”آنکھیں اشک آلود ہیں، دل غم زدہ ہے، مگر ہم اپنی زبان سے اس کے ماسوا کچھ نہیں کہتے جو ہمارے رب کو پسند ہے“ غم کی حالت میں اکثر زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے حسبی اللہ نعم الوکیل۔ رونے میں ادبچی آواز نہ نکلتی، بلکہ ٹھنڈا سانس لیتے۔ اور ہانڈی کے اُبلنے جیسی آواز سینے سے نکلتی۔

یہ دل حساس جب اپنے خدا کے حضور میں عرض و نیاز کر رہا ہوتا یا قرآن در زبان ہوتا تو ایسی حالت میں بھی بسا اوقات پلکوں پر موتی چپکنے لگتے۔ ایک بار عبداللہ ابن مسعود سے فرمائش کر کے قرآن سنا۔ وہ جب سورہ نساء کی اس آیت پر پہنچے ”فکیف، اذا جئنا...“ (اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کو اٹھا کر کھڑا کریں گے اور ان لوگوں پر تمہیں گواہ بنا کے لائیں گے، تو آنکھوں سے سیل اشک رواں ہو گیا۔

یہ رقت سرچشمہ ہے ان جذبات ہمدردی و شفقت کا جو حضور کو ساری انسانیت سے تھی۔ اور خصوصاً اسلامی جماعت کے افراد سے! حیرت ہے کہ اس نزاکتِ احساس کے ساتھ ساتھ حضور نے منکلاتِ مصائب کے مقابلے میں کس درجہ کے صبر و استقلال کا مظاہرہ کیا۔

### ذوق مزاج :

ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ رسول خدا خندہ روئی کی صفت سے متصف تھے، بلکہ فرمایا:   
 وَنَبَسَمَكَ فِي وَجَدِ أَخِيكَ. ”تیرا اپنے بھائی کے سامنے مسکراتے ہوئے آنا بھی ایک کامِ خیر ہے، آپ کی یہ شان بھی بیان ہو چکی ہے۔ کہ کان بسامًا صاحكًا۔ عظیم کارنامے انجام دینے والی

شخصیت کے لیے یہ ایک لازمی وصف ہے کہ وہ فرائض حیات کے بوجھ کو اپنے تبسم سے گوارا بنادے اور ساتھیوں کے دلوں میں گھر کر لے۔ آپ کا حال یہ تھا کہ قد کان یبسط اور حسابہ بجمالیہ و دلچشمہ فی القلوب یعنی آپ ایسے بے تکلفانہ انداز مزاج سے پیش آتے تھے کہ رفقہ کے دلوں میں آپ کی محبت رچ بس گئی تھی۔ آپ ہنسی، دل لگی کی باتیں کرتے۔ اور مجلس میں شگفتگی کی انسا پیدا کر دیتے۔ مگر توازن و اعتدال ہمیشہ ملحوظ رہتا مزاج کا رنگ آٹھے میں نمک کی طرح ہلکا رہتا اور اس میں بھی نہ تو خلاف حق کبھی کوئی بات شامل ہوتی۔ نہ کسی کی دلازاری کی جاتی اور نہ ٹھٹھے لگا کر ہنسنا معمول تھا۔ غیچوں کا سا تبسم ہوتا جس میں زیادہ سے زیادہ دانتوں کے کیلے دکھائی دیتے، حلق نظر نہ آتا۔

ایک بار تعجب سے حضرت ابو ہریرہ نے کہا کہ ”آپ ہم سے مذاق بھی نہ مالا لیتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: ”ہاں! مگر میں خلاف حق کوئی بات نہیں کہتا“

یہاں ہم حضور پاک کے مزاج کے چند نمونے درج کرتے ہیں جو سنت کے ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ کسی سائل نے سواری کا اونٹ مانگا۔ فرمایا ہم تمہیں اونٹنی کا ایک بچہ دیں گے سائل نے حیرت سے کہا کہ میں اسے لے کر کیا کروں گا۔ فرمایا: ہر ایک اونٹ کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے۔ ایک بڑھیا نے آکر عرض کی کہ میرے لیے دنیا کیجیے کہ خدا مجھے جنت عطا فرمائے حضور نے مزاج کہا: اے ام نلا! جنت میں کوئی بوڑھی عورت نہیں جاسکتی، وہ روتی، بونی اٹھ کر جانے لگی۔ حاضرین سے فرمایا۔ اسے کہو کہ خدا تعالیٰ اسے ان بڑھاپے کے ساتھ جنت میں نہیں لے جانے کا بلکہ اس کا ارشاد ہے کہ اَنْشَانَاهُنَّ الشَّاءَ فَجَعَلْنَاهُنَّ بَكَارًا عَسَوًا اَشْرَابًا مراد یہ کہ جنت میں جانے والیوں کو اللہ تعالیٰ جوانی سے سرفراز فرمائے گا۔

زاہر ریاز ہیرا نامی ایک بدوی تھے۔ ان سے بے تکلفی تھی۔ آپ اپنے اس بدوی دوست کو شہر سے متعلق کاموں میں امداد دیتے اور وہ دیہات سے متعلق حضور کے کام کر لاتا۔ نیز مخلصانہ جذبے سے ہدیے دیتا جن کی قیمت حضور باصرار ادا فرماتے، چنانچہ فرماتے کہ زاہر دیہات میں ہمارا گماشتہ ہے اور ہم شہر میں اس کے گماشتہ ہیں۔ یہی زاہر ایک دن بازار میں اپنا کچھ سودا بیچ رہے تھے حضور نے پیچھے سے جا کر چپکے سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور پوچھا بتاؤ میں کون ہوں۔ وہ پہلے تو کہے: سمجھے پھر جب معلوم ہوا تو فرط استیفاء

میں حضور کے سینے سے اپنے کندھے ملتے رہے۔ پھر حضور نے مزاحاً کہا کہ کون اس غلام کو خریدتا ہے۔ زاہر کہنے لگے، یا رسول اللہ! مجھ جیسے ناکارہ غلام کو جو خریدے گا۔ کھاٹے میں رہے گا۔ فرمایا۔ تم خدا کی نگاہ میں ناکارہ نہیں ہو۔

ایک موقع پر مجلس میں کھجوریں کھائی گئیں۔ آپ مزاح کے طور پر گٹھلیاں نکال نکال کر حضرت علیؑ کے آگے ڈالتے رہے۔ آخر میں گٹھلیوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے ان سے کہا۔ کہ تم نے تو بہت کھجوریں کھالیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے گٹھلیوں سمیت نہیں کھائیں۔

غزوہ خندق کے موقع پر ایک واقعہ کی وجہ سے حضورؐ خوب ہنسے اور آپ کے دانت (نوابند) تک دکھائی دیے۔ ہوا یہ کہ غامر کے والد سعد تیر پھینک رہے تھے ایک دشمن فرزند پر تھا، وہ ڈھال بڑی پھرتی سے چہرے کے سامنے رکھ لیتا سعد کے تیر کاری نہیں بیٹھ رہے تھے۔ آخری بار سعد نے تیر کمان چڑھایا اور تاک میں رہے کہ موقع ملے تو چھوڑیں۔ اس نے جو نہی ڈھال سے سر نکالا۔ تیر سیدھا پیشانی میں پوست ہو گیا۔ اس بڑی طرح چکا کر گرا کہ ٹانگیں اوپر کو اٹھ گئیں۔

بعد کے لوگوں کو اس رنگ مزاح کا حال سن کر تعجب ہوتا تھا، کیونکہ ایک تو مذہب کے ساتھ تقشف کا تصور ہمیشہ موجود رہا ہے اور خدا پرستوں اور متقیوں کی ہمیشہ رو فی صورتیں اور خشک طبیعتیں لوگوں کے سامنے رہی ہیں، دوسرے حضورؐ کی عبادت، رب، حضورؐ کی خشیت، حضورؐ کی بھاری ذمہ داریوں اور حضورؐ کے تفکرات کا خیال کرتے ہوئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اس نمونہ انسانیت نے ان مسکراہٹوں کے لیے زندگی کے نقتے میں کیسے جگہ پیدا کی۔ چنانچہ ابن عمرؓ سے پوچھا گیا کہ ”کیا رسول اللہ کے رفقاء بھی ہنسا کرتے تھے؟“ انہوں نے فرمایا ”ہاں ہنستے تھے اور ان کے دلوں میں پہاڑ سے زیادہ بڑا ایمان تھا۔ (یعنی ہنسی دل کی ایمان و تقویٰ کی نقیض نہیں ہے) تیروں کا نشانہ (بلطور مشق) کرتے ہوئے دوڑتے تھے اور باہم دگر ہنستے تھے۔“

(روایت قتادہ)

یہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ نماز صبح کے بعد مجلس رہتی اور اس میں جاہلی دور کی باتیں بھی چھڑتی اور صحابہؓ کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی خوب ہنستے۔ بچوں سے آپ کی دل لگی کرنے کے واقعات بھی ہم بیان کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں گھر میں ازواج کے ساتھ ہنسنے ہنسانے کا ذکر بھی گزر چکا ہے۔

## تفریحات :

متوازن زندگی کا ایک لازمی جز تفریحات (جائزہ دہیں) بھی ہیں۔ مزاح کی طرح یہ جز ساقط ہو جائے تو زندگی بوجھ بن جاتی ہے اور جس نظام حیات میں تفریحات کی گنجائش نہ رکھی گئی ہو اسے کوئی معاشرہ

دیر تک اٹھا نہیں سکتا۔ حضورؐ کو بھی بعض تفریحات پسند تھیں اور جائز حدوں میں ان کے لیے راستے نکالے۔  
شخصی طور پر آپؐ کو باغوں کی سیر کا شوق تھا۔ کبھی تنہا اور کبھی رفقا کے ساتھ باغوں میں چلے جاتے  
اور وہیں مجلس آرائی بھی ہو جاتی۔

تیرنے کا مشغہ بھی تھا۔ اور احباب کے ساتھ کبھی کبھار تالاب میں تیرا کرتے دو دو ساتھیوں کے  
جوڑ بنائے جاتے اور پھر ہر جوڑ کے ساتھی دُور سے تیر کر ایک دوسرے کی طرف آتے۔ ایک موقع پر اپنا  
ساتھی حضورؐ نے جناب ابو بکر صدیقؓ کو پسند کیا۔

وقفے کے بعد بارش پڑتی تو تہ بند باندھ کر پھوار میں نہایا کرتے۔ کبھی تفریحاً کسی کنوئیں میں پاؤں  
لٹکا کے اس کے دہانے پر بیٹھتے۔

دوڑوں اور تیر اندازی کے مقابلے کراتے اور اکھاڑے میں خود پوری دلچسپی سے شریک رہتے  
ایسے موقعوں پر ہنسی بھی ہوتی۔

مست کے موقعوں پر پسند تھا کہ دف بجائی جائے یا بچیاں گیت گائیں۔ چنانچہ عید کی تفریح پر  
حضرت عائشہؓ کے پاس دو لڑکیاں گیت گارہی تھیں۔ حضورؐ قریب ہی لیٹے تھے۔ ابو بکر صدیقؓ آئے تو غصے میں  
ذمنا کہ خدا کے رسول کے گھر میں یہ کیا شیطانی منگامہ مچا رکھا ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں گانے  
دو۔

شادی بیاہ کے لیے بھی فرمایا کہ ایسے موقعوں پر دف بجائی جائے روایت عائشہؓ و محمد بن حالب  
الجمعی (حضرت عائشہؓ ہی بیان کرتی ہیں کہ میرے پاس ایک انصاری لڑکی رہتی تھی۔ میں نے اس کا نکاح کر  
کے دیا۔ تو حضورؐ نے فرمایا: عائشہ! تم گانے کا انتظام نہیں کرتیں حالانکہ قبیلہ انصار گانے کو پسند کرتے ہے  
ایک دوسری روایت میں غالباً اسی موقع سے متعلق) یہ آتا ہے کہ تم لوگ کسی گانے والے کو لڑکی کے  
ساتھ بھیجتے جو کہتا: "أَتَيْنَاكُمْ فَهَيَّاْنَا وَحَيَّاكُمْ" (ہم تمہارے پاس آئے، ہم تمہارے  
پاس آئے۔ پس تم بھی سلامت رہو، ہم بھی سلامت رہیں) ایسی ہی ایک بزم عروسی میں بچیاں گارہی تھیں  
حضرت عامر بن سعد نے بعض حاضرین سے بطور اعتراض کہا کہ "اے صحابیان رسول! اے شرکاء۔ یہ ہر  
تمہارے سامنے یہ کچھ ہو رہا ہے؟" جواب ملا۔ "جی چاہے تو بیٹھ کر سنو ورنہ چلے جاؤ۔ یہیں رسول اللہؐ نے

۱۱۰ شامل ترمذی۔ مختلف ابواب

۱۱۱ روایت عائشہ (مسلم۔ باب ما یقول الجوارى فی العید)



اس کی اجازت دی ہے۔“

ازاں جملہ حضورؐ نے شعر سے بھی دلچسپی لی ہے۔ عرب میں جو شعر پرستی رائج تھی، اس سے تو آپؐ کو بُرد تھا۔ آپؐ کو نغمہ الہام کی جاذبتیں اتنا موقع ہی نہ دیتیں تھیں کہ شعر و سخن کی طرف زیادہ توجہ ہو۔ مگر دوسری طرف ذوقِ شعر سے قدمت نے محروم نہیں رکھا۔ اچھے شعر (بلحاظ مقصد) کی قدر فرماتے تھے بلکہ کہنا چاہتے کہ حضورؐ نے ایک نیا ذوقِ معاشرے کو دیا۔ اور ایک نیا معیارِ نقدِ مقرر فرمایا۔ جابر بن سمرہ کا بیان ہے کہ حضورؐ کی خدمت میں ایک سو سے زیادہ مجالس میں شریک ہوا، ہوں جن میں جاہلیت کے قصے بھی ہوتے تھے۔ اور صحابہ شعر بھی سنایا کرتے شاعرانِ عرب کے کلام میں سے ایک بار لبید کا یہ مصرعہ پسندیدگی سے

پڑھا : ع

أَلَا كَلَّ شَيْئٌ مَّا خَلَا اللَّهُ بَاطِلٌ

(آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کے سوا ہر چیز فانی ہے، دوسرا مصرعہ ہے :-

وَدَلَّ نَعِيمٌ لَا مَحَالَةَ زَائِلٌ

(دنیا کی ساری نعمتیں زائل ہو جانے والی ہیں) حضرت شریذ سے ایک سفر میں یکے بعد دیگرے فرمائش کر کر کے امیر ابن ابی صلت کے سو شعر سنے۔ آخر میں فرمایا کہ یہ شخص اسلام لانے کے قریب پہنچ گیا تھا بعض اوقات خود بھی (خصوصاً میدانِ جنگ میں) بلا ارادہ شعر کے انداز پر کلمات فرماتے ہیں۔ حضرت حسان اور کعب بن مالک سے دشمنانِ اسلام کے ہجو یہ اشعار کے جواب میں شعر کہلاتے اور کبھی کبھی حضرت حسان کو اپنے منبر پر بٹھا کر ان سے پڑھواتے اور کہتے کہ یہ اشعار دشمنوں کے حق میں تیر سے زیادہ سخت ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ ”مومن تلوار سے بھی جہاد کرتا ہے اور زبان سے بھی“ شعر و ادب، نیز دوسرے ثقافتی موضوعات پر ہم تفصیل سے ایک علیحدہ مقالے میں بحث کر کے دکھانا چاہتے ہیں کہ حضورؐ نے انسانی ذوق کو کس تعمیری راستے پر ڈالا تھا۔

چند متفرق ذوقیات :

آخر میں ہم بعض ایسے خاص ذوقیات و اطوار کا ذکر کرتے ہیں جنہیں کسی دوسرے عنوان کے تحت نہیں لیا جاسکا۔

کسی سے چیز لیتے تو سیدھے ہاتھ سے لیتے اور کوئی چیز دیتے، تو سیدھے ہاتھ سے دیتے۔

۱۔ ملاحظہ ہو : مشکوٰۃ باب اعلان نکاح۔

۔۔۔ خطوط لکھواتے تو سب سے پہلے بسم اللہ لکھواتے۔ پھر مرسل کا نام اور اس کے نیچے مرسل

الیہ کا نام ہوتا۔ اس کے بعد اصل مضمون لکھا جاتا۔ خاتمے پر مہر لگواتے۔

۔۔۔ حضور اوہام پسندی سے پاک تھے اور شاگون نہ لیتے تھے۔ البتہ اشخاص اور مقامات کے

اچھے نام پسند آتے۔ بڑے نام پسند نہ کرتے۔ سفر میں اقامت کے لیے ایسا ہی مقام انتخاب کرتے جس کے

نام میں خوشی یا برکت یا کامیابی کا مفہوم ہوتا۔ اسی طرح جس شخص کے نام میں اطمینان، جھگڑے یا فتنہ ان کا

معنی شامل ہوتا اسے کام نہ سونپتے۔ ایسے آدمیوں کو نامزد کرتے جن کے ناموں میں خوشی یا کامیابی کا

مفہوم پایا جائے۔ بہت سے ناموں کو تبدیل بھی فرمایا۔

۔۔۔ سواریوں میں سے گھوڑا بہت پسند تھا۔ فراتے گھوڑے کے، ایاں میں تیامت تک کے

لیے خیر و برکت ہے۔ گھوڑے کی آنکھ، منہ، ناک، گوشہ، ستاس سے اپنے ہاتھوں سے سانہ کرتے۔

۔۔۔ شور مہنگامہ اور ہڑ بونگ اچھی نہ لگتی۔ سرکاس میں۔ کون و دتار اور نظم و ترتیب چاہتے

نماز تک کے بارے میں کہا کہ بھاگم بھاگ نہ آؤ۔ عَلَیْكُمْ بِالسَّكِينَةِ (تمہارے لیے سکون و دتار

لازم ہے) یومِ عرندہ کو بجوم تھا بڑا شور و مہنگامہ تھا۔ لوگوں کو اپنے تازیانہ سے اشارہ کرتے ہوئے نظم و

سکون کا حکم دیا اور فرمایا: ذن البریس بالاییناع (جلدی مچانے کا نام نیکی نہیں ہے)

## اخلاق :

حضور پاک کے اخلاق کا بیان یہاں کسی ضمنی عنوان کے تحت کیا نہیں جاسکتا۔ وہاں تو پوری

زندگی حسنِ خلاق ہی کی تفسیر ہے۔ جس کے متعلق حضرت عائشہ نے فرمایا تھا: کان خلقہ انزلت

النس بن مالک کا یہ قول بہت ہی جامع ہے کہ کان احسن الناس وکان اجود الناس

کان اشجع الناس (احسن الناس ہونے کی کیفیت یہ تھی کہ کسی کو عمر بھر تکلیف نہیں پہنچائی۔

داسوا ان باتوں کے جو حکمِ الہی کے تحت تھیں) اور دوسروں کی زیادتیوں پر کبھی انتقام نہیں لیا۔ ہر

کسی سے عفو فرمایا۔ یہاں تک کہ مکہ اور طائف کے بیداد گروں کو معاف کیا اور منافقین و اشرار

سے دہ گزر کیا۔ اجود الناس ہونے کا عالم یہ تھا کہ جابر کہتے ہیں کہ رسول اللہ سے جو کچھ بھی کسی نے

مانگا آپ نے کبھی نہ نہیں کی۔ (موجود ہوا تو دے دیا کبھی قرض لے کر دیا۔ نہیں موجود ہوا تو دوسرے

۱۔ بخاری و مسلم

۲۔ مسلم باب فی شمائل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۳۔ باب ما سئل النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وقت آنے کو کیا، یا سکوت اختیار کیا، اشجع الناس ہونے کے لیے فی الجملہ یہ امر کافی ہے کہ نظریہ حق کو لے کر تنہا اٹھے اور زمانے بھر کی مخالفتوں اور مظالم کے مقابلے میں جھے کھڑے رہے۔ کبھی کسی خطرناک ترین موقع پر بھی خوت یا کمزوری کا اظہار نہ کیا۔ غار ثور ہو یا اُحد و حنین کے معرکے ہر موقع پر یقین محکم کا مظاہرہ کیا۔

# محسنِ انسانیت ﷺ

مخالفوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے

(۱)

مکی دور

مدا و جزر

بس وہ ایک کلمہ ہے اسے اگر قبول  
کر کے میرے ساتھ آؤ تو تم اس کے  
بل پر سارے عرب کو ہاتھ میں لوگے  
اور اس کے اثر سے عجم تمہارے  
زیر نگین ہو گا۔ محسنِ انسانیت

آئیے! ذرا صورتِ واقعہ پر غور کیجیے! — اس شاخِ گل کی اٹھان دیکھئے جس کی تواضع کانٹوں سے

کی گئی!

وہ نوجوان:

عرب کے ایک ممتاز، مہذب اور اعلیٰ روایات رکھنے والے خاندان میں، سلیم الفطرت والدین کے قرآن السعدین سے ایک انوکھا سا بچہ پیمپی کے ساتھ میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک غریب مگر شریف ذات کی دایہ کا درد دھپنی کر دیہات کے صحت بخش ماحول کے اندر فطرت کی گود میں پلتا ہے۔ وہ خاص انتظام سے صحرا میں تنگ و دو کرتے کرتے زندگی کی جولانگاہ میں مشقتوں کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کرتا ہے اور بکریاں چرا کر گلہ بانی اقوام کی تربیت پاتا ہے۔ بچپن کی پوری مسافت طے کرنے سے پہلے یہ انوکھا بچہ ماں کے سایہ شفقت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ دادا کی ذات کسی حد تک والدین کے اس خلاء کو پُر کرنے والی تھی، لیکن یہ سہارا جی چھین یا جاتا ہے۔ بالآخر چچا کفیل بنتے ہیں۔ یہ گویا مادی سہاروں سے بے نیاز ہو کر ایک آقا حقیقی کے سہارے گراں بہا نرائس سے عہدہ برآ ہونے کی تیاری ہو رہی ہے۔

جوانی کے دائرے میں تدم رکھنے تک یہ انوکھا بچہ عام بچوں کی طرح کھانڈا اور شریرین کر سامنے نہیں آتا، بلکہ بوڑھوں کی سی سنجیدگی سے آراستہ نظر آتا ہے۔ جوان ہوتا ہے تو انتہائی فاسد ماحول میں پلنے کے باوجود اپنی جوانی کو بے داغ رکھتا ہے۔ عشق اور نظر بازی اور بدکاری جہاں نوجوانوں کے لیے سرمایہ افتخار بنے ہوئے ہوں وہاں وہ اپنے دامانِ نظر تک کو ایک آن بھی میلا نہیں ہونے دیتا۔ جہاں گلی گلی شراب کشید کرنے کی بھٹیاں لگی ہوں اور گھر گھر شراب خانے کھلے ہوں اور جہاں مجلس مجلس دختِ مذ کے قدموں میں ایمانِ اخلاق نچھاور کیے جاتے ہوں، اور پھر جہاں اپنی بلا نوشیوں کے چرچے فخر یہ قصیدوں اور شعروں میں کئے جاتے ہوں۔ وہاں یہ جداگانہ فطرت کا نوجوان کبھی قسم کھانے کو بھی شراب کا ایک قطرہ تک اپنی زبان پر نہیں رکھتا۔ جہاں قمار قومی مشغلہ بنا چلا آ رہا تھا وہاں ایک یہ مجسمہ پاکیزگی تھا کہ جس نے کبھی ہردوں کو ہاتھ سے نہ چھوا۔ جہاں داستان گوئی اور موسیقی کلچر کا لازمہ بنے ہوئے تھے وہاں

کسی اور ہی عالم کا یہ نوجوان لہور لعیب سے بالکل الگ، تنگ رہا۔ اور دو مرتبہ ایسے مواقع پیدا ہوئے بھی کہ یہ نوجوان ایسی مجالس تفریح میں جا پہنچا، لیکن جاتے ہی ایسی میند طاری ہوئی کہ سمع و بصر کا دامن پاک رہا جہاں تہوں کے سلمے سجدہ پاشی عین دین و مذہب قرار پا چکی تھی وہاں خانوادہ ابراہیمی کے اس پاکیزہ مزاج نوجوان نے نہ غیر اللہ کے سلمے کبھی اپنا سر جھکا یا، نہ اعتقاداً کوئی مشرکانہ تصور اپنے اندر جذب کیا، باہر ایک مرتبہ تہوں کے چڑھاوے کا جانور پیکا کر لایا گیا تو اس نے وہ کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ جہاں قریش نے زمانہ حج میں اپنے آپ کو عرفات جانے سے مستثنیٰ کر لیا تھا وہاں اس ممتاز مرتبے کے قریشی نے کبھی اس من گھڑت استثنیٰ سے فائدہ نہ اٹھایا۔ جہاں اولاد ابراہیم نے مسلک ابراہیمی کو بگاڑ کر دوسری خرابیوں کے ساتھ کعبہ کا طواف حالت عریانی میں کرنے کی ایک گندی بدعت پیدا کر لی تھی، وہاں اس حیا دار نوجوان نے کبھی اس بدعت کو اختیار نہ کیا۔ جہاں جنگ ایک کھیل تھی اور انسانی خون بہانا ایک تماشا تھا، وہاں احترام انسانیت کا علم بردار یہ نوجوان ایسا تھا کہ جس کے دامن پر خون کی ایک چھینٹ نہ پڑی تھی۔ نو عمری میں اس نوجوان کو حرب فجار نامی جنگ عظیم میں شرکت کا موقع پیش آیا۔ اور اگرچہ اس نے قریش کے برسر حق ہونے کی بنا پر اس میں حصہ لیا، لیکن پھر بھی کسی انسانی جان پر خود ہاتھ نہیں اٹھایا۔

پھر اس پاکباز و عقیف نوجوان کی دلچسپیاں دیکھیے کہ عین بہک جانے والی عمر میں وہ اپنی خدمات اپنے ہم خیال نوجوانوں کی ایک اسلحہ پسند انجمن کے حوالے کرتا ہے جو حلف الفنون کے نام سے غریبوں اور مظلوموں کی مدد اور ظالموں کی چیرہ دستیوں کے استیصال کے لیے قائم ہوئی تھی۔ اس کے شرکار نے اس مقصد کے لیے حلفیہ عہد باندھا۔

آپ دور نبوت میں اس کی یاد تازہ کرتے ہوئے فرمایا کرتے کہ :

”اس معاہدہ کے مقابلے میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیے جاتے تو میں اس

سے نہ پھرتا۔ اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لیے کوئی ہلے تو میں ماننے ہوں۔“

پھر اس نوجوان کی صفات اور صلاحیتوں کا اندازہ اس سے کیجیے کہ تعمیر کعبہ کے موقع پر حجر، سونب کرنے کے معاملے میں قریش میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور تلواریں میانوں سے باہر نکل آتی ہیں لیکن تقدیر کے اشارے سے اس قبیلے کو چکلنے کا شرف اسی نوجوان کے حصے میں آتا ہے، انتہائی جذباتی تناؤ کی اس فضا میں حج اور سجدہ نمبر دار ایک چادر بچھاتا ہے اور اس پر پتھر کو اٹھا کر رکھ دیتا ہے اور پھر دعوت دیتا ہے کہ تمام قبیلوں کے لوگ مل کر اس چادر کو اٹھاؤ۔ چادر پتھر سمیت متحرک ہونے لگتی ہے اور جب موقع پر جا پہنچتی ہے تو وہ نوجوان اس پتھر کو اٹھا کر اس کی جگہ پر نصب کر دیتا ہے جب گارے کا سارا اخبار چھٹ جاتا ہے اور چہرے خوشی اور اطمینان سے چمک اٹھتے ہیں۔

یہ نوجوان میدانِ معاش میں قدم رکھتا ہے تو تجارت جیسا پاکیزہ اور معزز مشغلہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ کوئی بات تو اس نوجوان میں تھی کہ اچھے اچھے اہل سرمایہ نے یہ پسند کیا کہ یہ نوجوان ان کا سرمایہ اپنے ہاتھ میں لے اور کاروبار کرے۔ پھر سائب، تیس بن سائب محزومی، حضرت خدیجہ اور جن دوسرے لوگوں کو اس نوجوان کے حسنِ معاشرت کا عملی تجربہ ہوا۔ اور ان سب نے اسے "تاجر امین" کا لقب دیا۔ عبداللہ بن ابی الحسہ کی گواہی آج بھی محفوظ ہے کہ بعثت سے قبل خرید و فروخت کے معاملہ میں اس تاجر امین سے طے ہوا کہ آپ، ٹھہریں میں ابھی پھر آؤں گا۔ لیکن بات اتنی گئی ہو گئی۔ تیسرے روز اتفاقاً عبداللہ کا گزر اسی مقام سے ہوا تو دیکھا کہ وہ تاجر امین وعدہ کی ٹوری سے بندھا اسی جگہ کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ "تم نے مجھے زحمت دی۔ میں اسی مقام پر تین دن سے موجود ہوں۔"

(الوادد)

پھر دیکھیے کہ یہ نوجوان رزقِ حیات کا جب انتخاب کرتا ہے تو مکہ کی نو عمر، شوخ و شنگ لڑکیوں کو ایک ذرا سا مزاج لگاؤ تک، دیئے بغیر ایک ایسی خاتون سے رشتہ مناکحت استوار کرتا ہے جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ خاندان اور ذاتی سیرت و کردار کے لحاظ سے نہایت اشرف خاتون ہے اس کا یہ ذوقِ انتخاب اس کے ذہن، اس کی روح، اس کے مزاج اور اس کی سیرت کی گہرائیوں کو پوری طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ پیغامِ خود وہی خاتون حضرت خدیجہ بھیجتی ہیں۔ جو اس یکتائے روزگار نوجوان کے کردار سے متاثر ہوتی ہیں اور یہ نوجوان اس پیغام کو شرح صدر کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

پھر کسی شخص کے ذہن و سیرت کو اگر اس کے حلقہٴ احباب کا جائزہ لینے سے بچا جاسکتا ہے تو آئیے دیکھیے کہ اس عربی نوجوان کے درست، کیسے لوگ تھے۔ غالباً سب سے گہری دوستی اور سب سے زیادہ بے تکلفاً رابطہ حضرت ابوبکرؓ سے تھا۔ ایک ہم عمری اور پر سے ہم ذاتی! اس نوجوان کے دوستوں میں ایک شخصیت حکیم بن حزام کی تھی، جو حضرت خدیجہ کے چچیرے بھائی تھے اور حرم کے منسوب رفادہ پر فائز تھے۔ پھر حلقہٴ احباب کے ایک رکن سہاد بن ثعلبہ ازدی تھے جو طبابت و جراحی کا کام کرتے تھے۔ اس نوجوان کے حلقہٴ احباب میں کیا کوئی ایک بھی دوں فطرت، پست ذوق، اور کمینہ مزاج آدمی دکھائی دیتا ہے؟ مکہ کے اشرار میں سے کسی کا نام اس فہرست میں ملتا ہے؟ ظالموں اور فاسقوں میں سے کوئی اس دائرے میں سامنے آتا ہے؟

۱۔ ہجرت کے اٹھویں برس تک یہ ایمان نہیں لائے۔ لیکن پھر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے گہری محبت رکھتے تھے اور اسی محبت کے تحت ایک مرتبہ پچاس اشرفیوں کا ایک قیمتی حلقہ خرید کر مدینہ میں آکر پیش کیا۔ مگر آنحضرت نے باصرار قیمت ادا کر دی۔

پھر دیکھیے کہ یہ یکتائے زمانہ نوجوان گھر بار کی دیکھ بھال، تجارت اور دنیوی معاملات کی گونا گوں مصروفیات سے فارغ ہو کر جب کبھی کوئی فرست کا وقت نکالتا ہے، تو اسے تفریحات و تعیشات میں صرف نہیں کرتا، اسے کوچہ گردی میں اور مجلس آرائیوں اور گپوں میں نہیں کھپاتا، اسے سوسو کر اور غفلت میں بے کار پڑے رہ کر بھی نہیں گزارتا، بلکہ سارے ہنگاموں سے کنارہ کر کے اور سارے مشغلوں کو تھج کر حسرا کی خلوتوں میں خدلے واحد کی عبادت اور اس کا ذکر اپنی نظرت، مٹھرہ کی رہنمائی کے مطابق کرتا ہے کائنات کی گہری حقیقتوں کو اخذ کرنے کے لیے اور انسانی زندگی کے غیبی رازوں کو پالنے کے لیے عالم انفس و آفاق میں غور و فکر کرتا ہے اور اپنی قوم اور اپنے اہل نسل کو اخلاقی پستیوں سے نکال کر مرتبہ ملکوتی پرانے کی تدبیریں سوچتا ہے۔ جس نوجوان کی جوانی کی فرستیں اس تحت میں صرف ہو رہی ہوں کیا اس کی فطرت کے بارے میں انسانی بصیرت کوئی رائے قائم نہیں کر سکتی۔

ہونے والا آخری نبی اس نقشہ زندگی کے ساتھ قریش کی آنکھوں کے سامنے اور ان کے اپنے ہی مکی معاشرے کی گود میں پلتا ہے، جوان ہوتا ہے اور پختگی کے مرتبے کو پہنچتا ہے کیا یہ نقشہ زندگی بول بول کر نہیں بتا رہا تھا کہ یہ ایک نہایت ہی غیر معمولی عظمت رکھنے والا انسان ہے؟ کیا اس اٹھان سے اٹھنے والی شخصیت کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے کی کچھ بھی گنجائش کسی پہلو سے ملتی ہے کہ نعوذ باللہ بہ کسی جھوٹے اور فریبی آدمی کا نقشہ ہوگا؟ یہ کوئی مرد جاہ طلب ہوگا؟ یہ کوئی بندہ مفاد و اغراض ہوگا؟ یہ خدا کے نام کو متاع کار و بار بنا کر اپنی دکان چمکانے والا کوئی سوداگر ہوگا؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، خود قریش نے اسے عملاق و امین، دانا و حکیم اور پاک نفس و بانہ کردار تسلیم کیا۔ اور بار بار تسلیم کیا! اس کے دشمنوں نے اس کی ذہنی و اخلاقی عظمت کی گواہی دی اور سخت ترین کشمکش کرتے ہوئے دی، داعی برحق کے نقشہ زندگی کو خود قرآن نے دلیل بنا کے پیش کیا و لَقَدْ بَلَّغْتُ فِيكُمْ عَمْرًا مِنْ قَبْلِهِ : اَفَلَا تَعْقِلُونَ : یونس : ۱۰ لیکن اپنی قوم کا یہ چمکتا ہوا ہیرا جب نبوت کے منصب سے کلمہ حق پکارتا ہے تو زمانہ کی آنکھوں کا رنگ معاً بدل جاتا ہے۔ اور اس کی صداقت و دیانت اور اس کی شرافت و نجابت کی قدر و قیمت بازار وقت میں یکایک گرا دی جاتی ہے۔ کل تک جو شخص قوم کا مایہ ناز فرزند تھا، آج وہ اس کا دشمن اور مخالف اور اس کے لیے باعث ننگ گردانا جاتا ہے۔ کل تک جس کا احترام بچہ بچہ کرتا تھا، آج وہ ایک ایک قدر دان کی نگاہوں میں مبغون ٹھہرتا ہے۔ وہ شخص جس نے چالیس سال تک اپنے آپ کو ساری کسوٹیوں پر کھرا ثابت کر کے دکھایا تھا، توجید اور نیکی اور سچائی کا پیغام سناتے ہی صیرفیان قریش کی نگاہوں میں کھوٹا سا کتہ بن جاتا ہے کھوٹا وہ نہ تھا بلکہ صرافوں کی اپنی نگاہوں میں ٹیڑھ تھی اور ان کے اپنے معیار غلط تھے!



کیا قریش کی آنکھیں واقعی اتنی اندھی تھیں کہ وہ ماحول کی تاریکیوں میں جگمگاتے ہوئے ایک چاند کی شان نہیں دیکھ سکتی تھیں؟ کیا بالشتیوں کی محفل میں وہ اپنے اخلاقی قد و قامت رکھنے والے ایک زعمیم کو نہیں پہچان سکتی تھیں؟ کیا کوڑے کے انبار میں پڑا ہوا موتیوں کا ایک ہار ان کو الگ محسوس نہیں ہوتا ہوگا؟ کیا غار و غس کے ہجوم میں ایک گلدستہ شرافت و عظمت ان سے اپنی قدر و قیمت نہیں منوا سکا ہوگا؟ نہیں نہیں قریش خوب پہچانتے تھے کہ محمدؐ کیا ہے! مگر انہوں نے جان بوجھ کر آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی! مفاد اور تعصبات نے ان کو مجبور کیا کہ وہ آنکھیں رکھتے ہوئے اندھے بن جائیں۔ **وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَا يُبْصِرُونَ بِهَا**۔ اور جب کوئی آنکھیں رکھتے ہوئے اندھا بن جاتا ہے تو اس سے بڑی بڑی مصیبتیں اور تباہیاں رونما ہوتی ہیں۔

### قریش کے رجحان مخالفت :

آج اگر کسی طرح ہم مشرکین مکہ سے بات کر سکتے تو ان سے پوچھتے کہ تمہارے خاندان کے اس چشم و چراغ نے جو دعوت دی تھی وہ فی نفسہ کیا برائی کی دعوت تھی؟ کیا اس نے تم کو چوری اور ڈاکے کے لیے بلایا تھا؟ کیا اس نے تمہیں ظلم اور قتل کے لیے پکارا تھا؟ کیا اس نے یتیموں اور یتیموں اور کمزوروں پر حقائق ڈھانسنے کی کوئی اسکیم پیش کی تھی؟ کیا اس نے تم کو باہم دگر لڑانے اور قبیلے قبیلے میں فساد ڈھانسنے کی تحریک چلائی تھی؟ کیا اس نے مال سمیٹنے اور جائیداد بنانے کے لیے ایک جماعت کھڑی کی تھی؟ آخر تم نے اس کے پیغام میں کیا کجی دیکھی؟ اس کے پروگرام میں کونسا فساد محسوس کیا؟ کیوں تم پرے باندھ کر اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے؟

قریش کو جس چیز نے جاہلیت کے فاسد نظام کے تحفظ اور تبدیلی کی زد کی مزاحمت پر اندھے بتوں کے ساتھ اٹھا کھڑا کیا، وہ یہ ہرگز نہ تھی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فکر و کردار میں کوئی رخنہ تھا، یا آپ کی دعوت میں کوئی خطرناک مفسدہ تھا یا آپ کی تحریک جاہلی تمدن کو پستی کی طرف لے جانے کا موجب بنتی دکھائی دیتی تھی، بلکہ وہ چیز صرف مفاد پرستی تھی! قریش سالہا سال کے جسے ہوئے عربی معاشرہ کے سانچے میں اپنے لیے ایک اونچا مقام قیادت حاصل کر چکے تھے، تمام سیاسی اور مذہبی مناصب ان کے ہاتھ میں تھے، اقتصادی اور کاروباری لحاظ سے ان کی سیادت کا سکہ رواں تھا۔ پوری قوم کی چودھراہٹ انہیں حاصل تھی ان کی یہ چودھراہٹ اسی مذہبی و تمدنی و معاشرتی سانچے میں چل سکتی تھی جو جاہلی دور میں استوار تھا۔ اگر وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر مجبور تھے کہ اپنی چودھراہٹ کا تحفظ کریں تو پھر وہ اس پر بھی مجبور تھے کہ جاہلی نظام کو بھی ہر جملے اور ہر منزل سے بچائیں۔

قریش جہاں سیاسی و معاشرتی لحاظ سے چودھری تھے وہاں وہ عرب کے مشرکانہ مذہب کے پروہت، مذہبی استھانوں کے منت اور مجاور اور تمام مذہبی امور کے ٹھیکہ دار بھی تھے یہ مذہبی ٹھیکہ داری سیاسی و معاشرتی چودھراہٹ کی بھی پشتیباں تھی اور بجائے خود ایک بڑا کاروبار بھی تھی۔ اس کے ذریعے سارے عرب سے نذریں اور نیازیں اور چڑھاوے کھینچے چلے آتے تھے، اس کی وجہ سے ان کی دامن بوسیاں ہوتی تھیں۔ اس کی وجہ سے ان کے قدموں کو چھنوا جاتا تھا۔ مذہب جب ایک طبقے کا کاروبار بن جاتا ہے تو اس کی اصل روح اور مقصدیت کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے اور گونا گوں رسمیات کا ایک نمائشی طلسم قائم ہو جاتا ہے۔ اصولی تقاضے فراموش ہو جاتے ہیں اور من گھڑت روایات اور شعائر بنیادی اہمیت اختیار کر لیتے ہیں۔ خدا کا دیا ہوا علم و قانون گم ہو جاتا ہے اور مذہبی کاروباریوں کی اپنی بنائی ہوئی ایک شریعت آہستہ آہستہ نشوونما پاجاتی ہے۔ معقولیت ختم ہو جاتی ہے اندھی عقیدتیں اور فضول اوہام ہر طرف چھا جاتے ہیں۔ استدلال غائب ہو جاتا ہے۔ اور جذباتی ہیجانات عقل کا گلا گھونٹ لیتے ہیں۔ مذہب کا عوامی و جمہوری مزاج کا فور ہو جاتا ہے اور ٹھیکہ دار طبقے کا تسلیم معاشرہ کے سینہ پر سوار ہو جاتا ہے۔ حقیقی علم مٹ جاتا ہے۔ ہوائی باتیں مقبول عام ہو جاتی ہیں اعتقاد و احکام کی سادگی ہوا ہو جاتی ہے۔ بات بات میں بڑے اینچ پنچ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اختلاف رائے کا حق قطعی طور پر سلب کر لیا جاتا ہے اور ایک طبقے کی اتھارٹی بے روک ٹوک نافذ ہوتی ہے۔ حق اور نیکی اور شرافت اور تقویٰ کا نام و نشان مٹ جاتا ہے اور مذہبیت کا ایک فریب کارانہ بہروپ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جب کبھی مذاہب میں بگاڑ پیدا ہوا ہے تو ہمیشہ وہ اسی بیج پر ہوا ہے۔ جاہلی عرب میں یہ بگاڑ بالکل اپنی انتہائی شکل پر پہنچا ہوا تھا۔ اسی بگاڑ پر قریش کی منہت گری اور مجاوری کی ساری گدیاں قائم تھیں۔ یہ زرخیز گدیاں اپنی بقا کے لیے اس بات کی محتاج تھیں کہ فاسد مذہبیت کے ڈھانچے کو جوں کاٹوں قائم رکھا جائے۔ اور اس کے خلاف نہ کوئی صدائے احتجاج و اختلاف اٹھنے دی جائے اور نہ کسی دعوت تغیر و اصلاح کو برپا ہونے دیا جائے۔ پس قریش اگر دعوت محمدی جیسی خطرناک رو کے خلاف تملد کر نہ اٹھ کھڑے ہوتے تو اور کیا کرتے!

اور پھر، حال یہ تھا کہ قریش کا کلچر نہایت فاسقانہ کلچر تھا۔ شراب اور بدکاری، جوا اور سود خوری، عورتوں کی تحقیر و تذلیل اور بیٹیوں کا زندہ دفن کرنا، آزادوں کو غلام بنانا اور کمزوروں پر ظلم ڈھانا، یہ سب اس کلچر کے لوازم تھے۔ یہ کلچر قرون کی راسخ شدہ عادات بد اور فخر آمیز قومی روایات بن جانے والی رسوم خبیثہ سے ترکیب پایا ہوا تھا۔ قریش کے لیے آسان نہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں بنائے ہوئے اس آہنی تہذیبی قفس کو توڑ کر ایک نئی فضا میں پرواز کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ انہیں فوراً محسوس ہو گیا کہ دعوت محمدی ان کی

عادات ان کی خواہشات، ان کے فنون لطیفہ اور ان کے محبوب کچھ کی دشمن ہے چنانچہ وہ جذباتی ہیجان کے ساتھ اس کی دشمنی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

درحقیقت یہی وجوہ و اسباب ہمیشہ دعوت حق کے خلاف کسی بگڑے ہوئے سماج کے ارباب اقتدار اور مذہبی ٹھیکہ داروں اور خواہش پرستوں کو متحدہ مجاذ بنا کر اٹھ کھڑے ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

**تاریک ماحول میں چند شرارے :**

بعثت نبویؐ سے قبل ذہین لوگوں میں اس مذہب اس معاشرے اور اس ماحول کے بارے میں نوا میں الہی کے تحت اضطراب پیدا ہو چکا تھا اور فطرت انسانی اس کے خلاف جذبہ احتجاج کے ساتھ انگڑائی لے رہی تھی یہم بھی اوپر جن حساس افراد کا ذکر کر چکے ہیں ان کی روحوں کے ساز سے تبدیلی کا دھیما دھیما نغمہ بلند ہونے لگا تھا۔

قریش اپنے ایک بت کے گرد جمع ہو کر تقرب عید منا رہے تھے، اس خداوند سنگین کی تعریف و تعظیم ہو رہی تھی، اس پر چڑھاوے چڑھائے جا رہے تھے، اس کا طواف ہو رہا تھا اور عین اس عالم میں چار آدمی، یعنی ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن محش، عثمان بن الحویرث اور زید بن عمرو بن نفیل اس ہنگامہ یعنی سبزار انگ نخلگ بیٹھے ایک خفیہ میٹنگ کر رہے تھے۔ باہم دگر رازداری کا پیمانہ باندھنے کے بعد گفتگو ہوئی ان لوگوں کے خیالات یہ تھے کہ "ہماری قوم ایک بے بنیاد مسلک پر چل رہی ہے، اپنے دادا ابراہیم کے دین کو انہوں نے گنوا دیا ہے، یہ جس مجسمہ سنگین کا طواف کیا جا رہا ہے یہ نہ دیکھتا ہے، نہ سنتا ہے، نہ نقصان پہنچا سکتا ہے، نہ نفع دے سکتا ہے۔ ساتھیو! اپنے دلوں کو ٹٹو لو تو خدا کی قسم تم نے محسوس کر دو گے کہ تمہاری کوئی بنیاد نہیں ہے، ملک ملک گھومو اور کھوج لگاؤ دین ابراہیم کے سچے پیروں کا۔ بعد میں ان میں سے ورقہ بن نوفل عیسائی ہو گیا۔ عبداللہ بن محش عالم اضطراب میں پہلے اسلام لایا، پھر اسی اضطراب میں عیسائی ہوا۔ عثمان نے قیصر روم کے ہاں جا کر عیسائیت اختیار کر لی اور زید نے نہ یہودیت قبول کی نہ نصرانیت، لیکن اپنی قوم کا دین ترک کر دیا۔ بت پرستی چھوڑ دی، مردار اور خون اور استخوانوں کے ذبیحوں سے پرہیز شروع کر دیا۔ بیٹیوں کے قتل سے لوگوں کو باز رہنے کی تلقین کرتا رہا اور کہا کرتا۔ **اَعْبُدَا رَبَّ اِبْرٰهٖمَ** کہ میں تو ابراہیم کے رب کا پرستار ہوں۔ اسما بنت ابوبکر کا بیان ہے کہ میں نے بوڑھے سردار زید بن عمرو کو کعبے

کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے دیکھا اور وہ کہہ رہا تھا۔ اے قریش کے لوگو! قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں زید بن عمرو کی جان ہے۔ میرے سوا تم میں سے کوئی بھی ابراہیم کے دین پر قائم نہیں رہا۔ پھر کہنے لگا اے خدا! اگر میں جانتا کہ تجھے کون سے طریقے پسند ہیں تو میں انہی طریقوں سے تیری عبادت کرتا۔ لیکن میں نہیں جانتا۔ پھر ہتھیلیاں ٹیک کر سجدہ کرتا۔ اپنے ملنے والوں کے سامنے وہ اکثر یہ اشعار الایتا:-

أَرْبَابًا وَاحِدًا أَمَ الْفَرْقِ  
أَدِينُ إِذَا تَقَسَّمتِ الْأُمُورُ

رب ایک ہونا چاہیے، یا سینکڑوں رب بنا لیے جائیں؟ میں اس مذہب پر کیسے چلوں جب کہ مسائل حیات کئی معبودوں میں بانٹ دیے گئے ہوں۔

عَزَلْتُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ جَمِيعًا  
كَذَلِكَ يَفْعَلُ الْجَلْدُ الصَّبُورُ

میں نے لات و عزنی سب کو ترک کر دیا ہے اور مضبوط اور صبر کیش شخصیتیں ایسا ہی کرتی ہیں۔

وَلَكِنْ أَعْبُدُ الرَّحْمَنَ رَاقِيًا  
لِيَغْفِرَ ذُنُوبِي الرَّبُّ الْغَفُورُ

مگر ہاں، اب میں اپنے رب رحمن کا عبادت گزار ہوں تاکہ وہ بخشش فرمانے والا آقا میرے گناہوں کو معاف کر دے۔

فَتَقَوَّى اللَّهُ رَبَّكُمْ أَحْفَظُوهَا  
مَتَى مَا تَحْفَظُوهَا لَا تَبُورُوا

سو تم اللہ ہی کے تقویٰ کی حفاظت کرو۔ جب تک اس صفت کو قائم رکھو گے کبھی گھٹے میں نہ پڑو گے۔

بچارے زید کی بیوی صفیہ بنت الحضری ہمیشہ اس کے پیچھے پڑی رہتی۔ بسا اوقات وہ خالص ابراہیمی دین کی جستجو کے لیے مکہ سے نکل کھڑے ہونے کا ارادہ کرتا لیکن اس کی جو رو خطاب بن نبیل کو آگاہ کر دیتی اور وہ اسے دین آباؤ کے چھوڑنے پر سخت ست کہتا۔ زید کی والہیت کا عالم یہ تھا کہ سجدہ گاہ کعبہ میں داخل ہوتا تو پکار اٹھتا۔ لَبَّيْكَ حَقًّا حَقًّا، تَعْبُدًا وَرَقًا۔ یعنی اے خدائے برحق میں تیرے حضورِ اخلاص مندانہ، عبادت گزارانہ اور غلامانہ انداز سے حاضر ہوں۔ پھر کہتا۔ میں کعبہ کی طرف منہ کر کے اسی ذات کی پناہ طلب کرتا ہوں جس کی پناہ ابراہیم علیہ السلام نے ڈھونڈی تھی۔

۱۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۲۲

۲۔ ایضاً ص ۲۲۸

خطاب بن نفیل زید کے دپے آزار رہا۔ یہاں تک کہ مکہ کی بالائی جانب شہر بدر کر دیا۔ اور زید نے مکہ کے سامنے حرا کے پاس جادھونی رمائی۔ پھر خطاب نے قریش کے چند نوجوانوں اور کچھ کمینہ خصلت افراد کو اس کی نگرانی پر مامور کر دیا اور ان کو تاکید کی کہ خبردار اسے مکہ میں داخل نہ ہونے دو۔ چنانچہ زید اگر کبھی آیا تو چھپ چھپا کر، اور اس پر بھی اگر تہ چل جاتا تو خطاب اور اس کے رضا کار اسے کھڑکھڑاتے اور اسے دین کو بگاڑ دینے کا مجرم جانتے ہوئے نہایت نفرت کے ساتھ دکھ دیتے۔ چنانچہ تنگ آ کر اس نے وطن چھوڑا اور موصل، الجزیرہ اور شام وغیرہ میں بے آمیز ابراہیمی دین کی جستجو میں مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر کار وہ دمشق کے علاقہ بلقاء میں ایک صاحب علم راہب کے پاس پہنچا اور اس سے گم گشتہ مسک ابراہیمی کا سراغ پوچھا۔ راہب نے کہا کہ آج تجھے اس مسک پر چلنے والا کوئی ایک متنفس بھی نہ ملے گا۔ البتہ ایک نبی کے ظہور کا وقت آ پہنچا ہے جو اسی جگہ سے اٹھے گا۔ جہاں سے نکل کر تو آیا ہے وہ دین ابراہیمی کا علمبردار بن کے اُٹھے گا جا کر اس سے مل۔ ان دنوں اس کی بعثت ہو چکی ہے۔“ زید نے یہودیت و نصرانیت کو خوب دیکھ بھال لیا اور ان کی کوئی چیز اس کے دل کو نہ لگی۔ وہ راہب کی ہدایت کے مطابق مکہ کی طرف پسکا۔ بلا و لخم میں لوگوں نے اس کو قتل کر دیا۔ ورقہ بن نوفل نے بڑے دردناک اشعار لاپتے ہوئے اظہارِ ورد کیا :-

فَأصْبَحْتَ فِي دَارِ حَرِيمٍ مُقَامَهَا	تُعَلَّلُ فِيهَا بِالْكَوَامَةِ لَاهِيَا
تَلَاقَى خَلِيلَ اللَّهِ فِيهَا وَلَمْ تَكُنْ	مِنَ النَّاسِ جَبَّارًا إِلَى النَّارِ هَاوِيَا
وَقَدْ تُدْرِكُ الْإِنْسَانَ رَحْمَةً رَبِّهِ	وَلَوْ كَانَ تَحْتَ الْأَرْضِ سَبْعِينَ وَاثِنَا

راہب ابن صلت

اس کے بیٹے سعید اور حضرت عمر ابن الخطاب نے زمانہ اسلام میں آنحضرت سے دریافت کیا کہ کیا ہم زید کے لیے دعائے مغفرت کر سکتے ہیں؟ آنحضرت نے فرمایا: ہاں! فانہ یبعث اُمَّةً وَحَدًا اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن ایک مستقل جداگانہ امت کی حیثیت سے کھڑا کرے گا، دعایہ کہ ایک شخص کو جہاں تک اس کی فطرت سلیم سے رہنمائی مل سکتی تھی اس نے شرح صدر کے ساتھ اسے قبول کیا۔ اور پھر وہ ہدایت وحی کی طلب میں مارا مارا پھرا اور بالآخر وہ سرچشمہ رسالت کی طرف دوڑا چلا

رہا تھا کہ اسی راہ جستجو میں شہید ہوا۔

اس طویل بیان سے یہ حقیقت سامنے لانا مقصود ہے کہ تاریخ ایک موڑ مڑنے کے لیے بے چین ہو رہی تھی، روح معاشرہ ایک نئی کروٹ لینا چاہتی تھی، انسانی ضمیر ایک شدید اضطراب سے دوچار تھا۔ مگر فطرت کی دھندلی رہنمائی کے سوا کوئی روشنی موجود نہ تھی اوپر سے فاسد مذہبیت اور اندھی رسمیت کا ماحول ایک آہنی خول کی طرح سے انسانی خودی کو بھینچے ہوئے تھا۔ جمود نے زندگی کے سمندر پر یخ کی ایک موٹی تہ مستط کر دی تھی کہ جس کو توڑ کر کسی موج کے لیے اوپر آنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ حساس افراد یا تو مستکب نصرانیت کی منزل پر رک گئے جس کے لیے ماحول میں گنجائش تھی، یا وطن چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن اس کے خلاف جہاد کا آغاز کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ متذکرہ بالا چار افراد میں بغاوت کی ایک لہر اٹھی تھی، ان میں سے صرف ایک زید نے اتنا کس بل دکھایا کہ حرم میں بیٹھ کر خدائے واحد کو پکارا اور قریش کے سامنے بت پرستی سے تبریٰ کیا۔ لیکن زید بھی ایک اظہارِ اضطراب اور ایک اعلانِ احتجاج سے زیادہ کچھ نہ کر سکا۔ کیونکہ اس کے سامنے کوئی واضح اور مثبت اور مکمل نظریہ و مسلک نہ تھا جسے وہ بنائے دعوت و تحریک بنا سکتا۔ پھر بھی مکہ نے اس کے وجود کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔

شعرا کو جاہلی معاشرہ میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ اور یہ لوگ ذہنی قیادت کے منصب پر بھی فائز تھے اور ان کے نغمے پارے وقت کے اجتماعی ذہن اور فکری فضا کے آئینہ دار بھی تھے۔ سماج کے ضمیر کا اضطراب جو لہریں اٹھا رہا تھا وہ حضور سے قبل کے متفلسفہ دور کی جاہلی شاعری میں نمایاں ہیں ان لہروں میں انسانی فطرت بسا اوقات بنیادی صداقتوں کو پکار اٹھتی تھی۔

ان میں سے ایک نمایاں شخصیت امیہ ابن ابی الصلت کی تھی جو سردارانِ طائف میں سے تھا۔ اس شاعر نے توحید اور حشر اور جزا اور سزا کے بارے میں اچھے خیالات پیش کیے ہیں۔ نیز اخلاقی حکمت و نصیحت کی باتیں نظم کی ہیں۔ یہ شاعر بھی صنم پرستانہ جاہلی طرزِ فکر کا باغی تھا۔ مگر حضور کی دعوت سے یہ حصہ نہ پاسکا۔ اس کے اشعار کو حضور پسند کرتے تھے اور فرماتے کہ وہ اسلام لاتے لاتے رہ گیا۔

اس طرح کے حساس افراد کے ذہنی تدوین کو دیکھیے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ماحول ایک زندگی بخش پیغام کے لیے مضطرب ہو رہا تھا۔

۱۔ قس بن ساعدہ کا قصہ بھی کتب تاریخ و ادب میں اسی طرح کا مندرج ہے لیکن جو اشعار اور خطبہ حکاظ اس کے نام سے منسوب ہے اسے علامہ شبلی موصوع قرار دیتے ہیں ملاحظہ ہو سیرۃ النبی از شبلی نعمانی ج ۱ ص ۱۸۳-۱۸۰۔

تاریخ جس انقلابی قوت کو مانگ رہی تھی وہ اپنے ٹھیک تمدنی موسمِ نو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی صورت میں کو نپل نکالتی ہے۔ آپ ایک منفی صدائے احتجاج بن کر اور اپنے انفرادی ذہن و کردار کی فکر لے کر نمودار نہیں ہوئے۔ بلکہ ایک جامع مثبت نظریہ و مسک کے ساتھ ساری قوم اور سارے ماحول کی اجتماعی تبدیلی کے لیے میدان میں اترے۔ اس جرم کو بھلا کیسے ٹھنڈے پٹیوں برداشت کیا جاسکتا تھا۔

**دعوت کا پہلا خفیہ دور :**

مقدمہ دورِ نبوت کے طور پر اپنے زمانہ تخت میں آنحضرت روایتی صادقہ سے نوازے گئے۔ کبھی غیبی آوازیں سنائی دیتیں، کبھی فرشتہ دکھائی دیتا، یہاں تک کہ عرشِ الہی سے پہلا پیغام آپہنچا۔ جبریل آتے ہیں اور لپکارتے ہیں کہ "اقْرَأْ بِرَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ - الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي كَرَّمَ فِي هَيْبَتِهِ جلال کا بہت سخت بوجھ آپ نے محسوس کیا۔ گھر آ کر اپنی رفیقہ رازداں سے واقعہ بیان کیا۔ انہوں نے تسلی دی کہ آپ کا خدا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔ ورقہ بن نوفل نے تصدیق کی کہ یہ تو وہی ناموس ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر اترتا تھا۔ بلکہ مزید یہ کہا کہ یقیناً لوگ آپ کی تکذیب کریں گے، آپ کو تنگ کریں گے آپ کو وطن سے نکالیں گے اور آپ سے لڑیں گے۔ اگر میں اس وقت تک زندہ رہا تو میں خدا کے کام میں آپ کی حمایت کروں گا۔" اب گویا آپ خدا کی طرف سے دعوتِ حق پر باقاعدہ مامور ہو گئے۔ اور آپ پر ایک بھاری ذمہ داری ڈال دی گئی۔ یہ دعوت سب سے پہلے حضرت خدیجہ ہی کے سامنے آئی اور وہی اس پر ایمان لانے والوں میں سے پہلی ہستی قرار پائیں۔ پھر یہ کام خفیہ طور پر دھیمی دھیمی رفتار سے چلنے لگا۔ آپ کے بچپن کے ساتھی اور پوری طرح ہم مذاق و ہم مزاج حضرت ابوبکر صدیق تھے۔ ان سب کے سامنے جب پیغامِ حق آیا تو انہوں نے کسی تامل و توقف کے بغیر اس طرح لبیک کہی جیسے پہلے سے روح اسی چیز کی پیاسی تھی۔ علاوہ بریں زید رفیق مسک بنے جو آپ کے پروردہ غلام تھے اور آپ کی زندگی اور کردار سے متاثر تھے۔

آپ پر قریب ترین لوگوں کا ایمان لانا آپ کے اخلاص اور آپ کی صداقت کا بجائے خود ایک ثبوت ہے یہ وہ ہستیاں تھیں جو کئی برس سے آپ کی پراپیٹ اور پیک لائف سے اور آپ کے ظاہر و باطن سے پوری طرح واقف تھیں۔ ان سے بڑھ کر آپ کی زندگی اور کردار اور آپ کے ذہن و فکر کو جاننے والا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ ان قریب ترین ہستیوں نے بالکل آغاز میں آپ کے بلاوے پر لبیک کہہ کر گویا ایک شہادت ہم پہنچا دی، دعوت کی صداقت اور داعی کے اخلاص کی۔

حضرت ابوبکر صدیق نے تحریکِ محمدی کا سپاہی بنتے ہی اپنے حلقہ اثر میں زور شور سے کام شروع کر

دیا اور متعدد اہم شخصیتوں، مثلاً حضرت عمر عثمان، حضرت زبیر، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت سعد بن وقاص، حضرت طلحہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس انقلابی حلقہ کا رکن بنا دیا۔ بڑی خاموشی، رازداری اور احتیاط سے اس حلقہ کے جواں ہمت کارکن اس کو توسیع دے رہے تھے۔ عمار، خباب، ارقم، سعید بن زید (انہی زید بن عمرو کے بیٹے جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے) یہ والد کی زندگی سے متاثر تھے۔ عبداللہ بن مسعود، عثمان بن مظعون، عبیدہ، صہیب رومی رضوان اللہ علیہم اجمعین، بھی اسلامی تحریک کے ابتدائی خفیہ دور میں سابقین اولین کی صف میں آچکے تھے!

نماز کا وقت آتا تو آنحضرتؐ کسی پہاڑ کی گھاٹی میں چلے جاتے اور اپنے رفقاء کے ساتھ چھپ چھپا کر سجدہ عبودیت بجالاتے۔ صرف چاشت کی نماز حرم میں پڑھتے، کیونکہ یہ نماز خود قریش کے ہاں بھی مردج تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرتؐ حضرت علیؑ کے ساتھ کسی درہ میں نماز ادا فرما رہے تھے کہ آپ کے چچا ابوطالب نے دیکھ لیا۔ اس نے انداز کی عبادت کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئے اور بڑے غور سے دیکھتے رہے۔ نماز کے بعد آپ سے پوچھا کہ یہ کیا دین ہے جس کو تم نے اختیار کیا ہے۔ آپ نے فرمایا: "ہمارے دادا ابراہیمؑ کا یہی دین تھا" یہ سن کر ابوطالب نے کہا کہ میں اسے اختیار تو نہیں کر سکتا لیکن تم کو اجازت ہے اور کوئی شخص تمہارا مزاحم نہ ہو سکے گا"۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تحریک اسلامی کے اسی خفیہ دور میں ایمان لائے اور آپ کا ترتیبی نمبر بہ تحقیق علامہ شبلی چٹاپا یا ساتوال ہے۔ یہ بھی انہی مضطرب لوگوں میں سے تھے جو بت پرستی چھوڑ کر محض فطرت سلیم کی رہنمائی میں خدا کا ذکر کرتے اور اس کی عبادت بجالاتے۔ ان تک کسی ذریعے سے آنحضرتؐ کی دعوت کا نود پہنچ گیا۔ انہوں نے اپنے بھائی کو بھیجا کہ جا کر صحیح معلومات لائیں۔ انہوں نے آنحضرتؐ سے ملاقات کی، قرآن سنا اور بھائی کو بتایا کہ میں نے اس شخص کو دیکھا ہے۔ لوگ اُسے مُرتد کہتے ہیں، لیکن وہ مکارم اخلاق کی تعلیم دیتا ہے اور ایک عجیب کلام سناتا ہے جو شعر و شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا طریقہ تمہارے طریقے سے ملتا جلتا ہے، اس اطلاع پر خود آئے اور آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

۱۔ سیرت النبئی علامہ شبلی ج ۱ ص ۱۹۲:

۲۔ دیکھیے بگڑے ہوئے معاشرے کی شان کہ جو شخص دنیا بھر کو ایمان سے مالا ماں کرنے آیا تھا اسی پر بے دینی کا ٹمپہ لگا دیا۔ ہر دور کے مذہبی ٹھیکہ داروں کا طرز عمل یہی ہوتا ہے۔



اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اخفاء کے مشکِ حق کی خوشبو کو ہوا کی لہریں لے اڑی تھیں اور خدا کے رسولؐ کے لیے بدنام کن القاب تجویز کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا لیکن پھر بھی ماحول ابھی پُرسکون تھا ابھی وہ ”خطرے“ کا پورا پورا اندازہ نہیں کر پایا تھا۔

دیکھیے، ایک اور اہم تاریخی حقیقت، کہ تحریک کے ان اولین علمبرداروں میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو اعلیٰ درجے کے مذہبی و قومی مناصب پر مامور ہو۔ یہ حضرات اغراض کے بوجھ تلے دبے ہوئے اور مفاد کی ڈوریوں سے بندھے ہوئے نہ تھے ہمیشہ ایسے ہی آزاد فطرت نوجوان تاریخ میں بڑی بڑی تبدیلیاں پیدا کرنے کے لیے اگلی صفوں میں آیا کرتے ہیں۔ لیڈروں اور عمدہ داروں میں سے کوئی بھی ادھر نہ آیا تھا۔

تحریک اپنے اس خفیہ دور میں قریش کی نگاہوں میں درخورِ اعتناء نہ تھی وہ سمجھتے تھے کہ یہ پندرہ نوجوانوں کا سر بھرا پن ہے، الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں، چار دن میں دماغوں سے یہ ہوا نکل جائے گی، ہمارے سامنے کون دم مار سکتا ہے۔ مگر برسرِ اقتدار طبقہ تختِ قیادت پر بیٹھا اپنے زعمِ قوت میں مگن رہا اور سچائی اور نیکی کی کوپنل تخت کے سائے میں آہستہ آہستہ جڑیں چھوڑتی رہی اور نئی پتیاں نکالتی رہی، یہاں تک کہ تاریخ کی زمین میں اس نے اپنا ایک مقام بنا لیا۔ قریش کا اعتقاد یہ بھی تھا کہ لات اور منات اور عزیٰ جن کے آگے ہم پیشانیاں رگڑتے اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں اور جن کے ہم خدامِ بارگاہ ہیں اپنے احترام اور مذہب بت پرستی کی خود حفاظت کریں گے اور ان کی روحانی مار اس ہنگامہ کو ختم کر دے گی۔

### دعوتِ عام :-

تین برس اسی طرح گزر گئے۔ لیکن مشیتِ الہی حالات کے سمندر کو بھلائیخ بستہ کہاں رہنے دیتی؟ اس کی سنت تو ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ وہ باطل کے خلاف حق کو اٹھا کھڑا کرتی ہے اور پھر ٹکراؤ پیدا کرتی ہے۔ (بل نقدف بالحق علی الباطل)، اس سنت کے تحت یکا یک دوسرے دور کے افتتاح کے لیے حکم ہوتا ہے ”فاصدع بہاؤ صر! جو کچھ حکم دیا جا رہا ہے اسے واشگاف کہہ دیجئے!

آنحضرتؐ اپنی ساری ہمت و عزیمت کو سمیٹ کر، نئے مرحلے کے متوقع حالات کے لیے اپنے آپ کو تیار کر کے کوہِ صفا آکھڑے ہوتے ہیں، اور قریش کو عرب کے اس خاص اسلوب سے پکارتے ہیں جس سے وہاں کسی خطرے کے نازک لمحے قوم کو بلایا جاتا تھا۔ لوگ دوڑ کر آتے ہیں، جمع ہو جاتے ہیں اور کان منظر ہیں کہ کیا خبر سنانی جانے والی ہے۔

آپؐ نے آواز بلند پوچھا۔ ”اگر میں یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے سے ایک حملہ آواز فوج چلی آ رہی ہے

تو کیا تم مجھ پر اعتماد کرو گے؟“

”ہاں، کیوں نہیں؟ ہم نے تم کو ہمیشہ سچ بولتے پایا ہے۔“ یہ جواب تھا جو بالاتفاق مجمع کی طرف سے دیا گیا۔

”تو پھر میں یہ کہتا ہوں کہ خدا پر ایمان لاؤ — اے بنو عبدالمطلب! اے بنو عبدمناف، اے بنو زہرا! اے بنو تمیم! اے بنو مخزوم! اے بنو اسد! — ورنہ تم پر سخت عذاب نازل ہو گا۔ ان مختصر الفاظ میں آپ نے اپنی دعوت برسر عام پیش کر دی۔

آپ کے چچا ابولہب نے یہ سنا تو جل بھٹن کر کہا کہ غارت ہو جاؤ تم آج ہی کے دن! — کیا یہی بات تھی جس کے لیے تم نے ہم سب کو یہاں اکٹھا کیا تھا؟ ابولہب اور دوسرے اکابر بہت برہم ہو کر چلے گئے۔

دیکھیے! ابولہب کے الفاظ میں دعوت نبوتی کے صرف ناقابل اعتناء ہونے کا تاثر جھبک رہا ہے ابھی کوئی دوسرا رد عمل پیدا نہیں ہوا۔ شکایت صرف یہ تھی کہ تم نے ہمیں بے جا تکلیف دی اور ہمارا وقت ضائع کیا!

دعوت عام کی مہم کا دوسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ آنحضرت نے تمام خاندان عبدالمطلب کو کھانے پر بلوایا۔ اس مجلس ضیافت میں حمزہ اور ابوطالب اور عباس جیسے اہم لوگ بھی شریک تھے۔ کھانے کے بعد آپ نے مختصر سی تقریر کی اور فرمایا کہ میں جس پیغام کو لے کر آیا ہوں یہ دین اور دنیا دونوں کا کفیل ہے کون اس مہم میں میرا ساتھ دیتا ہے؟

اس پر سکوت چھا گیا۔ اس سکوت کے اندر تیرہ برس کا ایک لڑکا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگرچہ میں آشوبِ چشم میں مبتلا ہوں، اگرچہ میری ٹانگیں پتلی ہیں، اگرچہ میں ایک بچہ ہوں، لیکن میں اس مہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ — یہ حضرت علیؑ تھے جو آگے چل کر اساطین تحریک میں شمار ہوئے۔

یہ منظر دیکھ کر حاضرین میں خوب قہقہہ پڑا! — اس قبیلے کے ذریعے گویا خاندان عبدالمطلب یہ کہہ رہا تھا کہ یہ دعوت اور یہ داعی اور یہ لبتیک کہنے والا کونسا کارنامہ انجام دے لیں گے۔ یہ سب کچھ ایک مذاق ہے، ایک جنون ہے، اور بس! اس کا جواب تو صرف ایک نخذہ استنزاز سے دیا

لے بالکل ابتدائے دعوت میں آنحضرت اس حقیقت کا شعور رکھتے تھے کہ وہ دنیا سے کٹا ہوا مذہب لے کر نہیں آئے بلکہ دنیا کو سنوارنے والا دین لے کے آئے ہیں۔

جا سکتا ہے۔

اس دوسرے واقعہ پر ماحول کا سکون نہیں ٹوٹا، زندگی کے سمندر کے ننگوں اور گھڑیا لوں نے کوئی انگڑائی نہیں لی۔ لیکن اس کے بعد یہ تیسرا قدم اٹھا تو اس نے معاشرہ کو ہسٹیریا کے اس دورے میں مبتلا کر دیا جو آہستہ آہستہ شروع ہو کر روز بروز تند و تیز ہوتا گیا!

اس تیسرے اقدام کے بارے میں گفتگو کرنے سے قبل ایک اور واقعہ کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ مخالف ماحول کی خطرناک سنگینی کی وجہ سے نماز چوری چھپے پڑھی جاتی تھی۔ آنحضرت اور رفقاء نے تحریک شہر سے باہر وادیوں اور گھاٹیوں میں جا جا کر ادا کرتے۔ ایک دن ایک گھاٹی میں سعد بن ابی وقاص دوسرے رفقاء نے نبوی نے ساتھ نماز میں تھے کہ مشرکین نے دیکھ لیا۔ عین حالت نماز میں ان مشرکین نے فقرے کہنے شروع کیے، بُرا بھلا کہا اور نماز کی ایک ایک حرکت پر پھبتیاں چست کرتے رہے، جب ان لایعنی باتوں کا کوئی جواب نہ ملا تو زچ ہو کر لڑنے پر اتر آئے۔ اس دنگے میں ایک مشرک کی تلوار نے سعد بن ابی وقاص کو زخمی کر ڈالا۔ یہ تھی خون کی سب سے پہلی دھار جو مکہ کی خاک پر خدا کی راہ میں بہا۔ یہ جاہلی معاشرے کا سب سے پہلا جنون آمیز خونیں رد عمل تھا اور اس رد عمل کے تیور بتا رہے تھے۔ کہ مخالفت اب تشدد کی منزل میں داخل ہونے والی ہے۔

## انتشار انگیزی :-

تحریک کی زیر سطح رونے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے چالیس موتی اکٹھے کر لیے۔ تھے۔ اب گویا اسلامی جماعت ایک محسوس طاقت بن چکی تھی۔ کھلم کھلا کلمہ حق کو پکارنے کا حکم آہی چکا تھا۔ اس کی تعمیل میں آنحضرت نے ایک دن حرم کعبہ میں کھڑے ہو کر توحید کا اعلان کیا۔ لیکن مذہبیت جب بگڑتی ہے، تو اس کی اقدار اس طرح تہ و بالا ہو جاتی ہیں کہ وہ گھر جو پیغام توحید کے مرکز کی حیثیت سے استوار کیا گیا تھا، اسی کی چار دیواری کے اندر خدائے واحد کی وحدت کی پکار بلند کرنا اس مرکز توحید کی توہین کا موجب ہو چکا تھا۔ بتوں کے وجود سے کعبے کی توہین نہیں ہوتی تھی بتوں کے آگے پیشانیاں رگڑنے سے بھی نہیں، ننگے ہو کر طواف کرنے اور سیٹیاں اور تابیاں بجانے سے بھی نہیں۔ غیر اللہ کے نام پر ذبیحے پیش کرنے سے بھی نہیں مجاوری کی فیس اور پودہتی کا ٹیکس وصول کرنے سے بھی نہیں۔ لیکن اس گھر کے اصل مالک کا نام لیتے ہی اس کی توہین ہو گئی تھی!

۱۔ یہ تو غیر مشرکین تھے درجہ جاہلیت کے، آج ہمارے سامنے ایک مسلمان، اور ایک معمولی مسلمان نہیں ایک مذہبی شخصیت کعبہ کے نظام توہیت کی خرابیوں پر تنقید کرنے والے اپنے بھائی کو توہین کعبہ کا مجرم گردانتی ہے! فاعتبروا یایا ولی الابصار!

”کعبہ کی توہین! حرم کے بے حرمتی!“ — تو بہ تو بہ! کیسی خون کھولا دینے والی بات ہے، کسی جذبات کو مشتعل کر دینے والی حرکت ہے! چنانچہ کھولتے ہوئے خون اور مشتعل جذبات کے ساتھ چاروں طرف سے کلمہ توحید کو سننے والے مشرکین و کفار اُٹھ آتے ہیں، ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے۔ بنی صلی اللہ علیہ وسلم گھیرے میں آ جاتے ہیں، حادث بن ابی ام ہالہ کے گھر میں تھے، شور و شغب سُن کر آنحضرتؐ کو بچانے کے لیے دوڑے لیکن ہر طرف سے تلواریں ان پر ٹوٹ پڑیں اور وہ شہید ہو گئے۔ عرب کے اندر اسلام اور جاہلیت کی کشمکش میں یہ پہلی جان بحق جو حمایتِ حق میں قربان ہوئی۔

دیکھا آپ نے! ایک دعوت جو معقول اور پُر سکون انداز سے دی جا رہی تھی اس پر غور کیے رائے قائم کرنے اور استدلال کا جواب دلائل سے دینے کے بجائے اندھے جذباتی اشتعال سے دیا جاتا ہے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کلمہ حق آہنی تلوار سے منوانے نہیں اُٹھتے۔ لیکن مخالف طاقت معاً تلوار سونت کے آ جاتی ہے یہی ایک فاسد نظام کے مفاد پرست مخالفین کی علامت ہے کہ معقولیت کے جواب میں اشتعال اور دلیل کے جواب میں تلوار لیے میدان میں اُترتے ہیں۔ مخالفین میں اتنا ظرف نہیں تھا کہ وہ کم سے کم چند مہینے چند دن، چند لمحے حرم سے اُٹھنے والی صد پر پُر سکون طریقے سے غور و فکر کر سکتے۔ یہ تسلیم کرتے کہ محمدؐ کو بھی ان کی طرح کسی نظریے، فلسفے، عقیدے پر ایمان رکھنے، کسی مذہب پر چلنے اور ان کی قائم کردہ صورتِ مذہب سے اختلاف کرنے کا حق ہے، کم سے کم امکان کی حد تک یہ مانتے ہو سکتے ہیں کہ ہمارے اندر غلطی موجود ہو اور محمدؐ ہی کی دعوت سے حقیقت کا سراغ مل سکتا ہو۔ کسی نظامِ فاسد کے سربراہ کا دل میں اتنا ظرف باقی نہیں رہتا، ان میں اختلاف کے لیے قوتِ برداشت بالکل ختم ہو جاتی ہے، ان کی غور فکر کی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔

ذرا اندازہ کیجیے کہ کیسی بھئی وہ فضا جس میں ہم سب کی دنیوی و اُخروی فلاح و بہبود کے لیے اپنی جان کی بازی لگا دینے والا داعیِ حق بے سرو سامانی کے عالم میں اپنا فرض ادا کر رہا تھا!

**گندرا پروپیگنڈا :-**

ابراہیم واسمعیل علیہما السلام کے پاکیزہ جذبات اور پاکیزہ حسرتوں اور تمناؤں کے مسالے سے بنے ہوئے حرمِ پاک کے اندر مکہ والوں کی اس حرکت کے وقوع نے آنے والے مستقبل کا ایک تصور تو ضرور دلا دیا۔ اور ایک بے گناہ کے خون سے آئندہ الوابِ تاریخ کی سُرخ تو جمادی، لیکن یہ اصل دورِ نشد کا افتتاح نہیں تھا۔

پہلا مرحلہ مخالفت ہمیشہ استہزاء، تضحیک اور کٹ مچتیوں کا ہوتا ہے جو آہستہ آہستہ غنڈہ گردی

کارنگ اختیار کرتا جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو پایہ اعتبار سے گرانے کے لیے گالی دینے کے کینہ جذبہ کے ساتھ پروپیگنڈہ کے ماہر استادوں نے گونا گوں القاب گھڑنے شروع کیے۔

مثلاً یہ کہا جانے لگا۔ کہ اس شخص کی بات کیوں سنتے ہو یہ تو (نعوذ باللہ) "سمرند" ہے سکتہ بند

دین اسلاف کہ جس کے ہم اجارہ دار ہیں یہ اس کے دائرہ سے باہر نکل گیا ہے اور اب اپنے پاس سے ایک

انوکھا دین گھڑ لایا ہے۔ کوئی استدلال نہیں۔ بس اپنی گدیوں پر بیٹھے بیٹھے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا ہے

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ تو "صابی" ہو گیا ہے صابنیت چونکہ اس وقت کی مشرکانہ سوسائٹی میں ایک

بدنام اور ناپسندیدہ مسلک تھا اس لیے کسی کا نام صابی دھر دینا ویسی ہی گالی تھا جیسے آج کسی مسلمان کو

یہودی یا خارجی یا نیچری کہہ دیا جائے حق کے خلاف دلائل کے لحاظ سے بودے لوگ جب منفی ہنگامے

اٹھاتے ہیں تو ان کی پروپیگنڈے کی مہم کا ایک ہتھیار ہمیشہ اس طرح کے بدنام القاب اور ناموں اور

اصطلاحوں کا چسپاں کرنا ہوتا ہے۔ گلی گلی، مجلس مجلس مکہ کے پروپیگنڈسٹ ڈھنڈورہ پیٹتے پھرتے

تھے کہ دیکھو جی! یہ لوگ صابی ہو گئے ہیں، بے دین ہو گئے ہیں۔ باپ دادا کا دین دھرم انہوں نے چھوڑ

دیا ہے، نئے نئے عقیدے اور نئے نئے ڈھنگ گھڑ کے لا رہے ہیں، دیکھو جی! ان ہونی باتیں ہو رہی

ہیں! یہ آندھی جب اٹھ رہی ہوگی تو تصور کیجیے کہ اس میں راستہ دیکھنا اور سانس لینا عام لوگوں پر کتنا دو بھر

ہو گیا ہوگا۔ اور داعیان حق کے مختصر سے قافلہ کو کس آفت کا سامنا ہوگا! مگر آندھیاں اور باب عزیمت کے

راستے کبھی نہیں روک سکتیں! مَا يَفْتَحُ اللَّهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا۔ (فاطر ۴)

دلائل کے مقابلہ میں جب گالیاں لائی جا رہی ہوں تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ دلائل تو اپنی جگہ

جھے رہتے ہیں لیکن جو گالی مقابلے پر لائی جاتی ہے وہ جذباتی حد تک دو چار دن کام دے کر بالکل بے اثر

ہو جاتی ہے اور انسانی فطرت اس سے نفور ہونے لگتی ہے اس لیے استادان فن کا یہ کلیہ ہے کہ نت نئی

گالیاں ایجاد کرنے چلے جاؤ۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک گالی اور وضع کی گئی۔ آپ کو

"ابن ابی کبشہ" کہا جاتا تھا۔ ابی کبشہ ایک معروف مگر بدنام شخصیت تھی۔ یہ شخص تمام عرب کے دینی رجحانات

کے خلاف "شعری" نامی ستارے کی پرستش کرتا تھا۔ ابن ابی کبشہ کے معنی ہوئے "ابن کبشہ کا بیٹا" یا ابی

کبشہ کا پیرو (نعوذ باللہ) دل کا بخار نکالنے کے لیے مکہ کے مریضان جذباتیت نے کیا کیا ایجادیں نہیں

کیں!

کسی صاحب دعوت یا کسی نقیب تحریک کی ذات پر جب یہ اس طرح کے وار کیے جاتے ہیں تو اصل

مطلوب اس ایک شخصیت کو کرب دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ درحقیقت گالی دی جاتی ہے اس نظریہ و مسلک کو اور اس کام اور تنظیم کو جس کی روز افزوں یلغار سے سابقہ پڑا ہوتا ہے مگر کیا ایک اڈتے ہوئے سیلاب کے آگے گور کے پشتے بانڈھ کر اس کو روکا جاسکتا ہے! مستہزین مکہ دیکھ رہے تھے کہ وہ گندگی کے جو جو بند بھی بانڈھتے ہیں ان کو یہ دعوت بہلئے لیے جارہی ہے اور ہر صبح اور ہر شام کچھ نہ کچھ آگے ہی بڑھتی جاتی ہے تو انہوں نے پروپیگنڈے کے دوسرے پہلو اختیار کیے۔ ایک نیا لقب یہ تراشا کہ یہ شخص (نعوذ باللہ) درحقیقت پاگل ہو گیا ہے۔ . . . . بتوں کی مار پڑنے سے اس کا سر پتھر گیا ہے یہ جو باتیں کرتا ہے۔ وہ ہوش و حواس اور عقل و حکمت کی باتیں نہیں ہیں بلکہ یہ ایک مایخو لیا ہے کہ جس کے دورے پڑنے پر کبھی اسے فرشتے نظر آتے ہیں، کبھی جنت اور دوزخ کے خواب دکھائی دیتے ہیں کبھی وحی اُترتی ہے اور کبھی کوئی انوکھی بات منکشف ہو جاتی ہے، یہ ایک سر پتھر آدمی ہے، اس لیے اس کی باتوں میں عام لوگوں کو دھیان نہیں دینا چاہیے اور اپنا دین ایمان بچانا چاہیے۔ ہمیشہ سے یہ ہوا ہے کہ داعیانِ حق کا زور استدلال توڑنے کے لیے یا تو ان کو پاگل کہا گیا ہے یا سفیہ و احمق! ہوشمند تو بس وہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی دنیا بنانے اور زمانے کی ہاں میں ہاں ملانے اور اپنی خواہشوں کا سامانِ نسکین بہم کرنے میں منہمک رہیں، باقی وہ لوگ جو تجدید و اصلاح کی مہم اٹھا کر جان جو کھوں میں ڈالیں، ان کو دنیا پرست اگر احمق اور پاگل نہ کہیں تو آخر ان کی ڈکٹری میں اور کون سا لفظ موزوں ہو سکتا ہے۔

پھر یہ بات پیٹھ پیچھے کہتے رہنے پر اکتفا نہیں کیا جانا تھا بلکہ رُو در رُو کہا جاتا تھا۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِي نَزَلَ عَلَيْهِ مِنَ الْكَرَامَاتِ مَلْجُونٌ - (البحر - ۶) گالی کا اصلی مزہ تو آتا ہی جب ہے کہ وہ جو در رُو سناٹی جائے!**

لیکن کبھی پاگلوں کے گرد بھی دنیا کسی تحریک کو چلانے کے لیے منظم ہوتی ہے، کبھی احمقوں کا دامن بھی ہوشمند اور سلیم الفطرت نوجوان نے تھا ماہے، کبھی سر پتھرے لوگوں کے بلاوے پر سمجھدار لوگوں نے بھی لبتیک کہی ہے، اس سوال کا جواب دینے کے لیے مشرکین مکہ نے ایک اور طنز گھڑی کہنے لگے کہ یہ مدعی نبوت درحقیقت جادو کے فن میں بھی درک رکھتا ہے۔ یہ اس کا فنی کمال ہے کہ دو چار باتوں

سے پختہ مذہبی رجحانات رکھنے والوں کے لیے اہل مغرب نے جنونی (Fanatics) کی خاص اصطلاح اسی معنی میں اختیار کر رکھی ہے کہ یہ عقلی توازن سے بے بہرہ جذباتی لوگ ہوتے ہیں خود ہمارے اپنے اندر کے بد مذہبے عنام داعیانِ حق کو جب ملتا کہتے ہیں تو اس معنی میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ سوچ بوجھ سے کوہے، حالات زمانہ سے نا آشنا اور اپنے ماضی کے بوسیدہ خیالات کے اندھے عاشق ہوتے ہیں۔ اس سے بچنے اور کردینی لوگوں کو مخالف عنام سیاست سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ بڑھ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہیں ہی احمق!

میں ہر ملنے والے پر پینا ٹرم کر دیتا ہے نظر بندی کی حالت میں مبتلا کر دیتا ہے اور ذرا کوئی اس کی باتوں میں آیا نہیں کہ جادو کے جال میں پھنسا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے بھلے سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ اس کا شکار ہونے چلے جا رہے ہیں!

ہاں مگر ایک سوال یہ بھی تو پیدا ہوتا تھا کہ کبھی جادو گروں نے بھی آج تک مذہبی و تمدنی تحریکیں چلائی ہیں اور کبھی کاہنوں نے خدا پرستی اور توحید اور مکارم اخلاق کا درس دینے کے لیے فن ساحری کو استعمال کیا ہے؟ کوئی مثال ایسی تاریخ میں ہے کہ جادو گروں کی سی ذہنی سطح رکھنے والے کسی فرد نے نظام وقت کو بدل ڈالنے کے لیے جادو کے زور سے ایک انقلابی روائٹھا کھڑی کی ہو؟ کبھی جادو کے زور سے دلوں اور دماغوں، روحوں اور سیرتوں کو بھی بدلنے کی کوئی مثال سامنے آئی؟ — پھر یہ کیسا جادو گر تھا جو شعبہ گری کر کے چار پیسے کماتے پھرنے کے بجائے ساری دنیا کا عذاب بھگتا ہوا سوسائٹی کے بہترین صالح عنصر کو اپنے گرد ایک بڑی اجتماعی مہم کے لیے سمیٹ رہا تھا۔ کیا یہ کوئی نظر بندی کا ایک شعبہ تھا جو تمہاری آنکھوں کے سامنے واقع ہو رہا تھا! لیکن یہ سکہ بند الزام ہے، ایسا کہ ہر دور میں ہر صاحب دعوت پر لگایا گیا ہے۔ یقین دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ خود دعوت میں صداقت نہیں کہ اس کی فطری کشش کام کرے۔ داعی کے استدلال میں کوئی وزن نہیں کہ جس سے قلوب مسخر ہو رہے ہوں بلکہ سارا کھیل کسی پراسرار قسم کی فریب کاری اور ساحری پر مبنی ہے اور یہ اسی کا اثر ہے کہ بھلے چنگے لوگ توازن کھو بیٹھتے ہیں۔

لوگ اکابر قریش کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی الہامی تقاریر اور آیات قرآنی خصوصاً پیش بھی تو کرتے ہوں گے کہ یہ اور یہ باتیں کہی گئی ہیں۔ کلام کے وہ جو ہر شناس آخر یہ تو محسوس کر لیتے ہونگے کہ خود یہ کلام موثر طاقت ہے۔ اس پر سنجشیں ہوتی ہوں گی اور رائیں قائم ہوتی ہوں گی۔ اس کلام کے اعجاز کی توجیہ کرنے کے لیے انہوں نے کہنا شروع کیا کہ اچی کیا ہے، بس شاعری ہے، الفاظ کا ایک آرٹ ہے ادیبانہ زور ہے۔ محمد درجہ اول کے آرٹسٹ اور لسان خطیب ہیں، ان کی شاعری کی وجہ سے کچے ذہن کے نوجوان بہک رہے ہیں۔“

اے قریش مکہ! شاعر تو دنیا میں ہمیشہ ہوتے رہے ہیں کیا کوئی ایسا انوکھا شاعر کبھی پیدا ہوا جو اس بے داغ سیرت اور عظیم کردار کا حامل ہو جس کا مظاہرہ محمد اور ان کے رفقاء کر رہے تھے۔ کیا شاعری کے طلسم باندھنے والوں نے کبھی ایسی دینی مہمات بھی برپا کی ہیں جیسی تمہارے سامنے ہو رہی تھی۔ قریش کے سامنے بھی یہ سوال تھا۔ اس کا جواب دینے کے لیے انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

پر کہانت کا ایک اور الزام باندھا۔ کاہن لوگ کچھ مذہبی انداز و اطوار رکھتے تھے، ایک عجیب پُر اسرار سی فضا بناتے تھے۔ چٹوں اور اعتکافوں اور وظیفوں اور منستروں میں ان کی زندگی گزرتی تھی۔ مراقبوں اور مکاشفوں اور فال گیر لوگوں کے ذریعے ایک ٹیکنیکل زبان میں غیب کے اسرار لوگوں کو بتاتے تھے، عام لوگوں سے کچھ انوکھے سے انداز و اطوار رکھتے تھے۔ کچھ مجذوبانہ سی شان ہوتی تھی۔ کاہن کہنے سے قریش کا مدعا ہی تھا کہ آنحضرت نے بھی بس اسی طرح کا ایک ڈھکوسلہ بنا رکھا ہے۔ تاکہ لوگ آئیں۔ مرد نہیں ان پر کہانت کا سکہ بھی چلے اور پیٹ کا مثلہ بھی حل ہو جائے۔ (معاذ اللہ)

اور قرآن اس سارے پروپیگنڈے کی دھواں دھاریوں کو محیط ہو کر آسمانی بلندیوں سے پکار کر کہ

رہا تھا کہ :-

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ! — قَلِيلًا مَّا تَوْمِنُونَ

وَمَا يَقُولُ صَاحِبٌ! قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ

یہ شاعری نہیں ہے مگر افتاد تو یہ آپڑی کہ تم نے ایمان و یقین کے دروازے بند کر رکھے ہیں، یہ کہانت نہیں، مگر رکاوٹ یہ ہوئی کہ تم نے غور و فکر نہ کرنے اور کسی قسم کا سبق نہ لینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اس طوفانِ بدتمیزی پر قرآن نے چار لفظوں میں کیا ہی شاندار تبصرہ آنحضرت کو مخاطب کر کے کہا کہ اُنظروا کیف مَنُوبُوا إِلَيْكَ الْأَمْثَالُ! (الفرقان) دیکھو یہ لوگ کیسے کیسے محاورے اور فقرے چست کرتے ہیں، کیسے کیسے نام دھرتے ہیں کیا کیا تشبیہیں گھرتے ہیں اور کہاں کہاں سے اصطلاحیں ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ کر کے پھر یکا یک کیا پلٹا کھاتے ہیں؟ — "فَصَوِّدُوا" یعنی اپنے ہی آپ کو گمراہی میں ڈالتے ہیں دیکھیے! اب ایک اور شوشہ تراشا جاتا ہے۔ دینِ ابراہیمی کے نام یوں افرماتے ہیں کہ یہ کوئی جن ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر آتا ہے اور وہ آکر عجیب عجیب باتیں بتاتا ہے یا یہ کہ وہ سکھا پڑھا جاتا ہے۔ کبھی مکہ کے ایک رومی و نصرانی غلام (جابر یا جبر یا جبر) کا نام لیا جاتا جو آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر دین کی باتیں سنتا کہ یہ جاتا ہے اور تنہائی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ وعظ اور سیکر نوٹ کراتا ہے۔ ایک موقع پر وفد کا برفریش نے خود آنحضرت سے کہا کہ :- ہمیں معلوم ہوا ہے کہ پیامہ میں کوئی شخص الرحمن نامی ہے جو تمہیں یہ سب کچھ سکھاتا پڑھاتا ہے۔ خدا کی قسم ہم اس الرحمن پر ایمان نہیں لانے کے لئے۔ ان ہوائی شوشوں سے یہ ظاہر کرنا مطلوب تھا کہ یہ کسی بیرونی طاقت اور کسی غیر شخص کی شرارت



ہے جو ہمارے مذہب اور معاشرے کو تباہ کرنے کے درپے ہے اور محمد ابن عبداللہ تو محض آلہ کار ہے یہ کسی طرح کی ساز باز ہے۔ دوسری طرف اس میں یہ تاثر بھی شامل تھا کہ کلام کا یہ حسن و جمال نہ محمد کا کمال ہے نہ خدا کی عطا و بخشش، یہ تو کوئی اور ہی طاقت گل کھلا رہی ہے۔ تیسری طرف اس کے ذریعے کذب اور افتراء علی اللہ کا الزام بھی داعی بحق پر چسپاں ہو رہا تھا۔ اس کے جواب میں قرآن نے تفصیلی استدلال کیا ہے مگر اس کا چیلنج قطعی طور پر مسکت ثابت ہوا کہ انسانوں اور جنوں کی مشترکہ مدد سے تم اس طرح کی کوئی سورۃ یا ایسی چند آیات ہی بنا کر لاؤ۔

ضمناً مزید ایک دعویٰ یہ بھی سامنے آیا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، کوئی خاص کارنامہ نہیں ہے اصل میں پرانے قصے کہانیاں ہیں جن کا مواد کہیں سے جمع کر کے زور دار زبان میں ڈھالا جا رہا ہے، اسی طرح کی افسانہ طرازی ہے اور داستان گوئی ہے اور جس طرح داستان گو محفل پر چھا جاتا ہے اسی طرح محمد چٹپٹے انداز سے قصے سنا سنا کر داد لے رہا ہے۔ دعوتِ حق پر "اساطیر الاولین" کی پھبتی کہنے میں یہ طنز بھی شامل تھا کہ اگلے وقتوں کی ان باتوں کے ذریعے آج کے مسائل کی عقدہ کشائی کہاں ہو سکتی ہے زمانہ کہیں سے کہیں آ پہنچا "اگلے وقتوں کی کہانیوں اس میں انسان کا کیا کام بنا کے دے سکتی ہیں؟"

کمال یہ ہے کہ ایک طرف یہ الزام دیا جا رہا تھا کہ اسلاف کے سکتہ بند دین کئے بالمقابل نئی باتیں گھڑی جا رہی ہیں، دوسری طرف بالکل متضاد قسم کا یہ طعنہ کہ گڑے مردے اکھیر کر لائے جا رہے ہیں!۔ ہمیشہ غیر مخلص اشارہ کا یہی حال رہا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے کبھی ایک پہلو سے آ کر نکتہ چینی بنتے ہیں اور کبھی دوسرے رخ سے یورش کر کے دوسرا برعکس قسم کا اعتراض لاپھینکتے ہیں اور نہیں دیکھتے کہ خود اپنی نزدیک آپ کر رہے ہیں۔

اسی سلسلے میں ایک محاذ شعراء کا قائم کیا گیا تھا۔ ابوسفیان بن حارث، عمرو بن عاص اور عبداللہ بن زعبری اس مہم پر مامور کیے گئے کہ وہ آنحضرت کے خلاف گندی سجویہ نظمیں کہیں اور ان کو نشر کریں۔ واضح رہے کہ شعراء کا بڑا اثر جاہلی سوسائٹی پر تھا۔ یہ لوگ گویا ذہنی رہنمائی اور تربیت کے منصب پر فائز تھے اور ان کے منہ کا ایک ایک بول دلوں میں گھر کرتا تھا۔ اور اسے یاد کر کے پھیلایا جاتا تھا۔ یوں سمجھیے کہ شعراء اس دور میں تقریباً آج کے صحافیوں کی پوزیشن میں تھے۔ جس طرح آج ایک ماہر فن صحافی اگر اپنے قلم اور اخبار کی طاقت کے بل پر کسی کے پیچھے پڑ جائے تو اپنے شدت سے اور فکاہی سجویہ نگاری سے اور مراسلات کے کاموں کے غیر شریفانہ استعمال سے، خبروں کا بلیک آؤٹ کرنے اور بیانات کی کتر بیونت کرنے اور

گمراہ کن سرخیاں جمانے سے وہ کسی دعوت اور جماعت اور تحریک کے لیے بھاری مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ ٹھیک یہی مقام شعرائے عرب کا تھا، وہاں ایک سے زیادہ شعراء اس کام پر لگا دیے گئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت و تحریک کو گلی گلی بدنام کرتے پھریں اور مقضیٰ و مسجع گالیاں نشر کریں۔ بالکل یہ سماں تھا کہ جیسے ذہنی و فکری دنیا میں ایک شریف راہ گیر کے پیچھے کتے لگا دیے گئے ہوں۔ لیکن محسن النبیؐ کا پیغام اور کردار بجائے خود شاعروں کے جادو کا کامیاب توڑ تھا۔

واضح رہے کہ یہ ساری ہم کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں بلکہ سوچی سمجھی ہوئی شرارت کے طور پر چلائی جا رہی تھی، انہوں نے مل کر یہ قرارداد طے کی تھی کہ لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْفِیْهِ لَعَنَّكُمْ تَخِیْبُوْنَ رَحْمَۃَ اللّٰهِ وَرَحْمَۃَ رَسُوْلِهِ (یعنی داعی کی بات سنو ہی نہیں، اس پر غور کرو ہی نہیں۔ کہیں خیالات میں تزلزل نہ آجائے۔ کہیں ایمان خراب نہ ہو جائے۔ بس ہاڈ ہو کا خوب شور مچا کر اس میں رخنہ اندازی کرو۔ اور اس میں گڑبگڑ ڈالو۔ اور اسے مذاق پر دھرو، اس طریقے سے قرآن کا زور ٹوٹ جائے گا۔ اور آخری فتح تمہاری ہوگی۔ اس آیت کے اندر مطالعہ کیجیے حق کی مخالفت کرنے والی طاقتوں کی نفسیات کا۔ وہ بات کو سننے اور سمجھنے سے بے نیاز ہو کر اور دوسروں کو بھی سننے سمجھنے سے روک کر ہنگامہ آرائی کرتی ہیں۔ ایسے ذہنوں سے ہمارے محسن اور محبوب رہنما کا سابقہ پڑا تھا۔

عاص بن وائل السہمی نے آنحضرتؐ کی دعوت و تحریک کی تحقیر کرتے ہوئے یہ نہ ہر لیے کلمات کہے دَعْوَةُ ذَاتِ مَآهْرٍ رَجُلٌ اَبْتَرٌ لَا عَقِبَ لَهٗ۔ لَو مَاتَ لَا تَقْطَعُ ذِكْرُهٗ وَاِنَّ تَرْحَمْتُمْ مِرَّةً ۙ یعنی یہ کہ کیا ہے میاں چھوڑو اسے اس کے حال پر، وہ تو ایک لندمنڈ آدمی ہے، کوئی اس کے پیچھے رہنے والا نہیں۔ اس کے مرتے ہی اس کی یاد تک فراموش ہو جائے گی۔ اور تم اس کے جھنجھٹ سے نجات پا کر امن چین سے رہنا۔ طعنہ دیا گیا تھا آنحضرتؐ کی اولادِ زہرینہ نہ ہونے پر اور عرب میں فی الواقع یہ طعنہ کچھ معنی رکھتا تھا مگر عاص حبیبوں کی نگاہ میں یہ نہیں سمجھ سکتیں کہ انبیاءِ جمہیسی تاریخ ساز ہستیوں کی اصل اولاد ان کے عظیم الشان کارنامے ہوتے ہیں، ان کے دماغوں سے نئے ادوارِ تہذیب جنم لیتے ہیں۔ دران کی دعوت و تعلیم کی دراثت سنبھالنے اور ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان کے رفقاء اور پیروکار گروہ در گروہ موجود ہوتے ہیں وہ جس خیر کثیر کو لے کے آتے ہیں اس کی طاقت اور اس کی قدر و قیمت کسی کی زہرینہ اولاد کے بڑے سے بڑے لشکر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اس طعنہ کے جواب میں سورہ کوثر نازل ہوئی جس میں عاص اور اس کے ہم کیشوں کو بتایا گیا کہ ہم نے اپنے نبیؐ کو "کوثر" عطا کیا ہے، اسے خیر کثیر کا حشر تہیہ بنا یا ہے، اسے قرآن کی نعمتِ غنظی دی ہے، اسے ایمان والوں اور اطاعت کرنے والوں اور اس کے

کام کو پھیلانے اور جاری رکھنے والوں کی ایک بڑی جماعت دی ہے اور اس کے لیے عالمِ آخرت میں جو کچھ کا تحفہ مخصوص کر رکھا ہے۔ جس سے ایک بار اگر کسی کو اذنِ نوش مل گیا تو وہ ایدز تک پاس نہ محسوس کرے گا پھر فرمایا کہ اے نبی! بتر تو ہیں تمہارے دشمن کہ جن کا باعتبارِ حقیقت کوئی نام لیوا اور پانی دیوا نہیں ہے اور جن کے مڑبانے کے بعد کوئی بھول کے یاد بھی نہ کرے گا کہ فلاں کون تھا اور جن کے لیے تاریخِ انسانی کے ایوان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سرگرم ترین مستہزین مکہ کی فہرست پیش کر دی جائے بنو اسد میں سے اسود بن المطلب، بنو زہرہ بن کلاب میں سے اسود بن عبد یغوث، بنی مخزوم میں سے ولید بن المغیرہ، بنو سہم میں سے غاس بن وائل، بنو خزاعہ میں سے حارث بن طلاطلہ! یہ لوگ طنز و استہزاء اور دشنام طرازی کے محاذ کے سپہ سالار تھے۔

### کٹ حجتیاں :

استہزاء اور تنازع بالانقلاب کے ساتھ ساتھ کٹ حجتیوں کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا، جو لوگ کہ آنکھوں دیکھتے ایک امرِ حق کو نہیں ماننا چاہتے وہ اپنے اور داعی کے درمیان طرح طرح کے نکتے اور لطیفے اور باتوں میں سے باتیں نکال نکال کر ایک سنگین دیوار چنتے رہتے ہیں۔ اس بوہی دیوار کا ہر ردہ رکھتے ہی گر پڑتا ہے، معاندین کچھ اور اینٹ گارالتے ہیں، پھر ساری مزدوری برباد جاتی ہے، پھر وہ اور سالہ استعمال کرتے ہیں، غرض ان کی ساری عمر اسی کھیل میں گزر جاتی ہے لیکن نہ وہ اپنا کچھ بنا سکتے ہیں دوسروں کی کوئی تعمیری خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ وہ سوال اور اعتراض بالکل اور مزاج کا ہوتا ہے جو اخلاص کی اسپرٹ کے ساتھ اُبھرتا ہے اور وہ سوال اور اعتراض بالکل دوسری ساخت رکھتا ہے جو شرارت کے داعی کا راستہ روکنے کے لیے گھڑا جاتا ہے اس دوسری صورت کو کٹ حجتی کہتے ہیں اور کٹ حجتی ہمیشہ بے ایمانی اور شرارت اور فتنہ پسندی کی گواہی دیتی ہے۔ کٹ حجتی کرنے والے ذہن کا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ دعوت سے کوئی سبق اخذ نہیں کرنا ہے بلکہ کاوش کر کے کوئی نہ کوئی ٹیڑھ نکالتے رہنا ہے۔

يَبْخُؤْنَهَا عَوْجًا (ہود ۱۹ دیکر متانات)

اسلاف کی سکتہ بند مذہبیت کے یہ محافظین کرام آنحضرت سے ایک تو بار بار یہ پوچھتے تھے کہ تم اگر نبی ہو تو آخر کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ تمہارے نبی ہونے کی کوئی واضح نشانی تمہارے ساتھ ہو، کوئی ایسا سہرا ہو جسے دیکھنے والوں کے لیے نبوت ماننے بغیر چارہ ہی نہ رہے۔ لَوْ لَا اُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ؟ (قصص ۵۰۔ دیکر متانات)

پھر وہ مسمی صورتیں بنا کر کہتے کہ سَوَلَا اَنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ سَوٰى رَبِّنَا (الصفوان - ۲) یعنی لمبے بخت و استدلال کی کیا ضرورت، سیدھی طرح آسمان سے فرشتوں کے جھنڈا اتریں، ہمارے سامنے چلتے پھرتے دکھائی دیں۔ اور خدا تمہارے ذریعے پیغام بھیج کر اپنے آپ کو منوانے کے بجائے خود ہی کیوں نہ ہمارے سامنے آجائے اور ہم دیکھ لیں کہ یہ بے ہمارا رب۔ جھگڑا ختم ہو جائے۔

پھر وہ یہ کہتے کہ جو کچھ تم پیش کر رہے ہو یہ اگر واقعی خدا کی طرت ہوتا تو چاہیے یہ تھا کہ ایک لکھی ہوئی کتاب ہمارے دیکھنے دیکھتے آسمان سے اترتی، بلکہ تم خود سیرٹی کے ذریعے کتاب ایسے ہوئے اترتے اور ہم سر تسلیم خم کر دیتے کہ تم سچے نبی ہو، اسی سلسلے میں ایک سوال بھی اٹھایا جاتا تھا کہ قرآن خطبہ بہ خطبہ اور قطعہ بہ قطعہ کیوں نازل ہوتا ہے، سیدھی طرح ایک ہی بار پوری کی پوری کتاب کیوں نہیں نازل ہو جاتی اور اصل انہیں یہ صورت بڑی کھلتی بختی کہ جتنے سوال وہ اٹھاتے تھے، جو خوشتراری میں کرتے تھے، جس جس پہلو سے مین میخ نکالتے تھے اس پر وحی کے ذریعے حسب موقع تبصرہ ہوتا اس کا تجربہ کیا جاتا، اور پورے ذریعہ استدلال سے ان کی مخانہ کا رشتوں کی جڑیں کھود دی جاتیں۔

پھر وہ یہ کٹ جھتی کرتے کہ تم جو گوشت پوست کے بنے ہوئے ہماری طرح کے ایک آدمی ہو تمہیں بھوک لگتی ہے، معاش کے درپے ہو، رزنی کھاتے ہو، گلیوں اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہو، پیٹھے ماہوں رہتے ہو، تمہارے اوپر طرح طرح کی زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ کیسے یہ بات عقل میں آئے کہ تم اللہ کے پیارے اور اس کے معتمد ناسدے اور دنیا کی اصلاح کے ذمہ دار بنا کے بھیجے گئے ہو۔ تم واقعی اگر ایسے چمیدہ روزگار ہوتے تو فرشتے تمہارے آگے آگے ہٹو، بچو کی صدا لگاتے، باڈی گارڈ بن کر ساتھ چلتے، جو کوئی گستاخی کرتا لٹھے سے اس کا سر بھینٹ دیتے۔ تمہاری یہ شان اور یہ ٹھاٹھ دیکھ کر ہر آدمی بے چون و چرا مان لیتا کہ اللہ کا پیارا اور نبی ہے۔ اتنا ہی نہیں تمہارے لیے آسمان سے خزانہ اترتا اور اس خزانہ کے بل پر تم شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ ہمیشہ کی زندگی گزار رہے ہوتے۔ تمہارے بسنے کے لیے سونے کا ایک محل ہوتا، تمہارے لیے کوئی چشمہ جاری ہوتا۔ کوئی نمر بہانی جاتی، تمہارے پاس پھلوں کا کوئی اعلیٰ درجے کا باغ ہوتا، آرام سے بیٹھے اس کی کمانی کھاتے اس لقمے کے ساتھ تم نبوت کا دعویٰ لے کے اٹھتے تو ہم سب بسر و چشمہ مانتے کہ واقعی یہ کوئی منتخب زمانہ اور مقبول ربانی ہستی ہے۔ بخلاف اس کے حال یہ ہے کہ ہم لوگ کیا مال کے لحاظ سے، کیا اولاد کے لحاظ سے تم سے منزلوں آگے ہیں، اور تمہارا حال جو کچھ ہے وہ سامنے ہے، ایک تم ہی نہیں، تمہارے ارد گرد جو ہستیاں جمع ہوئی ہیں وہ سب ایسے لوگ ہیں جو ہماری سوسائٹی کے سب سے بچے عینے سے تعلق رکھتے ہیں اور کوتاہ نظر اور کم علم ہیں۔ تم لوگوں کو ہمارے مقابلے میں کوئی بھی تودہ فضیلت

حاصل نہیں۔ بتاؤ، اے محمد! کہ ایسی صورت میں کوئی معقول آدمی کیسے تمہیں نبی مان لے! چنانچہ حال یہ تھا کہ جدھر سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوتا۔ پھبتیاں کسی باتیں کہ اھذا الذی بعث اللہ رسولاً (الفرقان۔ ۲۱) یعنی انگلیاں اٹھا، اٹھا کر اور اشارے کر کے غنڈوں کا مذاق رکھنے والے اہل بیان مکر کہتے کہ ذرا دیکھنا ان صاحب کو، یہ ہیں جن کو اللہ نے رسول مقرر فرمایا ہے! خدا کو کسی آدم زاد سے رسالت کا کام لینا ہی تھا تو کیا لے دے کے یہی شخص نہ گیا تھا! کیا حسن انتخاب ہے۔ اسی طرح اسلامی تحریک کے علمبرداروں پر یہ حیثیت مجموعی یہ فقرہ چست کیا جاتا تھا، کہ اھؤلاء من اللہ علیہم من بیننا؛ یہ ہیں وہ ممتاز ہستیاں جنہیں اللہ نے مراتب خاص سے نوازنے کے لیے ہمارے اندر سے چھانٹ لیا ہے۔ پھر کہا جاتا کہ اے محمد! وہ جس عذاب کی روز روز تم دھمکیاں دیتے ہو، اور جس کے ذریعے اپنا اثر جمانا چاہتے ہو، اسے لے کیوں نہیں آتے؟ ”مَا يَجِيءُ“ اُسے آخر کس چیز نے روک رکھا ہے؟ چیلنج کر کے کہتے کہ فاسقط علينا كسفاً من السماء ان كنت من الصادقين (الشعرا ۱۸۰) کیوں نہیں تم آسمان کا کوئی ٹکڑا توڑ گراتے ہم جیسے نافرمان کافروں پر؟ اگر تم سچے ہو تو ہمارا خاتمہ کر ڈالو۔ بطور طنز یہ دعا کرتے کہ اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هَذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حَجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ اَوْ اِثْنَاكَ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (الانفال ۳۲)

پھر یہ دین اسلاف کے ٹھیکہ دار یہ نکتہ چھانٹتے کہ اے محمد! جب تم بتاتے ہو کہ خدا قادر و صاحب اختیار وقتا ہر وجہاً ہے تو کیوں نہیں وہ ہم کو اپنی طاقت کے زور سے اس ہدایت کے راستے پر چلاتا کہ جس پر چلنے کے لیے تم ہمیں کہتے ہو۔ وہ ہمیں موجد اور نیک دیکھنا چاہتا ہے تو پھر ہمیں موجد بنا دے اور نیکی پر چلا دے، اس کو کس نے روک رکھا ہے۔ وہ ہمیں بتوں کو نہ پوچھنے دے۔ وہ ہمیں بد عقیدہ نہ ہونے دے۔ جب وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ ہمیں محبوب رکھتا ہے اور ہماری موجودہ روش اسے گوارا ہے تو پھر بیچ میں تم کون ہوتے ہو۔ دخل دینے والے، مدعی سست، گواہ چست والی بات ہے۔

اسی طرح وہ قیامت کا مذاق اڑاتے، — بڑے ڈرامائی انداز میں دریافت کرتے، کہ ذرا یہ تو فرمائیے کہ یہ حادثہ کب واقع ہونے والا ہے؟ ”مَتَى هَذَا الْوَعْدُ“؟ کچھ اتنا پتا دیجیے کہ اس اعلان کو کب پورا ہونا ہے؟ ”اَيَّانَ مَوْسِمَهَا“ قیامت کب تک آپہنچنے والی ہے؟ کیا کوئی تاریخ اور کوئی گھڑی معین نہیں ہوئی؟

ان چند مثالوں سے جن کی تفصیل قرآن و حدیث اور سیرت و تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہے اندازہ کیجیے کہ دنیا کے سب سے بڑے محسن اور انسانیت کے عظیم ترین خیر خواہ کو کیسی فضا سے سابقہ آپڑا تھا۔ نہایت

گھٹیا مذاق کے لوگ چاروں طرف سے طعنہ آمیز اسلوب کے ساتھ نکتے چھانٹ رہے ہیں۔ مناظرانہ انداز سے سوال گھڑ گھڑ کر ڈال رہے ہیں، اور آنحضرتؐ ہیں کہ میں میخ نکالنے والوں کے ہجوم میں نہایت ہی شریفانہ اور مہذب اور ٹھنڈے اور سنجیدہ انداز سے اپنی دعوت پر استدلال کر رہے ہیں، جو اب کوئی مذاق نہیں کرتے طعنے نہیں دیتے، مناظرانہ رنگ اختیار نہیں کرتے، برا فروختہ نہیں ہوتے لیکن ایک لمحے کے لیے استدلال کا محاذ اور دعوت کا میدان چھوڑ کر پیچھے بھی نہیں ہٹتے۔

استہزاء اور کٹ جھتیوں کے اس طوفان سے گزرتے ہوئے آنحضرتؐ پر نفسیاتی کرب کے جو لمحے گزرے ہیں اور جس طرح آپ کڑھے اور گھٹے ہیں، ان سارے احوال کا قرآن میں پورا پورا عکس ملتا ہے عالم بالا کی طرف سے یقین دہانی کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے کلمات سے خود سامانِ تسکین فرماتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ اس مرحلے سے گزرنے کے لیے بار بار ہدایات دی جاتی ہیں مثلاً ایک جامع ہدایت یہ آئی کہ خُذِ الْعَصَا وَأَمْرٌ بِالْعُصْفِ دَاعِرِمْ عَنْ الْجَاهِلِينَ۔ (الاعراف - ۱۹۹) یعنی اعصاب کو جھنجھوڑ دینے والے اور دل دجگر کو چھید ڈالنے والے اس دور کے لیے آنحضرتؐ کو تین تقاضوں کا پابند کر دیا گیا۔ ایک یہ کہ بد زبانوں سے بے نیازی کا طریقہ اختیار کیا جائیگا دوسرے یہ کہ حق بات کہنے کی ذمہ داری ہر حال میں پوری کی جائے گی۔ تیسرے یہ کہ کمینہ اور بد اخلاق اور جہالت زدہ اشخاص کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں۔

اور قرآن اور تاریخ دونوں گواہ ہیں کہ آنحضرتؐ نے ان ہدایات کی مدد سے بال برابر تجارز کیے بغیر یہ پورا دور گزار دیا۔ اپنی جان گھلائی اور اپنے سینے میں گھٹن محسوس کی (فَلَمَّا آتَتْكُمْ بَنَاتُهُنَّ وَقُنَّ لِيْنَہُنَّ) لیکن نہ اپنی زبان میں کوئی بگاڑ آنے دیا۔ نہ اپنے داعیانہ کردار کی بلندی میں فرق آنے دیا۔ نہ استدلال کی سنجیدگی میں کمی گوارا کی! — خدا کی رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں آپ کی روح پر انوار اور آپ کے متبعین پر! یوں ان کٹ جھتیوں میں جہاں کہیں کوئی استدلال — خواہ وہ تیسرے درجے کا کیوں نہ ہو — پایا گیا۔ اس کا آپ کی زبان سے وحی الہی نے پورا پورا قلع قمع کر کے چھوڑا۔

**دلائل :-**

استہزاء، دشنام طرازیوں اور کٹ جھتیوں کے حملوں کے دوران میں کبھی کبھی قریش کو سوچ بچار سے کوئی عقلی قسم کی دیں بھی ہاتھ آجاتی تھی۔ مگر ایسے عقل استدلال کا مناسب پورے سنگاثر مخالفت میں نے میں نمک کا سا تناسب رکھتا تھا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ایک بات وہ یہ کہتے تھے کہ ہم کب بتوں کو خداوند تعالیٰ کے مقام پر رکھتے ہیں ہم تو نہ فہم نہ کھتے ہیں کہ یہ جن بزرگوں کی ارواح کے مظہر ہیں وہ اللہ کے دربار میں ہمارے لیے سفارش کرنے والے ہیں دوران

بتوں کے آگے سجدہ و قربانی کر کے ہم صرف اللہ کے حضور تقرب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اسی طرح ایک بات وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارے نزدیک زندگی صرف اسی دنیا کی زندگی ہے کوئی اور عالم پیش آنے والا نہیں ہے اور نہ ہمیں دوبارہ زندہ کیا جانے والا ہے، پھر آخر ہم ایک ایسے دین کو کیونکر تسلیم کریں جو کسی دوسری دنیا کا تصور دلا کر اس دنیا کے مفاد اور اس کی دلچسپیوں سے ہمیں محروم کرنا چاہتا ہے۔

اسی طرح ایک بات وہ یہ کہتے تھے کہ اگر ہم دعوتِ محمدی کو مان لیں اور موجودہ مذہبی و معاشرتی نظام کو ٹوٹ جانے دیں اور اپنے قائم شدہ تسلط کو اٹھالیں تو پھر تو ہمیں سے ایک ایک شخص کو دن دھاڑے چن چن کر اچک لیا جائے گا نَتَّخَطَّطُ مِنْ أَرْضِنَا (القصص ۵۷)

یہ دو تین مثالیں اس امر واقعہ کو عرض کرنے کے لیے مجھلائے لی گئی ہیں، کہ شرارتوں اور خباثیوں کے بیچ بیچ میں وہ کچھ نہ کچھ دلیل بازی بھی کرتے جاتے تھے لیکن اس دلیل بازی کا تار تار قرآن الگ کر کے دکھا دیتا تھا اور اس کی ہر موقع پر دھجیاں اڑتی رہتی تھیں۔

## غندہ گردی :-

استہزا، انقباط طرازی اور گالم گلوچ کی یہ مہم قریش کے بنون، مخالفت کے تیز ہونے کے ساتھ ساتھ غندہ گردی کا رنگ اختیار کرتی چلی جا رہی تھی۔ منفی شرارت کے علمبردار جب تضحیک و دشنام کو ناکام ہوتے دیکھتے ہیں تو پھر ان کا اگلا قدم ہمیشہ غندہ گردی ہوتا ہے۔ مکہ والوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کے لیے وہ کمینہ حرکتیں کی ہیں کہ صاحب رسالت کے علاوہ کوئی اور داعی ہوتا تو بڑی سے بڑی اولوالعزمی کے باوجود اس کی ہمت ٹوٹ جاتی اور وہ قوم سے مایوس ہو کر بیٹھ جاتا۔ لیکن رسول خدا کی شرافت اور سنجیدگی غندہ گردی کے پڑھے ہوئے دریا میں سے بھی پاکی دامن کو کنول کی طرح صحیح سلامت لیے آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ حرکات جو بالکل روزمرہ کا معمول بن گئیں یہ تھیں کہ آپ کے محلہ دار پڑوسی جو بڑے بڑے سردار تھے بڑے اہتمام سے آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتے تھے۔ نماز پڑھتے وقت شور مچاتے اور سنسی اڑاتے، عین حالتِ سجدہ میں اوجھڑیاں لاکے ڈالتے، چادر کو لپیٹ لپیٹ کر گلا گھونٹتے، محلے کے لونڈوں کو پیچھے لگا دیتے کہ تا بیاں پیش اور غوغا کریں۔ قرآن پڑھنے کی حالت میں آپ کو اور قرآن کو اور خدا تعالیٰ کو گالیاں دیتے۔

اس معاملے میں ابولہب کے ساتھ ساتھ بیگم ابولہب بہت پیش پیش تھی۔ وہ بلا ناغہ کئی سال تک

آپ کے راستے میں غلاطت اور کوڑا کرکٹ اور کانٹے جمع کر کے ڈالا کرتی تھی۔ اور آنحضرتؐ روزانہ بڑی محنت سے راستہ صاف کرتے۔ آپ کو اس کج بخت نے اس درجہ پریشان رکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تسکین کے لیے یہ خوشخبری سنائی کہ مخالف محاذ کی اس لیڈرہ کے شوہر نامدار کے ایذا رساں ہاتھ ٹوٹ جانے والے ہیں۔ اور خود یہ بیگم صاحبہ بھی دوزخ کے حوالے ہونے والی ہیں۔

ایک مرتبہ حرم میں خدا کا رسولؐ مصروفِ نماز تھا کہ عقبہ بن معیط نے چادر آپ کے گلے میں ڈالی اور اسے خوب مروڑ کر گلا گھونٹا۔ یہاں تک کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ اسی شخص نے ایک مرتبہ حالتِ نماز میں آپ پر اوجھ بھی ڈالی تھی۔

ایک مرتبہ آپ راستہ چلتے جا رہے تھے کہ کسی شقی نے سر پر مٹی ڈال دی، اسی حالت میں یہ مجسمہ صبر و استقامت چپ چاپ گھر پہنچا۔ معصوم بچی فاطمہؑ نے دیکھا تو آپ کا سر دھوتی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ مارے غم کے روتی جاتی تھیں۔ آپ نے اس ننھی سی جان کو تسلی دی کہ جان پارر! روؤ نہیں۔ خدا تیرے باپ کو بچائے گا۔

ایک اور مرتبہ آپ حرم میں مصروفِ نماز تھے کہ ابو جہل اور چند اور رؤسائے قریش کو توجہ ہوتی۔ ابو جہل کہنے لگا: کاش اس وقت کوئی جانا اور اونٹ کی اوجھ نجاست سمیت اٹھاتا۔ تاکہ جب محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں جاتا تو اس کی گردن پر ڈال دیتا۔ عقبہ نے کہا کہ یہ خدمت انجام دینے کے لیے بندہ حاضر ہے۔ اوجھ لائی گئی۔ ان بزرگوں کے ذوقِ عنڈہ گردی نے واقعی اسے آپ کے اوپر حالتِ سجدہ میں ڈال کر دم لیا۔ اب ٹھٹھے مار مار کر ہنسی اڑانی جا رہی تھی۔ حضرت فاطمہؑ کو اطلاع ہوئی تو آپ دوڑی آئیں اور پاکباز باپ کی معصوم بچی نے وہ سارا بارِ غلاطت آپ کے اوپر سے ہٹایا ساتھ ساتھ عقبہ کو بد دعائیں بھی دیتی جاتی تھیں۔

یہ تھا جواب اس خیر خواہانہ نصیحت کا کہ ایک خدا کو مانو، راستی اور انصاف پر چلو، یتیموں اور مسافروں کی سرپرستی کرو!

کانٹے بچھا کر چاہا گیا کہ تحریکِ حق کا راستہ رک جائے!

گندگی پھینک کر کوشش کی گئی کہ توحید اور حسنِ اخلاق کے پیغام کی پاکیزگی کو ختم کر دیا جائے۔ آنحضرتؐ کو بوجھ تلے دبا کر یہ توقع کی گئی کہ بس اب سچائی سر نہ اٹھاسکے گی۔

۱۔ سیرت ابنی۔ علامہ شبلی جلد ۱ ص ۱۶۲

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً ص ۱۸۶



آپ کا گلا کھونٹ کر یہ خیال کیا گیا کہ بس اب وحی الہی کی آواز بند ہو جائے گی۔ کانٹوں سے جس کی تواضع کی گئی وہ برابر پھول برساتا رہا! گندگی جس کے اوپر اچھالی گئی وہ معاشرے پر مسلسل مشک و عنبر چھڑکتا رہا! جس پر بوجھ ڈالے گئے وہ انسانیت کے کندھے سے باطل کے بوجھ متواتر اتارتا رہا۔ جس کی گردن گھونٹی گئی، وہ تہذیب کی گردن کو رسمیات کے پھندوں سے نجات دلانے میں مصروف رہا۔

غندہ گردی ایک ثانیہ کے لیے بھی ٹھوس شرافت کا راستہ نہ روک سکی! — اور شرافت اگر واقعہ میں ٹھوس اور عزیمت مند ہو تو تاریخ انسانی کے اٹل قوانین مقابلے میں آنے والی شدید سے شدید غندہ گردی کا سر نیوٹا دیتے ہیں۔

## حمایتوں کو توڑنے کی کوششیں :

دعوتِ حق کے مخالفین جب پانی سر سے گزرتا دیکھتے ہیں تو ایک مہم یہ شروع کرتے ہیں۔ کہ تحریک یا اس کے قائد اور علمبرداروں کو سوسائٹی میں ہر قسم کی موثر حمایت و ہمدردی سے محروم کر دیا جائے۔ براہ راست اثر نہ ڈالا جاسکے تو بالواسطہ طریق سے دباؤ ڈال کر تبدیلی کے سپاہیوں کو بے بس کر دیا جائے۔

اہل مکہ آنحضرتؐ پر ہاتھ صاف کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ڈرتے اس بات سے تھے کہ قبائلی عصبیت کے تحت خوزیری کی ایسی آگ بھڑک اُٹھے گی کہ کسی کے روکے نہ رک سکے گی اور ماضی قریب میں ایک ہمہ گیر جنگ ان کو ایسا جھنجھوڑ چکی تھی کہ وہ ایسی ایک اور جنگ کے لیے تیار نہ تھے۔ بیچ میں ایک بیچ اور بھی آ پڑا تھا۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان پرانی رقابت تھی۔ بنو امیہ کے سردار۔ بالخصوص ابولسب ہرگز اس کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ بنو ہاشم کے گھرانے کے ایک شخص کی نبوت چلے اور اس طرح ان کا سکھ روال ہو جائے۔ چنانچہ بنو ہاشم نے ایک دوبارہ یہ ارادہ کیا بھی کہ محمدؐ ہمارے ہیں اور ان کی بڑائی اور ان کے دین کا فروغ ہمارے ہی لیے موجب خیر و برکت ہوگا۔ لہذا کیوں نہ ہم کھل کر ساتھ دیں مگر بنو امیہ کے لیڈروں نے ان کو اس ارادے سے ہمیشہ باز رکھنے پر زور صرف کیا۔ بنو ہاشم مثبت طور پر تو کچھ نہ کر سکے۔ لیکن ان کے ایک فرد پر ہاتھ اٹھانا بہر حال سہل نہ تھا، تاوقتیکہ وہ اس کو اپنے دائرہ سے نکال نہ دیں! ادھر داعیِ حق اپنے چچا ابوطالب کی سرپرستی میں تھا اور یہ سرپرستی جب تک قائم تھی گویا پورے ہاشمی قبیلہ کی عصبیت آنحضرتؐ کے ساتھ تھی۔ مخالفین دعوت نے اب پورا زور اس بات پر صرف کر دیا کہ کسی طرح ابوطالب پر دباؤ ڈال کر آنحضرتؐ کو اس کی سرپرستی سے محروم کر دیا جائے، دباؤ ڈالنے کا یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ مگر مخالفین کو ہر بار ناکامی ہوئی۔

ربیعہ کے دونوں بیٹے غنہ اور شیبہ، ابوسفیان بن حرب، ابوالبختری، اسود بن عبدالمطلب، ابوہریر

ولید بن المغیرہ، حجاج بن عامر کے دونوں بیٹے بنیۃ اور منبۃ اور عاص بن وائل جیسے اکابرین کا ایک زوردار وفد آنحضرت کے چچا کے پاس پہنچتا ہے۔ یہ لوگ اپنا مدعا یوں بیان کرتے ہیں :

”اے ابوطالب! تیرا بھتیجا ہمارے خدادندوں اور ٹھاگردوں کو گالیاں دیتا ہے ہمارے مذہب میں عیب چھانٹتا ہے، ہمارے بزرگوں کو احمق کہتا ہے اور ہمارے اسلاف کو گمراہ شمار کرتا ہے، اب یا تو تم اس کو ہمارے خلاف ایسی زیادتیاں کرنے سے روکو، یا ہمارے اور اس کے درمیان سے تم نکل جاؤ۔ کیونکہ تم بھی (عقیدہ و مسلک کے لحاظ سے) ہماری طرح اس کے خلاف ہو۔ اس کی جگہ ہم تمہارے لیے کافی ہوں گے“

ابوطالب نے ساری گفتگو ٹھنڈے دل سے سنی اور نرمی سے سمجھا سمجھا کر معائنہ مال دیا۔ اور وفد کو رخصت کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بدستور اپنے مشن کی خدمت میں لگے رہے۔ درقریش پیچ و تاب کھاتے رہے، اہل وفد کی اس تقریر کو غور سے پڑھیے اس میں بڑی گہری جذباتیت پائی جاتی ہے۔ اس میں بڑی زوردار اپیل ہے اور خاص بات یہ کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ مخالفین حق نے عوامی ماحول میں اشتعال پیدا کرنے کا خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ ایسے نعرے اور الزامات بہم پہنچا دیے تھے کہ جنہیں سنتے ہی عام لوگ آپ سے باہر ہو جائیں اور رسول اللہ کے خلاف ایک حالت اشتعال میں مبتلا ہو جائیں۔ تاریخ مذہبیات میں جب کبھی حق کے خلاف محاذ کھڑا کیا گیا ہے تو لوگوں میں اشتعال پیدا کرنے کے چند مغالطہ آمیز تاثرات ان کو ضرور دیے گئے ہیں۔

ایک یہ کہ تمہاری عقیدتوں کو مجروح کیا جا رہا ہے اور تمہارے محبوبوں کو گالیاں دی جا رہی ہیں۔ دوسرے یہ کہ قدیمی اور باقی مذہبیت میں نقائص چیلنے جا رہے ہیں۔

تیسرے یہ کہ بزرگوں اور اسلاف کی توہین کی جا رہی ہے؛

اشتعال پیدا کرنے کے یہ حربے تھے جن کو مکہ کے کفار و مشرکین میدان میں لاکھے تھے۔ آنحضرت

کے الہامی پیغام میں اگرچہ کبھی معبودان قریش کو گالی نہیں دی گئی، لیکن ان کو معبود بنانے کے خلاف جو کچھ استدلال کیا گیا وہ پروپیگنڈے کے رنگ میں رنگ کر گالیوں کا عنوان قرار دیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کے سامنے ان بزرگوں اور اسلاف کی توہین نہیں کی۔ صرف یہ کہا کہ کسی چیز کو محض اس بنا پر سینے سے لگائے رکھنا کہ وہ پہلے سے چلی آرہی ہے کوئی معقول روش نہیں ہے۔ لیکن برگمانی کے

تیزاب میں غوطہ کھنا کر یہ چیز تو ہیں اسلاف کے نعرے میں ڈھل گئی۔ اسی طرح آنحضرتؐ نے توحید کی صداقت اور شرک کے بطلان میں جو جو کچھ استدلال کیا۔ اور مخالفین ہی کی طرف سے سوالات و جوابات اٹھائے جانے پر مردہ مذہبیت کے بارے میں جو جو تبصرہ کیا وہ قدیمی مذہبیت میں عیب چھانٹنے کے الزام کی بنیاد بنا۔

لیجیے، ایک اور وفد آتا ہے۔ پھر وہی روزا رو یا جاتا ہے۔

”اے ابوطالب! تم ہمارے درمیان عمر اشرف اور قدر و قیمت کے لحاظ سے ایک بڑا درجہ رکھتے ہو۔ ہم نے مطالبہ کیا تھا کہ اپنے بھتیجے سے ہمیں بچاؤ لیکن تم نے یہ نہیں کیا۔ اور خدا کی قسم، جس طرح ہمارے باپ دادا کو گالیاں دی جا رہی ہیں، جس طرح ہمارے بزرگوں کو احمق قرار دیا جا رہا ہے اور جس طرح ہمارے معبودوں پر حرف گیری کی جا رہی ہے، اسے ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ — الا آنکہ تم اسے باز رکھو یا پھر ہم اس سے بھی اور تم سے بھی لڑیں گے۔ یہاں تک کہ ایک فریق کا خاتمہ ہو جائے“

ابوطالب نے آنحضرتؐ کو بلایا اور سارا ماجرا بیان کیا۔ پھر لجاجت سے کہا کہ بھتیجے! مجھ پر ایسا بوجھ نہ ڈالو جس کا اٹھانا میرے بس سے باہر ہو۔ اب ایسی سورت آگئی تھی، کہ پاؤں جمانے کے لیے سہلے کا جو ایک پتھر حاصل تھا وہ بھی منتشر نزل ہوا جاتا تھا۔ بظاہر تحریک کے لیے انتہائی خطرناک لہم آگیا تھا، لیکن دوسری طرف دیکھیے اس جذبہ سادقہ اور اس عزیمت مجاہدانہ کو کہ جس سے سرشار ہو کر آنحضرتؐ یہ جواب دیتے ہیں :-

”چچا جان! خدا کی قسم۔ یہ لوگ اگر میرے دائیں ہاتھ پر سوج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ کر چاہیں کہ اس مشن کو چھوڑ دوں، تو میں اس سے باز نہیں آسکتا۔ یہاں تک کہ یا تو اللہ تعالیٰ اس مشن کو غالب کر دے یا میں اسی جدوجہد میں ختم ہو جاؤں“

یہاں وہ اصلی طاقت بول رہی ہے جو تاریخ کو الٹ پلٹ کے رکھ دیتی ہے اور مزاحمتوں اور شرارتوں کو کچلتی ہوئی اپنے نصب العین تک جا پہنچتی ہے، افسوس کہ قریش اسی طاقت کا راز نہ پاسکے! ابوطالب اسی طاقت کی سحر آفرینی سے متاثر ہو کر کہتے ہیں کہ ”بھتیجے! جاؤ جو کچھ تمہیں پسند ہے اس کی دعوت دو، میں کسی چیز کی وجہ سے تم کو نہیں چھوڑوں گا“

۱۔ سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۱۰۸

۲۔ ایضاً ص ۲۷۸

ایک اور وفد عمارہ بن ولید کو ساتھ لے کر پھر آنا ہے۔ ابکی یہ لوگ ایک اور ہی منسوبے کے ساتھ آتے ہیں۔ ابوطالب سے کہتے ہیں کہ دیکھیے یہ عمارہ بن ولید ہے جو قریش میں سے ایک منسوبے اور خوبصورت ترین جوان ہے، اسے لے بیجیے۔ اس کی عقل اور اس کی طاقت آپ کے کام آئے گی اسے اپنا بیٹا بنا لیجیے اور اس کے عوض میں محمدؐ کو ہمارے حوالے کر دیجیے۔ جس نے کہ آپ کے اور آپ کے اہل بیت کے دین کی مخالفت شروع کر رکھی ہے۔ اور آپ کی قوم کا شیرازہ درہم برہم کر دیا ہے۔ اور ان کے بزرگوں کو احمق ٹھہرایا ہے اسے ہم قتل کر دینا چاہتے ہیں۔ سیدھا سیدھا ایک اکو می کے بدلے میں ہم ایک آدمی آپ کو دیتے ہیں یہ

دیکھیے خدا ان لوگوں کا طرز فکر! گویا محمدؐ جیسی عظیم ہستی کوئی مال تجارت بنی رکھی تھی، کوئی جنس تبادلہ تھی اور ابوطالب آپ کے چچا نہ تھے کوئی سوداگر تھے۔ وفد کی گفتگو سن کر یقیناً ابوطالب کے جذبات پر بڑی چوٹ لگی۔ اور کہا کہ تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ تمہارے بیٹے کو تو میں لے کر پاؤں پوسوں میرے بیٹے کو تم لے کر تلوار کے نیچے سے گزار دو۔ اب تک ایسا نہیں ہو سکتا۔ معاملہ بڑھ گیا۔ کشمکش کی فضا گرم تر ہوئی اور خود وفد کے اتفاق رائے کا رشتہ ٹوٹ گیا۔

اب قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء پر سختیاں کرنے کے لیے ن تمام قبائل کو اکٹھا کرنا شروع کیا جن میں تحریک اسلامی کا کوئی فرد پایا جاتا تھا۔ ظلم ڈھائے جانے لگے، اسلام سے ہٹانے کے لیے استبداد سے کام لیا جانے لگا۔ لیکن اللہ نے اپنے رسولؐ کو ابوطالب کی اڑکھڑوں کر کے بچا رکھا۔ ابوطالب کے قریش کے بگڑے تمور دیکھ کر بنو ہاشم اور بنو مطلب کے سامنے آنحضرت کی پشت پناہی کے لیے اپیل کی۔ لوگ جمع ہوئے اور حمایت محمدؐ کے لیے تیار ہو گئے۔ مگر ابولہب نے سخت مخالفت کی اور بات طے نہ ہو سکی۔

آگے چل کے جب تحریک حق نے مخالفین کی صفوں میں سے حمزہ اور عمر جیسی دو ہستیاں چن لیں تو بیچ و تاب کی نئی لہر اٹھی۔ محسوس کیا گیا کہ محمدؐ کی چلائی ہوئی ہوا تو اب، گھس گھس میں گدست پاش ہو رہی ہے کچھ کرنا چاہیے۔ ابوطالب کی بیماری کی حالت میں یہ لوگ پھر پہنچے۔ ابکی سنیہ یہ تھی کہ معاہدہ ہو جائے وفد نے کہا کہ جو کچھ صورت حالات ہے اسے آپ جانتے ہیں، اپنے بھتیجے کو ہوا بیٹے، اس کے بارے میں ہم سے عہد لیجیے اور ہمارے بارے میں اس کا عہد دلوائیے۔ وہ ہم سے باز رہے ہم اس سے باز رہیں۔ وہ ہم

سے اور ہمارے مذہب سے واسطہ نہ رکھے، ہم اس سے اور اس کے مذہب سے واسطہ نہیں رکھیں گے۔  
 ۔۔ ایک جوائے جاتے ہیں، بات ہوتی ہے اور آپ سارا مطالبہ سننے کے بعد جواب دیتے ہیں،  
 کلمۃ واحداۃ تعطونہا تمذکون بہا العرب، وتدین بکربہا العجم، یعنی اے اشراف  
 قریش میرے اس ایک کلمہ کو مان لو تو پھر عرب و عجم سب تمہارے زیر نگیں ہوں گے۔

ذرا تصور میں لائیے! جان لیوا ماحول کو، کلبداتی ہوئی شرارتوں اور مخالفتوں سے بھری ہوئی  
 فضا کو، اور پھر سوچیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دعوت کے زور اور اس کے ممکنات کا کتنا  
 گہرا شعور و یقین تھا، گویا اندھیری رات میں کھڑے آپ قطعیت سے فرما رہے تھے کہ ابھی سورج  
 نکلنے والا ہے۔ پھر یہ نوٹ کیجیے کہ اپنے کلمہ کا صرف مذہبی نہیں بلکہ سیاسی و اجتماعی پہلو آپ  
 کے سامنے تھا۔

ابو جہل نے تنک کر کہا: ”ہاں! تیرے باپ کی قسم! ایک کیوں، دس کلمے چلیں گے!“  
 کوئی دوسرا بولا: ”یہ شخص تو خدا کی قسم تمہاری مرضی کی کوئی بات مان کر دینے کا نہیں ہے۔“  
 اس کے بعد یہ لوگ بالوس ہو کر چلے گئے۔ لیکن اس وفد کی گفتگو نے چند حقیقتوں کو نمایاں  
 کر دیا۔ ایک یہ کہ اب تحریک اسلامی کو وہ ایک ایسی طاقت ماننے پر مجبور ہو گئے تھے جس کو اکیڑنے  
 کی سبھی راہگاہ سے زیادہ بہتر سمجھوتہ کی کوئی راہ نکالنا تھا، دوسرے یہ کہ قریش ساری شرارتوں اور  
 زیادتیوں کو آزمانے کے بعد اب اپنی بے بسی کو محسوس کر رہے تھے۔

یہ تو وہ معاملہ تھا جو داعی تحریک صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھا۔ آپ کے رفقاء میں سے بھی  
 جو کوئی کسی کے سایہ حمایت میں تھا، اسے بھی اس حمایت سے محروم کرانے کی مساعی اسی طرح کی گئیں۔  
 مثلاً حضرت ابوسلمہ بھی ابوطالب کی امان میں تھے۔ بنو مخزوم کے لوگ آئے اور انہوں نے  
 کہا۔ اے ابوطالب! تم نے بھتیجے کو تو خیر ہمارے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اب تو معاملہ  
 خود ہمارے اپنے آدمی کا ہے اس کو روکنے کا تمہیں کیا حق ہے؟ ابوطالب کہنے لگے کہ وہ میرا بھانجا  
 ہے اور اس نے میری حمایت طلب کی ہے۔ تم اس پر زیادتی کرتے ہو اور ظلم ڈھانے سے کسی لمحے باز  
 نہیں آتے، خدا کی قسم، یا تو تم لوگ اس سے باز ہو ورنہ جہاں یہ کھڑا ہو گا ہم اس کی حمایت میں اٹھ  
 کھڑے ہوں گے۔

اسی طرح ہجرت حبشہ کے بعد ایک بار حضرت ابو بکرؓ مکہ کی گھٹن سے تنگ آ کر نکل کھڑے ہوئے، کچھ دور پہنچے تھے کہ ابنُ الدُّغْنَه سے ملاقات ہوئی، پوچھنے پر اسے جب آپ کے ارادہ آبرئہ کا حال معلوم ہوا تو اس نے کہا۔ کہ آپ جیسے آدمی کا یوں نکل جانا مجھے گوارا نہیں جو مسیبتوں میں قرابت داروں کے کام آتا ہے، بھوکوں کو کھانا اور ننگوں کو لباس ہم پہنچاتا ہے، نیک کام کرتا ہے اور دوسروں کو کماتا دیتا ہے، اپنی امان میں وہ حضرت صدیق کو واپس لے آیا۔ اور قریش کے سامنے اعلان کر دیا کہ ابو بکرؓ میری حفاظت میں ہیں۔ آپ کا معمول ہو گیا کہ اپنی مسجد میں جو گھر کے دروازے کے سامنے بتا رکھی تھی بڑی خوش الحانی سے قرآن پڑھا کرتے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے، اس سے ہر سننے والے پر اثر پڑتا تھا۔ قریش ابن الدُّغْنَه کے پاس پہنچے اور فریاد کی کہ تم نے ابو بکرؓ کو پناہ کیا دی، ہماری تو شامت آگئی ہے، وہ خوش الحانی سے قرآن پڑھتے ہیں اور ہماری عورتیں اور بچے اور کمزور طبیعت کے لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ تم پناہ اٹھا لو تو وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر جو چاہیں کریں۔ ابن الدُّغْنَه نے اس دباؤ کے زیر اثر آپ سے آکر کہہ کیا کہ میں نے پناہ اس لیے تو نہیں دی تھی کہ آپ لوگوں کو تاشیں۔ آپ نے پناہ دیس کر دی ہے۔

### منظم منفی محاذ:

انسانِ اعظم (صلی اللہ علیہ وسلم) اولادِ آدم کی جس سب سے بڑی خدمت میں مصروف تھا، اس کو ناکام بنانے کے لیے مخالفین جن مختلف تدبیروں سے کام لے رہے تھے ان سب کے علی الرغم دعوت کا کام جاری تھا، اور کلمہ حق کو نپلیں نکال رہا تھا۔ اندریں حالات مخالفانہ پروپیگنڈہ کی ایک متحرک مشینری پیدا کی گئی۔ مکہ کے بعض قائدین اعلیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے لگے بڑی پیچیدگی یہ تھی کہ مکہ مرکز عرب تھا اور ہر طرف سے قافلے آنے جاتے اور داعی حق کے لیے کام کانت یا میدان فرہم کرتے۔ سردارانِ مکہ کی جو دھونس خود باشندگانِ مکہ پر چاتی تھی وہ باہر سے آنے والوں پر نہیں چل سکتی تھی۔ نیز لو واردوں میں ایسے ذہین اور صاف فطرت لوگ بھی ہوتے تھے جو کسی دعوت کو محض اس کی استدلالی قدر و قیمت اور کسی داعی کو محض اس کے کرداری وزن کے لحاظ سے جانچ کر بغیر کسی تعصب اور بغیر کسی تاریخ عناد کی پرچھا میں قبول کیے آزادانہ رائے قائم کر سکتے تھے۔ تحریکِ محمدی کے خلاف ان کے دلوں میں کوئی حاسدانہ چھالے موجود نہیں تھے۔ اندریں حالات مکہ کو بچا لینا بالکل بے کار تھا۔

جب کہ باہر کا عربی ماحول دعوتِ حق سے متاثر ہوتا چلا جائے۔ وہی بات جسے قرآن نے خود ہی کہہ دیا کہ ”ذَهْنٌ شَاتِي الدَّرَنَى نَنْقُصُ مِنْ اطْوَا فِيهَا“ چنانچہ سب سے تشویش ناک موقع اس پہلو کے لحاظ سے حج کا تھا۔ قبائل عرب جوق در جوق مع اپنے سرداروں کے مکہ میں اکٹھے ہوتے اور نبی اکرم اپنا پیغام پھیلانے کے لیے خیمہ بہ خیمہ گردش میں مصروف ہو جاتے۔ ردِ عملی منفی ہنگامہ کے سربراہ کار اس وقت بہت سٹپٹاتے۔ چنانچہ ایک سال موسم حج کی آمد آمد تھی۔ کہ ولید بن مغیرہ کے ہاں قریشیان کرام جمع ہوئے اور سر جوڑ کر سوچ بچار میں مصروف ہو گئے۔ ولید نے معاملہ کو یوں چھیڑا :-

”اے گردہ قریش! یہ موسم آپہنچا ہے، عرب کے وفود اس زمانے میں تمہارے ہاں آئیں گے، اور صورتِ حالات یہ ہے کہ وہ سب تمہارے اس آدمی (نبی اکرم) کا قصہ سن چکے ہیں (اس لیے وہ ایک ذوقِ تجسس و تحقیق لے کر آئیں گے) سو اب تم اس معاملہ میں کوئی ایک بات طے کر لو، اور پھر باہم اختلاف نہ کرو کہ ایک دوسرے کو جھٹلاتا پھرے اور دوسرا پہلے کی بات کاٹتا رہے“

حاضرین نے کہا :-

”تم ہی کہو اے ابو عبید شمس! کہو اور ہمارے لیے کوئی رائے متعین کر دو۔ ہم اسی کے مطابق

بات کریں گے“

مگر ولید بن مغیرہ نے اصرار کیا کہ آپ لوگ خود ہی بات کریں میں سنوں گا۔ سوسلسلہ گفتگو

چل پڑا۔

حاضرین :- ”ہم تو کہتے ہیں کہ وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کاہن ہے!“

ولید :- ”نہیں خدا کی قسم وہ کاہن نہیں ہے۔ ہم نے کاہنوں کو دیکھا ہے۔ سو اس کے ہاں

نہ تو کاہنوں کا سارمز یہ کلام ہے نہ قافیہ آرائی“

حاضرین :- ”تو پھر ہم کہیں گے کہ وہ آسیب زدہ ہے“

ولید :- ”وہ آسیب زدہ بھی نہیں ہے، ہم آسیب کو جانتے پہچانتے ہیں مگر یہاں نہ تو اس

طرح سے حلق کی گھٹن ہے، نہ اعضا میں رعشہ، نہ ویسی پریشان خیالی!“

حاضرین :- ”اچھا تو پھر ہم یہ کہیں گے کہ وہ شاعر ہے“

ولید : ” وہ شاعر بھی تو نہیں ہے ! ہم شعر کو اس کی ہر قسم کے لحاظ سے جانتے ہیں۔ اس میں سے رجز کو، ہزج کو، قریض کو مقبوض کو، مبسوط کو، بحروں کے لحاظ سے اقسام شعر، سووہ (صلی اللہ علیہ وسلم) شاعر نہیں ہے۔“

حاضرین :- تو پھر ہم کہتے ہیں کہ وہ جادوگر ہے :

ولید :- ”جی نہیں، وہ جادوگر بھی نہیں ! ہم نے جادوگروں کو بھی اور ان کے جادو کو بھی دیکھ رکھا ہے۔ سو اس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاں نہ گنڈے ہیں نہ پھونکیں !“

حاضرین : ”تو پھر ابو عبد شمس ! تمہی بتاؤ کہ ہم اس کے خدث (پروپیگنڈہ کا طوفان اٹھانے کے لیے) کہیں کیا ؟“

ولید :- خدا کی قسم ! اس کی بات میں بڑی مٹھاس ہے۔ اور اس بات کی جڑ بڑا پھیدو دیکھتی ہے اس کی شاخیں بار بار ہیں، ”مترک کی روایت میں اتنا اور آتا ہے کہ یہ پیغام غالب ہوگا۔ اسے منسوب نہیں کیا جاسکے گا۔ اور یہ سب کو کچل ڈالے گا۔ اپنی کہی ہوئی باتوں میں سے تم جو بھی کہو گے۔ یعنی نرا دی جائے گی بس اس کے بارے میں ان میں سے کتنی سوتی بات ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ تم کہو کہ یہ ایک جادوگر ہے جس کا کلام جادو ہے اور اس سے بیٹے اور باپ ہیں، شوہر اور بیوی ہیں، بھائی اور بھائی ہیں، ایک شخص اور اس کے بیٹے ہیں بڑی ڈالی جا رہی ہے (اشارہ ہے دعوتِ حق کی طرف) کہ اس کی وجہ سے ہر طرف پھوٹ پڑ گئی ہے۔ درود و تقیات برسر کشمکش ہیں، حالانکہ اس کشمکش کا اصل محرک خود مخالفینِ حق کی شرارت تھی، اور کہو کہ لوگ اسی بنا پر اس سے کٹ گئے ہیں۔“

دیکھیے کہ کس طرح ایک شخص کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کے لیے سازش کی جاتی ہے دل جس بات کو نہیں مانتے، اسی کو لے کر مخالفانہ ہنگامہ جاری رکھنے کی اسکیم بنتی ہے۔ چنانچہ اس مجلس میں صے ہو گیا کہ مختلف پارٹیاں مکہ کو آنے والے راستوں چوکیاں لگاویں۔ اور آنے والے ہر وفد کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کی دعوت کے بارے میں چوکنا کر دیں چنانچہ اسی منسوبہ پر عمل کیا گیا، لیکن نتیجہ اٹا ہوا۔ آنحضرت کا چہرہ چاہے عرب کے کونے کونے تک پھیل گیا۔ اور جن کو کچھ نہیں معلوم تھا ان کو بھی معلوم ہو گیا کہ ایک نئی دعوت ایسی اٹھی ہے۔ اور اس کی علمبردار شخصیت محمد کی ہے۔

۱۔ سیرت المصطفیٰ از مولانا ادیس کا ندر صومی جلد ۱ ص ۱۵۲

۲۔ سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۸۲-۲۸۳



آئیے، ذرا تاریخ کے اسکرین پر داعی حق اور رد عملی تحریک کے لیڈروں کو میدان میں کام کرتے ہوئے دیکھئے!

ربیعہ بن عبادہ کا بیان ہے کہ میں منام میں اپنے باپ کے ساتھ موجود تھا جب کہ میں ایک نوخیز لڑکا تھا۔ اور دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی قبیلوں کی اقامت گاہوں میں جا جا کر رکتے اور فرماتے، "اے بنی فداں! میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں۔ تم سے کہتا ہوں کہ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ اور کسی کو شریک نہ گردانو، اور اس کے علاوہ ان بتوں میں سے جس جس کی بھی عبادت کر رہے ہو اس سے الگ ہو جاؤ اور مجھ پر ایمان لاؤ۔ میری تصدیق کرو، اور میری حمایت کرو، یہاں تک کہ میں اللہ کی طرف سے ساری بات کھول کر رکھ دوں جس کے ساتھ اس نے مجھے مامور کیا ہے۔"

واقعہ کارپورٹر کہتا ہے کہ ایک شخص عدنی حُلہ اورھے آنحضرت کے ساتھ لگا تھا جب رسول اللہ اپنی بات فرما چکے تو یہ شخص اپنی ہانگنا شروع کر دیتا۔ کہ: اے بنی فداں! یہ شخص تم کو لات عزی سے ہٹا کر بدعت و گمراہی کی دعوت کی طرف کھینچ لے جانا چاہتا ہے۔ پس نہ اس کی سنو نہ اس کی بات مانو،

وہ نوجوان یہ منظر دیکھ کر اپنے باپ سے پوچھتا ہے کہ یہ کون ہے جو آنحضرت کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ اور آپ کی بات کی تردید کر رہا ہے۔ جواب ملتا ہے کہ یہ آپ کا اپنا ہی چچا ابو لہب ہے۔ بنی کرم حج کی طرح میلوں کے اجتماعات میں ہی تشریف لے جاتے تھے، تاکہ انسانی اجتماع سے فائدہ اٹھائیں۔ ایک مرتبہ بازارِ ذوالحجہ میں پہنچے اور لوگوں کو حق کا پیغام سنا کر کلمہ طیبہ کی دعوت دی۔ ابو جہل ساتھ لگا تھا۔ کم بخت کو بغض و کینہ نے اتنا پست کر دیا تھا کہ مٹی اٹھا اٹھا کر آپ پر پھینکتا اور ساتھ ساتھ پکارتا کہ لوگو! اس کے فریب میں نہ آنا۔ یہ چاہتا ہے کہ لات و عزی کی پرستش چھوڑ دو۔ مخالفانہ پروپیگنڈہ کی اس طوفانی مہم سے ابوطالب کو تشویش بھی لاحق ہوئی کہ کہیں عرب کے عوام اجتماعی مخالفت پر نہ اتر آئیں۔ انہوں نے ایک طویل قصیدہ لکھ کر کعبہ میں آویزاں کیا جس میں ایک طرف یہ صفائی دی کہ میں نے دعوتِ محمدی کو قبول نہیں کیا، لیکن دوسری طرف یہ اعلان بھی کیا کہ کسی قیمت پر محمد کو نہیں چھوڑ سکتا اور اس کے لیے اپنی جان تک دے دوں گا۔ اگرچہ ایسے اکثر قسائد کی تاریخی حیثیت کمزور ہے تاہم ان میں سے بہت سے اجزا درست بھی ہیں۔

۱۔ سیرت النبی شبلی نعمانی جلد اول ص ۲۳۵

۲۔ سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۸۶

## الٹا اثر :-

جب کبھی کوئی اہم شخصیت مکہ میں وارد ہوتی تو تحریک اسلامی کے مخالفین اس کو رسول اللہ کے اثر سے بچانے کے لیے پورا جتن کرتے، مگر بسا اوقات اثر الٹا پڑتا۔ اس قسم کے چند خاص واقعات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

طفیل بن عمروسی ایک مرد شریف اور ایک شاعر لیب تھا۔ ایک مرتبہ وہ آیا، بعض افراد قریش اس کے پاس پہنچے، کہنے لگے، کہ طفیل! دیکھو تم ہمارے شہر میں آئے ہو اور یہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگرمیاں ہمارے لیے ناقابل برداشت بنی ہوئی ہیں۔ اس شخص نے ہماری دعوت کا شیرازہ بکھیر دیا ہے اور ہمارے مفاد کو ٹکڑے کر دیا ہے۔ اس کی باتیں جادو گروں جیسی ہیں۔ اور یہ بیٹھے ارد باپ ہیں، بھائی اور بھائی میں، شوہر اور بیوی میں جراتی ڈلوا رہا ہے۔ ہمیں تمہارے اور تمہاری قوم کے بارے میں اندیشہ ہے کہ تم کہیں شکار نہ ہو جاؤ۔ پس بہتر یہ ہے کہ اس شخص سے نہ تو بات کرنا اور نہ اس کی کوئی بات سنا۔

طفیل کا اپنا بیان ہے کہ ان لوگوں نے اس وقت تک پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ میں پوری طرح قائل نہ ہو گیا کہ نہ بات کروں گا، نہ سنوں گا، چنانچہ جب میں مسجد حرام کی طرف جاتا تو کانوں میں روٹی ٹھونس لیتا۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کے پاس عبادت میں کھڑے تھے تو میں بھی قریب جا کر کھڑا ہوا۔ میں نے بہت ہی خوب کلام سنا۔ پھر دل میں میں نے کہا کہ میری ماں مجھے رٹے۔ خدا کی قسم میں ایک صاحب عقل آدمی ہوں، شاعر ہوں، بڑے بھلے کی پہچان کر سکتا ہوں۔ پھر کیا چیز مجھے ان باتوں کے سننے سے روک سکتی ہے جنہیں یہ کہتا ہے جو پیغام یہ لایا ہے وہ اگر بھلا ہوگا، تو میں قبول کروں گا۔ اگر بنا ہوگا تو چھوڑ دوں گا۔

اسی سوچ بچار میں کچھ وقت گزر گیا۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوئے، طفیل ساتھ ہو گیا۔ راستے میں سارا قصہ سنایا کہ مجھے پروپیگنڈہ کے کس چکر میں ڈال رکھا گیا ہے۔ پھر مکان پر پہنچ کر درخواست کی کہ اپنا پیغام ارشاد فرمائیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی حقیقت بیان کی اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ طفیل کہتا ہے کہ "خدا کی قسم! نہ اس سے بڑھ کر اچھا کلام میں نے کبھی سنا نہ اس سے بڑھ کر سچا پیغام۔ اور پھر وہ بتاتا ہے کہ میں اسلام لے آیا اور حق کی گواہی دی۔ ان طفیل دوسی نے قبیلہ میں جا کر پرجوش طریق سے دعوت کا کام کیا اور پورا قبیلہ متاثر ہوا۔"

ان کے تبلیغی جوش کا یہ عالم تھا کہ گھر پہنچ کر جوہنی ضعیف العمر والد سے ملاقات ہوئی، کہنے لگے کہ نہ آپ میرے، نہ میں آپ کا! انہوں نے پوچھا بیٹے یہ کیوں؟ جواب دیا، کہ اب میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین قبول کر لیا ہے اور آپ کی پیروی کر لی ہے، والد نے کہا کہ بیٹے! جو تیرا دین ہے وہی میرا بھی ہوگا۔ فوراً ہنا کر اسلام قبول کیا۔ طفیل نے اسی طرح پر اپنی بیوی کو دعوت دی۔ اور اس نے بھی لبیک کہی۔ پھر قبیلہ میں دعوت عام کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں آ کر حضورؐ کی خدمت میں روداد بیان کی۔ اور اپنے قبیلہ کی خرابیاں بیان کر کے دعائے عذاب کی درخواست کی۔ مگر حضورؐ نے ہدایت کی دعا کی۔ اللہ صمد دوسرا طفیل کو تاکید کی کہ واپس جا کر اپنے لوگوں میں دعوت جاری رکھو اور خاص نصیحت کی کہ ان کے ساتھ نرمی برتو۔ (ان کا تشدد آمیز جوش تبلیغ اسلامی حکمت کے مطابق نہ تھا)

ایک اور واقعہ ملاحظہ ہو۔ اعشیٰ بن قیس بھی ایک ممتاز شاعر تھا۔ اس نے رسول اللہ کا چرچا سنا اور اس ارادے سے مکہ کا رخ کیا کہ جا کر اسلام قبول کرے۔ اس نے آنحضرتؐ کی شان میں قصیدہ بھی کہا تھا۔ اب جوہنی یہ مکہ کی حدود میں پہنچا ایک قریشی مشرک نے آگھیرا اور اس کے مقصد کے بارے میں کھوج کرید کی۔ اس نے بتایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ اس پر بات چل پڑی۔ مشرک حیلہ طراز نے اعشیٰ کی دکھتی رگوں کو ٹٹولنے کے لیے کہا کہ دیکھو محمدؐ تو زنا کو حرام ٹھہراتا ہے۔ یہ واراد چھا پڑا تو پھر کہا کہ وہ تو شراب سے بھی روکتا ہے۔ یہاں تک کہ باتوں باتوں میں اعشیٰ کے ارادے کو کمزور کر دیا۔ چنانچہ اس نے یہ منوالیا کہ اس مرتبہ تو تم واپس چلے جاؤ اور لگے برس آ کر اسلام قبول کر لینا۔ اعشیٰ واپس چلا گیا اور قبل اس کے کہ وہ مکہ لوٹتا، بدنصیب کی موت واقع ہو گئی تھی۔

سب سے زیادہ دلچسپ واقعہ مرداراشی کا ہے۔ یہ مکہ آیا۔ ساتھ اونٹ تھا جس کا سودا ابوہبل نے چکا لیا۔ مگر قیمت کی ادائیگی میں لعل کیا۔ اب یہ قریش کے مختلف لوگوں کے پاس گیا کہ اونٹ کی قیمت اسے کوئی دلوادے۔ وہاں ایک مجلس اراستہ تھی۔ اراشی نے اہل مجلس سے پسپائی کی کہ آپ میں سے کوئی میری رقم ابوہبل سے دلوادے، میں ایک مسافر بے وطن ہوں اور میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے اہل مجلس میں سے کسی کو ہرأت نہ تھی کہ وہ ابوہبل سے جا کر ایک مسافر کا حق دلوائیں۔ اس لیے بات ٹالنے

۱۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۰۴ تا ۲۰۹۔

۲۔ یہ ابوہبل ہی تھا۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۱۶۔

۳۔ ایضاً صفحہ ۱۶۔ ۲۱۵۔

یہ اشارہ کر کے کہنے لگے کہ وہ دیکھتے ہو ایک شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) بیٹھا ہے۔ اس کے پاس جاؤ وہ وصولی کرادے گا۔ دراصل یہ ایک طرح کا استہزاء تھا۔ کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ابو جہل کو جو عداوت تھی وہ ظاہر تھی۔ اراشی آنحضرت کے پاس پہنچا اور اپنا ماجرا بیان کر کے مدد طلب کی۔ آنحضرت اٹھے اور فرمایا میرے ساتھ آؤ۔ وہ لوگ دیکھنے لگے کہ اب کیا ہوتا ہے رسول اللہ حرم سے نکل کر ابو جہل کے گھر پر آئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آئی۔ کون ہے؟ فرمایا: محمد! باہر آؤ میرے پاس! ابو جہل نکلا۔ چہرے کا رنگ بالکل اڑا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا۔ اس شخص کا حق اسے دے دو۔ چنانچہ بے چون و چرا ابو جہل نے ادائیگی کر دی۔ اراشی خوش خوش حرم کی اس مجلس کی طرف پلٹا اور واقعہ سنایا۔

یہ اثر تھا اس عظیم کیریکٹر کا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جلوہ گر تھا۔ اس کا اعتراف خود ابو جہل نے کیا۔ اور اہل مجلس سے آکر کہا۔ کہ اس (محمد) نے آکر دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے اس کی آواز سنی۔ اور یہ ایک ایک رعب مجھ پر طاری ہو گیا۔

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس واقعہ کا کتنا بڑا اثر مرد اراشی پر اور خود اہل مکہ پر پڑا ہوگا۔ مہاجرین حبش کے ذریعے اسلام کا پیغام ایک نئے علاقے میں جا پہنچا تو وہاں سے ۲۰ عیسائیوں کا ایک وفد مکہ آیا۔ یہ لوگ مسجد حرم میں آنحضرت کی خدمت میں آئے۔ بیٹھے، بات کی اور سوالات پوچھنے آنحضرت نے قرآن سنایا۔ اور دعوتِ حق پیش کی۔ ان لوگوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اللہ کی پکار کو انہوں نے قبول کیا۔ ایمان لائے۔ اور نبی اکرم کی تصدیق کی۔ جب یہ اٹھ کر نکلے تو باہر قریشی مخالفین مسجد کے گرد منڈلا رہے تھے۔ ابو جہل نے اس گروہ کو نشانہ ملامت بنایا کہ تم بھی کیا احمق لوگ ہو جو اپنے دین کو خیر باد کہہ دیا۔ وفد والوں نے جواب دیا: ”آپ لوگوں کو ہماری طرف سے سلام عرض ہے ہمیں آپ کے سامنے کوئی جھگڑا نہیں کرنا۔ ہمارا راستہ الگ، آپ کا راستہ الگ! ہم اپنے آپ کو ایک بھلائی سے محروم نہیں رکھنا چاہتے۔“

بیعت عقبہ ثانیہ کی ساری کارروائی رات کی تاریکی میں بڑے اہتمامِ اخفا کے ساتھ ان دنوں سے عمل میں لائی گئی تھی کہ اشرار مکہ کی طرف سے سخت مزاحمت تھی۔ اہل وفد جب بیعت کی مجلس سے فارغ ہو کر قیام گاہوں میں پہنچے تو سردارانِ قریش نے ان کو وہاں جا لیا۔ ان کی مخبری کا نظام ایسا مضبوط تھا کہ انہوں نے بیعت کا قصہ بیان کر کے کہا کہ تم ہمارے آدمی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو نکال لینا چاہتے ہو اور اس کے

ہے پر تم نے ہمارے خلاف جنگ کرنے کا پیمانہ باندھا ہے۔ خوب سمجھ لو کہ تم لوگ اگر ہمیں اور اہل عرب کو لڑا دو گے تو تم سے بڑھ کر قابلِ نفرت ہماری نگاہوں میں کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا۔ انصاری نے بات کو چھپانے کی کوشش کی۔ چنانچہ اس وقت تو بات ٹل گئی۔ اور انصاری قافلہ روانہ ہو گیا۔ لیکن قریش بعد میں برابر تحبس میں لگے رہے۔ اور پوری اطلاع پالی۔ انصاری قافلہ کا تعاقب کیا گیا اور سعد بن عبادہ اور منذر ابن عمرو ان کے ہاتھ آگئے۔ یہ دونوں اپنے اپنے قبیلوں پر در ان بیعت میں نعتیہ مقرر ہوئے تھے۔ منذر تو تھے ہی کمزور آدمی سعد بن عبادہ کو قریش نے پکڑ لیا۔ اور ان کے ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ دینے اور گرفتار کر کے مکہ لے گئے مگر پہنچ کر خوب مارا۔ ان کے بال پکڑ کر جھنجھوڑا۔

سعد بن عبادہ کا خود اپنا بیان ہے کہ اسی حالت میں قریش کا ایک آدمی آیا جس کا چہرہ روشن اور وجاہت دار تھا۔ لمبا اور خوب صورت! میں نے دل میں کہا کہ اگر اس قوم میں کوئی خیر باقی ہے تو اس کی توقع اسی شخص سے کی جاسکتی ہے۔ جب وہ قریب آیا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر زور سے مجھے تھپڑ لگایا۔ اب دل میں نے سمجھ لیا کہ اس گروہ میں بھلائی کی کوئی رمت باقی نہیں۔ آخر ایک شخص نے نرمی کے ساتھ پوچھا کہ کیا تمہارا کوئی آدمی قریش میں ایسا نہیں کہ جس سے تمہارا کوئی بھائی چارہ یا کوئی عہد و پیمانہ ہو؟ میں نے جبر بن مطعم اور عمارت بن حرب کے نام لیے۔ اس نے کہا کہ پھر پکارو ان کے نام اور جو تعلق ان کے ساتھ ہے اسے بیان کرو۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہی شخص انہیں ڈھونڈنے نکلا۔ وہ دونوں پاس ہی مل گئے اور انہوں نے آ کر مجھے چھڑایا۔

ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دعوتِ حق کے خلاف ردِ عملی ہنگامہ کے علمبردار کس طرح میدانِ کشمکش میں سرگرم عمل تھے۔

### فتونِ لطیفہ کا محاذ :

اسلام کی مخالفت کی ہم کا ایک سرخیل نصر بن حارث بھی تھا۔ یہ اپنی تجارت کے لیے اکثر فارس جاتا۔ وہاں سے شالانِ عجم کے تاریخی قصص بھی جمع کر لاتا۔ اور ادبی انداز کی کہانیاں بھی۔ چنانچہ اس نے مکہ میں قرآن کے انقلابی ادب کے مقابلے پر عجم کے تفریحی ادب کا اڈہ قائم کیا اور لوگوں کو دعوتِ دنیا کے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عاد و ثمود کے پھیکے قصے کیا سنتے ہو، آڈ میں تم کو رستم و اسفندیار کی سرزمین کی چٹ پٹی کہانیاں سناؤں۔ نصر بن حارث کو ایک مستقل انسانی کردار بنا کر قرآن نے ہمارے سامنے یوں رکھا ہے کہ :-

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ بِغَيْرِ

عَلِمَ وَيَتَّخِذَهَا هُزُوًا - (لقمان - ۶)

اور لوگوں میں ایک کردار ایسا بھی ہے جو دل بہلاوے کے افسانوں کا خریدار ہے تاکہ ان کے ذریعے لوگوں کو اللہ کے راستے سے بغیر سمجھے بوجھے بہکائے اور اس کا مذاق اڑائے۔ یہ نضر بن حارث وہ ہے جس نے ایک مجلس میں ابو جہل کے سامنے دعوتِ محمدی کے مومنوں پر یہ تقریر کی تھی :-

اے گروہِ قریش! تمہارے اُدپر ایک ایسا معاملہ آپڑا ہے کہ آگے چل کر اس کے خلاف تمہارا کوئی جیلہ کار گرنہ ہوگا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے درمیان ایک من مومنا نوخیز لڑکا تھا، تم سب سے بڑھ کر راست گو، تم سب سے بڑھ کر امانت دار! یہاں تک کہ جب اس کی کنپٹیوں میں سفید بال آگئے اور اس نے تمہیں اپنا وہ پیغام دیا تو اب تم کہتے ہو کہ وہ بادو گر ہے..... کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے..... کہتے ہو کہ وہ شاعر ہے..... اور کہتے ہو کہ وہ دیوانہ ہے!..... (ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں ہے)..... اے گروہِ قریش! اپنے موقف پر غور کرو۔ کیونکہ بخدا تمہارے سامنے ایک امرِ عظیم آچکلا ہے "سے

نضر بن حارث کی یہ تقریر بتاتی ہے کہ وہ دعوتِ محمدی کی عظمت کو بھی سمجھتا تھا۔ اور محسنِ انسانیت کے کردار کی رفعت سے بھی آگاہ تھا۔ وہ اپنے ضمیر کو پامال کر کے حضور کے پیغام کی مخالفت کے لیے شیطانی ترکیبیں نکالتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ایک بامقصد تحریک کے سنجیدہ پیغام کے مقابلے میں عام لوگوں کے لیے تفریحی ادب میں زیادہ کشش ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس نے تفریحی ادب کے ایک مکتب کی ابتدا کر دی۔ نضر بن حارث کہا کرتا تھا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ دلچسپ کہانیاں پیش کرتا ہوں۔ پھر جب وہ عجمی داستانیں بیان کرتا تو کہتا کہ آخر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی باتیں کس پہلو سے میری باتوں سے زیادہ خوش آئند ہیں۔ دوسری طرف وہ حضور کے کلام پر اساطیر الاولیاء کی پیدائی کرتا۔ اتنا ہی نہیں اس نے گانے بجانے والی ایک فنکار لونڈی بھی خرید کی تھی۔ لوگوں کو جمع کر کے بکٹ کھلاتا۔ پھر اس لونڈی سے گانے سنواتا۔ جس نوجوان کے متعلق معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسلام کی طرف راغب

۱۔ یہاں ہم نے کسی قدر تلخیص سے کام لیا ہے۔

۲۔ سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۳۱۹۔

ہو رہا ہے تو اس کے ہاں اس فن کار لونڈی کو لے جانا اور اسے ہدایت کرتا کہ ذرا اسے کھلا پلا اور موسیقی سے شاد کام کر۔ آرٹ اور کلچر کے ایسے مظاہرے کے بعد طنزاً کہتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کام کی طرف بلا تے ہیں، وہ مزید اڑھے یا یہ پلے

اصل میں دینِ حق کی روح خدا پرستی ہے اور پابندیِ اصول۔ نساہت اور شہوانیت کی فضا میں اس روح کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جس ماحول میں ساری توجہ کھانے، شہوت، گانے بجانے، تفریحات اور فنونِ لطیفہ کی طرف منحطف ہو جائے وہ دعوتِ حق کے لیے سازگار نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر نصر بن حارث نے ایک طرف تفریحی انسانوں کا دور شروع کیا۔ دوسری طرف گانے بجانے اور نساہت کی جلوہ آرائیوں سے مجالس گرم کیں۔

لیکن ایک تعمیری پیغام اور ایک بامقصد تحریک کے مقابلے میں تفریحی ادب بھی کارگر نہ ہوا۔ اور فنونِ لطیفہ کے شعبے بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئے۔ چار دن ہما ہی رہی اور پھر یہ سارے ہنگامے ٹھنڈے پڑ گئے۔

چنانچہ اپنے اس حربے میں ناکام ہو کر ہی نصر بن حارث سردارانِ قریش کے مشورے سے یہودیوں کے مولویوں کے پاس مدینہ پہنچا کہ تم علم رکھتے ہو تو ہم بے علموں کو بتاؤ، کہ ہم تحریکِ اسلامی سے کیسے عہدہ بڑھوں۔ اور کیسے محسنِ انسانیت کو زچ کریں۔ علمائے یہود نے سکھایا کہ اس شخص سے اصحابِ کھف اور ذوالقرنین کا قصہ دریافت کرو اور روح کی حقیقت پوچھو۔ چنانچہ فیصلہ کن انداز سے یہ سوالات رکھے گئے۔ وحی ربی نے اطمینان بخش جواب دے دیے۔ لیکن کفر کی ہٹ کا کیا علاج!

## سودا بازی کی کوششیں :

ابتدائی خفیہ مرحلے سے نکلنے کے بعد اسلامی تحریک جب تیزی سے پھیلنے لگی۔ اور پھر آگے چل کر جب پروپیگنڈے اور تشدد کی مختلف تدبیریں ناکارہ ثابت ہوئیں۔ تو مخالفین دل ہی دل میں محسوس کرنے لگے کہ یہ ایک ناقابلِ تسخیر طاقت ہے اور کوئی بڑا نتیجہ پیدا کرنے والی ہے۔ چنانچہ پھر ایسی کوششیں ہونے لگیں۔ کہ کسی طرح سمجھوتہ (Compromise) کی راہ نکلے اور کچھ مان کر اور کچھ منوا کر قضیہ ختم کیا جاسکے۔ مگر اصولی تحریکوں میں اتنی لچک ہوتی ہی نہیں کہ لین دین کر کے کوئی درمیانی راہ پیدا کر لی جائے۔

۱۔ سیرت المصطفیٰ از مولانا ادریس کاندھلوی ج ۱ ص ۱۸۸

۲۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۱-۲۲

تاجم سردارانِ قریش نے اس حربے کو بھی پوری طرح آدما یا کہ شاید کسی طرف سے انگلی دھسنائی جا  
سکتی ہو۔

مثلاً ان کی ایک شرطِ مصالحت یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اصنام و اللہ کے خلاف  
زبان نہ کھولیں اور ان کے مذہب سے تعرض نہ کریں۔ اور اس کے علاوہ جو کچھ وعظ بھی کرنا چاہیں اور  
جیسی کچھ اخلاقی نصیحتیں فرمانا چاہیں، گوارا کر لی جائیں گی۔ یعنی آپ اپنے کلمہ دعوت میں سے نفی باطل کا جذبہ  
ساقط کر دیں۔ یا کہیے کہ ”لا اِلهَ“ نہ کہیں محض اللہ کا نام لینے کی گنجائش ہو سکتی ہے مطلب یہ ہوا کہ  
جن باطل تصورات پر نظامِ تمدن کھڑا تھا، اُن کو نہ چھیڑا جائے۔ اور معاشرہ کا جو فاسد ماحول جس شکل میں  
موجود تھا اسے برقرار رہنے دیا جائے۔ سچائی کو ایسی شکل میں لایا جائے کہ وہ تخریب کی نقیب نہ ہو۔ اور اس  
سے انقلابیت کی روح کو خارج کر دیا جائے۔ دینِ حق کا سیاسی جزم معطل ہو جائے اور اجتماعی نظام کو اس  
کی بنیادوں پر قائم رکھ کر اس کے سائے میں روحانی نوعیت کی اصلاح معاشرہ کی جاتی رہے۔ گویا قریش کا  
مطالبہ یہ تھا کہ ہماری طبقاتی سیادت برقرار، ہماری سیاسی و اقتصادی قیادت اور مذہبی پیشوائی سلامت،  
ہمارے عہدے قائم، ہمارے مفاد محفوظ — باقی جو کچھ تم کرنا چاہو کرو۔ لیکن تحریکِ اسلامی اگر یہ شرط  
دریافتی تو از خود ختم ہو جاتی۔

اسی طرح ان کی طرف سے خواہش کی گئی کہ :-

اٰمَّتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَا اَوْ بَدَّلَتْهُ (یونس - ۱۵)

یعنی اس قرآن کو تو بالائے طاق رکھ دو۔ اور کوئی دوسرا قرآن لاؤ۔ یا اس میں رد و بدل کر لو تاکہ

کچھ ہمارے تقاضوں کے لیے بھی گنجائش نکلے۔

اس کا جواب وحی الہی کے الفاظ میں حضور کی زبان سے یہ دلوا یا گیا کہ :- ”میرا یہ اختیار نہیں

کہ اس (قرآن) کو بطورِ خود بدل لوں۔ جو کچھ مجھ پر وحی کیا جاتا ہے، اس کے ماسوا کسی اور چیز کی پیروی

نہیں کر سکتا۔ میں اگر اپنے رب کی نافرمانی کروں تو یومِ عظیم (قیامت) کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔

اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو کوئی غلط بات (اپنی طرف سے گھڑ کر) اللہ تعالیٰ سے منسوب کر دے۔

مصالحت کی راہ نکالنے کے لیے مخالفین تحریک نے حضور کے سامنے ایک مطالبہ یہ بھی رکھا

کہ اگر آپ اپنے حلقے سے ہمارے معاشرے کے گھٹیا لوگوں، ہمارے غلاموں اور کمپروں اور کل کے لونڈوں

کو نکال دیں تو پھر ہم آپ کے پاس آ کے بیٹھیں اور آپ کی تعلیمات کو سنیں، پھر خرموجودہ حالت میں ہمارے

مذہب سے یہ بعید ہے کہ ہم کوئی استفادہ کر سکیں۔ شیخ ابوبکر نے ہمارا راستہ دک رکھا ہے۔ یہاں تک



کو دیکھتے ہیں کہ وہ تحریک کے خواص بنے بیٹھے ہیں۔ اور ان کو پرہیزگاری کی قربت حاصل ہے۔ انہی لوگوں کے بارے میں وہ اکثر طنزاً کہا کرتے تھے کہ یہ ہیں وہ ہستیاں جو قیصر و کسریٰ کی جانشین بننے والی ہیں۔ واقعہ یہ نہ تھا کہ ان کے دل تحریک اسلامی کی خدمت کے لیے مضطرب تھے۔ بلکہ منشا یہ تھا کہ وہ نوجوان جو مجنونانہ وار سچائی کے پیغام کا علم اٹھا رہے تھے، جو اپنے مفادات قربان کر رہے تھے اور جو ہر قسم کی مصیبتوں کو سہار کر اپنا کردار بنا رہے تھے اور وہ کہ جن کی ایک ایک سانس اپنے مقدس مشن کی خدمت کے لیے وقف تھی ان کی حوصلہ شکنی کرائی جائے اور ان کی خدمات سے اس مشن کو محروم کرایا جائے۔ قبل اس کے کہ حضور کے دل پر اس فریب کارانہ خواہش کا کوئی اثر ہوتا، قرآن نے آپ پر واضح کیا کہ یہ تو معاندین کی محض ایک چال ہے جیسی کہ وہ جملہ انبیاء کے خلاف چلتے رہے ہیں۔ مثلاً ٹھیک ایسی ہی بات نوح علیہ السلام کے سامنے بھی رکھی گئی تھی (ہود - ۲۷) پس آپ ان ساتھیوں کو معاندین کی خوشنودی کے لیے اپنے قرب سے ہرگز محروم نہ کریں جو صبح و شام خدا کا نام پکارنے والے ہیں (الانعام - ۵۲) بلکہ ہدایت دی گئی کہ اخلاص کے یہ پیکر جو طرح طرح کی مصیبتیں اٹھا رہے ہیں، ان کو اپنے سایہ شفقت میں رکھو۔ *وَ اَخْفِئْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ* (الشعراء - ۲۱۵) بلکہ ایک موقع پر ایک ذی اثر مخالف سے گفتگو کرتے ہوئے حضور نے ایک نابینا رفیق (ابن ام مکتوم) کی مداخلت کو ناپسند کیا تو اتنی سی بات پر تنبیہ آگئی۔ (سورہ عبس - ۱ تا ۱۰)

اسی سلسلے میں ایک بار معاندین قریش کی مجلس میں غور و فکر ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف رسول خدا حرم میں تنہا نشریف فرما تھے۔ عقبہ بن ربیعہ نے اہل مجلس سے کہا کہ اگر تم لوگ پسند کرد تو میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جا کر بات کروں اور اس کے سامنے ایسی سورتیں پیش کروں جن میں سے ممکن ہے کہ کسی کو وہ چاہے تو قبول کر لے۔ اور پھر ہم اسے ایفا کر دیں۔ اور وہ ہمارے مقابلے سے باز آ جائے۔ یہ صریح طور پر سودا بازی کی ایک تجویز تھی۔ اور یہاں تک اگر قریش آپہنچے تھے تو درحقیقت حضرت حمزہؓ کے ایمان لانے اور تحریک کے تیزی سے پھیلنے کی وجہ سے زچ ہو کر آپہنچے تھے۔ مجلس کی رضامندی سے عقبہ نے حضور سے جا کر یوں گفتگو کی :-

اے برادر زادے! تمہارا جو کچھ مرتبہ ہمارے درمیان ہے وہ تم خود جانتے ہو، خاندان

بھر میں تمہارا مقام بلند ہے اور نسب کے لحاظ سے تم ایک شان رکھتے ہو۔

اس خوشامد آمیز مگر مبنی بر حقیقت تمہید کے بعد عقبہ نے شکایت کی کہ تم نے قوم کو بڑی الجھن

میں ڈال دیا ہے۔ ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے، ان کے اکابر کو اجماع قرار دیا ہے، ان کے معبودوں

اور ان کے دین میں عیب لگایا ہے۔ ان کے گزرے ہوئے آباؤ اجداد کی تکفیر کر ڈالی ہے۔ اب میری بت سنو اور میں جو جو کچھ پیش کش کرتا ہوں، ان ساری صورتوں پر غور کرو۔ شاید کہ تم ان میں سے کوئی بات قبول کر لو۔ حضور نے فرمایا: تم کہو اسے ابو الولید! میں سنوں گا۔ عتبہ نے حسب ذیل صورتوں کی پیش کش کی:

اگر اس سارے ہنگامے سے تمہارا مقصود دولت ہو تو پھر ہم تمہارے لیے اتنا مال جمع کر دیں کہ تم ہم سب سے بڑھ کر مالدار ہو جاؤ۔

اگر تم اس کے ذریعے سرداری و قیادت چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنے اوپر سردار مقرر کیے لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ تمہارے بغیر ہم کسی بھی معاملے میں کوئی فیصلہ نہیں کریں گے۔

اگر تم بادشاہت چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ تسلیم کیے لیتے ہیں۔

اور اگر یہ اس وجہ سے ہے کہ تم پر کسی جن وغیرہ کا سایہ ہوتا ہے اور وہ تم پر مسلط ہو جاتا ہے تو پھر ہم کچھ چندہ وغیرہ کر کے تمہارے لیے علاج کا سامان کریں۔ پھر یا تو تمہیں اس سے نجات دلا دیں یا ناکامی ہو تو معذور سمجھیں۔

اس مصالحتانہ پیش کش میں وہ مختلف تصورات جھلک رہے ہیں جو اسلامی تحریک کے مخالفین میں پائے جاتے تھے۔ ان تصورات سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی نگاہ میں دو ہی امکان تھے: ایک یہ کہ حضورؐ جاہلی نظام کی طاقت سے اتنی بڑی ٹکر لینے کا اقدام ہوش و خرد کے عالم میں نہیں کر رہے تھے بلکہ کسی بھوت پریت کے سائے اور کسی طرح کے دورے میں ہونے کی وجہ سے کر رہے تھے: دوسرے یہ کہ اگر ہوش و خرد کے تحت یہ جدوجہد ہو رہی تھی تو پھر اس کا ہدف لازماً قیادت و بادشاہت کا مقنا تھا۔ بہر حال پوری پیش کش کو سن کر حضورؐ نے فرمایا: ”ابو الولید! کیا تم اپنی بات کہہ چکے؟“ اس نے کہا: ”ہاں“ فرمایا: ”تو اب میری سنو“ اس نے کہا: ”کہو“! حضورؐ نے پوری پیش کش کو ایک طرف ڈال کر خدا کی آیات، سنانی شروع کیں۔

یہ خدا ہے۔ یہ بڑی مہربان اور رحم دالی ہستی کی طرف سے بھیجی گئی ہے۔ یہ ایک نوشتہ ہے جس کی ایک ایک آیت نکھری ہوتی ہے۔ یہ قرآن ہے عربی زبان میں — سمجھو جو مجھ سے کام لینے والوں کے لیے! ایمان لانے والوں کو (بشارت سنانے والا اور) انکار کرنے والوں کو تنبیہ دلانے والا۔ پس ان (اہل مکہ) میں سے اکثریت نے اس سے ردگردانی کی اور سن کر نہیں دیتے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل اس حقیقت کے مخالف ہیں جس کی طرف تم بلا تے ہو۔ اور ہمارے کانوں میں گرائی ہے اور ہمارے اور تمہارے

درمیان ایک روک حائل ہے۔ سو تم اپنی جگہ کام کرو ہم اپنی جگہ کام کرتے ہیں۔“

حَمَّاتَا ۵

حضور جب تک سناتے گئے، عقبہ دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر ان پر ٹیک لگاتے ہوئے چپ چاپ توجہ سے سنتا رہا۔ حضور نے سجدہ تلاوت آنے پر قرأتِ ہد کی اور سجدہ کیا۔ پھر فرمایا۔

”ابوالولید! تم نے سن لیا جو کچھ سنا۔ اب تو جاتے اور یہ۔“

عقبہ اٹھا اور اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا۔ انہوں نے نظر پڑتے ہی کہا کہ عقبہ کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ اب وہ رنگ نہیں جو جاتے وقت تھا۔ تشویش کے ساتھ انہوں نے ماجرا پوچھا۔ عقبہ نے کہا :-

”ماجرا یہ ہے کہ میں نے ایسا کلام سنا ہے کہ جیسا کبھی نہیں سنا۔ بخدا نہ وہ شعر ہے، نہ جادو ہے اور نہ کہانت ہے۔ اے گروہ قریش! میری بات مانو اور اس کی ذمہ داری مجھ پر رہنے دو۔ اس شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دو اور اس کے پیچھے نہ پڑو۔ خدا کی قسم جو کلام میں نے اس سے سنا ہے اس سے یقیناً کوئی بڑا نتیجہ نکلنے والا ہے۔ اگر اہل عرب نے اس سے منٹ لیا تو دوسروں کے ذریعے تمہیں اس سے نجات ہو جائیگی اور اگر وہ عرب پر چھا گیا تو اس کی سلطنت تمہاری سلطنت ہوگی۔ اور اس کی طاقت تمہاری طاقت ہوگی۔ اور تم اس کے واسطے سے لوگوں میں سب سے بڑھ کر خوش نصیب ہو جاؤ گے۔“

عقبہ کے اس اظہارِ رائے سے کئی اہم حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ فضائے عرب مجبور ہو کر قرآن کے کلام کی عظمت کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ جب تک مخالفین اصل دعوت کو براہِ راست داعی کی زبان سے سننے سے بچے رہتے اور محض اپنے حلقے کے زہریلے پروپیگنڈے کے اثر میں رہتے تو ان کا زورِ مخالفت قائم رہتا۔ لیکن جس کسی نے بھی براہِ راست اصل پیغام کا کوئی جز سنا اس کا دل مفتوح ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تیسرے یہ کہ اس کلام کے بارے میں ان کے ہر ذہن آدمی کا تاثر یہی تھا کہ اس سے کوئی بڑا نتیجہ (بناءً عظیم) پیدا ہونے والا ہے۔ بلکہ وہ اس کے پردوں کے پیچھے ایک کامل انقلاب کا منظر دیکھتے تھے اور اندازہ کر لیتے تھے کہ اس کلمہ کی بنیاد پر ایک سلطنت اور ایک نظامِ زندگی

کا قیام ہونے والا ہے۔

مگر عقبہ کی بات سن کر مجلس میں یوں مذاق اڑایا گیا کہ "ابو الولید، اس کی زبان کا جادو تو تم پر بھی چل

گیا۔"

عقبہ نے کہا کہ اس کے متعلق میری رائے تو یہی ہے جو میں نے کہہ دی۔ اب تم جو چاہو کرو۔

ایک کوشش اس سلسلے میں اور کی گئی۔ بڑے بڑے زعماء — عقبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ابو سفیان

بن حرب، نصر بن حارث، کلدہ (جس کی برادر خواندگی بنو عبدالدار سے تھی)، ابو البختری بن ہشام، اسود

بن مطلب، زمعہ بن اسود، ولید بن مغیرہ ابو جہل بن ہشام، عبداللہ بن ابی امیہ، عاص بن وائل، نبیہ اور نبیہ

ابنائے حجاج (بنو سہم)، امیہ بن خلف — غروب آفتاب کے بعد کعبہ کے پاس جمع ہوئے انہوں نے رسول

خدا کو بلوایا۔ حضور اچھی توقعات کے ساتھ جلد جلد آہنچے۔ انہوں نے اپنی اسی پیش کش کو جو پہلے

عقبہ کے ذریعے پہنچائی گئی تھی۔ ایک بار پھر دہرایا۔ اُسے سن کر حضور نے یہ جواب دیا :-

"تم لوگ جو کچھ کہہ رہے ہو، میرا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ میں جو دعوت تمہارے

سامنے لے کے اٹھا ہوں۔ اسے اس لیے نہیں پیش کر رہا کہ اس کے ذریعے تم سے

مال و دولت حاصل کروں، یا تمہارے اندر سرداری حاصل کروں یا تمہارے اوپر بادشاہ

قائم کروں۔ مجھے تو خدا نے تمہارے سامنے اپنا پیغام بنا کر اٹھایا ہے۔ اس نے مجھ

پر کتاب اتاری ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ تمہارے لیے بشیر و نذیر بنوں۔ سو میں نے خدا

کی ہدایات تم تک پہنچادی ہیں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کیا ہے۔ اب جو کچھ میں

لایا ہوں اگر اسے تم قبول کر لو تو وہ تمہارے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی کا ذریعہ ہے اور

اگر تم اسے میری طرف واپس پھینک دو تو میں اللہ کے حکم کے انتظار میں صبر دکھاؤں گا۔

یہاں تک کہ خدا میرے اور تم لوگوں کے درمیان اپنا فیصلہ صادر فرمادے۔"

یہ جواب سن کر جب انہوں نے دیکھا کہ آگے بڑھنے کا راستہ نہیں مل رہا۔ تو طرح طرح کی جھٹیں

نکالنا شروع کیں۔ مثلاً یہ کہا کہ تم جانتے ہو کہ ہماری یہ سرزمین بہت ہی تنگ ہے۔ اس میں پانی کی کمی ہے

اور یہاں کی زندگی بہت کٹھن ہے۔ تم خدا سے کہو کہ وہ ان پہاڑوں کو ہٹا دے اور ہماری زمین کو کشادہ

کر دے اور اس میں شام و عراق کی طرح دریا چلا دے۔ پھر یہ کہا کہ خدا ہمارے آباؤ اجداد کو اٹھا کھڑا

کرے۔ اور ان میں قضی بن کلاب ضرور شامل ہو کیونکہ وہ مرد بزرگ بڑا راست باز تھا۔ ہم اس سے تمہاری دعوت کے بارے میں دریافت کریں گے، کہ یہ حق ہے یا باطل! پھر ہمارے اسلاف کرام زندہ ہو کر اگر تمہاری تصدیق کر دیں اور تو وہ باتیں کر دکھائے جن کا مطالبہ ہم نے کیا ہے تو ہم تمہاری تصدیق کریں گے اور خدا کے ہاں تمہارا یہ مرتبہ ہمیں تسلیم ہو گا کہ اس نے تمہیں واقعی رسول بنا کے بھیجا ہے۔ پھر کہا یہ بھی نہیں کرتے تو ہم پر عذاب ہی وارد کر دو۔ حضور ان لایعنی مطالبات پر بار بار اپنی وہی بات دہراتے چلے گئے اور کہتے گئے کہ :

مَا لِهَذَا بُحِثْتُ ۖ (ان کاموں کے لیے مجھے نہیں اٹھایا گیا)

آخر جب حضور اٹھ کھڑے ہوئے تو آپ کے ساتھ ہی ساتھ عبد اللہ بن ابی (جو حضور کا پھوپھی زاد بھائی تھا) بھی اٹھ کھڑا ہوا اور آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ تمہاری قوم نے تمہارے سامنے کچھ باتیں رکھیں۔ لیکن تم نے کوئی پیش کش بھی مان کر نہیں دی۔ اب تو خدا کی قسم میں تمہارے اوپر ایمان نہیں لانے کا خواہ تم آسمان پر سیر ہی لگا کر اس پر چڑھتے ہوئے دکھائی کیوں نہ دے جاؤ۔ اور پھر آنکھوں کے سامنے اترو اور تمہارے ساتھ چار فرشتے بھی آ کر تمہاری صداقت کی گواہی کیوں نہ دے دیں۔ خدا کی قسم اگر میں ایسا کروں بھی تو میرا قطعاً یہ خیال نہیں کہ میں حقیقتاً تمہاری تصدیق کروں گا۔

محسن انسانیت بڑے دکھی دل کے ساتھ گھر واپس آئے۔

ایسے ہی واقعات میں سے ایک یہ ہے کہ سفر طائف کے بعد جب حضور نے مکہ سے نکل کر اس پاس کے قبائل مثلاً بنو کنذہ اور بنو حنیفہ وغیرہ میں پیغام پہنچانا شروع کیا تو ایک بار قبیلہ بنو عامر بن صعصعہ کے ہاں بھی پہنچے اور سردار قبیلہ بنجرہ بن فراس سے ملاقات کی۔ اس نے حضور کی دعوت سنی۔ پھر ساتھیوں سے کہنے لگا: "بھلا اگر قریش کا یہ نوجوان میرے ہاتھ آ جائے تو میں اس کے ذریعے سارے عرب کو تمہاری دعوت کو قبول کروں گا۔" پھر آپ کو خطاب کر کے پوچھا، کہ اگر ہم لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں اور تم مخالفین پر غالب آ جاؤ تو کیا یہ وعدہ کرتے ہو کہ تمہارے بعد یہ سارا سلسلہ میری تحویل میں آ جائے گا؟

غور کیجیے کہ ابتدائی مجال دعوت کو سن کر ہی اس شخص نے بھانپ لیا تھا کہ یہ دعوت ایک معرکہ پیدا کرنے والی دعوت ہے اور اس کے غالب آ جانے کا امکان بھی ہے اور اس وقت یہ ذریعہ حصول مفاہ

بھی ہوگی۔ انہی تصورات نے بیخبرہ کے اندر سوداگرانہ ذہنیت پیدا کر دی مگر حضورؐ تو داعی تھے، سیاسی کاروبار کرنے نہیں چلے تھے اس لیے آپ نے جواب یہ دیا کہ :

”یہ تو خدا کے اختیار میں ہے وہ جسے چاہے گا میرے بعد مقرر کرے گا۔“  
بیخبرہ نے اس پر یہ کہا کہ ”کیا خوب! اس وقت تو عرب کے سامنے ہم سینہ سپر ہوں اور جب تمہارا کام بن جائے تو مفاد کوئی دوسرا حاصل کر لے جائے۔ جاؤ، ہم کو اس سلسلے سے کوئی مطلب نہیں۔“

حضورؐ اگر کوئی غیر سیاسی واعظ ہوتے یا صوفیانہ طرز پر معاشرہ کی اخلاقی اصلاح کرنے چلے ہوتے تو اس موقع پر ان کا جواب سیدھا سیدھا یہ ہوتا کہ ”میاں تم یہ کیسے خواب دیکھ رہے ہو، یہ تو اللہ واہوں کا ایک اصلاحی کام ہے۔ اس میں مفاد کا کیا سوال اور اس میں کسی کی سرداری اور جانشینی کا کیا ذکر حضرتؐ بھی اپنی تحریک کی جامعیت اور اس کے سیاسی پہلو سے آگاہ تھے اور مخاطب نے بھی اس منہا کا کچھ نہ کچھ تصور کر لیا جس کی طرف یہ دعوت ہانے والی تھی۔“

سودا بازی کی ان مختلف مساعی سے مخالف طاقت یہ فائدہ اٹھانا چاہتی تھی کہ اگر حضورؐ تحریک کے لیے نفوذ کی راہیں نکالنے یا استبداد کی بھٹی سے ساتھیوں کو بچانے کے لیے خم کھا جائیں تو یہ حیثیت اصولی تحریک کے ان کی دعوت کا زور ٹوٹ جائے اور اگر وہ بے لچک ہونے کا ثبوت دیں تو یہ پروپگنڈا کیا جاسکے کہ دیکھو لوگو! ہم نے جھمیلا ختم کرنے کے لیے کتنی ہی چیزوں کی پیشکش کی اور کتنے ہی راستے نکالے مگر یہ شخص ایسی ضد میں پڑا ہے کہ کسی حل کو قبول ہی نہیں کرتا۔ پوزیشن واقعی بڑی نازک تھی، اسی لیے قرآن حضورؐ کو ان سودا بازیوں کے مقابلے پر مضبوط رکھنے کے لیے درپے درپے آنتہ دیتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک بار تو بڑے شدید انداز میں مخالفین کی اس چال سے بچنے کی تلقین بھی کی۔ اور اس بارے میں حفاظت الہی کا یقین بھی دلایا۔ فرمایا :

”اور اگر ہم تم کو مضبوطی سے جمائے نہ رکھتے تو بعید نہ تھا کہ تم ان کی طرف کسی قدر جھکاؤ دکھا دیتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم تمہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اپنی گرفت کا مزہ چکھا دیتے۔ پھر تم ہمارے مقابلے میں کسی کو مددگار نہ پاتے۔“ (نبی اسرائیل ۴۲، ۵۰)

غرضیکہ بڑی حکمت اور بڑے صبر و تحمل سے حضورؐ نے تحریک کو سودا بازی کی ان کوششوں

سے بچا کر نکالا۔

تشدد اپنے جو بن پر :

مخالفین حق نیتوں کے لحاظ سے کھوٹے اور دلیل کے لحاظ سے کھوکھلے ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے اصل مسئلہ اپنے مفاد اور اپنے اقتدار کا ہوتا ہے وہ کسی دعوت کے اٹھنے پر قوت کے سارے ہتھیار سنبھال لیتے ہیں اور دلیل کا جواب تشدد سے دیتے ہیں۔ حق کی تحریک انسانی قوائے فکر کے بل پر کام کرتی ہے۔ مگر مخالفین جذبات غیظ و غضب کو جواب میں لاتے ہیں۔ تبدیلی کے لیے کوئی جنبش بھی اگر کسی طاقت نے نظام وقت کے خلاف کی ہے تو اسے خدایان معاشرہ کے ہاتھوں مار کھانی پڑی ہے۔ لیکن حق کی دعوت جس ہمہ گیر تبدیلی کی اذان ہے اس کے رد عمل میں تو لازماً ایک شدید سیڑھیاں دورہ نظام رائج کے پاسبانوں کو پڑتا ہے۔ یہی صورت مکہ میں درپیش تھی۔ یوں تو دعوت عام کی ابتدا کے ساتھ ہی تشدد کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ نظام جاہلی کا پارہ پڑھتا گیا اور ظلم کے دریا کی موجیں بھرتی چلی گئیں۔ پانچ چھ برس کے اندر اندر گویا مکہ نئے نظام امن و رحمت کے علمبرداروں کے لیے ایک گرم بھٹی بن گیا۔ اور یہ بھٹی حضرت خدیجہ اور جناب ابوطالب کی وفات کے بعد اپنی آنچ کے لحاظ سے پورے جو بن پر آگئی۔ کوئی نہ تھا جو اس بھٹی میں نہ تپا یا گیا ہو۔ مگر خوب اچھی طرح جل جل کر اور تپ تپ کر اور گھل گھل کر اسلامی جماعت کے افراد کھرا سونا ثابت ہوئے۔ اس بھٹی کی آنچ کا سب سے بڑا حصہ تو تحریک کے لیڈر — محمد صلی اللہ علیہ وسلم — کے حصے میں آیا۔ لیکن آپ کے رفقاء میں بھی جو کچھ بتی ہے اسے تاریخ کے ذریعے ہم پوری طرح کہاں جان سکتے ہیں اور کیسے محسوس کر سکتے ہیں تاہم تاریخ کے پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہم دشمنان حق کے محاذ تشدد کا بالکل ہی مجمل تذکرہ کرنے کی گنجائش رکھتے ہیں۔

براہ راست آنحضرت کے خلاف تو ہر گھڑی اور ہر سانس گونا گوں زیادتیاں کی ہی جاتی رہیں۔ لیکن آپ کے رفقاء کو جو اذیتیں دی جاتی تھیں وہ بھی بالواسطہ آپ ہی کے حساس قلب کو چھلنی کرنے والی تھیں۔ اب دیکھیے کہ کس پر کیا گزری ہے

جناب بن اللات تمیمی جاہلیت کے دور میں غلام بنا کر بیچ ڈالے گئے تھے۔ اور ام نمار نے ان کو خریدا تھا۔ یہ اس وقت ایمان لائے جب کہ خانہ ارقم تحریک اسلامی کا مرکز تھا۔ اور وہیں سے آنحضرت سارا جماعتی نظم چلا رہے تھے۔ قریش نے جلتے انگارے بچھا کر ان کو اس بستر آتشیں پر لٹایا۔ اور چھاتی پر ایک شخص کھڑا ہو گیا تاکہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ انگارے پیٹھ کے نیچے ہی ٹھنڈے

ہو گئے۔ بعد میں خباب نے حضرت عمرؓ کو ایک مرتبہ پیٹھ دکھائی تو برص کی طرح کے سفید داغ اس پر نمایاں تھے۔ پیشہ کے لحاظ سے یہ لوہار تھے۔ اسلام لانے کے بعد جب انہوں نے لوگوں سے واجب الوصول اجرتوں کا تقاضا کیا تو جواب ملا کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہیں کر دگے، ایک کوڑی بھی نہیں ملے گی۔ یہ گویا معاشی چوٹ لگائی جا رہی تھی۔ مگر حق کا یہ سپاہی کتنا کہ تم لوگ جب تک مرکز زندہ نہ ہو جاؤ ایسا نہیں ہو سکتا۔

حضرت بلالؓ حبشی امیہ بن خلف کے غلام تھے۔ جب سورج ٹھنیک نصف النہار پر آ جاتا تو عرب کی تپتی ریت پر ان کو لٹایا جاتا اور سینے پر بھاری پتھر رکھ دیا جاتا تاکہ کروٹ نہ بدل سکیں۔ امیہ اس حالت میں ان سے کہتا کہ اسلام سے باز آ جاؤ، ورنہ اسی طرح ختم ہو جاؤ گے۔ حضرت بلالؓ جواب میں صرف "احد! احد! پکارتے۔ امیہ کا غصہ اور بھڑک گیا۔ اس نے آپ کے گلے میں رستی ڈال کر شہر کے لونڈوں کو ساتھ لگا دیا۔ وہ آپ کو گلی گلی گھیٹتے پھرے لیکن یہ عاشقِ جانناز اسی طرح "احد! احد! پکارتا پھرتا۔ کبھی آپ کو گائے کی کھال میں پیٹتا جاتا، کبھی آہنی زرہ پہنا کر تیز دھوپ میں بٹھایا جاتا۔ حضرت ابو بکرؓ نے امیہ بن خلف سے ایک غلام کے عوض میں خرید کر آزاد کر دیا۔

عمار بن یاسرؓ قحطانی الاصل تھے۔ ان کے والد یاسر بن سے اپنے دو بھائیوں کے ہمراہ ایک گم شدہ بھائی کی تلاش میں آئے تھے۔ دو بھائی تو واپس چلے گئے اور یاسر ابو حذیفہ مخزومی سے علیفا نہ واقعات قائم کر کے مکہ میں ہی رہ پڑے اور یہیں شادی کر لی۔ یاسر سمیت تقریباً سارا ہی گھرانہ اسلام لے آیا۔ چونکہ عمار بن یاسر کا کوئی قبیلہ مکہ میں نہ تھا، اس لیے ان پر خوب ستم ڈھائے جاتے۔ انہیں قبولِ اسلام کے جرم کی سزایوں دی جاتی کہ ان کو بھی جلتی زمین پر لٹایا جاتا۔ اور قریش ان کو اتنا مارتے کہ بار بار بے ہوش ہو جاتے۔ ان کے والدین پر بھی اسی طرح طبع آزمائی کی جاتی۔ پانی میں ان کو غوطے بھی دیے جاتے۔ اور انکاروں پر بھی تڑپایا جاتا۔ حضورؐ ان کے سر پر دستِ شفقت پھیر کر خاص دعا کرتے۔ بشارت دیتے۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ فرماتے کہ عمار سر سے پیر تک ایمان سے بھرا ہوا ہے۔

شمیہؓ جو حضرت عمار کی والدہ تھیں ان کو اسلام لانے پر ابو بلال نے نہایت وحشیانہ طریق سے برہمی مار کر ہلاک کر دیا۔ یہی اولین جان ہے جو راہِ حق میں شہید ہوئی۔

یاسرؓ جو حضرت عمار کے والد تھے وہ بھی ظلم سہتے سہتے شہید ہو گئے۔

صہیبؓ بھی عمار کے ساتھ ایمان لائے تھے۔ ان کو اس بے دردی سے مارا جاتا تھا کہ دماغی



توازن بار بار درہم برہم ہو جاتا۔ دورِ ہجرت میں قریش نے ان کو اس شرط پر مدینہ جانے کی اجازت دی کہ اپنا سارا مال و اسباب دے جائیں۔ انہوں نے بخوشی منظور کیا اور خالی ہاتھ نکل گئے۔

ابو نکیبہ جہنی صفوان بن امیہ کے غلام تھے۔ اور اسلام لانے میں حضرت بلالؓ کے ہم عصر۔ امیہ کو اطلاع ہوئی۔ تو پاؤں میں رستی ڈلو کر لوگوں سے کہا کہ تپتی ریت پر لٹانے کے لیے گھسیٹ کر لے جاؤ۔ راستے میں ایک گبر ملا دکھائی دیا۔ تو امیہ نے ان سے کہا کہ ”یہی تو تیرا خدا نہیں“ انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ کہ میرا اور تیرا دونوں کا خدا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس پر امیہ نے اس زور سے ان کا گلا گھوٹا کہ لوگ یہ سمجھے کہ دم نکل گیا۔ مگر بچ گئے۔ ایک بار اتنا بھاری پتھر ان کے سینے پر لا دیا کہ بے حال ہو جانے کی وجہ سے زبان باہر نکل آئی۔ کبھی ان کو لوہے کی بیڑیاں پہنا کر جلتی زمین پر لٹا لٹایا جاتا۔ ان کو بھی حضرت ابوبکرؓ نے خرید کر آزاد کرادیا۔

لبینۃ ایک کنیز تھیں حضرت عمرؓ اس کو نہایت ظالمانہ طریق سے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ میں نے رحم کھا کر نہیں، بکہ تھک جانے کی وجہ سے تجھے چھوڑ دیا ہے۔

ذنیرہ۔ حضرت عمرؓ کے گھرانے کی کنیز تھیں اس لیے حضرت عمرؓ پوری بیدردی سے مارتے ابو جہل نے ان کو ایک مرتبہ اس جاہلانہ شان سے مارا کہ ان کی آنکھیں صنائع ہو گئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے ایمان کی برکت سے بطور خاص فضل و کرم کے اللہ تعالیٰ نے یکایک بیٹائی لوٹا دی۔ ان کو بھی حضرت ابوبکرؓ صدیق نے خرید کر آزاد کرایا۔

نہدیہ اور ام عبیس بھی دونوں کنیزیں تھیں۔ اور انہوں نے بھی انتہائی سخت ظلم سہے ہیں۔ حضرت عثمانؓ جو عمر کے لحاظ سے بھی قابل احترام تھے اور مال و جاہ رکھتے تھے جب اسلام لائے تو ان کے اپنے چچا نے رسی سے باندھ کر پٹیا۔

حضرت ابوذرؓ نے اسلام لائے ہی کعبہ میں آکر اعلان کیا۔ قریش ٹوٹ پڑے اور مارتے مارتے آپ کو زمین پر لٹا دیا۔

حضرت زبیر بن العوام کو اسلام لانے کی سزا دینے کے لیے ان کے چچا چٹائی میں لپیٹ کر ناک میں دھواں دیتے تھے۔ مگر وہ پوری عزیمت سے فرماتے ”میں کفر تو اب ہرگز نہیں کروں گا“ سعید بن زید کو یہ حضرت عمرؓ کے چچا زاد بھائی تھے، حضرت عمرؓ نے رسیوں میں باندھ دیا۔ سعید بن وقاص کے ساتھ بھی ظالمانہ کارروائیاں روا رکھی گئیں۔

عبداللہ بن مسعود نے اسلام لانے پر حرم میں پہلی مرتبہ باواز بلند قرآن پڑھا۔ سورہ رحمن کی

تلاوت آپ نے شروع ہی کی تھی کہ کفار ٹوٹ پڑے اور منہ پر طمانچے مارنے لگے۔ مگر پھر بھی تلاوت جاری رکھی اور زخمی چہرے کے ساتھ واپس ہوئے۔

عثمان بن مظعون ولید بن مغیرہ کی پناہ میں ہونے کی وجہ سے ابتداءً مامون تھے۔ لیکن رسول خدا کے اصحاب پر جو امتحانی گھڑیاں گزر رہی تھیں ان کو دیکھ کر عثمان کے دل میں احساس پیدا ہوا کہ میں ایک مشرک کے سایہ حمایت میں امن چین سے کیوں رہوں جب کہ میرے ساتھی یہ کچھ بھگت رہے ہیں۔ انہوں نے ولید بن مغیرہ سے بات کی کہ میں پناہ واپس کرتا ہوں۔ ولید نے سمجھایا کہ "بھتیجے میری قوم کا کوئی فرد تمہارے ساتھ بدسلوکی نہ کر بیٹھے" انہوں نے کہا کہ نہیں۔ میں تو اللہ کی پناہ میں رہوں گا۔ اور اس کے سوا اور کسی کی پناہ مجھے گوارا نہیں۔ کعبہ میں جا کر انہوں نے با آواز بلند ولید بن مغیرہ کی پناہ واپس کرنے کا اعلان کیا اور اس کے بعد قریش کی مجلس میں جا بیٹھے۔ بسید نے مصرع پڑھا۔ *الاعنل شیعی ما خلا اللہ یمن* عثمان بولے۔ تم نے سچ کہا۔ اس نے دوسرا مصرع پڑھا۔ *وکل نعیماً لا محالة زائل*۔ انہوں نے کہا۔ یہ بات تم نے غلط کہی ہے۔ جنت کی نعمتیں کبھی زائل نہ ہوں گی۔ بسید کا خون کھوں گیا کہ یہ جبارت کس کی ہے۔ بولا: اے قریش! کون ہے جو تمہارے ہم نشین سے ایسی بدسلوکی کرتا ہے کسی نے کہا کہ یہ احمقوں میں سے ایک احمق ہے، جنہوں نے ہمارے دین سے روگردانی کرنی ہے۔ سو اس کی جت ہذیبہ احساس نہ کر۔ عثمان بھی چپ نہ رہ سکے۔ ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس پر وہی شخص اٹھا اور اس نے عثمان بن مظعون کو ایک تھپیڑ ایسا مارا کہ ان کی آنکھ پھوٹ گئی۔ اس پر ولید بن مغیرہ نے کہا کہ تم گزیری پناہ میں رہتے تو آنکھ سے یوں ہاتھ نہ دھو بیٹھتے۔ عثمان نے جواب دیا کہ میری جو آنکھ بچ رہی ہے وہ جس قریشی ہونے کو تیار ہے۔ میں اس ہستی کی پناہ میں ہوں جو تم سے زیادہ صاحب عزت و مقدرت ہے۔

حضرت ابوذر نے دعوت حق کو قبول کیا تو انقلابی روح سے سرشار ہو کر سیدھے حرم پہنچے اور وہاں جا کر با آواز بلند اپنے نئے عقیدے کا اعلان کیا۔ قریش سٹ پٹا گئے اور کہنے لگے کہ یہ کون بے دین ہے، مارو اسے۔ چنانچہ مار پیٹ شروع ہو گئی۔ ارادے یہ تھے کہ ان کو جان سے مار دیا جائے۔ مگر حضور کے چچا عباس کا اتفاقاً گزر ہوا تو انہوں نے کہا۔ کہ یہ تو قبیلہ خنفر کا آدمی ہے۔ اور تمہیں تجارت کے لیے اسی قبیلہ کی حدود سے ہو کر جانا ہوتا ہے۔ کچھ موش کر دو۔ لوگ باز آگئے۔ دوسرے روز انہوں نے پھر عقیدے کا اعلان کیا۔ اور پھر مار کھائی۔

حضرت ام شریب ایمان لائیں، تو ان کے اعزہ واقارب نے انہیں پیچھا مانی دھوپ میں کھرا کر دیا۔ اس حالت میں وہ ان کو کھلنے کے لیے روٹی کے ساتھ شہر دیتے اور پانی نہ پلاتے، تاکہ حدت کا

دو گونہ عذاب بھگتیں۔ تین دن مسلسل اسی عالم میں گزر گئے۔ انتہائی کرب کے لمحوں میں ان سے مطالبہ کیا گیا کہ اسلام کو چھوڑ دو۔ ان کے حواس اس درجہ متاثر ہو چکے تھے کہ وہ اس بات کو سمجھ نہ سکتے تھے۔ پھر ظالموں نے آسمان کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ خدائے واحد کا انکار کرو۔ جب وہ مدعا سمجھ گئی تو کہا کہ خدا کی قسم میں تو اپنے عقیدہ پر قائم ہوں۔

خالد بن العاص کے قبول اسلام پر ان کے باپ نے اس قدر مارا، کہ سر زخمی ہو گیا۔ ان کو فاقہ کا عذاب بھی دیا گیا۔

غرضیکہ کون تھا جسے اس بھٹی میں نہ ڈالا گیا ہو۔ حضرت عثمان کو ان کے چچا حکم بن العاص نے رسیوں میں جکڑ دیا۔ یہی سلوک جناب ابو بکر اور طلحہ کے ساتھ ہوا۔ ولید بن ولید، عیاش بن ابی ربیعہ اور سلمہ بن ہشام کو انتہائی اذیتیں دی گئیں اور پھر ان کو ہجرت سے بھی روکا گیا۔ جو رو استبداد کا انتہائی مظاہر وہ بھی تھا جو اپنی بہن اور بہنوئی کے ساتھ حضرت عمر نے روا رکھا۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔ ایک طرف اس زہرہ گداز سلسلہ تشدد کو دیکھیے اور دوسری طرف تحریک اسلامی کے علمبرداروں کی استقامت ملاحظہ فرمائیے۔ کہ مرد، عورتیں، غلام اور لونڈیاں جو بھی اس مٹے حق سے سرشار ہو گیا، پھر اس کا اندم پیچھے نہیں ہٹا۔ مظالم کسی ایک فرد کو بھی ارتداد کی راہ پر نہ ڈال سکے۔ صحیح معنوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک انقلابی رو ان ہستیوں کے ذہنوں میں دوڑ رہی تھی اور ان کے صبر نے استبداد کو بالکل شکست دے دی۔ جو کوئی اسلام کی پکار پر لبیک کہہ دیتا۔ اس کے اندر سے بالکل ایک نیا انسان نمودار ہو جاتا اور اس کے سینے میں نئی قوتیں جاگ اٹھتیں۔

## ہجرت جلد ششم :

ہر مصیبت کی برداشت کی کوئی حد ہوتی ہے۔ امتحان کی جن کٹھن گھڑیوں سے تحریک اسلامی کے علمبرداروں کو سابقہ درپیش تھا، ان کو سہارنے میں انہوں نے ہمیشہ کے لیے یادگاری نمونہ قائم کر دیا۔ لیکن ظلم و استبداد کی زد کہیں تھمنے میں نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ روز بروز زور پکڑتی جا رہی تھی۔ حضور اپنے رفقاء کا حال دیکھ دیکھ کر کڑھتے۔ مگر کوئی زور نہیں چلنا تھا۔ سہارا تھا تو خدا کے ایمان کا تھا۔ آخرت کے یقین کا تھا۔ سچائی کی آخری فتح کی قوی امیدوں کا تھا۔ سوز بھری دعاؤں کا تھا۔ حضور اپنے رفیقوں کو تسلی دلاتے کہ خدا کوئی نہ کوئی راستہ نکالے گا۔ بظاہر مکہ کی فضا یا اس انگیز ہوتی جا رہی تھی اور اس امر کے آثار بالکل نہیں تھے کہ تحریک اسلامی کا شجرہ طیبہ اس سنگلاخ زمین میں برگ دبار لاسکے گا۔ حالات بتا رہے تھے کہ نظام حق کی تاسیس یہاں نہیں ہونے کی۔ بلکہ کسی دوسرے گوشہ زمین کو یہ سعادت ملنے والی

ہے۔ تحریک اسلامی کی تاریخ میں پہلے بھی ہمیشہ ہجرت کا باب ضرور شامل رہا ہے۔ سو اندازہ ہو چکا تھا کہ محسنِ انسانیت اور اس کے رفیقوں کو بھی وطن چھوڑنا ہوگا۔ ایک ہمہ گیر بین الاقوامی دعوت اگرچہ کسی خاص ملک اور قوم میں ہی ابتدا کرتی ہے لیکن وہ وطن پرستی اور قوم پرستی سے بالاتر ہوتی ہے۔ ایک ملت کے لوگ اگر نااہل ثابت ہوں تو وہ کسی دوسری آبادی کو مخاطب بنا لیتی ہے۔ لیکن جب تک خدا کی طرف سے واضح طور پر اذن نہ ہو جائے، انبیاء کی یہ شان نہیں ہوتی ہے کہ انہیں مرکز دعوت کو چھوڑ دیں۔ تاہم حضورؐ جبر اور صبر کی آدیزش کو ایسے مراحل میں داخل ہونے دیکھ رہے تھے جہاں انسانی صبر کا پیمانہ چھلک سکتا ہے۔ مسلمان بے چین تھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ ان حالات میں حضورؐ نے صحابہ کو مشورہ دیا کہ زمین میں کہیں نکل جاؤ، خدا جلد ہی تم کو کسی جگہ یکجا کر دے گا۔ پوچھا گیا کہ کدھر جائیں۔ حضورؐ نے ملک حبش کی طرف اشارہ کیا۔ دراصل رسولِ خدا کے علم میں تھا کہ وہاں کی بادشاہت انصاف پر قائم ہے اور عیسائیت کی مذہبی بنیادوں پر چل رہی ہے۔ آپ کے سامنے یہ امکان تھا کہ شاید یہی علاقہ دارالہجرت بننے کے لیے موزوں ہو۔ اسی لیے آپ نے اس ملک کے بارے میں فرمایا "ھی ارض مدینہ" "وہ سرزمینِ راستی ہے۔" نبوت کے پانچویں سال حضورؐ کی انقلابی جماعت کے گیارہ مردوں اور چار عورتوں کا قافلا حضرت عثمان بن عفان کی زیر قیادت رات کی تاریکی میں حبشہ کو روانہ ہوا۔ حضرت عثمان کے ساتھ ان کی اہلیہ محترمہ یعنی رسولِ خدا کی صاحبزادی جناب رقیہ بھی اس اولین سفر ہجرت پر نکلیں۔ حضورؐ نے اس بارے میں جوڑے کے متعلق فرمایا۔ لوط اور ابراہیم (علیہما السلام) کے بعد یہ پہلا جوڑا ہے جس نے خدا کی راہ میں وطن چھوڑا ہے۔

اس قافلے کے نکلنے کے بعد جب قریش کو خبر ہوئی تو تعاقب میں آدمی درڑے، مگر جب وہ بندرگاہ (جذہ) پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کو عین وقت پر کشتیاں تیار مل گئی تھیں اور وہ رسانی سے باہر ہیں۔ یہ مہاجرین بھڑا ہی عرصہ (حبشہ سے سوال تک) حبشہ میں ٹھہرے۔ ایک افواہ پہنچی کہ قریش نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ یہ سب پلٹ آئے۔ مگر مکہ کے قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ افواہ غلط تھی۔ اب سخت مشکل پیش آگئی کچھ لوگ چھپ کر شہر میں آئے اور کچھ کسی کی حمایت حاصل کر کے داخل ہوئے۔ اس طرح لوط آنے کا راز بھی نتیجہ ہی ہونا تھا کہ پہلے سے بڑھ کر استبداد ہونے لگا۔

۱۔ سیرت ابن ہشام جلد ۱ ص ۲۲۲

۲۔ الوہاب اللدینی ج ۱ ص ۱۵۵ رحمۃ اللعالمین ج ۱ ص ۱۵۵

دربارہ بہت بڑا قافلہ جس میں ۸۵ مرد اور ۱۷ عورتیں شامل تھیں، حبشہ جا پہنچا وہاں ان کو پر امن فضا ملی: اور وہ اطمینان سے اسلام کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے لگے۔

اب دیکھیے کہ دشمنانِ حق کا کینہ کہاں تک پہنچتا ہے۔ ان لوگوں نے ایک مجلس میں سارے معاملے پر غور کر کے منصوبہ بنایا اور عبداللہ بن ربیعہ اور عمرو بن العاص کو سفارت کے لیے مامور کیا کہ یہ شاہ حبش سے جا کر بات کریں۔ اور مہاجرین کو واپس لائیں۔ اس مقصد کے لیے نجاشی اور اس کے درباریوں کے لیے گراں بہا تحائف تیار کیے گئے۔ اور بڑے سروسامان کے ساتھ سفارت روانہ ہوئی۔ حبش پہنچ کر یہ لوگ درباریوں اور پادریوں سے سازش کرنے میں مشغول ہو گئے۔ اور ان کو رشوتیں دیں۔ ان کے سامنے معاملہ کی یہ صورت رکھی کہ ہمارے شہر میں چند سر پھرے لوگوں نے ایک مذہبی فتنہ اٹھا کھڑا کیا ہے۔ اور یہ تمہارے مذہب کے لیے بھی اتنا ہی خطرناک ہے جتنا ہمارے آبائی دھرم کے لیے ہم نے ان کو نکال دیا تھا تو اب یہ یہاں آپ کی پناہ میں آپڑے ہیں۔ ان کو یہاں ٹکنے نہیں دینا چاہیے۔ اس مقصد میں آپ ہم سے تعاون کریں۔ ان کی اصل کوشش یہ تھی کہ دربار میں سارا قضیہ زیر بحث نہ آنے پائے۔ اور مہاجرین کو سرے سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ بادشاہ یک طرفہ بات سن کر ان کو ہمارے حوالے کر دے۔ اسی مقصد کے لیے رشوت اور ساز باز کے طریقے اختیار کیے گئے تھے۔ یہ لوگ جب درباریوں کو روغنِ قاز ل چکے تو نجاشی کے سامنے تحائف لے کر پیش ہوئے۔ پھر اپنی غرض بیان کی کہ مکہ کے اشراف نے ہم کو آپ کی خدمت میں اس لیے بھیجا ہے کہ آپ ہمارے آدمیوں کو ہمارے ساتھ واپس کر دیں۔ درباریوں اور پادریوں نے بھی تائید کی۔ مگر نجاشی نے یک طرفہ دعوے پر کارروائی کرنے سے انکار کر دیا۔ اور صاف کہا کہ ان لوگوں سے دریافتِ احوال کیے بغیر میں ان کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا۔ دوسرے دن دربار میں دونوں فریق طلب کیے گئے۔ مسلمانوں کو جب طلبی کا پیغام پہنچا تو ان کے درمیان مشورہ ہوا کہ بادشاہ عیسائی ہے اور ہم لوگ اپنے اعتقاد اور مسلک میں اس سے اختلاف رکھتے ہیں تو آخر کیا کہا جائے۔ لیکن فیصلہ یہی ہوا کہ ہم دربار میں وہی کچھ کہیں گے جو کچھ خدا کے نبی نے ہم کو سکھایا ہے۔ اور اس میں ایک سر مو فرق نہ لائیں گے۔ جو ہو سو ہو۔ اندازہ کیجیے کہ ان لوگوں کا ایمان کیسا محکم تھا۔ اتنے سنگین حالات میں حق اور راستی پر قائم رہنے کا عزم خدا کی دین ہے۔ پھر جب یہ حضرات دربار میں پہنچے تو مقررہ آداب کے مطابق نجاشی کو سجدہ کرنے سے اجتناب کیا۔ درباریوں نے اس طرزِ عمل پر برا منایا۔ اور سوال کیا گیا، کہ آخر تم لوگوں نے سجدہ کیوں نہیں کیا۔ حضرت جعفر متکلم نے پوری جرأت سے جواب دیا کہ ہم لوگ سوائے اللہ کے کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ اور خود رسول اللہ کو

بھی سیدھے سادے طریق سے سلام ہی کہتے ہیں۔ غور کیجیے کن نازک حالات میں سچی توحید کا یہ انقلابی مظاہرہ کیا جا رہا تھا جریف جس طاقت کے سامنے چا پلوسی کر رہے تھے، یہ لوگ اُس کے روبرو اصول پسندانہ خودداری کا رنگ دکھا رہے تھے۔

اب سفارتِ مکہ نے اپنا دعویٰ پیش کیا کہ یہ مہاجرین ہمارے بھگورے مجرم ہیں! انہوں نے ایک نیا دین گھڑ لیا ہے اور ایک تخریبی طوفان اٹھا کھڑا کیا ہے۔ لہذا ان کو ہمارے حوالے کیا جائے۔ نجاشی نے مسلمانوں سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ اور عبیثیت اور بت پرستی کے علاوہ وہ کونسا دین ہے جو تم لوگوں نے اختیار کیا ہے۔

حضرت جعفر مسلمانوں کی طرف سے ترجمان بن کے اٹھے اور انہوں نے نجاشی سے اجازت طلب کی کہ پہلے وہ سفارتِ مکہ سے کچھ سوالات کر لیں۔ اجازت ملنے پر یوں مکالمہ ہوا :-  
حضرت جعفر: "کیا ہم کسی کے غلام ہیں جو آقا سے بھاگ آئے ہوں؟ اگر ایسا ہو تو ہمیں واپس کیا جانا چاہیے؟"

عمر بن العاص: "نہیں۔ یہ لوگ کسی کے غلام نہیں۔ آزاد شرفا ہیں۔"  
حضرت جعفر: "کیا ہم کسی کو ناحق قتل کر کے آئے ہیں؟ اگر ایسا ہو تو آپ ہمیں اویسے مقتول کے حوالے کر دیں؟"

عمر بن العاص: "نہیں۔ انہوں نے خون کا ایک قطرہ بھی نہیں بہایا۔"  
حضرت جعفر: "کیا ہم کسی کا کچھ مال لے کر بھاگے ہیں۔ اگر ایسا ہو تو ہم اس کی ادائیگی کرنے کو تیار ہیں؟"

عمر بن العاص: "نہیں۔ ان کے ذمہ کسی کا ایک ہتہ بھی نہیں۔"  
اس جرح سے جب مسلمانوں کی انفرادی پوزیشن پوری طرح صاف ہو گئی۔ تو حضرت جعفر نے یہ تقریر کی :-

"اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے۔ بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، قومی لوگ کمزوروں کو کھایا جایا کرتے تھے۔ اسی اثنا میں ہم میں ایک شخص پیدا ہوا جس کی شرافت، سچائی اور دیانت سے ہم لوگ پہلے سے آگاہ تھے، اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی۔ اور یہ سلا لیا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں۔ سچ بولیں، خوریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ سٹیں

ہمسایوں کو آرام دیں، عقیقت عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں، نماز پڑھیں، روزے رکھیں۔ صدقہ دیں۔ ہم اس پر ایمان لائے۔ شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام اعمال بد سے باز آئے۔ اس جرم میں ہماری قوم ہماری جانوں کی دشمن ہو گئی۔ اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ پھر اسی گمراہی میں لوٹ آئیں۔ پس ہم اپنا ایمان اور اپنی جانیں لے کر آپ کی طرف بھاگ کر آئے ہیں۔ اگر ہماری قوم ہم کو وطن میں رہنے دیتی تو ہم نہ نکلتے۔ یہ ہے ہماری روداد!

بات سچی ہو اور کہنے والا دلی جذبات کے ساتھ اسے کہے تو لازماً وہ اثر کرتی ہے۔ نجاشی جیسے خدا ترس بادشاہ کا دل موم ہو گیا۔ اب وہ کہنے لگا، کہ ذرا اس کتاب کا بھی کوئی حصہ سناؤ جو تم لوگوں پر اتنی ہے۔ چنانچہ حضرت جعفر نے سورہ مریم کا ایک حصہ پڑھا۔ آیات الہی کو سن کر بادشاہ کے دل پر رقت طاری ہو گئی، اس کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔ وہ بے اختیار پکار اٹھا۔ "خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پر تو ہیں۔" بلکہ اس پر مستزاد یہ کہا۔ کہ "محمد تو وہی رسول ہیں جن کی خبر یسوع مسیح نے دی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس رسول کا زمانہ ملا۔" ساتھ ہی فیصلہ دیا کہ مہاجرین کو واپس نہیں کیا جاسکتا۔ کارروائی ختم ہو گئی۔ اور سفارت ناکام ہوئی۔ بعد میں ان لوگوں نے پھر آپس میں مشورہ کیا کہ ایک کوشش اور کی جانی چاہیے۔ نجاشی عیسائی ہے اور اگر حضرت عیسیٰ کے بارے میں مسلمانوں کا عقیدہ دربار میں نمایاں کرایا جائے تو ممکن ہے کہ شاہ کے اندر مذہبی تعصب کی آگ بھڑک اٹھے۔

دوسرے دن عمرو بن العاص پھر دربار میں پہنچے اور نجاشی کے کان بھرنے کے لیے یہ الزام تراشا کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بہت خراب عقیدہ رکھتے ہیں۔ نجاشی نے پھر مسلمانوں کو طلب کر لیا۔ ان کو جب صورتِ حالات معلوم ہوئی تو کچھ تردد ہوا کہ عیسیٰ کے "ابن اللہ" ہونے کا انکار کرنے پر نجاشی کا ردِ عمل نہ جانے کیا ہو۔ لیکن عزیمت نے کہا کہ جو امر حق ہے اسے صاف صاف پیش کر دو۔ حضرت جعفر نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے اور پیغمبر ہیں اور

کلمۃ اللہ ہیں۔

نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ واللہ! جو تم نے کہا ہے عیسیٰ اس سے اس تنکے بھر بھی زیادہ نہیں ہیں۔ پادری جو سازش کا شکار اور رشوت اور ہدایا سے مسحرفھے، دل ہی دل میں بہت بیچ و تاب کھا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے نتھنوں سے سانس کی خرخر اہٹ سناٹی دینے لگی۔ نجاشی

نے ان کی کچھ پروا نہیں کی۔ حکم دیا کہ تمام تحائف واپس کر دیے جائیں۔ مکہ کا دند پوری طرح خائب و خامس ہو کر لوٹا۔

## عمر مفتوح ہو جاتے ہیں :

تشدد کی اس داستان کا وہ باب سب سے ممتاز ہے، جو حضرت عمرؓ کے غیظ و غضب سے مرتب ہوا تھا۔ عمرؓ ستائیسویں سال میں تھے جب کہ نبوت محمدی کا علم بلند ہوا۔ اسلام جلد ہی آپ کے گھرانے میں نفوذ کر گیا۔ آپ کے بہنوئی سعید پہلے پہل اسلام لائے، ان کے اثر سے آپ کی بہن فاطمہ بھی مسلمان ہو گئیں۔ خاندان کی ایک اور بااثر شخصیت نعیم بن عبداللہ نے بھی دعوت حق پر لبیک کہی۔ اول اول ان کو اسلام کے اس نفوذ کا حال معلوم نہیں ہو سکا۔ جو نبی علم ہوا تو یہ آپ سے باہر ہو گئے اور اسلام لانے والوں کے دشمن بن گئے۔ بسینہ ان کے خاندان کی کنیز تھیں ان کو مارتے مارتے تھک جاتے تو دم لینے کے لیے الگ ہوتے، پھر تازہ دم ہو کر مارتا شروع کر دیتے۔

آخر ایک دن تہیہ کر لیا کہ کیوں نہ اصل داعی حق ہی پر ہاتھ صاف کر لیا جائے۔ اس کا ایک محرک تاریخی روایات میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ ابو جہل نے رسول خدا کے قتل کرنے والے کے لیے انہی دنوں سوارنٹ کا انعام مقرر کیا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے مزاج سے بعید ہے کہ وہ ایسے لالچ کا شکار ہوتے ہوں۔ قیاس یہی کہتا ہے کہ وہ اس اقدام کو ایک اخلاقی فرض اور اپنے آبائی دین کی خدمت سمجھ کے کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال وہ تلوار سے کرپے ساتے میں نعیم بن عبداللہ سے ڈبھیٹ ہو گئی۔ انہوں نے کہا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لو اور بہن اور بہنوئی سے منٹ لو، پھر کسی اور طرف جانا۔ فوراً پلٹے اور بہن کے گھر پہنچے۔ وہ قرآن پڑھ رہی تھیں۔ آہٹ ہوئی تو خاموش ہو گئیں اور قرآن کے اوراق چھپا بیٹے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یہ کیا پڑھا جا رہا تھا۔ بہن نے ٹالا۔ کہنے لگے کہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم دونوں مرتد ہو چکے ہو۔ یہ کہہ کر بہنوئی پر ٹوٹ پڑے۔ بہن بیچ بچاؤ کے لیے آئیں تو ان کے مارا۔ ان کا جسم لہولہاں ہو گیا۔ لیکن ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ عزیمت مندانہ انداز سے کہنے لگیں۔

”عمرؓ! جو کچھ کر سکتے ہو، کرو! لیکن اسلام اب دل سے نہیں نکل سکتا۔“

ایک خاتون، اور وہ بھی بہن — ایک پیکر جذبات! — جسم زخمی! کپڑے خون آلود۔ آنکھوں میں آنسو! — اور زبان پر یہ عزیمت مندانہ بول! اندازہ کیجئے کہ اسلام نے کیسی روح نوخواتین کے اندر پیدا کر دی تھی۔ عمرؓ کی قاہرانہ طاقت نے اس مظلومانہ منظر کے سامنے ہار مان لی۔ ہیرے کا جگڑ پھیل کی پتی سے کٹ گیا۔ فرمایا۔ جو تم پڑھ رہی تھیں، مجھے بھی لاکر سناؤ۔ وہ گئیں اور اجزائے قرآن نکال لائیں جب یہ غماظ سامنے آئے کہ ”امنوا باللہ ورسولہ“ تو بے اختیار پکار اٹھے۔ اشھدان لا الہ



الا اللہ واشہدان محمداً عبداً ورسولاً - ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر تحریکِ حق کے مرکز — خانہ ارقم — کی طرف چلے۔ وہاں جا کر خدا کے رسولؐ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس واقعہ پر مسلمانوں نے مارے خوشی کے ایسا نعرہ تکبیر بلند کیا کہ مکہ کا سارا ماحول گونج اٹھا۔ داعیانِ حق اٹھے اور مکہ میں پھیل گئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی قوت بڑھ گئی ہے۔ حضرت عمرؓ کے ایمان لاتے ہی کعبہ میں پہلی مرتبہ علانیہ نماز باجماعت کی ادائیگی کا سلسلہ شروع ہوا۔

حضرت عمرؓ مکہ کے نوجوان میں اپنے جوش اور ذہانت کی وجہ سے امتیازی مقام رکھتے تھے ان کا کردار روحِ اخلاص سے مملو تھا۔ وہ جاہلیت کے دور میں تھے تو پورے اخلاص سے تحریکِ اسلامی کے دشمن تھے، انہ کہ کسی ذاتی مفاد کی بنا پر۔ اور جب حقیقت کھل گئی اور فطرتِ سلیمہ سے پرے اٹھ گئے تو پوری شانِ اخلاص سے تحریکِ اسلامی کا علم اونچا کر دیا۔ ان کے جوشِ مخالفت کا انداز اگرچہ بے حد طوفانی تھا۔ مگر ان کی ذہانت اور ان کی فطرتِ سلیمہ برابر حقیقت کی روشنی جذب کرتی رہی۔ مکہ کی فضا میں جو درد و جزر ہو رہا تھا اس کی ہر لہر سے وہ اثر اندوز ہوتے رہے اور یکے بعد دیگرے بہت سے واقعات نے ان کے دل کو قبولِ حق کے لیے تیار کر دیا۔ ایک طرف روزِ دعوتِ حق کے چرچے ان تک پہنچتے ہوں گے دوسری طرف اس کے مخالفین کی ذہنیت کی پستیاں ان پر نمایاں ہوتی ہوں گی، پھر ایک طرف وہ اس کردار کو دیکھتے ہوں گے جو محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاءِ دعوت پیش کر رہے تھے اور دوسری طرف انسانی سیرت کی وہ تاریکیاں ان کی نگاہوں سے گزرتی ہوں گی۔ جن میں مخالفینِ اسلام ڈوبے ہوئے تھے۔ ہر صبح اور ہر شام یہ تقابلی مناظر مکہ کے اس بیدار دل نوجوانوں پر اثر انداز ہوتے ہونگے لیکن اس عمومی صورتِ حالات کے علاوہ بعض خاص واقعات نے بھی کام کیا تھا۔

مثلاً ام عبد اللہ بنت ابی حشمہ ہجرتِ حبشہ کی تیاریوں میں تھیں کہ حضرت عمران کے ہاں پہنچے۔ کہنے لگے :- ام عبد اللہ! معلوم ہوتا ہے کہ مکہ چھوڑنے کی تیاری ہے؟ ام عبد اللہ نے جواب دیا :- ہاں، بخدا ہم خدا کی زمین میں ہجرت کر کے نکل جانے والے ہیں، تم لوگوں نے ہمیں بہت دکھ دیا ہے اور ہم پر استبداد ڈھایا، تاآنکہ اب خدا ہمارے لیے کوئی راہِ نجات کھول دے؟ عمرؓ کہنے لگے :- خدا تمہارا ساتھی ہو، ام عبد اللہ کا بیان ہے کہ اس لمحے ان پر ایسی رقت طاری تھی۔ جیسی میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہماری ترکِ وطن کی تیاریوں کو دیکھ کر وہ حالتِ اندوہ میں چلے گئے۔ اتنے میں عامر بن ربیعہ ام عبد اللہ کے شوہر، آگئے۔ ام عبد اللہ نے ان سے تذکرہ کیا کہ کاش تم اس وقت عمرؓ کی رقت اور غمگینی دیکھتے جو ہماری وجہ سے ان پر طاری ہوئی؟ عامر کہنے لگے۔ کیا تمہیں اس سے اسلام لانے کی امید بندھ گئی ہے؟ ام عبد اللہ نے اثبات میں جواب دیا۔ انہوں نے کہا۔ تم نے جسے دیکھا ہے وہ اس وقت تک اسلام نہیں لاسکتا جب تک کہ خطاب (حضرت عمرؓ کے والد کا نام)۔

کاؤڈھا اسلام نہ لے آئے: ” اُمّ عبد اللہ کہتی ہیں کہ اسلام کے بارے میں ان کی قناعت اور سنگدلی کی وجہ سے اس وجہ کی ناامیدی تھی۔“

لیکن کسے معلوم کہ اس واقعہ نے احساس کا ایک نیا کاشا عمر کے دل میں نہ چھو دیا ہوگا۔ اسی طرح ایک دوسری روایت بتاتی ہے۔ کہ ان کا دل حضور سے قرآن سن کر اثر پذیر ہوا۔ ان کا اپنا بیان یوں ہے کہ :-

میں اسلام سے بہت دور تھا۔ دور جاہلیت میں خوگر مہببا تھا۔ شراب سے رغبت تھی اور خوب پیتا تھا۔ خزورہ میں ہماری محفل جمتی تھی جس میں قریشی اصحاب جمع ہوتے۔ ایک رات میں اپنے انہی ہم نشینوں کی کشش میں اس مجلس میں پہنچا۔ ان کو تلاش کیا۔ مگر ان میں سے کوئی ایک بھی نہ ملا۔ پھر ایک شراب فروش کا خیال آیا کہ وہاں چل کر شراب پیوں اتفاق سے وہ بھی نہ ملا۔ پھر خیال آیا کہ کیوں نہ کعبہ کا رخ کروں اور سات یا ستربا طواف کر لوں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ رکن اسود اور رکن یمانی کے درمیان (شام — یعنی بیت المقدس کے رخ) کھڑے تھے۔ ارادہ ہوا کہ بخدا کیوں نہ آج سنا جائے کہ یہ شخص کیا کہتا ہے۔ غلاب کعبہ کے اندر گھس کر آہستہ آہستہ قریب جا کر سننا رہا۔ میرے اور رسول خدا کے درمیان فقط غلاب کعبہ ہی حائل تھا۔ جب میں نے قرآن سنا تو میرا دل گھل گیا۔ اور میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں! اسی لمحے اسلام میرے اندر داخل ہو گیا۔

بقیہ روایت یہ بتاتی ہے کہ عمرؓ اسی وقت حضور کے پیچھے پیچھے گئے اور اسلام قبول کر لیا۔ لیکن عملاً قبول اسلام کی وہی روایت صحیح ہے جس کی دوسے آپ کے ذہن نے آخری پلٹی بہن کے ایمان اور صبر و استقامت سے متاثر ہو کر کھانی۔ اس روایت کا یہ جزو اپنی جگہ اہم ہے کہ عمرؓ جیسی شخصیت بغیر اس کے کہاں رہ سکتی ہے کہ بہ گوش خویش دعوت حق کو سنے اور اپنی رائے آپ قائم کرے۔ برسوں کے دور کشمکش میں ایسے واقعہ کا پیش آنا بالکل قرین قیاس ہے کہ حضرت عمرؓ بنی اکرمؓ کی زبان سے قرآن سننے پہنچے ہوں اور پھر آیت الہی نے ایمان کا بیج ان کے قلب میں بو دیا ہو۔

قرآن کی مخالفت کرنے والے اور بھی لوگ — بلکہ اکابر بنی تمک — ایسے تھے کہ ذوق تجسس

۱۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۶۵

۲۔ اس زمانے میں یہ مکہ کا ایک بازار تھا اب وہی قطعہ زمین معبر میں شامل ہے۔

۳۔ سیرت ابن ہشام ج ۱ ص ۲۶۸-۹

انہیں چوری چھپے اس آسمانی نغمہ کو سننے کے لیے آتا تھا۔ حالانکہ برسراعام یہی لوگ کہا کرتے تھے کہ قلوبنا فی اکتیۃ (ہمارے دل ملفوف ہیں) ”وفی اذنا وقتراً (ہمارے کان بہرے ہیں) مثلاً ایک ہی رات کو ابوسفیان بن حرب، ابو جہل بن ہشام اور اٹخس بن شریق چھپ کر حصنہ کے گھر کے ارد گرد قرآن سن رہے تھے۔ اتفاق سے واپس ہونے لگے تو آمنہ سامنا ہو گیا۔ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ ایسا نہ کرنا چاہیے۔ ورنہ اگر کوتاہ عقل عوام نے دیکھ لیا، تو ان کے دلوں میں خواہ مخواہ بات بیٹھ جائے گی۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔ اگلی رات وہ پھر آ پہنچے اور پھر وہی باتیں ہوئیں۔ اردو ہی فیصلہ طے پایا۔ مگر پھر رات آئی تو وہی قصہ دوہرا گیا۔ بالآخر بڑا تاکیدی عہد باندھا گیا کہ اب ایسی حرکت نہ ہونے پائے گی۔ اسی سلسلے میں یہ سوال اٹھا کہ ہر ایک کی کیا رائے ہے اس کلام کے متعلق جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سنا گیا ہے۔ سب نے کچھ نہ کچھ کہا۔ اور سب سے آخر میں ابو جہل تنک کر کہنے لگا کہ ”ہم اور بنو عبدمناف ہمیشہ حریف رہے۔“ انہوں نے ہمانذاریاں کیں تو ہم نے بھی کیں انہوں نے خوں بہا دیے، تو ہم نے بھی دیئے۔ انہوں نے سخاوت کی تو ہم نے بھی کی، یہاں تک کہ ہم ان کے ہمسر ہو گئے۔ تو اب وہ یہ کہنے پر اتر آئے ہیں کہ یہ ہمارا نبی ہے جس پر آسمان سے وحی آتی ہے۔ ہم ایسی بات آخر کیونکر قبول کر سکتے ہیں۔ خدا کی قسم، ہم اس پر ایمان نہیں لاسکتے اور نہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔“

اس ضمنی قصے کو ہم نے اس لیے بیان کیا ہے کہ اس عمومی تجسس کا اندازہ کیا جانے کے جو کبھی نہ کبھی حضرت عمرؓ کو بھی رسول خدا کے پاس کلام الہی بگوش خود سننے کے لیے لے گیا ہوگا۔

### تحریک اسلامی کی نئی جست :-

بہر حال اسلام عمرؓ ایک بڑا واقعہ تھا جس کے پیچھے بہت سارے محرکات کام کر رہے تھے یہ واقعہ اس لحاظ سے اور بھی زیادہ بڑا ہو جاتا ہے کہ عین دور تشدد کے لصف النہار میں یہ مردِ حق پسند آگے بڑھتا ہے۔ مخالف طاقت تشدد اس لیے ڈھارس ہی تھی کہ لوگوں کو اسلام سے روکے، لیکن وہی تشدد ان کے منصوبوں کے بخلاف دلوں کو گھٹلا رہا تھا۔ یہ صورت حالات اسلام کی صداقت پر بجائے خود بڑی قطعی شہادت ہے کہ جتنی زیادہ مزاحمتیں بڑھتی گئیں، اتنے ہی بہترین دل و دماغ کے لوگ اس کے سامنے مفتوح ہوتے گئے۔ ہجرت حبشہ کے بعد کے دور میں مکہ اپنے آخری جواہر پارے پیش کر رہا تھا۔

عمرؓ جیسی شخصیت سچائی کے پیغام پر لبیک کہے اور پھر کوئی نیا مدو جزر پیدا نہ ہو، یہ کیسے ممکن تھا

انہوں نے تہیہ کر لیا کہ ایک بار فضا کو چیلنج کر کے رہیں گے۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما اس وقت لڑکے تھے مگر معاملات کو سمجھتے تھے) کا بیان ہے، کہ میرے والد عمر رضی اللہ عنہما جب ایمان لائے تو معلوم کیا کہ قریش کا کونسا آدمی بات کو اچھی طرح نشر کر سکتا ہے۔ نہیں جمیل بن معمر جمحی کا نام بتایا گیا۔ وہ علی الصباح اس کے ہاں پہنچے اور میں بھی ساتھ گیا کہ دیکھوں کیا کرتے ہیں۔ اس سے جا کر کہنے لگے کہ اے جمیل تمہیں معلوم ہے کہ میں اسلام لا چکا ہوں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دین میں شامل ہو گیا ہوں۔ وہ اپنی چادر تھامتے ہوئے مسجد حرام کے دروازے پر پہنچا۔ اور وہاں گلا بچاڑ کر اعلان کیا کہ اے گروہ قریش! سنو! عمر بن خطاب صابی ہو گیا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے آپہنچے اور انہوں نے پکار کر کہا۔ غلط کہتا ہے۔ میں مسلمان ہوا ہوں اور میں نے اعلان کیا ہے کہ ایک اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں اور محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اہل قریش ان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ والد سے خوب لڑے۔ اور والد ان سے لڑے اور اسی ہاتھ پائی میں سورج سر پر آ گیا۔ اسی اثنا میں ایک قریشی سردار یعنی عامر بن عبد مناف نے پوچھا۔ قصہ کیا ہے؟ اس نے بات سنی اور کہا کہ "اس شخص نے اپنے لیے ایک راستہ پسند کر لیا ہے تو اب تم کیا جانتے ہو؟ سوچو تو سہی کہ کیا بنو عدی بن کعب اپنے آدمی کو یوں تمہارے ہاتھوں میں دے سکتے ہیں۔ چھوڑ دو اسے۔ یہ تھے عاص بن وائل سہمی، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو اپنی پناہ میں لے لیا۔"

اسی کے ساتھ ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے جوش ایمانی نے اپنے اظہار کا ایک راستہ اور بھی نکالا۔ انہوں نے ایمان لانے کی پہلی ہی رات کو سوچا کہ رسول خدا کی مخالفت میں انتہائی منتشر کون ہے؟ معلوم ہوا کہ ابو جہل سے بڑھ کر سخت کوئی دوسرا نہیں۔ صبح ہوتے ہی ابو جہل کے ہاں بھی جا پہنچے۔ دروازہ کھٹکھٹایا ابو جہل نکلا اور خوش آمدید کہہ کر مدعا پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ میں یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لے آیا ہوں۔ اور آپ کے پیغام کی سچائی کو تسلیم کر چکا ہوں۔ ابو جہل نے جسٹا کر دروازہ بند کر لیا۔ اور کہا کہ "خدا کی مارتجو اور تیری اس اطلاع پر۔"

تیسری طرف انہوں نے تحریک سادہ می کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ مارتجو کھائی مگر اس کے جواب میں حرم میں علی الاعلان نماز ادا کرنے کا آغاز کر دیا۔ بقول حضرت عبد اللہ بن مسعود: "جب حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے اسلام لانے سے قبل اس پر تادرنہ تھے کہ کعبہ میں نماز ادا کر سکیں۔ عمر رضی اللہ عنہما مسلمان ہوئے تو قریش سے بڑھ کر کعبہ میں نماز ادا کی اور ہم نے بھی ان کے ساتھ نماز ادا کی۔"

ایک طرف تشدد کا وہ زور دیکھیے اور دوسری طرف یہ سماں ملاحظہ ہو کہ اسلام دشمنوں میں سے بہترین عنصر کو چھانٹ رہا تھا۔

### اسلام حمزہؑ :-

ایسا ہی واقعہ حضرت حمزہؑ کا ہے۔ مکہ کا یہ نوجوان ذہانت، شجاعت اور اثر کا مالک تھا۔ حضورؐ کے چچاؤں میں سے جناب ابوطالب کے بعد ایک ہی چچا ایسا تھا جیسے اختلاف کے باوجود آپ سے محبت تھی۔ عمر بھی صرف دو تین برس زیادہ تھی اور ہم عمری کی وجہ سے بچپن میں چچا بھتیجا، بھجولی رہے تھے ایک دن کا واقعہ ہے کہ کوہ صفا کے پاس ابوہلہ نے حضورؐ پر دست دازی کی، اور بہت دریدہ دہنی سے کام لیا۔ حضورؐ نے صبر سے اس اذیت کو برداشت کیا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اتفاق سے عبداللہ بن جدعان کی لونڈی نے یہ سارا ماجرا دیکھا۔ حضرت حمزہؑ شکار پر گئے ہوئے تھے۔ کمان اٹھاتے ہوئے واپس آئے تو اس لونڈی نے قصہ سنایا اور کہا۔ کہ ہاٹے اگر تم خود دیکھ سکتے کہ تمہارے بھتیجے پر کیا گزری یہ سن کر حمزہؑ کی حمیت جاگ اٹھی۔ سیدھے قریش کی مجلس میں پہنچے، جہاں ابوہلہ بیٹھا تھا۔ حرم میں جا کر ابوہلہ کے سر پر کمان ماری اور کہا کہ کیا تم نے محمدؐ کو گالی دی تھی۔ اگر ایسا ہے تو میں بھی اس کے دین پر ہوں اور جو کچھ وہ کہتا ہے وہی کچھ میں بھی کہتا ہوں۔ اب اگر ہمت ہے تو میرے مقابلے پر آؤ۔ ابوہلہ کی حمایت میں بنی مخزوم کا ایک شخص مجلس سے اٹھا مگر ابوہلہ نے اُسے یہ کہہ کر روک دیا کہ جانے دو، میں نے ابوعمارہ کے بھتیجے کو بہت گندی گالیاں دی ہیں۔ حضرت حمزہؑ اسلام پر ڈٹ گئے اور قریش نے محسوس کر لیا کہ رسولؐ خدا کی قوت بڑھ گئی ہے۔

### مقاطعہ اور نظر بندی :

دشمنانِ حق اپنی ساری تدبیروں کے علی الرغم یہ منظر دیکھ رہے تھے کہ حق کا سیلاب آگے ہی آگے بڑھ رہا ہے اور بڑی بڑی اہم شخصیتوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔ اس پر ان کا اضطراب اور بڑھ جاتا۔ محرم ۱۰ء نبوی میں مکہ کے تمام قبائل نے مل کر ایک معاہدہ کیا کہ خاندانِ بنو ہاشم سے بائیکاٹ کیا جائے اور کوئی شخص نہ ان سے قرابت رکھے نہ ان سے شادی بیاہ کا تعلق رکھے۔ نہ لین دین کرے نہ ان سے ملے جلے۔ اور نہ کھانے پینے کا کوئی سامان ان تک پہنچنے دے۔ الا آنکہ بنو ہاشم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمارے سپرد کر دیں اور ان کو قتل کرنے کا ہمیں حق دے دیں۔ یہ فیصلہ جناب ابوطالب سے متعدد گفتگوؤں کے بعد اس

امر سے مایوس ہو کر کیا گیا تھا کہ نہ ابوطالب رسول اللہ کو اپنی سرپرستی سے نکلانے پر تیار ہیں اور نہ ان کی وجہ سے بنو ہاشم تعلق منقطع کر سکتے ہیں۔ بہر حال قبائلی دور کے لحاظ سے یہ فیصلہ انتہائی سنگین تھا اور ایک آخری کارروائی کی نوعیت رکھتا تھا بنو ہاشم بے بس ہو کر شعب ابی طالب میں پناہ گزین ہو گئے۔ گویا پورا خاندان تحریک اسلامی کے داعی کی وجہ سے ایک طرح کی قید اور نظر بندی میں ڈال دیا گیا۔ اس نظر بندی کا دور تقریباً تین برس تک طویل ہوا۔ اور اس دور میں جو احوال گزرے ہیں ان کو پڑھ کر پتھر بھی گمھلنے لگتا ہے۔ درختوں کے پتے نکلے جاتے رہے۔ اور سوکھے چمڑے ابال ابال کر اور آگ پر بھون بھون کر کھائے جاتے رہے۔ حالت یہ ہو گئی۔ کہ بنو ہاشم کے معصوم بچے جب بھوک کے مارے ہلکتے تھے تو دور دور تک ان کی درد بھری آوازیں جاتی تھیں۔ قریش ان آوازوں کو سنتے تو مارے خوشی کے جھوم جھوم جاتے۔ ناکہ بندی اتنی شدید تھی کہ ایک مرتبہ حکیم بن حزام (حضرت خدیجہ کے بھتیجے) نے کچھ گھیوں اپنے غلام کے ہاتھ چوری چھپے بھینجا، راستہ میں ابو جہل نے دیکھ لیا اور گھیوں چھیننے کے درپے ہوا۔ اتفاق سے ابو البختری بھی آگیا۔ اس کے اندر کسی اچھے انسانی جذبے نے کودت لی۔ اور اس نے ابو جہل سے کہا کہ چھوڑو بھی ایک بھتیجا ہے تو تم اسے بھی اب روکتے ہو۔ سی صرح ہشام بن عمرو چوری چھپے کچھ غلہ بھیج دیتے تھے۔

یہی ہشام بن عمرو اس نظام نہ معاہدہ کے خلاف داعی اول بنا۔ پہلے یہ زبیر بن ابی اسید کے پاس گیا۔ اس سے بات کی کہ کیا تم اس بات پر خوش ہو کہ تم کھاؤ پیو، کپڑا پہنو، شادی بیاہ کرو، اور تمہارے ماموں کا یہ حال ہو کہ وہ نہ خریدو فروخت کر سکیں، نہ شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر سکیں۔ اگر معاملہ بوالحکم بن ہشام کے ماموں اور نہنیاں کا ہوتا اور تم نے اسے ایسے معاہدے کی دعوت دی ہوتی تو وہ کبھی اس کی پروا نہ کرتا۔ یہ سن کر زبیر نے کہا۔ میں کیا کروں، میں تو اکیلا آدمی ہوں۔ خدا کی قسم، اگر کوئی دوسرا میرے ساتھ ہوتا تو میں اس معاہدے کی منسوخی کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا اور اسے ختم کر کے دم لیتا۔ ہشام بن عمرو نے کہا۔ کہ دوسرے ساتھی تو تمہیں مل گیا ہے۔ زبیر نے پوچھا: کون؟ ہشام نے کہا: میں! پھر ہشام مطعم بن عدی کے پاس پہنچا۔ اور اسی طرح تحریک کی۔ اس نے بھی وہی جواب دیا۔ کہ اکیلا ہوں کیا کروں؟ ہشام نے وہی جواب دیا کہ دوسرا میں ہوں مطعم نے کہا۔ کہ اب کسی تیسرے کو ڈھونڈنا چاہیے۔ ہشام نے بتایا کہ وہ تو میں نے مہیار لیا ہے، اس نے پوچھا، کون؟ ہشام نے بتایا کہ زبیر بن ابی اسید۔ مطعم کہنے لگا کہ چھ کسی چوتھے کو حاصل کرنا چاہیے اسی طرح ابو البختری اور زبیر بن الاسود تک پہنچ کر ہشام نے بات کی۔

غرض بائیکاٹ کے معاہدے کے خاتمے کی تحریک اندر ہی اندر جب کام کر چکی تو ان سب لوگوں نے ایک جگہ بیٹھ کر طریق کار طے کیا۔ اسکیم یہ بنی کہ ہر عام ہشام ہی بات چھیڑے گا۔ چنانچہ ہشام نے بیت اللہ کا سات

بار طواف کیا۔ پھر لوگوں کی طرف آیا اور کہا کہ مکہ والو! کیا یہ زیبا ہے کہ ہم کھانے کھائیں اور لباس پہنیں اور بنو ہاشم بھوک سے تڑپ رہے ہوں، نہ وہ کچھ خرید سکیں اور پھر اس نے اپنا عزم ان الفاظ میں پیش کر دیا :-

”خدا کی قسم! میں اس وقت تک نہ بیٹھوں گا جب تک کہ تعلقات کو توڑ دینے والی اس ظالمانہ تحریر کو چاک چاک نہ کر لوں“

ابو جہل بھٹا کر اٹھا اور چیخ کر بولا: ”جھوٹے ہو تم۔ خدا کی قسم تم اسے چاک نہیں کر سکتے“ زمعہ بن الاسود نے ابو جہل کو جواب دیا: ”تم، خدا کی قسم! سب سے بڑھ کر جھوٹے ہو یہ معاہدہ معلوم ہے جس ڈھب سے لکھا گیا ہے ہم اسے پسند نہیں کرتے“ ابو البختری بھی بول اٹھا: ”سچ کہا زمعہ نے ہم کو پسند نہیں جو کچھ اس میں لکھا گیا ہے اور نہ ہم اس کو مانتے ہیں“ مطعم نے بھی تائید مزید کی: ”تم دونوں ٹھیک کہہ رہے ہو اور غلط کہتا ہے جو اس کے علاوہ کچھ کہتا ہے“ ہشام نے بھی یہی بات کہی۔ اکثریت کو یوں مخالف پا کر ابو جہل اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ اور معاہدہ چاک کر دیا گیا۔ لوگ جب اُسے دیوار کعبہ سے اتارنے لگے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ اسے دیکھ چاٹ چکی تھی۔ صرف باسمک اللہ وعدہ“ کے الفاظ سلامت تھے۔

## سال اندوہ :-

دور نظر بندری کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ایک بار پھر خدا کا بیٹا اپنے گھرانے سمیت آزادی کی فضا میں داخل ہوا۔ لیکن اب اس سے بھی سخت تر دور کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نبوت کا دسواں سال تھا۔ اس سال میں اولین سانحہ یہ پیش آیا کہ حضرت علیؑ کے والد ابوطالب کی وفات ہو گئی۔ اس طرح وہ ایک ظاہری سہارا بھی چھن گیا جو حضورؐ کو اپنے سایہ شفقت میں لیے ہوئے دشمنوں کے لیے پوری استقامت سے آخر دم تک مزاحم رہا تھا۔

اسی سال دوسرا صدمہ حضورؐ کو حضرت خدیجہؓ کی رحلت کا اٹھانا پڑا۔ حضرت خدیجہؓ محض حضورؐ کی بیوی ہی نہ تھیں۔ بلکہ سبقتوں الاولوں میں تھیں۔ اور انہوں نے دور رسالت سے قبل بھی مونس و غمگساری میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ اور اولین وحی کے نزول سے لے کر تادم آخر راہِ حق میں حضورؐ کے ساتھ سچی رفاقت کا حق ادا کر کے دکھلا گئیں۔ نحر یک حق کی حمایت میں مال بھی خرچ کیا قدم قدم پر مشورے

بھی دیے اور دل جذبے سے تعاون دکھایا۔ سچا طور پر کہا گیا ہے کہ "کانت لسا و ذبیحاً : (وہ حضور کے لیے وزیر تھیں)

ایک طرف تو یکے بعد دیگرے یہ دوصدے حضور کو سہنے پڑے اور دوسری طرف ان ظاہری سہاروں کے ہٹ جانے کی وجہ سے مخالفت کا طوفان اور زیادہ چڑھاؤ پر آگیا۔ اب تو گویا موجیں سر سے گزرنے لگیں مگر مثبت الہی کا تقاضا غالباً یہ تھا کہ سچائی اپنا راستہ آپ بنائے، سچائی اپنی حفاظت آپ کرے۔ سچائی اپنے لیے خود ہی واحد سہارا ثابت ہو۔ اب جو دنیوی سہارے پوری طرح ہٹا لیے گئے تھے شاید اس کے بغیر سچائی کی روح پوری طرح واضح نہ ہو سکتی۔ انہیں غم انگیز حالات کی وجہ سے یہ سال سال اندوہ یا غم الحزن کے نام سے موسوم ہوا۔

اب قریش انتہائی ذلیل حرکتوں پر اتر آئے۔ لونڈوں کے غول پیچھے لگا دیے جاتے جو شور مچاتے اور حضور نماز پڑھتے تو وہ تالیاں پیٹتے۔ راستہ چلتے ہوئے حضور پر غلاطت پھینک دی جاتی۔ دروازے کے سامنے کلٹے بچھانے جاتے۔ کبھی گلا گھونٹ دیا جاتا۔ اور کبھی دست تعدی دراز کیا جاتا۔ کھلم کھلا گالیاں دی جاتیں۔ پھبتیاں کسی جاتیں آپ کے چہرہ مبارک پر خاک پھینکی جاتی۔ بلکہ بعض خبیث بدتمیزی کی اس آخری حد تک پہنچے کہ آپ کے رُخ انور پر تھوک دیتے۔

ایک بار ابولہب کی بیوی ام جہیل پتھر سے حضور کی جستجو میں حرم تک اس ارادے سے آئی کہ بن ایک ہی وار میں کام تمام کر دے۔ مگر حضور اگرچہ حرم میں سلمنے ہی موجود تھے لیکن خدا نے اس کی نگاہ کو راستی نہ دی۔ اور وہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے سامنے اپنے دل کا بخار نکال کر چلی آئی۔ اس نے اپنے یہ اشعار بھی پڑھے۔

مَذْمَمًا عَصِيْبًا وَ اَمْرًا اَبِيْنَا وَ دِيْنًا قَلِيْنَا ۝

مذمّم (حضور کو محمد کے بھانے مذمّم کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی گئی) کی ہم نے نافرمانی کی اس کی بات ماننے سے ہم نے انکار کیا۔ اس کے دین سے ہم نے بغض رکھا (نام بگاڑنا اور بُرے بُرے الفاظ استعمال کرنا اخلاقِ پستی کی دلیل ہے۔ تریف جب بالکل ذات میں گر جاتا ہے تو ان گندے ہتھیاروں سے کام لیتا ہے)

اس پر حضور کما کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان لوگوں کے سب دشتم سے یوں بچاتا ہے کہ یہ مذمّم کو گالی دیتے ہیں۔ اور میں محمد ہوں۔

اسی طرح ایک بار ابو جہیل نے پتھر سے حضور کو ہلاک کر دینے کا ارادہ کیا۔ اور اسی ارادے میں حضور تک پہنچا بھی۔ مگر خدا نے ابو جہیل کو خوف و موعوبیت کے ایسے عالم میں ڈالا کہ وہ کچھ نہ کر سکا۔



ایک بار دشمنوں کا غول کا غول ٹوٹ پڑا اور محسن انسانیت کو سخت اذیت دی۔ واقعہ یوں ہوا کہ دشمنانِ حق بیٹھے یہی تذکرہ کر رہے تھے کہ اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے معاملے میں ہم نے جو کچھ برداشت کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اسی دوران میں حضور تشریف لے آئے۔ ان لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا تم ایسا کہتے ہو۔ حضور نے پوری اخلاقی جرأت سے فرمایا۔ ہاں! میں ہوں جو یہ اور یہ کہتا ہے! بس یہ کہتا تھا کہ چاروں طرف سے دھاوا بول دیا گیا۔ عبد اللہ بن عمرو بن عاص کا بیان ہے کہ قریش کی طرف سے اس سے بڑھ کر حضور کے خلاف میں نے کوئی دہرا دستہ نہیں دیکھی۔

حمہ آدرک گئے تو خدا کے رسول نے پھر اسی فوق الانسانی جرأت سے کام لے کر ان کو ان الفاظ سے متنبہ کیا کہ میں تمہارے سامنے یہ پیغام لایا ہوں کہ تم ذبح ہو جانے والے ہو یعنی استبداد کی یہ پھری جو تم مجھ پر تیز کر رہے ہو، تاریخ میں کام کرنے والا قانونِ الہی بالآخر اسی سے خود تم کو ذبح کر ڈالے گا۔ تمہارا یہ زور و اقتدار جو ظلم کے رخ پر گیا ہے، یہ یکسر ختم ہو جانے والا ہے۔

ان تفصیلی واقعات کے زمانِ وقوع کے بارے میں قطعیت سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ یہ واقعات انتہائی دورِ تشدد سے متعلق ہو سکتے ہیں اور یہ دور بہر حال جناب ابوطالب کی وفات کے بعد نمودار ہوا تھا۔

حضرت عثمان بن عفان ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے۔ عقبہ بن معیط، ابو جہل اور امیہ بن خلف حطیم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جب حضور ان کے سامنے سے گزرتے تو وہ کلماتِ بد زبانوں پر لالتے۔ تین بار ایسا ہی ہوا۔ آخری مرتبہ حضور نے چہرہ متغیرہ کے ساتھ کہا کہ "بخدا تم بغیر اس کے باز نہ آؤ گے کہ خدا کا عذاب جلد تم پر ٹوٹ پڑے"۔ حضرت عثمان کہتے ہیں کہ ہیبت حق تھی کہ یہ سن کر ان میں سے کوئی نہ تھا جو کانپ نہ رہا ہو۔ یہ فرما کر حضور اپنے گھر کو چلے تو حضرت عثمان اور دوسرے لوگ ساتھ ہو لیے۔ اس موقع پر حضور نے ہم سے خطاب کر کے فرمایا:

"تم لوگوں کو بشارت ہو۔ اللہ تعالیٰ یقیناً اپنے دین کو غالب کرے گا اور اپنے کلمہ کی تکمیل کرے گا۔ اور اپنے دین کی مدد کرے گا۔ اور یہ لوگ جنہیں تم دیکھتے ہو، اللہ تعالیٰ بہت جلد تمہارے ہاتھوں سے ذبح کرائے گا۔"

غور کیجیے کہ بظاہر یاس انگیز ماحول میں یہ بشارت دی جا رہی تھی اور پھر کس شان سے یہ بہت ہی جلد پوری ہوئی۔ گویا تحریکِ حق نے ہتھیلی پر سرسوں جادی۔

## طائف میں دعوتِ حق :-

زمانی لحاظ سے قطعیت کے ساتھ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ واقعہ کب کا ہے۔ بعض لوگوں نے اسے سووہ مدثر کے شانِ نزول کے طور پر بیان کیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اسے ابتدائی دور میں رکھنا چاہیے مگر واقعہ کی نوعیت کہتی ہے کہ اس کا زمانہ کلی دور کے اواخر کی طرف ہوگا۔

ایک روز رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم علی الصبح گھر سے نکلے اور خدا کا پیغام سنانے کے لیے مکہ کے مختلف کوچوں میں گھومے پھرے لیکن وہ ایک دن پورا ایسا گزرا کہ آپ کو ایک ہومی بھی ایسا نہ ملا جو بات کو سنتا۔ نئی اسکیم یہ اختیار کی گئی تھی کہ آپ کو جب آتے دیکھا جائے۔ تو لوگوں کو چاہیے کہ ادھر ادھر تک جائیں۔ بات سننے سے بات پھیلتی ہے اور مخالفت کرنے سے اور بحثیں چھیڑنے سے وہ اور زیادہ ابھرتی ہے۔ اسکیم کامیاب رہی۔ جو لوگ ملے بھی انہوں نے استہزاء اور غنڈہ گردی کا مظاہرہ کیا۔ اس روز آپ پورا دن گزار کر جب پلٹے تو اداسی کا ایک بھاری بوجھ آپ کے سینے پر لدا ہوا تھا۔ سخت گھٹن تھی۔ ایسی گھٹن جو کسی کی خیر خواہی کرنے والے کو اس دقت ہوتی ہے کہ جس کی وہ خیر خواہی کر رہا ہو، وہی خود محسن گشتی پر اتر آئے۔

اس خاص دن کا تجربہ گویا اس امر کی اطلاع تھا کہ مکہ کی کھیتی اب بخر ہوئی جا رہی ہے اور اسے جو کچھ فصل دینی تھی وہ دے چکی ہے۔ بعد کے حالات — بد سے بدتر ہوتے ہوئے حالات نے اس کی توثیق کی اور آہستہ آہستہ جو ہر قابل رکھنے والے آخری ذرات بھی محسن انسانیت کے گرد سمٹ آئے۔ شاید اسی دن سے آپ کے دل میں یہ رجحان پیدا ہو گیا تھا کہ اب مکہ سے باہر نکل کر کام کرنا چاہیے۔ ایک سیرت مند داعی جب اپنے ابتدائی مرکز پر اتنا کام کر چکتا ہے کہ وہاں کے کارآمد لوگ لبیک کہہ دیتے ہیں اور باقی عرفِ مندی معاندین رہ جاتے ہیں، تو پھر وہ اپنی قوتیں خواہ مخواہ ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ نئی کھیتی تلاش کرتا ہے اور ماحول کو بدل کر تجربہ کرتا ہے۔

ایسے ہی حالات میں نبی اکرم نے مکہ کے گرد و پیش میں کام کرنے کا ارادہ باندھا۔ دعوت کی نسیم فی الحقیقت طائف کے لیے چلی تھی۔ زید بن حارثہ کو ساتھ لے کر سرورِ عالم مکہ سے پیدل چلے اور راتے میں جو قبائل آباد تھے، ان سب کے سامنے خدا کا پیغام پیش کیا۔ قریباً ایک مہینہ کی مدت آنے جانے میں صرف ہو گئی۔

طائف ایک بڑا سرسبز قطعہ تھا۔ پانی، سایہ، کھیتیاں، باغات۔ نسبتاً کھنڈا متتام۔ لوگ بڑے خوشحال تھے اور دنیا پرستی میں بری طرح مگن۔ انسان ایک مرتبہ معاشی خوشحالی پالے تو پھر وہ خدا فراموش اور خنگ میں ڈوبتا چلا جاتا ہے۔ یہی حال اہل طائف کا تھا۔ مکہ والوں میں تو پھر بھی مذہبی سر رہی

اور ملکی قیادت کی ذمہ داریوں کی وجہ سے کسی قدر اخلاقی رکھ رکھاؤ ہو سکتا تھا لیکن طائف کے لوگ پوری طرح لالچالی ڈھب کے تھے۔ اور پھر سود خواری نے ان کے اچھے انسانی احساسات کو بالکل ملیا میٹ کر دیا تھا۔ حضور گویا کتے سے بدتر ماحول میں قدم رکھ رہے تھے۔

محسنِ انسانیت طائف میں پہنچے تو پہلے ثقیف کے سرداروں سے ملاقات کی۔ یہ تین بھائی تھے۔ عبدیاللیل۔ مسود اور حبیب۔ ان میں سے ہر ایک کے گھر میں قریش (بنی جمح) کی ایک عورت تھی۔ اس وجہ سے ایک طرح کی لحاظ داری کی توقع ہو سکتی تھی۔ حضور ان کے پاس جا بیٹھے۔ ان کو بطریق احسن اللہ تعالیٰ کی طرف بلا یا۔ اور اپنی دعوت پر گفتگو کی اور ان سے اقامتِ حق کے کام میں حمایت طلب کی۔ اب جواب نیٹے جو تینوں کی طرف سے ملتا ہے :-

ایک :- "اگر واقعی خدا نے ہی تم کو بھیجا ہے تو بس پھر وہ کعبہ کا غلاف سچوانا چاہتا ہے۔  
دوسرا :- "ارے! کیا خدا کو تمہارے علاوہ رسالت کے لیے کوئی اور مناسب آدمی نہ مل سکا؟"

تیسرا :- "خدا کی قسم! میں تجھ سے بات بھی نہیں کروں گا۔ کیونکہ اگر تو اپنے کہنے کے مطابق واقعی اللہ کا رسول ہے، تو پھر تجھ ایسے آدمی کو جواب دینا سخت خلافِ ادب ہے۔ اور اگر تم نے خدا پر افترا باندھا ہے تو اس قابل نہیں ہو، کہ تم سے بات کی جائے۔"

زہر میں مجھے ہوئے تیر تھے جو انسانیت کے محسن کے سینے میں پے در پے پویست ہوتے چلے گئے۔ آپ نے تحمل سے اپنے دل پر سارے زخم سہ لیے اور ان کے سامنے آخری بات یہ رکھی کہ تم اپنی یہ باتیں اپنے ہی تک رکھو اور کم سے کم عوام کو ان سے متاثر نہ کرو۔

مگر انہوں نے اپنے ہاں کے گھٹیا اور بازاری لوندوں اور نوکروں اور غلاموں کو ہشکا کر آپ کے پیچھے لگا دیا کہ جاؤ اور اس شخص کو بستی سے نکال باہر کرو۔ ایک غول کا غول آگے پیچھے ہوا۔ یہ لوگ گالیاں دیتے، شور مچاتے اور پتھر مارتے تھے۔ پتھر تاک کر ٹخنوں کی ہڈیوں پر مارتے تاکہ زیادہ اذیت پہنچے۔ حضور جب نڈھالی ہو جاتے تو بیٹھ جاتے۔ لیکن طائف کے غنڈے آپ کو بازو سے پکڑ کر اٹھا دیتے۔ اور پھر ٹخنوں پر پتھر مارتے اور تالیاں بجا بجا کر سنتے۔ خون بے تحاشا بہ رہا تھا، اور جوتیاں اندر اور باہر سے لپٹ لگتی۔ اس نادر تماشا کو دیکھنے کے لیے بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ غنڈوں کا غول اس طریقے سے آپ کو شہر سے نکال کر ایک باغ کے احاطے تک لے آیا۔ جو ربیعہ کے بیٹوں عتبہ اور شیبہ کا تھا۔ آپ نے بالکل بے دم ہو کر انگوڑی ایک بیل سے ٹیک لگالی۔ باغ کے مالک آپ کو دیکھ رہے تھے اور جو

کچھ آپ پر مبتی اس کا بھی کچھ مشاہدہ کر چکے تھے۔

یہ وہ موقع تھا جب کہ دو گانہ پڑھنے کے بعد آپ کے ہونٹوں سے ذیل کی درد بھری دعا نکلا۔  
 اللہ الہی! اپنی قوت کی کمی اپنی بے سرو سامانی اور لوگوں کے مقابلے میں اپنی بے بسی  
 کی فریاد تجھی سے کرتا ہوں۔ تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔  
 درماندہ بیکسوں کا پروردگار تو ہی ہے تو ہی میرا مالک ہے آخر تو مجھے کس کے حوالے  
 کرنے والا ہے۔ کیا اس حریف بیگانہ کے جو مجھ سے ترشروٹی روا رکھتا ہے یا ایسے  
 دشمن کے جو میرے معاملے پر قابو رکھتا ہے۔ لیکن اگر مجھ پر تیرا غضب نہیں ہے تو پھر  
 مجھے کچھ پروا نہیں۔ بس تیری عافیت میرے لیے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ میں اس بات  
 کے مقابلے میں کہ تیرا غضب مجھ پر پڑے یا تیرا عذاب مجھ پر وارد ہو، تیرے ہی نور و جمال  
 کی پناہ طلب کرتا ہوں جس سے ساری تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور جس کے ذریعے  
 دین و دنیا کے جملہ معاملات سنور جاتے ہیں مجھے تو تیری رضا مندی اور خوشنودی کی طلب  
 ہے۔ بجز تیرے کہیں سے کوئی قوت و طاقت نہیں مل سکتی۔“

اتنے میں باغ کے مالک بھی آپہنچے، ان کے دلوں میں ہمدردی کے جذبات اُٹھ آئے تھے۔ انہوں  
 نے اپنے نصرانی غلام کو پکارا۔ اس کا نام عداس تھا۔ پھر ایک طشتری میں انگوروں کا خوشہ رکھوا کر بھجوایا۔  
 عداس انگور پیش کر کے آنحضرت کے سامنے بیٹھ گیا۔ آپ نے ہاتھ انگور کی طرف بڑھائے ہی بسم اللہ کہا  
 عداس کہنے لگا: ”خدا کی قسم! اس طرح کی بات اس شہر کے لوگ تو کبھی نہیں کہتے“ رسول اللہ صلی اللہ  
 علیہ وسلم نے پوچھا۔ کہ تم کس شہر کے آدمی ہو۔ اور تمہارا دین کیا ہے تو اس نے بتایا کہ نصرانی ہوں اور نینوا  
 کا باشندہ۔ آپ نے فرمایا: ”تو تم یونس بن متی جیسے مرد صالح کی بستی کے آدمی ہو تو عداس نے حیرت سے  
 پوچھا۔ ”آپ کو کیسے معلوم کہ یونس بن متی کون ہے تو آپ نے کہا: ”وہ میرا بھائی ہے، وہ بھی نبی تھا  
 اور میں بھی نبی ہوں۔“ یہ سنتے ہی عداس آپ کے ہاتھ پاؤں کو چومنے لگا۔ ربیعہ کے بیٹوں میں سے ایک نے  
 یہ ماجرا دیکھا تو اس نے عداس کے واپس جانے پر ملامت کی کہ یہ کیا حرکت تم کر رہے تھے۔ تم نے اپنا دم  
 خراب کر لیا ہے۔ عداس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا: ”میرے آقا! اس سے بڑھ کر زمین میں کوئی  
 چیز بھلی نہیں۔ اس شخص نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے جسے نبی کے سوا کوئی اور نہ جان سکتا۔“

درحقیقت اب جناب ابوطالب کی وفات کے بعد مکہ میں آپ صفاہری لحاظ سے بالکل بے سہارا  
 تھے اور دشمن شیر ہو گئے تھے۔ خیال فرمایا کہ طائف میں سے شاید کچھ اللہ کے بندے اُٹھ کھڑے ہوں۔ وہاں

یہ صورت پیش آئی۔ وہاں سے پھر آپ نخلہ میں قیام پذیر رہے، وہاں سے واپس آئے اور غارِ حرا میں تشریف فرما ہوئے۔ یہاں سے مطعم بن عدی کو پیغام بھیجا یا کہ کیا تم مجھے اپنی حمایت میں لے سکتے ہو؟ عرب کے قومی کردار کی ایک روایت یہ تھی کہ حمایت طلب کرنے والے کو حمایت دی جاتی تھی۔ خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو، مطعم نے پیغام قبول کر لیا۔ بیٹوں کو حکم دیا کہ ہتھیار لگا کر حرم میں چلو۔ خود رسول اللہ کو ساتھ لایا۔ اور مکہ میں آ کر اونٹ پر سے اعلان کیا، کہ میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پناہ دی ہے۔ مطعم کے بیٹے آپ کو تلواروں کے سائے میں حرم میں لائے۔ پھر گھر میں پہنچایا۔

طائف میں حضور پر جو کچھ گندی اسے مشکل ہی سے روایات کے الفاظ ہم تک منتقل کر سکتے ہیں ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ پر احد کے دن سے بھی سخت دن کوئی گزرا ہے؟ فرمایا: تیری قوم کی طرف سے اور تو جو تکلیفیں پہنچیں سو پہنچیں مگر سب سے بڑھ کر سخت دن وہ تھا جب میں نے طائف میں عبدیایل کے بیٹے کے سامنے دعوت رکھی اور اس نے اسے رد کر دیا اور اس درجہ صدمہ ہوا کہ قرن الثعالب کے مقام تک جا کر بمشکل بیعت ہو گیا۔

زید بن حارثہ جنہوں نے آپ کے نڈھال اور بیہوش ہو جانے پر طائف سے کندھوں پر آپ کو اٹھا کر شہر کے باہر پہنچایا، دل اندوگہین کے ساتھ عرض کرنے لگے کہ آپ ان لوگوں کے لیے خدا سے بددعا کریں۔ فرمایا: میں ان کے لیے کیوں بددعا کروں۔ اگر یہ لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے تو امید ہے کہ ان کی نسلیں نذرِ خدا تھے واحد کی پرستار ہوں گی۔

اسی سفر میں جبریل آتے ہیں اور اطلاع دیتے ہیں کہ پہاڑوں کا انچارج فرشتہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ اگر آپ اشارہ کریں تو وہ ان پہاڑوں کو آپس میں ملادے جن کے درمیان مکہ اور طائف واقع ہیں اور دونوں شہروں کو پس کر رکھ دے۔

اسی یاس انگیز فضا میں جنوں کی جماعت آ کر قرآن سنتی ہے اور حضور کے ہاتھ پر ایمان لاتی ہے۔ اس طرح سے خدا نے یہ حقیقت واضح کی کہ اگر تمام انسان دعوتِ حق کو رد کر دیں تو ہماری مخلوقات ایسی موجود ہیں کہ آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔

**نویدِ سحر:**

طائف کا تجربہ ایسا تھا کہ جس سے گزرتے ہوئے محسنِ انسانیت نے درودِ کرب کے اس آخری

نقطہ کو چھو لیا جس تک پہنچنے کے بعد مشیت ربانی کامیابی کے دروازے کھول دیا کرتی ہے۔ زمانہ بندہ ظاہر نظام حق کے داعی کو جتنا زیادہ گرا سکتا تھا، گرا چکا تھا۔ اور اس کا راز می نتیجہ یہی تھا کہ اس مرتبہ بارگاہ الہی میں انتہائی حد تک بلند ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو بھیج کر جب بھی حق و باطل کا معرکہ برپا کرنا ہے اس کا قانون یہ رہا ہے کہ باطل جب آخری حد تک پورا زور دکھا چکتا ہے، اور بندگان حق ایک ایک کر کے تمام مراحل استبداد سے عبرت جیل کے ساتھ گزرتے ہوئے ایک آخری مرد انگن دور کو بھی پار کرتے ہیں تو نصرت الہی کی صبح نمودار ہوتی ہے جنت کو جانے والی راہ صداقت کا نٹوں سے پٹی پڑی ہے۔ اور اس پر کھمزن ہونے والوں کے لیے مراد پانے کی بشارت تب آتی ہے، جب :-

”ان کو کٹھنائی اور مصیبت نے آیا۔ اور وہ خوب جھڑ جھڑا گئے یہاں تک رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے لوگ پکار اٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد (اس مرحلے میں پہنچ کر ان کو بشارت دی جاتی ہے کہ) سنو! اللہ کی مدد قریب ہے۔“

(البقرہ - ۲۱۴)

طائف کے تجربہ کے بعد گویا حضور اس آخری امتحان سے گزر گئے۔ قانون الہی کے تحت ناگزیر تھا کہ اب نئے دور کے دروازے کھل جائیں اور طلوع سحر کی بشارت دی جائے۔ یہی بشارت دینے کے لیے حضور کو معراج سے سرفراز کیا گیا۔

معراج کی حقیقت یہ ہے کہ حضور کو قرب الہی کا انتہائی بلند مقام نصیب کیا گیا۔ جس فرہنگ نما شدگی کرتے ہوئے محسن انسانیت نے کئی برس طرح طرح کے مساائب کا سامنا کرتے ہوئے اور بہی کی طاقتوں کے خلاف فکری جنگ لڑتے ہوئے گزار دیے تھے، اس نے اپنے سفیر کو اپنے ہاں کا بلند ترین غزاز دینے کے لیے اسے اپنے دربار میں طلب کیا۔ کائنات اور زندگی کی جن بنیادی سچائیوں کو منوانے کے لیے ایک سپاہی میدان کارزار میں اتر کر چاروں طرف سے وار پورا سہرا رہا تھا، اسے یہ سعادت بخشی گئی کہ ان سچائیوں کا قریب سے مشاہدہ کرے۔ جس بین الانسانی تحریک خیر و فلاح کا احیاء یہ آخری داعی کر رہا تھا، اسے سعادت دی گئی کہ وہ اس تحریک کے ایک بڑے دیرینہ مرکز (بیت المقدس) تک جا کر اور پھر وہاں سے عالم بان کو پرواز کر کے اس تحریک کے سابق قائدین خاص سے ملاتی ہو۔

سابق انبیاء کو بھی موقع بہ موقع شرف دیا جاتا رہا تھا کہ وہ نبی حقائق کا مشاہدہ کریں اور قرب خداوندی میں پہنچ کر عنایات خاص سے بہرہ مند ہوں۔ قرآن میں جہاں ایک طرف ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں بتایا گیا

ہے کہ ان کو مذکوت السموات والارض کا مشاہدہ کرایا گیا تھا، وہاں موسیٰ علیہ السلام کو طور پر بلایا گیا، اور وہاں خداوند تعالیٰ نے ایک نور افگن درخت کی ارٹ سے "اِنِّیْ اَنَا اللّٰهُ" کہہ کر ہم کلامی سے سرفراز کیا۔ اور پھر دوسرے موقع پر ایسے ہی لمحہ قرب میں شریعت کے احکام تفویض کیے۔ گویا کسی نہ کسی نوع کی معراج جلیل القدر انبیائے سلف کو بھی حاصل ہوتی رہی تھی۔ حضور کی معراج اپنے اندر شان کمال رکھتی ہے واقعہ طائف اور ہجرت کے درمیان اس واقعہ سے زیادہ اہم اور ممتاز واقعہ کوئی دوسرا پیش نہیں آیا۔ اس کی جب اطلاع آپ نے دی تو مکہ بھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ آپ نے مجمع عام میں اپنے مشاہدات بیان کیے۔ بیت المقدس کا پورا نقشہ کھینچ دیا۔ راستے کی ایسی قطعی علامات بتائیں کہ جن کی بعد میں تصدیق ہو گئی۔

اس لمحہ قرب میں جو خاص وحی کی گئی (فاوحی الی عبدہ ما اوحی — النجم) وہی سورۃ بنی اسرائیل کے عنوان سے ہمارے سامنے ہے۔ اس سورۃ کا آغاز ہی واقعہ اسرا کے تذکرے سے ہوتا ہے۔ اور پھر پورے سورہ میں معراج کی روح رچی بسی ہے۔ اس سورۃ کے حسب ذیل پہلو نہایت قابل توجہ ہیں۔

۱۔ بنی اسرائیل کی داستان عبرت سامنے رکھ کر ایک طرف یہ واضح کیا گیا کہ خدا کے قوانین بڑی بڑی طاقتوں کا محاسبہ کرتے ہیں اور ان کی بے راہ روی پران کو کسی آلہ کار کے ذریعے پٹوا دیتے ہیں۔ دوسری طرف عبرت دلائی گئی کہ غلبہ و کامرانی کے دور میں پہنچ کر کہیں یہ طاقت بھی بنی اسرائیل کی روش نہ اختیار کرے۔

۲۔ یہ مشرکہ انتہائی ناسازگار ماحول میں صاف صاف الفاظ اور فیصلہ کن انداز میں دیا گیا کہ جہاں الحق و ذہق الباطل۔ (آیت۔ ۸۱) حق آگیا ہے اور باطل اب دم دبا کر بھاگنے والا ہے۔ تاریکیاں چھٹ جانے کو ہیں اور صبح ہونے والی ہے۔

۳۔ یہ اطلاع دے دی کہ اہل مکہ اب آپ کو مکہ سے نکال دینے کے درپے ہوں گے، مگر آپ کو نکالنے کے بعد زیادہ دیر تک امن چین سے نہ رہ سکیں گے۔ (آیت۔ ۶۶) دعائے ہجرت ان الفاظ میں سکھائی، کہ اے میرے رب مجھے (نئے دور میں) صدق کے دروازے سے داخل کر اور (موجودہ ماحول سے) صدق ہی کی راہ سے نکال اور مجھے اپنی بارگاہ سے اقتدار کی صورت میں مدد نصیب کر۔ (آیت۔ ۸۰) اس دعائے اقتدار کی طلب کو شامل کر کے گویا یہ بشارت بھی دے دی گئی کہ ہجرت کے بعد کا دور دورہ غلبہ و حکمرانی ہوگا۔

۴۔ آیت ۲۲ تا ۲۹ کے مسلسل پارہ کلام میں اسلامی نظام کے بالکل ابتدائی اصول عطا کیے گئے کہ ان کو بنیاد بنا کر نیا معاشرہ اور نیا تمدن استوار کیا جائے۔

لمحہ معراج کے ان نکات وحی کا نور سینے میں لیے جب سردیہ عالم مستقبل کی طرف نگاہ اٹھاتے ہوں گے

تو تاریخ کے افق سے روشنی کا ایک سیلاب اڑتا دکھائی دیتا ہوگا۔ کوئی مادہ پرست مکہ کے اس خوف ناک ماحول میں ہوتا تو شاید وہ بایوس ہو کر اپنی سرگرمیوں کا ٹماٹ لپیٹ چکا ہوتا۔ مگر حضورؐ تھے کہ انتہائی ناسازگار اور امید شکن حالات کی تاریکی میں گھرے ہونے پر بھی اس قطعی یقین سے مالا مال تھے کہ صبح آرہی ہے۔ اور نسیم کے ایک جھونکے نے آکر سرورِ عالم کے کانوں میں کہہ دیا کہ صبح نو کا مطلع میٹرب ہوگا وہ کہ جہاں کے نوجوانوں نے بڑی اندلس مندی اور شرح صدر کے ساتھ اسلامی تحریک کو لبیک کہنا شروع کیا۔

مکہ میں زندگی ختم ہو جانے کے بعد حضورؐ طائف سے پوچھنے گئے کہ آیا تم سچائی کی مشعل کو اٹھا سکتے ہو؟ طائف نے جواب دیا کہ میں تو مکہ سے بھی بڑھ کر نا اہل ہوں۔ ابھی حضورؐ اس پاس انگیز جواب کے اثر ہی میں تھے کہ دُور سے میٹرب کی دھیمی سی آواز آئی کہ میں مدینۃ النبیؐ بننے کو حاضر ہوں۔ میں نورِ حق کی مشعل کو اٹھاؤں گا اور ساری دنیا کو روشنی دوں گا۔ میری گود میں نیکی کا نظام پرورش پلٹے گا اور میرے گہواروں میں ایک نئی تاریخ پر دان چڑھے گی۔

طائف قریب تھا اور دُور ہو گیا۔

میٹرب دُور تھا مگر قریب آ گیا۔

میٹرب اس روز بالکل قریب آ گیا۔ جس روز نبوت کے گیارہویں سال چھ انقلابیوں کے ایک جتنے نے حضورؐ سے پیمانِ وفا باندھا۔ پھر دوسرے سال ۱۲ افراد نے تحریکِ اسلامی کی علمبرداری کے لیے باقاعدہ گفت و شنید کر کے پہلی بیعت عقبہ کی گرہ باندھی اور اسلامی توحید اور اخلاقِ حدود کے تحفظ کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ پھر حج کے موقع پر ایک بڑی جماعت حاضر ہوئی اور اس نے رات کی تاریکی میں ایک خفیہ مجلس کے اندر دوسری بیعت عقبہ استوار کی جو پوری طرح سیاسی روح سے مملو تھی۔ اسی میں حضورؐ کا ہجرت کر کے مدینہ جانا طے ہوا اور اس والمانہ پیش کش کے ساتھ طے ہوا کہ انصارِ مدینہ آپ کے لیے دنیا جہان سے لڑائی مول لینے کو تیار ہیں۔

شاید ہی دور — سفر طائف تا ہجرت — ہے جس میں سورہ یوسف نازل ہوئی تھی اور جس نے مدیثِ دیگرال کے پردے میں علمبرداری کو بشارت دی اور اس کے مخالفین کو ان کے گھٹیا اور ظالمانہ طرزِ عمل سے آگاہ کر کے ان کا انجام ان کے سامنے رکھ دیا۔

الوداع! — اے مکہ!

تشدد کسی متزلزل نظام کا آخری ہتھیار ہوتا ہے اور اگر یہ کارگر نہ ہو تو قاعدہ یہ ہے کہ دشمنانِ تغیر نقیبِ انقلاب کی جان لینے پر تل جاتے ہیں۔ اہل مکہ تو پہلے ہی دانت پیتے تھے اور ایسے ہی ارمان رکھتے



تھے۔ مگر بس نہیں چلتا تھا۔ اب آخری گھڑی آگئی تھی۔ کش مکش ایک فیصلہ کن مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اب دو متقابل طاقتیں چھنٹ کر بالکل الگ الگ ہو چکی تھیں اب واضح طور پر ایک ذہنی و اعتقادی خط سرحد کھینچ چکا تھا اور جو اُس پار تھے، وہ اُس پار تھے اور جو اس طرف آگئے تھے وہ بس اسی طرف کے تھے۔ اب دعوتِ حق کی بہر حال ایک منظم طاقت تھی۔ اس کا جماعتی نظم بڑا مضبوط تھا۔ اس کا کرداری وزن بہت زیادہ تھا۔ اس کا استدلالی اپیل غیر معمولی حد تک زور دار تھا اور اس کے خادموں کی مظلومیت دلوں کو فتح کرنے کی طاقت رکھتی تھی۔ اب سچائی کا ننھا سا بیج ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ اور جو خطرہ کل تک خداوندانِ جاہلیت کے لیے خیالی تھا وہ اب واقعی صورت میں سامنے تھا۔ اب وقت ان سے کہہ رہا تھا کہ یا تو اس خطرے سے نمٹنے کی قوت رکھتے ہو تو نمٹ لو۔ ورنہ دورِ نو کا طوفان لور چلا آ رہا ہے جس میں تم اور تمہارے مناصب اور تمہارا مذہب اور تمہاری جاہلانہ روایات سب کچھ بہ جانے والی ہیں۔ کل تم کو اپنی اکڑی ہوئی گردنیں محمد ادا اس کے پیغام کے سامنے خم کر دینی ہوں گی۔ خداوندانِ جاہلیت تاریخ کا یہ چیلنج سن رہے تھے اور برابر مضطرب ہو رہے تھے، چنانچہ اب وہ داعیِ حق کے خون کے پیاسے ہو کر ایک نئی سازش کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے۔

یوں بھی جماعتِ حق کے افراد کے لیے مکہ کی بھیٹی اپنے آخری درجہ حرارت پر آپہنچی تھی، مظالمِ انسانی برداشت سے باہر ہو گئے تھے، قریش اپنے ظلم کے ذہر اب کا جامہ لبریز کر چکے تھے مادھر علمبردارانِ حق کا صبر کا پیالہ بھی کناروں تک بھر چلا تھا۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ اب حالات کوئی بڑی کر دے لیں گے اب کوئی راہِ نجات نکلے گی اور اب تاریخ کوئی واضح موڑ مڑے گی۔ قریش نے ایک سعادتِ عظمیٰ کا دروازہ اپنے لیے بند کر لیا تھا، انہوں نے اپنے آپ کو تحریکِ اسلامی کا پیش رو بننے کے لیے نا اہل ثابت کر دیا تھا۔ اس نفسیاتی ماحول میں معراج واقع ہونے پر حضور نے جب روشن مستقبل کی بشارت دی ہوگی، اشارۃً بابِ ہجرت واہونے اور اس کے بعد دورِ اقتدار کا آغاز ہونے کا مزہ سنایا ہوگا، تو مسلم جماعت میں نئی امنگیں ابھر آئی ہوں گی۔ تشدد کا شکار ہونے والوں کی ڈھارس بندھ گئی ہوگی، زخمی کلیجوں کو مرہم سکون مل گیا ہوگا۔ ہمتیں بلند ہو گئی ہوں گی اور ذہنی دنیا میں ایک طرح کی پوپھٹنے لگی ہوگی۔ پھر جب محسنِ انسانیت کی حساس روح نے وہ موعود گھڑی قریب آتی دیکھی ہوگی تو احساسات کا مدبّر اور بھی بڑھ گیا ہوگا۔ یہاں تک کہ آپ کا دل بیشتر سے یہ غیبی حقیقت سمجھنے لگا کہ ہونے والا دارِ الحجرت مدینہ ہوگا۔ ایک طرف واضح حالات انگلی اٹھا کر اشارہ کر رہے تھے خصوصاً مقامِ عقبہ کی بیعتیں گواہی دے رہی تھیں اور دوسری طرف ملاذِ اعلیٰ سے بھی اشارات ہو رہے تھے۔ اندر میں حالات آپ نے اپنے رفقاء کو مدینہ جانے کی اجازت دے دی اور یکے بعد دیگرے مختلف اصحاب

جانے لگے۔ آہستہ آہستہ بہت ساری تعداد نکل گئی۔ محلے خالی ہونے لگے۔ اور گھر سنان ہو رہے تھے۔ ایک مرتبہ ابو جہل اور دوسرے اکابر بنی جحش کے سنان گھروں سے گزرے تو ابو جہل نے اس منظر کو دیکھ کر یہ رویا کر پاس کیا :-

”یہ ہمارے برادر زادے کا کیا دھرا ہے، اس نے ہمارے اجتماع کو پارہ پارہ کر دیا ہماری وحدت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ اور ہمیں آپس میں ایک دوسرے سے بچھاڑ دیا۔“

رفقاء کو مدینہ بھیجنے کے باوجود آنحضرتؐ نے اپنے مقامِ دعوت کو نہیں چھوڑا۔ اذنِ الہی کے منتظر ہے اب کوئی مسلمان بھی مکہ میں نہیں رہا تھا، سوائے ایسے لوگوں کے جنہیں قریش نے روک رکھا تھا یا ابتلا میں ڈال رکھا تھا۔ البتہ رفقاء خاص میں حضرت ابو بکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما باقی تھے۔ ان حالات میں قریش نے اندازہ کر لیا کہ اب جب کہ مسلمانوں کو ایک ٹھکانہ مل گیا ہے اور ایک ایک کر کے سب لوگ جا چکے ہیں۔ قریب ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہاتھ سے نکل جائیں۔ اور پھر ہمارے دائرہ اثر سے باہر رہ کر قوت پکڑیں اور سانا پچھلا حساب چک جائے۔ یہ لوگ مکہ کے سبک ہال دارالندوہ میں جمع ہوئے اور سوچنے لگے کہ اب محمدؐ کے خلاف کیا کارروائی کی جائے۔ ایک تجویز یہ سامنے آئی کہ آپؐ کو کسی آہنی قید خانے میں بند کر دیا جائے۔ اور دروازہ بند رکھا جائے۔ اس پر اعتراض ہوا کہ اس شخص کی بات بند آہنی دروازے میں سے بھی نکل جائے گی اور اس کے ساتھی زور پکڑ لیں گے تو اس کو نکال لے جائیں گے، کوئی اور تدبیر سوچو۔ ایک رکن مجلس نے دوسری تجویز پیش کی کہ آپؐ کو اپنے معاشرے اور حدودِ اثر سے باہر نکال دیا جائے۔ اس کے بعد ہمیں اس سے کیا مطلب کہ آپؐ پر کیا گزرتی ہے۔ اس پر پھر اعتراض ہوا کہ کیا تم اس کے حسن گفتار کو نہیں جانتے؟ اس کی باتوں کی مٹھاس سے واقف نہیں ہو؟ یہ چیزیں لوگوں کے دلوں پر اس کے چھا جانے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ایسا کرو گے تو تم اس سے نہیں بچ سکتے کہ وہ اہل عرب میں نفوذ کرے اور اپنی دعوت اور باتوں کے زور سے ان پر چھا جائے۔ پھر وہ ان کو لے کر تم پر دھاوا بول دے اور انتظار کی باگ ڈور تمہارے ہاتھوں سے چھین لے، اور پھر جو سلوک چاہے تمہارے ساتھ نہ رکھے۔ اب ابو جہل کی ذہانت دور کی کوڑی لاقی ہے اس نے تجویز کیا کہ ہر قبیلہ سے ایک ایک مضبوط اور معزز نوجوان لیا جائے اور سب کو تلواریں دی جائیں۔ پھر یکبارگی اس (محمدؐ) پر حملہ کر کے کام تمام کر دیں۔ بس ہمیں اس طرح سے چھٹی مل سکتی ہے۔ اس طریقے سے محمدؐ کا خون تمام قبائل پر تقسیم ہو جائے گا اور بزعبید مناف اتنے سارے قبائل سے بدلہ لینے کی

برأت نہ کر سکیں گے۔ بس اس پر اتفاق آرا ہو گیا اور یہ سازشی میٹنگ برخواست ہو گئی۔

اسی میٹنگ کی کارروائی پر قرآن نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا۔

” اور یاد کرو اس گھڑی کو جب کہ کفار تدبیریں کر رہے تھے کہ آپ کو قید میں ڈالیں یا

قتل کر دیں یا باہر نکال دیں۔ وہ اپنی سی تدبیر اڑاتے ہیں اور اللہ جو اباً دوسری تدبیر

کرتا ہے اور اللہ تدبیر کرنے میں سب سے بڑھ کر ہے۔“ (الانفال - ۳۰)

آنے والی پراسرار رات سامنے تھی۔ حضور دہپہ کو اپنے محبوب ترین رفیق حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ جا کر رازدارانہ طریق سے اطلاع دی کہ ہجرت کی اجازت آگئی ہے جناب صدیق نے معیت کی درخواست کی جو پہلے سے قبول تھی۔ اس سعادت کے حصول پر فرط مسرت سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی آنکھیں ڈبڈبیاں لگیں۔ انہوں نے ہجرت کے لیے دواونٹیاں پہلے سے خوب اچھی طرح فرہ کر رکھی تھیں پیش کش کی کہ حضور دونوں میں سے جسے پسند فرمائیں، ہدیہ ہے۔ مگر حضور نے باصرار ایک اونٹنی جس کا نام جدعاء تھا، قیمتاً لی۔ رات ہوئی تو حضور باشارۃ الہی اپنے مکان پر نہ سوئے۔ اور دوسرے محبوب ترین رفیق حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر بلاخوت سو جانے کی ہدایت فرمائی۔ ساتھ ہی لوگوں کی امانتیں ان کے سپرد کیں کہ بیع کو یہ مالکوں کو ادا کر دی جائیں۔ اس اخلاق کی کتنی ایک مثالیں تاریخ کے پاس ہیں کہ ایک فریق تو قتل کی سازش کر رہا ہے۔ اور دوسرا فریق اپنے قاتلوں کو امانتوں کی ادائیگی کرنے کی فکر میں ہے۔ پھر حضرت صدیق کے گھر پہنچے۔ جناب اسماء بنت ابوبکرؓ نے جلدی سے اپنا کمر بند بچھاڑا اور ایک ٹکڑے میں کھانے کی پوٹیاں باندھیں اور دوسرے ٹکڑے سے مشکیزہ کا منہ باندھا۔ دو مسافران حق کا یہ قافلہ رات کی تاریکی میں گامزن ہو گیا۔

آج دنیا کا سب سے بڑا محسن و خیر خواہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بغیر کسی تصور کے بے گھر ہو رہا تھا! آج وہ ان گلیوں کو الوداع کہہ رہا تھا جن میں وہ چل پھر کر جوان ہوا، اور جن میں اس نے حق کا بول بالا کرنے کے لیے ہزاروں ہی پھیرے کیے تھے۔ اور جن میں اس نے گایاں سنی تھیں اور ایذا سہی تھیں۔ آج وہ حرم کے مرکزِ روحانی سے جدا ہو رہا تھا جس میں اس نے بارہا سجدے کیے تھے، بارہا قوم کی فلاح کی دعائیں مانگی تھیں۔ بارہا قرآن پڑھا تھا، اور بارہا اس مقدس چار دیواری اس واحد پناہ گاہ امن و سلامتی۔۔۔ میں بھی مخالفین کے ہاتھوں دکھ اٹھائے تھے اور ان کے دل چھیدنے والے بول سنے تھے۔ آج وہ اس شہر کو آخری سلام کر رہا تھا جس میں ابراہیم واسمعیل علیہما السلام کے کارناموں کا ریکارڈ موجود تھا۔ اور جس کی فضاؤں میں ان کی دعاؤں کی لہریں اب تک متحرک تھیں۔

کلیجہ کٹ ہوگا، آنکھیں ڈبڈبائی ہونگی، جذبات اٹھے ہونگے، مگر خدا کی رضا اور زندگی کا مشن چونکہ اس قربانی کا بھی طالب ہوا، اس لیے انسان کامل نے یہ قربانی بھی دے دی۔

آج مکہ کے پیکر سے اس کی روح نکل گئی تھی، آج اس چمن کے پھولوں سے خوشبو اڑی جا رہی تھی۔ آج یہ چشمہ سوکھ رہا تھا۔ آج اس کے اندر سے با اصول اور صاحب کردار ہستیوں کا آخری قافلہ روانہ ہو رہا تھا۔ دعوت حق کا پودا مکہ کی سرزمین سے اُگا۔ لیکن اس کے پھولوں سے دامن بھرنا مکہ والوں کے نصیب میں نہ تھا۔ پھل مدینہ والوں کے حصہ میں آئے۔ ساری دنیا کے حصہ میں آئے! مکہ والے آج دھکیل کر پیچھے ہٹائے جا رہے تھے۔ اور مدینہ والوں کے لیے اگلی صف میں جگہ بنانی جا رہی تھی۔ جو اپنے آپ کو اونچا سمجھتے تھے ان کو پستی میں دھکیلنے کا فیصلہ ہو گیا اور جن کو متناہتاً نچلے درجے پر رکھا جاتا تھا وہی لوگ اٹھا کر اوپر لائے جا رہے تھے۔

حضور نے آخری نگاہ ڈالتے ہوئے مکہ سے یہ خطاب فرمایا :

• خدا کی قسم تو اللہ کی سب سے بہتر زمین ہے۔ اور اللہ کی نگاہ میں سب سے بڑھ کر محبوب۔ اگر یہاں سے مجھے نکالنا جاتا تو میں کبھی نہ نکلتا یہ چند لمحوں بعد حضور غارِ ثور میں بنے۔

راستہ خود حضور نے تجویز فرمایا تھا اور عبد اللہ بن اریقظہ ادلی کو اجرت دے کر گائیڈ مقرر کیا۔ تین روز آپ غار میں رہے۔ عبد اللہ بن ابی بکر رات کو مکہ کی ساری خبریں پہنچا آئے۔ حارث بن فیہرہ (حضرت ابوبکر صدیق کا غلام) بکریوں کا ریوڑ لے کے اسی طرف نکلتا اور اندھیرا ہو جانے پر غار کے سامنے جا پہنچتا تاکہ دروں مہاجر ضرورت کے مطابق در دھلے لیں۔

ادھر قریش نے حضور کے مکان کا محاصرہ رات بھر رکھا۔ اور پورے شہر کی ناکہ بندی کا کڑا انتظام بھی کیا۔ مگر جب اپناک ان کو یہ معلوم ہوا کہ جس کی تلاش تھی وہ تو نکل گیا ہے تو ان کے پاؤں تہ سے زمین نکل گئی۔ حضور کے بستر پر حضرت علیؓ کو پا کر بہت شیشائے اور ان پر غصہ نکال کر چلے گئے تلاش کے لیے پردوں طرف آ دی دوڑائے، کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک گروہ دوڑ دھوپ کرتے ہوئے عین غارِ ثور کے دروازے پر آ پہنچا۔ ان کے قدم اندر دکھائی دینے لگے۔ کتنا نازک تاریخی لمحہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ کو تشویش ہوئی کہ اگر یہ لوگ غار میں داخل ہو گئے تو گویا پوری تحریک خطرے میں پڑ جائے گی۔ ایسے لمحات میں صحیح انسانی فطرت

کے اندر جیسا احساس پیدا ہونا چاہیے، ٹھیک ایسا ہی احساس جناب صدیق کا تھا۔ مگر چونکہ حضور کے ساتھ حق تعالیٰ کے کچھ وعدے تھے اور اس کی طرف سے حفاظت و نصرت کی یقین دہانی تھی اس لیے پردہ غیب کے پیچھے تک دیکھنے والا دل جانتا تھا، کہ خدا ہمیں صحیح سلامت رکھے گا۔ پھر بھی ٹھیک اسی طرح وحی سکینت نازل ہوئی جیسی موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی (لا تخف) ارشاد ہوا "لا تخزن ان اللہ معنا" فکر نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ چنانچہ آنے والا گروہ غار کے دہانے ہی سے واپس لوٹ گیا۔

تین روز غار میں رہنے کے بعد حضور جناب صدیق کی معیت میں اپنے رہبر اور علمبرین فہیرہ کو لے کر نکلے۔ تعاقب سے بچنے کے لیے عام راستہ چھوڑ کر ساحل کالمبار راستہ اختیار کیا گیا۔ ادھر مکہ میں اعلان کیا گیا کہ دونوں ماجروں میں سے جس کسی کو بھی کوئی شخص قتل کر دے یا گرفتار کر لائے، اس کے لیے سو سو اونٹ کا انعام ہے۔ لوگ برابر تلاش میں تھے۔ سراقہ بن جہشم کو خبر ملی کہ ایسے ایسے دو آدمی ساحل کے راستہ پر دیکھے گئے ہیں۔ اس نے نیزہ لیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ قریب آ کر سراقہ جب تیزی سے جھپٹا تو اس کے گھوڑے کے اگلے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ نے دو تین بار کی ناکام کوشش کے بعد عفو چاہی نیز درخواست کی کہ ایک تحریر امان لکھ دیجیے۔ گویا اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ ان ہستیوں کے طفیل ایک نیا دور نمودار ہونے والا ہے۔ امان لکھ دی گئی اور فتح مکہ کے دن کام آئی۔ اسی موقع پر حضور نے سراقہ کو ایک بشارت بھی دی، کہ اے سراقہ! اس وقت تیری کیا شان ہوگی جب تو کسریٰ کے کنکن پینے گا۔ (یہ پیش گوئی حضرت عمرؓ کے دور میں فتح ایران کے موقع پر پوری ہو گئی۔)

اسی سفر میں حضرت زبیر کاروان تجارت کے ساتھ شام سے واپس آتے ہوئے ملاقی ہوئے انہوں نے حضور اور جناب صدیق دونوں کی خدمت میں سفید لباس پہن لیا۔

اسی سفر میں بریدہ اسلمی بھی ستر ہراہیوں کے ساتھ سامنے آئے۔ یہ بھی درحقیقت انعام کے لالچ میں نکلے تھے۔ جب سامنا ہوا تو بریدہ کے دل کی کایاپلٹ گئی۔ تعارفی گفتگو ہی میں جب حضور نے ایک کلمہ بشارت (خوبم سہمک) تیرا حصہ نکل آیا، فرمایا تو بریدہ مع ستر ساتھیوں کے ایمان لے آیا۔ پھر بریدہ نے یہ خواہش کی کہ حضور مدینہ میں داخلے کے وقت آپ کے آگے آگے ایک جھنڈا ہونا چاہیے۔ حضور نے اپنا حمامہ نیزے پر باندھ کر بریدہ کو دیا اور اس جھنڈے کو بہرتے ہوئے یہ قافلہ دار ہجرت میں داخل ہوا۔

✱

لازمًا تمہاری جانچ کی جائے گی جانوں اور مالوں کے نقصان سے! اور تم کو بہت سی بیہودہ

باتیں سننی پڑیں گی۔ — ان لوگوں سے بھی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ان

لوگوں سے بھی جنہوں نے شرک کا مسک اختیار کر رکھا ہے! اور اگر تم (ان) آزمائشوں کے مقابلے میں، ثابت قدم رہو اور (آلودگیوں سے) دامن بچا بچا کے چلو۔ تو — یقیناً یہ ایک کارنامہ ہمت ہے!

(آل عمران - ۱۸۶)

کسی نبی کے لیے اُس کے قرابت مند جس درجہ بڑے ہو سکتے ہیں، تم اپنے نبی کے حق  
 میں ایسے ہی بڑے ثابت ہوئے!  
 تم نے مجھے جھٹلایا  
 اور دوسرے لوگوں نے میری صداقت کی گواہی دی۔  
 تم نے مجھے وطن سے نکالا!  
 اور دوسرے لوگوں نے مجھے اپنے پاس جگہ دی۔  
 تم میرے خلاف لڑنے اُٹھے۔  
 اور دوسرے لوگوں نے مجھے اپنا تعاون پیش کیا!

### ارشاد رسالت مآب

میدان بدر میں مُشرکین کے لاشوں سے خطاب کرتے ہوئے!

محسنِ انسانیت ﷺ

مخالفوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے

(۲)

مدانی دوسرا

تاریخ موڑ مڑتی ہے



صبح صبح جب امّ احمد نے مجھے عازم سفر دیکھا کہ میں اُس ہستی کی حفاظت میں نکل رہا ہوں جس سے بن دیکھے خوف و خشیت رکھتا ہوں،

تو وہ کہنے لگی کہ اگر لازماً تمہیں یہ اقدام کرنا ہی ہے تو یثرب جانے کا خیال چھوڑو اور ہمیں کسی دوسرے علاقے میں لے چلو!

اس پر میں نے اُسے جواب دیا کہ بس اب تو یثرب ہی ہماری منزلِ مقصود ہے اور خدائے رحمن جبرہ چاہتا ہے، بندہ ادھر ہی سوار ہو کے نکلتا ہے۔

کتنے ہی چہیتے ساتھیوں اور کتنے ہی خیر خواہوں کو ہم نے پیچھے چھوڑا اور کتنی ہی غمگسار خواتین تھیں کہ جو آنسو بہاتی اور شیون کرتی رہ گئیں!

تم سمجھتی ہو کہ ہمارا ترکِ وطن اس غرض سے ہے کہ ہم جلا وطن کرنے والوں سے انتقام لینے کے قابل ہوں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ کچھ اور ہی مقاصد ہیں جن کی ہمیں تمنا ہے!

ایک ہم ہیں، اور ایک ہمارے وہ دوست ہیں، جو راہِ راست سے دودھ ہٹ گئے ہیں اور انہوں نے ہمارے خلاف ظلم کے ہتھیار اٹھائے اور ہنگامہ برپا کر دیا۔

یہ کش مکش کرتے ہوئے دو فریق ہیں جن میں سے ایک کو حق کی علمبرداری کی توفیق ملی ہے اور وہ ہدایت یافتہ ہے۔ دوسرا فریق خدا کے عذاب کی زد میں آنے والا ہے۔

اگرچہ ہم ان کے ساتھ ارحام کے لحاظ سے گہری قرابتیں رکھتے ہیں، لیکن جہاں (نظریات و مقاصد کا) دلی رشتہ نہ جوڑا گیا ہو، وہاں محض ارحام کی قرابت نہیں چلی سکتی!

ایک دن آئے گا جب کہ تمہاری وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی اور تمہارے اجتماعی نظم کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس وقت تم اچھی طرح جان لو گے کہ ہم دونوں گروہوں میں سے کون ٹھیک ٹھیک حق پر کار بند ہے۔

(تلخیص — رجز ہجرت — ابو احمد بن حنبل)

طاهر البدر علینا	من نذیات الوداع
وجیب الشکرہ اینا	مادعی ذلہ دا رع
بلیہا المبعوث فینا	جئت بالاموالطاع

نانبیت کے محسن اعظم اور دنیا کے سب سے بڑے تاریخ ساز حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامہ حیات کا مکی دور دعوت و پیغام کا دور ہے اور مدنی دور اقتدار کا دور ہے، مکہ میں افراد تیار کیے گئے، مدینہ میں اجتماعی نظام کی تشکیل ہوئی۔ یہاں سالہ تیار ہوا، وہاں عمارت کھڑی کی گئی۔ اس فرق کی وجہ سے قرآن اور سیرت و تاریخ کو سرسری نگاہ سے دیکھنے والے عام لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ اسلامی تحریک اور اس کے داعی پر امتحان کی کڑی گھڑیاں صرف مکی دور ہی میں بنتی ہیں۔ مدینہ میں مخالفت کے ویسے شدید طوفانوں سے سابقہ نہ تھا اور یہاں اس طرح کی بھٹیوں گرم نہ ہوتی تھیں۔ یا کم سے کم خیال یہ کیا جاتا ہے کہ مخالفت اب ایک ننگی تلوار بن کر میدان جنگ میں آگئی تھی اور مخالفین کی رات سے گھنٹیا حرکات اور ذلیل کارروائیوں کا وہ دور گزر گیا تھا۔ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بلاشبہ قریش کی اولین مخالف طاقت تو اب رُو در رُو ہو کر میدان جنگ میں چیلنج کر رہی تھی، لیکن دوسری طرف مدینہ میں تحریک کی پر زور اٹھان نے نئی مخالفت طاقتیں اُبھار دی تھیں اور وہ شرا انگیزی میں اہل مکہ سے کسی طرح کم نہ تھیں۔ اہل شرا انگیزی کے نت نئے کرشموں نے داعی حق اور اس کے رفقاء کو شروع سے آخر تک پریشان کیا اور تمدن کی تعمیر نو کے کام میں رکاوٹیں ڈالنے میں کوئی کسر اٹھانا نہ رکھی۔

تاریخی کلیہ یہی ہے کہ اصلاح و تعمیر کا کام جتنا جتنا آگے بڑھتا ہے، اصلاح دشمن اور جمود پسند طاقتیں اس کو تباہ کرنے کے لیے جذباتِ عداوت میں اتنی ہی زیادہ بھکتی پہلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ حق جب مظلومی کے تختہ دار سے ایک جست لگا کر تخت اقتدار پر قدم رکھتا ہے تو باطل کا بغض و حسد بھی ساری حدود سے آگے نکل جاتا ہے۔ یہی صورت مدینہ میں نئی مسلم سوسائٹی کے قیام اور امن و سلامتی کی بیاست کے بپا ہونے پر پیدا ہوئی۔

## مدینہ کی مختلف فضا :-

تاریخی لحاظ سے یہ صورتِ واقعہ بجائے خود بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ مدینہ کی سیاسی و مذہبی فضا مکہ سے بالکل مختلف تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دینِ حق کی جو پیروی وہاں سخت ناسازگار حالات سے دوچار تھی، یہاں لاکھوں نئی نصب کی گئی تو وہ تیزی سے برگ و بار لانے لگی۔

پہلی بات یہ کہ مکہ اور اس کے ماحول کی ساری آبادی باہم دگر مرلوب تھی، اور مذہبی قبیلوں اور معاہداتی بندھنوں سے بندھی ہوئی تھی اور قریش کا اس پر پورا تسلط تھا۔ لیکن مدینہ اور اس کے ماحول میں دو مختلف عناصر آباد تھے۔ جن کے درمیان کھچاؤ موجود تھا۔

مدینہ یثرب کے نام سے یہودیوں کا آباد کردہ قدیم شہر تھا۔ یہاں جوں جوں ان کی نسل پھیلنے لگی مدینہ

کے آس پاس ان کی نئی بستیاں قائم ہوتی گئیں۔ اور ساتھ کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے جنگی قلعے تعمیر ہوتے گئے۔ چنانچہ پورا علاقہ یہود کے مذہبی و سیاسی تسلط میں تھا۔

دوسرا عنصر انصار کا تھا۔ ان کا اصل وطن بین تھا اور قحطان کا خاندان ان کا نسلی سرچشمہ تھا۔ جس زمانے میں سیلِ عرم نامی مشہور سیلاب نے تباہی مچائی تھی اور بچے کھچے لوگ ادھر ادھر منتشر ہوئے تھے، اس زمانے میں قحطان کے قبیلے میں سے اوس اور خزرج نام کے دو بھائی یثرب آئے اور یہاں آباد ہو گئے۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں اور لوگ بھی آئے ہوں۔ تاہم انہی نو واردوں کے ذریعے اس علاقے میں نئے عنصر کا اضافہ ہوا۔ بعد میں نسل بڑھتی گئی۔ اور آہستہ آہستہ ایک نئی طاقت ابھرنے لگی۔ شروع شروع میں ان لوگوں نے یہودی معاشرے اور تمدن سے منقطع رہ کر پنپنا چاہا، لیکن پہلے کی جی ہوئی طاقت کے زور و اثر سے دب کر ان سے دوستانہ معاہدہ استوار کر لیا۔ معاہدہ تعلقات دیر تک خوش اسلوبی سے چلتے رہے۔ لیکن یہود نے جوہی یہ محسوس کیا کہ انصار کی روز افزوں ترقی ان کے اقتدار کے لیے ایک خطرہ بنتی جا رہی ہے، تو انہوں نے حلیفانہ تعلق توڑ لیا۔

یہود کے اندر ایک عیاش رئیس فطیون نامی اٹھا۔ اس نے جبر و قوت سے اپنا یہ حکم نافذ کر دیا کہ اس کی حدود میں جو لوگ بھی بیاہی جائے وہ اس کے شبستانِ عیش سے گزر کر ازدواجی زندگی کے دائرے میں داخل ہو، یہود کے بگاڑ کا اس سے اندازہ کیجیے کہ انہوں نے فطیون کے اس حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ آخر ایک دن اس شیطانی حکم نے انصار کی غیرت کو بھی چیلنج کر دیا۔ مالک بن عجلان کی بہن کی شادی ہو رہی تھی۔ کہ عین بارات کے دن وہ بھائی کے سامنے سے پورے انداز بے حجابی کے ساتھ گزری۔ مالک نے طامت کی تو اس نے کہا کہ کل جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اس سے زیادہ شدید ہے چنانچہ مالک نے فطیون کو جا کر قتل کر دیا اور شام کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں حسانی حکمران ابو جبیلہ کا سکہ چل رہا تھا۔ اسے یہ حالات جب معلوم ہوئے تو اس نے حملہ کیا اور بڑے بڑے یہودیوں کو قتل کیا۔ اور اوس و خزرج کو خلعت و انعام سے نوازا۔ ان واقعات نے یہود کا زور توڑ دیا۔ اور انصار کی طاقت بڑھادی۔

غرض یہود کے مقابلے میں انصار کا معاملہ برابر کی سوٹ کا معاملہ تھا۔ لیکن اصول و مقصد کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کا اتحاد مضبوط بنیاد نہیں رکھتا تھا۔ آپس کی کش مکش نے دیمک بن کر طاقت کو چاٹنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اوس و خزرج کے درمیان جنگِ بعات واقع ہوئی اور فریفین کے نہایت قیمتی افراد ایک دوسرے کی تلواروں کا لقمہ ہو گئے۔ اس طرح یہود کے سامنے وہ پھر بے زور ہو کر رہ گئے۔ اسی حالت سے مجبور ہو کر انہوں نے قریب کے زمانے میں قریش کے ہامنے حلیفانہ تعلقات کی درخواست رکھی تھی۔ لیکن بعض

وجہ سے یہ کوشش ناکام رہی۔

دوسری طرف یہود کے تفوق کی ایک وجہ ان کی مذہبی سیدت بھی تھی۔ ان کے پاس تورات تھی، اور وہ ایک مستقل مذہبی نظام کے علمبردار تھے، ان کے پاس ایک سرمایہ اعتقاد تھا۔ ایک اخلاقی عنایت تھا۔ فقہی احکام تھے، مذہبی قانون تھا، کچھ روایات تھیں اور عبادات کی انجام دہی کا ایک طریقہ تھا۔ انصار اس پہلو سے تہی دامن تھے۔ اور وہ اس دائرے میں ان کے سامنے ہاتھ پھیلائے پر مجبور تھے، انہی کے "بیت المقدس"۔

(یہودیوں کے مذہبی تعلیم کے مراکز) سے وہ استفادہ کرتے تھے۔ حدیہ کہ اگر کسی انصاری کی اولاد زندہ نہ رہتی تھی تو وہ نذر ہی یہ ماننا تھا کہ اگر بچہ زندہ رہا تو اسے یہودی بنایا جائے گا۔ انصار میں اس پہلو سے احساس کمتری موجود تھا اور ان کی غیرت و حمیت اس پر کرب محسوس کرتی تھی۔

اوپر کے حقائق کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مدینہ کے ماحول میں یہود اور انصار کے درمیان کھپاؤ تھا اور تعلقات کی گہرائی میں حریفانہ و رقیبانہ جذبات کام کر رہے تھے۔

اسی سلسلے میں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ یہود انصار کے سامنے اکثر یہ کہا کرتے تھے کہ آخری

نبی جلد ہی مبعوث ہونے والا ہے، وہ آئے تو پھر ہم اس کے ساتھ ہو کر تمہاری خیریں گے۔ یہود کی اس پیش گوئی نے انصار کو بھی اس پیغمبر موعود کا منتظر بنا دیا تھا۔ اور ان کے اندر ایک شعور سی رچھان یہ کام کر رہا تھا کہ اگر وہ نبی آجائے تو وہ آگے بڑھ کے اس کا دامن تمام لیں۔ چنانچہ یہی ہوا کہ پیش گوئی سنانے والے خود تو محروم رہے اور جن کو وہ دھمکیاں دیا کرتے تھے وہ نبی آخر زمان کے حلقہ رفاقت میں آئے۔ یہود جن کو چونا چاہتے تھے ان کے ہاتھوں سے خود پٹ گئے۔

مدینہ کی اس فضا اور اس کے پس منظر کو سامنے رکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہوں یہ ماحول مکہ کے مقابلے میں تحریک اسلامی کو زیادہ راہ آس۔

## تحریک اسلامی مدینہ میں :-

مکہ نے دعوت حق سنی اور مسلسل ۱۳ سال سنی، اس کا پورا استدلال سامنے آیا۔ اس کے نور سے بھری ہوئی ایک لامثال شخصیت کا کردار اس کے سامنے جگمگاتا رہا۔ اس کے علمبرداروں نے ظلم کی پٹی میں پستے ہوئے "احد، احد" کی صدا بلند کی، مگر مکہ کی اجتماعی فضا نے شرع سے آخر تک ایک ہی رٹ لگائے رکھی۔

نہیں منظور۔

۱۹۱۔ یہ معلومات سیرت النبی از علامہ شبلی مرحوم (حصہ اول) سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو ص ۱۵۹ تا ۱۹۱

لیکن مدینہ تک گلِ دعوت کی نگہت کا پہلا جھونکا ہی پہنچا ہوگا کہ اس کی روح وجد میں آکر یکراٹھی مدینیک۔ مدینہ کا پہلا نوجوان جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے بہرہ اندوز ہوا، سوئد بن صامت تھا۔ یہ ایک ذہین شاعر تھا، ایک ماہر سوار تھا، بہادر جنگجو تھا، ایسے نوجوان بالعموم انقلابی حرکت کے سپاہی بنا کرتے ہیں اور تعمیر و ترقی کی ہر دعوت پر لبیک کہتے اور پھر اپنا سب کچھ لگا دیا کرتے ہیں۔ یہ نوجوان مکہ میں آیا تو سرورِ عالم نے حسب معمول مل کر دعوت پیش کی۔ سوئد نے بتایا کہ ایسی ہی ایک چیز میرے پاس بھی ہے یعنی صحیفہ لقمان اس کا کچھ حصہ اس نے سنایا بھی۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن سنایا، دیکھیے بے تعصبی کا مظاہرہ، سوئد کی فطرتِ سلیم فوراً اپکار اٹھی کہ ”ان هذا القول حسن“ یعنی یہ کلام خوبی میں بڑھا ہوا ہے چنانچہ اس کلام کا پیغام اس کے دل میں گھر کر گیا۔ لیکن افسوس کہ جانے کے بعد جلدی وہ خنزرجیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بارے میں بعد میں لوگوں نے تذکرہ کیا کہ وہ قتل ہوتے وقت مسلم تھا۔ اور تکبیر اس کی زبان پر تھی بلکہ

متاثر ہونے والا دوسرا یثربی نوجوان ایاس بن معاذ تھا۔ یہ مدینہ کے ایک وفد کارکن تھا۔ وفد کا مقصد یہ تھا کہ خنزرج کے خلاف قریش سے حلیفانہ معاہدہ کریں اور امداد حاصل کریں۔ داعیِ حق نے ان لوگوں تک بات پہنچانے کا موقع نکالا۔ اسلام کا تعارف کرایا۔ اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ ایاس بن معاذ جو اس وقت لڑکپن کے عالم میں تھا۔ کہنے لگا: ”ای قوم! ہذا واللہ خیر مما جمعتم بہ“ کیا ہی پاکیزہ فطرت بول رہی ہے کہ ”اے ساتھیو! تم جس غرض کے لیے آئے ہو اس سے یہ زیادہ بہتر ہے“ سردار وفد ابوالحسیر نے مٹی اٹھا کر اس کے منہ پر ماری۔ مطلب یہ تھا کہ یہ تم بیچ میں کیا غضب ڈھا رہے ہو۔ ساتھ ہی کہا: ”ہم اس مطلب کے لیے نہیں آئے“ ابوالحسیر کو فکر تھی قریش کی حمایت حاصل کرنے کی اور وہ خوب سمجھتا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانی تو قریش کے دلوں کے دروازے الٹا اور بند ہو جائیں گے۔ ایاس چپ ہو گیا۔ لیکن اس کے دل کی مٹی میں دعوت کا بیج پڑ گیا تھا۔ یہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ اور افسوس کہ مدینہ کا یہ بیدار دل نوجوان بھی جلد ہی جنگِ بعثت کی لپیٹ میں آکر دنیا سے رخصت ہو گیا۔

نبوت کے گیارہویں سال حج کے لیے مدینہ سے جو گروہ آیا اس سے ایک نشست میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی تفصیلی گفتگو ہوئی۔ آپ کی دعوت کو سن کر وہ لوگ آپس میں کہنے لگے۔ ”اے ساتھیو! جان لو کہ قطعی طور پر یہ وہی نبی ہے جس کے بارے میں یہود تمہارے سامنے پیش گوئی کرتے رہتے ہیں۔ سو اب

وہ کہیں تم سے آگے نہ بڑھ جائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کھول دیے اور انہوں نے دینِ حق کو اپنے سینوں میں جذب کر لیا۔ پھر وہ کہنے لگے،

ہم لوگوں نے اپنی قوم کا ساتھ چھوڑا، دوسری کسی قوم میں ہمارے لوگوں کی طرح دشمنی اور خرابی نہ ہوگی۔ شاید کہ آپ کی ذات کے ذریعے اللہ تعالیٰ ان کو پھر جوڑ جاڑ دے۔ ہم ان کے پاس جائیں گے اور آپ کے دین کی طرف ان کو دعوت دیں گے اور ان کے سامنے اپنا وہ تاثر رکھ دیں گے، جو اس دین کے لیے آپ کے سامنے ہم نے ظاہر کیا ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اس دین پر جمع کر دیا تو اس کے بعد آپ سے زیادہ قوت رکھنے والا کوئی دوسرا نہ ہوگا۔

مکہ کے لوگوں نے جس دعوت کو موجب تفرقہ گردانا، مدینہ کے لوگوں نے اس میں اپنے لیے اتفاق و اتحاد کی بنیاد پہلی نظر ڈالتے ہی دیکھ لی۔ اسلامی تحریک کی علمبرداری کے لیے مدینہ کی یہ پہلی جماعت جس کی تشکیل مکہ میں ہو رہی تھی۔ چھ افراد پر مشتمل تھی۔ (۱) ابوالہیثم بن بنہان (۲) اسعد بن زرارہ (۳) عوف بن عارض (۴) رافع بن مالک بن عجلان (۵) قطیبہ بن عامر (۶) جابر بن عبد اللہ۔ یہ لوگ لوٹ کر گئے تو ماحول میں ایک نئی حرکت انہوں نے پیدا کر دی۔ دعوتِ اسلام پھیلنے لگی اور خوب مقبول ہوئی۔ انصار کے گھرانوں میں سے کوئی گھرا ایسا نہ رہا جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پرچا نہ ہو رہا ہو۔

### بیعت عقبہ اولیٰ :-

اگلے سال یعنی نبوت کے بارہویں برس بارہ افراد کا وفد آیا اور آ کر بیعت کی۔ اس بیعت کو اصطلاحاً "بیعت النساء" یعنی زنانہ بیعت کہتے ہیں۔ اس سے مفہوم یہ ہے کہ اس بیعت میں صرف بنیادی باتوں کا اقرار لیا گیا تھا۔ اور جنگ و تصادم کا کوئی سوال سامنے نہ تھا۔ اس ایمانی اقرار کے اجراء یہ تھے۔

"ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے، چوری نہیں کریں گے، زنا نہیں کریں گے اپنے بچوں کو قتل نہیں کریں گے، کسی کے خلاف جانتے بوجھتے کوئی من گھڑت بہتان گھڑ کر نہیں لائیں گے، اور کسی معروف معاملے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہیں کریں گے۔"

یہ لوگ فارغ ہو کر اٹھے تو پیغمبر خدا نے مصعب ابن عمیر بن ہاشم کو مدینہ میں فریضہ دعوت کی انجام دہی پر مامور کیا۔ ان کے ذمے لگایا کہ وہاں جا کر لوگوں کو قرآن پڑھائیں، اسلام کی تعلیم دیں۔ دین کی سوجھ بوجھ پیدا کریں۔ چنانچہ وہ نماز کی امامت بھی کراتے تھے اور اسلام کی آئیڈیالوجی اور اس کے اصول اخلاق کی تعلیم بھی دیتے تھے۔

## دولیدروں کا قبولِ اسلام :

ایک دن اسعد بن زرارہ (جن کے مکان پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مامور کردہ اعلیٰ مصعب اقامت گزین تھے) دعوتی مہم کے سلسلے میں اپنے ساتھ مصعب بن عمیر کو لے کر بنی عبدالاشہل اور بنی ظفر کے گھروں تک جانے کے لیے نکلے۔ دونوں مرق نامی کنوئیں کے متصل بنی ظفر کے احاطے میں پہنچے۔ بعض لوگ جو اسلام لایچکے تھے ان کے گرد آ جمع ہوئے۔ سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر دونوں بنی عبدالاشہل کے لیڈر تھے اور ابھی تک اپنی قوم کے مسلکِ مشرکانہ پر قائم تھے۔ اسعد بن زرارہ اور مصعب کے کارِ دعوت پر سعد بن معاذ جھلنا تو تھا ہی، جو نبی دونوں صاحبوں کے ادھر آنے کی اطلاع ملی اس نے اسید کے کان میں پھونکا کہ یہ دونوں ہم میں سے کمزور افراد کو آتو بنانے آتے ہیں۔ لہذا جا کر ان کی خبر لو اور ان کو منع کر دو کہ ہمارے گھروں میں نہ آیا کریں۔ اگر اسعد بن زرارہ میرا خالہ زاد اور عزیز نہ ہوتا تو تمہارے بجائے میں خود اس سے نیٹ لیتا۔ چنانچہ جو نبی مدینہ کے حلقہ اسلامی کی یہ مجلس لگی۔ سعد بن معاذ کی تلقین کے زیر اثر اسید بن حضیر آیا اور بجالانے ہوئے ان دونوں داعیانِ اسلام کی طرف لپکا۔ پھر ٹھٹک کر بدزبانی کرتے ہوئے کہا کہ تمہارے یہاں آنے کا مطلب کیا ہے؟ تم ہمارے کمزور آدمیوں کو بے وقوف بناتے ہو اگر تمہیں اپنی جالوں کی ضرورت ہے تو ہم سے کنارہ کرو۔ مصعب نرمی سے کہنے لگے کہ کیا تم ذرا بیٹھ نہیں جاتے کہ پہلے غور سے سنو، پھر اگر بات پسند آئے تو مالو۔ ناپسند ہو تو اس سے باز رہو۔ چنانچہ وہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ بھالائیچے ڈال دیا۔ اور تحریکِ اسلامی کے دونوں داعیوں کے پاس سکون سے بیٹھ گیا۔ مصعب نے گفتگو شروع کی۔ اور قرآن پڑھ کر سنایا۔ دونوں حضرات کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے مخاطب کے بولنے سے قبل اس کے چہرے سے قبولِ اسلام کا جذبہ پڑھ لیا۔ آخر اسید کی زبان کھلی، کیا ہی خوب ہے یہ کلام بہت ہی پیارا! اچھا۔ تم لوگ اسلام میں داخل ہونے وقت کیا صورت اختیار کرتے ہو؟ دونوں نے کہا کہ جاؤ جا کر نہاؤ۔ پاک صاف ہو جاؤ اور اپنے کپڑے دھو ڈالو۔ پھر حق کی صداقت کی گواہی دو اور نماز ادا کرو۔

اُسید جو ابھی ابھی بھالاتا نے کھڑا تھا اب خود اسلام کا زندگی بخش بھالا اس کے سینے میں اتر چکا تھا۔ اٹھا نہایا دھویا اور آکر دو رکعتیں نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر بات چھیڑی اور اُسید نے کہا کہ میرے ساتھ کا ایک شخص اور ہے، اگر وہ بھی تمہارے ساتھ ہو جائے تو اس کے قبیلے کا کوئی آدمی سرتابی نہ کرے گا۔ میں اسی وقت اس کو بلا لیتا ہوں۔ وہ ہے سعد بن معاذ۔ چنانچہ وہ فوراً بھالا اٹھائے سعد کے ہاں پہنچا۔ وہاں مجلس لگی تھی۔ اس نے دیکھتے ہی ساتھیوں سے کہا کہ میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اُسید کا چہرہ وہ نہیں ہے جو تم لوگوں سے اٹھ کر جاتے وقت تھا۔ پھر سعد نے اُسید سے پوچھا کہ کیا کر کے آئے؟ اُسید نے بیساختہ جواب دیا۔ میں نے دونوں سے بات کی۔ سو خدا کی قسم! ان کی طرف سے کسی طرح کا اندیشہ محسوس نہیں کیا۔ اور انہیں میں نے منع کر دیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہم وہی کریں گے۔ جو تمہیں پسند ہے ساتھ ہی ساتھ سعد بن معاذ کے جذبات کو حرکت میں لانے کے لیے یہ بھی کہہ دیا کہ بنی حارثہ اسد بن زرارہ کے قتل کے درپے ہیں اور وہ لوگ یہ جانتے ہوئے اس بات کی جسارت کر رہے ہیں کہ اسعد تمہارا عزیز ہے اور اس طرح وہ تمہاری تحقیر کرنا چاہتے ہیں۔ سعد بن معاذ بنی حارثہ کی طرف سے ایسی حرکت کا خوف محسوس کرتے ہوئے غضب ناک ہو کر لپکا اور بھالا اُسید کے ہاتھ سے اڑس لیا۔ لیکن وہاں پہنچا تو دیکھا کہ اسلام کے دونوں علمبردار سکون سے ہیں۔ سمجھ گیا کہ اُسید کا منشا اس چال سے صرف یہ ہے کہ میں براہ راست ان کی بات سنوں۔ ان کو بُرا بھلا کہتے ہوئے وہ سامنے ٹھٹک گیا۔ اور اسعد بن زرارہ کو مخاطب کر کے کہا کہ تم لوگ ہمارے پاس آتے ہو تو ایسی بات لے کر ہمارے گھروں میں آتے ہو جس سے ہمیں نفرت ہے۔ معصوب نے نرمی کے اسی انداز سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ذرا سنبھلو۔ بات سنو، پسند ہو تو مانو، نہیں تو پھر ہم وہ چیز تمہارے سامنے نہیں لائیں گے جس سے تمہیں نفرت ہو۔ سعد بن معاذ کہنے لگا کہ تم نے بات انصاف کی کہی؟ معاذ وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ بھالا نیچے ڈال دیا۔ اور بیٹھ گیا۔ سننے والے نے حق کا پیغام سنایا۔ اور قرآن پڑھا۔ دوبارہ وہی کیفیت پیش آئی۔ سعد بن معاذ کے بولنے سے قبل اس کے چہرے سے قبول اسلام کا جذبہ جھلکنے لگا۔ یہ دوسرا لیڈر بھی چند لمحوں میں اسلام کے محاذ پر کھڑا تھا۔

سعد "حیات نو" لے کر پلٹے تو اہل مجلس نے دُور سے دیکھتے ہی آپس میں کہا کہ چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ آتے ہی اس نے یوں خطاب کیا، "اے عبدالاشہل! میرے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟" سب کہنے لگے کہ تم ہمارے سردار ہو۔ تمہاری رائے ہم سے پختہ ہے، خوبیوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ بابرکت ہو۔ سعد بن معاذ نے کہا، "تو پھر جب تک تم لوگ خدا اور اس کے رسول پر ایمان نہیں لاؤ گے تمہارے مردوں اور عورتوں سے بات کرنا مجھ پر حرام!" پھر کیا تھا پورے قبیلے کے مرد و زن میں سے



کوئی ایک بھی اسلام کے دائرے سے باہر نہ رہا۔

ان دو لیڈروں کے ذریعے جب تحریک حق کی طاقت یکا یک اتنی بڑھ گئی تو دعوت کی ہم نے بھی زور پکڑا اور ایک ایک قبیلے اور ایک ایک گھر میں صبح اسلام کی تجلیاں بکھر گئیں۔

### بیعت عقبہ ثانیہ :

اسی دوران میں حج کا زمانہ آ گیا۔ اب کے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مکہ پہنچی۔ مدینہ کی کھیتی خوب فصل دے رہی تھی۔ یہ نئے نئے جذبہ دینی سے سرشار ہو کر آنے والے حجاج قریش سے بیچ کر راتوں کی تاریکی میں اپنے قائد محبوب سے ملے۔ اس بار پھر عہد وفا از سر نو استوار کیا گیا۔ لیکن اب کی معاملہ "بیعت النساء" سے بہت آگے تک جا پہنچا۔ پہلی بیعت میں سیاسی پہلو صرف ایک نکتے سے نمایاں ہوتا تھا، یعنی یہ اقرار کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے معروف احکام سے سرتابی نہیں کریں گے۔ لیکن اس مرتبہ سیاسی پہلو پوری خطرناکی کے ساتھ سامنے آ گیا۔ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے معنی قریش اور سارے عرب کے ساتھ برسر پیکار ہونے کے تھے۔ اور یہی معنی سامنے رکھ کر بیعت ثانیہ استوار کی گئی۔ گفتگو میں تحریک اسلامی کے ان بشری سپاہیوں نے پیش آنند ممکنات کا پورا اندازہ کر کے یہ کہا، کہ "لوگوں (یعنی یہود) کے ساتھ ہمارے معاہدہ روابط ہیں اور ہمیں ان روابط کو توڑنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب ہم یہ کر چکیں اور پھر اللہ تعالیٰ آپ کو غلبہ عطا کر دے، تو آپ اپنے خاندان والوں کی طرف لوٹ جائیں۔ اور ہمیں چھوڑ دیں" اس اندیشے کے جواب میں مسکراتے ہوئے حضور نے فرمایا: "تمہارا خون میرا خون ہے تمہارے دشمن میرے دشمن ہیں، میں تمہارا اور تم میرے! جس سے تمہاری جنگ اس سے میری جنگ جس سے تمہاری صلح اس سے میری صلح" عباس بن عبادہ نے کہا: "اے خزرج والو! جانتے ہو کہ اس ہستی کے ساتھ کس بات کا پیمانہ باندھ رہے ہو؟" یہ لوگوں میں سے سرخ و سیاہ سے جنگ کا پیمانہ ہے۔" اہل وفد نے پوری ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے جواب دیا، کہ "ہاں ہم اپنے مالوں کی تباہی، اپنے سرداروں کے قتل کے علی الرغم آپ کے ساتھ پیمانہ باندھ رہے ہیں" اس بیعت کی خاص نوعیت ہی کی وجہ سے اس کا نام "بیعت حرب" پڑ گیا۔ اس بیعت کی ایک مرکزی شرط یہ تھی کہ "ہم تنگی میں آسانی میں، خوشی میں اور رنج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ارشاد سنیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے اور حضور کو اور حضور کے فرمان کو اپنے آپ پر ترجیح دیں گے اور یہ کہ ہم ارباب امر سے کشمکش نہیں کریں گے۔ اور یہ کہ ہم اللہ کے دین کے معاملے میں ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پروا

۱۔ حالات کی تفصیل سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۷۸-۷۷ سے لی گئی ہے۔

نہیں کریں گے :

یہ بیعت گویا اسلامی قصر ریاست کی پہلی اینٹ تھی۔ اور ساتھ کے ساتھ کتاب تحریک میں لکھے جانے والے باپ ہجرت کا دیباچہ! اس بیعت کے ذریعے مستقبل کی اسلامی ریاست کے لیے گویا اس کے ہونے والے شہریوں نے برضا و رغبت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کو قبول کر لیا۔ علاوہ بریں سمع و طاعت کا نظم استوار ہو گیا۔

اس موقع پر صرف ایک پیمان ہی نہیں باندھا گیا۔ بلکہ اجتماعی نظم کی بنیاد بھی اٹھادی گئی۔ اسلامی تحریک کے تانہ سالار نے شہری جماعت کی رائے سے بارہ نقیب مقرر کیے۔ نو خزانج میں سے، تین اس میں سے! ان نقیبوں کو مامور کیا گیا کہ تم اپنی قوم کے سارے معاملات کے ذمہ دار ہو، بالکل اسی طرح جیسے عیسیٰ بن مریم علیہا السلام کے حواری ذمہ دار تھے اور جیسے خود میں اپنی پوری جماعت کا ذمہ دار ہوں۔ یہ گویا آنحضرت کے نائب تھے۔ ان کے تقرر سے منظم معاشرہ کی تعمیر کا کام باقاعدہ شروع ہو گیا۔ قریش کے کان میں بھنگ پڑی تو پٹھا گئے، وفد جا چکا تھا، اس لیے تعاقب کیا اور سعد بن عبدہ اور منذر بن عمرو کو گرفتار کر لائے۔ ان پر انہوں نے اپنا غصہ نکالا۔ لیکن سانپ نکل گیا تھا اب لکیر پٹینے سے کیا حاصل تھا!

## مدینہ میں تحریک کا نیا مدو جزر :

یہ طاقت مکہ سے نئی سپرٹ لے کر مدینہ پہنچی تو دعوت کا کام علی الاعلان بہت ہی زور و شور سے شروع ہو گیا۔ نوجوان جب کسی تبدیلی کے نقیب بن کے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو ان کے مقابلے میں بڑھاپے سے گزرتی ہوئی نسل دیر تک جم نہیں سکتی۔ اور جے بھی تو اس کا دور زیادہ لمبا نہیں ہو سکتا اور کسی تحریک کے مستقبل کا اندازہ کرنے کے لیے یہ جاننا بہت مفید ہوتا ہے کہ وہ میدان چھوڑتی ہوئی سال خوردہ نسل کے بل بوتے پر چل رہی ہے۔ یا اس کی رگوں میں نیا خون رواں ہے۔ سو مکہ میں بھی، اور خاص طور پر مدینہ میں نوجوان طاقت دعوت اسلامی کے جھنڈے اٹھائے آگے آگے بڑھ رہی تھی۔

نوجوان طاقت نے کیا کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے ایک دلچسپ واقعہ کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بڑے بوڑھوں میں سے ایک بزرگ تھے، عمرو بن الجموح جن کا تعلق بنی سلمہ سے تھا۔ ان بڑے

نے اپنے گھر میں لکڑی کا ایک بت متا نامی فراہم کر رکھا تھا۔ یہ اس کی پوجا کرتے تھے۔ اور اس کی جھاڑ پونچھ میں لگے رہتے تھے۔ بنی سلمیٰ کے دونوں جوان معاذ بن جبل اور معاذ بن عمرو دعوتِ حق پر ایمان لا کر تحریکِ اسلامی کے کارکن بن چکے تھے۔ موخر الذکر خود انہی بڑے میاں کے صاحبزادے تھے۔ یہ دونوں رات کی تاریکی میں جاتے اور بڑے میاں کے خداوند کو کچھڑ میں لت پت کر دیتے اور اٹھا کر بنی سلمہ کے گڑھے میں اٹا کر کے ڈال آتے جہاں لوگ غلاظت اور کوڑا کرکٹ پھینکتے تھے۔ صبح ہوتی تو عمرو بن الجموح چلاتا کہ میرے کون ہے جس نے رات ہمارے خداوندوں پر دراز دستی کی ہے؟ پھر وہ اپنے خدائے گم شدہ کو ڈھونڈتا پھرتا۔ اور جب پالیتا تو اُسے دھو دھا کر سنگھاسن پر لا بٹھاتا۔ اگلی رات پھر یہی حادثہ پیش آتا۔ بڑے میاں پھر اسی چکر میں پڑے بڑبڑاتے پھرتے۔ ایک دن عمرو نے تنگ آ کر اپنی تلوار بت کے ساتھ لٹکادی۔ اور اسے خطاب کر کے کہا کہ خدا کی قسم، میں نہیں جانتا کہ کون تیرے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہے، سو اگر تجھ میں کس بل ہے تو پھر خود ہی اپنا سچاؤ کر، یہ تلوار موجود ہے، شام ہوئی اور عمرو سو گیا۔ تو اس ڈرامے کے دونوں کردار رات کو آئے۔ اور تلوار بت کی گردن سے کھول لی۔ پھر ایک مرا ہوا کتا تلاش کر کے اس کے گلے میں رستی سے باندھا اور اسے ایک اندھے کنوئیں میں جا کر ڈال آئے جو انسانی غلاظت سے اٹا رہتا تھا۔ صبح اٹھ کر عمرو نے دیکھا تو حضرت پھر غائب تھے۔ تلاش کیا تو یہ حال زار دیکھا۔ عبرت کا یہ نقشہ دیکھتے ہی دل نے کر دیا اور وہی عمرو اسلام کی صفوں میں آشوب ہو ا۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مدینہ کی کس طرح کا یا پلٹ رہی تھی۔

## تحریک کا نیا مرکز :

تحریکِ حق کا آسمانی لیڈر برابر سوچ میں رہا کہ اگر مکہ کے ظرف میں سمائی نہیں اور یہاں کی سنگین قیادت ”جہان نو“ کی تاسیس کا موقع دینے پر تیار نہیں ہے تو پھر زمین کا اور کونسا گوشہ ہو سکتا ہے جہاں طاقت کو سمیٹ کر تعمیری کام شروع کیا جاسکے۔ پہلے نگاہ حبش پر گئی اور اسی لیے ساتھیوں کو وہاں بھیجا۔ اگرچہ شاہِ سخاشی نے مظلومین مکہ کی حمایت کا حق ادا کر دیا۔ لیکن ایک تو وہاں عیسائی علماء کا گھٹیا کردار سامنے آچکا تھا۔ اور ان کے چھائے ہوئے اثر کے تحت دینِ حق کا پینا آسان نہ تھا۔ دوسرے وہاں کی مقامی آبادی میں بالکل نئے سرے سے کام کرنے کی ضرورت تھی اور اس میں اجنبیت کے بہت سے وجوہ حائل نظر آتے تھے۔ اس لیے کسی دوسرے گوشے کی تلاش تھی۔ مدینہ نے جب کھلے دل سے دعوتِ حق کو لبیک کہی تو سرورِ عالم کو امید کی ایک نئی جھلک نظر آئی۔ بیعت عقبہ اولیٰ نے اس امید کو مستحکم کر دیا۔ پھر مصعب بن عمیر نے خود وہاں رہ کر اور کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد بیعت عقبہ ثانیہ والے موسم حج سے کچھ قبل آ کر حضور کی

خدمت میں رپورٹ پیش کی۔ مدینہ کے مسلمانوں کی تفصیل بیان کی، ان کی قوت کا حال بتایا۔ اور خوش خبری دی کہ وہ اس سال بڑی تعداد میں آرہے ہیں۔ اس رپورٹ نے حضور کو غور و فکر کی دعوت دی۔ یہ صورت فی الواقع بڑی خوش آئند تھی کہ مدینہ کے مسلمان تعداد اور قوت کے لحاظ سے دن دن رات رات بڑھ رہے تھے اور پھر یہود کی طرف سے اس طرح کی سنگین مخالفت کا ان کو سامنا نہیں کرنا پڑ رہا تھا جیسے ان کے مکی ساتھیوں کو قریش کی طرف سے درپیش تھی۔ اور اہل یشرب مکہ والے رفقاء کے لیے بالعموم کڑھتے تھے، ان کو بہت زیادہ سہولتیں تھیں۔ ان کے ہاں کھیتیاں تھیں اور نخلستان اور ناکستان تھے حضور سوچتے تھے کہ کیا یہ اچھا نہ ہو کہ مکہ کے رفقاء مدینہ چلے جائیں۔ اور قریش کے مظالم سے نجات پا کر دین کے تقاضے پورے کر دیں۔ چنانچہ آنے والے وفد میں جو لوگ محرم تھے ان سے آپ نے اس خیال کا اظہار بھی فرما دیا اور بعد میں جس شکل میں پیام بانڈھا گیا وہ اسی پس منظر کے ساتھ تھا۔

ہوں تو ہجرت حبشہ سے مہاجرین کے لوٹ آنے کے بعد ہی سے اکاد کا رفقاء آپ کی اجازت سے مدینہ جاتے رہے۔ لیکن بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد رفتار تیز ہو گئی۔ اور تقریباً طے ہو گیا کہ دوسرا دارالہجرت مدینہ ہی ہوگا۔

سردارانِ مکہ دیکھ رہے تھے۔ کہ تحریکِ اسلامی نے ایک نیا مضبوط مرکز پیدا کر لیا ہے ان کی نگاہوں میں مستقبل بڑا بھیاںک ہو ہو کر آنے لگا۔ وہ اپنی جگہ خوب سمجھ رہے تھے کہ اب اگر مدینہ میں کلمہ حق کی جڑ لگ جاتی ہے تو ہمارے حدودِ اثر سے باہر ہی یہ کلمہ ایک ناقابل شکست طاقت بن کر ایک دن ہماری ہی خبر لے گا۔ اور ہمیں کو اپنے کرتوتوں کا حساب پائی پائی ادا کرنا ہوگا۔ وہ اس خطرے کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ کہ شام کی تجارتی شاہراہ چونکہ مدینہ سے ہو کر گزرتی ہے اس لیے مدینہ کا نیا اسلامی مرکز شاہراہ کی ناکہ بندی کر سکے گا۔ اور اس طرح ان کی معاشی شاہ رگ کٹ جائے گی۔ ان پر اندر ہی اندر گھبراہٹ کا شدید درہ پڑ چکا تھا۔ مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کریں کیا؟ وہ دن رات اس اندیشے میں رہنے لگے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی پوری جماعت کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ اسی اندیشے کے زیر اثر وہ بالآخر صاحب نبوت کے قتل کے منصوبے بنانے پر اتر آئے۔ ایک تاریخی طاقت جو ان کے اپنے گھر سے ابھری اور ساری دنیا سے زیادہ ان کی اپنی تھی، اُسے اپنے ہی کرتوتوں سے "غیر" بنا دیا۔ اور خود اس کے دشمن بن کھڑے ہوئے۔ پس اب جوں جوں وہ زور پکڑتی تھی، ان کے لیے ایک جان لیوا خطرہ بنتی جاتی تھی۔

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حیات محمد از محمد حسین ہیکل مصری صفحہ ۲۰۲ - ۲۰۳

چنانچہ پہلا ہاجر جب مدینہ کے ارادے سے نکلا تو مکہ والوں نے اس کے ساتھ جفاکارانہ معاملہ کیا۔ یہ اولین ہاجر ابو سلمہ عبداللہ بن الاسد مخزومی تھے۔ یہ بیوی بچے کو اونٹ پر سوار کر کے نکلے۔ ان کی بیوی بنو مغیرہ میں سے تھیں، وہ لوگ عین روانگی کے وقت تندی میں آئے اور ام سلمہؓ کے اونٹ کی ہمار یہ کہہ کر ابو سلمہ سے چھین لی کہ اسے ہم تیرے ساتھ در در پھرنے کے لیے کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ اس جذباتی صورتِ حالات نے ابو سلمہ کے قبیلہ والوں میں سخت ردِ عمل پیدا کر دیا۔ انہوں نے بنو مغیرہ سے کہا کہ اگر تم ہمارے آدمی سے اس کی جو رو کو یوں چھینتے ہو تو پھر ہم اپنا نٹا بچہ اس کی گود میں نہ رہنے دیں گے۔ چنانچہ شوہر، بیوی اور بچہ تینوں باہم دگر بچھڑ گئے اور اس عالم میں ابو سلمہ نے کوچ کیا۔ ام سلمہؓ نہ صبح کو آ کر شہر سے باہر اسی موقع پر زار و قطار رونے لگتیں۔ آخر سال ہجر کے بعد کسی کو رحم آ گیا۔ اور اس نے بنو مغیرہ سے کہہ سن کر اونٹ پر سوار کرا کے ام سلمہ کو بچے سمیت مدینہ روانہ کر دیا۔ اور وہ تنہا چل کھڑی ہوئیں خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک مقام پر عثمان بن طلحہ مل گئے اور انہوں نے اس ہاجرہ کو حوالیٰ مدینہ میں پہنچا دیا۔ یعنی ہجرتِ حبشہ کے تلخ تجربے کے بعد اب پالیسی یہ ٹھہری کہ خدا پرستانہ نظامِ زندگی کے علمبرداروں کو اپنے قابو سے نکلنے ہوئے روکا جائے۔ وہ نکلیں تو ایسی حالت میں نکلیں کہ ان کا کنبہ قبیلہ بطورِ یرغمال مکہ والوں کے پاس رہے۔ یہ پالیسی شروع میں ذرا ڈھیل ڈھالی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس میں سختی بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ اور عیاش ابن ابی ربیعہ اور ہشام بن عاص بن لؤائل دورِ آخر میں ایسے عالم میں چھپ چھپا کر نکلے کہ ہر وقت دھڑکا تھا کہ کہیں گرفتار نہ ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ اور عیاش تو تیز رفتاری سے نکل گئے لیکن ہشام کو پکڑ لیا گیا اور وہ شکنجہٴ استبداد میں آ گئے۔ حضرت عمرؓ اور عیاش بخیریت مدینہ پہنچ گئے۔ کہہ سے ایک سازشی وفد ان کے پیچھے روانہ ہوا۔ یہ ابو جہل بن ہشام اور عارث بن ہشام پر مشتمل تھا یہ لوگ جا کر عیاش سے ملے اور کہا کہ تمہاری والدہ کا حال ابتر ہے اور اس نے قسم کھالی ہے کہ جب تک تم سے نہ ملے گی سر کے بال نہ سنوارے گی اور چلچلاتی دھوپ میں کھڑی رہے گی۔ ساتھیوں نے سمجھایا کہ یہ واضح طور پر ایک چال ہے، تم ایک بار مکہ والوں کے پھندے میں پھنس گئے تو یہ تمہیں دین سے ہٹا دیں گے۔ عیاش کو ایک لالچ یہ بھی تھا کہ وہ مالدار آدمی تھے اور کچھ مال نکال لانا چاہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پیش کش کی کہ میں اس سے زیادہ مال رکھتا ہوں۔ اور تم مجھ سے آدھا مال لے لو۔ ان دونوں کے ساتھ نہ جاؤ۔ عیاش نہ مانے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ اچھا اگر یہی طے ہے تو میری اصیل اونٹنی لے جاؤ جہاں کوئی اندیشہ محسوس ہو، بھاگ نکلنا۔ مگر کئی سازشیوں نے راستے میں ایسی چال چلی کہ اصیل اونٹنی سے فائدہ اٹھاتا بھی عیاش کے بس نہ رہا۔ اور ان کی مشکلیں کس لی گئیں۔ اہل وفد جب مکہ پہنچے تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو، یوں علاج کرو اپنے اپنے

عقل کے ماروں کا جیسے ہم نے کیا ہے۔

بعد میں حضرت عمرؓ نے دستِ خاص سے ایک خط ہشام بن العاص کو لکھا اور اس میں مشہور آیت  
 یعبادی الذین اسرفوا..... اللہ درج کی۔ اس خط کو مکہ کے پاس ”ذی طوی“ نامی موقع پر ہشام  
 نے پڑھا۔ بار بار غور کیا اور جب بات پالی کہ اس میں اشارہ خود اس کی جانب ہے تو فوراً اونٹ لیا کجاواکسا  
 اور روانہ ہو گیا۔ لیکن اس سے زیادہ مضبوط روایت یہ ہے کہ جب آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لا  
 چکے تو ایک دن مجلس میں ان دونوں مجوسین کا ذکر چھڑا۔ آپؐ نے فرمایا ”عیاش بن ابی ربیعہ اور ہشام بن عاص  
 کو نجات دلانے کے لیے کون مجھے اپنی خدمات سونپتا ہے؟“ ولید بن مغیرہ نے اپنے آپ کو پیش کیا۔ ولید  
 حکم نبویؐ کے مطابق مکہ روانہ ہو گئے۔ چھپتے چھپاتے آبادی کے قریب آئے۔ ایک عورت کھانا لے باقی  
 نظر آئی۔ پوچھا ”اللہ کی بندی کدھر کو جا رہی ہو؟“ اس نے جواب دیا کہ ”یہاں دو قیدی ہیں، یہ کھانا ان کے  
 لیے ہے“ ولید چھپے ہوئے۔ وہی دونوں تھے اور ایک بے چھت کے مکان میں بند تھے۔ شام ہو گئی تو یہ  
 دیوار پھانڈ کر اترے۔ ان کی بیڑیوں کے نیچے پتھر رکھ کر اپنی تلوار سے ان کو کاٹ ڈالا۔ پھر باہر نکال کر دونوں  
 کو اونٹ پر بٹھایا اور راہ فرار اختیار کی۔

اسی طرح اکثر لوگ خود اگر نکلے بھی تو مکہ والوں نے ان سے ان کے اموال رکھوا لیے جیسے بھارت  
 سے جائیں بچا کر نکلنے والے بہت سے مسلمانوں کے ساتھ ہوا۔

لیکن ہجرت کے اس درجہ جگر آزما ہونے کے باوجود مرد ہی نہیں، خواتین بھی برابر جادہ فرض پر اقدام  
 کر رہی تھیں۔ تحریکِ اسلامی کا یہ اعجاز اپنی مثال نہیں رکھتا کہ آج سے صدیوں پہلے کے وحشی عرب کی ان پڑ  
 خواتین تک میں اس زندگی بخش طاقت نے بیکسندہ در حرکت عمل پیدا کر دی۔

مہاجرین کے راستے میں رکاوٹیں ڈال کر قریش اپنی بوکھلاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے، مگر دوسری  
 طرف جس شخصیت سے سابقہ تھا، وہ عالی حوصلگی کی اونچی چوٹی پر کھڑی تھی۔ وہاں سمندر کا سا وسیع ظرف  
 تھا۔ وہ پیکرِ صبر و استقلال ٹھنڈی عزیمت اور ٹھہراؤ والی فطرت سے آراستہ تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مرکزِ دعوت  
 پر ڈٹا رہا۔ اسے آخری حد تک تمام محنت کا فریضہ ادا کرنا تھا۔ وہ اہل مکہ کے خلاف مشیتِ الہی کے کھیل  
 کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے اپنا فرض صبر و تحمل سے ادا کر رہا تھا۔ اس کی مثال ڈوبتے جہاز کے بہادر  
 کپتان کی سی تھی کہ جو سارے عملے اور سارے مسافروں کو سلامتی کی کشتی پر سوار کرنے کے بعد سب سے  
 آخر میں جہاز کو چھوڑنے والا تھا۔

جب بجز ایسے چند افراد کے کوئی باقی نہ رہا، جنہیں قریش کے جبر نے محصور کر رکھا تھا یا جن کو کسی

مقادیبا مصلحت نے بازہ رکھا تھا تو اس وقت آپ کو آسمانی حکومت کی طرف سے پروانہ ہجرت ملا۔ آپ نکلے تو ایسے عالم میں نکلے جب کہ مکہ والے آپ کو زندہ دیکھنے کے روادار نہ رہے تھے اور جب نکلنے کی گھڑی آگئی تو خون کی پیاسی تلواروں کے گھیرے میں سے آپ بے خون کی شان سے نکل گئے۔

### مدینہ — ہمہ تن انتظار :

مہاجرین کی تعداد جوں جوں بڑھ رہی تھی مدینہ میں زندگی کی روزور پکڑ رہی تھی۔ دعوتِ حق کا اُجالا آہستہ آہستہ بڑھنا جا رہا تھا۔ اور جتنا جتنا اسلام دلوں کی دنیاؤں کو فتح کرتا جاتا تھا۔ اسلام کا پیغام لانے والے محسن کی محبت بڑھتی جاتی تھی۔ خصوصاً بیعتِ عقبہ ثانیہ کے بعد سے مدینہ کی چشمِ انتظار ہر دم مکہ سے آنے والے راستہ پر لگی رہنے لگی۔ ایک فصل بہا بہا رہی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ ابر کرم آئے اور برس جائے۔ ایک چمن لالہ و گل آداستہ تھا اور امیدوار تھا کہ باد بہاری کے جھونکے آئیں اور رنگِ دبو کے طوفان اُبل پڑیں۔ مسالہ جمع پڑا تھا اور ہمہ تن آرزو تھا کہ معمارِ انسانیت آئے اور تعمیر نو بپا کر دے۔

ہوا کی لہریں یہ اطلاع بھی کسی نہ کسی طرح لے آئیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکل چکے ہیں۔ اور جاوہِ ہجرت کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ اس خبر پر مدینہ میں اشتیاق کے جذبات اضطراب کی حد کو پہنچ گئے ہوں گے۔ انتظار کی بے چینیاں زور پکڑ گئی ہوں گی۔ سوچو کہ ہر طرف کیا چرچے ہوں گے؟ کیا استفسارات ہوا کرتے ہوں گے؟ کیسی گفتگوئیں محفلوں کی رونق رہتی ہوں گی؟ جذبات و احساسات کا کیا عالم ہوگا؟ مشرکین کا۔ یہود کا۔ انصار کا، مسلمانوں کا۔

چھوٹے چھوٹے بچوں کی زبانوں پر یہی بات رہنے لگی کہ رسول آ رہے ہیں رسول آ رہے ہیں۔ لوگ ہر صبح گھروں سے نکلتے اور شہر سے باہر جمع ہو کر انتظار کرتے۔ جب گرما کا سورج اونچا ہو جاتا اور دھوپ قابلِ برداشت نہ رہتی تو حسرت زدہ ہو کر لوٹ جاتے۔ یومِ قدومت کو بھی لوگ اسی طرح جمع ہو کر لوٹ رہے تھے کہ ایک یہودی نے قلعے پر سے دیکھا اور مژدہ سنایا۔ کہ "اہلِ یثرب! لو، تمہیں جس بزرگ کا انتظار تھا وہ آپہنچے" تمام شہر تکبیر کے غلغلے سے گونج اٹھا۔ لوگ بے تابانہ وارد ہوئے۔ اکثر انصار خوب ہتھیار لگا لگا کر نکلے۔

اولین قیام مقامِ قبا میں ہوا جو مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک مضافاتی آبادی تھی۔ عمرو بن عوف کے خاندان نے نعرہ ہائے مسرت کے ساتھ استقبال کیا اور اسی خاندان کو شرفِ میزبانی حاصل ہوا۔ یہ گھر دراصل تحریکِ اسلامی کا ایک مرکزی اڈہ (CENTER) تھا۔ مہاجرین میں اکثر کے لیے منزلِ اول ہی گھر بنا اور بعض مہاجر صحابی اس وقت بھی یہیں مقیم تھے۔ حضرت علیؑ بھی امانتوں کی ادائیگی کے بعد روانہ ہو کر یہیں

کاروانِ محبوب کے ساتھ آئے۔ یہاں چودہ روز قیام رہا۔ اور مہاجرین بوق در بوق شرفِ ملاقات کو آ رہے تھے۔ لوگ اس ہستی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کا پیغام ان کے سینوں میں گھر کر چکا تھا۔ اس کے پرے کی ایک جھلک نگاہوں کے دامن میں سمیٹ لینا چاہتے تھے، اس کے منہ سے میٹھے بولی سننا چاہتے تھے، اس کی دعائے خیر سے حصہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ غائبانہ عقیدت اب محسنِ انسانیت کو رُودرُود دیکھنا چاہتی تھی۔ سلام، ملاقاتیں، گفتگوئیں، دعائیں، مجلسیں، کیا کچھ نہ ہوگا۔

قبائیں آپ نے اپنے ہاتھوں سے ایک مسجد کی بنا رکھی۔ ایک ایک مسلمان اس تعمیر کی مہم میں شریک تھا اور خود دنیا کا سب سے بڑا تاریخ ساز ایک معمولی مزدور کی طرح بھاری بھر کم پتھر اٹھا اٹھا کر لارہا تھا۔ کام ہو رہا تھا اور ساتھ کے ساتھ گیت گایا جا رہا تھا۔

افلح من يعالج المساجداً      ويقراء القرآن قائماً وقاعداً

ولا يبیت اللیل عنہ راقداً

یعنی کامیاب وہ ہے جو مسجد میں تعمیر کرے۔ اٹھتے بیٹھتے قرآن پڑھے اور راتوں کو عبادت کے لیے، جاگے۔ یہ مسجد محض اینٹ پتھر اور گارے اور پھولس کا مجموعہ نہ تھی اس میں خاتم النبیین سے لے کر ایک عامی مسلمان تک ہر ایک نے بہترین جذبات صرف کیے تھے۔ اسی لیے اس کی شان میں قرآن نے کہا: "مَسْجِدًا أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ"۔ یہ ایسی مسجد ہے کہ اس کی بنیاد تقویٰ پر استوار کی گئی ہے۔

قبائیں ورود ۸ ربیع الاول ۱۱؎ (دنبوی) بروز جمعرات ہوا تھا۔ چودہ روز بعد انسانِ اعظم نے رفقہ سمیت مدینہ کا رخ کیا۔ قبا سے مدینہ تک دورویہ انصار خیر مقدم کے لیے عینیں بانڈھے کھڑے تھے۔ آپ کے ننھیالی رشتہ داروں نے خاص اشتیاق سے ہتھیار لگائے۔ عورتیں چھتواں پر جمع تھیں اور ترانہ خیر مقدم گارہی تھیں۔

طلح البدر علینا      من ثنبات الوداع

وجب الشکر علینا      مادعی لکھ د۱۶

اور چھوٹی بچیوں کے غول گھوم رہے تھے، یہ لڑکیاں دف بجا بجا کر گاتی پھرتی تھیں۔

نحن جوار من بنی نجرار      یا حبذا احمداً من جار

ان بچیوں کی پاکیزہ محبت کا جواب سرورِ عالم نے بھی خاص شفقت سے دیا۔ ان سے باتیں

کیں۔ پوچھا۔ کہ کیا تم مجھے چاہتی ہو؟ انہوں نے کہا "جی ہاں! آپ نے فرمایا کہ میں بھی تم کو



چاہتا ہوں"۔

ذرا تصور میں لائیے اس تاریخی گھڑی کو جو دینے کے نصیب میں آئی تھی۔ گلیوں کی خاک کے ذرے ذرے میں دل دھڑک رہے ہوں گے۔ دیواروں کی درزوں کو آنکھیں مل گئی ہوں گی۔ ہوا کے جھونکوں میں انسانی احساسات پیدا ہو گئے ہوں گے۔

عارضی قیام کے لیے حضرت ابوالیوب انصاری کے گھر کی قسمت جاگی۔ سات ماہ نبی اکرم کا

قیام یہیں رہا۔

### تعمیری اقدامات :

یونہی ذرا سکون ہوا اور مسافرت کی کیفیت ختم ہوئی تو سرورِ عالم تعمیری اقدامات کی طرف متوجہ ہوئے۔ اولین مہم مسجد کی تعمیر کی تھی۔ جو یتیم بچوں کی افتادہ زمین خریدی گئی اور حضرت ابوب انصاری ہی نے قیمت ادا کی۔ اس زمین پر مسجد نبوی کی تاسیس ہوئی۔ مسجد کی اہمیت صرف بطور معبد ہی کے نہ تھی۔ بلکہ اسے اسلامی نظام تمدن و ریاست کا سرچشمہ و مرکز بنانا تھا۔ وہ حکومت کا دربار، مشورے کا ایوان، سرکاری مہمان خانہ، جمہوری دارالعلوم اور قومی لیکچر ہال کی حیثیت سے برپا کی گئی۔ اس اولین تعمیری اقدام پر وہی تباہ و لالہ نقشہ پیش آیا۔ کون مسلمان ہوگا جس نے اس میں دل و جان سے حصہ نہ لیا ہوگا۔ خود سرورِ عالم سچے اور گارا اٹھا اٹھا کر لاتے اس منظر کو دیکھ کر ایک مسلمان مارے جذبات کے پکار اٹھا کہ :-

لئن قعدنا و النبی یعمل لئذک منا العمل المصلک

یعنی اگر خدا کا نبی اس کام میں یوں لگ جائے اور ہم بیٹھے دیکھتے رہیں تو ہمارا کیا کرایا غارت

ہوا۔

کام کی گرما گرمی میں کوئی بیہودہ گوئی نہ تھی۔ بلکہ آنحضرت سمیت سب کے سب یہ صدا بلند کر

رہے تھے۔

لا عیش الا عیش الاخرة اللهم ارحم الانصار والمهاجرة

یعنی آخرت کی ابدی زندگی ہی زندگی ہے۔ اور وہ نہ ہو تو پھر زندگی بیچ ہے۔ اے اللہ!

تو انصار اور مہاجرین پر رحم فرما۔

۱۔ سیرت النبی جلد ۱ صفحہ ۲۰۴ - ۲۰۳

۲۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۱۲

یہ تھی اسپرٹ اور یہ تھیں دعائیں جو مسجد نبویؐ کی تعمیر کا اصل مسالہ بنیں۔ مسجد کے ساتھ محسن النساء صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے گارے اور پھونس کے حجرے (کواریٹرز) تعمیر ہو گئے۔ آپ اپنے انہی کواریٹرز میں منتقل ہو گئے۔

مدینہ میں حضرت رسالت مآبؐ کی تشریف آوری سے از خود دعوت کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ اور اس سات ماہ کے عرصے میں تحریکِ حق نے قبیلے قبیلے اور گھر گھر سے جان نثار حاصل کر لیے۔ صرف خطہ واقف، وائل اور امیہ کے گھرانوں میں شرک کی تاریکی باقی رہ گئی۔ اور ان سب کا تعلق قبیلہ اوسس سے تھا۔

تعمیری ہم کے سلسلے میں کارِ دعوت کا آگے بڑھانا درجہ اول کی اہمیت رکھتا تھا۔ انفرادی دعوت کے علاوہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی طور سے کام کا آغاز جس خطاب عام سے کیا وہ ان الفاظ پر مشتمل تھا۔

(حمد و ثنا کے بعد) — "لوگو! اپنی جانوں کے لیے وقت پر کچھ کمائی کر لو، خوب جان لو، خدا کی قسم تم میں سے ہر ایک پر موت وارد ہوگی۔ اور وہ اپنے گلے کو اس حال میں چھوڑ کر رخصت ہوگا کہ کوئی اس کا چرواہا نہ رہے گا۔ پھر اسے اس کے پروردگار کی طرف سے ایسے عالم میں خطاب کیا جائے گا جب کہ بیچ میں کوئی ترجمان نہ ہوگا۔ کہا جائے گا کہ کیا تجھ تک میرا رسول نہیں پہنچا تھا۔ جس نے بات تجھ تک پہنچائی ہو۔ پھر کیا میں نے تجھے مال نہیں دیا تھا، اور تجھ پر نوازش نہیں کی تھی؟ تو پھر اپنی جان کے لیے تو نے کیا اندوختہ کیا؟ پس وہ دیکھے گا دائیں بائیں، لیکن کچھ نہ دکھائی دے گا۔ پھر سامنے کی طرف نگاہ ڈالے گا۔ مگر بجز جہنم کے اور کچھ سامنے نہ آئے گا۔ سو جس کو بھی توفیق ہو کہ وہ کھجور کی ایک پھانک کے عوسن بھی اپنے چہرے کو دوزخ کی آگ سے بچانے کے لیے کچھ کر سکتا ہو تو کرے۔ جو اتنا بھی نہ کر سکے وہ کوئی بھلی بات کہہ کر ہی بچاؤ کرے۔ کیونکہ نیکی کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ملتا ہے اور تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں وارد ہوں گے۔"

سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص ۱۱۱  
ایضاً

دوسرا خطاب عام جو آپ نے فرمایا، یہ تھا :

ساری تعریف اللہ کے لیے ہے۔ میں اسی کی حمد کرتا ہوں۔ اسی سے مدد چاہتا ہوں! ہم سب اپنے دلوں کی شرارتوں اور اپنے اعمال کی خرابیوں کے مقابلے میں اللہ ہی کی پناہ طلب کرتے ہیں۔ جسے اللہ ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جسے وہ ہدایت سے محروم کر دے اس کے لیے کوئی رہنما نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کہ جو ایک ہے اور جس کے ساتھ کوئی دوسرا حصہ دار نہیں، کوئی اور قابل عبادت و طاعت ہستی نہیں۔ بلاشبہ بہترین بیان اللہ تبارک و تعالیٰ کی کتاب ہے، جس شخص کے دل کے لیے اللہ نے اس کو محبوب بنا دیا اور جسے کفر کے بعد اسلام میں داخل کیا۔ اور جس نے اور سارے انسانی بیانون کے مقابلے میں اسے اپنے لیے پسند کر لیا، اس نے فلاح پائی۔ یہ بہترین بیان ہے اور سب سے زیادہ مؤثر۔ تم وہی کچھ پسند کرو جو اللہ کو پسند ہے اور اللہ سے اخلاص کے ساتھ محبت کرو۔ اللہ کے کام سے تغافل نہ برتو اور تمہارے دل اس کے لیے سخت نہ ہونے پائیں۔ چونکہ یہ حقیقت ہے کہ اللہ جو کچھ پیدا کرتا ہے اس میں سے بہتر کو چھانتنا اور منتخب کرتا ہے سو اس نے اعمال میں سے بہترین اور بندوں میں سے برگزیدہ ترین اور بیانون میں سے پاکیزہ ترین کو متعین فرما دیا ہے۔ نیز انسانوں کو جو کچھ دیا گیا ہے اس میں سے کچھ حلال ہے، کچھ حرام۔ پس اللہ کی غلامی اختیار کرو۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دو۔ اس کے غضب سے اس طرح بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے۔ اور اللہ کے حضور میں وہ سارے پاکیزہ اقوال سچ کر دکھاؤ جن کو تم اپنی زبانوں سے ادا کرتے ہو۔ اور اللہ کی رحمت کے ذریعے ایک دوسرے سے محبت کا رشتہ استوار کرو۔ یقیناً اللہ ناراض ہوتا ہے اگر اس کے ساتھ باندھے ہوئے (ایمان کے) عہد کو توڑا جائے۔ اور تم پر سلامتی ہو۔

تقریر کے الفاظ جو روایات سے ملتے ہیں بہت مختصر ہیں اور آنحضور کے خطاب بالعموم مختصر ہوتے تھے۔ لیکن مطالب کی جامعیت دیکھیے کہ وقت کے تمام اہم

مسائل ان الفاظ میں بول رہے ہیں۔ تقریر میں اسلام کی دعوت بھی گئی ہے۔ قرآن کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ جلال و حرام کی تمیز پیدا کرنے کا درس دیا گیا ہے۔ اور اصولی و مقصدی جذبہ اخوت و رفاقت پیدا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ان دو تقریروں کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اجتماعی دعوت کی نئی لہر کس انداز سے اٹھائی گئی تھی۔ ایک طرف بنیادی نظریہ کا پیغام دیا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف اسی نظریہ کی اسپرٹ کے ذریعے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے سوسائٹی کو رہنمائی دی جا رہی تھی۔

## اسلامی ریاست کی تاسیس

تیسرا تعمیری اقدام — اور شاید سیاسی لحاظ سے سب سے بڑا تعمیری اقدام — یہ تھا کہ ریاست چلانے کے لیے مدینہ کے یہود و مشرکین اور مسلمانوں کی سوسائٹی کو ایک نظم میں پرو دیا گیا۔ سیاسی نوعیت کی تنظیم معاشرہ کے لیے ایک تحریری معاہدہ استوار کیا گیا۔ جس کی نوعیت درحقیقت ایک باقاعدہ تحریری دستور کی ہے۔ اس کو بجا طور پر دنیا کا پہلا تحریری دستور کہا جاتا ہے۔ ہم یہاں اس دستور کی دفعات پر بحث نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ اس کے چند اہم پہلوؤں کا خلاصہ بیان کر دیتے ہیں اس دستوری معاہدے کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ حاصل کیا۔ وہ یہ تھا:

— مدینہ کے منظم ہونے والے معاشرے میں خدا کی حاکمیت اور اس کے قانون کو اساسی اہمیت حاصل ہو گئی۔

— سیاسی، قانونی اور عدالتی لحاظ سے آخری اختیار (Authority) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ آ گیا۔

— دفاعی لحاظ سے مدینہ اور اس کے نواح کی پوری آبادی ایک متحدہ طاقت بن گئی اور اس کے کسی عنصر کے لیے قریش کی حمایت کے دروازے بند ہو گئے نیز دفاعی لحاظ سے بھی مرکزی اور فیصلہ کن اختیار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ گیا۔

اس دستوری معاہدہ سے باضابطہ طور پر اسلامی ریاست اور اسلامی نظام حیات کی تاسیس واقع ہو گئی ہے۔

لے جو طاقت کوئی نصب العین لے کر اٹھتی ہے وہ ہمیشہ سب سے پہلے اسی کی فکر کرتی ہے۔ عرب کی جماعت اسلامیہ کی بے سرو پا کو دیکھیے۔ اور مدینہ کے اجنبی ماحول میں اگر چند راہے پھڑے افراد کا عالم ابتلا دیکھیے اور پھر ملاحظہ فرمائیے کہ کیسے اولین اسلامی ریاست کی فوڈ تاسیس کی جاتی ہے۔ اور کیسے چند مہینوں میں دستور بن کر نافذ ہو جاتا ہے نسلی اور مذہبی لحاظ سے گونا گوں متضاد عناصر کو اتنا جلد ایک دستور متحدہ کو دکھانا تاریخ کا ایک حتمی نمونہ واقع ہے۔

اس زمانے کے حالات کی پیچیدگیوں کو سامنے رکھیں تو پھر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کارنامہ کتنے بڑے پیمانے کا کارنامہ تھا۔ اور اس کے پس منظر میں ایک لامتناہی سیاسی بصیرت اور گفت و شنید کی مہارت کام کرتی ملتی ہے۔ یہ دستوری دستاویز بھی اور دوسرے معاہدات و معاملات اور جنگی منصوبے بھی ہمیں آگاہ کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک صوفی و درویش نہ تھے بلکہ اجتماعی معاملات کو سنبھالنے اور سنوارنے کے لیے ماہرانہ حکمت سے آراستہ تھے۔ اور ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی پوری پوری صلاحیتیں رکھتے تھے۔

## نظامِ مواتیات :-

مدینہ کے معاشرہ کا ایک بڑا مسئلہ سینکڑوں مہاجرین کی بجالی کا مسئلہ تھا۔ گھر بار چھوڑ چھاڑ کر مسلسل لوگ اکھڑے چلے آ رہے تھے اور چند ہزار کی آبادی رکھنے والی متوسط سی بستی کو انہیں اپنے اندر جذب کرنا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلے کو جو تاریخ میں جب بھی پیدا ہوتا ہے، پریشان کن بن جایا کرتا ہے۔ مدینہ کے معاشرے اور اس کے صدر ریاست نے جس کمال حکمت سے حل کیا اس کی کوئی دوسری مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ کوئی آرڈی نینس جاری نہیں کیے گئے۔ کوئی قانون نہیں ٹھونسے گئے۔ الاٹ منٹیں نہیں کی گئیں۔ مہاجرین کی تعداد معین کر کے کوئی قدغن نہیں لگائی گئی۔ کسی جبر سے کام نہیں لیا گیا۔ محض ایک اخلاقی اپیل کے ذریعے اس پڑپچ مسئلے کو چند روز میں حل کر لیا گیا۔ سرورِ عالم نے عقیدے اور نظریے اور مقصد کی صحیح معنوں میں ایک نئی برادری پیدا کر دکھائی اور ایک ایک انصاری کے ساتھ ایک ایک مہاجر کا برادرانہ رشتہ قائم کر دیا۔ انصار کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے مال، مسکن، باغات اور کھیت آدھوں آدھ بانٹ کر فقار مقصد کو دے رہے تھے بلکہ بعض تو یہاں تک تیار ہو گئے کہ دودو بیویوں میں سے ایک ایک کو طلاق دے کر اپنے دینی بھائیوں کے نکاح میں دے دیں۔ دوسری طرف مہاجرین کی خودداری کا نقشہ یہ تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمیں کھیت یا بازار کا راستہ دکھا دو، ہم تجارت یا مزدوری کر کے پیٹ پال لیں گے۔

مجرد، بالخصوص نو عمر مہاجرین جو اپنے آپ کو تعلیم کے لیے وقف کرنا چاہتے تھے ان کی اقامت گاہ "صفہ" (مسجد نبوی کا ایک چبوترا) تھی۔ تعمیری کام کے سلسلے میں یہ ایک اہم ادارہ تھا۔ اصحاب صفہ کی کفالت سوسائٹی کرتی تھی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کی ضروریات کی تکمیل میں سرگرم رہتے۔

## پھر وہی کشمکش :

یہاں تاریخ و سیرت کے پورے سلسلہ واقعات کو پیش کرنا مقصود نہیں ہے۔ مجملاً ہم نے یہ دکھانا چاہا ہے کہ تحریک اسلامی کی پود مکہ سے آ کر مدینہ میں کس طرح نصب ہوتی ہے اور کس طرح نئی کونپس

نکلانے لگتی ہے۔ ماحول کیا تھا اور اب ایک نئی موثر طاقت کے آجانے سے اس میں کس نہج پر نئی حرکات شروع ہو رہی تھی۔ سوتے ہوئے معاشرے کو جس حق نے آکر جگا دیا تھا۔ عمل کا ایک اسٹیج تیار ہو گیا تھا اور اس پر ایک مثبت اور تعمیری طاقت اپنا کردار پیش کر رہی تھی۔ مثبت کردار کے سامنے آتے ہی تاریخی قانون کا یہ تقاضا تھا کہ کوئی نہ کوئی منفی کردار بھی نمودار ہو۔ تعمیری مہم کے مقابل میں مثبت کا ضابطہ لازماً ایک تخریبی طاقت کو حرکت میں لانا چاہتا تھا۔ حق اگر میدان میں آ گیا ہو۔ تو پھر ناگزیر تھا کہ باطل کے محاذ پر بھی گرما گرمی پیدا ہو جائے۔ عاشق جانناز اگر کوچہ جاناں کی طرف اقدام کرے تو پھر رقیب رُسیاہ کی ضرورت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مدینہ میں جس نئے معاشرہ کی اٹھان ہو رہی تھی اُسے دیکھ دیکھ کر شیطان بری طرح تلملا رہا تھا۔ وہ اپنے کچھ فداکار اور جاں نثار میدان میں لانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسے آلہ کار مل گئے۔ اور وہ ان کو اٹھا کر بیٹج پر لے آیا۔ تحریک کو پہلے سابقہ ابراہیم علیہ السلام کے نام لیواؤں سے تھا اب اس کے مقابلے میں موسیٰ علیہ السلام کے جانشین چغہ ہاتے تقدس پہنے اور کتاب اللہ بغل میں لیے خراماں خراماں بڑھتے دکھائی دیے۔ تحریک اسلامی کے ڈرامے میں پہلے جو پارٹ متولیانِ کعبہ نے ادا کیا تھا اب مدینہ میں وہی پارٹ فرزندِ ان بیت المقدس نے اپنے ذمے لیا۔

## یہود کا تاریخی مقام اور پارٹ :

تاریخ اسلام و جاہلیت کی یہ عجیب ٹریجڈی ہے کہ دین حق کی مزاحمت کرنے کی خدمت سب سے بڑھ کر جوشِ ایمانی کے ساتھ ہمیشہ اہل مذہب ہی نے سرانجام دی ہے۔ اہل مذہب جن کو دین حق کی دعوت کی پہلی آواز سنتے ہی اولین صفوں میں جا کھڑا ہونا چاہیے وہی ہمیشہ ”اول کا فریہ“ بنتے رہے ہیں (الاماشاء) اہل مذہب ابتداء میں مذہب کے خادم اور علمبردار ہوتے ہیں۔ لیکن آہستہ آہستہ جب ان کا ایک مرتبہ پیدا ہو جاتا ہے، اور ان کے کچھ مفاد مذہب سے وابستہ ہو جاتے ہیں تو پھر وہ مذہب کو اپنا تابعدار بنا لیتے ہیں وہ آہستہ آہستہ مذہب کے نام پر اپنے کچھ مستقل حقوق پیدا کر لیتے ہیں۔ پیردانِ مذہب سے وہ کچھ اپنے طبقاتی مطالبات منوا لیتے ہیں۔ اور کچھ اعزازات ان کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ مذہب اپنے پیروؤں کے دور زوال میں ہمیشہ انہی مراحل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر مذہب ایک اچھے نفع بخش کاروبار کی سطح پر آ جاتا ہے اور وہ ایک موردِ ثنی جاگیر بنتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وعظ مالِ تجارت بن جاتے ہیں۔ غلہ ذریعہ معاش ٹھہرتا ہے۔ فتوے متاعِ بازار بن کر اپنا ایک مارکیٹ ریٹ پیدا کر لیتے ہیں۔ ہونی مناصب، روحانی قیادت و اقتدار کا زینہ قرار پاتے ہیں۔ اس مقام پر جب ایک بار اہل مذہب آپہنچتے ہیں تو پھر ان کا کاروباری ذہن ہر معاملے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ہمارا مفاد محفوظ رہتا ہے یا نہیں، اور ہمارا

منصب اور ہماری پوزیشن کسی اور طرف تو منتقل نہیں ہوتی جاتی۔ کاروباری ذہن جب ان اوصاف کے ساتھ دائرہ مذہب میں آگستا ہے۔

تو اہل مذہب :

کسی کی طرف سے اختلاف کو گوارا نہیں کر سکتے اور نہ کسی بڑے مقصد کے لیے دوسروں کے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں۔

اپنے اندر کسی کمزوری یا غلطی کو ماننے اور اس کی اصلاح کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

قیادت و اثر کی کرسی چھوڑ کر کسی دوسرے کی دعوت پر ادائے فریضہ نہیں کر سکتے۔

ٹھیک یہی مقام تھا جس کی آخری سرحد پر یہود آ پہنچے تھے۔ وہ یہ ہرگز نہیں مان سکتے تھے کہ حق

ان کے گروہی دائرہ کے باہر بھی پایا جاسکتا ہے۔ وہ نہیں مان سکتے تھے کہ ان کے پیچھے لگ کر چلے بغیر

بھی کوئی راہ باب ہو سکتا ہے۔ وہ نہیں مان سکتے تھے کہ رہنمائی کا منصب کسی دوسرے کو بھی مل سکتا ہے۔

مخالفت قریش مکہ نے بھی کی اور مخالفت یہود نے بھی کی۔ اور دونوں میں سے کسی نے کوئی کسر اٹھا

نہیں رکھی مگر دونوں کے مخالفانہ پارٹ میں بڑا بھاری فرق ہے جب ہم تجزیہ و موازنہ کر کے دیکھتے ہیں تو

اولین حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ قریش مکہ کی مخالفت میں اصل کار فرما روح جذبہ استکبار کی تھی۔ لیکن

یہود پر حسد کا جذبہ چھپا ہوا تھا۔ وہاں احساس برتری کی بیماری تھی اور یہاں احساس کنتری کا روگ تھا اسی

لیے وہاں کھلا کھلا انکار اور تصادم تھا اور یہاں مکاری اور عیاری کا مزاج مخالفانہ سرگرمیوں میں نمایاں تھا۔

وہاں بہادرانہ جسارت تھی اور یہاں بزدلانہ شرارت، وہاں مخالفت سیدھی تشدد کے رخ پر ارتقاء کرتی رہی

تھی۔ لیکن یہاں وہ نجوی اور سازش اور نفاق کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ مکہ میں صرف مسلم اور کافر دو گروہ تھے

لیکن مدینہ میں مسلم اور کافر طاقتوں کے بیچ میں ایک تیسرا کردار نفاق کا بھی نمودار ہو گیا۔ اس مطالعہ سے اندازہ

کیا جاسکتا ہے کہ جامد مذہبیت اور فاسد دین داری کھلے کھلے کفر و شرک اور صریح جاہلیت سے زیادہ

پست فطرت رکھتی ہے اور مخالفت حق میں زیادہ گھٹیا کردار پیش کرتی ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس رزم کفر و دین میں یہود کی جامد مذہبیت اور فاسد دین داری نے اسلام

کے مقابلے پر کفر و شرک کی طاقت کے پلڑے میں اپنا پورا پورا وزن تعاون ڈال دیا۔ حالانکہ بڑے سے

بڑے اختلاف کے باوجود اسے خدا پرستانہ و اخلاق پسندانہ مسلک کے علمبرداروں کے ساتھ زیادہ ہمدردیاں

ہونی چاہئیں تھیں۔ زیادہ سے زیادہ گنجائش اس بات کی ہو سکتی تھی کہ یہود مخالفت اسلام میں اپنی پوزیشن

کفار و مشرکین سے بالکل الگ میسر رکھتے۔ لیکن "تعالوا الی کلمۃ سواۓ بیننا و بینکم کی ورد مندانہ"

پکار سننے کے باوجود انہوں نے انسانِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے ساتھیوں کے پاکیزہ دینی انکار و اعمال کو چھوڑ کر ابوجہل اور ابولہب جیسے گھٹیا انسانوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اور جامد مذہبیت اور فاسد دین داری کا یہ بھی ہمیشہ تاریخی رول رہا ہے کہ وہ معرکہ کارزار میں دینی محاذ پر کسی قیمت کے عوض بھی اپنا تعاون پیش نہیں کر سکتی۔ بلکہ لازماً وہ دین کی دشمن طاقتوں کی گود میں جا گرتی ہے۔ اس کا قارورہ ہمیشہ کفر و الحاد اور فسق و فجور کے پکیروں سے ملتا ہے۔ یہاں گشتگو چند مستثنیٰ افراد پر نہیں ہو رہی جو کسی گروہ کے اندر سے بدترین دورِ فساد میں بھی برآمد ہوتے ہیں۔ ہم عمومی کلیتہً اخذ کر رہے ہیں۔

یہ تھا موقف جو یہود نے لیا! وہ اپنی کمین گاہوں سے نکلے اور علم و تقویٰ کے سارے ہتھیار

سنبھال کر تخریب پسندانہ منفیت کے مورچوں پر جا ڈٹے اور انہوں نے عمداً کفار و مشرکین کو اپنا پورا پورا تعاون پیش کر دیا۔ انہوں نے داعی حق اور تحریک اسلامی اور اس کے کارکنوں کے خلاف پھبتیاں کیسی مذاق اڑائے، نئے نئے سوالات اور اعتراضات گھڑ گھڑ کر کٹ جھتیاں کیں، الزامات لگائے، پروپیگنڈے کے طوفان اٹھائے، مخبریاں اور جاسوسیاں کیں۔ مسلمانوں کو باہم دگر لڑانے کے منصوبے اختیار کیے۔ تکفیر و تفسیق کے فتوے لگائے۔ رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی تدبیریں کیں۔ اور جنگ اور تعمیرِ ضعیف کے حالات میں سخت قسم کی غداریاں کیں۔ اپنی طرف سے ایڑی چوٹی کا زور صرف کر دیا۔ لیکن شروع سے آخر تک یہ ایک بڑے مغالطے میں رہے۔ اور منفی مزاج کی تخریبی مہموں کو اٹھانے والی طاقتیں ہمیشہ اس مغالطے میں رہتی ہیں، لیکن بعد والوں کو اس سے سبق لینے کی بھی توفیق نہیں ہوتی)۔ کہ کسی اصولی اور تعمیری تحریک کا توڑ ایسے لوگ کامیابی سے کر سکتے ہیں جو خود بے اصول ہوں، کوئی تعمیری نقشہ نہ رکھتے ہوں اور جو اخلاقی پستی کی آخری گہرائیوں میں جا گرے ہوں۔ درحقیقت ایسے لوگوں کا پارٹ بالکل اس نوعیت کا ہوتا ہے۔ جیسے پڑھتے سورج کی شعاع انگنی سے چڑ کر چمکا ڈر فضا میں اپنے پر پھیلا کر زمانے کو تاریک رکھنے کے درپے ہوں۔ جیسے شہسواروں کے کسی دستے کا راستہ روکنے کے لیے چند مچھر اور چند مکھیاں اپنی بھینٹا کا پورا زور شور دکھادیں۔ جیسے چودھویں کے چاند کو دیکھ کر کوئی گنوار اس کی طرف منہ اٹھا کر ہتوک دے۔ جن لوگوں میں خود اپنی کوئی قدر و قیمت باقی نہ رہی ہو، جن کے پاس کوئی باندہ یا پیغام موجود نہ ہو جن کا اخلاق و کردار زمانے کے لیے کوئی جاذبیت نہ رکھتا ہو، اور جن سے کسی تعمیری خدمت کی توقع انسانیت کو نہ رہی ہو، وہ محض دوسروں کا راستہ روک کر اور ان کا منہ چڑا کر اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکتے۔ جن کے پاس جنون اور فساد اور بگاڑ اور تخریب کے سوا اور کوئی متاعِ حیات باقی نہ رہی ہو۔ وہ اصلاحی و تعمیری کام کرنے والی کسی متحرک طاقت کے منہ آ کر اپنے اندر قدر و قیمت پیدا نہیں کر سکتے۔ انجام کار ایسوں کے حصے ہیں ذلت و نامداری



کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ مگر جب جذباتی رد عمل کی زد میں بہہ کر کوئی فاسد طاقت اندھی ہو جاتی ہے تو پھر وہ انجام کو نہیں سوچتی۔ بس آگے ہی آگے بڑھتی جاتی ہے یہود کی فاسد طاقت بھی احساس کمتری اور حسد کے مارے اندھی ہو کر اسلام سے الجھنے لگی۔

یہود کا کردار مسلمانوں کے کردار کے بالمقابل رکھ کر دیکھنے سے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ ہوتا ہے کہ سچائی کے کسی علمبردار کی صدا پر لبیک کہنے والوں کا اخلاق جتنا بلند ہوتا جاتا ہے اس کی مخالفت کرنے والوں کی سیرتوں میں اتنا ہی زوال پیدا ہوتا جاتا ہے، مثبت تحریک اپنے دائرہ میں انسانیت کو جتنا زیادہ سنوارتی ہے، منفی رد عمل اپنے حلقہ میں اتنا ہی زیادہ فساد اور بگاڑ سدا کرتا چلا جاتا ہے۔

اسلامی معاشرہ کے سربراہ کار کے سامنے ایک طرف بڑا وسیع اور متعدد پہلو رکھنے والا تعمیری منصوبہ تھا۔ دوسری طرف مسلسل آنے والے مہاجرین کی بحالی اور ان کو معاشی سہارا بہم پہنچانے کا پرالیم تھا۔ تیسری طرف قریش مکہ کی طرف سے ہر لحظہ حملے کا امکان تھا۔ اور اس کے لیے دفاعی استحکام کی ضرورت تھی۔ اور ان ساری مشکلوں میں اضافہ کرنے والی بڑی مشکل یہ تھی کہ مدینہ کی نوخیز ریاست اور زیر تشکیل معاشرے کے اپنے دائرے میں غداروں اور سازشیوں کی ایک بڑی بھاری تعداد فتنہ انگیزیاں کر رہی تھی۔ غور کرو کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریاں کتنی نازک اور پیچیدہ ہو گئی ہوں گی خیال میں لاؤ کہ ایک جان کتنی گونا گوں الجھنوں میں دن رات الجھی رہتی ہوگی۔ اندازہ کرو کہ چھوٹی سی اسلامی جماعت اور ابتدائی مراحل سے گزرتی ہوئی تحریک کیسے جان جو حکم میں پڑی ہوگی اور اس ساری صورت حال کو پیدا کرنے کا سہرا تاریخ میں یہود کے سر بندھا نظر آتا ہے۔ جی ہاں! ایک خدا کو ماننے والوں، ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے پروانوں، تورات کے علمبرداروں اور علم و تفقہ اور تقدس و تقویٰ کے ٹھیکیداروں کے سر۔

”ہوئے تم دست جس کے اس کا دشمن آسمان کیوں ہو“

ابتدا میں یہود کو حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام سے بڑی اچھی امیدیں تھیں۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ نئی طاقت انہی کی طرح بنو اسمعیل سے برسر اختلاف ہے، یہود جن انبیاء کے نام لیوا تھے۔ ان کو مانتی ہے۔ ان کی کتاب کا احترام کرتی ہے اور انہی کے مرکز عبادت، یعنی بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائے ہوئے ہے۔ بنا بریں ان کا اندازہ یہ تھا کہ آہستہ آہستہ ہم محمد رسول اللہ اور آپ کے رفقاء کو اپنے اندر جذب کر لے جائیں گے۔ یہود کا ذہن حق پرستانہ طرز پر نہیں سوچ رہا تھا، بلکہ یہ خالص سوداگرانہ طرز فکر تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ اُجڑے پجڑے لوگ، جو سینکڑوں کی تعداد میں یوں اکھڑے چلے آ رہے ہیں۔ ان کو ہم اپنے پاڑے کی بھیڑیں بنا سکیں گے۔ اسی امید پر انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ بغیر کسی لمبی چوڑی

رد و کرد کے معاہدات استوار کر لیے اور اس سیاسی تنظیم کو گوارا کر لیا، جو مدینہ میں قائم کی جا رہی تھی۔ ان کا اندازہ یہ تھا کہ یہ سیاسی طاقت جو اپنی کونپلیس نکال رہی ہے یہ تو بس ہماری جیب میں ہے۔ ہماری پیری اور مشیخت کی گدیاں اس کو چار جانب سے احاطہ کیے ہوئے ہیں اور ہمارے علم و تقویٰ کی ساکھ اپنا دامن اس کے اوپر پھیلانے ہوئے ہے۔ کوئی سوال نہ تھا حق و صداقت تک رسائی حاصل کرنے کا، کوئی کاوش نہ تھی فکر و کردار کو سنوارنے کی۔ کوئی اہتمام نہ تھا عاقبت بنانے کا۔ مجرد ایک گروہی مفاد کی سیاست تھی۔ جو ان کمجنوں کے سر پر سوار تھی۔ ان کے نزدیک تو گو یا مدینہ کے ماحول میں ان کے گھر کتے دروازوں پر شکار آ کر جمع ہو رہا تھا اور وہ اپنے دام و فتراک تیار کیے گھات میں بیٹھے تھے۔ ان کی نگاہ میں گو یا مچھلیاں تھیں جو غول در غول ساحل کے پاس آرہی تھیں۔ اور یہ ماہی گیر کھلی ہوئی باجھوں کے ساتھ مذہبی مکاری کی ڈوریاں اور کتدیاں پانی میں ڈال رہے تھے۔ مگر کچھ ہی مدت کے تجربے سے ان کی خوش فہمیوں کا خاتمہ ہونے لگا۔ انہیں اسلامی جماعت نے جتا دیا کہ یہ کوئی سستا شکار نہیں ہے، یہ ایسی مضبوط طاقت ہے کہ شکاری اس کے ہاتھوں خود شکار ہو کے رہ جانے والے ہیں۔ ان کی نگاہوں کے سامنے آہستہ آہستہ ایک انقلابی مزاج کی ریاست پروان چڑھنے لگی۔ اور یہ ریاست اپنے وجود میں ایک قلعے کی طرح مضبوط بنتی گئی، یہود کو چند ہی دن میں معوم ہو گیا کہ یہ ریاست جس کے بنانے میں دستوری معاہدہ کی بنا پر وہ خود بھی حصہ دار ہیں ان کے ہاتھوں میں کھڑکی نہیں بن سکتی، نہ اس میں انگلی دھنسانے کی ان کو کوئی جگہ مل سکتی ہے، انہوں نے اپنے لیے جو مقام سیدت اس میں حاصل کرنا چاہا اس کے بارے میں ان کو جلد ہی نامرادی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے مختلف اداروں اور سرگرمیوں میں انہوں نے نفوذ اور تصرف حاصل کرنے کی جو کوششیں کیں، ان میں بار بار منہ کی کھائی۔ اس ریاست کے صدر اور کارپردازوں اور اس کے اصولوں پر ایمان رکھنے والے شہریوں کو انہوں نے اپنے ہاتھ میں لینے کے جتنے بھی منصوبے اختیار کیے وہ سب ناکامی کا شکار ہو گئے۔ الٹا اولین مراحل میں یہ ہوا کہ یہود کے اپنے آدمیوں نے محسن انسانیت کی پیش کردہ صداقتوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا شروع کر دیا۔ یہ خطرناک انقلابی رونامیوں ہی کو نہیں، ان کی بعض سرکردہ ہستیوں کو بھی بہا لے گئی۔ تب ان کی آنکھیں کھلیں انہوں نے محسوس کیا کہ ان کا سارا بازار تقدس اُجڑ جانے والا ہے اور ان کے باڑے کی بھیریں یک ایک کر کے ہاتھ سے جانے والی ہیں۔ یہ سودا یہود کو بڑا اہنگا پڑا۔ ایک طرف وہ بروٹھے معاہدہ مسلم ریاست کے نظام کے پابند ہو چکے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ دفاعی مقصد کے لیے حلیفانہ معاہدات استوار کر چکے تھے، اور تیسری طرف وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ سب کچھ جس مقصد کے لیے کیا گیا تھا وہ غارت ہوا جا رہا ہے۔ چنانچہ اندر ہی اندر ان میں ایک حسدانہ ابال پیدا ہونے لگا اور وقتاً فوقتاً یہ گندامادہ ان کے اجتماعی بدن کے

ناسوروں سے بہنے لگا۔ خصوصاً تخیلِ قبلہ پر تو یہ جذباتی پیپ یہودی سوسائٹی کے مسام مسام سے رسنے لگی! اس جذبہ نے اولاً نثر انگیزی کا راستہ اختیار کیا، پھر یہ تخریبی کارروائیوں کی شکل میں ڈھلا، سستی کہ مرتبہ کمال تک پہنچ کر اس نے غداری کی صورت اختیار کر لی۔ آئیے! ہم مدنی دور میں اس جذبہ کے ردِ عمل سے پیدا ہونے والی ان مخالفانہ سرگرمیوں کا جائزہ لیں جس سے انسانیت کا سب سے بڑا اخیر خواہ اور اس کے ساتھی دوچار ہوئے۔ اور جس سے اپنا وجود سلامتی کے ساتھ بچا نکلنے کے لیے اسلامی ریاست کو سخت مشقتیں اٹھانی پڑیں۔

## کھپاؤ :

مدینہ کی نوخیز اسلامی جماعت جن بھاری ذمہ داریوں میں گھری ہوئی تھی ان کے لحاظ سے اس کے ایک ایک کارکن کا پارٹ بڑا اہم تھا۔ علی الخصوص جو لوگ صفِ اول کے کارکن تھے، ان میں سے کسی ایک کی کمی بھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کے لیے بڑا بھاری حادثہ تھی۔ ابو امامہ، اسد بن زرارہ جو بنو نجار پر نقیب مقرر کیے گئے تھے، ایسا ہی اہم مقام رکھتے تھے بالکل ابتدائی دور میں ان کو عالمِ آخرت سے بلاوا آ گیا اور ایک جلیل القدر سپاہی تحریکِ اسلامی کی صفوں میں سے کم ہو گیا۔ حضور کے لیے یہ صدمہ فی نفسہ بڑا صدمہ تھا۔ لیکن اس صدمہ کو مدینہ کی اسلام دشمن طاقت نے اپنے مفسدانہ پروپیگنڈے کے ذریعے دگنا کر دیا۔ یہود اور ان کا ساتھ دینے والے منافقین یہ کہتے پھرتے تھے کہ اچی کیا ہے، اگر یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی سچا نبی ہوتا، تو اس کا ایسا سرگرم ساتھی ایسے عالم میں کیوں مرا ہوتا۔ گویا مخالفین کے ہاں اس موت پر گھی کے چراغ جل گئے۔ وہ قلبِ حساس جو چاروں طرف سے دکھوں کے تیروں کی زد پر تھا۔ وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ کہ بئس المیت ابو امامة لیہود و منافق العرب، یقولون لوصان نبیاً لم یجت صاحبہ ولا املک لنفسی ولا لصاحبی من اللہ شیئاً<sup>۱</sup>۔ اس چھوٹے سے واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دشمنوں کے دلوں کے پھوٹے کیسے پکتے ہوئے تھے۔ بنو نجار نے آکر حضور سے درخواست کی کہ اب ہمارے لیے کوئی اور نقیب مامور فرما دیجیے۔ بنو نجار کی تسکین کے لیے آپ نے خود اپنے آپ ہی کو برناتے قرابت ان کا نقیب قرار دیا۔ ”انتما ائحوالی وانا بما فیکم، وانا نقیبکم“!

۱۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۲۷، براہوا ابو امامہ کا مرنا یہود اور منافقین عرب کے لیے۔ کہتے ہیں کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو اس کا ساتھی نہ مرنے۔ حالانکہ اللہ کی مشیت سے نہ میں خود بچ سکتا ہوں اور نہ اپنے کسی ساتھی کو بچ سکتا ہوں۔“

یہود نے جن شرائط پر دستوری معاہدہ پر دستخط ثبت کیے تھے، ان کی وجہ سے وہ اس پر قادر نہ تھے کہ تحریک اسلامی کو روز افزوں ترقی سے روک سکیں۔ ان کی ناک کے نیچے عامۃ الناس اور ان کے سربراہ کار اسلام کے جھنڈے کی طرف اپک رہے تھے اور ان کی گدیاں اور پیریاں، ان کی خانقاہیں اور دارالافتاء دم سادھے بہ دُور رس انقلاب واقع ہوتے دیکھ رہے تھے۔ یہاں تک کہ تحریک حق کی لہریں ان کے گھروں کے دروازوں سے داخل ہونے لگیں۔ اور کاروباری مذہبیت کے صبر کا پیمانہ اس حادثے کے پیش آ جانے پر لازماً چھٹک جاتا ہے کہ اس کے اپنے حلقے کے افراد — بالخصوص نمایاں اور قیمتی افراد — ٹوٹنے لگیں۔ دوسری طرف ہر انقلابی تحریک کی قوتِ نفوذ ہوتی ہی اس بلا کی ہے کہ منفی رجحان کے ساتھ جو لوگ اس کے مقابلے پر آتے ہیں، وہ خود اپنی کے گھروں سے نوجوان طاقت کو اکٹھا کر ان کے مقابلے پر آتی ہے بیٹھے باپوں سے، بہویں خسروں سے، بیٹیاں ماؤں سے، پوتے دادوں سے غلام آقاؤں سے اختلاف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بوڑھی مذہبیت جب نوجوان تحریک کے اس داخلی حملے سے دوچار ہو جاتی ہے تو وہ مغلوب الغنم ہو جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کے صبر و تحمل کا قطعی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مدینہ میں بھی تاریخ نے اپنا یہی معمول دوہرا دیا۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کس زور شور سے سچائی کا بول بالا ہو رہا تھا اور کس تیز رفتاری سے گھر گھر نئے نظام کا ڈنکا بج رہا تھا، اس تغیر احوال کو دیکھ کر یہود کے سینوں پر سانپ لوٹ لوٹ جاتے تھے خصوصاً جب قبائل کے سردار اور شہرت یافتہ یا اثر شخصیتیں اسلام کی فطری پکار پر لبیک کہتی تھیں، تو حسد اور احساسِ کمتری کی وجہ سے پورے یہودی معاشرے کے بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ مثلاً ان کے دیکھتے دیکھتے جس دن ابوقیس ابی انس نے کلمہ حق کو سینے میں جگہ دی ہوگی۔ اس دن یہودیت کے سینے میں کیا کیا آبال نہ اٹھتے ہوں گے۔ یہ ایک نامور بزرگ تھے۔ دورِ جاہلیت ہی میں طبیعت پٹا کھا گئی تھی۔ محض فطرت کی رہنمائی سے بت پرستی چھوڑ دی۔ غسل جنابت کو لازم کھرا گیا۔ عائشہ عورتوں سے پرہیز اختیار کیا۔ پہلے نصرانیت کی طرف مائل ہوئے مگر ٹھٹک گئے اپنے گھر میں مسجد بنانی جس میں ناپاکی کی حالت میں داخل ہونے سے اجتناب رکھا۔ کہتے تھے کہ میں ابراہیم علیہ السلام کے رب کی بندگی غلامی کرتا ہوں۔ یہ بزرگ ضعیف العمر تھے۔ حق بات کہنے میں بہت جرأت دکھانے والے اور جاہلیت میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اعلان کرنے والے تھے۔ اپنے دل جذبات کو شعر کا قالب دیا۔ چند اشعار کتابوں میں منقول ہیں۔ ایسے ذہین اور نیک سیرت بزرگ کا مقام خاصا نمایاں ہونا ہی چاہیے۔

کیا بعید کہ یہود کی ان سے بحثیں رہتی ہوں۔ اور انہوں نے ان بزرگ کو اپنی طرف کھینچنے کی کوششیں نہ کی ہوں۔ لیکن اس شخص کی فطرتِ صالحہ نے دین حق کا جو ذوق بیدار کر دیا تھا وہ بجز داعیِ اسلام کے کسی

سے تسکین نہ پاسکا۔ حضور مدینہ پہنچے تو قسمت کے جاگ اٹھنے کی گھڑی آگئی۔ اور یہ بزرگ حلقہ تحریک میں شامل ہو گئے۔ اور بہترین طریق سے اسلام پر عمل پیرا ہو گئے۔ اس واقعہ سے یہود میں جو ردِ عمل ہوا ہوگا۔ اس کا کچھ نہ کچھ اندازہ قوتِ تصور کے بل پر کیا جاسکتا ہے۔

لیکن یہاں تک تو خیر پھر بھی جو کچھ ہوا بیرونِ در ہوا۔ سنگین حوادث تو وہ تھے جو تحریک کے دوران خانہ گھس آنے پر رونما ہوئے۔ ان میں سے یہود کے ذہنی توازن کو بالکل تلیپٹ کر دینے والا واقعہ ان کے ایک حدیث المقدّہ عالم کا ذہنی انقلاب تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اکابر۔ چاہے وہ اہل دنیا ہوں یا اہل مذہب۔ میں قبولِ حق کی صلاحیتوں کا تناسب بہت کم ہوتا ہے لیکن ہر دائرے میں فطرتِ صالحہ رکھنے والے افراد ضرور موجود ہوتے ہیں۔ اور وہ خورشیدِ صداقت کے جلوہ آرا ہو جانے پر آنکھیں موند کر تعصب کے غاروں میں جا نہیں چھپتے، بلکہ سنہری اور روپہلی شعاعوں کے لیے دل اور دماغ کے در پیچھے کھول دیتے ہیں۔ ان صفوں سے اگرچہ کم لوگ آتے ہیں۔ مگر جو آتے ہیں وہ بڑی چیز ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کو مفاد اور مناصب کی بڑی بھاری زنجیریں اور بٹیریاں توڑ کر آنا ہوتا ہے۔ یہود کی صفوں میں ایسے ہی ایک بزرگ عبد اللہ بن سلام تھے۔ قبل اسلام ان کا نام حصین تھا۔ یہ بلند پایہ عالم و متقی تھے اور مذہبی لیڈر تھے ان کا تعلق بنی قینقاع سے تھا۔ حضور سے ملاقات کے بعد انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اور اپنے گھر والوں کو بھی دعوت دی اور متاثر کر لیا۔ چنانچہ سب تحریکِ اسلام کے حلقے میں داخل ہو گئے۔ ان کے قبولِ اسلام کی داستان سنیے جسے ان سے ان کے ایک عزیز نے روایت کیا ہے۔

”میں نے جب اللہ کا پیغام لانے والی ہستی کے بارے میں سنا، تو آپ کی صفات آپ کے

نام اور آپ کے زمانے کو پہچان لیا۔ کیونکہ ہم اس کے انتظار میں تھے۔ سو اس اطلاع پر

میں دل ہی دل میں خوشی محسوس کر رہا تھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ تا آنکہ رسولِ خدا

مدینہ آ پہنچے۔ جب آپ قبا میں بنی عمرو بن عوف کے گھرانے میں پہنچے تو ایک شخص آیا اور

اس نے آپ کی تشریف آوری کی اطلاع مجھے اس عالم میں دی کہ میں اپنے کھجور کے درخت

کی چوٹی پر چڑھا کام میں مصروف تھا۔ میری پھوپھی خالدہ بنت حارث نیچے بیٹھی تھیں میں

نے جو نبی تشریف آوری کی خبر سنی۔ تکبیر بلند کی، پھوپھی نے میری تکبیر سن کر مجھ سے کہا۔

”خدا تجھے غارت کرے۔ تجھے اگر موسیٰ بن عمران کی آمد کا مزدہ بھی ملا ہوتا تو تو اُس سے

بڑھ کر اظہارِ مسرت نہ کرتا“ میں نے کہا۔ ”پھوپھی جان! خدا کی قسم! یہ موسیٰ بن عمران کے

بھائی ہیں۔ اور ان ہی کے دین پر کار بند ہیں۔ یہ وہی پیغام لائے ہیں جو موسیٰ لائے تھے

اس پر وہ کہنے لگیں، اے میرے برادر زادے! کیا یہ وہی نبی ہے جس کے بارے میں

میں بتایا جاتا ہے۔ کہ وہ قیامت کی گھڑی کے قریب اُٹھایا جائے گا، میں نے کہا کہ ہاں  
یہی تو وہ ہے پھر میں خدا کا سند لہرانے والے کی خدمت میں پہنچا اور میں نے اسلام قبول  
کر لیا۔ پھر اپنے گھروالوں کے پاس آیا اور ان کو بھی دعوت دی سو وہ بھی حلقہ اسلامی میں  
داخل ہو گئے یہ

یہ تو مسلم عالم چونکہ یہود کی کمزوریوں کے راز داں، ان کی حاسرہ نفسیات اور ان کے ذلیل کردار کے  
رمز شناس تھے۔ اس لیے خوب سمجھتے تھے کہ میرے ذہنی انقلاب پر کیا تاثر دیا جائے گا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب  
مفاد پرستی کی بناء پر گروہ بندیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو کردار اتنا گہرا جاتا ہے کہ اچھے کو اچھا اور بُرے کو بُرا کہنے کے  
بجائے اپنے بُروں کو اچھا اور دوسروں کے اچھوں کو بُرا قرار دیا جاتا ہے۔ اپنے باڑے کی بھیڑ کالی ہو تو بھی  
سفید شمار ہوتی ہے اور باہر کی بھیڑ سفید ہو تو بھی اسے کالی کہا جاتا ہے۔ بلکہ اپنے باڑے کی سفید بھیڑ باڑ  
پھاند کر باہر ہوتے ہی کالی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہر دور میں اس قماش کے مذہب داروں کا حال یہی رہا ہے کہ  
جب تک کوئی شخصیت ان کے ساتھ رہتی ہے یا کم سے کم اس سے یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ اس کی سرگرمیاں اپنے  
کاروباری اثر انداز ہونے والی ہیں۔ تو اس کی خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھار تو پورے  
مبالغہ سے اس کی علمی و کرداری عظمت بیان کی جاتی ہے لیکن وقت کی چند گردشوں کے ساتھ جب یہی عنایت  
شخصیت کا پارٹ کسی بزرگ کی مذہبی مارکیٹ کے لیے ضرر رساں بن جاتا ہے تو معاً اسے گرامی کر دیا جاتا  
ہے اور زبان و قلم پٹی کھاتے ہیں۔ کوئی عالم تھا تو اب جاہل قرار پاتا ہے گا۔ مومن تھا تو اب فاسق و کافر  
گردانا جائے گا۔ خادمِ دین و ملت تھا تو اب وہ ضال و مضل گناہاٹے گا اور احترام کا مستحق نہ رہے گا۔ تو اب  
گالیوں کا ہدف بن جائے گا۔ عبداللہ بن سلام کے سامنے یہود کی مسخ شدہ فطرت کی یہی پستیاں تھیں۔ اور  
انہوں نے نتیجہ کر لیا کہ ان پستیوں پر سے تصنع کے پردے اٹھوا دیے جائیں۔ دل ہی دل میں ایک ڈرامے کا  
نقشہ بنا کر انہوں نے اپنے اسلام کو مخفی رکھا۔ مناسب موقع پر محسنِ انسانیت کی خدمت میں آئے اور عرض کیا  
یہود ایک باطل زدہ گروہ ہیں۔ اور ان کے فسادِ احوال کو بے نقاب کرنے کے لیے آج مجھے اپنے گھس میں پس پردہ  
بٹھا دیں اور ان کی نگاہوں سے مخفی رکھ کر ان کی رائے میرے بارے میں دریافت فرمائیں۔ اور پھر ملاحظہ فرمائیں  
کہ میرے اسلام لانے سے ناواقف ہوتے ہوئے مجھے کیا مقام دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر ان کو میرے قبولِ اسلام  
کا علم ہو گیا۔ تو پھر وہ مجھ پر بہتان باندھیں گے اور عیب جوئی کریں گے۔ حضور نے ایسا ہی کیا کہ عبداللہ بن سلام

کو گھر میں آڑ کے پیچھے بٹھا دیا۔ اور ادھر یہودی بزرگ آہنچے۔ باتیں ہوئیں۔ سوالات پوچھتے رہے اور جواب دیے جاتے رہے۔ آخر میں رسول خدا نے پوچھا۔ "حصین بن سلام تم میں سے کیسے آدمی ہیں؟" کہنے لگے کہ وہ ہمارے سردار ہیں۔ اور ہمارے ایک سردار کے فرزند ہیں۔ ہمارے ایک مرد جلیل ہیں ایک بلند پایہ عالم ہیں۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکے تو عبداللہ بن سلام اوٹ سے باہر آگئے اور ان کو مخاطب کر کے کہا: اے گروہ یہود! خدا کا خوف کرو۔ اور جو دین حضور کے ذریعے آیا ہے اسے اپنا لو۔ کیونکہ خدا کی قسم! تم خوب سمجھتے ہو، کہ آپ اللہ کے فرستادہ ہیں۔ تم حضور کے اسم گرامی اور آپ کی صفات کا تذکرہ اپنے ہاں تورات میں لکھا دیتے ہو، سو میں تو گواہی دیتا ہوں کہ حضور خدا کے فرستادہ ہیں۔ اور آپ پر ایمان لاتا ہوں اور آپ کی تصدیق کرتا ہوں اور آپ کو پہچانتا ہوں۔" یہود پر وہ اٹھا دینے والے اس ڈرامے کو دیکھ کر بہت سٹھٹائے اور کہنے لگے۔ "تم جھوٹے ہو۔ اور پھر عبداللہ بن سلام کے درپے ہو گئے۔ ابھی چند ثانیے پہلے جس شخص کو سید اور عالم اور مرد جلیل قرار دیا، گھڑی بھر میں اسی کو جھوٹا آدمی کہہ رہے تھے۔ عبداللہ نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ میں نے حضور سے کہہ نہیں دیا تھا کہ یہ ایک باطل زدہ گروہ ہے۔ یہ سرکشی، جھوٹ اور بُرائی سے آراستہ لوگ ہیں۔ اس دلچسپ طریقے سے عبداللہ بن سلام نے اپنے گھروالوں کے اسلام کا اعلان کیا۔ تصور کیجیے کہ یہود کے دل و دماغ پر کیا واردات گزرے ہوں گے۔"

ایسا ہی ایک واقعہ مشہور بزرگ و عالم مخیر بنی کا ہے جو ذرا بعد کے دور میں پیش آیا۔ یعنی یوم اُحد پر! یہود میں سے یہ صاحب بہت مالدار بھی تھے اور کھجوروں کے باغات کے مالک تھے۔ اپنے علم کی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات سے وہ آپ کو پہچان گئے تھے۔ یہاں تک کہ یوم اُحد آ گیا اور اتفاق سلسلی دن یوم سبت پڑتا تھا۔ کسی مجلس میں انہوں نے کہا کہ: "اے گروہ یہود! خدا کی قسم! تم جانتے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کرنا تم پر لازم آتا ہے۔" ان کا مدعا یہ تھا کہ — اہل شرک کے مقابلے میں مسلم جماعت کی امداد اصولاً تم پر واجب ہے، دوسرے برائے معاہدہ تم اس بات کے پابند ہو کہ پیش آمدہ تعادم میں اس حلیف طاقت کا ساتھ دو۔ اس پر جو جواب یہود نے دیا۔ وہ حیلہ باز اور نکتہ طراز مذہبی ذہن کی گھناؤنی تصویر کو پوری طرح سامنے لے آتا ہے۔ کہنے لگے کہ "آج کا دن تو یوم سبت ہے۔" اس جواب پر درشتی سے مخیر بنی نے کہا: "کوئی سبت نہیں ہے تمہارے لیے! پھر اس فریق شناس مجاہد نے ہتھیار سنبھالے اور شہر سے نکل کر میدان اُحد میں رسول اللہ سے جا ملے۔ جاتے ہوئے اپنے اہل خاندان سے یہ بات طے کرتے گئے کہ اگر

میں آج مارا جاؤں تو میرے تمام اموال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیے جائیں۔ اور وہ اللہ کی رہنمائی کے تحت جس طرح چاہیں ان میں تصرف کریں۔ چنانچہ یہ جاننا میدان میں کام آگیا۔ اور اس کے ترکہ کو رسول خدا نے اپنے قبضہ میں لے کر صرف کیا۔ کسی قدر اختلاف اس بارے میں ہے کہ مخیر لوق اسلام لا۔ تھے یا نہیں۔

تخریبِ اسلامی کی اس فاسد مذہبیت کا جو باطنی ردّ عمل تھا اس کا اندازہ اسی سلسلے کے ایک دلچسپ واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ حضرت صفیہ بنت حیّ بن اخطب یہ روداد بیان کرتی ہیں کہ میں اپنے والد اور چچا کی نگاہ میں ساری اولاد سے زیادہ چہیتی تھی اور دونوں ہمہ وقت ساتھ رکھتے تھے۔ جب رسول خدا مدینہ آئے اور قبا میں قیام فرمایا۔ تو میرے والد حیّ بن اخطب اور چچا ابو بکر بن اخطب منہ اندھیرے ملاقات کے لیے گئے، لوٹے تو غروب آفتاب کا وقت تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بہت نکلے ماندے اور پریشان خاطر ہیں۔ وہ بہت دھیمے انداز سے چلے آ رہے تھے۔ میں معمول کے مطابق مسکراتی ہوئی ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ لیکن بخدا پریشانی کے مارے دونوں میں سے کسی نے میری طرف التفات نہ کیا۔ میرے چچا ابو بکر والد سے کہہ رہے تھے۔ کیا یہ وہی (پہنچیر موعود) ہے؟ والد نے کہا: "ہاں، خدا کی قسم! چچا نے پھر پوچھا: کیا تم نے اسے پہچان لیا ہے اور یقین کر لیا ہے؟ والد نے جواب دیا: "ہاں! اس پر چچا نے دریافت کیا: "پھر اس کے لیے تمہارے دل میں کیا جذبہ ہے؟ والد نے کہا: "دشمنی ہی دشمنی۔ جب تک زندہ ہوں خدا کی قسم!"

یہ تھا یہود کا اصل ذہن! یعنی خوب سمجھتے ہیں کہ ان کے سامنے آنے والا داعی حق ہے۔ خدا کا پیغام لانے والا ہے۔ اس کا ہر بول اس کی سچائی پر گواہ ہے، اس کا پورا کردار اس کے مرتبہ کو نمایاں کر رہا ہے، اس کا چہرہ اور اس کی وجاہت اس کی نبوت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ سمجھتے ہی نہیں خلوتوں میں زبان سے قرآن تک کرتے ہیں۔ لیکن ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کرنے کی بجائے مخالفت و عداوت کا عزم باندھتے ہیں یہ فطرت یہود کے ہاں عام تھی، آفتاب نکلتا ہے تو کون نہیں جانتا کہ طوفانِ نور اہل پڑا۔ آدمی اور حیوانات تو خیر آنکھیں رکھتے ہیں۔ گھاس کی ایک پتی کو علم ہو جاتا ہے کہ وہ ہونے والا واقعہ ہو گیا جو ہر شبیہ کے خاتمے پر روز ہوا کرتا ہے۔ بلکہ حرارت اور گرمی مٹی کے بے جان ذروں اور پانی کے قطروں اور ہوا کی موجوں تک کو یہ معرفت دے دیتی ہیں کہ نور کو پیغامِ جلوہ آرا ہو چکا۔ طلوعِ آفتاب تو ایسا بڑا انقلابی واقعہ ہوتا ہے کہ اسے چمکا دیں اور اتو تک جان جاتے ہیں۔ ان کی فطرت کج کی امتیازی شان بس یہ ہوتی ہے۔ کہ روشنی ہونے پر اور دنیا کی تو آنکھیں کھلتی ہیں اور ان کی آنکھیں بند ہو جایا کرتی ہیں۔ بلکہ ان کے لیے سورج



کے ذکاوت کی علامت ہی یہ ہوتی ہے کہ ان کی آنکھیں چندھیا کے رہ جائیں۔ انسان اتنا اندھا نہیں ہو سکتا کہ اس کے سامنے خدا کے انبیاء مرتبہ اعجاز کو پہنچے ہوئے علم و کردار کے ساتھ جلوہ گر ہوں۔ اور وہ یہ نہ محسوس کر لے کہ کوئی عظمت مآب اور غیر معمولی اہمیت کی شخصیت ابھری ہے۔ آدمی دیکھتا ہے، سمجھتا ہے، جانتا ہے اور جاننے کے بعد آنکھیں بند کرتا ہے۔ پھر بھی اگر روشنی پوٹوں کے پردوں کو چیر کر اندر جا پہنچتی ہے، تو آنکھوں پر پٹیاں باندھتا ہے۔ ہاتھوں سے ان کو بھینچ لیتا ہے۔ منہ ریت میں چھپا لیتا ہے۔ کمروں کے دروازے کھڑکیاں بند کر کے کالے پردے ان پر ڈال دیتا ہے۔ کہتے ہیں سوتے کو جگایا جا سکتا ہے جاگتے کو جگانا ممکن نہیں ہوتا۔ ٹھیک اسی طرح اسجان کو علم دیا جا سکتا ہے۔ لیکن جاننے والے کو اسجان بن جانے پر جہل کے عالم سے باہر نہیں نکالا جا سکا، ٹھیک یہی حال تھا جس میں یہود کی اکثریت اور خصوصاً ان کے علماء کبار جا پڑے تھے۔ قرآن نے بھی ان کے اس فساد کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ ”يعرفونہ کما يعرفون ابناءہم“ یعنی یہ حق اور داعی حق کو اسی قطعیت کے ساتھ جانتے ہیں۔ جیسے اپنے بچوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں۔

یہودیت کے سربراہ کار محسن انسانیت کے علو مرتبہ کو دیکھ کر جلتے تھے اور جوں جوں عامۃ الناس اور ان کے اپنے ریوڑ کے افراد نئی دعوت کی طرف لپک رہے تھے، ان کے دلوں کی فضا میں کھچاؤ بڑھ رہا تھا۔

## مناظرانہ سوالات :

بگڑے ہوئے مذہب داروں کے دلوں میں جب کسی موثر دعوت اور کسی فروغ پاتی ہوئی تحریک اور کسی جلیل القدر داعی کے خلاف کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ قوام پکڑ لیتا ہے تو وہ افہام و تفہیم کے دروازے بند کر کے مناظرے کا دنگل کھول دیتے ہیں۔ مناظرے کی اسپرٹ سے جو سوالات و شکوک اٹھائے جاتے ہیں۔ ان کا منشا کبھی یہ نہیں ہوتا۔ کہ ایک بات کو سمجھتا ہے بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ سیدھی سادی بات کو سمجھ کے نہیں دینا ہے۔ یعنی مناظرے کی روح ہے ”میں نہ مانوں“ لیکن مقصد اتنا ہی نہیں ہوتا۔ وسیع تر منہما یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس کو طلب حق کی فطری راہ سے ہٹا کر شکوک و شبہات کے خارزاروں میں ڈال دیا جائے اور وہ سادہ استدلال سے دور ہو کر نظری سوالات کے چکر میں پڑ جائیں۔ وہ دعوت کی عقلی قدر و قیمت اور اس کے اخلاقی اثرات کو جانچنے کے بجائے پیچیدہ ٹیکنیکل مسائل کی بھول بھلیاں میں گھومنے رہیں۔ علمائے سود اپنے بارے میں تو سو فیصدی اطمینان رکھتے ہیں کہ ہمیں دعوت حق کبھی ختم نہیں کر سکتی، ڈرا نہیں ہوتا ہے اپنی بھٹیروں کے ہاتھ سے نکل جانے کا، ان کی حفاظت

کے لیے وہ ٹیڑھے ٹیڑھے سوالات کے جھاڑ کا باڑا بنتے ہیں۔ یہود کے علماء سوہ بھی اس کے سوا اور کیا کرتے ؟

عبداللہ بن سلام کے تحریک اسلامی میں شامل ہو جانے کے بعد یہود نے مناظرانہ بحثوں اور کاوشوں کے مورچے جمانے پر پوری پوری توجہ صرف کر دی۔ اور کج بحثیوں کے ترکش کھول کر منطقیات کے تیر تحریک اسلامی پر برسانے شروع کر دیے مگر یہ ساری جنگی کارروائی بھی کھلے مورچوں سے نہیں۔ منافقت کی ٹیٹوں سے جاری کی گئی۔ یہ بزرگانِ تفویٰ کیش حق پڑ ہی کے بڑے مرعوب کن بہروپ بھر کر تحریک اسلامی کے اجتماعات میں شریک ہوتے۔ پھر باتوں باتوں میں گریہ مسکینی کے طرز سے ہونٹ لٹکا لٹکا کر سوالات سامنے لاتے۔

ایک اجتماع میں حضور رسالت مآب کے سامنے انہوں نے یہ سوال رکھا "خلق کو جب خدا تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو آخر خود خدا تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا؟" دیکھا آپ نے ذہن کا ٹیڑھ! — یہود خود اسی خدا پر ایمان رکھنے کے دعویٰ دیتے تھے، اس کے پیغمبروں کے معتقد اور اس کی کتاب کے علمبردار تھے۔ وہ خدا کو پہلے سے جانتے تھے، اس کی صفات سے آگاہ تھے۔ لیکن اسی خدا کی طرف جب اسلام نے بلایا تو خدا کے بسے میں ان کے دلوں میں بڑا بھاری اشکال پیدا ہو گیا۔ اور ان کے سوال کا گویا ظاہری مدعا یہ تھا کہ اگر یہ اشکال رفع ہو جائے تو پھر ان کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ کھل جائے۔ لیکن سوال کا ٹیڑھ بنا رہا ہے کہ مفسود مذہب ہدایت نہیں بلکہ لوگوں کو ہدایت سے بچنے کے لیے راہ فرار دکھانا ہے۔ آنحضرت نے اس ٹیڑھے سوال کا جواب بہت ہی سیدھے طریق سے دیا۔ یعنی سنجیدگی سے سورہ اخلاص پڑھ دی۔ کہو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ اللہ ایک ہے، وہ بے ہم ہے، نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور کوئی اس کا ہمتا نہیں ہو سکتا یہ

آئیے آپ کو ایک اور دلچسپ مجلس گفتگو میں سے چلیں۔ یہود کے بعض نامور مولوی ایک دن حضور کے حلقہ میں آئے اور کہنے لگے کہ ہمارے چار سوالوں کا جواب دیجیے۔ پھر ہم آپ کی دعوت مانیں گے۔ اور آپ کی اطاعت قبول کر لیں گے۔ حضور نے فرمایا کہ اب اس عہد کی ذمہ داری تم پر ہے پوچھو جو کچھ پوچھنا ہے۔ سوالوں کے سامنے آنے سے قبل آپ ذرا خود اندازہ کیجیے کہ تحریک اسلامی کی ماہیت کو سمجھنے کے لیے معقول لوگوں کی طرف سے کس قسم کے استفسارات کی توقع کی جانی چاہیے۔ وہ پوچھتے تو ساسی صدائقوں کے بارے میں پوچھتے، اسلام کی اخلاقی قدروں کے بارے میں پوچھتے، سیاسی و معاشی نظام اور اس کے

لے حیات محمد صلی اللہ علیہ وسلم، از محمد حسین مصدق

طریق کار کے بارے میں پوچھتے مسلمان ہونے کے شرائط و لوازم کے بارے میں پوچھتے، اپنی زندگیوں سے تعلق رکھنے والے دوسرے علمی مسائل کے متعلق پوچھتے، لیکن ان چیزوں سے وہاں سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔ انہوں نے اپنے علم و فراست کا مظاہرہ کرنے کے لیے یہ سوالات یکے بعد دیگرے پیش کیے۔

۱۔ بچہ ماں کے مشابہ کیوں ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے باپ کے نطفہ سے تشکیل پاتا ہے؟

۲۔ آپ کی نیند کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟

۳۔ اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) نے کیا چیزیں اپنے اُپر حرام کر لی تھیں اور کیوں؟

ان کسوٹیوں پر تحریکِ اسلامی کی حقانیت کو جانچا جا رہا تھا!

چوتھا سوال البتہ کچھ نہ کچھ تعلق براہِ راست دعوت و تحریک سے رکھتا تھا، مگر اسپرٹ اس کی بھی ویسی

ہی تھی، پوچھا گیا کہ رُوحِ فرشتہ وحی کیا ہے؟

حضور نے سکون سے ایک ایک سوال کا جواب دیا۔ اور آخری سوال کے جواب میں فرمایا کہ تم خود

اس بارے میں جانتے ہو کہ وہ جبریل ہے اور وہی میرے پاس آتا ہے۔

سب سوالات ہو چکے۔ جوابات سامنے آ گئے۔ ان جوابوں میں سے کسی کی تردید نہیں کی گئی۔ بلکہ

ہر ایک پر کہا گیا۔ "انھم، نعم"؛ یعنی ٹھیک، اے ہمارے اللہ!

آپ توفیق کریں گے کہ ان جوابات کے بعد انہوں نے دلوں کے دروازے اسلام کے لیے کھول

دیے ہوں گے۔ بہرگز نہیں! آخری بات پر وہ کہنے لگے: "لیکن اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) جبریل تو

ہمارا دشمن ہے، وہ ایک فرشتہ ہے کہ جب آتا ہے تو مصیبت اور خون خرابے کا پیغام لے کے آتا ہے"۔ مراد

یہ تھی، کہ وہ جب خدا کی طرف سے دین کی علمبرداری کا مطالبہ لاتا ہے تو ایک کشمکش ناگزیر ہو جاتی ہے، طرح

طرح کے نقصانات سر پڑتے ہیں۔ اور بڑے چر کے کھانے پڑتے ہیں۔ بلکہ نوبت جہاد تک پہنچتی ہے۔ اس

سے ہماری نہیں بنتی۔ بس اس فرشتے کی دشمنی اڑے نہ آئی ہوتی تو پھر ہم آپ کا ضرور ساتھ دیتے اور آپ

کے نقش قدم پر چلتے۔ یعنی دعوتِ ٹھیک، پیغامِ برحق، تحریکِ درست، مگر اس کے پس منظر میں جس فرشتے

کو خدا نے لاڈالا ہے اس سے ہماری سلامت ختم ہو چکی ہے۔ لہذا جہاں وہ ہوگا وہاں ہم نہیں

آ سکتے!

اس کا جواب محسنِ انسانیت نے قرآن کے الفاظ میں ایسا دیا کہ بس سننے والوں کو ہمیشہ یاد رہا ہوگا۔

فرمایا: "کہو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کہ جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو وہ کان کھول کر سن لے کہ قرآن کو

اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل پر اپنے فرمان کے تحت اتارا ہے جو اپنے سے پہلے کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ اور ایمان لانے والوں کے لیے رعداوت اور مصیبت اور خون خرابے کا پیغام نہیں بلکہ ذریعہ ہدایت و بشارت ہے۔

ایک اور بحث پیدا ہو گئی۔ سرورِ عالم نے کسی موقع پر حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر سلسلہ انبیاء میں فرمایا۔ اس پر یہودی حلقوں میں بڑا چرچا ہوا۔ سب طرف کہا جانے لگا کہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی انوکھی بات سنی ہے کہتے ہیں کہ سلیمان بن داؤد بھی پیغمبر تھے! خدا کی قسم، وہ تو محض ایک جادوگر (نعوذ باللہ) تھے۔ چنانچہ قرآن نے اس داہیات چرچے کی تردید کی کہ جادوگری تو ایک کافرانہ حرکت ہے اور حضرت سلیمان نے کبھی یہ حرکت نہیں کی۔ چاہے بابل کے جو قہقہے مشہور ہیں وہ تو شیطان کے کرشمے تھے۔

### طوفانِ اُمّ پرطہ :

تحریکِ اسلامی کے ددِ ادائل میں یہودیت سے ایسے پہلو دیکھ رہے تھے جن کی بنا پر ان کو یہ آس لگی رہی کہ آہستہ آہستہ یہ تاریخی طاقت ہمارے ہاتھ میں آجائے گی۔ قرآن میں نبی اسرائیل کی جہانی فنیت کا ذکر تھا۔ اِنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ — ان کے انبیاء کی نبوت کی تصدیق تھی، ان کی کتاب مقدس کی حقانیت کی گواہی تھی۔ ان کے سامنے نَعٰلُوْا اِلَیْ کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنِنَا وَبَیْنِکُمْ کِی سہرٹ سے دین کی مرکزی حقیقت کو اجاگر کیا جا رہا تھا۔

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے طور طریقوں کے مقابلے میں یہود کے بعض طریقوں کو پسند فرماتے، مثلاً مشرکین بالوں میں مانگ نکالتے تھے اور یہود نہیں نکالتے تھے۔ سو آپ نے اس معاملے میں مشرکین کی مخالفت کی اور یہود کی موافقت! جن معاملات میں قرآن میں کوئی حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد نہیں ہوتا تھا ان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب کی موافقت کرتے تھے۔ مدینہ کے یہودی عاشوراکے دن کاروزہ رکھتے تھے، آپ نے بھی اس دن روزہ رکھا، اور مسلمانوں کے لیے عاشوراکاروزہ رکھنا پسند فرمایا۔ کسی یہودی کا جنازہ گزرتا تو آپ کھڑے ہو جاتے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمانوں کے لیے قبلہ نماز بیت المقدس تھا۔ یہ ایک کھلی ہوئی علامت تھی کہ تحریکِ اسلامی مشرکین کے مقابلے میں اہل کتاب سے زیادہ اقرب تھی۔

۱۔ سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۶۸ - ۱۶۷

۲۔ ایضاً " " ۱۶۸-۹

۳۔ بخاری۔ کتاب اللباس۔

امرواقعہ درحقیقت یہ تھا کہ یہودیت کا قالب تو اس مذہب کے مفاد پرست مولویوں اور پیروں نے پوری طرح مسخ کر ڈالا تھا۔ اور یہ قالب بے جان بھی ہو چکا تھا۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام جس دین کو لائے تھے وہ وہی اسلام تھا جسے سارے ہی انبیاء نے شرائع کے تھوڑے بہت تفاوت کے ساتھ پیش کیا تھا اور اب اسی کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے سامنے رکھ رہے تھے بلکہ ایک نظام کی صورت میں برپا کر رہے تھے۔ یہی رشتہ تھا جس کی بنا پر حضور کو بھی اُمیدیں تھیں کہ یہود اسلامی جدوجہد کو جوں جوں سمجھیں گے اس کا خیر مقدم کریں گے۔ اور اس کام کو اپنا کام سمجھیں گے۔ انہیں خوشی ہوگی کہ خدا کے نام کا جھنڈا بلند ہو رہا ہے اور انبیاء کے دیے ہوئے اصول اخلاق نظام زندگی کی بنیاد بن رہے ہیں۔ اور شریعت تورات کی اصل قدروں کے بچھے ہوئے دیے از سر نو روشن کیے جا رہے ہیں۔ انہی امیدوں کی فضا میں قرآن نے اپنی دعوت یوں پیش کی تھی کہ اصل سوال گروہ بندیوں کا نہیں اصول و عمل کا ہے۔ یہودیوں میں سے، عیسائیوں میں سے، صابوں میں سے، اور خود اسلام کے نام یواڑوں میں سے جو کوئی فی الحقیقت خدا اور اس کے قانون اور اس کے انبیاء کی دعوت اور محاسبہ روز جزا پر ایمان لائے اور پھر اپنی زندگی کو عمل صالح بنا کے دکھاوے تو بس یہ چیز ہے جو مطلوب ہے۔ اصل چیز نام نہیں، کام ہے، مطلوب پچھے نہیں، کھرا مال ہے، مقصود نسبتیں نہیں، سیرتیں ہیں۔ مسئلہ کسی دھڑے اور جھٹھے کے مفاد کا نہیں، انسانیت کی مشترک خیر و فلاح کا ہے۔ لیکن نہ یہودیوں کی طرف سے تحریک اسلامی کی امیدیں پوری ہوئیں، نہ تحریک اسلامی کی طرف سے یہودیوں کی مرادیں برآئیں۔

اور یہ ایک تحریک اسلامی ایک انقلابی موڑ مڑ گئی۔ یہ موڑ تھا تجویل قبلہ کا واقعہ! تحریک اسلامی کی بنیادی فطرت ہر دور میں یہ رہی ہے کہ وہ اپنے امتیازی وجود کو نمایاں رکھنا چاہتی ہے اور اپنے افراد کے اندر اصولی و اعتقادی خودی کو زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ مکہ میں اسی تقاضے کے تحت بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا تھا تاکہ نظریہ اسلامی کی علمبردار جماعت کو اپنی جداگانہ حیثیت کا احساس ہو۔ چنانچہ ہجرت تک کے لمبے دور میں مسلمانوں نے مشرکین کے مقابلے میں اپنی مختلف حیثیت کا پوری طرح احساس کر لیا۔ اور خود مشرکین کو بھی احساس ہو گیا کہ وہ اور مسلمان دو الگ الگ سمتوں میں حرکت کرنے والی طاقتیں ہیں۔ اسی شعور و احساس کی تکمیل تھی جس کا اظہار ”لکم دینکم و لی دین“ کے مختصر سے قرآنی بول میں کر دیا گیا۔ بات پوری طرح منتظر گئی کہ تمہاری راہ الگ، ہمارا راستہ جدا۔ ہم میں تم میں کوئی جوڑ میل نہیں۔

اب مدینہ میں آ کر جو کچھ بھی اندیشہ التباس تھا وہ اہل کتاب سے تھا۔ اور اب اس امر کی ضرورت تھی کہ تحریک اسلامی کو اہل کتاب کی بے روح مذہبیت سے ممیز رکھا جائے۔ اور مسلم معاشرے کو یہودی معاشرے میں ذہنی طور پر تحلیل ہونے سے بچایا جائے۔ اب دور مکہ کی وہ ضرورت ختم ہو چکی تھی جس کے

تحت بیت المقدس کو عارضی طور پر قبلہ بنا لیا گیا تھا۔ مسلمانوں کا ذہنی رابطہ قبلہ ابراہیمی ہی سے اقرب تھا اور خود حضور اسی خانوادہ کے چشم و چراغ تھے اور تحریک کے اولین جان باز بھی بنوا اسمعیل سے تعلق رکھتے تھے۔ امتیاز کا وہ عارضی اہتمام اب غیر ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضور کا قلب حقیقت شناس پہلے سے اس تبدیلی کا منتظر رہا۔ اور اس کا ذکر خود قرآن میں ہے کہ **فَإِذَا سَرَّاهَا وَقَلَّبَ لَهَا الْوَجْهَ فِي السَّمَاءِ** تحویل قبلہ کا فرمان صادر کر کے درحقیقت سلطنتِ زندگی کے فرمانروائے حقیقی نے جہانی امت کے منصب سے بنی اسرائیل کو معزول کر دیا۔ اور ان کی جگہ ملتِ اسلام کو مامور فرمایا۔ عالمی دعوتِ خیر و فلاح کا جو مرکز پہلے بیت المقدس میں چلا آ رہا تھا۔ وہ اب حرمِ کعبہ کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو امتِ وسط یعنی عالمی دعوت کا مرکزی گروہ قرار دیا گیا۔ جس پر شہادتِ علی الناس کی ذمہ داری ڈالی گئی اور تمام بنی نوع انسان کی رہنمائی کا فریضہ عاید کیا گیا۔

سولہ ہجرت تک مدینہ میں بیت المقدس کے رُخ نماز ادا کی جاتی رہی۔ رجب یا شعبان ۱۱ھ کا واقعہ ہے کہ ابنِ سعد کی روایت کے بموجب سرورِ عالم بشر بن برّان معرور کے ہاں دعوت پر گئے تھے، وہاں ظہر کا وقت آ گیا اور آپ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے۔ دو رکعتیں پڑھا چکے تھے۔ کہ تیسری رکعت میں یکایک وحی کے فدیعے یہ آیت نازل ہوئی کہ **فَلَنَوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضَاهَا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ** **صَحَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهُ** لہٰذا کہا گیا کہ لو ہم تمہیں اسی قبلے کی طرف پھیر دیتے ہیں۔ جسے تم پسند کرتے ہو۔ سوراب، مسجدِ حرام کی طرف رُخ پھیر دو۔ اب جہاں کہیں بھی تم ہو اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔

اس حکم کے سنتے ہی خدا کا سب سے زیادہ اطاعت شعار بندہ حالتِ نماز ہی میں رُخ بدل بیٹا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا اتباع کرنے والے تمام نمازی نئے قبلہ کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ بیت المقدس مدینے سے سیدھا شمال میں ہے اور مکہ جنوب میں۔ حالتِ نماز میں قبلہ کی تبدیلی کے معنی یہ ہوتے کہ امام کو مقتدیوں کے سامنے سے سیدھا پیچھے کی طرف آنا پڑا ہوگا۔ اور نمازیوں کو صف کو بالکل اٹے قدموں گھومنا پڑا ہوگا۔ اس کے بعد مدینہ اور آس پاس کی بستیوں میں عام منادی کرادی گئی۔ براہ بن عازب کا بیان ہے کہ ایک جگہ منادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رکوع میں تھے اور وہ اعدان سنتے ہی حالتیں کبے کی طرف مڑ گئے۔ انس بن مالک کی روایت ہے کہ بنی سلمہ کے ہاں یہ اطلاع دوسرے روز نمازِ صبح کے دوران میں پہنچی لوگ ایک رکعت پڑھ کر دوسری میں تھے کہ منادی کی پکار سنی اور اُسے سنتے ہی پوری جماعت نے اپنا رُخ بدل لیا یہ

اس تبدیلی پر جو ہنگامہ بپا ہونے والا تھا اس کے بارے میں پہلے سے قرآن نے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا۔ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّيْتَهُمْ عَنِ قِبَلَتِهِمْ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا یعنی نادان اور حقیقت نا آشنا لوگ قبیل و قال کا طوفان اٹھادیں گے کہ ان لوگوں نے کس سبب سے قبلہ بدل ڈالا ہے طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہوں گی۔ عجیب و غریب ذہنی ردِ عمل رونما ہوں گے، اور تعلقات و روابط پر بڑا اثر پڑے گا، مسلمانوں کو پروپیگنڈے کے آنے والے طوفان میں مضبوط موقف لے کر کھڑے رہنے کے لیے قرآن نے تحویلِ قبلہ کی معنویت کو پیشگی ان کے ذہن نشین کر دیا۔ انہیں بتایا کہ پہلے بیت المقدس کو قبلہ بنانے سے غرض یہ تھی کہ عربیت کے بت کو توڑا جائے۔ کیونکہ عرب اپنے قومی دائرہ سے باہر کی کسی چیز کی قدر ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اب بیت المقدس سے کعبہ کی طرف رخ گھما دینے کا مدعا یہ ہے کہ اسرائیلیت کا بت بھی ٹوٹ جائے۔ ایک کام پہلے ہو چکا تھا دوسرا اب کر دیا گیا۔ عربیت کے پرستار پہلے چھٹ چکے تھے اور اسرائیلیت کے پرستار اب چھٹ جائیں گے۔ اس طرح نفاق کے گھن سے نیا اسلامی معاشرہ پاک ہو سکے گا۔ اب اس حلقہ میں وہی لوگ رہیں گے جن کی نگاہ میں اصل احترام اللہ کے فرمان اور اس کے رسول کی سنت کا ہے۔ یہ موڑ جس سے تحریکِ اسلامی گزر رہی ہے، رسول کا دامن پورے اعتماد کے ساتھ تقام کر چلنے والوں کو ان تمام ایلے اصول افراد کو افراد۔ سے چھانٹ کر الگ کرے گا جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہوں کہ مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں اور اصل مرکزِ اطاعت وہ ہے، نیز جو اس نکتہ کے راہروا ہیں کہ نیکی مشرق یا مغرب کی طرف رخ کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ ان ظاہری اشکالِ شریعت کے اندر کام کرنے والی جس روح کا نام نیکی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ پر، یومِ آخرت پر، فرشتوں پر، خدا کی کتابوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنا ہے۔ سو تمہیں قبلہ کے ظاہری شعار کو قائم کرنے میں جس چیز کا اہتمام کرنا چاہیے وہ ہے "استنبقوا الخیوات" یعنی نیکیوں کی طرف لپکو اور بھلائیوں کی طرف رخ کرو۔ تمہیں چاہیے کہ تم خدا کے بڑے سے بڑے تغیر آفرین اور انقلاب انگیز حکم کی تعمیل کرنے میں کسی مخالف طاقت سے نہ ڈرو۔ صرف اسی ایک سے ڈرو۔ اس کا مطالبہ ہے کہ "فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي"۔

قرآن نے حاکم کائنات کا فرمان سناتے ہی کہہ دیا ہوگا کہ یہ واقعہ بجز اہل ایمان و یقین کے اور ہر کسی پر شاق گزرے گا۔ اس پر جب ہنگامہ کھڑا ہوگا۔ تو گھبراہٹ چھا جائے گی اور گلی گلی وہ کج بختیاں شروع ہوں گی کہ کمزور لوگوں کے سر چکرا جائیں گے اور جذبات میں ہل چل مچے گی۔ اب سنیے کہ قبیل و قال کیا کچھ ہوئی۔ مشرکین نے کہا کہ لیجیے اب ہوش کچھ تو ٹھکانے آئی۔ سارا قبلہ اختیار کر لیا ہے تو آہستہ آہستہ یہ

لوگ ہمارے مذہب کی طرف بھی از خود لوٹ آئیں گے۔

یہود نے کہا کہ داعی اسلام نے ہماری مخالفت کے جوش میں قبلہ انبیاء کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ اگر یہ نبی ہوتا۔ تو کبھی بھی اس قبلہ کو نہ چھوڑتا۔

نفاق کے مریض کہتے تھے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا صبح قبلہ کدھر کو ہے۔ اگر پہلا قبلہ برحق تھا تو اب وہ چھوڑ دیا۔ اور اگر اب دوسرا قبلہ درست ہے تو پہلے جو کچھ تھا وہ نلٹ تھا۔ قبلہ کیا ہو اکیل ہو گیا۔ جدھر جی چاہا ادھر رخ کر لیا۔ تو یہ سارا مذہب ہی بس مرضی کا کھیل ہے۔

اور جو لوگ ایمان و یقین کی روح سے مالا مال تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے حکم سنا اور اس کی اطاعت قبول کی اور ہم اس پر ایمان لائے۔ یہ سب کچھ ہمارے پردردگار کی جانب سے ہے۔

یہی اہل ایمان بچارے پردہ پیگنڈہ کی آندھی میں گھر گئے اور چاروں طرف سے سوالات، بحثوں اور طنز و تضحیک کے تیروں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ مجلس مجلس معرکہ آرا گفتگو میں تھیں، گلی گلی ہاڈ ہو چی۔ ہی تھی۔ لمحہ لمحہ جذباتی بیجان پیدا ہوتے تھے۔ انقلابی تحریکوں میں ہر بڑی تبدیلی اور ہر بڑے موڑ پر اور لوگوں کے خیالات کے بتوں کو توڑنے والے ہر اقدام پر اس طرح کے طوفانی ہنگامے پیش آجاتے ہیں اور ایسے حالات میں ان کے کارکن گھبراہٹ اور پریشانی میں مبتلا ہو کر بسا اوقات اشتعال کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔ اس اندیشے کے پیش نظر نصیحت کر دی گئی کہ ان گردابوں کو پار کرنے کے لیے صبر و صلوات کے مضبوط سیپنے ہی کارآمد ہو سکتے ہیں۔ مخالفانہ پروپیگنڈے والوں کے بارے میں بتایا گیا کہ ان کا مقصود تماشہ حق ہرگز نہیں ہے۔ اور یہ دلائل سے مطمئن ہونے پر بالکل تیار نہیں ہیں۔ ان کے سوالات کا مدعا محض پریشانی کرنا ہے۔ یہ اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم اپنا اصول اور نظام چھوڑ کر ان کی مریدی نہ اختیار کر لو۔

یہودہ نکتہ طرازیوں کے جواب میں اتمام حجت کے طور پر تحریک اسلامی کی طرف سے سنجیدہ اور متین انداز سے زوردار استدلال کیا گیا اور عوام الناس کے سامنے کعبہ کی عظمت کو سورہ آل عمران کے ایک خطاب میں واضح کر دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

”بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ دی ہے جبکہ میں واقع ہے اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکز ہدایت



بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ ابراہیمؑ کا مقام عبادت ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مومن ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھرتک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔

(ال عمران ۹۶-۹۷)

بیت المقدس کے متعلق یہ حقیقت خود بائبل سے ثابت تھی کہ اسے حضرت موسیٰ کے سارٹھے چار صدیاں بعد حضرت سلیمان نے تعمیر کرایا تھا۔ اور دوسری سیماں ہی میں اسے خدا پرستوں کا قبلہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس تاریخی اور مذہبی دونوں طرح کی متفقہ اور متواتر روایات سے یہ ثابت تھا کہ کعبہ کو حضرت ابراہیمؑ نے استوار کیا تھا۔ اور حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰ سے آٹھ نو صدیاں قبل ہو گزرے تھے۔ کعبہ کی زمانی اولیت کے ساتھ ساتھ یہ بتایا گیا کہ اس کے پر تقدس ماحول میں بڑی اہم نشانیاں ہیں، اس میں دین کی بیش قیمت روایات جگمگا رہی ہیں۔ نیکی کی علمبرداری کی ایک تاریخ اس کے سنگ و خشت پر مرقوم ہے۔ پھر اس میں ابراہیم علیہ السلام کی جائے عبادت واقع ہے جس کے سرچشمہ سے آج بھی ذوق توحید سیراب ہو سکتا ہے۔ پھر اس مرکز عبادت کا مقبول بارگاہِ حق ہونا اس آیتِ بئینہ سے آشکارا ہے کہ لوق و ودق صحرا میں تعمیر ہونے والی اس عمارت کے آس پاس ایک انسانی دنیا آباد ہو گئی ہے اور اس کی طرف لمبے لمبے فاصلے طے کر کے لوگ کھچے چلے آتے ہیں۔ پھر اس کے علوم مرتبہ کی روشن دلیل یہ ہے کہ بے آب و گیاہ وادی کے آباد کاروں کے پاس ہر طرح کا رزق از خود پہنچ رہا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عرب کے جنگ جو بدوی معاشرے کے طوفانی سمندر میں یہ گھر چار ہزار برس سے ایک جزیرہ امن بنا کھڑا ہے جو کوئی اس کے دائرہ حرمت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے جان، مال اور آبرو کو تحفظ مل جاتا ہے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اس کے سائے میں آکر تلواریں نیام میں کر لیتے ہیں اور جذبات کی باگیں تھام لیتے ہیں۔ قاتل اور ڈاکو اس کی فنا میں سانس لیتے ہی امن پسند شہریوں میں بدل جاتے ہیں۔ سو اس گھر کا حق تھا کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کا علم بلند کرنے والی تحریک کا روحانی مرکز قرار پائے۔ اس میں دین یا عقل کے خلاف آخر کوئی بات واقع ہوئی ہے کہ اس پر گلی گلی چھ میگوٹیاں کی جا رہی ہیں۔

اس استدلال کا اگر کوئی نتیجہ خیر تھا تو وہ صرف عوام کے لیے تھا، رہے یہود، سوانہوں نے تو تحویلِ قبلہ کے واقعہ کو مسلمانوں کی طرف سے ایک فیصلہ کن مخالفت اقدام قرار دیا جس کی وجہ سے ان کی وہ تمام امیدیں ختم ہو گئیں جو وہ مسلمانوں کے بارے میں دلوں کے اندر باندھے بیٹھے تھے۔ انہیں معلوم

ہو گیا کہ یہ طاقت سستا شکار نہیں ہے۔ دوسری طرف مسلمانوں پر بھی یہود کی نفسیات کے وہ تمام تاریک گوشے آشکارا ہو گئے جن کے ہوتے ہوئے وہ حُسنِ ظن برقرار نہ رہ سکتا تھا جس کے ساتھ، تعلقات کا آغاز کیا گیا تھا۔ ان کو اندازہ ہو گیا کہ مدینہ میں بھی تحریک کو بس اپنے بل بوتے پر چلنا ہو گا اور مذہب و تقویٰ کے کاروباری اجارہ داروں سے کسی تعاون و حمایت کی امیدیں باندھنا فضول ہے بلکہ الٹا یہ خطرہ آہستہ آہستہ محسوس ہونے لگا۔ کہ یہود کفار و مشرکین مکہ سے زیادہ گھناؤنے جذبات کے ساتھ تحریکِ حق کی راہ میں زد و کوب کریں گے۔ اس کے باوجود حضورؐ اور آپ کے رفقاءؓ تحریک کا طرزِ عمل داعیانہ اخلاق پر استوار رہا۔ اور جیسے کونسیا کے اصول پر یہود اور دوسرے مخالفین سے کوئی معاملہ نہیں کیا گیا۔ کج بحثیوں اور طنز و تضحیک اور چھپچھور پن پر مسلمان طرح دے جاتے بات کرنی پڑتی تو مذہب اور معقول طریق سے استدلال کرنے پر اکتفا کرتے اور زیادتیوں پر عالی ظرفی سے صبر کرتے۔

بہر حال اب دلوں میں پھرا ہوا طوفان بند توڑ کر اُٹھ پڑا۔

## بد تمیزیاں اور یہود گیاں :

جو لوگ خود کوئی تعمیری نصب العین نہیں رکھتے وہ کسی تعمیری کام کو محض اس لیے نہیں ہونے دینا چاہتے کہ اس وجہ سے ان کا کھوکھلا پن دنیا بھر کے سامنے بے نقاب ہونے لگتا ہے۔ یہی صورت یہود کی تھی وہ برسوں سے مدینہ کے ماحول پر چھائے ہوئے تھے۔ لیکن کبھی وہ اس قابل نہ ہوئے کہ پستیوں میں گری ہوئی انسانیت کو بلند کر دے اور پلاسکیں۔ لوگوں کے ذہنوں کا تزکیہ کر سکیں اور ان کے اخلاق سنوار سکیں۔ اور ان کو نظم اور تہذیب سکھا سکیں، ان کو امن و سلامتی کا کوئی نظام دے سکیں۔ وہ گری ہوئی انسانیت کو تو کیا سہارا دیتے خود اپنے آپ کو سنبھالنے کے قابل نہ تھے۔ دنیا کا ہر روگ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اور وہ اپنے کسی روگ کا درماں کرنے کی سوجھ بوجھ نہ رکھتے تھے۔ اب جب ان کی آنکھوں کے سامنے ایک نئی طاقت اُبھری اور اس نے لوگوں کے دل و دماغ میں زندگی بخش اصول و اعتقاد کے چراغ جلانے شروع کیے، ان کے کردار کے کھنڈروں کو صاف کر کے تعمیر نو کا آغاز کیا، ایک مقدس نصب العین کے سانچے میں ڈھال کر افراد تیار کرنے اور ان افراد کے بل پر ایک نظامِ امن و عدل کی تاسیس کرنے کی مہم شروع کر دی تو یہود بھٹا اٹھے اور اس تعمیری تحریک کو ناکام کرنے کی ہر گھٹیا سے گھٹیا تدبیر اختیار کی۔ اس طرح کی منفی اور تخریبی طاقتیں جب کسی کی مخالفت پر کمر باندھتی ہیں تو شرافت اور معقولیت اور تہذیب کو اٹھا کے بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔ نہایت کینگی کے ساتھ بد تمیزیاں کرنا ان کی شانِ تقدس کو گوارا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بد تمیزیوں کا محاذ بھی کھول

دیا گیا۔

ان جانشینانِ انبیاء اور علمبردارانِ کتابِ الہی اور مسند نشینانِ درس و افتاء نے بغض و عناد کے میخانے سے جام کے جام چڑھا کر جن کرتوتوں کا مظاہرہ کیا ان میں سے دو تین مثالیں یاد گار رہیں گی۔ مذہب و تقویٰ کے یہ اجارہ دار جب حضورِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتے تو السلامِ عیدک کہنے کے بجائے زبان کو ذرا گھما کر السلام سے حرفِ لام کو غائب کر دیتے۔ یعنی السلامِ عیدک "کہا کرتے۔ اس کلمہ کے معنی یہ تھے کہ اے مخاطب! تجھ پر موت وارد ہو۔ یہ سلوک کیا جا رہا تھا اس جلیل القدر ہستی سے جو ابراہیم اور موسیٰ اور یعقوب اور یوسف اور اسحاق اور اسمعیل علیہم السلام ہی کے پیش کردہ پیغام کی تجدید کے لیے سرگرم عمل تھی، جو تورات کی اصل روح کی تجدید کرنے میں منہمک تھی، جو شریعتِ الہی اور قانونِ آسمانی ہی کے احیاء کے لیے مجاہد تھی بلکہ کتنا چاہیے کہ جو دراصل یہود کے فراموش کردہ فریضہ کو ادا کر رہی تھی۔ اور انہی کا چھوڑا ہوا کام کر رہی تھی۔ ایک مرتبہ یہ تقدس آبادانِ مدینہ پیغمبرِ حق کے گھر پر آئے تو غنڈوں اور کمینوں کا سایہ ہی لغت استعمال کیا۔ اس بدتمیزی پر حضرت عائشہؓ نے پردے کے پیچھے سے سخت ردِ عمل دکھایا، وہ غصے میں جواب دیے بغیر نہ سکیں۔ اور کہہ اٹھیں، کہ کبختو! تم پر موت وارد ہو۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں یہ آواز پڑ گئی۔ آپ نے ام المومنین کو سمجھایا: عائشہ! نرمی سے کام لو! حضرت عائشہؓ نے عرض کیا۔ "کچھ آپ نے سنا بھی کہ انہوں نے کیا کہا تھا؟" فرمایا "سنا تو تھا۔ لیکن میں نے بھی "وعیدک" کہہ دیا، یہ ہی کافی ہے!"

بدتمیزی کی دوسری مشہور شرمناک مثالیں جن کا ریکارڈ قرآن نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا،

ملاحظہ ہوں :

ایک یہ کہ بزمِ رسالت میں یہ اجارہ دارانِ تقوٰے ررنق افروز ہوتے اور دورانِ گفتگو میں جہاں کہیں یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ ذرا ٹھہریٹے ہمیں بات سمجھنے کا موقع دیجئے۔ تو اس موقع پر ایک ذومعنی لفظ استعمال کرتے تھے۔ دَاعِنَا۔ اس لفظ کا ظاہری مطلب تو وہی تھا کہ ہماری کچھ رعایت فرمائیے۔ ہماری بات سن لیجیے، ہماری جانب توجہ رکھیے۔ مگر دوسری طرف عبرانی زبان میں اس سے ملتا جلتا لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا تھا کہ "سُن تو بہرا ہو جائے" علاوہ بریں عربی زبان میں بھی قریبی مادوں سے اس کے ہم صورت الفاظ ایسے موجود تھے۔ جن سے معافی سونکتے تھے۔ مثلاً دَعَنْتَ۔ دَعَا سے ایک لفظ تھا "السرعاع" جس کے معنی تھے "سفلۃ الناس"۔ اس کو دَعَا عِنَا کی شکل دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ اسی طرح دَعَنْ۔ دَرَعَنْ و دَرَعِنْ میں جاہل اور بے عقل ہونے کے معنی پائے جاتے ہیں۔ ذرا سا زبان کو اور لچکا کر

اسے ”دَاعِيْنَا“ بھی بنایا جاسکتا تھا۔ اور اس صورت میں معنی ہوتے: ”اے ہمارے چرواہے، اے ہمارے گڈریے“ ایہ مختلف صورتیں تھیں جنہیں عظمائے یوڈیاں ہم جتہ دستار مسمی صورت بنا بنا کر اختیار کرتے تھے عوام بچارے بھلا لغت و ادب کے اتنے ماہر کہاں ہو سکتے تھے، یہ علمائے گرامی قدر تھے جو گھروں سے خوب تیاری کر کے آتے کہ آج کیا بد تمیزیوں کی جانی چاہئیں، ان ہستیوں میں سے کم سے کم ایک، یعنی رفاع بن زید بن تابوت کے متعلق تو تاریخ میں واضح روایت محفوظ ہے کہ اخلاق و شرافت کی اس شاندار مثال کے قائم کرنے میں اس یہودی مولوی نے بھی حصہ لیا تھا۔ یعنی ظاہراً دیکھیے تو بڑی شائستگی تھی لیکن دلوں کی گہرائیوں میں اُتریے تو اندر غنڈوں کی سی نفسیات کام کر رہی تھیں۔ آپس میں جانتے تھے کہ ہم وقت کی ممتاز شخصیت کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ٹوک دینا تو ارشاد فرماتے کہ واہ ہمیں تم نے بد تمیز سمجھا ہے ہم تو ادب و احترام کے ساتھ عرض کر رہے ہیں کہ ذرا ہمیں سمجھنے سمجھانے کا موقع دیجئے۔

دوسری یہ کہ دورانِ گفتگو میں محسنِ انسانیت کو اکثر یہ جانشینانِ انبیاء و رسل یوں خطاب کرتے: ”اِسْمَعْ غَيْرَ مَسْمُوعٍ“ اس کا ظاہری مطلب یہ تھا کہ ذرا سیٹھے۔ آپ کا احترام اس میں مانع ہے کہ آپ کو کوئی بات آپ کی مرضی یا اجازت کے بغیر سنانی جاسکے۔ لیکن ان کی شریکِ ذہنیت اس سے ایک اور مفہوم مراد لیتی۔ یہ کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تم کو کوئی بات سنانی سمجھائی جائے اور یہ کہ خدا کرے تم بہرے ہو جاؤ، سننے کے قابل ہی نہ رہو۔

یہ گندازہن و کردار تھا جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے کے لیے اُٹھا تھا۔

تیسری یہ کہ اہل ایمان حضور کی مجلس میں بیٹھ کر جب کوئی ارشاد سنتے اور سمجھ لیتے تو بدایت الہی کے تحت جذبہ صادق سے پکار اُٹھتے ”سمعنا و اطعنا“ ہم نے ارشاد کو سن لیا۔ اور ہم نے اس کی اطاعت اختیار کر لی۔ لیکن حاملینِ تورات ایسے موقع پر بڑی ڈرامائی حرکت کرتے پہلے زور سے پکارتے ”سمعنا“۔ ”جی ہاں! ہم نے سن لیا ہے“ پھر ذرا دھیمی آواز سے زبان کو لچکا کر اطعنا کے بجائے ”عَصَيْنَا“۔ ہم نے تمہاری بات کو رد کیا۔ نافرمانی کا غزم کر لیا ہے یہاں بھی وہی مشکل کہ کوئی گرفت کرتا تو تیوری چڑھا کر کہتے کہ تم نے ہم لوگوں کو اتنا نامعقول سمجھ لیا ہے مخالفت کے جوش میں آکر ہم پر ایسی گھٹیا حرکت کا الزام لگاتے ہو، تم میں اپنے سے باہر کے علماء اور بزرگوں کا احترام باقی نہیں رہا، اپنے علاوہ کسی کو تم شریف اور معقول ماننے پر تیار نہیں ہو؟

غور فرمائیے کہ آخر اس طرح کی ذلیل حرکتوں سے کیا محسنِ انسانیت کے پیغام میں کیڑے پڑ چلے تھے؟ کیا اس کمینگی کے زور سے اسلامی جماعت کا وجود مٹ چلا تھا؟ گالیاں دینے اور منہ چڑانے سے کسی تعمیری

طاقت کا ایک بال بھی بیکا نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ اس میں سارا مزہ صرف اس قدر ہوتا ہے کہ مقابل کی جادو منفی اور تخریبی طاقت کے دل کا بخار نکل جاتا ہے۔ یہ بزرگ جب بزم نبوت میں اس طرح کے کارنامے انجام دے کر رخصت ہوتے ہوں گے تو اپنی محفلوں میں جا کر فخر کرتے ہوں گے، کہ آج توجی بس ہم ان نبی صاحب کو یہ اور یہ کہہ آئے۔ مریدوں میں بیٹھ کر اپنی قابلیت کا سکہ جاتے ہوں گے کہ ہم نے لفظوں کے اُلٹ پھیر سے کیا کیا مطلب نکالے اور چسپاں کیے ہیں اور ہمارے صرف و نحو اور فصاحت و بلاغت کے علم نے اس معرکہ میں ہمیں کتنی مدد بہم پہنچائی ہے۔

بزرگانِ یہود کے ان کارناموں میں عبرت کا درس یہ ہے کہ مذہبی لوگ جب انحطاط کا شکار ہوتے ہیں تو ان میں تخریفِ کلمات کی گندی بیماری پیدا ہو جاتی ہے، دوسرے ان کے اندر سے انسانیت اور شرافت اور تہذیب کے تقاضوں کا لحاظ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرے ان کی حرکات کے ظاہر و باطن میں شرمناک تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ چوتھے ان میں ایک طرح کی بزدلی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ سیدھے سیدھے طریق سے دل کے گندے جذبات کو اگل بھی نہیں سکتے، بلکہ اپنی بدظنیتی پر شرافت کی جھلیاں چڑھا چڑھا کر لاتے ہیں۔ یہ ایسی علامات ہیں جو کسی ذہن و فکر کے فاسد ہونے کی قطعی دلیل ہوتی ہیں۔ علی الخصوص بدزبانی اور بازاری اندازِ خطاب جہاں بھی پایا جائے وہاں حق اور انصاف اور سچائی سے کوئی تعلق باقی نہیں رہ سکتا۔ آدمی کا ہر بول اور اس کا اندازِ گفتگو اس کی سیرت کا اسی طرح ترجمان ہوتا ہے جس طرح کھانے کی کسی دیگ میں سے اس کی خوشبو پھیل کر دُور دُور تک کھانے کی نوعیت اور اس کے مسالوں کے معیار کا اعلان کر دیتی ہے۔ اب اگر کسی دل و دماغ کی دیگ سے بدزبانی اور بدتمیزی کی سطر اند اُٹھ رہی ہو تو کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کے اندر پاکیزہ خیالات اور شریفانہ جذبات سے ترکیب پاکر کوئی اعلیٰ سیرت پک رہی ہوگی جب کسی شخص کو دیکھو کہ وہ اختلاف کرنے والوں کے خلاف بدزبانی اور بدتمیزی کی سطح پر اتر آیا ہے تو سمجھو کہ یہ اس کے مقابلے میں دلیل کی بازی بھی ہرچکا اور اخلاق کے مقابلے میں بھی شکست کھا چکا۔ اب یہ ہرا ہوا کھلاڑی محض دل کا بخار نکال رہا ہے اور دل کا بخار نکالنے والی طاقتیں تاریخ میں کوئی اثر نہیں پاسکتیں وہ بس دل کا بخار نکالتی رہتی ہیں اور تعمیرِ دعوتوں کے قافلے گام بہ گام آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

اتنے ہی برس نہیں ہو جاتی، مدینہ میں جب اذان کی ابتداء ہوئی تو چونکہ یہود کے روایتی مسلک کے خلاف یہ بھی نظامِ مذہب میں ایک بدعت تھی، لہذا وہ اس پر بھی پڑا پیچ و تاپ کھاتے۔ خصوصاً وہ دیکھ رہے تھے کہ اذان کے کلمات اسلام کی پوری انقلابی دعوت اور اس کے بنیادی نظریے کو جامعیت سے سامنے لے آتے ہیں، اور دن میں پانچ مرتبہ ان کا پکارا جانا۔ اور اونچی اور خوش آئند آواز میں پکارا جانا۔ ایک مؤثر

ذریعہ نشر و اشاعت ہے۔ یہ آواز ان کی عورتوں، ان کے بچوں اور ان کے غلاموں کے کانوں میں پڑتی، ہر روز پڑتی اور پانچ پانچ بار پڑتی۔ تصور کیجیے کہ جب یہ انوکھی آواز بلالی سوز و ساز کے ساتھ گونجتی ہوگی تو مدینہ کی ساری فضا میں سناٹا چھا جاتا ہوگا۔ اپنوں پر ایوں کے دل متوجہ ہو جاتے ہوں گے۔ خصوصاً ان کو وہ فرق محسوس ہوتا ہوگا جو گھنٹے اور ناقوس بجانے اور اذان پکارنے میں تھا۔ اور جس کے بارے میں خود ان کے عوام بھی کچھ نہ کچھ احساس کرتے ہوں گے۔ گھنٹے اور ناقوس کی آواز بس آواز تھی اس میں نہ لفظ تھے نہ معنی تھے، بخلاف اس کے اذان کی آواز چند بولوں اور چند کلموں پر مشتمل تھی جن میں عام فہم معانی موجزن تھے۔ گھنٹے اور ناقوس کی آواز میں انسانی جذبات کا اظہار نہیں تھا۔ لیکن اذان کی پکار میں انسانی قلب کا سوز و گداز کارفرما ہوتا تھا۔ اس فرق کو محسوس کر کے یہود بجاتے اس کے کہ یہ اعتراف کر لیتے کہ اذان فی الواقع عبادت کی دعوت دینے کا بہتر اور مؤثر ذریعہ ہے اور اس کے کلمات قدر و قیمت رکھتے ہیں، وہ چڑ میں مبتلا ہو گئے۔ اپنی مجلسوں میں، صحبتوں میں وہ اذان پکارنے والے کی آواز کو عجیب و غریب تشبیہیں دیتے۔ وہ نقیبن انا رتے اور اذان کے کلمات کو بگاڑ بگاڑ کر سامانِ تضحیک پیدا کرتے۔ حسد اور کینہ ان مذہب داروں کو بھانڈوں کی سطح تک جاگراتا تھا۔ مگر جو کام اذان کر رہی تھی، اس کی روک تھام تضحیک اور نقالی اور بھانڈپن سے کیسے ہو سکتی تھی۔

بدتمیز لوگوں کی آخری حد یہ تھی کہ خود اللہ میاں کو بھی رغوہ باللہ، نشانہ بنا لیا گیا۔ مثلاً جب یہ آیت اتری کہ ”من ذالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً“ یعنی کون ہے جو اللہ کو چھ قرض دے تو بجائے اس کے کہ اس کے عیدھے صاف مفہوم کو اخذ کیا جاتا، یہود نے یہ کہہ کر مذاق اڑانا شروع کیا، لوگو! سنتے ہو، اب تو اللہ میاں بھی قداش ہو گئے ہیں، لو اب وہ بندوں سے قرض مانگنے نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ خدا سے بے خوفی اور بے شرمی کی اس سے زیادہ ناپاک مثالیں کم ملتی ہیں۔

اسی طرح قرآن میں جہاں کتھی اور مچھریا ایسی ہی بظاہر حقیر چیزوں کا بطور مثال تذکرہ ہوا ہے اور ان کے وجود سے کوئی استدلال کیا گیا ہے، وہاں یہ لوگ طنز و تحقیر کا طوفان مچانے کا موقع پا لیتے۔ کہتے کہ ان مسلمانوں کا خدا بھی عجیب ہے کہ جسے مثال دینے کے لیے بھی ملتی ہیں تو ایسی حقیر چیزیں ملتی ہیں۔ اس استہزاء میں یہ استدلال بھی شامل ہوتا کہ قرآن خدا کا کلام کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اس کے اندر ان گھٹیا چیزوں کا تذکرہ ہے۔ ان لوگوں کو کیا خوب جواب ملا کہ :

”ہاں! اللہ اس سے ہرگز نہیں شرماتا کہ مچھریا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی تمثیل دے جو لوگ حق بات کے قبول کرنے والے ہیں وہ انہی تمثیلوں کو دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ

یہ حق ہے، جو ان کے رب ہی کی طرف سے آیا ہے، اور جو ماننے والے نہیں ہیں وہ انہیں سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی تمثیلوں سے اللہ کو کیا سروکار ہے؟

(بقرہ - ۲۶)

## مضحکہ انگیز مطالبہ :-

یہود کی بدتمیزی طلبِ حجت کی شکل اختیار کر کے ایک عجیب مضحکہ انگیز مطالبہ بن گئی۔ حضور سے کہنے لگے۔ "لو لا یکلّمنا اللّٰہ" (بقرہ - ۱۱۷) آخر یہ کیا جھمیل ہے کہ خدا تمہاری طرف ایک فرشتہ درپردہ بھیجتا ہے اور بلا بلا ہی تم تک اپنی بات پہنچا دیتا ہے۔ کیوں نہیں وہ سامنے آکر ہم سے براہِ راست بات کرتا کہ وہ چاہتا کیا ہے؟ وہ زمین پر اترے آنکھوں سے دکھائی دے اور ہم سے رُودر رُو کہے کہ یہ اور یہ میرے احکام ہیں ان کو مانو اور یہ شخص میرا پیغمبر ہے اس کا دامن تھام کر چلو۔ یہ نہیں تو کم سے کم اتنا ہی کرے کہ کوئی صریح اور قاطع نشانی بھیج دے جس کے بعد کسی کو مجالِ انکار نہ رہے کہ تم اس کے نبی ہو اور قرآن اس کا کلام ہے۔

یہ قاطع نشانی بھی انہوں نے ستین صورت میں بتادی جو ان کو مطمئن کر سکتی تھی، تاریخ و سیرت کے ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مطالبہ یہود کے حلقوں میں بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ دیر تک اس کا پھر چارہ اور بار بار یہ آپ کے سامنے دوہرایا گیا۔

پہلے سنیے کہ یہ مضحکہ انگیز مطالبہ پیدا کیونکر ہوا۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ مدینہ کے یہود حضور کی اجبت سے قبل اوس و خزرج کو زک دینے کے منصوبے بنا بنا کر آنے والے نبی کی فوری آمد کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ جب حضور کی نبوت کا آفتاب طلوع ہو گیا تو لیکایک انہوں نے پختہ بدل لیا اور انکار اور سرکشی کے مورچوں پر ڈٹ گئے۔ ان کی اس قلبِ ماہیت پر عام لوگوں میں عجیب سی حالت استغمام پیدا ہو گئی۔ لوگ آ آ کر ان سے پوچھتے کہ یہ قصہ کیا ہے کہ پہلے آپ ہی حضرات یہ دعائیں مانگتے تھے، اور ایک نبی کی آمد کا مژدہ سناتے تھے۔ اور اب آپ خود ہی آنے والے کی آمد پر بگڑ بیٹھے ہیں۔ خصوصاً ایک مجلس میں معاذ بن جبل اور بشر بن براہ بن معرور جیسے ذہین اکابر نے یہودی بزرگوں سے صاف صاف کہا کہ "اے گروہ یہود! اللہ سے ڈرو اور سر تسلیم خم کر دو، کیونکہ تم ہمارے خلاف تائید حاصل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے خود ہی بعثت محمدی کی آرزوئیں کیا کرتے تھے اور ہمارا حال یہ تھا کہ ہم اہل شرک تھے اور تم ہی ہمیں یہ خبر سنایا کرتے تھے کہ وہ مبعوث ہو چکا ہے اور پھر تم اس کے اوصاف ہمارے سامنے گنوا یا کرتے تھے۔" اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسی گفتگوؤں میں کس بڑی طرح یہودی ذہن کا پول کھل جاتا ہوگا۔ اور وہ خود محسوس کر لیتے۔

ہوں گے کہ ہمارے متعلق غاطبین کی رائے کیا ہے۔ اپنی شانِ دیانت و تقویٰ کے بچاؤ کے لیے ناکزیر تھا کہ وہ ایک نہ ایک ڈھال فراہم کرتے۔ وہ ڈھال تھی کیا، اسے معلوم کرنے کے لیے اُدپر کی بات کا جواب سنیے جو بنی نغیر کے ایک بزرگ سلام ابن مشکم کی زبان مبارک سے صادر ہوا۔ فرماتے ہیں: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ساتھ کوئی ایسی نشانی نہیں لایا۔ جس کے ذریعے ہم اسے پر حیثیت نبی کے پہچان سکتے، اور زیادہ وہ شخص نہیں ہے جس کے بارے میں ہم تم سے تذکرہ کیا کرتے تھے۔ یہی بات ابنِ صلویٰ فطیونی نے خود محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست بھی کر دی تھی۔ یعنی ایک فیصلہ کن نشانی چلتی تھی۔ اور اس کا تعین کرنا یہود کا کام تھا۔ وہ جیسی نشانی کا بھی چاہیں مطالبہ کریں۔ اسی طرح لوگوں کی طرف سے یہ مذاق کا سوال اٹھایا گیا جو نبی آخر الزمان کے بارے میں سابق انبیاء سے انہوں نے استواء کیا تھا تو اس پر بھی ان لوگوں نے آئیں بائیں شائیں کر دی۔ ابک بن الصیف نے ایک بار صاف صاف کہا کہ وہ خدا کی قسم محمد کے بارے میں ہم سے کوئی عہد نہیں کیا گیا۔

ان کے لیے قرآن کے پاکیزہ کلام اور اہل چل مجاہدینے واسے استدلال میں کوئی نشانی نہ تھی۔ محسن انسانیت کے کردار میں کوئی نشانی نہ تھی۔ زندگی کا نقشہ بدلنے والی تحریک کی ہر دوں میں کوئی نشانی نہ تھی۔ علمبردارانِ حق کی پروان چڑھتی ہوئی جماعت میں کوئی نشانی نہ تھی، ان قربانیوں اور جانبازیوں میں کوئی نشانی نہ تھی۔ جو مہتمی مہتمدانِ ظلم و تشدد کے ہتھیاروں سے کام لینے والی با اثر طاقتوں کے مقابلے میں دکھارہے تھے۔ ان کو تو اس کوئی عجوبہ اور کوئی تماشہ چاہیے تھا۔

اب سنیے کہ کس نشانی کا مطالبہ تھا!

رافع بن حرملہ اور سب بن زید حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ بائیں ہوئی کہنے لگے کہ:

”اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے سامنے لکھی لکھائی کتاب لاؤ جسے آسمان سے ہمارے در پر اتروا اور ہم اسے بطور خود پڑھیں اور ہمارے سامنے چٹھے باری کر دو، پھر تمہارے پیچھے چلیں گے اور تمہاری صداقت کی گواہی دیں گے۔“

۱۔ سیرت ابن ہشام ج ۲ صفحہ ۴۳ - ۱۴۳

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً



اسی رافع بن حرملہ نے یہ تقاضا بھی کیا کہ "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر تم اللہ کے رسول ہو جیسے کہ تم خود کہتے ہو تو ذرا اللہ میاں سے یہ کہو کہ وہ ہم سے بات کرے، یہاں تک کہ ہم اس کی بات خود سن لیں۔"

ایک اور مجلس میں فخاص، عبداللہ بن صبور یا ابن صلوہا، کنانہ بن ربیع بن اپنی الحقیق، اشع، کعب بن اسد شمویل بن زید، جبل بن عمرو بن سکینہ جیسے بزرگان یہود حضور سرور عالم سے گفتگو کر رہے تھے۔ کہنے لگے "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا واقعی یہ قرآن تمہیں کوئی جن یا کوئی انسان نہیں سکھاتا؟ رسولِ خدا نے فرمایا: تم خوب سمجھتے ہو، کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور یہ کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ تم اس حقیقت کو اپنے ہاں تورات میں مرقوم دیکھتے ہو۔ اس پر وہ کہنے لگے "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر حقیقت یہ ہے کہ جب خدا اپنے کسی رسول کو برپا کر دیتا ہے تو پھر جو کچھ بھی رسول چاہے، خدا اس کے لیے وہی کچھ کر دیتا ہے اور رسول جس بات کا بھی ارادہ کرے خدا کی طرف سے وہی کچھ کر دکھانے کا اختیار پالیتا ہے۔ سو تم آسمان سے ہمارے اوپر لکھی ہوئی کتاب کو اتروا۔ جسے ہم پڑھیں اور پہچانیں۔"

یہود نے بڑی کارگر ڈھال تلاش کر لی۔ اب کوئی سوال نہ رہا اس کا کہ داعیِ حق کی دعوت کیا ہے؟ وہ کیا بات کہتا ہے؟ اس کے لیے دلائل کیا رکھتا ہے؟ اس کی دعوت کے اثر سے کیسی زندگی بنتی ہے؟ اس کی تعلیم و تربیت سے کس نوعیت کی سیرت پروان چڑھتی ہے؟ اس کے تعمیری کام سے کیسا نظامِ تمدن بنتا ہے؟ یہ سارے سوالات پیچھے چلے گئے اور سامنے یہ مطالبہ آ گیا کہ "آسمان سے کتاب اتار کے دکھاؤ۔" اب لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے ایک ذریعہ ہاتھ آ گیا۔ جس نے بات چھیڑی اس سے کہہ دیا کہ ہم تو ماننے کو تیار بیٹھے ہیں، لیکن ان سے جا کر کہو کہ وہ نبیِ برحق ہوں تو اللہ میاں سے کہہ کر خدا یہ ایک نشانی دکھا دیں۔ اللہ والوں کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں اوپر سے منوا لیتے ہیں، پھر وہ کیسا رسول ہے جس کی بات عالمِ بالا میں درخورِ اعتنا نہیں ہے لوگو، چھوڑو ان انتشار انگیز باتوں کو، جاؤ کسی اللہ والے کا دامن مقامِ لوہیہ تو بس یونہی ڈھکوسلہ ہے۔

**یہود کا شائیلا کی طرزِ عمل:**

یہ تو معلوم عام حقیقت ہے کہ مدینہ کے محدود ذرائع و وسائل پر جب مہاجرین کی روز افزوں آبادی

کا بار پڑنے گا اور بے سرمایہ و بے سہارا لوگ اپنی معاشی زندگی کی تعمیر نو میں آکر لگے تو تحریک کے بیشتر کارکنوں پر عالم فقر و فاقہ چھا گیا۔ اس امتحان فقر و فاقہ میں خود تحریک کا لیڈر اور اس کے گھر کے لوگ سب عام ساتھیوں کے برابر کے شریک تھے بلکہ آزمائش میں سے زیادہ حصہ اسی محسن انسانیت کو ملا۔ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی فقر و فاقہ کی صبر آزمائیوں کو ہاجرین کی بیماری نے دوگنا کر دیا۔ نئی آب و ہوا باہر سے آنے والوں کو اس نہ آئی اور یکے بعد دیگرے سچائی کے نظام کے سپاہی بیمار ہونے لگے۔ بخار کی ایک وبا پھیل گئی اور یہ بخار بڑا ہٹیلہ اور موذی ثابت ہوا۔ ناقص غذا کے ساتھ اس نئی بلا نے جس کو نیشا نہ بنایا اس کو بڑیوں کا ڈھانچہ بنا کے چھوڑا۔ لوگ معاشی تنگ و دو کے قابل نہ رہے۔ ایک طرف تحریک کا سفینہ مشکلات اور مخالفتوں کے نت نئے گردابوں سے دوچار تھا۔ نونیز اسلامی ریاست ہر پہلو سے محتاج تعمیر تھی، اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے طرح طرح کے خطرات تھے، افراد کار صاحب فراش ہو رہے تھے اور پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا کا پورا پورا انتظام نہ تھا۔ اس مرحلے کو چھوٹی سی انقلابی پارٹی نے جس طاقت کے بل پر پار کیا، وہ ایمان باللہ، مقصد کی محبت اور باہمی جذبہ اخوت کی طاقت تھی۔ دراصل بڑے بڑے تاریخی کارنامے انجام دینے والے افراد اور تنظیموں کی مرکزی طاقت ہوتی ہی ہے ایمان اور اخوت! اسی طاقت نے نجیفوں کو قومی بنانے رکھا اور اسی طاقت نے فدائے و وسائل کی کمی کے اثرات کو کم سے کم کر دیا۔ تاہم ناسازگار حالات کے خلاف جو کچھ جدوجہد ہو رہی تھی، اسے دباٹے عام نے بہت کمزور کر دیا اور اس دوران میں یہ چرچا بھی ہونے لگا، کہ مدینہ کے یہودیوں نے جادو کر دیا ہے اور اب مسلمان پنپ نہیں سکیں گے۔ حالات کیسے سنگین تھے آئیے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے محسن انسانیت کے چند رفقاء کے کار سے ملیے۔

یہ دیکھیے، سیدنا حضرت ابو بکرؓ ہیں۔ بسترِ مرض پر مارے کرب کے تڑپ رہے ہیں اور ایک شعر میں اپنے دلی اضطراب کا اظہار کر رہے ہیں:

كُلُّ امْرُؤٍ مُصَبَّحٌ فِي اَهْلِهِ وَالْمَوْتُ اِدْفِي مِنْ شَرَاكِي لَعْلَه

حالت یہ ہے کہ اپنے لیے موت کو جوتی کے تسمہ سے بھی زیادہ قریب پارہے ہیں۔

ازدھر ملاحظہ فرمائیے، یہ سیدنا بلال ہیں۔ کروٹیں لے رہے ہیں اور درد بھری لہجے میں الایب

رہے ہیں:

الالیت شعری هل ابیتن لیلة بواجٍ وحولی اذ خرو جلیل

وہل اُردن یوماً میاً مجنہ وہل یبدون لی شامة و طہل

یہ مکہ کی وادیوں اور چشمیں اور پہاڑیوں کی یاد تازہ کی جا رہی ہے اس وادی میں انہ رات گزارینے

کی حسرت کا اظہار ہے جس میں اذخر اور جلیل نام کی گھاسیں اگتی ہیں اور ہاں، مجنہ کے چشے کا پانی پینے اور شام اور طفیل نامی پہاڑیوں کا منظر دیکھنے کے ارمان ابلے چلے آرہے ہیں۔

اور آئیے۔ ملاحظہ فرمائیے، یہ عامر ہیں۔ لیوں پر کیا ہی بیتاب کن شعر قصاں ہے۔

انجی وجدات الموت قبل ذوقہ ان الجبان خنفة من فوقہ

ان کے ابتلائے بدن کا عالم یہ ہے کہ موت کے آنے سے پہلے موت کی آہٹ سن رہے ہیں۔

پھر یہ ہیں حضرت شداد۔ رسول اللہ اپنے اس رفیق کی عیادت کے لیے تشریف لاتے ہیں۔

بے قرار رہتا ہے کہ اگر بطمان کا پانی پی لیتا تو اچھا ہوتا۔ رسول فرماتے ہیں کہ چلے جاؤ کون روکتا ہے۔

کتا ہے "ہجرت" رسول تسلی کے لیے فرماتے ہیں کہ چلے جاؤ تم جہاں بھی ہوں گے، مہاجر ہی رہو گے۔

صلح حدیبیہ پر جب مسلمان مکہ گئے تو ان کے بدن بار بار کی علامتوں نے ایسے پور پور کر دیئے

ہوئے تھے کہ اہل مکہ کی طرف سے طعنے دیے گئے کہ "اور جاؤ تا مدینہ" انہی طعنوں کا رد عمل تھا کہ رسول

اللہ کے ارشاد کے تحت مسلمان اکڑا اکڑ کر چلتے تھے۔

انہی حالات کی بناء پر حضور فرماتے تھے کہ "ان شان الهجرة لشدید" یعنی ہجرت کا معاملہ

بڑا سنگین ہے، کوئی کھیل نہیں! اس سلسلے میں ایک دلچپ واقعہ پیش آیا۔ ایک بدو نے آکر سرورِ عالم کے

ہاتھ پر بیعت کی، لیکن مدینہ تک ہی بخارنے آیا۔ اُس نے اس کو اسلام کی بدشگونی قرار دیا اور اصرار کر کے

بیعت ختم کرائی اور چلا گیا۔ اس واقعہ پر حضور نے فرمایا کہ مدینہ سنار کی بھٹی کی مانند ہے کہ کھوٹ بھل کر اگل

دیتی ہے اور زیرِ خالص کو الگ کر لیتی ہے (بخاری) یعنی تحریکوں کے کارِ عظیم کے لیے جو لوگ اٹھتے ہیں ان

کو قدم قدم پر ایسے مراحل ابتلا پیش آتے ہیں کہ جن کو پار وہی کرتا ہے جس کے پاس ایمان کا زہرِ کامل عیار

موجود ہو، کھوٹا مال کسی نہ کسی مرحلے میں الگ ہو جاتا ہے۔ سو مدینہ کا یہ مرحلہ ابتلا سنار کی بھٹی کا سا کام

کر رہا تھا یہ

یہی دور تھا جب کہ حضور سرورِ عالم نے اللہ تعالیٰ سے گڑ گڑا کر دعا کی، کہ "اے اللہ! ہمارے

لیے مدینہ کو ویسا ہی دلکش بنا دے جیسے مکہ کو بنایا تھا، یا اس سے بھی زیادہ۔ اور ہمارے لیے اس کے

پیمانوں (یعنی غلے اور پیداوار) میں برکت عطا فرما۔ اور اس پر آئی ہوئی دبا کو صہیحہ (مہیقات اہل شام)

کی جانب منتقل کر دے یہ

۱۔ اسوۃ صحابہ از مولانا عبدالسلام ندوی صفحہ ۳۲-۳۳

۲۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۱

دوسری طرف عالم فقر و فاقہ کی کیفیت حد درجہ تشویش ناک تھی، نئی جگہ آ کر معاشی زندگی کی نیوٹاننا اور پھر اس میں کسبِ حلال کا اہتمام کرنا اور وہ بھی اس عالم میں جب کہ ایک تحریک لمحہ لمحہ انفاقِ مال کے مطالبات لیے سامنے کھڑی ہو، ایسے حالات میں جو ابتلا پیش آ سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ علمبردارانِ حق پر جو کچھ گزری اس کی دردناک روداد سے تاریخ، سیرت اور احادیث کے ذخائر بھرے پڑے ہیں۔

حضرت ابو طلحہ اس دورِ ابتلاء کا حال یوں بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ بھوک کی مصیبت میں گھل گھل کر جب تنگ آ گئے تو سہارا حاصل کرنے کے لیے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، حال بیان کیا اور پیٹ کھول کر دکھائے کہ کئی روز کے فاقے کی وجہ سے (معدے میں ہونے والی ایک خاص جلن کو روکنے کے لیے) پتھر باندھ رکھے تھے۔ اس پر تاریخ کی اس عظیم ترین شخصیت نے اپنے پیٹ سے کپڑا اٹھا کر دکھایا کہ ایک نہیں دو دو پتھر بندھے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر اپنا دکھڑا بیان کرنے والوں کی تسلی ہو گئی تھی۔

ایک مرتبہ اسی حال میں حضرت ابو بکرؓ بے وقت آئے اور چاہا کہ تسکین حاصل کرنے کے لیے اپنی تکلیف بیان کریں، مگر پھر خیال ہوا کہ اس سے قائدِ اسلام کو خواہ مخواہ مزید پریشانی ہوگی۔ تھوڑی دیر میں حضرت عمرؓ بھی آ پہنچے۔ وہ بھی اسی امتحان کا شکار تھے۔ باعثِ آمد پوچھا گیا۔ تو انہوں نے صاف صاف عرض کیا کہ بھوک کے مارے بیتاب ہوں۔ حضورؐ نے یہ سنا تو فرمایا کہ میرا بھی حال کچھ ایسا ہی ہے۔ طے پایا کہ اپنے رفیقِ مقصد ابو الہیثم کے ہاں چلیں۔ ابو الہیثم باغات کے مالک اور خوشحال تھے۔ تینوں اپنے رفیق کے ہاں پہنچے تو وہ بیچارے خادم نہ ہونے کے سبب خود ہی پانی لینے گئے ہوئے تھے۔ آئے تو فرطِ مسرت سے پیٹ گئے پھر باغ میں لے جا کر دسترخوان بچھایا۔ اور کھجوریں توڑ کر حاضر کیں۔ کھجوریں کھا کر ان فاقہ کشانِ راہِ حق نے ٹھنڈا پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کرتے، اور ابو الہیثم کے لیے دعائے خیر کرتے واپس ہوئے تھے۔

سعد بن ابی وقاص نے ایک موقع پر بیان کیا کہ تحریکِ محمدیؐ کا میں ہی وہ رکن ہوں جس کے ہاتھ سے ایک دشمنِ حق کا پہلا خون گرا، میں ہی ہوں جس نے جہاد میں اولین تیر پھینکا۔ ہم لوگوں نے ایسی حالت میں جہاد کیا ہے کہ ہم درختوں کے پتے اور کیر کی پھلیاں کھایا کرتے تھے اور اس وجہ سے منہ کے کنارے زخمی ہو جاتے تھے اور اجابت اونٹوں اور بکریوں کی مینگنیوں کی شکل اختیار کر جاتی تھی۔

۱۔ شامل ترمذی باب ماجاء فی عیش النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً یہ واقعہ ذرا بعد کے دور سے متعلق ہے لیکن اس سے مرینہ میں پیش آمدہ معاشی ابتلاء کا عمومی اندازہ ہوتا ہے۔

حضور کے رفیق خاص حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ " ایک زمانہ تھا کہ جب میں منبرِ نبوی اور حضرت عائشہ کے حجرہ کے درمیان بھوک اور فاقہ کی شدت کے مارے بیہوش پڑا تھا اور لوگ مجھ کو جنون زدہ سمجھ کر (بطور علاج) پاؤں سے میری گردن دباتے تھے، حالانکہ مجھے جنون نہیں ہوتا تھا۔ وہ محض بھوک کا عالم ہوتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ ہی کا بیان کردہ ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ آپ حضرت عمرؓ کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ اور کسی آیت کا مفہوم زیر بحث تھا، باتیں کرتے کرتے اور ساتھ چلتے چلتے یکایک حضرت ابو ہریرہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ فاقہ کشی نے نوبت یہاں تک پہنچا دی تھی۔

اس عالم میں حضور اگرچہ بیت المال میں آنے والی دولت کو ساتھ کے ساتھ رفقا کو سنبھالنے کے لیے صرف کرتے جاتے تھے مگر دائرہ صرف اتنا وسیع تھا کہ بیت المال کی آمدنیاں اور انصار اور خوشحال مہاجرین کے فراخ دلانہ انفرادی صدقات بدرجہ اولیٰ بھی کافی نہ ہوتے تھے۔ عام فاقہ زدہ مہاجرین کے ساتھ ساتھ اصحابِ صفہ کا مستقل دارالاقامت ضرورت مند تھا، همان آتے تھے، بدوی لوگ وقتاً فوقتاً اسلام لانے، زیارت کرنے اور احکام معلوم کرنے آتے، سائل آ کر سوال کرتے، اور مسلسل نئے مہاجرین کی آمد رہتی۔ حالات میں بیت المال بچا رہا بھی کیا کر سکتا تھا۔ جب رفقہ اور اہل حاجت کی ضروریات کا دباؤ شدید ہوتا تھا قائدِ تحریک یا تو اعانت کے لیے اپیل کر دیتے اور لوگ جذبہ صادق سے اپنا مال نچوڑ دیتے، یا پھر قرض لینا پڑتا قرض اپنی جماعت کے اندر سے کچھ زیادہ مل نہ سکتا تھا۔ لہذا یہودی مالداروں کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ یہودیوں کا حال یہ تھا کہ یہ لوگ پکتے مہاجرین اور سود خوار تھے اور ان کے سودی حال تمام علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے ساتھیوں کو وہ جس غرض سے قرض دیتے تھے وہ سود سے زیادہ بڑی چیز تھی، وہ یہ تھی کہ روپے اور احسان داری کے زور سے ان پر قابو پایا جائے اور اس ذہنیت کے ساتھ وہ قرض خواہی میں بالکل ناشیلا کی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے اور توہین و تذلیل پر اتر آتے یہی حال مشرکین کا تھا۔ اس تلخ تجربے سے خود سرورِ عالم کو بھی گزرننا پڑا اور آپ کے ساتھیوں کو بھی۔ بہت سارے واقعات سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ آہ! دنیا کی بھلائی کے لیے زندگیوں کی بازی لگانے والوں نے یہ سب کچھ بھی بھگتا۔ مگر اس مفلوک الحالی پر بھی اپنے ایمان اور مقصد کے بارے میں تحریک کے سپاہیوں میں کوئی تزلزل نہیں آیا۔

محسنِ انسانیت نے اپنے قریبی رفیق اور ذاتی نائب حضرت بلالؓ کو حکم دے رکھا تھا کہ تحریک اور اس کے سپاہیوں کی ضرورت پر وہ آمدنیوں کو بے دریغ صرف کریں حضرت بلالؓ اسی طریق کار پر کار بند رہتے تھے۔ ایک مرتبہ نوے ہزار درہم کی رقم آئی اور ایک بوریٹے پر ڈھیر لگادی گئی۔ وہیں پیٹھے پیٹھے سرورِ عالم

لہ شامل نزدی۔ مَا جَاءَ فِي عَيْشِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا۔ اور ایک حصہ باقی نہ رہا۔ تقسیم ہو چکنے کے بعد ایک سائل آگیا۔ تو اس کے لیے قرض لینے کا حکم دیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ کسی موقع پر سیدنا بلالؓ کے سامنے کھجوروں کا ایک ڈھیر لگا پڑا تھا۔ حضورؐ نے دریافت کیا یہ کیسا مال ہے؟ سیدنا بلالؓ نے عرض کیا کہ اسے مستقبل کی نادیدہ ضرورتوں کے لیے روک رکھنے کا ارادہ ہے فرمایا یہ کیا تم نچنت ہو گئے ہو کہ کل قیامت کے دن کہیں اس مال کو یوں روک رکھنے کے بدلے جہنم کا دھواں تم تک پہنچے۔ خرچہ کرو۔ اسے بلالؓ! اور تخت اقتدار کے مالک کی طرف سے کسی کا اندیشہ نہ کرو۔ حضرت بلالؓ ہی کا بیان ہے کہ مدینہ کا ایک مشرک ان کے پاس آیا۔ اور خود پیش کش کی کہ میرے پاس وافر مال موجود ہے۔ جب ضرورت ہو مجھ سے لے لیا کریں۔ چنانچہ حضرت بلالؓ نے قرض لینا شروع کر دیا۔ یکایک ایک دن ایسا ہوا کہ حضرت بلالؓ وضو کر کے اذان کہنے کی تیاری میں تھے کہ وہ مہاجن اپنے ساتھ کچھ اور کاروباریوں کو لیے ہوئے آیا اور چلایا کہ "اوجبشی" حضرت بلالؓ اس کے پاس گئے۔ وہ بہت گرم ہوا اور بڑا جھلا کہنے لگا اور اتنا دیکھا کہ مہینہ ختم ہونے کو ہے اگر قرضہ وقت پر ادا نہ کیا تو عرب کے جاہلی طریقے کے مطابق تم کو غلام بنا لوں گا۔ اور تمہارا وہی حال ہو گا جو پہلے تھا۔ حضرت بلالؓ بیان کرتے ہیں کہ اس فضیلت سے مجھ پر وہی کچھ گزری جو ایسے عالم میں ہر شریف آدمی پر گزرتی ہے۔ سیدنا بلالؓ عشا کی نماز کے بعد اپنا دکھڑا سنانے محسن انسانیت کی خدمت میں پہنچے اور ادائیگی کی کوئی تدبیر نہ پا کر روپوش ہو جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور کہا کہ جب قرض ادا کرنے کا کچھ انتظام ہو جائے گا تو میں واپس آ جاؤں گا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ حضرت بلالؓ اپنے ارادے کو عمل میں لاتے، اگلی ہی صبح محسن انسانیت کی طرف سے بلاوا آیا۔ حاضر ہوئے تو دیکھا کہ حاکم فدک کی طرف سے سامان سے لدی ہوئی چار اونٹنیاں ہدیہ کھڑی ہیں۔ قرضخواہ کو بلا کر حساب بے باق کر دیا گیا۔ اور بقیہ مال حسب معمول مستحقین میں تقسیم کر دیا گیا۔

اسلامی تحریک کے ایک سپاہی ابو حدرد اسلمی ایک یہودی کے مقروض ہو گئے لیکن ادائیگی کے لیے وہ بجز تن کے کپڑوں کے اور کوئی چیز نہ رکھتے تھے۔ ابو حدرد نے یہودی سے مزید مہلت طلب کی۔ لیکن اس کی شائلا کی ذرا بھی مہلت دینے پر تیار نہ تھی۔ وہ ابو حدرد کو پکڑ کر آنحضرتؐ کے سامنے لے آیا اور اپنا مطالبہ پیش کیا۔ حضورؐ نے ابو حدرد کو ادائیگی کے لیے کہا۔ انہوں نے اپنے حالات سامنے رکھ کر عذر کیا۔ لیکن یہودی قرض خواہ کی غیر انسانی ذہنیت کے پیش نظر آپؐ نے اصرار کیا کہ جیسے بچ پڑے ادائیگی کرو۔ انہوں نے پھر گزارش کی کہ غزوہ خیبر سامنے ہے۔ شاید وہاں سے لوٹ کر آنے پر کوئی عورت حل نکل آئے۔ حضورؐ نے پھر شدت اس بلا سے نجات لینے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ یہودی ابو حدرد کا تہ بند

لے کر ٹلا اور اس مردِ حق کو اپنا عمامہ اتار کر کمر سے لپیٹنا پڑا۔ ذرا قرضہ کی رقم کی مقدار کا اندازہ لیجیے۔ اور اس پر یہودی قرضخواہ کا اصرار دیکھیے اور پھر اس ظالمانہ وصولی کا تصور کیجیے کہ اپنے مقروض کے تن کا کپڑا اترا کے دم لیا۔

حضرت جابر بن عبد اللہ اسلامی تحریک کی ایک اور بزرگ ترین ہستی ہیں۔ یہ مدینہ کے رہنے والے تھے اور خاصے خوشحال تھے۔ پھر بھی حالات و ضروریات کے تحت ایک یہودی مہاجن سے وقتاً فوقتاً قرض لینے پر مجبور ہو جاتے۔ ایک سال اتفاق سے کھجوروں پر پوری طرح پھل نہ آیا اور قرضہ وقت پر ادا نہ ہو سکا یہودی مہاجن سے یہ مشکل اگلی فصل تک کے لیے مہلت مانگی۔ اگلی مرتبہ پھر فصل خراب ہوئی۔ مزید مہلت دینے سے مہاجن نے انکار کر دیا۔ آخر جابر بھی اپنی رام کہانی سنانے اپنے آقا کی خدمت میں پہنچے حضور چند رفقاء کو ساتھ لے کر یہودی کے گھر تشریف لے گئے۔ اور اس سے اپیل کی کہ وہ جابر کو مہلت دے۔ اس نے انکار کیا۔ حضور تھوڑی دیر کے لیے ادھر ادھر گھومے اور ایک بار پھر آ کر اس سے گفتگو کی۔ لیکن پتھر کو کسی طرح جونک نہ لگ سکی۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے آپ سو گئے۔ جاگے تو پھر جا کر وہی ذکر چھیڑا۔ مگر وہ ظالم نہ پیجا۔ آخر کار آپ جابر کی کھجوروں کے جھنڈ میں جا کر کھڑے ہوئے اور ان سے فرمایا کہ کھجوریں توڑو۔ کھجوریں توڑی گئیں تو توقع سے بہت زیادہ نکلیں۔ قرضہ بھی ادا ہو گیا اور خاصی مقدار بھی بچ رہی۔

حضور کی ایک ذاتی زدہ ایک یہودی قرضخواہ کے پاس رہن تھی۔ آخر دم تک آپ کے پاس اس کو تک کرانے کے لیے اندوختہ نہ ہو سکا۔

ایک مرتبہ سرورِ عالم سے ایک بدوی قرض خواہ مطالبہ کرنے آیا۔ اپنے بدویانہ مزاج کے مطابق اس نے نہایت تندہی سے گفتگو کی۔ رفقاء نے نبوت نے اسے احساس دلایا کہ تم دیکھتے نہیں کہ کس مہستی سے ہم کلام ہو۔ وہ کہنے لگا کہ میں تو اپنا حق طلب کر رہا ہوں۔ حضور اپنے رفقاء کو فرماتے ہیں کہ تم لوگوں کو اس کی حمایت کرنی چاہیے کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔ پھر اس کا حساب بے باق کرنے کا حکم دیا اور اس کے حق سے کچھ زیادہ دلوادیا۔

۱۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم شبلی ۲۵ صفحہ ۲۶۲

۲۔ ایضاً۔

۳۔ شمائل ترمذی۔ باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۴۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم شبلی جلد ۲ صفحہ ۲۶۹

زید بن سحنہ کا دلچسپ واقعہ ان حالات پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔ یہ یہودی عالم تھے۔ اور دیانت داری سے محسن انسانیت کے دعوائے نبوت کا جائزہ مختلف علامات کی روشنی میں لے رہے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک بدو آیا اور حضور سے آکر ملا۔ اس نے بیان کیا کہ میری قوم مسلمان ہو چکی ہے۔ اور میں نے ان کو دعوت دیتے ہوئے کہا تھا کہ تم اگر اسلام لاؤ گے تو اللہ تعالیٰ تم کو بھرپور رزق دے گا۔ لیکن بدقسمتی سے الٹا قحط پڑ گیا ہے۔ اب اگر ان کو سہارا نہ بہم پہنچایا جائے تو اندیشہ ہے کہ وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں گے۔ حضور نے حضرت علیؓ کی طرف مستفسرانہ نگاہ سے دیکھا۔ انہوں نے عرض کیا کہ فی الوقت کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ زید بن سحنہ نے پیش کش کی کہ مجھ سے ۸۰ مثقال سونا لے لیں۔ اور اس کے عوض میں وقت معین پر کھجوریں دے دیں۔ معاملہ طے ہو گیا اور حضور نے سونے لے کر بدوی کے حوالے کر دیا۔ زید بن سحنہ کا بیان ہے کہ مقررہ میعاد میں جب دو تین دن باقی رہ گئے تو وہ حضور سے ایسے عالم میں دوچار ہوئے کہ آپ اپنے چند رفقاء سمیت کسی کے جنازے کی نماز سے فارغ ہو کر ایک دیوار کے پاس تشریف فرما تھے زید نے حضور کے کرتے اور چادر کے پلوؤں کو کھینچتے ہوئے نہایت ترشروٹی سے کہا: "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا قرضہ ادا نہیں کرتے! خدا کی قسم میں تم سب اولاد عبد المطلب کو خوب جانتا ہوں کہ پکتے نادہند ہو!"

حضرت عمرؓ نے زید کو گرم نگاہوں سے گھورا اور کہا۔ کہ "او خدا کے دشمن! کیا بکتا ہے! خدا کی قسم مجھے (حضور سے) اندیشہ نہ ہوتا تو تیری گردن اڑا دیتا۔ محسن انسانیت نے حضرت عمرؓ کو سمجھایا کہ ایسے موقع پر آپ کو چاہیے کہ ایک طرف مجھے حسن و خوبی سے ادائے حق کرنے کی تلقین کرتے۔ دوسری طرف اس شخص کو مطالبہ کرنے کے بہتر طریقہ کی نصیحت کرتے۔ پھر فرمایا کہ اب جاؤ اور جا کر اس کا حساب ادا کر دو اور ڈانٹنے کے بدلے میں بیس صاع (مدینہ کا ایک معروف پیمانہ) کھجوریں مزید دو۔

یہ دراصل زید بن سحنہ کی طرف سے صاحب نبوت کا آخری امتحان تھا۔ حضرت عمرؓ سے اپنا تعارف کرایا ادا ان کو گواہ بنا کر اسلام قبول کیا۔ اور اپنا آدھا مال ملت اسلامیہ پر صدقہ کر دیا۔ یہ زید یہودی مہلکوں کی صف سے بالکل الگ اپنا مقام بلند رکھتے تھے لیکن ان کے واقعے سے بھی یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مدینہ میں تحریک ادا اس کے افراد کی مالی مشکلات کس درجے کی تھیں اور ان کے زیر اثر آئے دن قرض اٹھانا پڑتا تھا۔ اور قرض خواہوں کی طرف سے سختیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔

یہود اور مالدار مشرکین نے ایک طرف تو ماجنی محاذ تحریک اسلامی کے خلاف کھول رکھا تھا۔ دوسری طرف وہ ایک اور ہم میں بھی معروف تھے۔ وہ یہ تھی کہ لوگوں کو "انفاق فی سبیل اللہ سے روکا



جائے تاکہ تحریک مالی کمزوری کی وجہ سے سوکھ سوکھ کر ختم ہو جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک تو وہ ترغیب انفاق کی آیات کا مذاق اڑاتے تھے کہ لو جی، مسلمانوں کا خدا بھی دیو الیہ ہو کر قرض مانگنے نکل کھڑا ہوا ہے۔ کبھی کہتے کہ اسلامی تحریک کے خدا کا ہاتھ بند ہے۔ یہ باتیں یہودیوں سے چل کر منافقین کی زبانوں پر چڑھ جائیں اور پوری فضا کو غبار آلود کر دیتیں۔ دوسری طرف وہ انفاق کرنے والوں سے مل کر کہتے کہ دیکھو۔ کیوں اپنا مال غارت کر رہے ہو۔ مگر کے چند کنگالوں کو کھلا پلا کر تم کیا حاصل کرو گے۔ اپنے بال بچوں کی خدمت کرو، کاروبار چلاؤ۔ آخر مال کا یہ کیا احقانہ مصرف تم نے ڈھونڈا ہے۔ اس ہم کو چلانے والے یہود اور منافقین ہی کے پارے میں قرآن نے کہا کہ "یا ہسرون الناس بالبخل" یعنی یہ لوگوں کو کبھو سی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان معتمدین بخل میں کرم بن قیس (کعب بن اشرف کا حلیف) اسامہ بن حبیب نافع بن ابی نافع، بحری بن عمرو، جلیبی بن اخطب اور فاع بن زید بن تابوت نامور اور سربراہ آوردہ حضرات تھے۔ یہ انصار کے پاس آ کر بیٹھتے اور ان سے ناصحانہ انداز میں کہا کرتے: اپنے مال یوں نہ اڑاؤ۔ یہ یوں جائے گا تو ہمیں تمہارے منلوک الحال ہو جانے کا اندیشہ ہے، سو تم (تحریک اسلامی پر) خرچ کرنے میں اتنی تیزی نہ دکھاؤ تمہیں کچھ سدھ بدھ نہیں کہ حالات کیا ہو جائیں گے۔

یہود کے پانچویں کالم کے کارندوں میں یہ سرگوشیاں ہوتی تھیں کہ رسول اللہ کے ساتھیوں پر مال

خرچ کرنے سے باز آ جاؤ، تا آنکہ یہ سب چھٹ چھٹا جائیں: (قرآن سورہ منافقون۔ آیت ۷)

کتنی دور اندیشانہ اسکیم تھی۔ یعنی ایک طرف سے جذبہ انفاق کے سرچشمے کو بند کر دیا جائے۔ اور

دوسری طرف مہاجن بن کر اپنے شاہیلا کی پنجے کی گرفت تحریک اسلامی کی گردن پر کسی جائے۔ اسکیم کامیاب

ہو جاتی تو ایمان و استدلال اور عمل و کردار کے میدان میں مقابلہ کیے بغیر سر پر منڈلاتے ہوئے انقلاب کو شکست

دی جاسکتی تھی۔ مگر معاملہ ایک خدائے دانا و بینا اور ایک حاکم قادر و توانا سے تھا۔ اس کی گہری تدابیر نے

دشمنان حق کی چالوں کو شکست دے دی۔

اس داستان میں دیکھنے کی چیز محسن انسانیت اور تحریک حق کے پروردہ سپاہیوں کا وہ صابرانہ

کردار ہے جو مخالفین کی ظالمانہ اور گھٹیا حرکات کے جواب میں نمودار ہوا۔ انسانیت کا وہ کیسا اعلیٰ نمونہ

تھا جس نے اخلاقی علو کا دامن سخت مایوس کن اور اذیت دینے والے حالات میں بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

## یہود کا پیدا کردہ پانچواں کالم :

تاریخ انسانی کے صد ہا تجربات اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ اخلاص کی روح اپنے اندر  
یہ جب کبھی کوئی دعوتِ خیر و فلاح فاسدہ اقدام کرتی ہے تو اس کے مقابلے پر آنے والی ردِ عملی طاقتوں،  
میں سے ایک وہ ہوتی ہے جو رو در رو ہو کر اس سے ٹکر لیتی ہے اور وقت کی تلوار بے نیام کر کے آخر دم  
تک مقابلہ کرتی ہے۔ مگر ایسے فاسد عناصر جو اخلاقی پستی کی وجہ سے بزدلی اور کمینگی کی سطح پر گر چکے ہوتے ہیں  
وہ نفاق کی کمین گاہ میں بیٹھ کر ریشہ دو انیاں کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ مشرکین مکہ کی ردِ عملی حرکت پہلی نوعیت  
کی تھی، مگر مدینہ کے یہود اور ان کے ہم نواؤں نے دوسری پوزیشن اختیار کی۔

تحریکِ اسلامی اب چونکہ ایک ریاست کی صورت اختیار کر گئی تھی اور یہ ریاست سب کی آنکھوں  
کے سامنے نشوونما پارہی تھی۔ اور ہر چہار جانب سے بیدار دل اور متحرک اور عمل پسند افراد کو جن جن کر اپنے  
سامنے لے رہی تھی۔ لہذا مخالف طاقت حسد اور احساسِ کہتری کے خوفناک ردِ عمل کا شکار ہوتی جا رہی تھی  
مگر دلوں ہی دلوں میں جو ابال تھا اس کے لیے بہاؤ کا کوئی راستہ نہ تھا، اور حالات پر اثر اندازی کی کوئی صورت  
ممکن نہ تھی۔ نظریہ اسلامی کے مقابلے میں یہود کے پاس کوئی معقول، سیدھا سادہ، عوام کو اپیل کرنے والا  
اور حرکت پیدا کرنے والا تعمیری نظریہ نہ تھا۔ ان کے پاس کچھ بے جان اور کھوکھلے عقیدے تھے۔ جو ان  
تاریخ کے بہاؤ کو روکنے والے اور انسانی فطرت میں جمود پیدا کر دینے والے تھے۔ ان کے پاس تحریکِ اسلامی  
کے پیدا کردہ اخلاقی کردار کے جواب میں برابر کی ٹکر کا اخلاقی کردار نہ تھا۔ بلکہ وہ کردار کے لحاظ سے انسانیت  
کے کم سے کم مطلوبہ معیار سے بھی گرے ہوئے تھے۔ اور کوئی محرک نہ تھا جو ان کو اس پستی سے اٹھاسکے  
انسانیت کی تعمیر نو کی قرآنی دعوت جو نیا انسان بنا کے لائی تھی، یہودیت کا فرسودہ نمونہ انسانیت اس  
کے سامنے کھڑا ہونے کے قابل نہ تھا، پروپیگنڈہ کے میدان میں غلط فہمیوں اور شرارتوں کا کتنا ہی  
گردوغبار وہ اڑاتے پھرے، لیکن استدلال کے میدان میں وہ زکیت زک اٹھا رہے تھے، پھر وہ اپنے  
آپ کو چاہے کچھ سمجھتے رہیں، تاریخ کی طاقت مسلم تحریک کے ساتھ تھی، اور واقعاتی پیکار گاہ میں یہود  
پر ہر ہر آن کاری ضربیں پڑ رہی تھیں۔ زمانہ ان کو پیچھے چھوڑ کر اسلامی نظریہ حیات کا جھنڈا لہراتا آگے  
ہی آگے بڑھا چلا جا رہا تھا۔ سیاسی لحاظ سے وہ چاہتے تھے کہ اسلامی انقلاب کی شہ رگ کاٹ ڈالیں  
لیکن حلیفانہ معاہدات نے ان کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ اس واقعاتی لفظی میں گھر کر وہ اپنے آپ کو  
بے چارگی و بے بسی کے مقام پر پاتے۔ بے چارگی و بے بسی کے اس احساس نے ان کی سیرت کی بنیادی  
کمزوریوں کے ساتھ مل کر بزدلی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ بے بسی اور بزدلی کے عالم میں آدمی کے اندر کام

کرنے والے حریفانہ جذبات ہمیشہ حسد اور کینہ کی راہ سے اسے نفاق کی کین گاہ تک لے جاتے ہیں وہ مخالف بد سامنے سے وار کرنے کے بجائے پیچھے سے شجون مارتا ہے وہ کھلم کھلا تاخیر و تاراج کے بجائے لقبِ نبی کی اسکیس بنا تا ہے۔ یہود نے بھی اسی بزدلانہ موقف کو سنبھال لیا۔

منافقین کے ذلیل عنصر کے ظہور کے لیے واقعاتی صورتِ حال نے دو اسباب پیدا کر دیے تھے۔ ایک تو وہی یہود اور ان کے ہمنواؤں کا عاسدانہ انتقامی جذبہ برسرِ عمل تھا اور اس جذبے میں چونکہ براہِ راست حملہ کرنے کی طاقت نہیں تھی، اس وجہ سے نفاق کا خفیہ محاذ برسرِ عمل آ گیا۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ اسلام کی برہمتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر بہت سے لوگ اپنا مستقبل بنانے کے لیے اسی چوردروازے سے اندر داخل ہونے لگے۔

اس چوردروازہ کا افتتاح بہر حال یہودی ذہن نے کیا۔ ان کے اچھے اچھے سردار تھے، جو اسلامی جماعت کی صفوں میں اپنے حریفانہ جذبات کو اسلام کے بہروپ میں چھپانے ہوئے داخل ہونے لگے۔ بنی قینقاع میں سے نمایاں مرتبہ کے حسب ذیل بزرگ "پانچویں کالم" کے طور پر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے

(۱) سعد بن حنیف (۲) زید بن نصیت (۳) نعمان ابن اوفی ابن عمرو (۴) رافع بن حرمیلہ (۵) رفاع بن زید بن تابوت (۶) سلسلہ ابن برہام (۷) کنانہ ابن صوریہ۔

ان میں سے زید بن نصیت وہ شخص ہے جو بنی قینقاع کے بازار میں حضرت عمرؓ سے نبرد آزما ہو گیا تھا۔ پھر یہی تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازٹنی کے کھوجانے پر طعنہ دیا تھا کہ "یوں تو آسمان کی خبریں دیتے پھرتے تھے۔ لیکن اتنا پتا نہیں کہ ازٹنی اس وقت کہاں ہے" اس کے جواب میں حضور نے فرمایا تھا کہ "بھلا میرا حال یہ ہے کہ میں بجز اس کے کچھ نہیں جانتا جو کچھ کہ اللہ تعالیٰ مجھے بتا دے، اور اب اللہ تعالیٰ نے مجھے ازٹنی کے بارے میں اطلاع دے دی ہے۔ سو وہ اس وادی میں ہے اور ایک درخت کے ساتھ اس کی باگ الجھ گئی ہے" چنانچہ رفاع تلاش کو گئے تو بالکل یہی صورت واقعہ آنکھوں سے دیکھی۔

ان میں سے رافع بن حرمیلہ کا مقام نفاق اتنا بلند تھا کہ جس دن وہ مرا، تو سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود فرمایا کہ "آج منافقین کے سرخیلوں میں سے ایک سرخیل مر گیا ہے" ایسا ہی مقام رفاع بن زید بن تابوت کا تھا۔ چنانچہ غزوہ بنی عبدالمصطلق سے واپسی پر طوفانِ صرصر اٹھا اور لوگ کچھ گھبرا گئے تو حضور نے تسلی دلاتے ہوئے فرمایا، کہ یہ طوفان منافقین کے ایک سرخیل کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے متحرک ہوا ہے۔ لوگ مدینہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ رفاع کی روح اسی طوفان کی لہروں کے ساتھ پرداز کر چکی

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ منافقین کی صفوں میں جتنے بھی لوگ شریک ہوئے سب کے سب پختہ سال اور خوش حال لوگ تھے۔ ان کے سامنے مفاد تھے اور ان کے مزاج بالعموم غلط جذبات کے سانچے میں ڈھل کر پتھر کی طرح سخت ہو چکے تھے۔ نوجوان طاقت تحریک اسلامی کے ساتھ تھی۔ بروئے تحقیق صرف ایک نوجوان پانچویں کالم میں ملتا ہے جس کا نام قس ابن عمرو بن سہل تھا۔

یہ گروپ اتنا ہی محدود نہ تھا، بلکہ درحقیقت یہ چند حضرات تو پانچویں کالم کے قائد اور سالار تھے یہ اپنے حلقوں سے منافقین بھرتی بھی کرتے، اسلامی جماعت کے اندر سے کمزور افراد کو تلاش کر کے ان کو متاثر بھی کرتے اور ان کو استعمال میں لاتے، شکوک و شبہات پھیلا کر اور مسلمانوں کی مجلسوں میں سنجیدہ معاملات میں استہزاء و تضحیک کے پہلو پیدا کر کے فضا کو خراب کرنے کے درپے رہتے۔ مسجد میں جا کر تمام اہم گفتگوئیں سنتے اور پھر آ کر اپنی مجالس میں رپورٹ کرتے۔ راتوں کو سازشی مجالس میں بیٹھ کر شرارت کے نئے منصوبے بناتے اور نئے نئے طریقوں سے ان کو رُو بعل لاتے۔ یوں تو اپنے انداز و اطوار کی وجہ سے نفاق کا پیدا کردہ یہ بے ڈھنگا کردار نبی اکرم اور مسلمانوں کی نگاہ میں پہچانا جاتا تھا اور ساتھ کے ساتھ ہر مرحلے پر وحی الہی کی روشنی ان کے خیالات، ان کی حرکات اور ان کی کارروائیوں سازشوں بلکہ ان کے مجرمانہ ضمیر کی خاص خاص علامات کو نمایاں کرتی رہتی تھی۔ لیکن ایک موقع پر مسجد نبوی میں ان اکابرین نفاق کی حرکات، حد برداشت سے باہر ہو گئیں مجمع عام میں یہ ٹولی کی ٹولی بالکل الگ دھڑا بنی بیٹھی تھی۔ اور اپنی جگہ الگ کھڑے پھسر کر رہی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر سرور عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو مسجد سے نکل جانے کا حکم دیا۔ بعض بزرگ تو ایسے ہٹیلے تھے کہ ان کو ”پاہ دست دگرے دست بدست دگرے“ کی شان سے نکالا گیا۔ لیکن ان سرخیلانِ نفاق کی خود اپنی مرکزی قیادت عبداللہ بن ابی کی ذات گرامی میں مرتکز تھی۔ یہ شخص جو واقعہ افک میں فتنہ کی بارود کو فتیلہ دکھانے والا ہیرو تھا، اس کی رگ رگ میں اسلامی انقلاب کے خلاف بغض و کینہ کا آتشیں لاوا بھرا پڑا تھا۔ اس لا علاج بغض و کینہ کی بنیاد کیا تھی، یہ اُسید بن حصیر کی زبانی سنیں۔ جنہوں نے غزوہ بنی عبدالمصطلق کے موقع پر عبداللہ بن ابی کی ایک شرانگیزی پر تبصرہ کرتے ہوئے قائدِ انسانیت کی خدمت میں عرض کیا۔

”یا رسول اللہ! اس شخص (کے دکھی جذبات) کی رعایت فرمائیے۔ مدینہ میں جب آپ کا

درد ہوا تھا تو اس موقع پر ہم اس کو بادشاہت کی مسند پر بٹھانے کی پوری تیاریاں کر چکے تھے اور اس کے لیے تاج تیار ہو رہا تھا۔ آپ کی آمد سے اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ بچارا اسی کی جان نکال رہا ہے۔ (تفہیم القرآن - سورہ نور کا دیباچہ)

جن لوگوں کے بنے بنائے کھیل کسی دعوت یا تحریک کے ہاتھوں بگڑ جاتے ہیں اور جن کے مفاد کی کندا ایسے عالم میں ٹوٹتی ہے کہ سامنے دو چار ہی ہاتھ پر لب بام ہوتا ہے، وہ پھر اپنے سینے میں بس بھرے ساری عمر بیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں۔ ایسے شکست خوردہ حریف کبھی معاف نہیں کیا کرتے۔ اسلام کے بارے میں یہی کیفیت تھی۔ جس میں عبداللہ بن ابی اؤل روز سے مبتلا ہو گیا تھا اور مرتے دم تک اسی میں مبتلا رہا۔ اول اول اسلام لے آیا۔ تاکہ اس نئی طاقت کے نظام کے اندر اپنی جگہ بنا سکے اور پھر اس کے اندر سے قدم قدم اُپر اٹھ کر قیادت و اقتدار کی چوٹی تک پہنچ سکے۔ لیکن اس نظام کے اندر سے تو جدھر بھی کوئی راستہ جاتا تھا وہ ایمان اور عمل کے بل پر طے ہو سکتا تھا۔ سو عبداللہ بن ابی کے لیے نفاق کے سوا کوئی دوسرا مقام نہ تھا۔ ابتداءً یہ نفاق مخفی رہا۔ لیکن ایک دن اچانک اس کے دل کا ناسور پھٹ پڑا اور گندہ متعفن مادہ بہنے لگا۔

ہوا یہ کہ حضور پاک سعد بن عبادہ کی بیمار پرسی کے لیے تشریف لے گئے۔ حضور گدھے پر سوار تھے، اور اپنے پیچھے آپ نے اُسامہ بن زید بن حارثہ کو بٹھالیا۔ یہی اُسامہ بتاتے ہیں کہ راستہ میں ایک جگہ عبداللہ بن ابی مجلس جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے گرد قبیلے کے لوگ حلقہ زن تھے۔ سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا گزر ہوا، تو اُسے بڑا لگا اور منہ پھیر لیا۔ حضور قریب پہنچے تو سلام کہا۔ پھر ذرا دیر کے لیے رُکے اور قرآن کا کچھ حصہ پڑھا۔ اور خدا کی طرف دعوت دی۔ خدا کی یاد دلائی۔ اور اس کے غضب سے ڈر دلیا۔ اُسامہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی دم سادھے بیٹھا رہا اور کوئی بات نہیں کی لیکن جب حضور بات سے فارغ ہو کر چلنے لگے تو بڑے گستاخانہ اور بازاری سے انداز میں منہ پھاڑ کے کہا، کہ "اے فلاں! بات کرنے کا تیرا یہ ڈھنگ ٹھیک نہیں۔ اپنے گھر میں بیٹھ اور جو کوئی تیرے پاس جائے تو بس اس کو اپنی بات سنا دیا کر۔ اور جو کوئی تیرے پاس نہ جائے اُسے تنگ نہ کیا کر اور اس کے گھر میں آ کر ایسی دعوت نہ سنا کہ جو اسے ناگوار ہو" دیکھیے ان الفاظ کو، پر کیسے اس انداز بیان کو! لفظ لفظ زہر میں بچھا ہوا ہے۔ اور حرف حرف سے سڑا نڈاٹھ رہی ہے۔ کتنے دل چھیدنے والے بول ہیں۔ کیسے اشتعال دلانے والے جذبات ہیں۔

درحقیقت یہ عبداللہ بن ابی نہیں بول رہا تھا۔ یہ جاہلیت کا ٹٹا ہوا دور تھا جو آنے والے دور

امن وعافیت کے خلاف ول کی بھڑاس نکال رہا تھا۔

اور حضور نے اپنے مقام کی بلندیوں سے پستی کی اس بڑ بڑا ہٹا کو سنا۔ اس کریم النفس ہستی کو غصہ کی بجائے اغلباً رحم ہی آیا ہوگا۔

مجلس میں عبداللہ بن رواحہ بھی موجود تھے جو مسلم جماعت کے رکن تھے۔ ان کی غیرت نے اپنا فرض ادا کیا اور انہوں نے منافق اعظم کو تنک کر جواب دیا۔ حضور کیوں نہ آئیں۔ ہم آپ کو چاہتے ہیں آپ ہمارے گھروں اور ہماری مجلسوں میں آئیں گے ہم آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ ہی کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں سر بلندی عطا فرمائی ہے اور آپ ہی کے ذریعے سے ہدایت عطا کی ہے۔“

اس تجربے سے گزرنے کے بعد قائدِ انسانیت سعد بن عبادہ کے ہاں پہنچے۔ انہوں نے چہرہ کا ایک خاص رنگ دیکھ کر استفسار کیا۔ آپ نے واقعہ بیان کیا۔ سعد نے بھی وہی واقعاتی پس منظر بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مدینہ لے آیا۔ ورنہ ہم اس کے لیے تاج تیار کر رہے تھے۔ آپ نے تو آکر اس کی بادشاہت کا خواب درہم برہم کر دیا۔ مدعا یہ تھا کہ اس کا یہ رد عمل قدرتی ہے اسے کچھ اہمیت نہ دینی چاہیے۔

یہ شخص نفاق کے پورے ڈرامے کا مرکزی ہیرو بن کر تاریخ کے اسٹیج پر کام کرنا رہا! سب سے آگے یہ تھا اس کے پیچھے موٹے موٹے یہودی بزرگ تھے۔ ان کے پیچھے شعوری طور پر نفاق کا کھیل کھیلنے والے عوام تھے۔ ان کے پیچھے ادھ کچرے اور تنگ دل مسلمان تھے۔ اور سب سے آخر میں جاہل اور نا سمجھ یہودی تھے۔ تحریک اسلامی کے خلاف جو بھی رد عملی حرکت نمودار ہوتی تھی اس میں درجہ بدرجہ ان مختلف عناصر کا حصہ ہوتا تھا۔

مدینہ میں مسلم جماعت جن جن مخالفوں اور مزاحمتوں سے دوچار ہوئی، اور سرورِ عالم کو جن جن شرارتوں کے طوفانی ریلوں کا سامنا کرنا پڑا ان سب میں یہود کے زیر اثر نفاق کی اس فاسد طاقت کا بڑا بھاری پارٹ شامل رہا ہے۔ کمانڈر اگرچہ سارے محاذ مخالفت پر یہود کی رہی لیکن جتنے بھی منفی فتنے محسنِ انسانیت کا راستہ روکنے کے لیے اٹھے ان میں عملاً بہت بڑا حصہ مریمانِ نفاق کا تھا۔ جو یہود کے آلہ کار بن کر کام کرتے رہے۔

**مفسدانہ پروپگنڈے کا محاذ :**

جمود پسند فاسد عناصر جب کسی دعوتِ اصلاح و تعمیر سے دوچار ہوتے ہیں تو پھر ہمہ تن ان کے

علمبرداروں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ خود تو کچھ کرنا نہیں ہوتا، اور خدا و خلق کی طرف سے کسی طرح کی ذمہ داریاں تسلیم نہیں ہوتیں۔ اس لیے ساری ذہانتیں اور قوتیں باسانی منفی مصرف میں لگا دی جاتی ہیں۔ یہ عناصر غول بن کر داعیانِ اصلاح و تعمیر کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں، دور بینیں اور خورد بینیں لگ جاتی ہیں۔ اور پیمانے اور مسطر سنبھال لیے جاتے ہیں۔ ہر آن بات بات کا تجزیہ ہوتا ہے۔ ایک ایک واقعہ کا گہرا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ہر معاملے کی چیر بھار ہوتی ہے۔ کوئی ٹیڑھ ادھر سے نکالی جاتی ہے کوئی کچی ادھر سے تلاش کی جاتی ہے اور پھر ڈونڈی پیٹ پیٹ کر اعلان کیا جاتا ہے کہ لوگو! دیکھو یہ گمراہی ہے۔ یہ فساد ہے، یہ کفر ہے یہ اسلاف دشمنی ہے۔ یہ بزرگوں کی توہین ہے یہ اکابر پر تنقید ہے چنانچہ اندھی مخالفت کے نشے میں بہک کر جب کسی بھلے آدمی اور اس کے مفید انسانیت کام کو نقصان پہنچانا مطلوب ہوتا ہے تو پھر ایک طرف ہر بھلی سے بھلی بات کے اندر سے کیڑے نکال کر دکھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف اس کام کے کرنے والوں سے ذرا سا بھی سہو ہو جائے تو بات کا بتنگڑ بنا کر رائے عام کا طوفان اٹھا دیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ زریں مواقع تخریبی عناصر کے لیے وہ ہوتے ہیں جب کوئی بات یا کوئی واقعہ عام لوگوں کے غلط توہمات اور متعقدات اور مستمر رسمیات کے خلاف ہو جائے۔ خواہ وہ بجاٹے خود کتنا ہی برحق اور اقرب الی الصواب کیوں نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ اصلاحی، تعمیری اور انقلابی تحریکوں کو عوام کے بہت سارے مسلمات کے بتوں کو توڑنا ہوتا ہے۔ اس لیے مخالفانہ پروپیگنڈے کے لیے نئے نئے موضوعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہی صورت حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کو یہود کی طرف سے درپیش تھی۔ صبح شام ایک نہ ایک واویلا مچتا رہتا، اور ایک نہ ایک اشتہار بازی ہوتی رہتی۔

### ہوس منصب کا الزام :

کسی علمبردارِ حق کے دامنِ خلوص پر نفسانیت کے دھبے ڈالنے کے لیے مخالفین نے ہر دور میں ایک الزام یہ رکھا ہے کہ یہ شخص کچھ بننا چاہتا ہے۔ کوئی منصب حاصل کرنے کے درپے ہے اپنا کوئی مقام بنانا چاہتا ہے۔ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام کے خلاف یہی پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ لوگ اپنی حکومت جمانا چاہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے خلاف غوغا کیا گیا کہ یہ صاحب تو یہودیوں کا بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح وفدِ نجران کی آمد کے موقع پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف یہودیوں نے ایک پروپیگنڈہ یہ بھی اٹھایا کہ یہ ساری جان ماریاں تو ہیں اس غرض سے ہیں کہ جو مقام عیسیٰ علیہ السلام کا چلا آ رہا ہے وہ آپ کے قبضے میں آ جائے۔ اور عیسائیوں اور

دوسرے لوگوں کو آہستہ آہستہ گھیر کر اپنی پرستش میں لگالیا باٹھے۔ غور فرمائیے، حضور نے اس طرح کا کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا۔ ایسے منصب کی طلب کا اشارہ تک نہیں دیا تھا۔ لیکن مخالف طاقت نے خود ہی اپنے ذہن سے ایک طومار گھڑ لیا اور اپنی جگہ طے کر لیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد تو یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بن کر پوجا کر ائیں۔ دعویٰ نہ کیا ہو تو نہ سہی، دل میں اسی کے ارادے ہیں۔ ابھی، یہ ارادے سامنے نہیں آتے تو کیا ہوا۔ آثار بتا رہے ہیں کہ کبھی نہ کبھی یہ سامنے آکر رہیں گے وفدِ نجران کے ارکان کے کان ان فضویات سے بھرے گئے ہوں گے۔ جمعی تو اس وفد کے ایک رکن ابو نافع قرظی نے یہ سوال حضور سے کھلم کھلا دریافت کیا کہ کیا آپ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی اس طرح پوجا کریں جیسے نصاریٰ علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں؟ وفد کے ایک دوسرے رکن ابوبیس (یا الریس یا الریس) نے بھی پوچھا کہ: "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا آپ ہم سے یہی چاہتے ہیں اور اسی کے لیے دعوت دیتے ہیں؟" آپ نے جواب دیا: "خدا کی پناہ اس بات سے کہ میں خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کروں یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کی دعوت دوں پس مجھے خدا نے اس مقصد کے ساتھ نہیں اٹھایا ہے اور نہ مجھے اس کا حکم دیا ہے" قرآن بھی اس موقع پر پکار اٹھا کہ "کسی انسان کا یہ منصب نہیں ہے کہ خدا سے کتاب اور حکمت اور نبوت سے سرفراز کرے تو پھر وہ لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ اللہ کے بجائے میرے بندے بن جاؤ"۔

### مسلمہ مذہبی شعائر کی بے حرمتی کا الزام :

قائدِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کر کے چلے آنے پر مکہ میں انتقامی جذبات نے نئی کروٹ لینی شروع کر دی تھی۔ اور برابر جنگی کارروائی کے لیے سوچا جا رہا تھا۔ ان کے جاسوس، مدینہ کے اطراف میں گھومتے تھے، ان کا سلسلہ نامہ و پیام خفیہ طور پر یہود مدینہ کے ساتھ شروع ہو چکا تھا، اور ان کے فوجی دستے وقتاً فوقتاً اسلامی ریاست کے حدودِ اثر تک پہنچنے لگے تھے۔ اس کے جواب میں اسلامی ریاست نے بھی اپنا نظام دید بانی برسر عمل کر دیا۔ فوجی اور غیر فوجی پارٹیاں گشت کے لیے نکلتیں اور قریش کے جاسوسوں اور فوجی دستوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتی رہتیں۔ مدینہ اپنی اس نقل و حرکت سے قریش کو ایک طرف یہ احساس دلانا چاہتا تھا، کہ ہم سوئے نہیں پڑے ہیں اور ساتھ ہی یہ اندیشہ دلانا بھی مقصود تھا کہ اگر تم نے امن کی فضا کو خراب کر دیا تو پھر تمہارے تجارتی قافلوں پر یہ شاہراہ بند ہو جائے گی۔



اسی نذر دید بانی کے تحت رجب ۲ھ میں آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ قریش کی قتل و حرکت اور ان کے آئندہ منصوبوں کا جائزہ لینے کے لیے قائد انسانیت نے روانہ فرمایا۔ اس دستہ کو کسی جنگی کارروائی کا مجاز نہیں مٹھرایا گیا تھا۔ لیکن ان کی مڈ بھیر قریش کے ایک چھوٹے سے تجارتی قافلے سے ہوئی تو اس عالم تقابل میں باہمی ذہنی کھچاؤ ایسے نقطہ تک جا پہنچا کہ اسلامی ریاست کے دستے نے حملہ کر کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ بقیہ کو گرفتار کر کے مال و اسباب سمیت مدینہ لے آئے۔ یہ واقعہ چونکہ رجب کے خاتمے اور شعبان کے آغاز کے دوران میں کسی وقت ہوا تھا اس لیے اشتباہ و التباس کے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف مکہ کے مشرکین نے اور دوسری طرف مدینہ کے یہود و منافقین نے پروپیگنڈہ کا طوفان کھڑا کر دیا۔ انہوں نے اس واقعہ کو قطعی طور پر شعبان سے متعلق کر کے عوام کو اشتعال دلانے میں پورے زور سے کام لیا۔ وہ کہتے پھرتے تھے کہ یہ لوگ چلے ہیں بڑے اللہ والے بن کر اور حال یہ ہے کہ ماہ حرام تک میں خونریزی سے نہیں چوکتے، اس پروپیگنڈہ کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں بہت ہی نقصان نہ تھا۔ یہ مختصر سی نوخیز طاقت جو چاروں طرف سے دشمنوں اور خطروں میں گھری تھی اور جس کے لیے کسی بھی فرد اور کسی بھی عنصر کی حمایت بڑی قیمتی تھی، اس کے بارے میں عرب میں اس نافرمانی کا پھیل جانا کہ وہ حرام مہینوں کا احترام ختم کیے دے رہی ہے درآنحالیکہ اس حرکت پر ہی عرب کے دینی اور معاشی نظام کا دار و مدار تھا۔ اس کے حمایتیوں کو اس سے کاٹ کر اس کے مخالفوں میں دھکیل دینے والا تھا۔ پھر چونکہ اس معاملے کا تعلق عوام کے نازک مذہبی جذبات سے تھا۔ اس لیے یہ وجہ اشتعال بھی تھا۔ خصوصیت سے یہ پروپیگنڈہ مسلمانوں کی خدا پرستی اور دینداری اور اخلاقی لحاظ سے ان کے ذمہ دارانہ پن پر ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتا تھا۔

نخلہ کا یہ ایک حادثہ ایک اور وجہ سے خود اسلامی ریاست کی نگاہ میں ناپسندیدہ قرار پایا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دستے کو کسی طرح کے تصادم کا اختیار نہیں دیا تھا۔ بغیر باضابطہ اختیار کے اس دستے نے ایک ایسا قدم اٹھا دیا جو اسلامی ریاست کے اس پورے منصوبے کو متاثر کرنے والا تھا، جو حفاظت اور دید بانی کی غرض سے پیش نظر تھا اور جس کے مطابق بڑی احتیاط سے ہر کارروائی کی جا رہی تھی۔ اب چونکہ نخلہ کا حادثہ سرے سے ایک بے ضابطہ اور غیر قانونی کارروائی تھی، لہذا ان حضور نے متعلقہ افراد سے سختی سے باز پرس کی اور ان کی تادیب کی، اور گرفتار شدہ جنگی

قیدیوں کو قبول کرنے اور ان کے اموال کو بیت المال میں لینے سے انکار کر دیا۔  
 اسلامی ریاست نے اپنے نظم کے تحت اس بے ضابطگی پر جو کارروائی مناسب تھی وہ تو اپنی  
 جگہ کر دی۔ لیکن مخالفین نے مفسدانہ پروپیگنڈے کا جو طوفان اٹھا دیا تھا اس کا مقابلہ زیادہ مضبوط اور  
 مدلل اور اخلاقی اثر رکھنے والے صاف ستھرے پروپیگنڈے سے کیا۔ خود اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس  
 کا جواب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان الفاظ میں دلویا کیا :-

” لوگ پوچھتے ہیں کہ ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ اے پیغمبر کہتے ہیں کہ اس میں لڑنا  
 بہت بُرا ہے۔ مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجدِ حرام  
 کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکانا اللہ کے  
 نزدیک اس سے بھی زیادہ بُرا ہے! — اور فتنہ خوزیری سے شدید تر ہے!“

(البقرہ - ۲۱۷)

صاف معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے مخالفین کے اس طوفانی پروپیگنڈے سے جو اسلامی جماعت  
 کے ارکان متاثر ہوئے اور پریشانی میں مبتلا ہو کر انہوں نے سوالات کیے کہ ماہِ حرام میں جنگی کارروائی  
 کرنا اسلامی نظریہ و قانون کی روشنی میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ جن لوگوں پر نیکی اور صلح پسندی کا ایک غیر  
 متوازن تصور زیادہ پر تو انگن تھا اور جو ذرا سی مخالفت سے گھبرا اٹھتے تھے، ان کو خاص طور پر تشویش  
 ہونے لگی تھی کہ کہیں ہم روحِ دین اور جو ہر تقوے کو ہاتھ سے دیتے تو نہیں جا رہے اور کہیں ہم سیاست  
 زدہ ذہن کے تحت اپنے اصل مقصد سے دور جا کر عام لوگوں کو خود ہی تو دور نہیں دھکیلتے جا رہے۔  
 سو اس طرح کے افراد کی پریشانی غیر معمولی نوعیت رکھتی تھی ان کا دلی اطمینان متزلزل ہو چلا تھا۔ لہذا  
 وہ خصوصیت سے اس معاملے میں اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سوالات کے پیچھے یہ ذہن خاص طور  
 پر متحرک تھا۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے دشمنانِ تحریک کو بھرپور جواب دیا گیا۔ فرمایا کہ مشرکین مکہ جو  
 خود تو راہِ خدا سے روکنے اور اللہ سے کفر کرنے اور زائرینِ حرم کا راستہ روکنے اور باشندگانِ حرم کو  
 حدودِ حرم سے تنگ کر کے نکالنے کے مجرم ہیں، اب وہ ماہِ حرام کی حرمت کے محافظ بن کر کس منہ سے  
 میدان میں آ رہے ہیں۔ اس میں یہود اور منافقین کے لیے یہ خطاب مضر تھا کہ تم جو اہل مکہ کے ان سارے  
 مظالم اور دینی شعائر کی حرمتوں کو توڑ دینے والی کارروائیوں میں منہ میں گھنگنیاں ڈالے پڑے رہے ہو، اور  
 آج بھی تم کو اس بارے میں کچھ احساس نہیں ہے، واقعہ نخلہ کے سلسلے میں مسلمانوں کی ایک ایسی اتفاق  
 کا ردوائی پرکاش ہے کو نگہدارِ شعائر بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہو جس کے لیے نظامِ ریاست کی طرف سے

بقاعدہ اجازت نہیں دی گئی بلکہ چند افراد کی نادانی سے ایک اقدام ہو گیا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں  
کو قبول کرنے سے ریاست کے سربراہ نے انکار کر دیا۔ اور متعلقہ افراد کو سخت تادیب بھی کر دی۔  
اس واقعہ کے تاریخی آئینے میں دیکھا جاسکتا ہے کہ اہل حق کے دشمن کس طرح گھات لگائے  
بیٹھے رہتے ہیں کہ کہیں سے ان کو کوئی رخ نہ ملے اور وہ اس سے حملہ کر دیں اور کہیں کوئی سہو اور بے احتیاطی  
کام کرنے والوں سے سرزد ہو اور وہ فوراً اس کو دنیا بھر میں اپنی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ اچھال دیں۔  
جہاں ہر ہر لمحہ ہر ہر معاملے میں اس طرح غلط فہمیوں اور بدگمانیوں اور اشتعال انگیزیوں کے طوفان  
اٹھائے جاتے ہوں گے، وہاں اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ دشمنوں میں گھری ہوئی تھی سی ریاست اور اس کو  
وجود میں لانے والی انقلابی تحریک اور اس تحریک فلاح انسانیت کے قائد پر کیا گندقی ہوگی۔ شکوک و شبہات  
شر پسندانہ اعتراضات اور کارکنوں کو ذہنی طعنے پر الجھا دینے والے سوالات فضا میں بھنگوں کی طرح اڑتے  
پھرتے ہوں گے اور زمین پر برسات کے کیرٹوں کی طرح ہر طرف رینگتے دکھائی دیتے ہوں گے۔ لیکن  
بھنگوں اور کیرٹوں کی نقل و حرکت نے کبھی کسی اصول و کردار رکھنے والی طاقت کے فاتحانہ اقدام کو  
روکنے میں کامیابی نہیں حاصل کی۔

### دین کے پردے میں نفسانیت کا الزام :

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اسلام کی نافذ کردہ اصطلاحات میں سے ایک ایک پر یہودی مولویوں اور  
مفتیوں نے نامعقول قسم کے ہنگامے بپا کیے تھے۔ بہت بڑی اصلاح منہ بولے بیٹوں کے مقام اور  
حقوق کے سلسلے میں نافذ کی گئی۔ چنانچہ اس پر مخالفانہ پروپیگنڈے کا ہنگامہ بھی زور شور کے ساتھ  
اٹھایا گیا۔

ایک اہم تاریخی روایت سابق مذہبی و معاشرتی تصورات کے مطابق یہ چلی آرہی تھی۔ کہ متبشی  
(منہ بولے بیٹے) کی مطلقہ سے حقیقی بہو کی طرح نکاح کرنا ناجائز ہے۔ اس روایت کو ختم کرنے کے  
لیے مشیت الہی نے واقعات کو بڑی عجیب و غریب صورت سے نشوونما دی اور پھر ایک انقلابی نتیجے  
تک پہنچایا۔ تو ایہ کہ زید جو دس برس کی عمر میں غلام بن کر بکے تھے۔ اور جن کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم  
نے خرید کر اپنے سایہ شفقت میں لے لیا تھا، وہ حضور کے گھر میں متبشی کی حیثیت رکھتے تھے۔ بعد میں  
زید کے باپ اور بھائی ان کو لینے آئے اور حضور نے اذن بھی دیا۔ کہ چاہو تو جا سکتے ہو لیکن زید کو آپ  
سے اب اتنی گہری محبت ہو چکی تھی کہ اس رشتے کا ٹوٹنا گوارا نہ ہوا۔ چونکہ اصلاً اشراف عرب میں سے  
تھے اس لیے مکہ کے کچھ بزرگوں نے جناب زینب (حضور کی پھوپھی زاد بہن) کو ان کے نکاح میں دینا

تجویز کیا۔ لیکن زینب کے بھائی اس رشتہ پر راضی نہ ہوئے، کیونکہ نکاح کے لیے جو معیار اور پیمانے اس ماحول میں رائج تھے، ان پر یہ جوڑا پورا نہیں اترتا تھا۔ جاہلی ذہن کی نگاہ میں حضرت زینب کے دامن حیات پر گویا غلامی کے دھبے کا اثر بھی باقی تھا۔ اور پھر ان کی بے سرو سامانی، بجائے خود ایک نقص تھی۔ اسلام آیا تو اس نے اس ذہن کو بھی بدلنا ضروری سمجھا اور محسن انسانیت نے خاندانی امتیازات کی روکیں نکاح و ازدواج کے راستے سے ہٹا کر پورے اسلامی معاشرے کو ایک خاندان میں بدل دینے کی کوشش فرمائی۔ چنانچہ فی الواقع یہ دیواریں قطعی طور پر پڑھے گئیں اور ”کفو“ کا ایک نیا مفہوم پیدا ہو گیا۔ آپ نے بڑی تاکید سے لوگوں کا ذوق نگاہ بدلا۔ اور ان کو سکھایا کہ عورتوں کو نکاح میں لینے کے لیے مرتبہ اول پر ان کے دین اور کردار کو دیکھو۔ باقی چیزوں کا لحاظ بعد میں ہے۔ ایک موقع پر تو یہ بھی فرمایا کہ اگر دین و کردار کے بجائے کوئی دوسرا معیار اختیار کرو گے تو معاشرت میں بڑا فساد واقع ہو جائے گا۔ اس طرح ”کفو“ کا نیا تصور یہ بنا کر ازدواجی جوڑا اس لحاظ سے بنا چاہیے کہ اصل مقصد زندگی میں کون بہترین ساتھی بن سکتا ہے اور کس کے ساتھ ذہنی اور ذوقی سازگاری زیادہ سے زیادہ ممکن ہے۔ اور بے شمار بلکہ اکثر شادیاں اسی نئے رجحان کے مطابق عملاً ہونے لگیں۔ اس ذہنی معاشرتی تبدیلی کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ حضرت ابو طلحہؓ نے زمانہ کفر میں حضرت ام سلیمؓ کو نکاح کا پیغام بھیجا۔ وہ آنحضرتؐ کو صوفہ اسلام لاجکی تھیں۔ انہوں نے جواب میں کہلا بھیجا کہ تم بھیرے کافر اور میں ہوں کہ اسلام لاجکی ہوں۔ اب دو متضاد زندگیاں کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔ ہاں اگر اسلام قبول کر لو، تو میں تم سے۔۔۔ بھتر قبول اسلام کے اور کوئی مہر بھی نہ لوں گی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رشتہ خود ام سلیمؓ کو بھی مرغوب تھا، لیکن اسلام نے ایسا انقلابی رجحان پیدا کر دیا تھا کہ انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر انکار کر دیا۔ مگر ساتھ ہی ترغیب اسلام بھی دلا دی۔ آخر ابو طلحہؓ اسلام لے آئے۔ نکاح ہوا اور فی الواقع ان کا اسلام ہی مہر قرار پایا۔ (موطائے امام مالکؒ)۔ غرضیکہ معاملہ ازدواج میں ذوق اور معیار کی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ پھر بھی کچھ رکاوٹیں باقی تھیں۔ انہی کے سبب حضرت زینبؓ کے بھائی مجوزہ نکاح پر تیار نہ ہوئے۔ حضورؐ بھی چاہتے تھے کہ یہ نکاح ہو۔ لیکن جب اس میں مجرد ایک جاہلی رجحان رکاوٹ بنا تو یہ چیز خدا اور رسول کی نگاہ میں ناپسندیدہ قرار پائی۔ اس سلسلے میں اشارۃً سورۃ احزاب میں گرفت کی گئی، ملاحظہ ہو آیت اِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ . . . اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (آیت ۲۵)

۱۔ ملاحظہ ہو اسوۃ صحابیات از مولانا عبدالسلام ندوی صفحہ ۲۸

اس آیت کی اسل سپرٹ یہ ہے کہ اسلامی نظریہ اور اسلامی ذہن اور اسلامی کیریئر رکھنے والے مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ہمسر اور ہم دوش ہیں۔ اور ان میں قرابت و موثرت ہے، یہ ایک دوسرے کے لیے قابلِ قدر ہیں۔ کجا کہ ان کے بیچ میں خاندانی امتیازات اور فضل و شرف کے جاہلی تصورات آ کے حائل ہوں۔ مگر اشارہ بس اتنا ہی نہیں تھا اگلی آیت بڑی سخت تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کو کسی شکل میں طے کر دیں تو پھر کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ پھر اس فیصلے کے مقابلے میں اپنی پسند و ناپسند اور اپنے معیارات کو کوئی اہمیت دے اس طرح سے جو لوگ خدا اور رسول کی نافرمانی کرتے ہیں تو وہ بہت دور تک بھٹک گئے (احزاب ۳۶) مطلب یہ تھا کہ جب ایک مسلم اور مسلمہ کے درمیان رشتہ ازدواج کے قیام کے لیے دروازے کھول دیے گئے ہیں تو اب اپنے راستے میں پرانے جاہلی تصورات کو اہمیت دے دے کر حائل کرنا خدا و رسول کی رہ نمائی اور ان کے فیصلوں کے مقابلے میں ایک طرح کی خود سری ہے اور ایسی خود سری مگر ای پر منتج ہوتی ہے چوٹ بڑی سخت تھی۔ اور ٹھیک نشانے پر لگی۔ زینب کے بھائی ان آیات کو سن کر اشاروں میں بات کو پاگئے اور نکاح کے لیے تیار ہو گئے۔ گویا شرف و ذلت کے جاہلی معیار کی زنجیر ٹوٹ گئی۔

اللہ تعالیٰ نے اسی واقعے کے ذریعے متبہنی کے بارے میں غلط تصورِ راجح کو بھی توڑنے کا ارادہ فرمایا۔ بعد میں ہوا یہ کہ زوجین میں سازگاری نہ ہو سکی اور اس میں وہ تفاوت موثر ہوا جو بطور ایک واقعے کے فریقین میں موجود تھا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایات آنے لگیں لیکن معاملات سلجھنے کے بجائے بگڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ بالآخر زینب کو طلاق دینے کا ارادہ آپ کے سامنے ظاہر کرنے لگے۔ اس پر آپ کو بڑی توجہ ہوئی کہ ایک ایسا نکاح ٹوٹ رہا ہے جو معاشرے میں ایک نئی انقلابی مثال قائم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ نیز اس میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک اور مشورے کو بڑا دخل تھا اور آپ ہی چونکہ زینب کی طرف سے ولی تھے اس لیے آپ کی بڑی ذمہ داری تھی۔ آپ نے بار بار اس رابطے کو بچانے اور حضرت زینب کو طلاق سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن آخر کار یہ ساری کوشش ناکامی کی سرحد کو پہنچی — اور جس طرح کی شکایات پیدا ہو گئی ہونگی ان کے ازالے کی ایک ہی صورت ممکن تھی اور وہ یہ کہ آپ خود زینب کو اپنے نکاح میں لے لیں۔ شریعت میں پوزیشن بالکل صاف تھی اور اس معاملے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی لیکن سابق جاہلی تاثرات کے تحت اندیشہ تھا کہ لوگوں کو اچنبھا ہوگا اور ساتھ ہی مخالفین پر دباؤ

کا ایک موضوع پالیں گے لیکن مرضی الہی یہ تھی کہ زمانہ جاہلیت سے متبثی کی جو غلط پوزیشن چلی آرہی تھی اس کی نفی خود آپ ہی کے فدیعے پوری ہدایت و صراحت سے کر دی جائے تاکہ اس رسمیت کی جڑ بالکل کٹ جائے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے مخفی خیال اور فکر کو اٹھا کر برسر عام رکھ دیا۔ فرمایا :

وَتَخْفَىٰ فِي نَفْسِكَ مَا لَمْ يَكُن مَبْدِيَهُ وَتَخْشَى النَّاسَ (احزاب، ۳۷) انداز تنبیہ کا ہے۔ تم اپنے دل کے پردہ خفا میں وہ بات لیے ہوئے ہو جسے اللہ کھول دینے والا ہے۔ . . . . اور تم لوگوں سے اندیشہ کرتے ہو، یعنی ایک بات جو خدا کی شریعت میں روا ہے اسے لوگوں کے جاہلی تصورات کے اندیشے سے دل میں چھپائے رکھنا اللہ کو ناپسند ہے۔ اسے سامنے آنا چاہیے اور اس کو واقع ہونا چاہیے تاکہ لَا يَكُونَنَّ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ حَسْرَةٌ فِي أَزْوَاجِهِمْ إِذْ أَقْسَمُوا مِثْمَنًا وَطَرًا۔ (یضاً، ۳۷)

مقصود اس سے یہ تھا کہ منہ بولے بیٹوں کے بارے میں وہ غلط فہم جو لگی چلی آرہی ہے۔ وہ مسلمانوں کے اوپر سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جائے۔ اسی زنجیر جاہلیت کو کاٹنے کے لیے بھرپور ضرب لگانے کی یہ شکل اختیار کی گئی کہ حضور سے حضرت زینب کا رشتہ نکاح خود اللہ تعالیٰ نے بطور خاص قائم فرمادیا۔ بس اس واقعہ کا ہونا تھا کہ مدینہ کے دشمنانِ حق کے حلقوں میں کھلبلی مچ گئی۔ یہ لوگ پروپیگنڈا کرنے لگے کہ دیکھا، یہ مذہبیت و تقدس کا ڈھونگ! منہ بولے بیٹے کی مطلقہ سے شادی رچالی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زیب داستان کے لیے انسانے بھی گھڑ لیے گئے۔ منہ پھٹ بیود اور منافقین نے یہ چرچا کیا کہ دلخوذاً اصل میں تو بہو پر عاشق ہو گئے تھے۔ اسی لیے طلاق دلوائی اور پھر نکاح گانٹھ لیا۔

لہٰذا واضح رہے کہ زمانہ حال کے متعصب مستشرقین نے تاریخ کے اوراق سے وہ سارا گندامواد امن میں بھر دیا ہے۔ جو تحریک اسلامی کے معاندین نے پیش کیا تھا۔ چنانچہ خود یہ واقعہ بھی ان اصحاب دانش و تحقیق کے ہاں ایک مقبول ترین موضوع بحث بنا اور اس کو خوب نمک مرچ لگا لگا کر کتابوں کے اوراق پر پھیلا دیا گیا۔ ایک گھٹیا اور بازاری قسم کا افسانہ مکمل کر کے سامنے لایا جاتا ہے جس کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ حضور کی نگاہ اتفاقاً زینب پر پڑ گئی اور جذبات بے قابو ہو گئے۔ ذرا سوچو کہ وہ شخص جو بے داغ جوانی کو لیے ہوئے ہم وقت مصروف رکھنے والی جدوجہد میں ساری عمر منہمک رہا۔ اور جسے چین کا سانس لینا کبھی نصیب نہ ہوا۔ اس کا کردار میں پختگی کے نقطے پر پہنچ کر بس یہی کچھ رہ گیا تھا کہ اس کا دل اس کی آنکھوں کی پیکوں پر دھرا ہوا ہو۔ کیا یہ الزام اس کے مجموعی کردار میں کھپ سکتا ہے۔ پھر حضرت زینب حسرت کی پھوپھی کی لڑکی تھیں اور بچپن سے آپ کے سامنے کھیلیں اور جوان ہوئیں۔ ان کا وجود کوئی نیا انکشاف جس تھا پھر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ آپ نے خود بڑے اصرار سے حضرت زینب کے ساتھ ان کا نکاح کرایا تھا اور اس نکاح میں آپ زینب (باقی صفحہ پر)

نکاح بھی ایسا ویسا نہیں، آسمانوں پر منعقد ہو گیا۔ اس نکاح کے لیے زمین ہموار کرنے کو اپنے مطلب کی وحی بھی نازل کرالی۔ اس سے پہلے اب تک اعتقادی اور کلامی اور فقہی امور میں مخالفانہ ہر نہہ سرایشیاں تھیں، مگر اس واقعہ کے سلسلے میں توضیح معنوں میں گنداپروپیگنڈا کیا گیا ہے اور محقق انسانیت کے اخلاقی مرتبے پر ہتہ بولا گیا۔ ظاہر بات ہے کہ کسی تحریک تعمیر و اصلاح کے لیے سب سے زیادہ کاریاں اخلاقی پہلو ہی سے ہو سکتا ہے کسی صاحب دعوت کے بارے میں اگر مخالفین یہ غوغا آرائی کرنے لگیں کہ وہ بندہ ہوس ہے، وہ اپنی خواہشات نفس کے لیے ہر طریقے سے کار بر آری کر سکتا ہے۔ اور وہ کسی اخلاقی معیار کا احترام کرنے پر تیار نہیں تو اس سے بڑھ کر تعمیری کام کو نقصان پہنچانے والا حملہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بڑی آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مدینہ میں دشمنانِ حق نے کتنی گندگی اس واقعہ پر پھیلائی ہوگی۔ کتنی سڑاند پیدا کر دی ہوگی۔ اور انسانیت کے سب سے بڑے خیر خواہ پر کئی روز تک کیسی سخت کرب کی گھڑیاں گزری ہوں گی۔

یہود کا یہ پروپیگنڈا بے چارے مسلمانوں کے لیے بھی بے حد پریشانیوں کا موجب ہوا ہوگا۔ ان کو راہ چلتے چھیرا جاتا ہوگا۔ ان پر فقرے کسے جاتے ہوں گے۔ اور ان کو شہادت کے چکر میں ڈالا جاتا ہوگا۔ ان میں وہ مسلم بھی تھے جو اپنے کچے پن کی وجہ سے گھبرا اٹھتے ہوں گے۔ ان میں منافق بھی گھسے پڑے تھے اور وہ اپنے بن کر عجیب طرح کی دورنگی باتیں کرتے ہوں گے۔ اس حالت میں مسلمانوں کی تسکین اور تربیت کے لیے اللہ تعالیٰ نے چند حقائق ان کے ذہن نشین کرائے۔ ان کو بتایا کہ بنی پر کسی ایسی بات میں کوئی معنائقہ نہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے طے کر دیا ہو۔ (احزاب - ۱۳۸) اس اقدام کا مقصد بھی واضح کر دیا کہ مسلمانوں کے لیے منہ بولے بیٹوں سے نکاح کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے (احزاب - ۳۷) یہ اعلان بھی کر دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ (احزاب - ۴۰) آخر میں خود حضور سے خطاب فرما کر کہا، کہ کافروں اور منافقوں کی نہ مالو اور ان کی دلائل اربوں کو بالائے طاق رکھ دو۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ اور اللہ ہی کار سازی کے لیے

رہتیہ صغیر گزشتہ) کی طرف سے دلی تھے حالات کی یہ ساری ترتیب کیا اس افسانہ کے لیے واقعی کوئی بنیاد فراہم کرتی ہے جسے مدینہ کے یہود و منافقین نے پروپیگنڈہ کے مواد کا ایک بم بنانے میں بطور مسالہ استعمال کیا تھا۔ اور اب اس مسالے کو دوبارہ مستشرقین اسلام کے خلاف استعمال کر رہے تھے؟ کیا یہ باتیں عقلیت (Rationalism) اور تحقیق (Research) کے دعویداروں کے اپنے معیارات پر پوری آتی ہیں؟

کافی ہے۔ (احزاب - ۴۸) اس سنجیدہ اسلوب سے اس مکروہ اور گندے پروپیگنڈے کا جواب دیا گیا جو یہود کی طرف سے حدودِ جہ کی ذمہ داری کے ساتھ اٹھایا گیا تھا۔

### ایک اور گندے بہتان کا طوفانِ عظیم :

اوپر کے واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ تحریکِ اسلامی کے نظریہ و نصب العین پر جب کسی طرف سے بھرپور وار کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ تو اس کی پیٹھ میں چھرا بگھونپنے کا بہترین طریقہ شیطان کی نگاہ میں یہی رہ جاتا ہے۔ کہ اس کے علمبردار کی شخصیت اور اس کی قیادتِ عقلی کے دامنِ تقدس پر گندگی کے چھینٹے ڈال دیے جائیں۔ سو ایک موقع پر اقتدارِ طلبی کا اور دوسرے موقع پر نفسانیت کا گھناؤنا الزام اس کے خلاف اچھال دیا گیا۔ اب یہ سلسلہ اور آگے چلتا ہے اور اسلامی تحریک کے قائدِ اعلیٰ کے حرم کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ جو ساری اُمت اور ساری انسانیت کے لیے معاشرتی و اخلاقی لحاظ سے مرکزی نمونہ ٹھہرایا گیا تھا۔ اسی حرم کے گرد نئی اسلامی معاشرت کا چھتہ تیار ہو رہا تھا۔ اور اس چھتے کو برباد کرنے کے لیے کارگر ترین واروہی ہو سکتا تھا جو اس کے مرکز پر کیا جائے۔ منفی تخریبی طاقت نے یہ آخری وار بھی کر ڈالا۔ اس مخالفانہ وار کی دردناک داستان واقعہ انک کے عنوان سے قرآن، سیرت اور تاریخ کے دفتروں میں عبرت اندوزی کے لیے محفوظ ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اصل واقعہ کی حقیقت سامنے لائیں، یہ بات واضح کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اتنے گندے بہتان کا طوفانِ عظیم آخر اسلامی تحریک کے پیدا کردہ صالح معاشرے اور تربیت یافتہ نظامِ جماعت میں اٹھ کیسے سکا؟ کن رخنوں سے یہ طوفانِ تنظیم کے قلعے میں داخل ہوا اور کیسے اسے کچھ دیر کے لیے ہولناک اتار چڑھاؤ پیدا کرنے کا موقع ملا۔

### فتنہ آرائی کے لیے سازگار فضا :

شیطان کو اسلامی نظامِ اجتماعیت میں تخریب و انتشار کے ہنگامے کھڑے کرنے کے لیے بہر حال ایک خاص فضا کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ فضا چاہے جماعت کے نظم و اخلاق کی کسی کوتاہی کی وجہ سے موجود ہو جائے یا حالات کی پیدا کردہ ایک مجبوری کے طور پر پائی جائے، بہر حال فتنہ انگیزی کچھ صورتیں ہیں جو پوری ہو جائیں تو شیطان کا کید کچھ گل کھلا سکتا ہے۔ نظامِ مشیت جس نقشے پر گامزن ہے اس میں شیطان کے لیے کام کرنے کے مواقع کسی نہ کسی حد تک ضرور ہی باقی رہتے ہیں۔ خواہ کیسی ہی مثالی سوسائٹی کیوں نہ موجود ہو، درحقیقت انسانی فطرت میں ایسی کمزوریاں موجود ہیں کہ جن کے راستے فتنہ کا سیلاب در آتا ہے۔ نبی کی پیدا کردہ جماعت کے بارے میں بھی یہ گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ اس کے



دائرے میں فتنے کی طاقت کو کام کرنے کا سرے سے موقع ہی نہیں ملے گا۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے تندرست سے تندرست آدمی بھی کبھی نزلے، زکام یا بخار میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ایک پاکیزہ سے پاکیزہ معاشرہ کو بھی حالت مرض پیش آ سکتی ہے۔ ایک زندگی سے بھرپور اچھے معاشرے سے توقع یہی کی جا سکتی ہے کہ وہ مرض کی مدافعت کرے، کرتا ہی نہ دکھائے گا اور حمد اور جراثیم کو ہلاک کر کے باہر پھینک دے گا۔ مگر یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اس میں کوئی مرض کبھی پیدا ہی نہ ہوگا۔

شیطان کے لیے ایک نظامِ جماعت میں سازگار ترین فضا نجویٰ کی فضا ہوتی ہے۔ نجویٰ سرگوشی کو کہتے ہیں، کسی اجتماعی نظام میں نجویٰ کے اصطلاحی معنی یہ ہوتے ہیں کہ پوری جماعت کے سامنے کھلم کھلا اپنے خیالات، مشوروں، تنقیدوں اور اعتراضوں کو پیش کرنے کے بجائے متفرق افراد علیحدگی میں بیٹھ کر کھچڑی پکائیں۔ نجویٰ درحقیقت اجتماعی زندگی میں ایک بڑے راستے کی طرف پیش قدمی کا آغاز ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ہوتی ہے۔ تبھی کھلے بندوں کام کرنے سے آدمی کتراتا ہے اور سامنے آنے سے پہلے چپ چپاتے کھچڑی پکانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی چیز آخر کار سازش کی شکل اختیار کرتی ہے۔

بدقسمتی سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں چلتی ہوئی تحریک کے اندر یہود کی سرپرستی میں منافقین نے نجویٰ کی یہ فضا پیدا کر دی تھی اور یہ برابر تحریک کے قائد اور کارکنوں کو پریشان کرتی رہی۔ قرآن اس فضا کے بنانے والوں کو بھی درسِ اصلاح دیتا رہا۔ اور اسلامی نظامِ جماعت کے کارفرماؤں کو بھی اس کے بارے میں برابر انتباہ دیتا رہا۔ وہ پکارا۔

”کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ جن لوگوں کو سرگوشیاں کرنے سے باز آنے کو کہا گیا تھا وہ پھر وہی حرکت کر رہے ہیں۔ جس سے انہیں روکا گیا تھا۔ اور وہ آپس میں بدی اور سرکشی اور رسول کی نافرمانی پر خفیہ مشورے کرتے پھرتے ہیں“ (مجادلہ - ۸)

”اے ایمان والو! جب کبھی تم علیحدگی میں باہم مشورے کرو تو بدی اور سرکشی اور رسول کی نافرمانی کے منصوبے بنا نہ دو۔ بلکہ نیکی اور تقویٰ کے لیے مشورے کرو“

(مجادلہ - ۹)

”یہ خفیہ مشورے شیطانی کام ہیں تاکہ وہ ایمان لانے والوں کو پریشان کرے حالانکہ بغیر اللہ کے اذن کے کوئی بھی چیز ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی“ (مجادلہ - ۱۰)

یہ سرگوشیاں کرنے والے، لوگ انسانوں کی نگاہ سے تو اوجھل رہ سکتے ہیں، مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے۔ حال یہ ہے کہ جب رات کی تاریکی اور تنہائی کے پردے میں

وہ ایسی کوئی بات پکاتے ہیں جو اللہ کو پسند نہیں ہوتی تو اس گھڑی اللہ ان کے ساتھ  
موجود ہوتا ہے“ (النساء - ۱۰۸)

”خفیہ مشورے کے لیے کوئی تین آدمی ایسے جمع نہیں ہوتے کہ ان کے ساتھ جو تھا اللہ  
نہ موجود ہو۔ اور نہ پانچ کہ جن کے ساتھ چھٹا وہ نہ ہو اور نہ اس سے کم یا اس سے  
زیادہ تعداد کہ ان کے ساتھ وہ موجود نہ ہو۔“ (مجادلہ - ۷)

وہ منہ پر کہتے ہیں کہ ہم (جماعت کے فیصلوں اور قیادت کے احکام کی) اطاعت  
کریں گے! مگر جب (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ نے پاس سے نکلتے ہیں تو ان  
میں سے ایک ٹولی راتوں کو سر جوڑ کر آپ کی کہی ہوئی باتوں کے خلاف کھچڑی پکاتی  
ہے۔ اور اللہ ان کے منصوبوں کو لکھ رہا ہوتا ہے“ (النساء - ۸)

ان آیات میں بات بالکل صاف کر دی گئی ہے کہ اسلامی نظام جماعت اجتماعی طور پر جن طے  
شدہ خطوط پر چل رہا ہو اور جو اجتماعی فیصلے اور جماعتی روایات اس کے اندر کار فرما ہوں ان کی حمایت و  
وکالت اور ان کی پابندی و پیروی اور ان کے نفاذ و استحکام کے لیے تو علیحدگی میں افراد باہم دگر علانیہ بھی  
اور تنہائی میں بھی آزادانہ بات چیت کر سکتے ہیں۔ لیکن ان سے اختلاف کرنے اور ان کو شکست دینے، ان  
کے خلاف بددلی پھیلانے اور اعتراضات اٹھانے اور ان کا رخ پھیر دینے کے لیے علیحدگی میں بیٹھ کر  
افراد کا خفیہ مشورے اور سرگوشیاں کرنا ایک ایسا گھناؤنا گناہ ہے جو ان افراد کی سیرت و عاقبت کو تباہ  
کر دیتا ہے اور پورے نظام جماعت کو پریشانیوں اور پیچیدگیوں سے دوچار کر دیتا ہے۔ خفیہ اختلافی سرگوشیوں  
کا اصلی سررشتہ دار شیطان ہے جس سے اسلامی جماعت کو قرآن نے خبردار کر دیا۔

خفیہ سرگوشیوں کا ایک موضوع ”معصیت الرسول“ بھی ہمارے سامنے آتا ہے۔ درحقیقت  
یہی مرکزی موضوع تھا۔ مدینہ کی تحریک اسلامی کے دائرے کے اندر اس امر کی تو سرے سے گنجائش نہ  
تھی کہ نفس تحریک اور اس کے نظریہ و نصب العین کو پروپیگنڈے کا ہدف بنایا جاسکے اور خود خدا کی نافرمانی  
اور اس کی کتاب سے بغاوت کا اقدام کیا جاسکے۔ منافقین کے لیے زیادہ سے زیادہ میدانِ فتنہ اتنا ہی  
تھا کہ تحریک اسلامی کی قیادت سے الجھیں اور علمبردارِ اول کی شخصیت کے خلاف لاوا پکاتے رہیں۔ ایک  
اخلاقی تحریک کے لیے تباہی کا سب سے زیادہ کارگر اور سہل ترین حربہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کی بہترین  
شخصیت کو داغدار کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ اقتدار طلبی اور نفسانیت کے الزامات پہلے ہی عائد کیے جا چکے

تھے۔ لیکن درحقیقت معاملہ ایک الزام یا دوسرے الزام تک محدود نہیں تھا۔ شوشہ بازی کی ایک ہم (Whispering Campaign) اور "سردھم" برابر چلائی جاتی رہی۔

مثلاً بعد کے دور میں جب کہ زکوٰۃ کا نظام وصول و صرف باضابطہ طور پر قائم ہو گیا۔ حضور پر ایک گھٹیا الزام یہ بھی عائد کیا گیا تھا کہ آپ بیت المال میں آنے والے صدقات کو من مانے طریق سے اڑا دیتے ہیں۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ تمام اندوختوں اور کاروباری سرمایوں اور سواشی اور زرعی پیداواروں میں سے جب باضابطہ خدا کے حاجت مند بندوں کا حق لیا جانے لگا تو ڈھیروں دولت ایک مرکز پر سمٹنے اور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے بارانِ رحمت کی طرح تقسیم ہونے لگی۔ دولت کی اس بہتی گنگا کو دیکھ کر بند پختوں کے منہ میں پانی بھر آتا اور وہ چلبتے کہ جاہلی دور کی طرح آج بھی اس گنگا سے وہی ہاتھ رنگیں۔ جو پہلے سے مضبوط مالی حیثیت کے مالک ہیں، لیکن اسلامی تحریک کے قائم کردہ نظام معیشت نے دولت کے بہاؤ کا رخ، غریب طبقوں کی طرف پھیر دیا تھا اور ارباب جاہ و شہم اس انقلاب پر کڑھتے تھے، وہ فی نفسہ اسلامی نظام معیشت پر توجہ کرنے سکتے تھے۔ جو ان کی جیبیں بھاری کرنے کے بجائے اٹان سے بزورِ قانون "زکوٰۃ" کا سبرمانہ وصول کر رہا تھا۔ بس دل کا بخار نکالنے کے لیے محسنِ انسانیت کو نشانہ بنا لیتے ان کا یہ کہنا تھا کہ دولت اپنے حامیوں اور اپنے چہیتوں میں خرچ کی جا رہی ہے۔ اور مہاجرین کو خاص طور پر نوازا جا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں خدائی خزانے کے بل پر دوست نوازی اور کنبہ پروری ہو رہی ہے۔ متفرق گفتگوؤں میں مسالہ لگا لگا کر کہا جاتا ہوگا، عام لوگوں کے گاڑھے پسینے کی کٹائی خدا کے نام پر نچوڑی جاتی ہے۔ لیکن اسے اپنی دھاک بٹھانے اور اپنا اقتدار مستط کرنے کے لیے بے وردی سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ پبلک فنڈز کے بارے میں کسی بھی نظام میں قیادت پر الزام لگ جائے تو سنگین ہوتا ہے۔ لیکن خاص طور پر ایک دینی و اخلاقی نظام معاشرہ میں جہاں خزانہ اللہ کا مال کہلاتا ہو اور جس کا پیر آمد صرف اللہ کے نام سے — اور اس کے احکام کے تحت کیا جاتا ہو وہاں ایسے الزام سے شدید جذباتی ہیجان پیدا کیا جاسکتا ہے۔

غور فرمائیے یہ الزام نمونے کی اس شخصیت پر چپکا یا جا رہا تھا جس نے صدقہ کی آمدنی کو خود اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے نہیں، پورے خاندانِ بنی ہاشم کے لیے بمنزلہ حرام کے قرار دے لیا تھا۔ یہ شان بے لوثی جس کی کوئی مثال تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس کے تراق دامن پر بھی نہایت

لہ وَمِنْهُمْ مَّن يَّتُزَّكَّىٰ فِي الصَّدَقَاتِ - القرآن۔ سورہ توبہ

ادنی سیرت کے لوگوں نے اُٹھ کر دھبے ڈال دیے۔

پھر یہی لوگ تھے جن کی تعریف قرآن یوں بیان کرتا ہے کہ یہ اپنی باتوں سے نبی کی ذات کو دکھ دیتے ہیں (توبہ) یعنی تحریک کے اجتماعی مسائل پر صاف دلی سے کھلی فضا میں بات کرنے کے بجائے یہ اس کے عنان بردار کی شخصیت کو نشتر لگاتے رہتے تھے! اس نشتر زنی کی ایک مثال قرآن نے خود بیان کر دی ہے۔ صورت واقعہ یہ تھی کہ اسلام نظام جماعت میں منافقین کی حرکات و سکنات ایک ایسی بے جوڑ چیز تھیں کہ ان کی بوداہل ایمان کی فطرت صالحہ کو ناگوار گزرتی تھی۔ اور وہ مضطرب ہو جاتے تھے! اس پر مشکل یہ تھی کہ منافقین کی پراسرار حرکات پر قانون اور نظم کے تقاضوں کے تحت باقاعدہ گرفت کرنا بھی مشکل اور ان پر دم سادھے رہنا بھی مشکل! اہل ایمان بے چارے جماعتی ذمہ داری کے تقاضے سے مجبور ہو کر اہل نفاق کی غیر صحت مندانہ حرکات سے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آگاہ کرتے رہتے تھے۔ ہر نفاق زدہ آدمی آہستہ آہستہ جماعت میں پہچان لیا جاتا۔ اور اس کے بارے میں عنان بردار تحریک کی شخصیت ایک خاص طرح کا رد عمل دکھاتی جو انتہائی نرمی کے اسلوب سے آہستہ آہستہ سختی کے انداز میں بدلتا گیا۔ ان حالات میں مرعیان نفاق اپنے آپ کو ذلیل پا کر چرچا کرنے لگے کہ ”هَوَ اَذُنٌ (توبہ - ۶۱) یعنی نعوذ باللہ! یہ شخص تو کان کا کچا ہے معمولی سے معمولی مرتبے کے آدمی، جن کی ہمارے مقابل میں کوئی ہستی ہی نہیں، جاتے ہیں اور جس کے بارے میں جو بات چاہیں کہہ آتے ہیں۔ اور وہاں ہر چیز بریقین بھی فوراً کر لیا جاتا ہے۔ میرا کارواں (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس کمزوری کی وجہ سے ہم مارے جاتے ہیں اب ہم تو ٹھہرے منافق اور سازشی، اور کل کے بے حیثیت لوٹے اور فاقوں مارے غلام ہو گئے مقررین خاص!

کچھ ایسے ہی حالات کا رد عمل ہو گا کہ ایک دفعہ منافقین نے تحریک کے علمبردارِ اول سے علیحدگی میں وقت لینے اور گفتگو میں کرنے کا ایک چکر چلا دیا۔ مجلس آراستہ ہے ایک منافق صاحب بیچ میں بول اُٹھتے کہ مجھے ذرا علیحدگی میں خاص بات کرنی ہے۔ حضورؐ بر بنائے مروت اس کا موقع ہر کسی کے لیے کھلا رکھتے تھے۔ لیکن علیحدگی میں خاص باتیں کرنے اور وقت لینے کا یہ ڈرامائی سلسلہ کسی اور غرض سے تھا، اس سے منافقین کا مدعا یہ تھا کہ ایک تو جماعت پر اپنی دھاک جمائیں کہ ہم خاص انہی لوگ ہیں صرف اوپر کے دائرے میں ذمہ دار ترین ہستی سے خاص باتیں کرتے ہیں دوسرے یہ کہ حضورؐ کی نگاہ میں مصنوعی طریق سے تقرب و اعتبار حاصل کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اہل اخلاص کے بارے میں بدگمانیاں پیدا کر کے اس ذلت کا اُپاؤ نکالا جائے جس میں اپنے ہی کرتوتوں کی وجہ سے یہ حضرات گم

کئے تھے لیکن حضور کی مروت نے منافقین کو جس تضيغ اوقات کا کھلا موقع دے دیا تھا اسے فرما کر حقیقی نے یہ حکم دے کر ختم کر دیا کہ :-

” اے ایمان والو! جب تم پیغمبر سے (خاص وقت لے کر) علیحدگی میں بات کرو تو ہر گفتگو سے خاص سے قبل صدقہ پیش کرو“ (مجادلہ - ۱۳)

اس حکم سے سبھل کے مارے ہوئے منافقین کی کم لٹ گئی اور بار بار خاص وقت لینے اور علیحدگی میں بات کرنے کا سلسلہ رک گیا۔ تاہم یہ شروع اسی تصور سے کیا گیا تھا کہ عنان بردار تحریک کان کا کچا (خاک برائیاں) ہے سواہل اخلاص کے مقابلے میں کیوں نہ ہم بھی کان بھر کر اسے اپنی دہ میں بہالے جاؤں۔ مگر ان کو اندازہ نہیں تھا کہ وہاں اہل اخلاص کے لیے کان جتنے نرم تھے اہل فتنہ کے لیے اتنے ہی ثقیل بھی تھے۔ بہر حال اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو لوگ تحریک اسلامی کے اندر رہ کر اس کے عنان بردار اعلیٰ کے خلاف ایسی تحقیر آمیز باتیں کرتے پھرتے ہوں گے۔ ان میں نظم سے وہ محبت و وابستگی باقی کیسے رہ سکتی تھی جو کسی جماعت کے کارکنوں کو فعال اور متحرک بناتی ہے۔ ایک دینی و اخلاقی نظام جماعت میں تو جو عنصر اس کے نظام امر و قیادت کے خلاف تحقیر کا طوفان ابھاتا ہے اور سرگوشیوں کی مہم چلاتا ہے وہ درحقیقت سرے سے اس کی حرکت، اس کے اقدام اور اس کی فعالیت کی تباہی کا سامان کرتا ہے۔

تحریک جب دعوت کے مرحلے سے جہاد کے مرحلے کی طرف ایک انقلابی موڑ مڑ رہی تھی اسی وقت ایک بڑی تعداد کا نفاق اُبھر آیا تھا۔ تحریکوں کے ایسے موڑ بہت سے لوگوں کو چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر توازن صرف وہی کارکن برقرار رکھ سکتے ہیں جو پہلے سے کچھ سمجھ کر چلے ہوں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ اور کیا کیا منازل راہ میں پڑیں گی۔ ورنہ دنیا بھر کی تحریکوں کو جب کوئی بڑا موڑ پیش آتا ہے اور وہ جست لگا کر ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں داخل ہوتی ہیں تو اس تغیر کا فہم نہ رکھنے والا ضرور ناکارہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسے ہی تاریخی مواقع پر بسا اوقات اچھے خاصے متحرک افراد ذہنی الجھنوں میں پڑ کر بددلی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہی تحریک اسلامی کے ساتھ بھی ہوا۔ تحریک دعوت سے جہاد کے مرحلے میں داخل ہوتی تو کچھ لوگ اپنا فکری توازن کھو بیٹھے اور خاص طور پر وہ عنصر تو ہمیشہ کے لیے نفاق کا شکار ہو گیا جو ”جہاد“ کی گراں بار ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے آمادگی نہیں رکھتا تھا۔ اور پہلے سے ذہن و فکر کو اس مرحلے کے لیے تیار کر کے نہیں لایا تھا۔ قرآن میں مذکور ہے کہ کچھ لوگ تھے جن کو جب پہلے قدم میں یہ حکم دیا گیا تھا کہ ”كُفُّوا ايديكم

یعنی دعوتِ حق پہنچاتے ہوئے ظلم و زیادتی کو خموشی سے برداشت کرو اور ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بس اقامت نماز اور ایٹھے زکوٰۃ جیسی سرگرمیوں میں منہمک رہو۔ (النساء - ۷۷) لیکن ان کو اُس دور میں یہ حکم ناگوار تھا، بعد کے مرحلے میں جب انہی لوگوں کو ”جہاد“ کا حکم سنایا گیا تو وہ انسانی قوتوں سے خوف زدہ ہو کر ٹھٹک سے گئے۔ ان کا ذہنی ردِ عمل یہ تھا کہ رَبَّنَا لِمَا كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ اے ہمارے رب! تو نے جہاد کا حکم ہمارے سر کیوں ڈال دیا؟ ابھی ہم اور دعوت دیتے۔ نماز و زکوٰۃ کے ذریعے فلاحِ سیرت کرتے۔ چندے اور تعمیری سرگرمیاں جاری رکھتے۔ ایک مرحلے کے تقاضے پورے ہوئے نہیں کہ دقت سے پہلے نئی ذمہ داریاں لادنی گئی ہیں۔

مگر بچارے نہ خدا سے بحث کر سکتے تھے نہ اس کے احکام کے آگے کوئی بند کھڑا کر سکتے تھے۔ ان کے سامنے تو صرف رسول کی ذات تھی، چنانچہ اس ذات اور اس شخصیت کو انہوں نے آخر دم تک نہ بخشا۔ ہر ہر معرکہ جہاد سے کئی کاٹتے رہے اور ہر نازک موقع پر طرح طرح کی باتیں گھڑتے رہے، انہوں نے خدا کی عائد کردہ ذمہ داریوں کا انتقام اس کے دین کی تحریک چلانے والے علمبردارِ حق سے دل کھول کر لیا۔

تحریکیں جب معرکہ آرا ہوتی ہیں تو ان کے علمبردار مخالف طاقت کو جہاں ضرر پہن گاتے ہیں وہاں ان کے ہاتھوں چوٹوں پہ چوٹیں کھاتے بھی ہیں۔ تدابیر کے تیر نشانے پہ لگتے بھی ہیں اور اُچھٹ بھی جاتے ہیں۔ نتائج امیدوں کے مطابق بھی نکلتے ہیں اور خلاف بھی نکل آتے ہیں۔ ایسا تو کوئی بھی میدانِ کارزار نہیں پایا گیا جس میں ہر نقصان ایک ہی فریق کے حصے میں آئے اور ہر فائدہ دوسرے فریق کے حصے میں رہے، جو فریقِ آخری فتح بھی حاصل کرتا ہے وہ بھی بہت سی جانبِ فتح کی قیمت میں پیش کرتا ہے بہت سے زخم کھاتا ہے بہت سا مال جنگ کی آگ میں جھونکتا ہے، لیکن مدینہ کی اسلامی تحریک کے اندر کام کرنے والے منافقین اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا کے اس فلسفہ ربانی سے خالی الذہن ہو کر ہر تکلیف اور ہر نقصان اور ہر چوٹ پر بے اختیار چلا اٹھتے تھے کہ یہ نتیجہ ہے تحریک کے کار پرداز کی کوتاہی بصیرت کا (نعوذ باللہ) قرآن میں اس ٹھنڈے ٹھنڈے فلسفیانہ پروپیگنڈے کا واضح طور پر تذکرہ موجود ہے،

” اور اگر ان کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر ان کو کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہاری (مراد ہے ذات رسالت مآب) بدولت ہے۔“ (النساء - ۷۸)

یعنی تحریک کے معرکوں میں جو جو چوٹیں لگتیں، جو نقصانات پیش آتے جو قربانیاں دینی پڑتیں

اور۔۔ جن تدابیر کے نتائج حسبِ مراد نہ برآمد ہوتے ان سب کی ذمہ داری سرورِ عالم کی گردن پر ڈال دی جاتی، کہ یہ سب انہی کا کیا دھرا ہے۔ مطلب یہ کہ دین فی نفسہ برحق ہے، تحریکِ پاکیزہ، نظامِ جماعتِ لاجواب مگر بس جن ہاتھوں میں رہنمائی ہے انہوں نے سارے کام کو عجیب چکروں میں ڈال دیا ہے۔ ذرا متقیانہ شان ملاحظہ ہو کہ اللہ سے بات بنا رکھی ہے اور فوائد اور کامیابیوں کی نسبت بڑے اہتمام سے اس کی طرف پھیری جا رہی ہے۔ گویا پروپیگنڈہ فلسفیانہ ہی نہیں بڑا متقیانہ بھی تھا مگر یہ منافقانہ شان اتنا جو رسولؐ جیسے سربراہِ کارِ تحریک کی خیر خواہی و اطاعت کا اتنا بھی حق ادا نہ کر سکی جتنا اسلام نے ایک حبشی غلام تک کی امارت کے لیے طلب کیا ہے اور جو خدا کے رسولؐ اور تحریکِ اسلامی کے بہترین عنان بردار سے بالا بالا خدا سے رشتہٴ قرابت جوڑ رکھنا چاہتی تھی، اس سے بڑھ کر خود فریبی کی اور کونسی شکل ہوگی جو انسان نے اپنی تباہی کے لیے ایجاد کی ہو۔ اس موقع پر یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ”حسنت“ کی جو نسبت وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف کرتے تھے وہ بر بنائے شکر و اعتراف نہ تھی، بلکہ ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ حالات کے اندر جو اچھے پہلو ابھر آتے ہیں اور معرکہ آرائیوں سے جو مفید نتائج برآمد ہو جاتے ہیں ان میں محسنِ انسانیت کی قیادت اور بصیرت کو کوئی دخل نہیں ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے پیدا کردہ اتفاقات ہیں۔

مدینہ کی تحریکِ اسلامی کے قائدِ اعلیٰ کو کن ذہنی احوال سے گزرنا پڑتا ہوگا جب کہ ہر موقع تکلیف پر گھر کے اندر مخالفانہ تبصرہ کرنے اور ہنسی اڑانے اور تحقیر کرنے والے نام نہاد ساتھی موجود ہوں۔ بات بات پر کہتے پھرتے ہوں کہ اس عنان بردار تحریک کے ہاتھوں اب یہ مصیبت آپڑی اب وہ زخم لگا۔ اب ادھر سے تباہی آپڑی، ہر اہم اقدام کے نتائج نکل آنے کے بعد پنڈت بن کر بیٹھ جاتے ہوں اور تبصرے کرتے ہوں کہ یوں نہ کیا جاتا اور دوں کیا جاتا۔

اسی گھٹیا ذہنیت کے ساتھ وہ ہر معرکہ کے سامنے آنے پر یا وہ کوئی کرنے لگ جاتے مثلاً کہتے کہ ”ہمیں اندیشہ یہ ہے کہ حالات کا کوئی چکر ہمیں اپنی لپیٹ میں نہ لے لے“ (المائدہ - ۵۲)

۱۔ اس موقع پر بتا دینا مفید ہوگا کہ صاحبِ موضع القرآنؑ نے اپنے جاشیہ میں بالکل یہی بات یوں ارشاد فرمائی ہے کہ یہ منافقوں کا ذکر ہے کہ اگر تدبیر جنگ درست آئی اور فتح وغنیمت ملی تو کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے ہوئی یعنی اتفاقاً بن گئی۔ حضرت کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے تھے اور اگر بگڑ گئی تو الزام رکھتے حضرت کی تدبیر کا۔ (ملاحظہ ہو حائل شریف مطبوعہ تاج کپنی ۱۹۵۷ء)

مراد یہ ہوتی تھی کہ اس تحریک کی گاڑی کو جس ڈھب سے چلایا جا رہا ہے اس کے پیش نظر ہر وقت یہ خطرہ ہے کہ اب کسی چٹان سے ٹکرائی، اور اب کسی کھڈ میں گری! — آخر ہم کیوں مفت میں اپنے آپکے ہاتھ دھو بیٹھیں۔

جنگِ اُحد کے موقع پر یہی ذہنیت تھی جس نے حسرتِ ظاہر کی تھی کہ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قَتَلْنَا هَاهُنَا۔ یعنی اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔ (تفہیم القرآن سورہ آل عمران آیت ۱۵۷) اس ذہنیت میں آنحضرت کی قیادت و بصیرت کے خلاف صریح بے اعتمادی موجود تھی۔ یہ اپنی جگہ عقلِ کل تھے اور جو شخص کئی برس سے وحی الہی کی روشنی میں تحریک چلاتا آ رہا تھا وہ پیغمبر ہونے کے باوجود ان کی نگاہ میں کچھ نہ تھا۔ اگر کہیں معاملہ کسی پیرو نبوت کی قیادت کا ہوتا تو خدا جانے بصیرت کے ان ٹھیکیداروں کے ہاتھوں اس کی کیا گت بنی ہوتی۔

ان مثالوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تحریک کی براہِ راست مخالفت کے بجائے سرورِ عالم کی شخصیت کو ہدف بنا کر بالواسطہ حملے کا کامیاب ترین اسلوب اختیار کیا گیا تھا۔ تحریک کے میر کاروبار ہی کے خلاف اعتراضات، تحقیر اور بیہودہ خردہ گیری کا لاوا بخجی کے ناپاک ماحول میں پکایا جاتا اور اس کی نافرمانی اور اس سے سرکشی کرنے کے لیے نئے نئے اقدامات زیرِ غور لائے جاتے۔

## اخلاقی نظامِ جماعت کی پچیدگیاں :

یہ فصاحتِ شیطان کے لیے کام کرنے کا بہترین اور وسیع میدان اپنے اندر رکھتی تھی۔ خاص طور پر اس کے دو پہلو فتنہ پر اوزوں کے حق میں جاتے تھے تحریکِ اسلامی کا جماعتی نظام اخلاقی نظام تھا۔ اخلاقی نظام کی ایک خاص پچیدگی یہ ہے کہ اس میں صریح قابلِ گرفت واقعات جب تک ثابت شدہ حقائق کی شکل اختیار کر کے سامنے نہ آجائیں، ان پر نہ جماعت گرفت کر سکتی ہے اور نہ خرابی محسوس کرنے والے افراد حالات کے دھندلے پس منظر کو آخری نتائج نکلنے سے قبل برسرِ عام لا سکتے ہیں۔ اسلام کا اخلاقی نظام جماعت اپنے افراد کو ایک دوسرے کے بارے میں سوئے ظن سے روکتا ہے۔ اور ایک مخلص آدمی آخری حد تک مجبور ہوتا ہے کہ اپنے ساتھیوں کے مشتبہ طرزِ عمل کے ہر جز کی بہتر سے بہتر تاویل کرتا رہے اور پھر اگر وہ غیر صحت مندانہ سلسلہ احوال کی بیشمار کڑیوں کے مل جانے پر اپنے ذہن کی گہرائی میں کوئی بری رائے قائم کر بھی لے تو بھی زیادہ سے زیادہ وقفہ اس انتظار میں گزارے کہ شاید اس کے سوئے ظن کی تردید کرنے والی کوئی واضح حقیقت سامنے آجائے۔



محض تاثرات — چاہے وہ اس کی اپنی نگاہ میں کتنے ہی وقیح کیوں نہ ہوں — اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کو ایک مقدمہ کے طور پر باقاعدہ جماعت کے سامنے لا کر نظم کو متحرک کیا جائے۔ ان وجوہ سے مدینہ میں اہل اخلاص مجبور تھے کہ وہ فتنہ پسندوں کی ابتدائی سرگرمیوں کو جو نجوئی کے دھندلکے میں چل رہی تھیں چند ناخوش آئند آثار و علامت کے سامنے آجانے پر بھی چپ چاپ دیکھتے رہیں۔ ہاں جب فتنہ کی فصل باقاعدہ برگ و برلانے لگتی۔ تو پھر کہیں جا کر اخلاقی نظام جماعت ان کو موقع دیتا کہ وہ زبان کھولیں، اور اجتماعی نظم کو حرکت میں لائیں۔

دوسری پیچیدگی اخلاقی نظام جماعت کی یہ ہوتی ہے کہ اگر ان کے سربراہ کار کی شخصیت اور اس کے دوسرے اہل حل و عقد اور ارباب امر کی ذوات کو کوئی لپیٹ میں لے لے تو ان کی پوزیشن بڑی نازک ہو جاتی ہے۔ ایک طرف وہی ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں جماعت کی انتظامی مشینری کی باگ ڈور ہوتی ہے اور جن کے ہاتھوں فتنوں کا سر کچلا جاسکتا ہے۔ دوسری طرف فتنے انہی کو نشانہ بنا کر ایسی صورت پیدا کر دیتے ہیں کہ اگر وہ ارباب فتنہ کا پول ساری جماعت کے سامنے پوری طرح کھلنے سے پہلے ان کے خلاف کوئی کارروائی کریں تو ان پر الزام آتا ہے کہ تنقید اور اختلاف کو دہلتے ہیں۔ اور آواز حق بلند کرنے والوں کو آمرانہ طریقوں سے شکست دیتے ہیں۔ جس طرح افراد کے معاملے میں کہا جاسکتا ہے کہ شرافت جہاں سب سے بڑی طاقت ہے وہاں شرافت ہی سب سے بڑی کمزوری بھی ہوتی ہے، بالکل اسی طرح جماعتوں کے لیے اخلاقی نظام ان کی سب سے بڑی پیچیدگی بھی ہے۔ اس پیچیدگی کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ ہے کہ جماعت اپنے مجموعی ذہن کے لحاظ سے اتنی بیدار اور اپنے کردار کے لحاظ سے اتنی مضبوط ہو کہ وہ اپنے مزاج کے خلاف کسی چیز کو اپنے اندر چلنے نہ دے۔ اس کے دائرے میں کوئی گوش ہوش جماعتی نظم کے خلاف سرگوشیاں سننے کے لیے تیار نہ ہو۔ اور کوئی زبان کان میں پڑی ہوئی ہر بات کو ادھر ادھر پھیلانے کی جرأت نہ کرے۔ مگر اس انتہائی معیار تک عملاً جماعت کی جماعت کا پہنچنا اور ہر آن اس پر قائم رہنا مشکل ہے۔ گھٹیا باتیں سوچنے والے دماغوں، ان کو پھیلانے والی زبانوں اور ان کو سننے والے کانوں سے کوئی انسانی معاشرہ بالکل ہی پاک نہیں ہو سکتا۔ انسانی فکر نطق اور سماعت میں سے شیطان کچھ نہ کچھ حصہ لے ہی اڑتا ہے۔

منافقین نے اخلاقی نظام کی اس ڈھیل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، لیکن انجام کار کے لحاظ سے وہ اس کی زبردست طاقت کی گرفت سے نہ بچ سکے۔ ان کے پورے کلانامے کا خلاصہ قرآن کی زبان میں بس یہ تھا ”ہتوا بما لم یزالوا“ وہ جس مقصود کی طرف تہمتیں بکتے تھے۔ اس تک رسائی

حاصل نہ کر سکے۔ مگر جماعت کو پریشان تو کیا۔ اسے اضطراب میں تو ڈالے رکھا۔

بخوی کی اس سازگار فضا میں جس میں تحریک کے علمبردار اولین کی ذات ہدف بنی چلی آ رہی تھی اور یکے بعد دیگرے اس کے خلاف ناوک اندازیاں ہو رہی تھیں، ناپاک سے ناپاک بہتان کے کسی طوفانِ عظیم کا اٹھا دینا ہرگز ناممکن نہ تھا، بشرطیکہ کوئی اچھا موقع قسمت سے فتنہ پردازوں کے ہاتھ آ جائے۔ شیطان کو اس فضا سے فائدہ اٹھانے اور منافقین کے گروہ کو ڈھنگ سے استعمال کرنے کے لیے دوسری ضرورت ایک فعال کردار کی تھی جس کا ذہن شرارت اٹھانے کے لحاظ سے موجدانہ اور تخلیقی ہو اور جسے بخوی کے پیدا کردہ بارود کے ڈھیر میں بی جالو کی طرح ایک چنگاری اٹھا پھینکنے کی جسارت حاصل ہو۔ سو اس طرح کا فعال کردار عبداللہ بن ابی کی صورت میں پہلے ہی موجود تھا۔ اس شخص کے اندر اپنی شخصیت اور اہمیت کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ آخر ہجرت سے پہلے مدینہ کی بادشاہت کا تاج اسی کے سر پر تو رکھے جانے کے لیے زیر تیاری تھا؛ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود اس کی تمناؤں کے راستے میں روک بن گیا۔ بادشاہت تو دور رہی، اُسے اپنے کردار کے سبب تحریکِ اسلامی کے دائرے میں آ کر مرتبہ اولین تو کجا، مرتبہ ثانی و ثالث تک بھی حاصل نہ ہو سکا۔ اس حادثے نے اس کے ذہن میں بڑا تلخ اور زہریلا رد عمل پیدا کر دیا۔ اور یہ رد عمل ہر آن ایک نہ ایک نئے فتنے کی شکل میں مدوجزر پیدا کرتا رہتا تھا۔ شیطان انسانوں میں براہِ راست تو بہت ہی محفوظ کام کرتا ہے۔ اُسے آلہ کار کے طور پر شیاطین انس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور شیاطین انس کوئی سبیل اللہ فساد میں متحرک رکھنے کے لیے یہ ان کے اوپر کوئی سرخیل چاہتا ہے۔ کوئی امامِ فتنہ! یہ امامِ فتنہ اسے مدینہ میں بنا بنایا ہاتھ آ گیا اور محض بھی وہ تحریکِ اسلامی کے دائرے کے اندر! یہ ایک شخصیت ایک پیغمبر کی قیادت میں چلنے والی تحریک پر بظاہر اصرار و صدقنا بھی کہہ چکی تھی اور دوسری طرف اسی پیغمبر کی ذات اور اس کے مشن کے ساتھ ہر پہلو سے بھڑ بھی رہی تھی۔

انانیت (Self-Importance) کے زیر اثر اس فعال کردار نے بڑے تاریخی موقع پر اپنے جذبہ حسد کے بھڑکتے آتش دان میں سے چنگاری اٹھا کر حرمِ نبوی میں ڈال دی اور انا فانا سارا معاشرہ ذہنی حیثیت سے بھڑ بھڑ جلنے لگا۔

**حضرت عائشہ کی آپ بیتی :**

اس طوفانِ عظیم میں حضرت عائشہؓ کے سفینہٴ قلب و روح پر جو کچھ گزری اس کی مستند تفصیل خود آں جناب اور دوسرے روادے کی زبانی حدیث، سیرت اور تاریخ کی اہم کتابوں میں محفوظ ہے میرے

سامنے اس وقت زاد المعاد (ملاحظہ ہو، جلد ۲ صفحہ ۱۵-۱۱۳) اور نیرت ابن ہشام (ملاحظہ ہو جلد ۳ صفحہ ۲۴-۳۲۲) جیسے مستند آخذ میں لیکن چونکہ صاحب تفسیر القرآن نے حضرت عائشہؓ کی روایتِ الم کا بہترین الفاظ میں ترجمہ کر دیا ہے، لہذا اسی کو مستعار لیتا ہوں:

مدینہ پہنچ کر میں بیمار ہو گئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی رہی۔ شہر میں اس بہتان کی خبریں اڑ رہی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کانوں تک بھی بات پہنچ چکی تھی۔ مگر مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ آپ گھر میں آتے تو بس یہ پوچھ کر رہ جاتے کیف نیکہ (کیسی ہیں یہ؟) اس سے زائد کوئی کلام نہ کرتے۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ آخر آپ سے اجازت لے کر میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی تاکہ وہ میری تیمارداری اچھی طرح کر سکیں ایک روز رات کے وقت حاجت کے لیے میں مدینے کے باہر گئی۔ اس وقت تک ہمارے گھروں میں یہ بیت الخلاء نہ تھے اور ہم لوگ جنگل ہی جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ مسطح بن اثاثہ کی ماں بھی تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں (دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے خاندان کی کفالت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ذمے لے رکھی تھی، مگر اس احسان کے باوجود مسطح بھی ان لوگوں میں شریک ہو گئے تھے جو حضرت عائشہ کے خلاف اس بہتان کو پھیلا رہے تھے) راستے میں ان کو ٹھوکر لگی۔ اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: غارت ہو مسطح! میں نے کہا: اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو۔ اور بیٹا بھی وہ جس نے جنگ بدر میں حصہ لیا ہے۔ انہوں نے کہا بیٹا! کیا تجھے اس کی باتوں کی کچھ خبر نہیں؟ پھر انہوں نے سارا قصہ سنایا کہ افتراء پرداز لوگ میرے متعلق کیا باتیں اڑا رہے ہیں۔ منافقین کے سوا خود مسلمانوں میں سے جو لوگ اس فتنے میں شامل ہو گئے تھے ان میں مسطح، حسان بن ثابت مشہور شاعر اسلام اور حمہ بنت جحش (حضرت زینبؓ کی بہن) کا حصہ سب سے نمایاں تھا یہ داستان سن کر میرا خون خشک ہو گیا۔ وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لیے آئی تھی

سیدھی گھر گئی اور رات بھر رو کر کاٹی (اس موقع پر ابن ہشام کی لی ہوئی روایت میں  
یہ الفاظ بڑے اہم ہیں کہ رونے کا عالم یہ رہا کہ مجھے اندیشہ ہو گیا کہ میرا کلیجہ پھٹ  
جائے گا) (ن۔ ص)

حضرت عائشہؓ اس کرب میں جان گھلا رہی تھیں لیکن شہر مہاجر میں چہ میگوئیوں کا ایک چکر چل  
رہا تھا۔ ان کی طرف سے سب سے بڑھ کر صفائی دے سکنے والے ان کے والد اور شوہر ہی ہو سکتے تھے  
جو ان کے ذہن و کردار کا قریبی اور تفصیلی علم و تجربہ رکھتے تھے مگر اس طرح کے بہتان جب ظالم لوگ  
لگا دیتے ہیں تو جو جتنا قریبی ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ پیچیدگی میں پڑ جاتا ہے۔ اس کی صفائی بالکل  
بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ چنانچہ والد اور شوہر دونوں دم بخود تھے اور چار جانب سے زبانوں کے چھوڑ  
ہوئے تیر کھا رہے تھے۔

انسانیت کے محسن اعظم پر یہ گھڑیاں جس درجہ شاق گزری ہوں گی۔ ذاتی لحاظ سے بھی، اور  
تحریک کے مفاد کے لحاظ سے بھی۔ ان کا کچھ ٹھوڑا اندازہ ہر شریف اور حساس اور ذمہ دار آدمی کر  
سکتا ہے۔ صبر و سکوت سے بہت کام لیا۔ لیکن اس نازک معاملہ کو موجودہ حالت میں معلق نہ نہیں  
چھوڑا جا سکتا تھا۔ ادھر یا ادھر کوئی ایک فیصلہ ناگزیر تھا۔ سو حضورؐ نے غیر جانب دارانہ طریق سے  
تحقیق شروع کی۔ اپنے دو قریبی رفقاء حضرت علیؓ اور حضرت اسامہ بن زید کو طلب فرمایا۔ اور ان سے  
رائے طلب کی۔ حضرت اسامہؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! وہ آپ کی زوجہ محترمہ ہیں اور ہم ان کے  
بارے میں بجز خیر کے کچھ نہیں پاتے، یہ سب کچھ کذب اور باطل ہے جسے پھیلا یا جا رہا ہے۔" حضرت  
علیؓ نے بالکل دوسرے ہی پہلو سے مسئلے کو لیا۔ اور فرمایا: "یا رسول اللہ! عورتوں کی کمی نہیں۔ آپ  
اس کے بجائے دوسری بیوی کر سکتے ہیں۔ یوں آپ بوڑھی کو بلا کر تحقیق فرمائیں۔" اصل میں حضرت  
علیؓ کا منشا یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ حضورؐ پریشان رہیں۔ کیوں نہ ایسی بیوی کو طلاق دے کر دوسرے نکاح  
کر لیں جس کے بارے میں ایک ظوفان اٹھا دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے خاص  
رشتے کی وجہ سے اس معاملے کے تحریکی پہلو کی بہ نسبت حضورؐ کی ذاتی پریشانی کو زیادہ اہمیت دی اور وہ  
رائے دی جس سے آپؐ اس ذہنی الجھن سے نکل کر مطمئن ہو جائیں۔

تاہم حضرت علیؑ کے مشورہ کا دوسرا جز، سرورِ عالم نے قبول فرمایا۔ اور اس کے مطابق گھر کی خادمہ کو طلب کیا گیا۔ حضرت علیؑ نے چھوڑتے ہی اُسے آڑے ہاتھوں لیا اور مار کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سچ سچ کہہ دو۔ اس نے کہا: خدا کی قسم میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں جانتی اور میں اس کے علاوہ اور کوئی نقص عائشہؓ میں نہیں نکال سکتی کہ میں اٹا گوندھتی تھی اور کہہ کر جاتی کہ ذرا اسے دیکھتی رہنا، اور وہ پڑی پڑی سو جاتیں اور بکری آکر اٹا کھا جاتی تھی اس بے ساختہ بیان میں خادمہ نے جتنی کھل صفائی حضرت عائشہؓ کی دے دی تھی اس پر کوئی دوسرا بیان مشکل ہی سے اضافہ کر سکتا ہے۔ اس نے ایک ایسی بھولی بھالی اور سادہ منہ لڑکی کا حقیقی نقشہ پیش کر دیا جس نقشے میں کسی شرک و انسانی عقل نصب نہیں کر سکتی۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرا اقدام تحریکِ اسلامی کے سربراہِ اعلیٰ نے یہ کیا کہ مجلس عام میں خطاب فرمایا۔ حمد و ثنا کے بعد بڑے درد بھرے الفاظ زبان سے نکلے۔

”آخر ان لوگوں کا مدعا کیا ہے جو مجھے میرے اہل خانہ کے بارے میں دکھ دیتے ہیں اور ان کے متعلق خلاف واقعہ باتیں کہتے پھرتے ہیں، خدا کی قسم، ان کے بارے میں بجز بھلائی کے کوئی اور بات میرے علم میں نہیں ہے اور وہ یہ بات ایک ایسے شخص کے متعلق کہتے ہیں کہ اس کی طرف سے بھی بھلائی کے۔ اور میرے علم میں کوئی اور بات نہیں ہے اور اس نے میرے گھر میں بھی میری موجودگی کے بغیر کبھی قدم نہیں رکھا ہے۔“

دوسری روایت میں ابتدائی الفاظ یہ ہیں :-

”کوئی ہے جو مجھے اس شخص سے بچائے جو میرے گھر والوں کے بارے میں مجھے ایذا دیتا ہے“ لے

یہ سن کر قبیلہ کے سردار اسید بن حضیر نے اٹھ کر عرض کیا: یا رسول اللہ! اگر ایسے لوگ

لے ایضاً

لے سیرت ابن ہشام کی روایت کے بموجب واقعہ کا یہ جز ترتیب و وقوع کے لحاظ سے مقدم تھا۔

ملاحظہ ہو جلد ۳ صفحہ ۲۰۶

لے سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۲۵

لے زاد المعاد جلد ۲ صفحہ ۱۱۴

ہمارے قبیلے کے موں تو ہم ان سے نمٹ لیں گے اور اگر ہمارے خیزرجی بھائیوں میں سے ہوں اور آپ حکم دیں، خدا کی قسم! ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ دوسری طرف سے خیزرجیوں کے سردار سعد بن عبادہ بھٹنا کر اٹھے اور کہا: جھوٹ کہتے ہو، بخدا ہم ان کی گردنیں نہیں ماریں گے۔ ہاں ہاں! خدا کی قسم! تم نے یہ بات اسی بنا پر کہی ہے کہ ان کا تعلق خیزرج سے ہے۔ حضرت سعد کا یہ خلاف توقع جواب اسید ابن حضیر کو سخت ناگوار گزرا۔ انہوں نے غاباً یہ محسوس کیا ہوگا کہ جس جماعت میں مجرموں اور فسادپلوں اور شربندوں کو پناہ اور سرپرستی کسی نمایاں شخصیت کی طرف سے حاصل ہو باقی ہے اس کے لیے اجتماعی مسائل کی تعمیر سامان نہیں رہتی۔ عبداللہ بن ہاشم ہمیشہ تحریکوں میں پیدا ہونے جتے ہیں۔ لیکن ایک سبب اور خود شناسی نظام جماعت کا معرہ ایسی مکھیوں کو جو جزو بدن نہیں بننے دیتا بلکہ اگل کر پھینک دیتا ہے۔ البتہ اگر کسی شریک کو کسی نظام جماعت کے اندر ممتاز اور سنبھلا دینے پر اس کے لیے چہ پینے والے مل جائیں تو پھر مارے آئیں پرورش پاتے جتے ہیں۔ اور جماعتوں کے ان کے دنا کے گمانے پرتے ہیں۔ اسی تلخ حقیقت کے احساس کی بنا پر حضرت سید شت جذبات میں دل اٹھنے اور نظام کچھ بڑا بخدا! بلکہ تم خود منافق ہو، جی بھی منافقوں کی دکالت و حمایت کرتے ہو۔

یہ ناخوشگوار تصویر اس درجے سے پیدا ہوئی کہ اس وقت خیزرج کے درمیان کھچاؤ پیدا کرنے کے لیے بھی تو متواتر فتنہ کی بارود بچھاؤ جاری تھی۔ جیسی درہی بات پر جذباتی ہیجان پیدا ہو گیا اور جماعت کے دو گونہ عناصر متحرک ہو گئے۔ کچھ دھڑ سے اُٹھے کچھ ادھر سے، اور قریب تھا کہ اس وقت خیزرج باہم دگر گتہ جائیں۔ دونوں قبیلوں کو شیر و شکر کرنے والے قائد حلیل کو یہ گوارا نہ تھا کہ برسوں کی محنت سے بندھا ہوا یہ شیرازہ اس کی ذات کی وجہ سے درہم برہم ہو جائے۔ خود تحریک سے ہی کی چوہیں مل جائیں۔ آپ منبر سے اُتر آئے۔ لوگوں کو ٹھنڈا کیا۔ اور مجلس برداست کر دی۔

صنوبر کے لیے جماعت کے اس کمزور پہلو کا یہ نیا تجربہ پہلی پریشانی میں کتنے سنا نہ کا موجب بن گیا ہوگا۔ یہ وہ اصل عصبيت کی وہی بارود پھٹ رہی تھی جسے عبداللہ بن ابی غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر دلوں کی گہرائیوں میں بچھا چکا تھا۔

کہانی کا آخری حصہ بھی، جس نے حزنینہ کو طرب بہ بنا دیا۔ خود اس کہانی کے مرکزی کردار حضرت

عائشہؓ کی زبانی ہی سنئے :

اس بہتان کی افواہیں کم و بیش ایک مہینے تک شہر میں اُڑتی رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سخت اذیت میں مبتلا رہے۔ میں روتی رہی۔ میرے والدین انتہائی پریشانی اور رنج و غم میں مبتلا رہے۔ آخر کار ایک روز حضور تشریف لائے اور میرے پاس بیٹھے اس پوری مدت میں آپ کبھی میرے پاس نہ بیٹھے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ اور ام رومان (حضرت عائشہؓ کی والدہ) نے محسوس کیا کہ آج کوئی فیصلہ کن بات ہونے والی ہے۔ اس لیے وہ دونوں بھی پاس آ کر بیٹھ گئے۔ حضور نے فرمایا۔ عائشہ مجھے تمہارے متعلق یہ خبریں پہنچی ہیں۔ اگر تم بے گناہ ہو تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری برأت ظاہر فرمادے گا اور اگر تم کسی گناہ میں مبتلا ہوئی ہو تو اللہ سے توبہ کرو اور معافی مانگو۔ بندہ جب اپنے گناہ کا معترف ہو کر توبہ کرتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے۔ یہ بات سن کر میرے آنسو خشک ہو گئے (بے گناہ آدمی سے اسی فطری کیفیت کی

توقع کرنی چاہیے۔ (ن - ص)

میں نے اپنے والد سے عرض کیا، آپ رسول اللہ کی بات کا جواب دیں انہوں نے فرمایا۔ بیٹی! میری کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہا آپ ہی کچھ کہیں انہوں نے بھی یہی کہا، کہ میں حیران ہوں، کیا کہوں۔ اس پر میں بولی آپ لوگوں کے کانوں میں ایک بات پڑ گئی ہے اور دلوں میں بیٹھ چکی ہے۔ اب اگر میں کہوں کہ میں بے گناہ ہوں — اور اللہ گواہ ہے کہ میں بے گناہ ہوں — تو آپ لوگ نہ مانیں گے، اور اگر خواہ مخواہ ایک ایسی بات کا اعتراف کروں جو میں نے نہیں کی — اور اللہ جانتا ہے کہ میں نے نہیں کی — تو آپ لوگ مان لیں گے میں نے اس وقت حضرت یعقوبؓ کا نام یاد کرنے کی کوشش کی مگر یاد نہ آیا۔ (ایک بے گناہ جب کسی بھاری الزام کی زد پر آ کر لاینحل اضطراب میں پڑتا ہے تو اس کے عالم نفسیات میں ایسے ہی حوادث صادر ہوتے ہیں۔ (ن - ص) آخر میں نے کہا، اس حالت میں میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ وہی بات کہوں جو حضرت یوسفؓ کے والد نے کہی تھی کہ فَصَبَّرْ جَمِيًّا (اشارہ ہے اس واقعہ

کی طرف جب کہ حضرت یعقوب کے سامنے ان کے بیٹے بن یمن پر چوری کا الزام بیان کیا گیا تھا، یہ کہہ کر میں لیٹ گئی اور دوسری طرف کروٹ لے لی (بے بسی اور اس کے ساتھ یہ عالم بے نیازی پھر اسی نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جب کہ کسی بے گناہ پر کوئی الزام چھبکا گیا ہو۔ (ن۔ ص) میں اس وقت اپنے دل میں کہہ رہی تھی۔ کہ اللہ میری بے گناہی سے واقف ہے۔ اور وہ ضرور حقیقت کھول دے گا۔ اگرچہ یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ تیرے حق میں وحی نازل ہوگی جو قیامت تک پڑھی جائے گی۔ میں اپنی ہستی کو اس سے کمتر سمجھتی تھی کہ اللہ خود میری طرف سے بولے۔ مگر میرا یہ گمان تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی ثواب دیکھیں گے جس میں اللہ تعالیٰ میری برأت ظاہر فرما دے گا اتنے میں یکایک حضور پر وہ کیفیت طاری ہو گئی جو وحی نازل ہوتے وقت ہوا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ سخت جاڑے کے زلنے میں بھی موتی کی طرح آپ کے چہرے سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگتے تھے۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ میں تو بالکل بے خوف تھی مگر میرے والدین کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، وہ ڈر رہے تھے کہ دیکھیے اللہ کیا حقیقت کھولتا ہے۔ وہ کیفیت دور ہوئی تو حضور بے حد خوش تھے۔ آپ نے سنتے ہوئے پہلی بات جو فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ مبارک ہو عائشہ! اللہ نے تمہاری برأت نازل فرمادی اور اس کے بعد حضور نے دس آیتیں سنائیں میری والدہ نے کہا اٹھو اور رسول اللہ کا شکر یہ ادا کرو میں نے کہا میں نہ ان کا شکر یہ ادا کروں گی نہ آپ دونوں کا! بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتی ہوں جس نے میری برأت نازل فرمائی۔ آپ لوگوں نے تو اس بہتان کا انکار تک نہ کیا (ذرا یہ شکوہ بھرا غیونہ انداز گفتگو ملاحظہ ہو، کیا یہ کسی مجرم صنمیر کی ترجمانی کرتا ہے؟ (ن۔ ص) اس آپ بیتی کا ہر لفظ بول کر کہہ رہا ہے کہ یہ ایک بے گناہ کی داستان درد ہے جو ہر نصنع سے پاک ہے اور جس میں حقیقی کرب کا بے ساختہ اظہار ہے۔



## تبصرہ، تجزیہ اور تزکیہ :

پروپیگنڈہ کے اس طوفان اور اس کے پیدا کردہ بحران (Crisis) کی اتھاہ تاریکیوں کا ٹوڑ کرنے کے لیے یکایک افق وحی چمک اٹھا۔ معاشرے کے ذہنی عالم میں صبح الہام نمودار ہوئی، اور آیاتِ بینات کی کرنیں روحانی فضاؤں میں رقص کرنے لگیں۔ کیا ہی خوب مناسبت تھی کہ جو سورۃ اس بحران کا ازالہ کرنے اُتری، اس کا نام سورۃ نور قرار پایا۔ اس سورۃ میں جماعت اور معاشرہ پر تبصرہ کیا گیا، اس کی کمزوریاں واضح کی گئیں۔ اور ان کمزوریوں سے اُسے مستقل طور پر پاک کر دینے کے لیے قانونی اور اخلاقی ہدایات دی گئیں۔

اس معرکہ آراء سورۃ کے مضمون کی اٹھان ہی چونکا دینے والی ہے فرمایا گیا :-  
 ”یہ ایک سورت ہے جسے ہم نے نازل کیا ہے۔ اور جسے ہم نے ذمہ داری کے طور پر . . . . . (اسلامی معاشرے کے لیے) لازم ٹھہرایا ہے اور جس میں ہم نے نہایت واضح باتیں پیش کر دی ہیں۔ شاید کہ تم لوگ ان سے استفادہ کرو!“  
 (آیت ۱۰)

اب سورۃ نور کی صدا معاشرے میں گونجتی ہے۔

جو لوگ یہ بہتان گھڑ کر لائے ہیں وہ تمہارے ہی اندر کا ایک ٹولا ہیں . . . . .  
 جس نے اس میں جتنا حصہ لیا، اس نے اتنا ہی گناہ سمیٹا، اور جس شخص نے اس کی ذمہ داری کا بڑا حصہ اپنے سر لیا، اس کے لیے تو عذابِ عظیم ہے (آیت ۱۱)۔  
 کتنا بڑا طنز ہے، کہ ایک بے ثبوت الزام جس کے لیے کوئی واضح قرینہ موجود نہ تھا وہ ایک طوفان کی طرح اٹھا اور کسی بیرونی دشمن اور حریف کی طرف سے نہیں، بلکہ خود برسوں کی تربیت یافتہ مسلم جماعت کے اپنے اندر سے اُٹھا۔ پھر یہ ایک آدھ آدمی کی وقتی لغزش نہ تھی، مہینہ بھر تک ایک ٹولے کا ٹولہ ذہنی مدوجزر پیدا کرتا رہا۔ بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے جماعتی ماحول میں یہ کمزوری موجود ہے کہ اس کے معمار ہی اس کی تباہی کی ہم چلا دیں۔ اس فضا میں ایسے رخنے ہیں کہ علمبردارانِ صداقت کی سوسائٹی میں جھوٹ برگ و بار لائے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ یہ بہتان نہیں تھا۔ عصیان کی ایک بہتی گنگا تھی جس سے کسی نے خم اور کسی نے جام بھرا۔ اور کسی نے چلو ہی لیا۔ سو جس نے جتنا بھی حصہ لیا اپنے لیے برائی ہی سمیٹی۔ پھر اشارہ کیا گیا اس سرخیل فتنہ اور اس امامِ شکر کی طرف جس نے پہلی چنگاری ڈالی تھی اور پھر برابر شعلوں کو دامن سے ہوا دیتا رہا۔ یعنی عبداللہ بن ابی۔

سورہ نور سوال کرتی ہے کہ :-

جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا اسی وقت کیوں نہ ایمان والے مردوں اور  
ایمان والی عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا اور کیوں نہ کہہ دیا کہ یہ صریح  
بہتان ہے ؟  
(آیت ۱۲)

کتنا اخلاقی اپیل ہے اس میں — شریفانہ جذبات اور مومنانہ حس کے لیے کتنا تیز کچھو کا  
ہے ان الفاظ میں ! مدعا یہ ہے کہ محض اتنی سی بات کہ اسلامی معاشرہ کی ایک شریف ترین خاتون  
قافلے سے بچھڑ جاتی ہیں اور اسی معاشرے کا ایک دوسرا معزز رکن ان کو رستے میں پا کر ساتھ سے  
آتا ہے، تمہارے لیے درجہ آخر کی بدگمانی کی بنیاد کیوں بن گئی ؟ کیا تم میں سے کوئی مرد و عورت ایک  
اتفاقی حادثے کے طور پر اس صورت سے دوچار ہوتا تو وہ لازماً اسی پستی میں گرتا ؟ کیا اپنے اخلاق و کردار  
کے بارے میں تمہارا اندازہ یہی تھا ؟ کیا تمہارے معاشرے کی سطح اتنی گری ہوئی ہے کہ اس کے ذریعے  
اگر اتفاقاً علیحدگی میں رہ جائیں تو وہ بدکاری سے بڑے بڑے نہیں رکھنے کے ! اگر تم اپنے بارے میں  
اس پسندی کا تصور نہیں کر سکتے تو تمہیں اپنی جماعت کی ایک بہترین خاتون اور اس کے ایک ممتاز رکن  
کے بارے میں ایسا ذلیل تصور باندھنے کا کیا حق تھا ؟

اور اس معاشرے کی بڑی اکثریت اس دورِ بجران میں بھی اپنی اخلاقی عظمت پر قائم تھی  
ورنہ اگر سارا جسم اس زہر کو قبول کر لیتا اور اس کی ذہنی مدافعت کرنے میں عاجز رہ جاتا تو یہ حملہ اس  
کا شیرازہ وجود بکھیر کر رکھ دیتا۔ کتنا صحیح رد عمل تھا حضرت ابو ایوب انصاری کا جب ان کی بیوی نے  
ان سے ان گندی افواہوں کا تذکرہ کیا وہ کہنے لگے : "ایوب کی ماں ! اگر تم عائشہ کی جگہ اس موقع پر  
ہوتیں تو کیا ایسا فعل کرتیں ؟ وہ بولیں : "خدا کی قسم ! میں یہ حرکت بہ گز نہ کرتی" حضرت ابو ایوب  
نے کہا : "تو عائشہ تم سے بدرجہا بہتر ہیں، اور میں کہتا ہوں کہ اگر صفوان کی جگہ میں ہوتا تو اس طرح کا  
خیال تک نہ کر سکتا تھا۔ صفوان تو مجھ سے اچھا مسلمان ہے۔"

سورہ نور اس گندے بہتان کو بھیلانے والوں کا داسن پکڑ کر پوچھتی ہے کہ آخر تمہیں کیا ہو  
گیا تھا۔ تم نے کیوں نہ ابو ایوب انصاری کا سابقہ عمل دکھایا ؟  
اس کے بعد سورہ نور قانونی نقطہ نظر سے سوال اٹھاتی ہے کہ :

”وہ لوگ (اپنے الزام کے ثبوت میں) چار گواہ کیوں نہ لائے؟ اللہ کے نزدیک وہی جھوٹے ہیں“ (آیت ۱۳)

یعنی کسی مرد و عورت کی عصمت کے دامن پر دھبہ ڈالنا محض ایک دل لگی نہیں ہے، یہ ایک سنگین معاملہ ہے اور اس پر ایک زندہ نظام معاشرہ میں قانونی کارروائی واجب ہو جاتی ہے جس طرح کسی شریف شہری کے بارے میں اٹھ کر یہ کہہ دینا کہ اس نے قتل کیا ہے، اس نے چوری کی ہے، اسی طرح — بلکہ اس سے بڑھ کر — یہ دعویٰ کرنا کہ فلاں شخص نے بدکاری کی ہے، ایک سرسری سی بات نہیں ہے کہ آئی گئی ہو جائے۔ یہ انتہائی ذمہ دارانہ احساس چاہتی ہے۔ ایسے الزام لگانے پر ان کا ثبوت دینا اور ان کے لیے قانونی شہادت فراہم کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اب جو لوگ اسلامی معاشرہ کے دو شریف اور معزز شہریوں کے متعلق اپنی آنکھوں سے کوئی بات دیکھے بغیر محض افسانہ طرازی کے طور پر ایک بہتان کا چرچا کرتے پھر رہے ہیں ان کا فرض یہ ہے کہ وہ ثبوت اور شہادت لائیں۔ ورنہ قانون کے مطابق وہ خود جھوٹے اور مجرم ہیں۔

پھر سورہ نوز مسلم معاشرہ کے کمزور عنصر کی کمزوری کو نمایاں کرتی ہے کہ:

”خود غور تو کرو، اس وقت تم کیسی سخت غلطی کر رہے تھے، جب کہ تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اس جھوٹ کو لیتی چلی جا رہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جا رہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا، تم نے اسے ایک معمولی بات سمجھا، حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات ہے۔ کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا ذمہ نہیں دینا۔ سبحان اللہ یہ تو ایک بہتانِ عظیم ہے۔“ (آیت ۱۵-۱۶)

یہ کسی بھی معاشرے اور کسی بھی نظامِ جماعت کی — خصوصاً جب کہ وہ دنیا بھر کی اخلاقی اصلاح کے لیے قائم ہوا ہو اور اس کے زیر اثر ایک تمدنی و سیاسی تحریک بھی چل رہی ہو — بڑی بھاری کمزوری ہے کہ اس میں بے سرو پا اور بیہودہ اور غیر ذمہ دارانہ باتوں کا آسانی سے چلن ہو سکے۔ کان جو کچھ سنیں، اٹھا کر دل میں رکھ لیں اور دل زبانوں کے حوالے کر دیں اور زبانیں آگے منتقل کرتی چلی جائیں کوئی غور و تامل نہ ہو۔ کوئی تحقیق نہ ہو۔ کوئی رد و کد نہ ہو۔ اور کسی جگہ جا کر سلسلہ رکے نہیں۔ جو جس شخص کے خلاف جیسے کچھ کلمات بھی کہتا جائے، بالکل چھوٹ ہو، جو جس کی پگڑی اچھالنا چاہے اُسے پوری آزادی ہو اور جو جس کے دامنِ عفت کی دھجیاں بکھیرنا چاہے ماحول اسے وسیع موقع بہم پہنچا دے۔

اچھا چمن افکار و کردار ہوگا۔ جس میں فتنہ کا مانی کانٹے بونٹا رہے اور زبانوں کی کباریاں کانٹے اگاتی رہیں۔ جس معاشرے میں سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور عائشہ صدیقہ اور حضرت ابو بکر صدیقؓ اور صفوان جیسی ہستیاں ایک منافق کے چھوڑے ہوئے شوٹے سے محفوظ نہیں رہ سکتیں اس میں اور کس کی عزت و آبرو کی خیر ہوگی۔

سورۃ نور کی آواز میں ایک گونج اور پیدا ہوئی :

”جو لوگ پاک دامن اور بھولی بھالی ایمان دار عورتوں پر تمہیں لگاتے ہیں۔ ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔“ (آیت ۲۳)

اس آیت میں تو گویا حضرت عائشہؓ کے کردار کی تصویر کھینچ کر رکھ دی گئی۔ ایک ایمان دار اور پاک دامن خاتون جو مزاج کی سیدھی سادی تھیں اور جن کو تصویر تک نہ تھا کہ بد چلنی کیا ہوتی ہے اور کیسے کی جاتی ہے اور جن کے حاشیہ خیال میں بھی کبھی یہ اندیشہ نہ گزرا ہوگا کہ کوئی ان پر بھی ایک گھناؤنا الزام لگا دے گا۔ اس آیت میں ان کی مظلومیت پوری طرح بول رہی ہے۔ مظلومیت کی یہ تصویر اخلاقی طور پر ایک ایک دل کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔

بد قسمتی سے جو مخلص، ایماندار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جماعت اور تحریک کے وفادار افراد اس سیل تند و تیز میں بہہ گئے تھے، ان میں سے ایک وہ ہستی بھی جس نے تحریک کی بڑی خدمات انجام دی تھیں۔ اور جس نے اس کے فکری و ادبی سرمائے میں اضافہ کیا تھا۔ یہ تھے حسان بن ثابت۔ سورۃ نور کی الہامی شعاعیں جن حساس لوگوں کے دلوں میں نشتر بن کر اتر رہی تھیں آج حسان بھی ان کے زمرے میں تھے۔ ان کا مرتبہ دائرہ تحریک اور دربارِ نبوت میں خاصا بلند تھا۔ مختلف مواقع پر حضورؐ بطور خاص فرمائش کرتے اور توجہ دلاتے کہ شعرا و ادب کی جاہلی طاقت کے حملوں کا جواب شعر و ادب ہی سے دیں۔ اور اسلام کی ترجمانی کریں۔ اس سعادت کا تصور کیجیے کہ محسنِ انسانیت نے حسان کو خود منبر پر بٹھایا کہ وہ اسلامی تحریک کا ترانہ الایں۔ ان کے اسی مرتبہ کا لحاظ خود حضرت عائشہؓ کو اس قدر تھا، کہ اس بحرانی دور کے گزر جانے کے بعد وہ ہمیشہ ان کی عزت کرتی رہیں۔ بسا اوقات ان کو یاد دلایا جاتا کہ اس شخص نے آپؐ کے خلاف کچھ اچھا کرنے کی مہم میں حصہ لیا تھا، تو وہ شرافتِ نفس کے انتہائی بلند مقام سے فرمائش کہ جالے دو۔ انہوں نے مخالف اسلام شعراء کو رسول اکرمؐ اور اسلامی تحریک کی طرف سے ہمیشہ پر زور جواب دیا ہے اور شاعری کے محاذ پر خاصا جوہر دکھایا ہے۔

لیکن امر واقعہ بہر حال یہی ہے کہ تحریکِ اسلامی کے یہ ممتاز فرد — منافقین کے اٹھانے

ہوئے فتنہ کے گھیرے میں آگئے۔ اس بحران میں ان کا — اپنی جگہ مخلصانہ، مگر تحریک کے لیے نہایت  
 نضر — پارٹ دیکھ کر آدمی یہ درس عبرت حاصل کرتا ہے کہ نہ کوئی بہتر سے بہتر شخص اپنے بارے  
 میں یہ ضمانت رکھتا ہے کہ وہ مغالطے کے کسی چکر میں نہ پڑے گا۔ اور نہ دوسری نمایاں ترین شخصیتوں  
 کے بارے میں وہ بے فکر ہو سکتا ہے کہ وہ کسی فتنے کے گھیرے میں نہ آئیں گی، ہر انسان، بڑا ہو یا چھوٹا  
 ہر وقت شیطان کی کمان سے نکلنے والے تیروں کی زد میں ہے۔ بلکہ فتنے ہر اہم اور بڑے آدمی کے گرد  
 گھیرا ڈالنے کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے تحریک اسلامی کی دی ہوئی بنیادی فکر  
 یہ ہے کہ اشخاص کے بجائے اصولوں کے گرد جماعت مجتمع ہو۔

عبداللہ بن اُبی اور اس کے مریدوں کے لیے کتنی بڑی کامیابی یہ تھی کہ انہوں نے تحریک اسلامی  
 کے ایک ممتاز فرد کو شکار کر لیا تھا — وہ نفاق کے مارے شراںگیزی کر رہے تھے اور حسان بن ثابت  
 اخلاص کے ساتھ ان کے برپا کردہ فتنے کو تکمیل تک پہنچانے میں سرگرم تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا، کہ  
 تحریک کے لیے عبداللہ بن اُبی کا نفاق اتنا خطرناک اور مضر نہ تھا جتنا حسان بن ثابت کا اخلاص! جو  
 اقدام اخلاص اور نیک نیتی سے کیے جاتے ہیں وہ ضرر رسانی میں زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔ بمقابلہ ان اقدامات  
 کے جو دانستہ شرارت کے طور پر کیے جاتے ہیں۔

حسان بن ثابت اس بات کا احساس نہ کر سکے کہ وہ کن لوگوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں، وہ  
 کیسے افراد کے نقطہ نظر کو پھیللا رہے ہیں۔ وہ کن شخصیتوں کے خیالات و عزائم کی ترجمانی کر رہے  
 ہیں اور ان کی حرکات و سکنات معاشرے کے کس عنصر کی حمایت میں جاری ہیں اور جماعت کی کیسی ٹولی  
 کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہیں۔ مشیت ربانی تھی کہ وہ اس معاملہ میں فراستِ مومن سے کام نہ لے سکے۔  
 عبداللہ بن اُبی کے ساتھ اسلامی معاشرہ کا معاملہ دوری اور بیگانگی کا تھا۔ اس کی کلوخ اندازی  
 قابل برداشت تھی لیکن حسان بن ثابت سے جماعت کی جو بیگانگی تھی، اس کی وجہ سے جذبات میں  
 کھولاؤ پیدا ہوتا تھا کہ ہمارے نیام کی ایک تلوار ہمارے ہی خلاف استعمال ہو رہی ہے۔ یہ صورت  
 جب بھی کسی تحریک اور تنظیم میں پیدا ہوتی ہے تو صبر کے پیمانے لبریز ہو جاتے ہیں۔ صبر کے پیمانے  
 لبریز ہوئے ہوں گے۔ مگر مسلم جماعت کا کڑا اخلاقی ڈسپن جذبات کے آگے روک بنا کھڑا تھا۔  
 ایک شخصیت ایسی تھی جو ضبط برقرار نہ رکھ سکی۔ یہ صفوان بن المعطل تھے۔ جن کو ایک یہ صدمہ تھا کہ  
 حضرت عائشہ رضوان کے لیے بمنزلہ ماں کے تھیں ان پر تہمت لگائی جا رہی تھی اور دوسری طرف یہ  
 کرب کہ افسانے کا دوسرا سرا خود ان کی ذات سے جوڑا گیا تھا۔ وہ شخص کہ جو اصحابِ بدر میں سے تھا

جس نے تحریک کی رسالت سرانجام دی تھیں جو جتنی سستی ہونے کے لحاظ سے معروف تھا، جس کے گرداب میں آج تک کوئی آثار فسق و فجور کے نہ پلٹے گئے تھے اور جس نے ایک مشرمیلے بیٹے کی حیثیت میں حضرت عائشہؓ کو دیکھے بغیر اور سر سے راستے بات کیے بغیر پوری احتیاط کے ہاتھ چپے پڑنے سے لشکر گاہ تک پہنچایا تھا ان کا خون اس زیادتی پر بری طرح کھولا۔

صفوان نے حضرت حسان کے کچھ اشعار سنے جو منافقین کے لگائے ہوئے ہمتان عظیم پر مشتمل تھے۔ زبان حضرت حسان کی تھی جسے وقتی طور پر اشعار کے خیالات نے مستعار لے لیا تھا۔ فن ان کا تھا اور ذہن شیروں کا بون رہا تھا۔

صفوان کی ان سے جھڑپ ہوئی اور انہوں نے تلوار سے دار کر دیا۔ ثابت بن قیس بن شیبہ نے موقع پر بچاؤ کیا اور صفوان کو پکڑ کر باندھ لیا۔ اور بنی سورت کی سویلی میں لے گئے۔ آخر یہ قضیہ محسن انسانیت کی خدمت میں پہنچا۔ حسان اور صفوان دونوں کی حلہی ہوئی۔ صفوان نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس شخص نے مجھے اذیت دی ہے اور میرے حق میں سخت بدگوئی کی ہے سو مجھ پر غصہ آسوار ہوا اور میں نے اسے مارا۔ آپ نے ملاکت سے حسان کو سمجھایا بچھا یا۔ اور بعد میں صفوان کی طرف سے تلوار کے زخم کے بدلے دیت دلوئی گئی۔

صفوان کی غیرت چونکہ بالکل نظری تھی۔ حسان بن ثابت نرم پڑ گئے۔ اور خدا نے زکوٰۃ اس خاطر سے بچایا کہ وہ کسی غلط جذبے کی زد میں آگے ہتے چلے جاتے۔ اور تحریک کے لیے نیر موجب ضرر ہوتے۔

حضرت حسان کا بجز بڑا مذمت آرا ایک قصیدہ بنی سورت میں ہے۔ جس میں شعرے پانی سے انہوں نے اپنے ہی لگائے ہوئے رہے جو حضرت عیسیٰؑ کے دامن تک سے دھونے کی کوشش کی۔ کیا خوب فرمایا:

حِصَانٌ دَرَانٌ مَا تُفْنِنُ بِرِيْبِيْتِ  
وَتُصْبِحُ غَرَّتِي مِنْ لُحْمِيْرِ الْغَوَافِلِ  
مُهَذَّبَةٌ قَدْ طَيَّبَ اَنْفُخِيْمَهَا  
وَطَهَّرَهَا مِنْ كُلِّ سُوءٍ وَرَسَاوِلِ

فَاتَّذِنِي قَدْ قَبِلَ لَيْسَ بِلَايِطٍ  
وَلَكِنَّهُ ، قَوْلُ امْرِي فِي مَا حِلِّ

”وہ ایک عفت مآب خاتون ہیں۔ پردہ نشین، ہر شک و شبہ سے بالاتر۔ وہ اس سے پاک ہیں کہ بھولی بھالی عورتوں کے عزت و ناموس سے تعرض کریں۔ وہ شائستہ اطوار ہیں۔ خدا نے ان کو مزاج کے لحاظ سے نکھارا، اور نتھارا ہے اور ان کو گناہ اور باطل سے پاک کیا ہے، وہ جو کچھ کہ اب تک کہا جا چکا ہے وہ موصوفہ پر چسپاں ہونے والا ہرگز نہیں ہے، وہ تو ایک ایسے شخص کی کہی ہوئی بات تھی، جس نے میرے سامنے نمک مرچ لگا کر اور جھوٹ گھڑ کر چٹا خوری کی تھی پلے پھر سورہ نور نے ایک معاشرتی حقیقت کو اصولی استدلال کے طور پر مسلم جماعت کے سامنے کھول کر رکھا کہ :-

”خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لیے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لیے پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے۔ ان کا دامن پاک ہے ان باتوں سے جو گھڑنے والے گھڑتے ہیں۔“ (آیت ۲۶)

یعنی ازدواج کے لیے یوں بھی ذہنی و اخلاقی لحاظ سے جوڑا تلاش کیا جاتا ہے اور نفسیاتی طور پر آدمی کی نگاہ انتخاب وہیں ٹہکتی ہے جہاں اسے اپنے کردار کا عکس نظر آتا ہے۔ خصوصیت سے کسی اصول و مقصد کو لے کر جو لوگ ساری متعارض حیات اس میں لگا دیتے ہیں، وہ ازدواجی رابطے کے لیے بھی ایسا ہی رفیق تلاش کرتے ہیں جو زندگی کے مشن میں مدد اور مفید ثابت ہو سکے۔ پھر عالمگیر پیمانے کی یہ تجربی صداقت کیسے نظر انداز کی جاسکتی ہے کہ نبھاؤ اور صلح و سازگاری کسی جوڑے میں تبھی ہوتی ہے کہ قلب و نظر کا جوڑا میل پیدا ہو جائے اور ذہن و کردار میں یکسانی ہو۔ ورنہ از اول تا آخر تصادم رہے گا۔ یہ آیت بہتان طرازوں کو دعوتِ فکر دیتی ہے کہ تم نے یہ نہ دیکھا کہ دائرہ ازدواج میں تحریکِ اسلامی کے بلند مرتبت رہنما کی نگاہِ انتخاب جس ہستی پر پڑی تھی، جس سے گہرا قلبی لگاؤ تھا اور جس کے ساتھ قلب و نظر کی سازگاری وہم آہنگی ایک معیاری نمونہ تھی وہ کیا تمام تر ملمع کا کرشمہ تھی کہ ایک آن میں ملمع اتر گیا۔ اور کھوٹ باقی رہ گیا۔

ایک پاکیزہ گھرانے کی نور چشم جس کے ماں باپ تحریکِ اسلامی کے اولین علمبرداروں میں سے تھے اور جس کا بچپن اسی تحریک کی نت ایڈیٹی گھٹاؤں کے ساتھ میں تربیتِ فکر و نظر پاتے گزر ا پھر جسے سرکارِ رسالت مآب کے ساتھ یکجہتی کا شرف حاصل ہوا۔ جسے قریب ہو کر آپ کے نورانی کردار سے استفادہ کرنے کا سب سے بڑھ کر موقع ملا۔ جسے محسنِ انسانیت کی تربیت کا فیضانِ خاص حاصل ہوا اور جس کے حجرے میں بارہا وحی و الہام کی کرنوں کی بوجھاڑیں ہوتی رہیں۔ کیا ایسے پاکیزہ ماحول کے سانچے میں ڈھلی ہوئی خاتون کا کردار ایسا ہونا چاہیے تھا کہ ایک غلیظ ترین بہتان کا جامہ اس کے قامت پر راست آجائے۔ در آنحالیکہ اس کے والدین کو اور نہ سرورِ عالم کو اور نہ عام معاشرے کو اس کے بارے میں اس بہتان طرازی سے قبل ایسا کوئی اندازہ ہو سکا ہو۔ برسوں سے ایک کردار جو حسن و پاکیزگی کے خطوط پر ارتقا کرتا رہا ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ یکایک اس کے اندر سے ایک بدترین قسم کی گھناؤنی حرکت نمودار ہو جائے کہ جس کے کوئی ابتدائی آثار کبھی کسی کے سامنے نہ آئے ہوں۔ ایک شجرہ طیبہ کمالِ شادابی کے ساتھ پاکیزہ برگ و بار دیتے دیتے یکایک ایک دن خبیث پھل لے آئے۔ آخر یہ کیسے ممکن ہے ؟

### قانونِ حرکت میں آتا ہے :

سورۃ نور کی روشنی سے اہل ایمان کے دلوں کی نگریاں جگمگا اٹھیں، راتے عام یکسو ہو گئی۔ معاشرہ نے مرد و بزرگ کے ایک لمبے دور کے بعد اپنی سطح کو پرسکوں اور ہموار کر لیا۔ سورۃ نور حدِ قذف کے قانون کا کوڑا اپنے ساتھ لائی تھی۔ سو جن جن اصحاب نے سرگرمی سے بہتان طرازی کی اس مہم میں حصہ لیا تھا اور جو اپنے اخلاص کی وجہ سے نادم ہو کر جرم کے اقراری بھی ہوئے اور جن کے بارے میں شہادت بھی موجود تھی انہوں نے اپنی پیٹھیں اسلامی نظامِ عدل و قانون کے سامنے پیش کر دیں اور اسی کوڑے کھٹا کر انہوں نے اپنے صنمیروں کی پاکیزگی کو بحال کر لیا۔ یہ تھے مسطح ابن اثاثہ، حسان بن ثابت اور حنہ بنت جحش۔ لیکن اصل بائی ثر و فساد قانون کی گرفت سے بچ نکلا۔ البتہ راتے عام کی نگاہ میں اس کی فطرت کی پستی کھل طور پر آشکارا ہو گئی اور اسلامی معاشرے نے اسے بے وقعت بنا کر ایک طرف ڈال دیا۔

غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں اور کس ماحول اور کس جماعت میں انبیاء کے خصوصی اتھنے کے ساتھ انسانی فطرت مقامِ امتحان سے نکل کر عصمتِ کاملہ کی قدسیانہ سطح پر پہنچ سکتی ہے لیکن قصہ آدم کے دو متقابل کرداروں کی روشنی میں دیکھیں تو غلطی سرزد ہو جانے پر غلط کارکنے سامنے دورا سنے کھل جاتے ہیں۔ ایک شیطان کا پسندیدہ راستہ — کہ غلطی ہو جانے کے بعد اس پر آدمی ڈٹ جائے۔ اور اٹا بپھر جائے۔ دوسرا



آدم علیہ السلام کی فطرتِ سلیم کا پسندیدہ راستہ — کہ غلطی کے بعد نادام ہو کر اپنی اصلاح کر لی جائے۔  
سو عبد اللہ بن اُبی اور اس کے ساتھی تو شیطانی راستے کی طرف مڑ گئے اور حسان اور مسطح اور حمزہ نے اصلاح  
کا راستہ اختیار کیا۔

### عدو و شر کے برانگیز و کہ خیر ماوراء باشد :

سلسلہ اوقات کو نگاہِ تصور میں تازہ کریں اور اپنے آپ کو مدینہ کے اس ماحول میں لے جائیں جس  
میں یہ بہتان کا جھکڑ مہینہ بھر چلتا رہا تھا۔ تو ایک ہولناک اور دردناک سماں سامنے آتا ہے۔ ایک تحریک  
جو ایک ایک فرد کو آہستہ آہستہ ساتھ لے کر ایک چھوٹے سے کاروانِ انقلاب کی شکل اختیار کر سکی تھی جس  
نے کتنی ہی مرد آزما منزلوں کو پار کر کے اسلامی ریاست کا ایک چھوٹا سا گھر وند انسانیت کو پناہ  
دینے کے لیے سالہا سال کے بے دورِ فساد کے بعد کربہ ارضی کے ایک گوشے میں تیار کیا تھا، جو  
چاروں طرف سے دشمنوں کی ٹہنی تھی۔ اور جس کو ہر آن کسی نہ کسی جانب سے فوج کشی کا خطرہ تھا  
اور جو خود اپنے غیر مسلم شہریوں کی ایک بڑی تعداد کی شرارتوں کے گھیرے میں تھی، اس کے بالکل  
اندرون سے اگر ایک تباہ کن طوفان اُبل پڑے تو اس سے بڑھ کر اور کون سا موقع اضطراب ہو  
سکتا تھا۔

لیکن قرآن نے تسلی دلائی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں — ”اسے اپنے حق میں موجبِ ضرر  
نہ سمجھو، یہ تو تمہارے لیے بھلائی کا ذریعہ ہے“ (نور — ۱۱)

اور واقعہ یہ ہے کہ اصولی و انقلابی تحریکوں کے لیے ذہنی شکست و ریخت کے ہنگامے  
خواہ باہر سے اٹھیں، خواہ اندر سے — انجام کار کے لحاظ سے مزید فلاح و ترقی، تعمیر و اصلاح  
اور قوت و سطوت کا سامان بن کے رہتے ہیں۔ جس طرح ادنیٰ مقصد رکھنے والے صلاحیت دار  
افراد کے لیے حوادثِ روزگار معاونِ ترقی ہوتے ہیں اسی طرح روحِ فکر و عمل رکھنے والی تحریکوں  
کے لیے مخالفتوں اور مزاحمتوں اور فتنوں کے طوفان وسیلہ استحکام و ارتقا بن جاتے ہیں، جس  
نظامِ جماعت میں نصب العین کا شعور کار فرما ہو، جس کا ایک اجتماعی ذہن بن چکا ہو، جس کا  
فکری و اخلاقی مزاج پختہ ہو چکا ہو، جس کے سر پر ایک فعال اور بیدار مغز قیادت بیٹھی ہو اور  
جس میں فتنوں اور مخالفتوں کے ہر مد و جزر پر نظر رکھنے والے، طوفانوں کو تہہ تک پڑھ لینے والے  
اور ان کے مقابل میں سینہ سپر ہو جانے والے مضبوط کارکن موجود ہوں اور جس کی رائے عام کسی  
فاسد نظریہ و اقدام کو اپنے دائرے میں چلنے نہ دے۔ ایسا نظام جماعت ہر مخالفت و شرارت سے

پیہہ کا کر نکلتا ہے۔

چنانچہ پروپگنڈے کے اس گندے طوفان کی موجوں سے بھی مدینہ کی اس عظیم المرتبت اسلامی جماعت نے کئی پہلوؤں سے اپنے دامن میں خیر و فلاح کے موتی سمیٹے اور وہ اس سے نکلی تو پہلے سے زیادہ مضبوط اور پہلے سے زیادہ چاق و چوبند تھی۔

نیکی اور سچائی کی اس نورانی تحریک کے علمبرداروں کو انسانیت کی ان خطرناک اور وسیع الاثر کمزوریوں کا علم براہ راست تلخ تجربے کے ذریعے ہوا جس کا تصور بھی کسی خانقاہ میں بیٹھ کر نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ ان کا مقابلہ کرنے کے لیے انسانی سیرت کو تیار کیا جاسکتا ہے۔ جماعتی زندگی کے وہ رخنے پوری طرح سامنے آگئے جن میں سے معاشرے کو تہہ و بالا کر دینے والے مفسد کا داخلہ ہوتا ہے۔ حضور سرور عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے رفقاء کے سامنے جماعت کے مختلف عناصر — نفاق کے روگی، ضعیف الایمان لوگ، سطحی اور جذباتی مزاج رکھنے والے، نیک نیتی کے ساتھ کسی غلط رویے میں بہہ جانے والے اور دشمنوں کا شکار ہو جانے والے سادہ لوح انفرادی بھی الگ الگ نمایاں اور ممیز ہو گئے۔ خصوصیت سے نفاق کے شیطان نے جماعت کے اندر جو ایک الگ الگ کردی منظم کر دی تھی، اس کے بارے میں پوری طرح وضاحت ہو گئی کہ وہ کہاں تک جاسکتی ہے۔ عملی تجربے کے میدان میں جماعت کے اندرونی ماحول کی ان کمزوریوں کے سامنے آ جانے سے وہ خاص ذہنی کیفیت پیدا ہوئی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طرف نئی اخلاقی ہدایات دے کر تربیت کا انتظام کیا گیا اور دوسری طرف ایسے معاشرتی احکام کا نفاذ کیا گیا جو گونا گوں مفسد سے جماعت کو بچانے کا ذریعہ ہو سکتے تھے۔ تیسری طرف نئے قوانین اور حدود و تعزیرات پر مشتمل ایک کڑا ضابطہ نازل ہوا جو ہمیشہ کے لیے انسانیت کی اجتماعی فلاح و بہبود کا ضامن بنا۔ اس واقعہ نے مدینہ کی سوسائٹی کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا۔ اس کو اخلاقی حس کی چوٹیں لگا کر بیدار اور اس کی جماعتی حمیت و غیرت کو تازیا نے برسا کر متحرک کر دیا۔ پوری جماعت نفاق کے اس اضطراب انگیز حملے سے نکلی تو اس کا ایک ایک فرد پہلے سے زیادہ چوکنا اور مضبوط تھا۔

اس ہنگامہ کے طوفان سے گزرتے ہوئے حضرت عائشہؓ کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ منظم ذات خود محسن انسانیت ہی کی تھی۔ لیکن جس عالی ظرفی، حوصلہ مندی اور صبر و تحمل کا مظاہرہ حضور نے بنے ٹھنڈے غیر جذباتی اور باوقار طرز عمل سے کیا۔ وہ النہای کو حیرت میں ڈال دینے والا ہے۔ اور یہ حضور کے بعد اسلامی تحریک اور نظام جماعت کی قیادت کرنے والوں کے لیے ایک ف

نمونہ پایا جاتا ہے کس بڑے پیمانے کی ایذا تھی جو سہنے والے نے محض اس قصور میں سہی کہ وہ دنیا سے انسانیت کو ایک نظامِ رحمت سے مالا مال کرنا چاہتا تھا جو سارے انسانوں کے ناموس بچانے کے لیے اٹھا تھا اسے زلنے نے صلہ یہ دیا کہ خود اس کے ناموس پر گندگی اچھال دی۔ کوئی دوسرا اس چکر میں پڑا ہوتا تو یا تو مخالفین کو پسینہ رکھ دیتا، یا پھر بیزار اور مالوس ہو کر گوشہ نشین ہو جاتا۔ مگر وہ پیکرِ صبر و عزیمت فرض کی راہ پر چلتا رہا، چلتا رہا۔ کانٹے اس کے قدموں کو لہو لہان کرتے رہے اور وہ پھر بھی آگے ہی بڑھتا رہا۔

## شہر انگیزیاں :

مدینہ کے یہودی قبائل ایک طرف اپنی جی جاتی قوت کے زعم میں اور دوسری طرف سیاسی ضرورتوں کے تحت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک دستوری معاہدے کے پابند ہو کر اسلامی ریاست کے نظم میں آچکے تھے۔ اول تو وہ اس نئی سیاسی ہیئت کو وقت پر پوری طرح سمجھ بھی نہ پائے ہوں گے پھر ان کو اس کے روشن مستقبل کا مشکل ہی سے کچھ اندازہ ہو سکا ہو گا کہ یہ انتہائی تیز رفتاری سے نشوونما پائے گی اور چند بے خانماں افرادِ مدینہ کے انصار کے تعاون سے ایمان و کردار کے بل پر تاریخ کی باگ ڈور تھامنے والی قوت بن جائیں گے۔ ان کے اندازے یہ ہوں گے کہ شاخسارِ وطن سے ٹوٹ گرنے والی یہ چند مسلم ہوئی خشک پنیاں اول تو حادثات کے جھونکوں میں اڑ جائیں گی۔ اور اگر یہ پڑی بھی رہیں تو ان سے کوئی چمن شاداب تو وجود پالنے کا نہیں۔ مگر کلمہ طیبہ کی عظیم انقلابی روح کا اعجاز تھا کہ مخالف قوتوں بھرے ماحول میں گھری ہوئی ان چند جانوں سے ایک پر زور سیاسی ہیئت تشکیل پاتی چلی گئی اور چند مہینوں کی گردشوں میں یہود کو اندازہ ہو گیا کہ اسلامی ریاست ایک ایسا چڑھتا سورج ہے کہ جس کے سامنے ان کے اثر و رسوخ کی مشعلیں روشن نہ رہ سکیں گی خصوصاً جنگ بدر سے اسلامی تحریک کا نہ صرف زندہ و سلامت بیج نکلنا بلکہ علم فتح لہراتے ہوئے مدینہ پلٹنا یہود کے لیے ایسا مہوت کُن واقعہ تھا کہ یقیناً وہ سارے معاملے کو از سر نو سوچنے پر مجبور ہو گئے ہوں گے۔

معاہدہ تعلق نے ان کو اسلامی ریاست کا حلیف بلکہ پابند دستور و قانون شہری بنا دیا تھا لیکن ان کی رو میں حریفانہ و باغبانہ رجحانات سے بھرپور تھیں۔ مارے حسد کے ان کے جگر اندر ہی اندر کباب ہوئے جاتے تھے۔

اس متضاد پوزیشن نے ان کو فتنہ انگیزی کی راہ پر ڈال دیا۔ وہ ہر موقع سامنے آنے پر بلکہ خود ایسے مواقع پیدا کر کے یہ کوشش کرتے کہ کسی طرح اسلامی معاشرہ کی وحدت پارہ پارہ ہو۔ کسی

طرح مسلمانوں کو اشتغال میں ڈال دیا جائے۔ کسی طرح نظم کو معطل کیا جائے۔ لاء اینڈ آرڈر کو غارت کیا جائے۔ اور بحران پیدا کر دیا جائے۔ کسی طرح حضور کی قیادت کو کمزور کر دیا جائے۔ ان لوگوں کے اپنے ہی آدمی نفاق کا جامہ اوڑھ کر مسلم معاشرہ کے اندر موجود تھے اور وہ انصار میں سے ضعیف الایمان لوگوں کو ساتھ ملا کر یہود کے منصوبوں کو جامہ عمل پہناتے تھے۔

ان کینہ تو زد دشمنوں کی شریکوں نے ایک راہ یہ نکالی تھی کہ یہ لوگ مسلمان خواتین کے نام لے لے کر فحش اشعار کہتے اور ان کو پھیلانے۔ ان کے ناموں کو رسوا کرنے کی کوشش کرتے۔ اس گندی شاعری نے ان کے ذہنوں کو اس طرح پر نشوونما دی کہ عصمت جیسی بنیادی تہذیبی قدر کا احترام بھی ان کے دلوں سے اٹھ گیا۔ یہود کے اس حیا باختہ ذہن کا اظہار ایک موقع پر ایسے ہوا کہ کچھ یہودی افراد بالکل بازاری غنڈوں کی سطح پر اتر آئے تھے۔ بنو قینقاع کی ایک مستقل آبادی مدینہ کا ایک جزء تھی۔ ان کے بازار میں ایک مسلمان عربی عورت سودا لینے گئی۔ دکاندار نے اس سے چھیڑ چھاڑ کی، اور بالآخر اسے سب بازار ننگا کر دیا۔ اس حرکت پر وہ اور اس کے ہم جہیں شرمندہ ہونے کے بجائے اس کی مہتی اڑانے لگے۔ عربی طریقے پر وہ چلائی اور اس نے مدد کے لیے صدا بلند کی۔ ایک عربی نوجوان کی حمیت اس کی پیچ سُن کر حرکت میں آگئی۔ اس نے جوشِ غیرت میں بے قابو ہو کر بد معاش یہودی کو قتل کر دیا۔ اشرار کی مراد بر آئی۔ مسلمان عربوں اور یہودیوں کے درمیان بلوی ہو گیا۔ حضور کو اطلاع ہوئی تو موقع بہرہ تشریف لے گئے۔ قینقاع کو ایسی گندری حرکت پر ملامت کی۔ اور متنبہ بھی کیا کہ ”اے گروہ یہودیو! اپنی اصلاح کرو، پیشتر اس کے کہ تم کو بھی وہی کچھ پیش آئے جو کچھ کہ (بدر میں) قریش کو پیش آیا ہے۔“

بنو قینقاع کے سینوں میں چونکہ برد اینٹ ابن سعد بغض و حسد کی جذبات موجزن تھے اس لیے انہوں نے بہت ہی تیز و تند لہجے میں جواب یہ دیا۔ کہ ”اے محمد! تمہیں اپنے بارے میں اس بنا پر کوئی مغالطہ نہ ہو کہ تم نے قریش کے کچھ آدمی مار دیے ہیں۔ وہ بے طاقتے لوگ ہیں۔ وہ لڑنا جانتے ہی نہیں۔ خدا کی قسم اگر تم نے ہمارے خلاف تلوار اٹھائی تو تم خود جان لو گے کہ ہم ہیں لڑنے والے لوگ! ہماری طرح کے لوگوں سے تمہیں ہرگز سابقہ نہیں پڑا۔“

یہود کو یہ بات بہت بری طرح کھلتی تھی کہ انصار جوان کے مقابلے میں ذہنی اور سیاسی

محافظ سے کمزور تھے۔ اسلامی تحریک نے ان میں زندگی کی نئی روح دوڑادی تھی اور ایک مقدس نصب العین کی لگن نے ان کو آپس میں بھی اور مہاجرین کے ساتھ بھی وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا۔ یہود کا مشہور زیرک بڑھا شناس بن قیس حالات کی اس تبدیلی کو بڑی تشویش سے دیکھتا اور تحریکِ حق کے علمبرداروں کے خلاف اس کا سینہ حسد اور کینہ سے بھرا رہتا۔ ایک بار اس نے بنی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رفقاء کی ایک مجلس کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا جس میں اوس اور خزرج کے کچھ لوگ بات چیت کر رہے تھے، ان کی باہمی الفت، خیر سگالی اور اسلام کی پیدا کردہ اجتماعیت کا رنگ دیکھ کر اس کا کلیجہ جل بھن گیا۔ کجا جاہلیت کی وہ آویزش اور کجا ایک جان ہونے کا یہ منظر! دل ہی دل میں کہنے لگا۔ اس شہر میں اب قبیلہ (انصاریوں کی جدہ) کی اولاد شیر و شکر ہو گئی ہے۔ یہ لوگ اگر اس طرح مربوط ہو جائیں تو پھر ہمارے لیے چین حرام ہے۔ اس کے کینہ نے ایک منصوبہ لپکایا۔ اور ایک یہودی نوجوان کو اس نے آلہ کار بنا کر تلقین کی کہ تم جا کر اوس لوگوں میں بیٹھو اور ان میں گھل مل کر جنگ بٹھاؤ اور اس سے قبل کے معرکوں کی یاد تازہ کرو۔ جب کہ اوس نیزہ برج لڑا کرتے تھے۔ چنانچہ اس آلہ کار نے اپنا پارٹ بخوبی ادا کیا۔ ایک مجلس میں اوس و خزرج کے لوگ مل کر بیٹھے تھے۔ جاہلی تاریخ کا تاریک باب ان کے سامنے آیا تو وہی موضوع گفتگو بن گیا۔ آہستہ آہستہ منافرت ہونے لگی، طنز و تعریض کی جانے لگی۔ تیزی آگئی، دونوں طرف سے جوشیلے جانباڑا منہ نکالنے آکھڑے ہوئے کہ کیوں نہ نئے سرے سے معرکہ لڑ کے دیکھ لیا جائے کہ کون کیا ہے؟ ہتھیار لاؤ، ہتھیار! کا شور بلند ہوا۔ اوس نے اوس والوں کو پکارا، اور خزرج نے خزرجیوں کو، معرکہ کے لیے جگہ اور وقت کا بھی تعین ہو گیا۔ جوش میں پھرے ہوئے لوگ تیار ہو کر نکل ہی رہے تھے کہ حضور مہاجرین میں سے چند اصحاب کو لے کر موقع پر جا پہنچے، اور ان کو بالفاظِ ذیل خطاب فرمایا:

”اے گروہِ مسلمانان! خدا خدا کرو! بعد اس کے کہ خدا نے تم کو اسلام کا راستہ دکھایا اور اس کے ذریعے تمہیں سر بلند کیا۔ اور تمہاری گردنوں سے نظامِ جاہلیت کا قدادہ کاٹ پھینکا اور تمہیں کفر سے نجات دلادی اور تمہاری دلوں کو محبت سے جوڑ دیا، تم میرے موجود ہوتے ہوئے جاہلیت کے نعرے بلند کرنے لگے ہو؟“

یہ تقریر سن کر لوگوں نے محسوس کیا کہ یہ سارا ہنگامہ شیطانی فتنہ ہے اور دشمنوں کی رخنہ انداز کا منت کش۔ انہوں نے تدامت سے گردنیں جھکا دیں اور مطیعانہ شان سے حضور کے ساتھ واپس ہوئے۔

ایسا ہی ایک موقع غزوہ بنو مطلق کے سفر میں آیا جہاں یہود کے آلہ کار بننے والے منافقین نے عبداللہ بن ابی کے زیر اشارت مہاجرین و انصار میں خوف ناک حد تک اشتعال پیدا کر دیا۔ اس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں۔ حضور نے اس موقع پر بھی بڑی حکمت سے صورتِ حالات کو سنبھالا۔ اس طرح کے فتنوں میں سب سے بڑھ کر منظم فتنہ وہ تھا جس نے مسجدِ ضرار کی صورت میں ظہور کیا۔ اس فتنہ کا اصل بانی مہاجر قبیلہ خزرج کا ایک شخص ابو عامر راہب تھا۔ حضور کے مدینہ آنے سے قبل یہ اپنے علمِ کتاب اور تقشف کی وجہ سے بہت با اثر تھا۔ حضور جب مدینہ آ کر مرجعِ خاصِ عام بن گئے۔ تو ابو عامر کے اثر و رسوخ کا چراغ گل ہو گیا۔ دل ہی دل میں وہ کڑھتا۔ بدر کے واقعہ نے جو مستقبل اس کے سامنے نمایاں کیا اس کا مشاہدہ کر کے اس کی آنکھوں میں نشتر اتر گئے۔ اس نے ایک طرف جنگِ احد کے لیے سردارانِ مکہ کو اکسایا، دوسری طرف عرب کے مختلف سرداروں سے ساز باز کی تیسری طرف خود انصار کو رسولِ اکرم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی دعوت دی، اور چوتھی جانب ہرقلِ روم کو فوجیں چڑھا لینے کی دعوت دی۔

اس نے منافقین سے یہ ساز باز کی کہ حضور کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک متوازی اڈہ کھڑا کیا جائے۔ چنانچہ اسی منصوبہ کے تحت مسجدِ ضرار کھڑی کی گئی۔ اس مرکزِ فساد کے بانوں نے حضور سے بڑے ڈرامائی انداز میں یہ درخواست کی ہم نے یہ مسجد ایسے کمزوروں اور معذوروں کے لیے تعمیر کی ہے جو زیادہ دور نہیں جا سکتے۔ نیز اندھیری راتوں اور بارش اور طوفان کی صورت میں آس پاس کے لوگ اس میں آسانی سے جمع ہو سکیں گے۔ آپ اس میں چلیں اس کا افتتاح فرمائیں اور اسے برکت اندوز کریں۔ حضور اس وقت تبوک روانہ ہو رہے تھے، لہذا آپ نے اس معاملے کو واپسی تک کے لیے ملتوی کر دیا۔ واپسی میں وحی کے ذریعے آپ کو متنبہ کر دیا گیا کہ،

”اور وہ لوگ جنہوں نے (اسلامی معاشرہ کو) ضرر پہنچانے، کفر کرنے، مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے اور پہلے سے خدا و رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں کو گھات لگانے کا اڈا فراہم کرنے کے لیے مسجد کھڑی کی ہے — اور وہی جو قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ (اس کام میں) ہم نے تو فقط نیک مقاصد ملحوظ رکھے ہیں (ان کی حقیقت یہ ہے کہ) اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ قطعی طور پر جھوٹے ہیں۔“

اس میں آپؐ ہرگز ہرگز کبھی قیام نہ فرمائیں۔ ہاں وہ مسجد (یعنی مسجد قبا) کہ جس کی بنیاد اول روز سے پرہیزگاری (کے جذبات) پر رکھی گئی ہے۔ وہی زیادہ مستحق ہے، کہ آپؐ اس میں (عبادت کے لیے) کھڑے ہوں۔ اس میں ایسے لوگ ہیں جو اس بات کے خواہاں ہیں کہ پاکیزگی اختیار کریں۔ اور اللہ پاکیزگی چاہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔“ (توبہ - آیات ۱۰۷، ۱۰۸)

عبرت لیجیے، کہ جذبہ حسد و رقابت کا نفا سب کس طرح ایک شجرہٴ خبیثہ پیدا کرتا ہے، دیکھیے کہ کس طرح اسلامی تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے کفر بھی ایک مسجد کا خوشنما پردہ فراہم کرتا ہے۔ توجہ دیجیے اس پر کہ دین کو نقصان پہنچانے کے لیے جو فتنے کھڑے کیے جاتے ہیں وہ کس طرح اپنے قیامت پر دین و تقوٰے ہی کے جامے راست کر کے نمودار ہوتے ہیں۔ سبق لیجیے کہ کتنی جماعت بندیاں کتنی مخالف ہیں، کتنی مسجدیں، کتنے حلقہ ہائے درس، کتنے اشاعتی ادارے اور کتنے جرائد آج بھی ہمارے سامنے نمودار ہوتے اور نشوونما پاتے چلے جاتے ہیں جن میں اسی مسجد ضرار کی سی روح بد کام کر رہی ہوتی ہے۔ اور ان کے بانی دعویٰ یہی لے کر اٹھتے ہیں کہ ”ان ادنا الا الحسنی“

اگر یہ مسجد خدا کی عبادت ہی کے لیے بنائی گئی ہوتی، اگر اس کا مقصود معذور مسلمانوں کو نماز کی سہولت فراہم کرنا ہی ہوتا تو یہ ضرورت خود حضورؐ کے سامنے پیش کی گئی ہوتی۔ اسلامی معاشرہ کی قیادت اس کی تعمیر کا فیصلہ کرتی اور جس طرح دوسری مساجد پوری جماعت کے اشتراک سے بنی تھیں، اسی طرح یہ بھی وجود پاتی۔ جماعت اور اس کی قیادت سے بالا بالا بیٹھ کر کچھ لوگ سرگوشیاں کر کے ایک خفیہ منصوبہ بناتے ہیں۔ اور چپکے سے صحیح معنوں میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کھڑی کر دیتے ہیں۔ در آنحالیکہ مسجد قبا اس کے قریب ہی پہلے سے موجود تھی۔ تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس متقیانہ کارنامہ کی دال میں کچھ نہ کچھ کالا ہے۔ اسے وحی نے نکال کر معاشرے کے سامنے رکھ دیا۔ کسی مقصد کے لیے کام کرنے والے نظام جماعت کے ہوتے ہوتے کچھ لوگ اس کے اندر اگر اپنی الگ ٹکڑی بنا کے سوچتے ہیں اور مجموعی نقشہ کار سے الگ ہی الگ اپنے منصوبے بناتے اور روبرو عمل لاتے ہیں تو وہ اپنی شانِ تقوٰے بازی کو منوانے کے لیے کتنی ہی نفاظی کرتے پھریں اور کیسے ہی خوشنما بہروپ بھریں نتیجہ بہر حال ضرار، کفر اور تفریق کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔

چنانچہ مسجد کے مقدس نام سے قائم ہونے والا یہ ناپاک اٹا فرمانِ نبوت کے تحت جلا کر

راکھ کر دیا گیا۔ تاکہ اس کے ساتھ اس کی منحوس تاریخ بھی ملیا میٹ ہو کر رہ جائے۔  
 منحصر یہ کہ الہی ہدایت کے ان ٹھیکیداروں اور انبیاء کے وارثوں نے شرانگیزی کا کوئی موقع  
 ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ان پریشان کن حرکتوں سے کہیں برٹھہ چڑھ کر ان کی وہ تخریبی سازشیں تباہ کن  
 تھیں جو ہر موقع جنگ پر اسلامی نظامِ دفاع کو نقصان پہنچانے کے لیے عمل میں لائی جاتی رہیں۔ ان کا تذکرہ  
 ہم آگے کریں گے۔

## نظامِ انصاف میں رخنہ اندازی :

کسی بھی نظامِ حکومت کا چلنا اس کے دو وظائف کے صحیح طور پر انجام پانے پر منحصر ہے۔ ایک  
 یہ کہ اس کا دفاع مضبوط رہے، دوسرے یہ کہ اس کا عدالتی نظام ٹھیک طریق سے کام کرتا رہے اور  
 اس کے قوانین نافذ ہوتے رہیں۔ پہلا وظیفہ بیرونی حملوں سے بچاؤ کے لیے ہے۔ اور دوسرا وظیفہ  
 اندرونی مفاسد کی روک تھام کے لیے ہے۔ لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کو ان دونوں  
 وظائف کی انجام دہی میں یہود و منافقین کی طرف سے شدید مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہاں ہم یہ  
 بتانا چاہتے ہیں کہ ان مزاحم قوتوں نے کس طرح اسلامی ریاست کے نظامِ عدل میں خلل اندازیاں کیں  
 اور سول نظم کو کمزور کرنے کے لیے کیا کارستانیاں دکھائیں۔ ایک نوخیز ریاست کے سول نظم کو ہی اگر  
 قائم نہ ہونے دیا جائے تو وہ نہ تو داخلی مشکلات پر قابو پاسکتی ہے اور نہ خارجی قوتوں کا مقابلہ کر سکتی  
 ہے۔ اس کا عین وجود بالکل ابتدائی مراحل میں خطرے کی زد پر آجاتا ہے چنانچہ تاریخ میں بے شمار نظائر  
 موجود ہیں کہ فاتحین یا انقلابیوں نے جہاں کہیں بھی کوئی نئی حکومت قائم کی ہے وہاں سول نظم کو نافذ  
 کرنے میں ابتداءً غیر معمولی جبر و سختی سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن محسنِ انسانیت کی حکومت جس اخلاقی  
 نظریے اور جس تصورِ عدل پر قائم تھی اس میں بے جا سختی کا موقع نہ تھا۔ اس لیے مدینہ کے پانچویں کاملہ  
 کو کسی قدر کھل کھیلنے کی راہیں مل گئی تھیں۔

مدینہ کی اسلامی ریاست کا وہ دستوری معاہدہ جس کے تحت مسلمان مہاجرین انصار اور یہود کے  
 قبائل ایک سیاسی ہیئتِ اجتماعیہ میں جمع ہوئے تھے، اس میں تسلیم کر لیا گیا تھا کہ سیاسی اور عدالتی لحاظ  
 سے اختیارِ اعلیٰ (Final Authority) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہے۔ وہ دستاویز آج  
 تک محفوظ ہے اور اس میں حسب ذیل دو واضح دفعات موجود ہیں۔

۱۔ سیرت ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۱۸۵

۲۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۲-۲۳-۲۴-۲۵ کتاب الاموال ابو عبید قاسم بن سلام پیر ۱، ۵۱ ص ۲۰۴



وانکم مہماً اختلفتم فیہ من شیء فان مردۃ

الی اللہ عزوجل والی محمد صلی اللہ علیہ وسلم .

وانہ ما کان بین اہل ہذا الصمیفة من

حدیث او اشجار یخاف فسادہ فان مردۃ الی

اللہ عزوجل والی محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اس دستوری پیمان کے بعد معاہدہ یہودی قبائل پر شرعاً، اخلاقاً اور سیاسی و قانونی حیثیت سے یہ فرض عائد ہو گیا کہ وہ اس نظام عدل و قانون کو کامیاب بنانے میں پوری طرح تعاون کریں۔ اور اس کی وفادارانہ اطاعت کریں جو سرور عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سرکردگی میں چل رہا تھا۔ یوں بھی دیکھا جائے تو ایک غیر منظم معاشرہ کو قانون کی عملداری کے اصول پر باقاعدہ شہری نظم میں لانا محسن انسانیت کی ایک عظیم الشان قابل قدر خدمت تھی۔ اور جرائم اور بد کاریوں کے استیصال کے لیے انصاف کے فطری اور دائمی اصولوں کی مساویانہ تنفیذ ایک ایسا بابرکت اقدام تھا کہ جس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی حالت امن و امان یہودیوں کے لیے بھی اتنی ہی نافع تھی جتنی دوسروں کے لیے۔ پھر قانونِ الہی کے نظام کی اقامت خود ان کے اپنے مشن میں شامل تھی۔

اوپر سے معاہدانہ ذمہ داری انہوں نے برضا و رغبت قبول کی تھی۔

لیکن جہاں انہیں یہ محسوس ہوا کہ اسلامی ریاست کے بے لاگ قانون کی زد ان کے کسی مفاد پر پڑتی ہے اور ان کی کوئی شخصیت اس کی لپیٹ میں آتی ہے۔ تو وہ اپنی معاہدانہ، سیاسی، اخلاقی اور شرعی ذمہ داریوں اور معاشرے اور انسانیت کے مجموعی مفاد کو یکسر نظر انداز کر کے الٹے راستے پر پڑ جاتے رہے۔

یہود کے ایک شادی شدہ مرد نے کسی منکومہ یہودیہ سے زنا کی۔ معاملہ یہود کے سرداروں کے سامنے آیا۔ یہ اکابر بیت مد اس میں جمع ہوئے اور آپس میں صلاح بٹھرانے کے بعد ایک آدمی کو سرور عالم کی خدمت میں دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ ایسی حرکت پر کیا سزا دی جائے گی۔ انہوں نے پیشتر سے رائے قائم کر لی کہ اگر ہماری رواجی سزا (تعمیہ) بتائی جائے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک بادشاہ سمجھو اور بات مان لو۔ لیکن اگر کتابِ الہی کے مطابق رجم کی شرعی حد جاری کرنے کو کہیں تو پھر وہ اپنے تہ صیح اور اپنی جراتِ حق اور اتباعِ فرمانِ الہی کے دوسے) بنی ہیں اور ان سے بچنا کہ تمہارا جو کچھ قاتل کرتی ہے وہ بھی نہ جانتا رہے۔ سو آدمی پہنچا اور اس نے پیغام دیا۔ اور اکابر یہود کی طرف سے پیش کش

لی کہ ہم آپ کو حکم بناتے ہیں یہ پیش کش دستوری معاہدے سے ٹکراتی تھی۔ معاہدے کی رو سے یہ مستقل طور پر مدینہ کے حکم اور عدلیہ کے سربراہ تھے ہی۔ غالباً یہی وجہ ہوئی کہ حضور اٹھ کر سیدھے بیت مدراس تشریف لے گئے۔ اور جا کر یہود سے فرمایا کہ اپنے عالموں کو لاؤ۔ عبداللہ بن صوریہ کو پیش کیا گیا۔ بعض روایتوں کے مطابق اس شخص کے ساتھ ابویاسر بن اخطب اور وہب بن یہود بھی تھے۔ دوران گفتگو سب نے عبداللہ بن صوریہ کو علم تورات میں فاضل ترین مستند شخصیت قرار دیا۔ حضور نے اس عالم سے علیحدگی میں گفتگو کی اور خدا کا خوف دلا کر اور بنی اسرائیل کے ندیں ابواب تاریخ کی یاد تازہ کر کے دریافت کیا کہ کیا تم جانتے ہو کہ شادی شدہ زانی کے لیے تورات میں رجم کا حکم آیا ہے؟ اس نے جواب دیا: اللہمَّ نَعَمْ! ہاں بخدا! وحی سے جو حقیقت حضور پر آشکارا تھی۔ اس کی تصدیق فریق مخالف کی طرف سے بھی ہو گئی۔ لیکن مجلس عام میں یہودی سردار اور علماء کج بحثی کرتے رہے۔ ان کو اصرار تھا کہ ہمارے قانون شریعت میں زنا کی سزا تھمبہ ہے۔ اس اصطلاح کے مفہوم کے مطابق یہودی زانیوں کا ٹنہ کالا کر کے ان کو گدھے پر سوار کرتے اور بستی میں گھماتے۔ تورات کا حکم رجم انہوں نے بلاٹھے طاق ڈال دیا تھا۔ ان کے اندر جب زنا کی وبا پھیلی اور ان کے اُدبچے طبقیوں تک کے لوگ اس اخلاقی فساد سے ملوث ہو گئے تو معاشرے نے شریعت کا ساتھ دینے کے بجائے مجرم کی حمایت کا رخ اختیار کر لیا۔ اور سزا میں کمی کر دی۔ اب اکابر یہود کو اندیشہ یہ تھا کہ اگر تورات کے قانون رجم کا احیا ہو جاتا ہے تو پھر کس بکرے کی ماں کب تک نیر منائے گی۔ آج تم کل جاری جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ رجم کی سزا کا نفاذ رکوانا چاہتے تھے۔ مجبوراً حضور نے مجلس عام میں ان سے تورات منگوائی۔ **فانتوا بالتورات فاتلوها ان کنتم صدقین**، ایک یہودی عالم نے متعلقہ مقام کی قرأت کی۔ اس نسخہ میں آیات رجم موجود تھی اور اس ستم گر عالم نے آیت پر ہاتھ رکھ کے آگے پیچھے سے پڑھ ڈالا۔ عبداللہ بن سلام، مشہور یہودی عالم جو ایمان لے آئے تھے، نے پک کر اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔ اور حضور کو دکھایا کہ **اے پیغمبر خدا!** ملاحظہ کیجیے یہ رہی آیت رجم! حضور نے اس مکاری پر یہود کو سخت ملامت کی اور یہ کہہ کر مجرموں پر

۱۔ انجیل یوحنا میں واضح ثبوت موجود ہے کہ محصن زانیہ کے لیے اصل تورات میں رجم ہی کا حکم موجود تھا۔

ملاحظہ ہو یوحنا ۸ آیت ۵ کے یہ الفاظ ۱۔

توریت میں موسیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ایسی عورتوں کو سنگسار کریں!

تورات کے متداول نسخوں میں یہودی مفسرین اور فقہاء اور اہل تحریف کی آمیزشوں کے ساتھ زنا کی

حد جاری کر دی کہ ”میں پہلا شخص ہوں جو خدا کے حکم اور اس کی کتاب اور اس پر عمل پیرا ہونے کے مسک کی تجدید کرتا ہوں“

یہ تھے وقت کے حاملین دینِ مبین اور جامیانِ شرعِ متین جو بخلوں میں قانونِ الہی لیے ہوئے من گھڑت رواجی قانون کا کھوٹا سکہ چلا رہے تھے اور اس کردار کے ساتھ وہ اس مقدس ہستی کے مقابلے کو نکلے تھے۔ جو قانونِ الہی کا بے لاگ طریقے سے احیا کرنے اٹھی۔ اور قرآن کا یہ نغمہ حق فضاؤں میں گونج رہا تھا کہ ”لستم علیٰ شیءٍ حتیٰ تقیموا التوراة والانجیل وما انزل الیکم من ربکم“ اس وقت تک تمہاری کوئی بنیاد ہی نہیں ہے جب تک کہ تم تورات اور انجیل کو اور اللہ کی طرف سے جو کچھ قوانین نازل ہوئے ہیں ان کو نافذ نہ کر دکھاؤ۔ جب تک تمہارے عقیدہ و عمل میں یہ بھاری تضاد موجود ہے۔ تمہاری کچھ بھی حقیقت نہیں ہے۔ تم ایک بے معنی اور بے وزن، ٹولی ہو۔

یہودی معاشرہ کے فسادِ عام کا ایک بڑا مظہر یہ تھا کہ ان میں اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں کی تقسیم مستقل طور پر قائم ہو چکی تھی اور قانونی مساوات یکسر ختم ہو گئی تھی با اثر لوگوں کے لیے قانون الگ تھا اور کمزور کے لیے الگ، انصاف کی ندی پھٹ کر الگ الگ دھاروں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ان کے قاضی اور مفتی میزانِ عدل کے پلڑے نابرابر کر چکے تھے۔ اب دوہرے اور ترے باٹ استعمال کر رہے تھے چنانچہ بنو نضیر اور بنو قریظہ میں ان کے غلبہ و ضعف کی وجہ سے نامساویانہ نظام دیت راجح تھا۔ کوئی نضیری کسی قریظی کو قتل کر دیتا تو دیت سو و سق لی جاتی۔ اور صورتِ جرم الٹی ہوتی تو پچاس و سق دی جاتی۔ حضور کے مدینہ

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ: صورتوں میں قتل اور سنگساری کی سزا مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو:

”اگر کوئی مرد کسی شوہر والی عورت سے زنا کرتا پکڑا جائے تو وہ دونوں مار دیے جائیں“ (استثناء باب ۲۱-۲۲)

”اگر کوئی کنواری لڑکی کسی شخص سے منسوب ہو گئی ہو اور کوئی دوسرا آدمی اسے شہر میں پا کر اس

سے صحبت کرے تو تم ان دونوں کو شہر کے پھاٹک پر نکال لانا اور ان کو تم سنگسار کر دینا

کہ وہ مر جائیں“ (استثناء باب ۲۲-۲۳ آیت ۲۳)

آیت ۲۶ میں بھی قتل کا حکم ایسے شخص کے لیے دیا گیا ہے جو جبراً کسی کی عصمت دری کرے۔

آنے اور اسلامی نظام عدل کے قائم ہو جانے کے بعد بنو نضیر کے کسی آدمی نے بنو قریظہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ بنو قریظہ نے دو گنی دیت دینے سے انکار کیا اور مساوت کا حق منوانے کی کوشش کی۔ اب تو ان کے سامنے ایک سہارا موجود تھا۔ بحث میں تیزی آتے آتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں قبیلوں میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخر دونوں اس پر راضی ہوئے کہ معاملہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لے جایا جائے۔ اور وہاں سے جو فیصلہ ہو اسے قبول کر لیا جائے۔

حضور نے فاتحہ بینہما بالقسط کے حکم کے تحت دیت کے اس غیر مساویانہ نظام کو ختم کر کے ترازو کے پلٹے ہمیشہ کے لیے برابر کر دیئے۔ اور ساتھ ہی قرآن نے عدل کے خدائی نظام کو بگاڑنے والوں سے خطاب کر کے انتباہ دیا کہ :

”جو لوگ خدا کے اتارے ہوئے قانون کے مطابق معاہدات کے فیصلے نہیں کرتے وہی کافر ہیں“ (مائدہ)

اسلامی نظام انصاف اور اقامتِ حدود میں اگر تنہا یہود مدینہ ہی رکاوٹ ہوتے تو بھی غنیمت ہوتا۔ مشکل یہ تھی کہ مجموعی طور پر سارے عرب میں انصاف میں دو رنگی پائی جاتی تھی۔ بائبل و عہدوں کے لیے قانون دوسرا تھا۔ کمزوروں اور نام لوگوں کے لیے دوسرا۔

فتح مکہ کا موقع تھا کہ فاطمہ نامی ایک مخدومی عورت پوری کے جرم میں گرفتار ہوئی۔ چونکہ وہ بائبل و عہدوں سے تعلق رکھتی تھی، اس لیے قریش کے لوگ اس کی گرفتاری پر بڑے بے چین ہوئے۔ اور ان کے تصور میں یہ بات سمانہ ہی تھی کہ ایسی عورت پر بھی قانون کا وہی حکم عقوبت چل جائے جو عام لوگوں کے لیے ہے۔ ان لوگوں نے مشورہ کیا کہ رسول خدا سے کہہ کر اسے چھڑا لیا جائے۔ مگر آگے ہو کر بات کون کرے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے اسامہ بن زید کو سفارشی بنایا۔ اسامہ نے جا کر مدعا عرض کیا۔ حضور کے چہرے کا رنگ بات سن کر متغیر ہو گیا اور فرمایا : کیا تم اللہ کی ایک حد کے بارے میں اسے کوآنے کی سفارش کرتے ہو؟ بس اتنے ہی پر اسامہ کو حساس ہو گیا۔ اور انہوں نے معافی طلب کی۔ دن ختم ہونے پر حضور نے مجمع میں خطاب فرمایا کہ :-

”تم سے پہلے کے لوگوں کا ایک سبب بلائیت یہ تھا کہ جب ان میں سے کوئی ممتاز

آدمی چوری کرتا تو وہ اس سے چشم پوشی کر لیتے اور جب کوئی کمزور درجے کا آدمی  
یہی جرم کرتا تو اس پر سزا نافذ کر دیتے۔ میں اپنے بارے میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں  
جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ اگر فاطمہ بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی چوری  
کرے تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ ڈالوں یہ

یہی مرتبہ ذہنیت ام حارثہ کے معاملے میں بھی سامنے آئی۔ اس عورت نے کسی کا دانت توڑ  
ڈالا۔ مقدمہ حضور کے سامنے لایا گیا۔ حضور نے قصاص کا حکم سنایا۔ ام ربیع (غالباً مجرمہ کی بہن تھیں۔  
لیکن اس معاملہ میں روایات میں کچھ التباس ہو گیا ہے) نے یہ فیصلہ سنا۔ تو حضور سے بہ تعجب پوچھا  
کہ کیا فلانی سے بھی قصاص لیا جائے گا۔ خدا کی قسم اس سے قصاص نہیں لیا جاسکتا۔ حضور نے فرمایا۔  
”اے ام ربیع! قصاص تو خدائی نوشتہ ہے“! مگر وہ کہنے لگی، کہ ”نہیں! خدا کی قسم، اس سے ہرگز  
قصاص نہیں لیا جاسکتا۔“ ان کی سمجھ میں نہیں آتا، کہ اس درجے کی مجرمہ کا دانت کیسے توڑا جاسکتا ہے  
ادھر عملاً یہ ہوا کہ فریقین کے درمیان دیت پر معاملہ طے ہو گیا۔ اس طرح حکم قصاص (جس میں  
دیت کی گنجائش بھی شامل تھی) بھی پورا ہو گیا۔ اور ام ربیع کی بات بھی رہ گئی۔ چنانچہ بطور بطیفہ حضور نے  
فرمایا۔ کہ خدا کے ایسے بندے بھی ہیں کہ جب وہ قسم کھالیں تو خدا ان کی قسم کو پورا کر  
دیتا ہے۔

یہود نے صرف اسلامی عدلیہ ہی کے کام میں رخنہ اندازیاں کرنے پر اکتفا نہیں کی، بلکہ وہ  
مجموعی سول نظم و نسق جہاں موقع ملتا گڑ بڑ پیدا کرنے سے باز نہ آتے۔ اس کی ایک بڑی مثال یہ ہے  
کہ فتح خیبر کے بعد خیبر کے یہودیوں کی درخواست پر جب ان کو بطور کاشت کار ارضی نصف بٹائی پر  
رکھ لیا گیا۔ اور اسلامی حکومت کا تحصیلدار ان سے پہلی بار بٹائی لینے پہنچا تو انہوں نے اسے رشوت  
دینے کی کوشش کی۔ خیانت کے جس خوف ناک روگ میں ان کی قوم مبتلا تھی، اس کی چھوت انہوں  
نے نئے نئے نظام کے کارپردازوں کو بھی لگا دینا چاہی۔ یہ تحصیلدار عبداللہ بن رواحہ تھے۔ رسول خدا کا  
بھیجا ہوا معتمد علیہ تحصیلدار یہود خیبر کے اندازوں سے بہت اونچا تھا۔ انہوں نے ان سے صاف  
صاف کہا کہ ”اے خدا کے دشمنو! کیا مجھے حرام مال کھلانا چاہتے ہو؟“

۱۔ مسلم۔ باب النبی عن الشفاعة فی الحدود۔

۲۔ مسلم باب القصاص من الجراح الا ان یونسوا بالدیة

۳۔ سیرت النبی از مولانا شبلی جلد ۲ صفحہ ۵۵، بحوالہ فتوہ بیان صفحہ ۱

ان پر اپنا مدعا واضح کر دیا کہ مجھے تو کانٹے کے تول معاملہ کرنا ہے۔ فرمایا :  
رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہاں اس لیے بھیجا کہ تمہارا مال کھا جاؤں ،  
بلکہ اس لیے بھیجا ہے کہ تمہارے اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم عمل میں لاؤں تم  
چاہو تو میں اندازہ کر کے نصف تمہیں دے دوں اور اگر چاہو تو تم خود اندازہ کر سہ  
نصف ہمیں دے دو۔“

چنانچہ ابن رواحہ نے ۴۰ ہزار وسق کا تخمینہ لگایا اور ۲۰ ہزار وسق مسلمانوں کا حصہ لے لیا۔  
اس بے لاگ تقسیم پر جہاں بعض گھٹیا ذہن کے یہودیوں نے بھٹا کر کہا کہ یہ تو ظلم ہے وہاں انصاف  
پسند عوام نے تسلیم کیا کہ اسی عدل پر آسمان اور زمین قائم ہیں : عبداللہ بن رواحہ ہی زندگی بھر اس  
منصب کو سرانجام دیتے رہے۔

غرضیکہ ایک نیم منظم معاشرے کو باقاعدہ ایک منظم ریاست بنانے اور خدائی انصاف کے  
اصولوں کو جاری کرنے میں محسن انسانیت کو تعاون بہم پہنچانے کے بجائے تہذیب اور مذہب کے  
قدیمی ٹھیکیداروں نے سخت مزاحمتیں کیں۔ اور نظام حق کی جڑوں کو ابتدائی مراحل میں کھوکھلا کرنے  
کی ناقابل عفو کوششیں کیں۔

### خاتہ نبوت میں چنگاریاں :

مدینہ کے مخالفین اسلام نے شرارت کی چنگاریاں حضور کے حرم میں پھینکنے کے ناپاک جتن بھی  
کیے ان کی نگاہ میں حضور کے خاندان اور ان کے رفقاء خاص میں پھوٹ ڈالوانے کا یہ بہت ہی سیدھا  
اور آسان راستہ تھا۔ تحریک اسلامی کے سربراہ کو گھریلو جھگڑوں میں پھنسا دینے کی تدبیر اگر کامیاب ہو  
جاتی تو اس کے نتائج بڑے ہی مہلک ہوتے۔ مدینہ کی عام عورتیں حضور کے گھر آتی جاتی تو تھیں ہی۔  
پھر وہ جو کچھ بھی دیکھتی ہونگی اسے نسائی نفسیات کے مطابق بیان کرتی پھرتی ہوں گی۔ اس طرح اشرار و  
منافقین کو بخوبی علم رہتا ہوگا کہ حضور کے گھر میں کس طرح فقر و فاقہ کا سماں چھایا رہتا ہے۔ حضور کی  
ازواج بڑے بڑے گھرانوں کی خواتین تھیں۔ ان کے ذوق کسی سے کم اونچے نہ تھے۔ لیکن دوسری طرف  
معاشی حالات جیسے تھے اور جن پر حضور دل سے راضی تھے وہ ان کے سابق ذہنی معیارات سے بہت  
ہی فروتر تھے۔ حضور کے ساتھ ازواج بھی مسلک صبر پر گامزن تھیں اور ان کو خود یہ شعور تھا کہ یہ لوگو

کا معیارِ اعظم جان جو کھوں کے جس عالم سے گذر رہا ہے۔ اس میں عیش و تنعم کی جنتیں آراستہ نہیں کی جا سکتیں۔ مگر انسان پھر انسان ہے اور انسان ہمیشہ ان خواہشات و جذبات کے درمیان گھرا رہتا ہے جنہیں اس کی فطرت میں گوندھ دیا گیا ہے۔ دوسری طرف ازواجِ مطہرات ایمان و اخلاق کے لحاظ سے عالی مرتبت ہونے کے باوجود اور اتحاد و یک جہتی اور مسکینی و علمی کا ایک شاندار معیار دنیا کے سامنے پیش کرنے کے باوجود کبھی نہ کبھی باہمی رشک کے جذبات سے ہلکا سا اثر لے سکتی تھیں جو ایک گھر کی رونق بننے والی خواتین کے درمیان ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قریش کی عورتوں میں شوہروں کی وفاداری و طاعت کی جو کڑی روایات چلی آ رہی تھیں ان کے خلاف مدینہ کی عورتیں مردوں کے مقابل میں خاصا زور رکھتی تھیں چنانچہ حضرت عمرؓ جیسے رعب و تمکنت والے مردِ عظیم نے مدینہ کے دور میں ایک بار اپنی زوجہ محترمہ کو ڈانٹا انہوں نے آگے سے جواب دیا۔ اس پر حیرت سے حضرت عمرؓ نے کہا۔ کہ تم مجھے جواب دیتی ہو؟ اسی موقع پر ان کو اندازہ ہوا کہ معاشرہ کی ازدواجی زندگی میں مکہ کی روایات پر مدینہ کی فضا کا اثر خاصا پڑ چکا ہے۔

یہ نقشہ احوال اشرار و منافقین کے سامنے تھا اور اسی کے اندر سے انہوں نے شرارت کی راہ نکالی۔ انہوں نے بعض عورتوں کو اس غرض کے لیے آلہ کار بنا کر استعمال کیا کہ حضورؐ کے گھر میں فتنہ کی چنگاری پھینک کر آگ بھڑکائیں۔ ایک ایسی عورت ام جلدح کا نام ہمارے سامنے آتا ہے جس کا پارٹ یہ تھا کہ کانت تحوش بین ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی وہ ازدواجِ مطہرات کو بھڑکایا کرتی تھی۔ اسی طرح کی عورتوں کی مدد سے انک کی چنگاری سے شعلے اٹھائے گئے تھے۔ اشرار کی ان دراندازیوں کی وجہ سے پے در پے چند واقعات ایسے ہوئے، کہ جو خاصے نشوونما ہو سکتے تھے۔ لیکن خدا کی مدد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار، صحابہ خاص کے تعاون اور ازواج کی شرافت کے اثر سے بروقت اصلاح ہو گئی۔

ان میں سے سب سے بڑا واقعہ ازدواج کا وہ منجھڑا مظاہرہ تھا جس کا مدعا تو بیعِ نفقہ تھا یہی ایلام کا محرک ہوا۔ خدا کا فضل خاص تھا کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے پورے اخلاص کے ساتھ حضورؐ کا پہلو مضبوط کیا اور اپنی صاحبزادیوں کی ہمت افزائی کرنے کے بجائے ان کو سختی سے ڈانٹا دھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے چیلنج آ گیا کہ :

”اے پیغمبر! اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے۔ کہ اگر تم کو دنیاوی زندگی اور اس کی زینت و آرائش مطلوب ہو تو وہ اس گھر میں نہیں ملے گی، آؤ میں تم کو رخصتی کے جوڑے دے کر بطریق احسن رخصت کر دوں۔ اور اگر تم کو خدا، خدا کا رسول اور آخرت کا ٹھکانا مطلوب ہے تو خدا نے نیکو کار خواتین کے لیے بڑا ثواب مہیا کر رکھا ہے۔“ (احزاب)

دور اتنے ازواج کے سامنے رکھ دیے گئے کہ جسے چاہیں اختیار کریں۔ اب یہ ازواج کی شرافت تھی کہ ان کو فوراً تنبیہ ہو گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے اثر و رسوخ اور اپنی غیر معمولی ذہانت و منتہی کی وجہ سے اس مظاہرہ کی لیڈر بنی ہوئی تھیں انہی کو سب سے پہلے بالاخانے سے اتر کر حضور نے اس خدائی فیصلے سے آگاہ کیا اور انہی نے سب سے پہلے اعلان کیا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر خدا اور رسول کو لیتی ہوں ان کے بعد تمام ازواج نے اپنے مطالبہ سے شرح صدر کے ساتھ دست برداری کرنی۔ دشمنوں کے درمیان گھرے ہونے ایک بڑے گھرانے میں اگر شرار کی مسلسل رخنہ اندازیوں اور گھٹیا عورتوں کی لگائی بھجائی کے نتیجے میں کسی ایک موقع پر کھچاؤ پیدا ہو گیا ہو تو یہ کوئی بڑی بات نہیں بلکہ اتنی شرارتوں کے باوجود اس گھر کے سفینے کا بخیر و خوبی بیچ کے نکل جانا اس کے اہل کی مضبوطی، شرافت اور یک جہتی کا ثبوت ہے۔

اب اندازہ کر لیجیے کہ حضور کے ہر چہار طرف کس طرح رنگارنگ شرارتوں کے ڈانٹا میٹ بچائے جا رہے تھے۔ کہاں کہاں فیتلے رکھے جا رہے تھے۔

## قتل کی سازشیں :

سچائی جب کسی کی دعوت پر تحریک بن کے اٹھتی ہے تو اس کی مزاحم طاقتیں مخالفت بے جا میں پڑ کر مسلسل پستی کی طرف لڑھکتی چلی جاتی ہیں، یہاں تک کہ جب وہ اصل دعوت کے مقابلے میں دلیل کی بازی بھی ہار جاتی ہیں۔ اور فتنہ انگیزوں اور تشدد کاروں کو بھی ناکام دیکھتی ہیں تو پھر ان کا حسد اور ان کا کینہ پن ان کے اندر جرائم پیشہ ڈاکوؤں اور قاتلوں کی سی گندی ذہنیت بھار دیتا ہے۔ اس مرحلے میں اگر وہ داعی حق اور تحریک عدل کے قائد کی جان لینے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ ایسے خناس اگر قوت و اختیار رکھتے ہوں تو وہ حریف کو سیاسی جبر کے شکنجے میں کتے ہیں اور قانون کی تلوار کو حرکت میں لاکر اور عدالتی ڈرامہ ایڈج کر کے خادمانِ انسانیت کے خون سے ہاتھ رنگتے ہیں۔ قوت و اختیار سے محروم ہوں تو پھر قتل کی سازشی تدبیریں اختیار کرتے ہیں ٹھیک یہی راہ مکہ کے اربابِ جہالت نے اختیار کی تھی۔ اور اب اسی ناپاک راستے پر مدینہ کے سکہ بند اللہ والے بھی گامزن ہونگے۔



ایک مرتبہ (۳۳۰) عمرو بن امیہ صمیری نے قبیلہ عامر کے دو آدمی قتل کر دیے تھے ان کی دین وصول کرنے کے لیے نیز معاہدہ ذمہ داریوں کی یاد دہانی کے لیے رسول خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) بنو نضیر کے ہاں پہنچے۔ وہاں کے لوگوں نے آپ کو ایک گڑھی کے ساتھ میں بٹھایا پھر وہ لوگ علیحدگی میں مل کر یہ منصوبہ باندھنے لگے۔ کہ کوئی شخص جا کر اوپر سے پتھر (چکی کا پاٹ) گرا دے اور حضور کی زندگی کا خاتمہ کر دے عمرو بن حجاج بن کعب نے یہ مقدس ذمہ داری اپنے سر لی۔ ادھر حضور پران کا ارادہ بد منکشف ہو گیا اور آپ وہاں سے اٹھ کر چلے آئے۔

مشہور یہودی سردار کعب بن اشرف جس کا باپ قبیلہ طے سے تھا اور جس کی ماں یہود کے مال دار مقتدا ابورافع ابن ابی حقیق کی بیٹی تھی، اپنے اس دو گونہ تعلق کی وجہ سے عربوں اور یہودیوں کے درمیان یکساں رسوخ رکھتا تھا۔ ایک طرف وہ مالی قوت رکھتا تھا، دوسری طرف اس کی شاعری کی بھی دھاک تھی، اس کے سینے میں اسلام کے خلاف بڑا زہریلا لاوا بھرا تھا۔ چنانچہ ایک دوسری روایت (فتح الباری) اس کی مؤید ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کعب نے حضور کی دعوت کی اور کچھ آدمیوں کو مامور کر دیا کہ جب حضور آئیں تو وہ ان کو قتل کر دیں۔ یہ روایات اپنی مستقل حیثیت میں چاہے بہت زور دار نہ ہوں۔ مگر کعب کے بغض اور اس کی مجموعی سرگرمیوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو ایسا ہونا بڑی حد تک قرین قیاس ہے۔

جس زمانے میں بنو قریظہ سے حضور نے تجدید معاہدہ کی، اسی زمانے میں بنو نضیر نے حضور کو پیغام بھیج دیا کہ آپ اپنے ساتھ تین آدمی لائیں اور ہم بھی اپنے تین عالم پیش کریں گے۔ آپ اپنی بات اس مجلس میں بیان کریں۔ اگر ہمارے عالموں نے آپ کی تصدیق کر دی تو ہم سب بھی آپ پر ایمان لے آئیں گے حضور روانہ ہوئے تو راستہ میں آپ کو اطلاع ہو گئی کہ یہود تلواریں باندھے اس ارادے سے آپ کے منتظر ہیں کہ آپ کو قتل کر دیا جائے۔ آپ واپس آ گئے۔

### فتح خیبر:

کے موقع پر ایک یہودی عورت زینب بنت الحریث (ذو جہ سلام بن مشکم) نے ایک بکری کا گوشت بھون کر تیار کیا اور اس میں زہر ملا دیا۔ پھر یہ معلوم کیا کہ حضور کو کون سا حصہ زیادہ مرغوب ہے۔ پھر جب

سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۱۹۲۔ رحمة للعالمین از قاضی سلمان پوری جلد ۱ صفحہ ۱۸۰ رسول اکرم کی سیاسی زندگی

محمد حمید اللہ صفحہ ۳۳۲۔

معلوم ہو گیا کہ دست کا گوشت خاص طور پر پسند ہے تو اس نے اس میں باقی گوشت سے زیادہ مقدار میں بہت ہی تیز قسم کا مہلک زہر ملا دیا۔ پھر یہ گوشت حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں کے لیے تختے میں بھیجا۔ حضورؐ نے لقمہ منہ میں رکھا (شاید کچھ حصہ نگلا بھی گیا ہو) اور جلدی تنوک دیا۔ فرمایا کہ اس گوشت نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس میں زہر ملا ہے۔ پھر خود بھی نہیں کھایا اور ساتھیوں کو بھی روک دیا۔ بعد میں اس یہودیہ کو بلایا گیا تو اس نے اقرار کر لیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے پیچھے بہت سے یہود کی سازش کام کر رہی تھی حضورؐ نے جب مجلس عام میں ان کو بلوا کر بات کی تو انہوں نے بھی اعتراف کیا۔ مگر بات یہ گھڑی کہ ہم نے آپ کی جانچ کرنا چاہی تھی کہ آپ اگر سچے نبی ہوں گے تو آپ پر حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ ورنہ ہم کو نجات مل جائے گی۔

کھانے کی اس مجلس میں جو صحابہ شریک تھے ان میں حضرت برآء بن معرور بھی شامل تھے انہوں نے لقمہ لیا۔ اور زہر کی تلخی محسوس کرنے کے باوجود بہ تقاضائے ادب حضورؐ کے سامنے اگلنا پسند نہ کیا اور کسی نہ کسی طرح اسے حلق سے اتار لیا۔ اسی ایک لقمہ کے زہر سے ان کا انتقال ہو گیا۔

تبوک سے جب حضورؐ کی واپسی ہوئی اور منافقین کے دل اس مہم کی کامیابی سے بھنے جا رہے تھے کیونکہ ان چھپے دشمنوں کے ارمان کچھ اور تھے تو انہوں نے حضورؐ کے قتل کی ناپاک سازش باندھی اس سازش میں بارہ آدمی شریک ہوئے۔ یہ عبداللہ بن ابی سعید بن ابی سرح، ابوفاطرا عربی، عامر، ابو عامر رامب، جلاس بن سوید، مجمع بن جاریہ، بلیح تیمی، حصن بن نمیر، طعیمہ بن ابیرق، عبداللہ بن عیینہ و مرہ بن ربیع تھے۔

سازش کی مجلس میں جلاس نے کہا کہ :

”آج رات ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو عقبہ سے گرائے بغیر نہ رہیں گے، چاہے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے ساتھی ہم سے بہتر ہوں، مگر ہم لوگ بکریاں ہیں اور یہ ہمارے چرواہے بن گئے ہیں۔ ہم گویا بے عقل ہیں اور یہ لوگ بڑے خردمند ہیں“

۱۔ سیرت النبی علامہ شبلی جلد ۱ صفحہ ۳۷۶ بحوالہ فتح الباری

۲۔ زاد المعاد جلد ۲ صفحہ ۲۰ - ۳۹ شمائل ترمذی باب ما جاء فی صفحۃ ادا م

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث ۱۱ اصح ابیر۔ مولانا عبدالرؤف دانا پوری - ۲۲۶ -

اسی شخص سے یہ قول بھی منسوب ہے کہ :  
 ”اگر یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سچا ہے تو پھر ہم لوگ تو گدھوں سے بھی  
 بدتر ہیں۔“

عبداللہ نے کہا تھا کہ ”آج کی رات جاگو تو پھر ہمیشہ سلامتی سے رہو گے۔ تمہارا کوئی کام  
 اس کے سوا نہیں ہے کہ اس شخص کو آج قتل کر دو۔“  
 مرہ نے کہا تھا کہ ”بس اگر ہم اس ایک شخص کو قتل کر دیں تو سب کو اطمینان ہو جائے گا۔“  
 ان میں سے حصن بن نمیر کا ایک کارنامہ یہ تھا کہ اس نے صدقہ کے مال پر ڈاکہ  
 ڈالا تھا۔

ان میں سے ابو عامر بظاہر راہب تھا، اور صوفی و درویش بنا پھرتا تھا مگر مسجدِ ضرار کے فتنہ  
 کا بانی تھا۔ اور غستان اور روم کے حکمرانوں سے حضور کے خلاف ساز باز رکھتا تھا۔ اس کے لباس تقویٰ  
 میں طرح طرح کے شتر رقص کرتے تھے۔

طے پایا کہ حضور جب عقبہ سے گزریں تو ان کو نیچے گرا دیا جائے۔ اسی منصوبے کے مطابق  
 یہ بارہ مفسدین حضور کے ساتھ ساتھ لگے رہے۔ حضور جب عقبہ کے قریب پہنچے تو ارشاد فرمایا کہ جو  
 لوگ بطنِ وادی کے کشادہ راستہ سے ہو کر جانا چاہیں وہ ادھر سے جا سکتے ہیں۔ آپ نے عقبہ کا راستہ  
 لیا۔ صحابہ کی کثیر تعداد بطنِ وادی کی طرف چلی گئی۔ مگر سادشی گروہ بطور خاص حضور کے ساتھ رہا حضور  
 کی نگاہ یوں بھی دلوں کی گہرائی میں اتر کر محض جذبات کو پڑھ لینے والی تھی۔ اور پھر اپنے سامنے پر پرزے نکالنے  
 والے منافقین کا بعض شناس آپ سے بڑھ کر کون ہوگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے غیبی اشارہ دے کر آپ کو اس  
 چال سے مطلع بھی کر دیا۔ آپ نے دو رفیقوں کو ساتھ لیا۔ ایک حضرت حذیفہ بن یمان تھے، دوسرے  
 عمار بن یاسر۔ حضرت عمار کو حکم دیا کہ وہ آگے رہیں، اور ناقہ کی ہارٹھا میں اور حضرت حذیفہ سے فرمایا کہ وہ  
 پیچھے پیچھے چلیں۔ جب عقبہ کا خاص مقام آگیا تو سازشی ٹولی لپکتی ہوئی آئی۔ رات کی تاریکی بھی تھی اور  
 انہوں نے چہروں پر نقاب بھی ڈال رکھی تھیں۔ حضور کو آہٹ ہوئی تو ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ ان لوگوں  
 کو پیچھے لوٹادیں۔ حضرت حذیفہ لپک کر گئے۔ اور ان لوگوں کا اونٹ دکھائی دیا اور انہوں نے اپنا ترکش  
 اس کی تھوٹھنی پر مارا۔ وہ لوگ حضرت حذیفہ کو جب پہچان گئے تو سمجھے کہ راز فاش ہو گیا۔ اور پیچھے بھاگ

کر لوگوں میں گھل مل گئے۔

حضرت خذیفہ واپس ہوئے تو حضور نے حکم دیا کہ اس مقام سے اونٹ کو تیز ہٹا کر نکال دے چلو۔ پھر حضرت خذیفہ سے پوچھا۔ کہ کیا تم نے ان لوگوں کو پہچانا۔ انہوں نے کہا کہ فلاں اور فلاں کی سواری تو پہچان لی۔ مگر آدمی نہیں پہچانا۔ حضور نے پوچھا کہ تم نے ان کا عندیہ سمجھا۔ انہوں نے نفی میں جواب دیا۔ پھر حضور نے ان کو خود آگاہ کیا۔ کہ یہ ہمیں عقبہ سے گرا دینا چاہتے تھے۔

صبح ہوئی تو حضور نے اشارہ غیبی کے مطابق نام بہ نام ان بارہ سازشیوں کو طلب کیا۔ اور ہر ایک کے دلی جذبات اور مجلس سازش میں کہی ہوئی اس کی باتوں کو اس کے سامنے رکھ دیا۔ اور ہر ایک سے صفائی طلب کی۔

ان کے جواب بڑے دلچسپ رہے ہوں گے۔ مثلاً حصن بن نمیر کہنے لگا۔ کہ مجھے یقین نہ تھا کہ آپ کو اس کی خبر ہوگی۔ مگر آج معلوم ہوا کہ واقعی آپ خدا کے رسول ہیں۔ اس سے قبل میں پہچان نہ تھا۔ اب صدقِ دل سے اسلام لاتا ہوں۔

سب نے اس طرح کی مختلف باتیں بنائیں۔ عذر کیے اور بعض نے معافی چاہی حضور نے سب سے

درد گزر فرمایا۔

کافی زور دار روایات اس مدعا کی ہیں کہ حضور نے ان اشخاص کے نام صرف حضرت خذیفہ کو رازداری سے بتادیے تھے۔ اور عام مسلمانوں پر فاش نہیں کیے۔ علاوہ ان ناموں میں سے بعض کے بارے میں جزوی اختلافات ہیں۔ نیز ان میں دو تین افراد کے بارے میں یہ بحثیں بھی کی گئی ہیں کہ کم سے کم بعد میں ان کے اندر کوئی علامتِ نفاق نہیں پائی گئی۔

مگر اصل واقعہ اپنی جگہ تاریخی طور پر ثابت ہے اور اسی کا ذکر قرآن نے "ہکمتو بھما لحدود" (اس چیز کا ارادہ باندھا کہ جس تک پہنچ نہ سکے) کہہ کر کیا۔

اس محسنِ انسانیت کی عالی ظرفی کی کوئی مثال ڈھونڈنے کے لائق تاریخ سے جو نوعِ انسانی کی خدمت کے لیے خونِ پسینہ ایک کر کے انقلاب برپا کرتا ہے۔ اور چنداثر نہیں دوں گمشدہ ہیں اس کے کارنامے کی جز کاٹنے کے لیے اس کے قتل ہا منصوبہ بنا کر عملی اقدام بھی کرتے ہیں، ان کا راز فاش بھی ہو جاتا ہے۔ اور وہ اقبال جی کر بیٹے ہیں۔ لیکن وہ نمونہٴ انسانیت اتنے بڑے جرم پہ بھی عفو سے بامعنا

ہے۔ حضور سے درخواست کی بھی گئی کہ آپ ان میں سے ہر ایک کے اہل قبیلہ کو حکم دیں کہ وہ اپنے اپنے آدمی کا سر آپ کے سامنے لا کے پیش کر دیں۔ جواب میں حضور نے فرمایا کہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ عربوں میں بپہر جا ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کچھ لوگوں کو ساتھ لے کر دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ اور پھر جب غلبہ پایا تو خود اپنے ساتھیوں کو قتل کرنے لگا۔ حضور کا منشا یہ تھا کہ تحریک اسلامی کی اصل طاقت اس کی امتیازی شان برقرار نہ رہ سکے گی۔ سو اپنی جان کے لیے خطرات بھی انگیز کر لیے اور لوہہ نوقتوں اور شرارتوں کا مقابلہ کرنا بھی گوارا کر لیا۔ مگر یہ پسند نہ کیا کہ حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے جبر و قوت کا لٹھ چلائیں۔ اور جہاں کوئی خرابی دیکھیں۔ اسے اقتدار اور قانون کے زور سے بے تحاشا کچل دیں۔ انسانی معاشرہ کا نظام چلاتے ہوئے بے شمار حکمتیں اور مصالح پیش نظر ہوتے ہیں۔ اور اصلاح کی بہت سی تدبیریں مختلف پہلوؤں سے استعمال کرنی ہوتی ہیں۔ اسلامی انقلاب عام دنیوی انقلابوں سے زیادہ کٹھن اسی لیے ہے کہ اس کی نازک اخلاقی روح کا تحفظ قدم قدم پر کرنا پڑتا ہے کہ اس آئینہ میں کہیں کسی عمومی غلط فہمی اور کسی مخالفانہ پروپیگنڈے کا غبار نہ آجائے۔

انہی واقعات میں سے یہ بھی ہے کہ یہودیوں نے آپ پر جادو کا ایک حملہ بھی کیا تھا۔ بہادر شاہ وہ ہوتا ہے جو کھل کر مقابلہ کرے۔ اور اگر وہ جان کے درپے ہو تو چیلنج کر کے کھلم کھلا حملہ آور ہو۔ لیکن یہودیوں میں اتنا بل بوتہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ سازش کی راہ پر پڑے جو بردوں اور کینہ فطرت لوگوں کی راہ ہوتی ہے۔ لیکن اس سے آگے جادو اور ٹونوں اور ذلیفوں اور جھاڑ پھونکوں کے زور سے وہ لوگ کسی پر حملہ کرتے ہیں جو دوسری ہمتی اور سفلگی کے لحاظ سے آخری مرتبہ سے بھی فروتر ہو جائیں سو ان لوگوں نے بعض کے مارے یہ گھٹیا حرکت بھی حضور کے خلاف کر ڈالی۔

بنی زریق کا ایک شخص بسید بن عاصم یہودیوں کا حلیف تھا۔ اور منافقانہ شخصیت کا حامل۔ اس کے ہاتھوں عمل سحر کرایا گیا۔ ایک یہودی لڑکا اپنی اچھی فطرت کی وجہ سے حضور کی طرف مائل تھا۔ اور آپ کی خدمت کیا کرتا تھا۔ اس کو مجبور کر کے بعض یہودیوں نے حضور کے سر کے بال اور کنگھی کے دندانے حاصل کیے۔ اور ان پر جادو کا عمل کر کے بارہ گروہوں والا گنڈا بنایا گیا اور ذروان نامی کنوئیں میں اسے رکھوایا گیا۔

احادیث میں آتا ہے کہ اس عمل سحر کی وجہ سے حضور ایک عجیب سی کیفیت محسوس کرتے کسی

کام کا خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے۔ حالانکہ نہ کیا ہوتا۔ جنسی میلان پر بھی کچھ اثرات تھے۔ انقائے ربانی سے آپ اس عملِ سحر سے آگاہ ہوئے۔ وہ گنڈا نکلوا یا گیا۔ اور آپ کی طبیعت معمول پر آگئی۔

اس واقعہ سے متعلق ایک مشہور بحث یہ چلتی ہے کہ نبی پر سحر کا اثر ہو سکتا ہے یا نہیں۔ ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ قطعاً اثر نہیں ہو سکتا۔ اس دلیل کو لے کر منکرینِ حدیث نے احادیث کو ناقابلِ اعتماد ثابت کرنے میں بھی استعمال کیا ہے۔ حالانکہ ایک نبی کا انسانی جسم جس طرح امراض اور ضربات اور زبرد سے اڑھتا ہے۔ اسی طرح اس کے نفسیاتی قوی بھی ہر طرح کے ظاہر و نہاں محرکات سے اڑھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ پر فرعون کے جادو گروں کے عمل کو دیکھ کر ذہنی اثر ہوا۔ اور آپ نے ان کی سونے کو سانپ محسوس کر کے خوف محسوس کیا۔ (فادو جس فی نفسہ خبیثۃ موسیٰ) جادو کے جس اثر کی نفی انبیاء کے حق میں کی گئی ہے۔ وہ ایسا اثر ہے جو کائنات میں قادیح ہو سکے اور زمین کسی دوسرے کے قبضے میں چلا جائے۔ اور قوتِ ارادی کی باگ دور ہانڈے سے بالکل چھوٹ جائے۔

اس بحث سے قطع نظر یہ واقعہ مان لینے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے کہ یہود نے اپنی عیب سے حضور پر عملِ سحر کرنے کا اقدام کر ڈالا تھا۔ ان کا جرم اپنی جگہ ثابت ہے۔

یہ واقعات جب ہمارے سامنے آتے ہیں۔ تو اس وقت ہم پر اس تشویش کا غلبہ ہوتا ہے جو جاتا ہے جو حضور کی جان کے متعلق مدنی دور میں اسلامی جماعت کو لاحق رہتی تھی۔ حضور کو انسانی جسم کے وقت گھر سے لکلنا پڑتا تو رفقاء کو سخت اضطراب رہتا۔ طلحہ بن برد نے انہی حادثات کو مدللہ لکھ کر رسالہ میں وصیت کی کہ اگر میرا دم واپس رات کو مفقود ہو تو حضور کو اطلاع نہ کی جائے۔ کیونکہ یہود کی طرح یہ خطرہ ہے۔ خدا نخواستہ دشمنوں کے ہاتھوں کوئی گزند نہ پہنچے۔ اگر حضور اتفاقاً لگا ہوں سے ذرا دور ہو جاتے تو رفقاء میں گھبراہٹ پھیل جاتی اور وہ تلاش میں نکل کھڑے ہوتے۔

حضرت ابو ہریرہ کی وہ مشہور اور معرکہ الآراء حدیث جس میں شہادت لآلہ الا اللہ کو خدا جنت کی ضمانت قرار دیا گیا ہے، اپنے اندر ان حالات کی ایک جھلک رکھتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ:

” ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد بیٹھے تھے اور ہماری اس مجلس میں

حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی شریک تھے۔ رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے درمیان سے اٹھ کر کہیں چلے گئے اور خاصی دیر لگا دی۔ ہمیں تشویش لاحق ہوئی، کہ ہمارے ساتھ موجود نہ ہونے کی صورت میں آپ کو کوئی گزند نہ پہنچا دیا جائے۔ ہم لوگ اس خیال سے گھبراہٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے جس پر سب سے پہلے گھبراہٹ طاری ہوئی۔ وہ میں ہی تھا۔ سو میں حضورؐ کی تلاش میں نکل ہی کھڑا ہوا۔<sup>۱</sup>

کھوج لگاتے لگاتے حضرت ابو ہریرہؓ بنو نجار کے ایک انصاری کے باغ تک جا پہنچے احاطہ کی دیوار کے گرد گھوم پھر کر دیکھا کہ کدھر کوئی دروازہ ہے لیکن احاطہ لمبا ہو گا۔ اور گھبراہٹ اور جلدی میں ان کو کوئی نزدیکی راستہ نہ ملا۔ آخر انہوں نے دیکھا، کہ پانی کی ایک نالی احاطہ کی دیوار کے نیچے سے گزرتی ہے۔ سمٹ سمٹا کر ان کے اپنے الفاظ ہیں کہ میں لومڑی کی طرح سمٹ کر نکلا، نالی کی راہ سے اندر پہنچے۔ حضورؐ کو وہاں دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ اس کے بعد پھر گفتگو ہوئی جس میں حضورؐ نے مشہور بشارت دی۔

ایک صحابی خاص کے اس بیان کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہود و منافقین کی نت نئی قاتلانہ سازشوں کے باعث مدینہ کی فضا کیسی رہتی تھی۔ اور حضورؐ کی زندگی کن خطروں میں گھری رہتی تھی مگر وہاں اعتماد علی اللہ کا حال یہ تھا کہ ایک بار انہی خطرات و خدشات کے پیش نظر صحابہ کرام نے حفاظتی پیرے کا انتظام کیا۔ مگر حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کے مطابق کہ **وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ** اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا، اسی وقت خیمے سے سر باہر نکال کر فرمایا:

”لوگو! واپس چلے جاؤ، میری حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا ہے۔“

یہ وہی ایمان تھا جو حضورؐ کے خلاف ارادہ قتل کر کے گرفتار ہو جانے والے ایک مجرم کے سامنے بھی ظاہر ہوا۔ جب کہ آپؐ نے فرمایا۔ کہ:

”اے چھوڑ دو! کیونکہ یہ مجھ کو قتل کرنا بھی چاہتا تو نہیں کر سکتا تھا۔“

۱۔ مشکوٰۃ جلد اول۔ کتاب الایمان فصل سوم

۲۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ ص ۹۹

۳۔ ایضاً

ذرا انسانیت کے اس معمار کے مقام کا تصور کیجیے کہ جس کے گرد قتل کی سازشیں عشقِ چپوں کی سیلوں کی طرح نشوونما پاتی تھیں اور فتنے تیندوے کی تاروں کی طرح پھیلے تھے۔ مدینہ میں کچھ کونے بیٹھے تھے اور دن رات وہ بیٹھے شجاعت کے شیر کا شکار کرنے کے لیے جالے تانتے رہتے تھے۔ اذھر مکہ کا کوہِ آتش فشاں بھی روز بروز زیادہ کھولتا چلا جا رہا تھا۔ اور اس کے سینے میں بھی عناد اور کمینگی کا لاوہ برابر زور کر رہا تھا۔ ہجرت سے پہلے حضور کے قتل کی جو بہت بڑی اجتماعی سازش کی گئی تھی۔ اگرچہ اس نے اب باقاعدہ جنگی مہمات کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مگر ان کھلی کھلی مہمات کی ناکامیاں قتل کی خفیہ سازشوں کی محرک بھی بن رہی تھیں۔

معرکہ بدر میں حضور کی مٹھی بھر جماعت نے مظلومانہ صبر کے نیام سے حق کی تیغ برقی رشتہ نکال کر جب اپنے ہاتھ دکھائے تھے تو فرزندِ انِ جاہلیت کو وہ دُور چر کے گئے کہ بن کی تیسوں سے نہیں برسوں آتش زیر پا رکھا۔ کوئی گھرانہ تھا جس کے اچھے بچے سرزد ہو کر جوان نصیرت کر رہے تھے۔ لیکن گنتی کے چند بے سرو سامان انقلابی مسلمانوں کے ہاتھوں سے مارا گیا۔ کھنکھانے کی آواز سن کر بھی مزید رسوائی کا سبب تھا۔ اس لیے قریش نے مسلمانوں کو دین کوئی شخص مسلمانوں میں بدنام کرے۔ اس روٹی میں اسود کے تین بیٹے مارے گئے تھے۔ اور اس کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ مگر اسے ہلاک نہیں نکال سکتا تھا۔ ایک دن اسے رونے کی آواز ساری۔ نہ وہ ہم سے کہا کہ ذرا آواز نہ کرے۔ اس کی اجازت ہو گئی ہے۔ خادم نے دریافت کر کے بتایا کہ ایک عورت کا اور وہ اس کے لیے رو رہی ہے۔ اسود کے جذبے کو اس واقعے نے مہلک کیا۔ اس لیے اسے ہلاک کر دیا۔

شعر الپے جو خاص ادبی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ ان میں سے نہیں ناظر ہوں۔

اَنْبٰى اَنْ يَضِلَّ لَهَا بَعِيْرٌ  
وَيَمْنَعُهَا مِنْ اَنْ يَوْمَ لَسَهْوَدٌ  
فَلَا تَبْكِي عَلٰى بَكْرٍ وَّوَلَكِنْ  
عَلٰى بَدْرِ لَقَا حَرِيْرَتِ الْجَدُوْدِ  
وَبِكِي حَادِثًا اَسَدًا لَاسُوْدٌ

وہ ایک اونٹ کے کھوجانے پر روتی ہے۔ اور اس کو نیند نہیں آتی۔ اونٹ کے لیے نہ رو، رونا ہے تو بدر کے حادثے پر رو۔ جہاں نصیبہ کوتاہ ہو گیا۔ روتی ہے تو پھر عقیل کے لیے رواد اس عمارت کے لیے جو شیروں میں ایک شیر تھا۔



مکہ کے ایسے غم آگین ماحول میں عمیر بن وہب اور صفوان بن امیہ یکجا بیٹھے مقتولین پر رو رہے تھے، صفوان نے کہا: اب جینے میں لطف نہیں رہا، عمیر کہنے لگا۔ اگر مجھ پر قرض نہ ہوتا اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں سوار ہو کر جاتا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرتا۔ میرا بیٹا بھی وہاں قید میں پڑا ہے۔ صفوان نے اس کے بچوں اور قرض کی ذمہ داری لی۔ اور عمیر نے فوراً گھبرا کر تلوار زہر میں بچھائی اور مدینہ روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو حضرت عمرؓ نے اس کے مخفی جذبے کو اس کی پیشانی سے پڑھ لیا۔ اور گلے سے پکڑے پکڑے حضورؐ کے سامنے لائے۔ آپؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا۔ کہ اسے چھوڑ دو۔ قریب بلایا۔ پوچھا کس ارادے سے آئے ہو۔ عمیر نے کہا کہ بیٹے کو چھڑانے آیا ہوں۔ پوچھا کہ یہ تلوار کیوں لٹکار رکھی ہے۔ عمیر نے کہا کہ آخر تلواریں بدر میں کیا کام دے سکیں؟

حضورؐ نے اب اس کے سینے کا راز ہناں کھول کے اس کے سامنے رکھ دیا، کہ تم نے اور صفوان نے مجھ میں بیٹھ کر میرے قتل کی سازش کی ہے۔ لیکن اللہ تمہارے اور تمہارے اس ارادے کے بیچ میں حائل ہے۔“

عمیر نے یہ سنا تو مبہوت ہو گیا۔ بولا: بخدا! آپؐ سچے پیغمبر ہیں۔ میرے اور صفوان کے علاوہ اس معاملہ کی اور کسی کو خبر نہ تھی۔“

عمیر مسلمان ہو کر واپس مکہ پہنچا۔ اور جرات کے ساتھ اسلام کی دعوت دی اور بہت بڑی تعداد کو اسلامی انقلاب کے جھنڈے تلے لے آیا۔

فتح مکہ کے موقع پر فضالہ بن عمیر کے سینے میں بھی انتقام کی بجلی کوندی۔ دل ہی دل میں حضورؐ کے قتل کا ارادہ باندھا۔ حضورؐ بیت اللہ کا طواف کر رہے تھے کہ فضالہ نمودار ہوا۔ قریب آیا تو آپؐ نے بلایا: فضالہ! تم ہو؟ اس نے جواب دیا: ہاں یا رسول اللہ! فضالہ نے اپنے دل میں گھمان رکھی ہے؟ فضالہ نے گھبرا کر جواب دیا: ”کچھ بھی نہیں۔ میں تو خدا کا ذکر کر رہا ہوں۔“ حضورؐ یہ جواب سُن کر ہنس پڑے اور نصیحت کی کہ خدا سے مغفرت طلب کرو۔ اور یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ فضالہ کے سینے پر رکھ دیا۔ اور اس کا دل ٹھکانے آ گیا۔ فضالہ کا بیان ہے، کہ حضورؐ نے جب اپنا ہاتھ میرے سینے سے اٹھالیا تو خدا کی مخلوق میں سے میرے لیے حضورؐ سے بڑھ کر اور کچھ محبوب نہ رہا۔“

فضالہ اس قلبی انقلاب سے گزر کر گھر چلے گئے۔

فاتح مکہ — بلکہ فاتح عرب کے خلاف ایک شخص قتل کا ارادہ باندھ کر آتا ہے اور اس کی بارگاہ سے نئی زندگی لے کر روانہ ہوتا ہے۔ کاری زخم لگانے آتا ہے اور اپنے زخموں کے لیے مرہم لے کے جاتا ہے۔

قریش اور یہود اور منافقین سب کے سب اپنی چالیں چلتے رہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ اور آخر دم تک اپنے بندے اور اپنے رسولؐ کی حفاظت فرمائی۔

ان سازشوں کا اصل مقصود مجرد ایک فرد کا قتل نہیں تھا بلکہ یہ لوگ اسلامی تحریک کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ یہ سچائی کی اس صبح درخشاں کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے جس کے دامن نور کے نیچے تاریکیوں کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ یہ اس نظامِ لوز کا گلا کاٹنا چاہتے تھے۔ جس نے صدیوں کے زخم خوردہ مظلوم طبقوں کو پہلی مرتبہ زندگی، آزادی، مساوات اور عزت و آبرو سے مالا مال کیا تھا۔

## ہلاکت انگیز غداریاں :-

اوپر ہم نے مدینہ کی اسلام دشمن طاقتوں کی جن شرارتوں کا ذکر کیا ہے وہ اخلاقی اور قانونی لحاظ سے سنگین جرائم کی تعریف میں آتی ہیں۔ اور اگر ان پر سخت ترین کارروائی کی جاتی تو دین و سیاست کے بہترین اصولِ عدل کے عین مطابق ہوتی۔ مگر حضورؐ پاک نے بڑا ہی ٹھنڈا اور صابرانہ رویہ اختیار کیا۔ جس تحریک کے سامنے اصل مقصود انسانیت کی اخلاقی اصلاح و تعمیر ہو وہ اقتدار کی تلوار اور قانون کے ڈنڈے پر سارا انحصار نہیں کر سکتی۔ لوگ کتنی بھی پستی دکھائیں، وہ انسانی فطرت سے مایوسی کو اپنا نقطہ آغاز نہیں بناتی۔ بلکہ بسی امیدیں باندھ کر قدم بڑھاتی ہے۔ اس کی اصل قوت تعلیم و تہذیب ہوتی ہے نہ کہ تعزیر و تہدید۔ اقتدار اور قانون کی طاقت سے ایک مناسب حد تک کام لے بغیر تو کوئی نظام ریاست وجود ہی قائم نہیں رکھ سکتا۔ لیکن انسانوں کے ذہن و کردار کی تبدیلی کا کام تلواروں اور کوڑوں سے کبھی نہیں ہوتا۔ عقلی دلیل اور اخلاقی اپیل سے ہوتا ہے۔ اس راہ میں غصہ کے بجائے تحمل اور انتقام کے بجائے صبر زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ انسانیت کے محسن اعظمؐ نے تاریخ کی زبناؤں کو حسنِ اخلاق سے روشن کرنا چاہا۔ اور مخالفوں کی زیادتیوں اور فتنہ سازیوں پر مردانگہ درجے کا صبر دکھایا۔ اتنے بڑے غم اور اتنی بڑی چشم پوشی کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی کہ کچھ لوگ حضورؐ کی برسوں کی کمائی کو نکتوں کے چھکروں

میں اڑا دینا چاہتے ہیں۔ نظم اور قانون کو معطل کرنے کے سامان کرتے ہیں۔ قتل کی سازشیں گانتھتے ہیں  
ذلیل طریقوں سے پریشان کرتے ہیں اور دنیا بھر میں اپنے نمونے کی پہلی نوخیز ریاست کا سربراہ شرفناز  
کے ان طوفان کے زرخے میں سے بڑے وقار اور سکون کے ساتھ — بلکہ موجوں اور نہنگوں کو ایک  
خندہ استہزاء سے داد دیتا ہوا — چھوٹی سی ہچکولے کھاتی ہوئی کشتی کو نکال لیے جا رہا ہے۔

لیکن مخالف طاقتوں نے بھی جرم و شرارت کی آخری حد کو چھوئے بغیر دم نہ لیا۔ انہوں نے  
ایک بار نہیں، بار بار باغبانہ غداری (High Treason) کے کھلے کھلے اقدامات کیے  
اور کوئی لحاظ اس بات کا نہیں کیا کہ وہ ایک دستوری معاہدہ کا قلابہ اپنے گلے میں ڈال کر جس ریاست کے  
شہری بنے ہیں اس کی وفاداری ان پر دین و سیاست کے تقاضے سے واجب ہو چکی ہے۔ غداری کے  
کھلے کھلے اقدامات ایسے ہیں کہ جن کی سزا نہ آج سے پہلے اور نہ آج سلبِ شہریت اور موت سے  
کم رکھی گئی ہے۔ مگر وہ جو تمدن کی تقدیر بدلنے آیا تھا۔ اس نے اتنے بڑے اور ہلکے جرائم کے مقابلے  
میں بھی حدودِ جہ کا تحمل دکھایا۔ اور آخر دم تک یہ کوشش جاری رکھی کہ دشمن طاقت کی حسِ شرافت بیدار  
ہو، اس کی سوچنے کی طاقتیں جاگ اٹھیں، وہ معقولیت کی طرف مڑ جائے، اور ایک بار، دوسری بار،  
تیسری بار سنبھل جائے۔ مگر جو لوگ ٹیڑھے راستے پر پڑ گئے تھے، ان کی آنکھیں نامرادی کے گڑھے میں  
گرنے سے پہلے پہلے نہیں کھل سکیں۔ اَلَا مَآ شَاءَ اللّٰہ !

ہلاکت انگیز غدارانہ اقدامات کی چند نمایاں مثالیں ہم یہاں پیش کر رہے ہیں، جن سے اندازہ  
ہو سکے گا کہ سچائی اور نیکی کا نظام قائم کرنے والوں کو کن خارزاروں سے گزرنا پڑا ہے۔

یہ بات روشن ہے کہ بیعت عقبہ ثانیہ کی مجلس میں صدق و اخلاص کے جن پیکروں نے رسولِ برحق  
کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا، اس شعور کے ساتھ دیا تھا کہ حضور کے مدینہ جانے اور وہاں تحریکِ اسلامی کامرکز  
بننے کے معنی جنگ ہیں۔ یہ واقعہ قریش کے لیے بہت سے وجوہ سے بڑا بھاری چیلنج ہو گا اور وہ سخت  
جذبائی اشتعال میں آ کر تلواریں سونت لیں گے۔ اس بنا پر حقیقت بھی واضح ہے کہ حضور کی جان، آپ  
کی قائم کردہ جماعت کا وجود اور دوسرے مرکزِ تحریک کا تحفظ تا شید ایزدی کے تحت تمام تر اہلِ مدینہ  
کے تعاون پر منحصر تھا۔ اسی مقصد سے انصار کے نمائندہ اور فعال نوجوانوں سے حضور نے بیعت لی اور  
اسی غرض کے لیے یہودی قبائل سے پہلے ہی سالِ ہجرت میں معاہدات استوار کر لیے۔ انصار نے تو اپنی  
بیعت کا بہ حیثیتِ مجموعی آخر دم تک حق ادا کیا۔ مگر خدا کی کتاب کے امانت داروں اور انبیاء کے وارثوں  
نے اور ان کے عقیدت مندوں نے اپنے باندھے ہوئے معاہدوں کو بار بار خود ہی پامال کیا۔

سب سے پہلا اور نمایاں واقعہ غداری یہ ہے کہ قریش مکہ نے عبداللہ بن ابی کو کارآمد ترین آدمی پا کر اُسے ایک خفیہ خط بھیجا اور اس کے ذریعہ مدینہ کے فاسد اور کمزور عناصر کو اپنے اثر میں لینے کے لیے ایک ہمہ گیر پیغام بھیجا۔ لکھا کہ :-

”تم لوگوں نے ہمارے آدمی (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ہاں پناہ دی ہے اور ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم اسے مار ڈالو یا مدینہ سے نکال باہر کرو۔ ورنہ ہم سب مل کر تمہارے خلاف چڑھائی کریں گے اور تم کو قتل کریں گے۔ اور تمہاری عورتوں کو اپنے لیے سامانِ عشرت بنا لیں گے۔“

عبداللہ بن ابی اگر ایماندار اور شریف شہری ہوتا تو وہ فوراً اس خط کو حضور تک پہنچاتا اور اس کی دلی خواہش یہ ہوتی کہ قریش کی دھمکی کے مقابلے میں سارے مدینہ کے جذباتِ حمیت کو صف آرا کر دیا جائے۔ لیکن غداری تو اس کی روح میں رچی بسی تھی۔ وہ اپنی محرومی اقتدار کا انتقام لینے کے لیے اس پر تل گیا کہ قریش کا منشاء پورا کر دیا جائے۔ اسے اندازہ تھا کہ تحریکِ اسلامی کے مقابلے پر مدینہ کے باسیوں میں شریکوں کی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ لیکن یہ راز بہت جلد کھل گیا اور حضور مطلع ہو گئے۔ خود عبداللہ بن ابی کے پاس تشریف لے گئے اور اُسے سمجھایا کہ تم لوگوں کے اپنے ہی بیٹے۔ بھتیجے و بھانجے اپنی پوری قوتِ شباب کے ساتھ دینِ حق کی علمبرداری کر رہے ہیں اور اگر کوئی ایسی ویسی - تپیر ہوئی تو تم دیکھو گے کہ تمہاری ہی اولادیں تمہارے مقابلے میں کھڑی ہیں۔ تمہیں اپنے ہی بچوں سے بڑا ہوکا - عبداللہ بن ابی کی سمجھ میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ اپنے منسوبے سے باز آ گیا۔ واضح رہے کہ سبک بدر کے بعد قریش نے پھر ایسا ہی ایک خط عبداللہ کو بھیجا تھا۔

اسی فتنہ گرنے ایک نہایت ہی نازک موقع پر سخت غدارانہ اقدام یہ کیا کہ جب بنو نضیر کی بار بار کی عہد شکنی اور تخریبی حرکات پر اسلامی ریاست کی طرف سے ان کو دس روز کے اندر اندر مدینہ کی حدود سے نکل جانے کا حکم ہوا۔ اور وہ اس کے لیے تیاریاں بھی کرنے لگے، تو عبداللہ بن ابی نے ان کو کہا: ”بھیجا کہ شہر دار! اس حکم کی تعمیل نہ کرنا اور اپنی بستی کو نہ چھوڑنا۔ ہم دوسرے آدمیوں کی ملک سے کرا رہے ہیں۔ پھر یہ امید بھی دلاتی کہ ایک طرف بنو قریظہ تمہاری مدد کریں گے اور دوسری طرف بنو غطفان تمہارے حلیف ہیں۔ چنانچہ بنو نضیر نے حضور کو کہا: ”بھیجا کہ ہم یہاں سے نہیں جا سکتے۔ آپ کا جو جی

چاہے کریں۔ بالآخر اسلامی حکومت کو اپنا حکم منوانے کے لیے فوجی کارروائی کرنی پڑی۔  
پھر اسی شخص نے جنگ اُحد کے انتہائی نازک اور فیصلہ کن موقع پر یہ گل کھلایا کہ جب اسلامی  
فوج مدینہ سے نکل کر شوطہ کے مقام پر پہنچی تو یہ تین سو منافقین کو لے کر مدینہ لوٹ گیا۔ یہ حرکت اسلامی  
فوج کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف تھی۔ کہتا یہ تھا کہ جب ہماری راتے پر عمل نہیں کیا جاتا اور  
اختیارات دوسروں کے ہاتھوں میں ہیں تو ہم اپنی گردنیں کیوں کٹوائیں۔ دراصل عبداللہ بن ابی کی راتے  
یہ بھٹی کہ مدینہ سے باہر نہ نکلا جائے یہ

خدا راہ ساز باز کے لحاظ سے دوسری نمایاں شخصیت ابو عامر کی تھی۔ ہم مسجد ضرار کے سلسلے میں  
اس کا تعارف کر چکے ہیں۔ اس فتنہ گر نے معرکہ بدر کے بعد نبی اکرم کی فتح سے جل بھن کر مکہ کا سفر کیا  
اور ابوسفیان سے مل کر قریشی سرداروں کو انتقام کے لیے بھڑکایا۔ جنگ اُحد کی آگ کو دہکانے میں اس  
کا بھی حصہ تھا۔ یہ خود بھی قریشی لشکر کے ساتھ میدان جنگ میں اس زعم کے ساتھ اڑا کہ میرے کہنے  
پر قبیلہ ادس کے لوگ اسلام کا ساتھ چھوڑ کر قریش کی طرف آجائیں گے۔ اس لیے میدان جنگ میں  
اوس والوں کو پکارا۔ مگر اس کو وہ جواب ملا کہ دماغ درست ہو گیا۔ اور تو اودن خود اس کے فرزند حضرت  
حنظلہ نہایت اخلاص اور جاں نثاری سے سرورِ عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اشاروں پر سر بکفت کھڑے  
تھے۔ پھر اُحد کے بعد یہ ہر قبل روم کے پاس پہنچا تاکہ وہاں سے فوجیں چڑھا لائے۔ ادھر منافقین کو درپہ  
بھروسہ دلا یا گیا تھا کہ تم تیار رہنا۔ میں ملک لے کے آ رہا ہوں۔ اس شخص کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ  
اس نے مقام حنین کے قریب حصونہ کو اذیت دینے کے لیے گڑھے کھدوائے تھے۔ چنانچہ آپ ایک  
گڑھے میں گرے اور متعدد چوٹیں آئیں تھیں

خدا راہ سرگرمیوں کا تیسرا بڑا امام کعب بن اشرف تھا۔ اور اس کا تذکرہ بھی اوپر ہم کر چکے ہیں  
اس شخص نے ایک طرف مدینہ میں وظیفے جاری کر کے کراٹے کے پٹھو پیدا کر رکھے تھے۔ اور دوسری  
طرف یہ مکہ والوں کو مدینہ پر پڑھائی کے لیے بھڑکاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے  
اپنے اثر و رسوخ اپنے فن شعرا اور اپنی دولت کو خوب خوب استعمال کیا۔ اس کی تحریک سے ابوسفیان

۱۔ اصح السیر از مولانا عبدالرفیق دانا پوری صفحہ ۱۱۷

۲۔ ایضاً صفحہ ۱۲۶ سیرت النبوی از شبلی نعمانی جلد ۱ صفحہ ۲۲۲

۳۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۲ صفحہ ۸ - ۳۸۷

اور دوسرے لوگوں نے غلافِ کعبہ کو ختم کر بدر کا انتقام لینے کا حلف لیا۔

اس سازشی ماحول نے اسلامی جماعت کو خاص حفاظتی انتظامات اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ حضورؐ راتوں کو جاگا کرتے تھے۔ اور اپنے رفقاء کو باری باری پرے پر مامور کرتے۔ اسی دور کا واقعہ ہے کہ ایک بار آپؐ نے مجلسِ عام میں فرمایا: آج کوئی اچھا آدمی پہرہ دے؛ یہ اشارہ سن کر سعد بن ابی وقاص نے ہتھیار لگائے۔ اور رات بھر پہرہ دیا۔ حال یہ تھا کہ صبح تک ہتھیار لگائے لگائے سویا کرتے تھے۔ اور غالباً یہی وہ دور ہے۔ جس سے حضورؐ کا یہ ارشاد تعلق رکھتا ہے کہ :-

رِبَاطٌ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللَّهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا يَه

خدا کی راہ میں ایک دن پہرہ دینا دنیا و ما فیہا کے مقابلے میں بہتر ہے۔

اور یہ کہ :

رِبَاطٌ يَوْمٍ وَكَيْلَةٌ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَ قِيَامِهِ ۚ

(خدا کی راہ میں) ایک دن رات کا پہرہ دینا مہینے بھر کے (نفلی) روزوں اور شبانہ قیام نماز سے افضل ہے۔

اس خدمت کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ اس کا اجر قیامت تک بڑھتا چلا جاتا ہے اور یہ عذابِ قبر سے نجات کا ذریعہ ہے۔

علاوہ ازیں ان سازشوں کے زیر اثر اچانک حملے کے اندیشہ سے حضورؐ نے اپنے علاقہ کی آخری حدوں تک (جن میں تدریجاً توسیع ہوتی گئی) طلایہ گردی کا انتظام فرما دیا تھا۔ تاکہ دشمن کو معلوم رہے کہ اسلامی ریاست سوئی ہوئی نہیں بلکہ چاق و چوبند ہے۔

مدینہ کے ”پانچویں کالم“ کے لیے تحریکِ اسلامی کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کا بہترین موقع معرکہ ہاشمہ جہاد کے دور میں پیدا ہوتا تھا۔ یوں تو مدینہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دس برس کا جو زمانہ گزارا ہے۔ اس کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ نازک اور ہنگامی صورتِ حالات (State of

Emergency) چھائی رہی لیکن حق و باطل کی باہم آویزش جب جب بھی (تھوڑے تھوڑے

۱۔ ریاض الصالحین کتاب الجہاد

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

دفعوں پر بار بار ایسا ہوتا رہا، معروف معنوں میں جنگ کی صورت اختیار کرتی، یہود اور منافقین غدارانہ حرکتوں میں لگ جاتے۔ اسلامی ریاست کے پاسانوں کے لیے کیسی سنگین صورتِ حالات ہوتی ہوگی جب کہ ایک طرف شدید معاشی مشکلات اور دوسری طرف معرکہ ہائے پیکاران کو اپنے گھیرے میں لیے ہوں اور تیسری طرف اپنے اندر کے مار ہائے آستین اپنے ڈنک لگا رہے ہیں۔

اعد کا واقعہ ہم اوپر بیان کر ہی آئے ہیں کہ اسلامی فوج میدانِ جنگ کی طرف مارچ کر رہی ہے اور راستے میں سازشوں کا لیڈر عبداللہ بن ابی نین سو آدمیوں کو الگ کر کے واپس لے جاتا ہے۔ اگر حضور اور آپ کے جان نثاروں کی جگہ کوئی دنیاوی طاقت اس صورتِ حالات سے دوچار ہوتی، کہ تین ہزار دشمنوں کے مقابلے پر جانے والی کل ایک ہزار کے لگ بھگ تو سپاہ ہو اور اس میں سے بھی تین سو آدمی یکا یک الگ ہو جائیں۔ اور بقیہ سات سو میں بھی کچھ افراد شرا انگیزی کے لیے گھلے بلے رہ جائیں تو شاید وہیں دل ٹوٹ جاتے اور ہمتیں جو اب دے جاتیں۔ چنانچہ بنو سلمہ اور بنو حارثہ کے لوگ دل شکستہ ہو کر واپسی کی سوچنے لگے تھے۔ لیکن صحابہ کے ہمت بندھلنے سے رک گئے۔ مگر خدا پر ایمان، روحِ صداقت کی برتری کا یقین، اخلاقی قوت کی کامیابی کا تصور اور غیبی امداد پر بھروسہ علمبردارانِ اسلام کا اصل سرمایہ تھا۔ ان کی قوتوں میں ذرا بھی اضمحلال پیدا نہ ہوا، اور وہ اسی عزم کے ساتھ میدانِ احد کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ پھر میدانِ احد میں جب سخت وقت آیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر اڑی تو منافقین نے اس تجویز کے لیے حامی پیدا کرنے چاہے کہ عبداللہ بن ابی نین کی منت سماجت کر کے اُسے آمادہ کیا جائے کہ وہ ابوسفیان سے امان لے دے۔ پھر اس موقع پر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے ان کی کمزوریوں پر گرفت کرنے کے لیے ایک طرح کی جو ہزیمت دی تھی، اس پر ان لوگوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، اگر نبی ہوتے تو کیوں ہزیمت کھاتے۔ یہ تو دنیاوی حکمرانوں کا سامنا نہ ہوا کہ کبھی جیت ہو گئی، کبھی ہار۔ اس پروپیگنڈے کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر شہات پیدا ہو بھی گئے۔ بعض لوگ اس طرح سوچنے لگے کہ ہم جب خدا کی راہ میں لڑنے گئے تھے اور خدا کے پیغمبر کی قیادت میں تھے۔ تو پھر آخر ہمیں زک کیوں ہوتی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے قرآن نے کہا کہ ”ہومن عند انفسکم“ (یہ مصیبت تمہاری اپنی ہی لائی ہوئی ہے یعنی تمہاری بعض کمزوریاں رنگ لائی ہیں،)

اور پھر کوئی جنگ ایسی نہیں ہوتی جس کے پہلے جس کے بیچ میں اور جس کے خاتمے پر ان چھپے رستوں نے غداری کے جوہر نہ دکھائے ہوں، جہاں عملاً کوئی کارنامہ انجام نہ دیا جاسکا، وہاں زبان

کے نشتر چلا چلا کر تحریکِ اسلامی کی رگیں کاٹنے اور مدینہ کی ریاست کا جگر چھیدنے کی کوشش ضرور کی گئی۔ لوگوں کی ہمتیں پست کرنا۔ ان کو ڈر اوے دینا۔ حضور سے فریب کرنے کی پٹی پڑھانا۔ اتفاق سے روکنا۔ اسلامی فوج کا مذاق اڑانا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت پر حرف گیری کرنا۔ غرضیکہ کسی پہلو سے کوئی کسر نہ رہنے دی۔

البتہ اس پانچویں کالم نے سب سے بڑھ کر اپنے جوہر جنگِ احزاب (غزوہ خندق) کے موقع پر دکھائے۔ میدانِ بدر کے اولین معرکے میں قریش کی قوت کو کاری ضرب لگ چکی تھی۔ اس کا انتقام لینے کے لیے انہوں نے بڑی تیاریوں سے فوج کشی کی اور اُحد میں مقابلہ ہوا۔ لیکن وہ پوری طرح بازی سر کیے بغیر ہی پلٹنے پر مجبور ہو گئے۔ سہمے میں وہ اپنی اور اپنے سارے حامیوں اور مدینہ کے سازشیوں کی قوتیں مجتمع کر کے اور مختلف قبائل کو اکسا اکسا کر لائے۔ گویا ہر طرف سے لشکروں (احزاب) نے آ کر مسلمانوں کو گھیر لیا۔ یہ بڑا ہی فیصلہ کن معرکہ تھا۔ اور اس کے بعد قریش اور دوسرے دشمنانِ اسلام کا زور ٹوٹ گیا۔ اور مسلمان نے مدافعتِ پالیسی کو ترک کر کے دشمنوں کی سرکوبی کے لیے پیش قدمی کی پالیسی اختیار کی۔ جنگِ احزاب کے خاتمے کے دن ہی درحقیقت فتح مکہ کا دروازہ کھل گیا تھا۔

اس فیصلہ کن معرکہ کے پس منظر میں جن عناصر نے سازشی سرگرمی دکھائی ان میں سرفہرست بنو نضیر کے یہودیوں کو رکھا جاسکتا ہے۔ ان میں سے جو لوگ خیبر میں جا کر جمے، انہوں نے حالات کے تار پڑھاؤ پر برابر نگاہ رکھی، جب انہیں جنگِ اُحد کا حال معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو بڑی سخت صورت حالات پیش آئی اور قریش اگرچہ کامل فتح کا سہرا انہیں بانڈھ سکے لیکن خاصاً زور دکھا کے تھے ہیں، تو انہوں نے متحرک ہو کر تادریخ کے مدوجزر کو تیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ بنو نضیر میں سے سلام بن ابی الحقیق، سلام بن مشکم، جیبی بن اخطب، کنانہ بن الربیع جیسے نامی گرامی سردار نکلے اور انہوں نے بنو نضیر میں سے ہوزہ بن قیس، ابوعمارہ اور بعض دوسروں کو ساتھ لیا۔ مکہ جا کر انہوں نے قریش کو مدینہ پر چڑھائی کرنے کی ترغیب دلائی اور اپنی حمایت کی پیش کش کی۔ پھر یہ لوگ بنو غطفان کے ہاں پہنچے اور ان کو بھی تیار کیا۔ پھر دوسرے متفرق قبائل میں گھومے۔ قریش نے بھی قبائل میں اپنے پورے اثر کو استعمال کیا۔ چنانچہ دس ہزار سپاہیوں نے مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔



آغاز جنگ سے قبل جی بنی بنی نے کعب بن اسعد سے ساز باز کر کے بنو قریظہ کا معاہدہ  
 تڑوا دیا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ اس خبر کو سن کر مسلمانوں کو سخت پریشانی لاحق  
 ہوئی اور بنو قریظہ کی طرف سے حملہ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرنے کے لیے حضور  
 نے فوری طور پر تین سو سپاہیوں کا دستہ مامور کیا۔ ادھر منافقین اور کھڑوے لوگوں نے بے اعتمادی، بزدلی  
 کی باتیں پھیلانا شروع کر دیں اور بعض گھروں کی حفاظت کے بہانے مورچے سے جانے لگے۔ یہاں  
 تک طعن کیا جانے لگا کہ نہ ایک طرف تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں قیصر و کسریٰ کی سلطنت کی کنجیاں  
 پانے کی بشارت دیتے ہیں اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص آج رفع حاجت کے  
 لیے بھی اطمینان سے نہیں جاسکتا۔

ایک مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ عین معرکہ کے وقت جب کہ عورتوں کی قیام گاہ کی حفاظت کا معقول  
 انتظام نہ تھا، ایک یہودی مشتبہ حالت میں چکر لگاتا ہوا پایا گیا۔ حضرت صفیہ بنت عبد المطلب نے  
 ایک چوبلی اور جاگر اس کا کام تمام کر دیا۔

اسلامی تحریک کے سپاہیوں کو سب سے زیادہ اضطراب انگیز حالات اسی موقع پر پیش آئے  
 مگر علمبردارانِ حق کے لیے اللہ تعالیٰ کی تائید خاص تھی۔ اس لیے ایک طرف خندق کی نئی  
 دفاعی تدبیر، دوسری طرف قریش اور بنو قریظہ کی ساز باز توڑنے میں نعیم بن مسعود کا حکیمانہ کمال، تیسری  
 طرف حضور اور آپ کے تربیت یافتہ قائدین اور پوری جماعت کا مضبوط مجاہدانہ کردار اور چوتھی طرف  
 مشیت کی بھیجی ہوئی آندھی نے یہ نتیجہ دکھایا کہ دشمن یکایک میدان سے اس طرح رخصت ہو گیا جیسے  
 کبھی کبھی بدلیاں جھٹ جاتی ہیں۔

پھر ایک موقع غزوہ تبوک کا ہے۔ جب کہ مدینہ کے پانچویں کالم نے اپنے فنِ لطیف کے  
 کچھ شاہکار پیش کیے۔ ہرقل روم حضور کا نامہ دعوت پانے کے وقت ہی سے برا فروختہ تھا۔ بیچ  
 میں اربابِ سازش نے بھی دربار روم میں رسائی حاصل کر کے اُسے اُکسانے کی کوششیں کی تھیں۔  
 خبر اڑی کہ ہرقل نے چالیس ہزار کا لشکر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کر دیا ہے۔

۱۔ سیرۃ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۶-۲۲۵

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً صفحہ ۲۲۶

حالات کچھ عجیب تھے۔ قحط کا زمانہ تھا۔ درختوں میں پھل تیار تھے۔ موسم سخت گرم تھا۔ فوج بڑی تعداد میں زیادہ فاصلے پر روانہ کی جانی تھی۔ مگر مالیات کا پہلو کمزور تھا۔ اور سواری سازو سامان اور نان و نفقہ کی حدود بہ قلت تھی۔ اسی لیے اسے ”جیشِ عسرت“ کا نام بھی دیا گیا ہے۔ منافقین نے اس حالت کو دیکھ کر اور یہ اندازہ کر کے کہ اس معرکے میں غنیمت ہانتے آنے کا کم ہی امکان ہے۔ مہم تعاون کی پالیسی اختیار کی اور جھوٹے عذر گھڑ گھڑ کر بیٹھ رہے۔ اس پہلو سے اسے غزوہٴ قاضحہ (یعنی منافقین کا پول کھول دینے والا معرکہ) بھی کہتے ہیں۔ غدرات کی مصحفہ انگیزہ نوعیت کا اندازہ اس سے ہو سکے گا کہ جد بن قیس نے آکر حضور سے کہا کہ لوگ جانتے ہیں کہ مجھے عورتوں کی طرف بہت زیادہ رغبت ہے اور میں ڈرتا ہوں کہ نبی الا صفر کی عورتوں کو دیکھ کر فتنہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں لہذا مجھے معذور رکھیے۔ یہ لوگ خود تو رہے ہی تھے، ہر کسی سے کہتے پھرتے تھے کہ خدا خدا کرو، دیوانے ہو گئے ہو۔ اس جھلستی گرمی میں تم جہاد کرنے چلے ہو۔ (وق لولا انصر وافی الاحزاب) انہوں نے یہ ایک ڈراما ویلڈ یہودی کے مکان پر بنا رکھا تھا۔ اس میں لوگ جمع ہوئے تو ان کو انہوں نے منہ سے نکال دیا۔ انہوں نے کہا کہ تم لوگ اس سے کانپا کر وجود ہی ختم کر دیا گیا۔

ادھر عبداللہ بن ابی کی فعال شخصیت نے شیبہ اور اس میں ذباب کی جانب سے یہودیوں کو مدد پر مشتمل، بگ شکر شریپندانہ مقاصد کے لیے ترتیب دے دیا جو خاص طور پر انہوں نے حضور کے ساتھ روانہ نہ ہو سکا۔

پھر شکر کی روانگی کے بعد ان لوگوں نے ایک اور فتنہ پیدا کر دیا۔ حضور نے یہودیوں کو اہل بیت کی دیکھ بھال کے لیے بطور ذائقہ نائب کے چھوڑا تھا۔ یہ لوگ کہنے لگے کہ آج کل محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی طبیعت حضرت علیؑ کے بارے میں مکدر ہے اسی لیے ان کو ساتھی نہیں بنا۔ حضرت علیؑ کی طبیعت کو اس نشتر نے اُجھا دیا۔ اور ہتھیار لگا کر آپ حضورؐ پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہٹے۔ اور منافقین کی شرا انگیزی کا قصہ بیان کیا۔ حضور نے انہیں سمجھا، بھجا کروا پس بھیجا کہ انہوں نے ان لوگوں سے خدشہ ہے۔

نبوک پہنچ کر ساتھ جانے والے منافقین (اور کچھ نہ کچھ تعداد فتنہ انگیزی کے لیے ہمیشہ تیار ہوتی تھی) نے حق کے سپاہیوں کو یہ کہہ کر ڈرانا شروع کیا کہ نوا صفر کے شیر دل جنگ زمانوں کو تو لوگوں نے عربوں پر قیاس کر رکھا ہے۔ کا تمہارا اپنی غلط فہمی ہا حال لیجیل ہائے کا جب کہ تم سب کے سب غلام بن کے جکڑے ہوئے ہو گے۔ باز پرس لی تو کہہنے لگے کہ ہم تو مذاق مذاق میں کچھ باتیں کر رہے

تھے کوئی سنجیدہ معاملہ نہ تھا۔

رومی لشکر تو آیا ہی نہیں تھا۔ لیکن اس مہم سے ایک طرف رومیوں کو اندازہ ہو گیا کہ مدینہ پوری طرف چوکنا ہے اور ہمارے مقابلے پر آنے کی طاقت رکھتا ہے۔ دوسری طرف اہلبے، جبریا اور دومۃ الجندل کے علاقے زیر اثر آ جانے سے بیرونی حملہ کے امکانات کم ہو گئے۔

اس سفر میں دو مواقع پر حضور نے چشموں سے بلا اجازت پانی پینے سے فوج کو منع کر دیا تھا۔ لیکن بعض منافقوں نے حکم عدولی کر کے اپنے دلی روگ کو عیاں کر دیا۔

اسی سفر میں عقبہ کے مقام پر حضور کو ہلاک کر دینے کی ناکام سازش کی گئی۔ جس کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔

اہل نفاق کی اتنی غداروں اور سازشوں کے باوجود حضور اس مہم میں کامیابی حاصل کر کے واپس ہوئے اور بڑی شان سے آپ درگزر کرتے گئے۔ تین مخلص ساتھی کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن ربیع ہوساہل کی وجہ سے رہ گئے تھے انہوں نے اعتراف قصور کیا اور ان کو سچاں دن تک حکم الہی کے انتظار میں معاشرہ سے الگ رہنا پڑا۔ اس امتحان سے یہ لوگ اس خوبی سے گزرے کہ انہوں نے اپنے آپ کو زہریں کردار سے مالا مال کر لیا۔ ان کی سچی توبہ قبول ہوئی۔ مگر منافق کہتے تھے کہ عجب بے وقوف لوگ ہیں ہماری طرح کوئی عذر کر دیتے، خواہ مخواہ اپنے آپ کو وبال میں ڈال لیا ہے۔ اب بھگتیں۔ اندازہ کیجیے کہ اسلامی ریاست اور اسلامی تحریک کو کیسے کیسے سنگین حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور نوع انسانی کو فلاح کا راستہ دکھانے والی ہستی کو پیروانِ مہی اور ان کے پیدا کردہ منافقین کے ہاتھوں کیسی کیسی غدارانہ کارروائیوں سے سابقہ پیش آیا۔

مگر اسلامی ریاست کا پھیلاؤ بڑھتا ہی گیا۔ تحریکِ حق کی شعاعیں فضا میں پھیلتی ہی چلی گئیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام گونجتا ہی چلا گیا۔ اخلاص پھولا اور پھلا، مگر غداروں کے جھاڑ جھنکار پھل تو کیا لاتے، ان کی جڑیں ہی کھد گئیں۔

**قریش کی ذلیل انتقامی حرکات :**

مدینہ کے ابتدائی دور میں — جنگ چھڑنے سے قبل — قبیلہ اوس کے ممتاز سردار سعد بن معاذ عمرہ کرنے کے لیے مکہ معظمہ گئے۔ امیہ بن خلف سے چونکہ ان کے دیرینہ تعلقات تھے، اس لیے

اسی کے ہاں قیام کیا۔ وہ اُمیہ کو لے کر کعبہ کا طواف کرنے لگے۔ اتفاقاً ابو جہل بھی اُدھر آ نکلا۔ اس نے پکار کر اُمیہ سے پوچھا، ”کون ہے تمہارے ساتھ؟“ اُمیہ نے بتایا کہ سعد ہیں۔ ابو جہل نے غضب ناک ہو کر کہا۔ کہ تم لوگ ان بد مذہبے (صّابی) لوگوں کو پناہ دیتے ہو، پھر سعد سے کہا کہ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم لوگ کعبہ میں قدم رکھ سکو۔ اگر تم اُمیہ کی حمایت میں نہ ہوتے تو آج زندہ بچ کر جا نہ سکتے یہ

دیکھیے کہ سیاسی انتقام کا جذبہ قریش کے ایک لیڈر کو یہاں تک لے آیا ہے کہ وہ خدا کے گھ کے دروازے اس کے بندوں پر بند کرتا ہے۔ اور ان کو ایک عبادت سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ گویا کعبہ بھی ان لوگوں کی ایک جاگیر تھی۔ اور حرم کی تولیت کو انہوں نے درحقیقت اپنی سیاسی قوت کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ یوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جن رفقاء کو سجت، پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ ان کے لیے حرم پاک کے دروازے بند تھے ہی۔ مگر سعد بن معاذ کو یوں صاف صاف لفظوں میں روک کر ابو جہل نے اپنی غلط پوزیشن کو بری طرح اہم نشرح کر دیا۔ ادھر حد بھی کوئی خودی کش درویش تو بنتے نہیں۔ ان کے اندر اسلام کی روح حمیت کا رومانا تھی اور وہ مدینہ کی سیاسی قوت کے معنی جانتے تھے۔ انہوں نے مختصر لفظوں میں ایسا جواب دیا کہ ابو جہل اور قریش کے سامنے ایک خطرہ عظیم نمودار ہو گیا۔ سعد نے کہا: ”اگر تم نے ہم کو حج سے روکا تو ہم تمہارا مدینہ کا دشمن بن جائیں گے۔ دوسرے لفظوں میں یہ قریش کی معاشی شاہ رگ کو کاٹ دینے کی دھمکی تھی اس دھمکی نے سامنے مکہ کو چونکا دیا۔ بعد میں مدینہ کی پالیسی سعد کے اسی قول کے مطابق تشکیل پائی اور قریش بے بس ہو کر آخری بازی کھیل بنانے پر تیار ہو گئے۔“

ابو جہل جذباتی مہجان میں کہنے کو تو یہ کہہ گیا۔ لیکن اس بے جا دھمکی سے قریش کے ٹرک و سخت دھکا لگا۔ قرآن نے ان کی حرم کی اس ٹھیکہ داری کو جس کے بل پر وہ بندگانِ خدا کو خانہ خدا میں رہنے سے روک رہے تھے، بھرپور تنقید کا نشانہ بنایا۔ دیکھیے:

\_\_\_\_\_  
 بعد اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو گا جو اللہ کے معبودوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور (اس طریقے سے) ان کی ویرانی کے درپے ہونے

(بقرہ - ۱۱۴)

”لوگ پوچھتے ہیں کہ ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے؟ کہو اس میں لڑنا بہت بُرا ہے۔ مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجدِ حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ بُرا ہے۔“ (بقرہ ۲۱۷)

”لیکن اب کیوں نہ وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) ان پر عذاب نازل کرے جب کہ وہ مسجدِ حرام کا راستہ روک رہے ہیں۔ حالانکہ وہ اس مسجد کے جائز متولی نہیں ہیں۔“ (الانفال - ۳۳)

اور قرآن کی یہ بات تمام عرب میں آہستہ آہستہ پھیلتی گئی اور قریش کی مذہبی دھاک کا زور کم ہوتا گیا۔

خود صلح حدیبیہ رضی اللہ عنہا کے موقع پر قریش نے اسی ضد عن المسجد الحرام کا ذرا بڑے پیمانے پر مظاہرہ کیا۔ ایک القلے غیبی کے تحت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقط عمرہ کے ارادے سے یہ سفر کیا۔ کوئی بغیر جنگ نہیں ہوئی۔ رہنا کارانہ طور پر لوگ عمرہ کے لیے نکلے۔ قربانی کے جانور ساتھ لیے گئے۔ اور جنگی ضرورت سے اسلحہ بندی کے بغیر محض معمولی حفاظتی ہتھیاروں کے ساتھ قافلہ روانہ ہوا۔ ذوالحلیفہ کے مقام پر مشہور مقررہ شعائر کے مطابق قربانی کے اونٹوں کو نشان زد کیا گیا۔ اور ان کے گلے میں قلاوے ڈالے گئے۔ اس سے ایک نظر میں دیکھنے والے کو اندازہ ہو سکتا تھا کہ یہ اونٹ حرم میں قربانی پیش کرنے کے لیے لے جا رہے ہیں۔ یہ جنگی سواریاں نہیں ہیں۔ راستے ہی میں مخبر۔ بشر بن سفیان الکعبی۔ کے ذریعے اطلاع مل گئی کہ بنی کعب بن لوی جنگی تیاری کر رہے ہیں اور کسی قیمت پر حرم میں نہ جانے دیں گے۔ حدیبیہ پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغام بھجوایا کہ ہم لڑنے نہیں آئے۔ عمرہ کرنے آئے ہیں۔ بدیل بن ورقاء خزاعی نے مصالحت کی کوشش کی۔ پھر عروہ بن مسعود نے گفت و شنید کو آگے بڑھایا اس کے بعد بنی کنانہ کا ایک شخص حلیس بات چیت کرنے کے لیے بیچ میں آیا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے جب قلاوہ والے اونٹوں کا ایک سیلاب وادی میں متحرک دیکھا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبائی گئیں اور اس نے اپنا یہ تاثر قریش سے بیان کیا۔ تو انہوں نے یہ کہہ کر اس کی بڑی حوصلہ شکنی کی کہ تم دیہاتی آدمی ان معاملات کو کیا جانو۔ حلیس کو اس پر بڑا رنج ہوا۔ اس نے کہا:

”اے قریش! ہمارا تمہارا یہ معاہدہ نہیں۔ نہ اس پر ہم نے حلیفانہ تعلق قائم کیا ہے

کیا خدا کے گھر سے ایسے شخص کو روکا جائے گا جو اس کی شان بڑھانے کے لیے آیا ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں حلیم کی بان ہے تم محمد رسول اللہ علیہ وسلم کو موقع دو کہ جو کچھ وہ کرنا چاہتے ہیں، کریں۔ مگر ہم اپنے تمام گروہوں کو واپس لے جاتے ہیں۔

سنو کا پیر، سوائف موقوفہ اس شخص کے عدل میں ٹھہر کر گیا تھا اور اس کی شان بڑھانے کے لیے آیا ہے۔ اور اس کا امیر قریش کی دعا میں لے گیا۔ خلافت کا مسئلہ میں آگیا۔ اور اس کو روکا گیا کہ تم ہوئے۔ باوجود کہ اس سے ٹھنڈا کیا گیا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ تم سب شرعیوں کی رائی رکھو۔ اور اس کو پھر تشریحیں بیسی۔ طے لیں کہ حضور اور امیر کے ساتھ آگے بڑھنا اور جو وہ گروہ سے ہٹا دیا اور کچھ اور بہن سکا تو ابی ہبشہ پوری کر کے گئے۔ پھر اس کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔

وہ ان سے اس موقع پر کبھی نہیں ملے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے امیر کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔

سے روکا، اور اس میں کچھ مسئلہ کی کہ اس کی رائی رکھو۔ اور اس کے ساتھ گئے۔

تمام نام پہنچ سکیں۔ اور اس کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔

شعیر دینی۔ جو ابی ہبشہ کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔

کی اس لئے اندامی نے ان کا موقع نہ ہی ہو۔ اور اس کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔

ایک مخالفانہ چرچا سارے عرب میں پیدا ہوا۔ اور اس کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔

فقوی اور شرافت کے جوہر سے خالی ہو کر وہ اور مندرجہ ذیل اور اس کے ساتھ گئے۔

قریش کے جذبہ انتقام کا مینگی کی حالت میں جو پورا صحابہ کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔

نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے دل ٹھنڈا کر لیا۔ اور اس کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔

سے ظالمین دلوائیں۔ یہ بڑے ہی زہریلے ڈنکے تھے جو صحابہ کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔

گئے تھے۔

حضرت رقیہ اور حضرت امیر غنیمہ اور امیر غنیمہ کے ساتھ گئے۔ اور اس کے ساتھ گئے۔

۱۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۴ صفحہ ۸-۱۹۴، بیروت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۵۵-۲۵۶، صحیح ابی یوسف جلد ۱ صفحہ ۲۱۰-۲۱۱

بیابا ہی ہو۔ دستور کے موافق انتہائی قرابت دار گھر میں ان کا یہ تعلق پہلے سے قائم تھا۔ ابولہب کی  
 آنکھیں شخصیت اتنی عالی مرتبہ کبھی تھی ہی نہیں کہ وہ اصولی نزاع کو ذاتی اور نجی تعلقات سے الگ رکھ  
 سکتا۔ قرابت داری کے حقوق کو اختلاف کی لپیٹ میں نہ آنے دیتا۔ وہ اپنے بغض میں ہمیشہ تندر اور  
 اپنے کروتوں کے لحاظ سے ہمیشہ لپست رہا ہے۔ اس کی ذلیل حرکتوں کی بنا پر جب سورہ لہب نازل  
 ہوئی اور آسمانوں سے صدادی گئی کہ ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ گئے۔ یعنی وہ ساری مخالفانہ حرکات  
 سے کام لینے کے باوجود تحریک اسلامی کا بال بیکا نہیں کر سکتا اور سچائی کی طاقت اس کے ہاتھوں کو  
 توڑتی ہوئی آگے بڑھ جانے والی ہے تو وہ بھٹا گیا۔ اس نے اپنے بیٹوں پر دباؤ ڈالا کہ اب تمہارے  
 لیے یہ بات قطعاً حرام ہے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹیوں کو اپنے گھروں میں رکھو۔ اور ان کو طلاق  
 نہ دے دو۔ حضرت رقیہ اپنے گھر میں بس رس رہی تھیں۔ عقبہ نے باپ کے اشارے پر طلاق دے دی  
 اور بعد میں حضرت عثمانؓ سے ان کا ازدواج ہوا۔ ابولہب کو بھڑکانے اور اس کے بیٹوں کو اس حرکت  
 پر آمادہ کرنے کے لیے قریش کے دوسرے سرداروں نے بھی خاصا کام کیا۔ انہوں نے باہم دگر اس امر  
 پر غور کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پریشان کرنے کا سلسلہ کچھ رک سا گیا ہے۔ سو کوئی نیا شرتیز  
 کرنا چاہیے۔ جس سے کچھ اور ناسور ڈالے جا سکیں۔ کیوں نہ اس کی صاحبزادیوں کو اپنے شوہروں سے  
 طلاق دلوائی جائے۔ تاکہ ایک نئی مصیبت اس شخص کے لیے پیدا ہو جائے۔ اس مشورے کے تحت  
 انہوں نے عقبہ بن ابی لہب کو پیش کش کی کہ قریش کی جس عورت کو چاہو گے فراہم کر دی جائے گی۔ بس  
 شرط یہ ہے، کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کو اپنے سے الگ کر دو۔ سو اس ظالم نے یہ اقدام کر ڈالا۔  
 عقبہ نے ذرا زیادہ تندی دکھائی۔ اور حضرت ام کلثوم کو طلاق دے کر دندناتا ہوا سرور عالم (صلی اللہ  
 علیہ وسلم) کے پاس پہنچا۔ ڈھٹائی سے کہنے لگا کہ ”میں نے تیرے دین سے کفر کیا۔ اور تیری بیٹی کو  
 طلاق دی۔ نہ تجھے مجھ سے محبت ہے اور نہ میں تجھے پسند کرتا ہوں“ نہایت گستاخانہ انداز سے درازت  
 کی اور حضورؐ کا کرتہ نوجا۔ ایک قرابت دار نوجوان کا اپنے کینہ تو زباپ کی شہ پر ایک طرف ایک شریف  
 زادی کو طلاق دے کر ظلم کرنا اور دوسری طرف یوں غنڈوں کی طرح پیش آنا اتنا تکلیف دہ واقعہ  
 تھا کہ بے اختیار حضورؐ کی زبان سے یہ بددعا نکلی کہ ”اے اللہ! اپنے درندوں میں سے کسی درندے  
 کو اس پر مسلط کر۔ ابوطالب نے سنا تو عقبہ سے کہدیا، کہ اب تمہیں میرے بھتیجے کی اس بددعا سے کوئی  
 نذیر بچا نہ سکے گی۔ چنانچہ شام میں ایک جگہ وہ تجارتی قافلے کے ساتھ شب باش ہوا۔ اور رات کو ایک  
 شیر نے سارے قافلے میں سے چھانٹ کر اسی کا سر چبا لیا۔

حضرت رقیبہ کی وفات کے بعد حضور نے اپنی ان دوسری صاحبزادی اتم کلثوم کا نکاح بھی حضرت عثمان سے کر دیا۔ اسی لیے آنجناب ذوالنورین کہلائے۔

فقہ گران قریش نے جس طرح عتبہ بن ابی لہب پر دباؤ ڈالا تھا، ٹھیک اسی طرح انہوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت ابوالعاص پر بھی زور دیا اور ان کو بھی وہی پیش کش کی کہ تم اگر بنت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو طلاق دے دو، تو جس بہترین عورت پر نظر ڈالو گے تمہارے نکاح میں دے دی جائے گی۔ ابوالعاص میں شرافت کا جو ہر تاباں موجود تھا، انہوں نے کہا کہ خدا خدا کرو، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی اہلیہ کو جدا کر دوں۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے کہ زینب کے برے میں قریش کی کوئی اور عورت میرے گھر میں ہو۔ بعد میں حضور ابوالعاص کی اس مضبوطی کردار کی تعریف فرماتے تھے۔ اور اس کے اس شریفانہ رویے کا جواب انہوں نے دو موقعوں پر بہت بڑے احسانات کی صورت میں دیا۔ ایک اس وقت جب وہ اسیران بدر میں آئے تھے اور فدیرہ میں حضرت زینب کا بھیجا ہوا ہار واپس کر آیا۔ اور دوسری بار جب کہ ان کا تجارتی مال، مالِ غنیمت کے طور پر مسلمانوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ اور حضور کے اشارے سے وہ بچوں کا ٹوں ان کو لوٹا دیا گیا۔

جنگ بدر کے بعد جب ابوالعاص کو حضور نے بطور احسان خاص کے رہائی دلوائی تو باتوں باتوں میں ان سے وعدہ لیا کہ وہ حضرت زینب کو مدینہ آنے کا موقع دیں گے۔ یہ بات عام لوگوں سے مخفی رہی۔ چنانچہ حضرت زینب کی روانگی کے مقررہ وقت پر دو صحابیوں حضرت زید بن حارثہ اور ایک انصاری کو بھیجا کہ تم یا بیج (ایک جگہ کا نام ہے جو مکہ سے ۸ میل کی دوری پر تھی) کے بیچ میں ٹھہرا اور جب زینب آجائیں تو ان کو ساتھ لے آنا۔ ادھر ابوالعاص نے حضرت زینب کو تیار کیا اور انہوں نے سامان وغیرہ درست کر لیا۔ ان کا دیور کنانہ بن ربیع علی الصباح ان کو ہودج میں بٹھلا کر نکلا قریش کو خبر ہوئی تو ان خسیسوں نے یوں سوچا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی یوں صحیح سلامت ہمارے درمیان سے چلی جائے، تو حیف ہے۔ کچھ لوگ تعاقب کو نکلے اور ذمی طوی میں ان کو جا لیا۔ ہبار بن اسود نے پھر کر ہودج پر تیر چلایا۔ حضرت زینب اس وقت اُمید سے تھیں تیر گئے سے وہ سببین حادثہ سے دوچار ہو گئیں اور جنین کا اسقاط ہو گیا۔ پھر جب ان کے دیور نے تیر کمان درست کر کے ان کو لکارا، تو مکہ کے یہ غنڈہ مزاج بہادر پیچھے ہٹ گئے۔



مخوڑی ہی دیر میں ابوسفیان بھی آ پہنچا۔ اس نے دُور ہی سے حملہ آوروں کو پکار کر کہا کہ میری بات سُن لو۔ اس نے کنانہ بن ربیع کو ٹوکا کہ آخر یہ تم نے کیا کیا کہ علی الاعلان اس بی بی کو لے نکلے۔ حالانکہ تم دشمنی کی اس فضا کو جانتے ہو جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وجہ سے ہمارے سر پر محیط ہے یوں دن دہاڑے اس طرح کے اقدام میں مکہ کے لوگ ذلت محسوس کرتے ہیں۔ مجھے اپنی بھان کی قسم۔ ہمیں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی کو روکنے سے کچھ غرض نہیں۔ اس وقت اسے واپس لے چلو۔ کسی وقت چپکے سے لے جانا۔

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مکہ والے حضور کو اذیت پہنچانے کے لیے کن آخری حدود خباثت کو چھوڑے تھے۔ ان کے دلوں میں قرابت کا کوئی لحاظ نہیں رہا تھا۔ ان کو ایک عورت پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ان کے حلقوں میں ظلم کو ظلم سمجھنے کا مادہ ہی ختم ہو چکا تھا۔ اور ان کی نگاہوں میں انسانیت کی کوئی قدر اور ہم جنسوں کے کوئی حقوق باقی نہیں رہے تھے۔ اب ایک اور واقعہ لیجیے جو سرتا سر خوشخوارانہ ذہنیت کو ہمارے سامنے بے نقاب کرتا ہے۔ حضور نے ملحقہ علاقوں میں تعلیمی و فوڈ بھیجنے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اس کے تحت غزوہ اُحد کے منسلک بعد (ماہِ صفر میں) عضل و قارہ (بنو مذیل) کے لوگوں کی خواہش پر — جس کے پیچھے سازش کام کر رہی تھی — چھ آدمیوں کا ایک وفد روانہ کیا جس میں سے چار کو بمقامِ ربيع (چشمہ راز) شہید کر دیا گیا اور حضرت خبیب اور حضرت زید بن وثنہ کو قیدی بنا کر مکہ لے جایا گیا۔ وہاں بنو مذیل کے دو قیدی قریش کے پاس تھے۔ جنہیں تبادلہ کر کے انہوں نے چھڑایا۔ حمیر بن ابی تمیمہ نے حضرت خبیب کو عقبہ بن حارث بن عامر کے لیے لیا۔ تاکہ ان سے حارث کا بدلہ لے جسے حضرت خبیب نے میدانِ یر میں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ زید بن وثنہ کو صفوان بن امیہ نے اپنے باپ امیہ بن خلف کے بدلے میں قتل کرنے کے لیے خریدا۔

یہ اپنی شجاعت کے گُن گانے والے میدانِ جنگ میں قلیل التعداد اور بے سروسامان مسلمانوں سے پٹنے کے بعد اب دو بے بس قیدیوں کی جان لے کر آتش کینہ کو بجھانا چاہتے تھے۔ اسلامی معاشرہ کی

۱۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۹۹ - ۲۹۶ صحیح السیر مولانا عبدالرؤف دانا پوری صفحہ ۲۰-۱۳۹  
 ۲۔ واقعہ ربيع کے دوسرے پہلو تفصیل سے ہم بعد کی ایک فصل میں دے رہے ہیں۔ اسی طرح تریسیل و فوڈ کا تذکرہ بھی دوسری جگہ آئے گا۔

دوقیمتی ہستیوں کو اگرچہ شہادت کا پیالہ پلا دیا گیا۔ لیکن اس موقع پر دونوں کے کرداروں کا ایسا واضح تقابل ہو گیا، کہ اس کے اثرات وقت کی تاریخ کی رگوں میں پھیل گئے۔

صفوان نے زید بن دثنہ کو اپنے غلام فسطاس کے سپرد کیا کہ وہ حرم کے باہر تنعیم میں جا کر ان کا کام تمام کر دے۔ اس دلچسپ ڈرامے سے خوش وقت ہونے کے لیے قریش کا ایک مجمع موقع پر موجود تھا۔ اور ان میں ابوسفیان بہ نفس نفیس شریک تھا۔ ابوسفیان نے قریب ہو کر زید سے پوچھا کہ کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے۔ اور تم اپنے بال بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہو سہو اور تمہارے بچائے ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا خاتمہ کر دیں۔ زید جس کے سامنے سرت کھڑی مسکرا رہی تھی، ایمان کی کن بلندیوں سے جواب دیتا ہے کہ :-

”واللہ ما ہم لوگوں کو اتنی سی بات کے عوض بھی آزاد ہو کر اپنے اہل وعیال میں رہنا پسند نہیں کہ اس وقت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جہاں ہیں وہاں بھی ان کو ایک کانٹا تک چبھے۔“

ابوسفیان یہ جواب سن کر دنگ رہ گیا اور پکار اٹھا کہ میں نے کسی کو کسی کا ایسا محاسب نہیں دیکھا جیسا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کے رفیق محبوب رکھنے ہیں۔ پھر اس مجلس صاف رونے لگا اور انہوں نے کالقمہ بنا دیا گیا۔ کون جانتا ہے کہ زید کے اس کردار نے کتنے دلوں میں جاگ بجا کر ہو گئی اور کتنی قریش کی اس ظالمانہ اور کمینہ کار روانی پر ماتم کر رہی ہوں گی۔

حضرت خبیثؓ بعد تک قید میں رہے۔ قید میں رہ کر انہوں نے اپنے بیٹے اور بیٹی کی پرورش کی۔ جھلک متواتر دکھائی اس کا ایک واضح نتیجہ تو یہ ہوا کہ حمیر بن اباب کی نوڈنی مادہ پیدا ہوئی۔ اس مادہ کی مدد سے ان میں جذب ہو گئی۔ اور اسی کے ذریعے حضرت خبیثؓ کی روداد اسیر سی سامنے آئی۔ مادہ ہا بین ہے۔ ان کے قتل کا مقررہ وقت جب قریب آگیا تو انہوں نے سفائی کے لیے استرہ منگوا یا ہو۔ پھر وہاں گیا۔ مگر بعد میں یہ دیکھ کر زمین میرے پیروں تلے سے نکل گئی کہ استرہ ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ بچہ بچہ خبیثؓ کی گود میں بیٹھا ہے۔ جس قیدی کو اس ظالمانہ طریق سے زندگی سے محروم کیا جا رہا ہوگا، اس کے قابو میں دشمن کا ایک بچہ آجائے۔ اور ہتھیار بھی اس کے ہاتھوں میں ہونو ہوا۔ پیشے ہو سکتے ہیں ظاہر ہیں۔ میرے اضطراب کو خبیثؓ نے بجا نپ لیا اور اطمینان دلایا کہ میں کسی حال میں اس معصوم

کی جان نہیں لینے کا۔ انہوں نے فوراً لڑکے کو الگ کر دیا۔ یہ بلندی کر دار کیا ایک مشعل کی طرح مکہ کی تیرتار فضاؤں میں جگمگانہ اٹھی ہوگی۔

پھر ان کو صلیب پر چڑھانے کے لیے تنعیم لے جایا گیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے اجازت لے کر آخری نقلی نماز بہ اطمینان پڑھی اور شہادت گاہ الفت میں قدم رکھنے والوں کے لیے ایک مبارک سنت قائم کر دی۔ پھر جلد ہی فارغ ہو کر کہا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ میں موت کے ڈر سے نماز میں تاخیر کر رہا ہوں۔ یہ مختصر سی دعا مانگی۔

اے اللہ! ہم نے تیرے رسول کے پیغام کو پہنچا دیا۔ تو کل اس ہستی کو اس سے آگاہ فرما دے جو کچھ کہ ہمارے ساتھ ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔

اے اللہ! ان (دشمنوں) کی تعداد کو کم کر۔ ان کو تفرقہ میں ڈال کر ہلاک کر اور ایسے خوشخواروں میں سے کسی کو جیتا نہ چھوڑ۔

اور صلیب پر لٹکا دیئے گئے اور آخر میں ابو مغیرہ نے حرہ مار کر ان کا رشتہ حیات منقطع کر دیا۔ عین اسی آخری لمحے ان کی زبان پر کچھ اشعار آئے جس میں سے مشہور ترین یہ ہے:

وَلَسْتُ اَبَايَ حَيْثُ اُقْتَلُ مُسْلِمًا

عَلَى اَيِّ شَيْءٍ كَانَ فِي اللّٰهِ مَضْجَعِي

میں جب اسلام سے مالا مال ہو کر قتل کیا جا رہا ہوں تو پھر مجھے اس بات کی کچھ فکر نہیں ہے کہ خدا کی راہ میں مجھے کس کروٹ گرنا نصیب ہو رہا ہے۔

ان دو جانوں کو لے کر قریش نے بزعم خویش یہ سمجھا ہوگا کہ ہم نے تحریک اسلامی کی قوت گھٹا دی۔ لیکن ان کو اندازہ نہیں تھا کہ ان مظلوموں کے خون شہادت کے قطرے دلوں کی کھیتوں میں ایسے بیج بن کر پڑے ہوں گے کہ آگے چل کر ان سے اسلام کی نئی فصلیں لہلہا اٹھنی تھیں۔

انہی گھٹیا انتقامی حرکات کے ساتھ ہم قریش کی اس سیاسی خیانت کو بھی پیش کرتے ہیں جن کا مظاہرہ انہوں نے معاہدہ حدیبیہ کو توڑ کر کیا۔ اس عظیم تاریخی معاہدہ کے تحت طے پایا تھا کہ عربی قبائل میں سے جن کا جی چاہے وہ قریش کے ساتھ معاہدہ تعلق قائم کرے اور جس کو پسند ہو وہ اسلامی ریاست کے ساتھ حلیفانہ رشتہ استوار کر لے۔ قبائل کو پوری آزادی ہوگی اور کسی طرف سے ان پر جبر نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ

وہیں موقع پر بنو بکر نے قریش سے اور بنو خزاعہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے معاہدہ تعلق جوڑ دیا۔

دورِ اسلامی سے قبل ان دونوں قبیلوں کے درمیان ایک قتل کے سلسلہ میں انتقام در انتقام کا منحوس چکر چل رہا تھا۔ اور ان کے مابین متعدد واقعات قتل ہو چکے تھے۔ بنو بکر اپنی باری پر بدلہ لینے کے لیے تل ہی رہے تھے کہ اسلامی تحریک نے تاریخ میں شدید مدوجذر پیدا کر کے جاہلی عرب کے تمام قبائل کی توجہ ادھر کھینچ لی اور وہ باہمی معاملات کو درکنار رکھ کر اس نئے پیغام کی مخالفت میں صفت بستہ ہو گئے۔ تحریکِ اسلامی کے عناد نے جو سطحی سا اتحاد ان میں پیدا کر دیا تھا۔ اس کا زور معاہدہ حدیبیہ کے بعد ٹھنڈا پڑنے لگا۔ اب ان لوگوں کو اپنے پرانے جھگڑے یاد آئے۔ بنو بکر کی ایک شاخ بنو دیل تھے۔ بنو دیل کے ایک شخص اسود بن رزن کے مقتول لڑکوں کا بدلہ لینے کے لیے بنو دیل کے سردار نوفل بن معاویہ نے قبیلہ کے لوگوں کو ساتھ لیا۔ اور ایامِ ہدینہ (یعنی مصالحت) کے وقفے کو غنیمت جان کر بنو خزاعہ پر حملہ کیا۔ اور آغازِ شرارت کے طور پر چشمہ الوتیر کے پاس ایک خزاعی کے خون سے ہاتھ رنگے۔ بقیۃ خزاعی اس نادیدہ عمدہ شکنی کی وجہ سے سرا سیمہ ہو کر بھاگے۔ اور انہیں حملہ آوروں نے تعاقب کر کے قتل کیا۔

قریش نے معاہدہ حدیبیہ کی ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھ کر بنو بکر کو ہتھیار بھی فراہم کیے، اور رات کی تاریکی میں چھپ چھپ کر خزاعیوں سے لڑے۔ بنی خزاعہ نے حرم میں جا کر پناہ لی، اور بنو بکر کے سردار کو پکار کر کہا۔ کہ "اے نوفل! دیکھو، اب ہم حرم میں داخل ہو چکے ہیں۔ اب باز آ جاؤ۔ خدا کے لیے! خدا کے لیے! مگر وہ فتح کے نشے میں بہک رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "آج کوئی خدا نہیں۔ اے بنو بکر! اپنا پورا پورا بدلہ لو! کیا حرم کے احترام میں اپنی عزتوں کا انتقام لینا فراموش کر دو گے؟ چنانچہ ان ظالموں نے حرم میں خوزیزی کی اور کچھ خزاعی بمشکل جانیں بچا کر بدیل بن رقاء اور اس کے غلام رافع کے مکان میں جا چھپے۔

قریش نے قبائلی رقابتوں کے تحت جذباتی بیجان میں آ کر یہ ایسی بڑی حماقت کی کہ جس کا خمیازہ انہیں نقد نقد بھگتنا پڑا۔ یہی واقعہ فتح مکہ کا محرک ہوا۔ قریش نے قطعاً نہ سوچا، کہ تحریکِ اسلامی کی لمحہ ب لمحہ آگے بڑھتی ہوئی طاقتور رو کے مقابلے میں ان کی قوتِ اخلاقی اور سیاسی دونوں لحاظ سے حد درجہ گہر چکی ہے۔ اور ان کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔ اس واقعہ کی وجہ سے عرب کے قبائلی معاشرہ میں قریش کی بدعمری کا خوب چرچا ہوا ہوگا۔ اور ان کی ساکھ حد درجہ گہری ہوگی۔ پھر بنو بکر کی انتہائی ظالمانہ

روش اور بنو خزاعہ کی حد درجہ شانِ مظلومی نے تمام قبائل کو چوکنا کر دیا ہوگا کہ قریش کی قیادت امن اور انصاف بہم نہیں پہنچا سکتی۔ پھر اس واقعہ میں خدا کے نام کے تقدس اور حرم کی حرمت کو صدیوں کی روایات کے بخلاف جس بڑی طرح سے پامال کیا گیا تھا۔ اس نے عوام کے دلوں میں جذباتی بل چل برپا کر دی ہوگی اس ہنگامے سے قریش نے اپنا وزن ظالم عنصر کے پلڑے میں ڈال کر اپنے آپ کو ذلیل کر لیا۔ علاوہ ازیں قریش نے سوچا تو یہ ہوگا کہ ہم اسلامی ریاست کے ایک حلیف کو کچل کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی آتش کینہ کو ٹھنڈا کر رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ نہ سوچا کہ ہم جاہلی نظام کی پشت پناہی کرنے والے نیچے کھچے قبائل کا شیرازہ اپنے ہاتھوں سے درہم برہم کر رہے ہیں۔ اور بعض ہمسایہ قبائل کو خود ہی دھکیل کر مدینہ کے حوالے کر رہے ہیں۔

در اصل ہر بوسیدہ نظام اور ہر فرسودہ قیادت — جو اعلیٰ اصول و مقاصد اور اخلاقی معیارات اور تعمیری نقشہ تمدن سے محروم ہو کر محض اس منفی مقصد کو اپنالے کہ وقت کے افق سے اُبھرنے والی ہر اصلاح اور تعمیر کیش قوت کو کچلنا ہے — اس کی تقدیر یہی ہے کہ اس کی عقل اسے حماقتوں کی راہ پر لے جاتی ہے۔ اس کا زور اسے ضعف کے گڑھے میں گراتا ہے۔ اس کا احساس اسے ذلیل کرتا ہے اور اس کی پیش قدمی اس کی پسپائی کا موجب بنتی ہے۔

عمر بن سالم خزاعی مدینہ روانہ ہو گئے اور سرورِ عالم کے حضور میں جا کر بنو بکر اور قریش کے مظالم کا دکھڑا سنا یا۔ حضور مسجد میں سر مجلس تشریف رکھتے تھے۔ عمر بن سالم نے عربی روایت کے مطابق اپنی داستان درد کو دل شکاف اشعار میں بیان کیا۔

لَا هُمَّ رَافِي نَاسْتَدُ مُحَمَّدًا      حَلَفَ ابِينَا وَ ابِيهِ الْاَتْلَدَا  
فَالصُّرْهَدَا لَكَ اللهُ نَصْرًا اَعْتَدَا      وَ اَدْعُ عِبَادَ اللهِ يَالْتُوا مَدَدَا  
فِي فَيْلِقِ كَالْبَحْرِ يَجْرِي مُزْبِدَا      اِنَّ قُرَيْشًا اَخْلَفُوكَ الْمَوْعِدَا  
هُدًى يَتَوْنَا بِالسُّوْتِ بِرِهْجَدَا      وَ قَتَلُوْنَا رَدْعًا وَ سَجَدَا

اے اللہ! — میں محمد کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا۔ جو ہمارے اور ان کے قدیمی گھرانوں کے درمیان ہوا ہے (اے پیغمبر! ہماری مدد کیجیے اور خدا کے بندوں کو پکاریں تاکہ وہ مدد کے لیے آپ کے گرد مجتمع ہوں۔ ایک ایسے لشکر جزار کے درمیان اٹھیے جو سمندر

لَا هُمَّ رَافِي کے بجائے يَادِيَتِ بھی روایت کیا گیا ہے۔ مثلاً ابن ہشام کے یہاں۔

کی طرح موجزن ہو کر جھاگ اٹھا رہا ہو۔ کیونکہ قریش نے آپؐ کا معاہدہ توڑ ڈالا ہے۔ انہوں نے سہیں رات کی تاریکی میں وتیر کے پاس آیا۔ سوتے میں ہم پر حملہ کیا ہے اور پھر ہمارے لوگوں کو رکوع و سجود کرنے کی حالت میں گھائل کیا:

جواب ملا: نُصِرْتِ يَا عَمْرُو بْنَ سَالِحٍ: تمہاری امداد کی جائے گی۔

ب۔ قریش کی آنکھیں کھلیں کہ ہم نے کیسی بلاکت انگیز حرکت کر ڈالی۔ اور البوسفیان دوڑا دوڑا دینے پہنچا تا کہ شہر پر حملہ کرانے۔ مگر وہاں کی فضا کا عالم یہ تھا کہ البوسفیان اپنی بیٹی کے کھڑ جا کر جب بستر پر بیٹھنے لگا تو بیٹی نے بستر لپیٹ کر اٹھا لیا۔ اور کہا کہ یہ رسول خدا کا بستر ہے اور تم ایک ناپاک مشرک ہوتے ہوئے اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔ بوسفیان نامراد لوٹا اور چند ہی دن بعد یکایک مکہ نے دیکھا کہ ایک عظیم شکر س کے درون سے پر دستک دے رہا ہے۔

ان واقعات سے یہ واضح ہے کہ اس تاریخی کشمکش میں جاہلی قیادت کی منفی قوت کو اس کا ہر اقدام اس کی ہر شرارتوں کی ہر انتقامی حرکتوں کی ہر ہرزمانہ کارروائیوں کا نوٹنہ نہ کوئی چلی گئی اور ہر صوفی شہادت نسولی اور تہذیبی طاقت آہستہ آہستہ زور پکڑتی اور آگے بڑھتی جی گئی۔

ان حکایتوں کے متن میں اس کی پوری محنت سے اس سیرت کے مکرز میں کو دیکھیے کہ البوسفیان درمیان جا رہا ہے۔ جو سیرت میں اس کا نام قبول بر کے مستقل طور پر آیا ہے۔ البوسفیان نے خود کی رسد کو بردہ دیا ہے۔ میں اس زمانے میں مکہ کے لوگ فحشاء سے دور رہنے کی خاطر غریب طبقوں کا خیال کرتے ہوئے پیام سے از خود کہہ کر سدا بھی کرانی اور پھر اپنے بطن سے نکلے مکہ کے لیے پانچ سوا اثر فیاں روانہ کیں۔ ایک اسی احسان نے مکہ کے عوام کے دلوں کو اس قدر زور دیا جو گا۔ ایک روایت میں تو یہ آتے ہیں کہ مکہ والوں نے خود حضور کو کہا کہ آپؐ تو صد رحمی ہونے دیتے ہیں اور ان آپؐ نے ہمارے ساتھ یہ رشتہ توڑ لیا۔ یہ فقرہ بھی مذکور ہے کہ قتلت رسولاً بالصیفة والابن باحسوۃ۔ باپوں کو تلواروں سے نختم کر دیا اور ان کی اولادوں کو بھوکوں مار رہے ہوئے

۱۔ سیرت ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۱۶۔ ۲۔ صبح السیر مولانا عبدالرؤف دہلوی صفحہ ۹۰۔ ۳۔ سیرت ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۱۶۔

۴۔ سیرت ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۱۶۔ ۵۔ صبح السیر مولانا عبدالرؤف صفحہ ۱۱۹۔ رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی۔

۲۵۰

# تلواروں کی چھاؤں میں



اَنَا نَبِيُّ الرَّحْمَةِ  
 اَنَا نَبِيُّ الْمَلْعَمَةِ

میں رحمت کا پیغامبر ہوں  
 میں معرکوں کا پیغامبر ہوں

مُحَسِّنِ السَّنَانِيَّتِ

## تلواروں کی چھاؤں میں

دعوتِ حق کا قافلہ وادیِ سینا سے چلے یا فاران کے دامن سے، اس کی راہ تلواروں کی چھاؤں میں سے ہو کر گزرتی ہے۔

اسلام کی نقلدنی تحریکِ دلیل کے زور سے دلیوں کی دنیا فتح کر رہی تھی وہ قبائلی انتشار کے مقابلے پر ایک نظامِ اخوت کو نشوونما دے رہی تھی، وہ غیر منظم جمہوں کو تنظیم کے رستے پر ڈر رہی تھی، وہ لاقانونی اور نرج کی جگہ ایک جمہوری دستوری ریاست اور قانون و عدالت کے در کے نشانیں دے رہی تھی۔ وہ سوتی ہوئی علمی قوتوں میں تحریک پیدا کر رہی تھی، بہالت کی تاریکیوں میں علم کی مشعلیں روشن کرتی جا رہی تھی، وہ خدا پرستی کی مردہ درگم شدہ روح کا حیا کر رہی تھی، وہ خدا کی قدر و کیمے سمجھے ہوئے دلیوں کو جگمگا رہی تھی۔ وہ قدیم باہنٹ مہ سے اکتائی ہوئی دنیا کو ور معاشی و معاشی حیثیت سے پسے ہوئے طبقتوں کو سماجی انصاف کی جنت کا راستہ دکھا رہی تھی اور اس کی گود میں انسانیت کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ تشکیل پانا تھا۔

مقابلے پر وہ جاہلیت تھی جس کے پاس کوئی حرکتِ تکبیر نشہ نہ تھا جو انتشار و نرج کا تحفظ کر رہی تھی، جو نفس پرستانہ معاشرہ بنا رہی تھی۔ جس نے مذہب کو ایک فنحوکہ بنا دیا تھا اور اس کی بنا پر متاس کار و بار چل رہے تھے۔ یہی قدیمی اخلاقی اقدار ہی اس کے ہاتھوں تباہ ہو رہی تھیں غرضیکہ وہ آزادی، امن، انصاف اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن رہی تھی۔ یہی اسی کمزوری کی وجہ سے وہ پسپا ہوتے ہوئے زچ ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے دلائل کے ترکش خالی ہو چکے تھے اس کے تشدد کے ہتھیار کند ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی سازشیں نا کام ہو رہی تھیں، اس کا انسان ذلیل سے ذلیل ہونا جا رہا تھا۔

جاہلیت کے فائدہ بین اعلیٰ نے اپنی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم وراپ کے رفقا، کوئلہ

سے نکال کر بڑا کاری دار کیا تھا۔ لیکن بہت جلد انہیں اندازہ ہو گیا کہ بیعت عقبہ کے ذریعے حضور کو انصار کا تعاون حاصل ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ اب مدینہ تخریبِ اسلامی کا ایک مضبوط مرکز بنے۔ وہاں ایک نظامِ حکومت نمودار ہو اور پھر مسلم معاشرہ ایک ایسی قوت بن کر سامنے آئے کہ جس کا راستہ روکنا ہرگز ممکن نہ رہے۔

پھر حضور نے مدینہ پہنچ کر مدینہ کے یہودیوں اور دوسرے قبائل سے سیاسی معاہدات استوار کر لیے تو قریش کے لیے خطرہ واضح تر ہو گیا۔ اس کے بعد فوراً ہی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دفاعی قوت کی تنظیم کا آغاز کیا اور ریاستِ مدینہ کی سرحدات کی نگرانی اور ملحقہ علاقوں میں دشمن کی نقل و حرکت کی دیکھ بھال کے لیے طلایہ گردی کے طور پر مہمات بھیجا شروع کیں تو قریش کے سامنے بہت سارے نئے خوف ناک امکانات آ گئے۔ ان کی شام کو جانے والی تجارتی شاہ راہ مدینہ کے قریب سے ہو کر گزرتی تھی۔ اور اب سارے تجارتی نظام کے تباہ ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ بلکہ سعد بن معاذ کو جب حرم میں عمرہ کرنے سے ابو جہل نے روکا تو انہوں نے صاف صاف انتباہ دیا کہ ایسا کرو گے تو تمہاری تجارتی شاہ راہ کاٹ دی جائے گی۔ حضور اذان کے ساتھ جو پہلے بالکل ان کے پنجے میں جکڑے ہوئے تھے اب ان کی گرفت سے آزاد تھے۔ پہلے صرف داعی تھے، اور اب وہ اقتدار سے بھی بہرہ مند تھے۔ پہلے مظلوم تھے اور ہر ظلم پر صبر کرنا ان کا شیوہ تھا۔ مگر اب وہ ظلم کا ٹوڑ کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ قریش سچائی کی دعوت کی مخالفت کے مختلف مراحل طے کرتے ہوئے اب جس مقام تک آچکے تھے اس سے اگلا قدم لازمی طور پر معرکہ کارزار گرم ہونا ہی ہو سکتا تھا۔ تخریبِ اسلامی کے نقیبوں کو بدترین مظالم کا نشانہ بنانے اور حضور کے قتل کے منصوبے باندھنے کے بعد لازماً ان کے اندر ایک قاتلانہ اور خونخوارانہ ذہنیت پک چکی تھی۔ ادھر حضور نے دورِ نو کی تعمیر کے لیے جو تھوڑی سی پونجی مدینہ میں جمع کی تھی اور جس کے بل پر نئی ریاست کا سنگِ اساس رکھا جا چکا تھا اس کے تاراج ہو جانے کے معنی سارے کیے کرانے کام کے خاتمے کے تھے کجا کہ نظامِ حق پوری طرح برک و بار لائے۔ اس کی نشوونما اور حفاظت کے معاملے میں رفتارِ وقت کا لحاظ بڑا ضروری تھا۔ اگر ہر خطرے کو وقت پر محسوس نہ کیا جائے اور وقت پر اس کے انسداد کی تدبیریں نہ کی جائیں تو کسی قیادت کی اس سے بڑی کوتاہی کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جو اقدام جس بہترین وقت پر — بلکہ بہترین اول وقت پر — ہونا چاہیے، ٹھیک اسی وقت پر ہو۔ ورنہ برق رفتار زمانہ کبھی بھی رک تھم کر کسی کی راہ نہیں دیکھا کرتا۔ ہر دعوت و تخریب کو اپنا ہی آپ نہیں دیکھنا ہوتا۔ بلکہ اپنے آپ کو حریف طاقتوں کے

مقابل پر رک کر دیکھنا ہوتا ہے کہ کب کون کتنی آگے اور کون کتنی پیچھے جا رہی ہے۔ محسن انسانیت اور آپ کے ذہن رفقا کو خوب معلوم تھا کہ ہجرت کی فصل سے آگے کا باب لازماً جہاد کا باب ہے اور بنگا کی راہ قریش کی تلواروں کے درمیان سے ہو کر نکل رہی ہے۔ اس لیے مہاجرین کی بحالی اور مدینہ کے نئے توازن قوت کے قائم ہونے ہی حضور نے ایک ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے دنیا میں انتظامات کی طرف پوری توجہ صرف کی۔

## اسلامی نظریہ جہاد :

یہاں ہم اس اصولی حقیقت کو اجمالاً بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ جہاد کسی بھی ریاست کا ویسا ہی وضعی وظیفہ ہے جیسا کہ انداد جرائم کے لیے پولیس اور عدالت کا انتظام اس کا فصری عمل ہے۔ لیکن ایک لوخیز ریاست ایک نو تشکیل یافتہ معاشرہ اور اپنے زمانہ کی ابتدا کرنے والا ایک نظم تو وضعی طور پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ عین اپنی بقا اور نشوونما کے لیے ایک سنگین دور جہاد گزارے۔ خصوصیت سے جب کوئی جدید ہیئت اجتماعی کسی نقدی نظریے پر ٹھہری ہو تو اس کے مقابلے میں اس کا قدم انقلاب دشمن طاقتیں سمف بستہ ہو کے لگتی ہیں۔ ایسی انقلاب دشمن طاقتوں کے مقابلے میں محسن دفاع ہی کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کو نرس نرس کیے بغیر قطعاً ممکن ہی نہیں ہوتا کہ کوئی انقلاب اپنی موجودہ حدود اور معیار پر بھی قائم رہ سکے۔ سو اسلامی نظریہ جہاد یہیں تک نہیں جاتا کہ کوئی جہاد کرے تو چاروں اطراف اس کا سامنا کر لیا جائے بلکہ وہ یہ رہنمائی دیتا ہے کہ اسلامی انقلاب کے داعی ایک طرف اپنی ریاست کے موجودہ وجود کے ایک ایک ذرے کو بچا رکھنے کے لیے بوقت ضرورت جان و مال کی قربانیاں دینا دوسری طرف لاکھوں بندگان خدا کو خلع و جہالت، معاشی خسرت حالی اور خلافتی پستی سے نکالنے اور انقلاب کی تکمیل کرنے کے لیے انقلاب دشمن طاقتوں کی سرکوبی کریں۔ اس کے علاوہ کسی انقلابی نظریہ پر استوار ہونے والی ریاست کے لیے کوئی چارہ نہیں ہے۔

یہاں ہم ایک شبہ کا ازالہ کرنے کے لیے یہ ضروری وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ اصلاح و سیر کا کوئی بھی دائرہ کسی بھی دائرے میں کیجیے اس کے لیے کسی نہ کسی نوع سے قوت کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے جس طرح ماں باپ اپنے بچوں کی بہتری کے لیے اور حکومتیں باشندوں کی بہتری کے لیے دیں، نصیحت اور تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ قوت سے کام لیتی ہیں اسی طرح اصلاحی و تعمیری انقلابوں کے علمبردار بھی کسی نہ کسی حد تک قوت کے استعمال پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہنے کو کہا جاسکتا ہے کہ عرب کے جاہلی دور میں قبائلی نظام کی جو کچھ بھی شکل کار فرما تھی وہ

خدا نے توفیق دی تو ہم یہ بحث تفصیل سے کتاب کے اس حصے میں کریں گے جس میں حضور کے دور کی جنگی کارروائیوں کو تفصیل سے لیا جاتا ہے۔

اس موضوع پر ایک نہایت غلط بحث نہایت غلط ذہنیت کے ساتھ اہل مغرب کی طرف سے اٹھائی گئی۔ اور پھر خود نا آشنا مسلمانوں کا فرنگیت زدہ عنصر بھی پریشان خیالی میں مبتلا ہو گیا۔ معترضین نے ریاست مدینہ کی جنگی کارروائیوں کو یہ معنی پہنائے کہ گویا ایک مذہب کو تیسرا لوگوں پر ٹھونسنے کے لیے

عوام اس کے تحت جس بھی حالت پر پڑے تھے اسے بدلنے کا کسی کو استحقاق ہی کیا تھا؛ اصلاح و تعمیر کے لیے کوئی انقلاب اٹھانا اور پھر اس کی تکمیل چاہنا اور اس سلسلے میں قوت سے کام لینا سرے سے جائز ہی کیوں مانا جائے۔ اس اعتراض کو اگر کچھ بھی وقعت دی جائے تو پھر کسی باپ یا ماں کو آپ آخر یہ حق کس بنا پر دیں گے کہ وہ اپنی اولاد کے ذہن میں کسی خیال کو ٹھونسے، کوئی آداب اس پر مسلط کرے اور کسی اخلاقی شعور سے اسے جبراً آراستہ کرے آپ کسی حکومت کو یہ حق کس بنا پر دیں گے، کہ وہ شہریوں کو بعض اعمال سے روکے اور بعض کے کرنے پر قوت سے مجبور کرے؛ وہ جمالت، گندگی، بد اخلاقی کے خلاف اصلاحی تدابیر عمل میں لائے۔ اور جو قوت بھی ان تدابیر پر مزاحم ہو اس کی مزاحمت ختم کر دے؛ اصلاح و تعمیر کا کوئی کام کسی دائرے میں ممکن تصور نہیں ہے جس میں کوئی مزاحمت نہ ہو اور اس مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے قوت سے کام نہ لینا پڑے۔ آپ اگر مزاحم طاقتوں کو کھلی چھٹی دے دیتے ہیں تو سرے سے کسی اصلاح و تعمیر کا کام ممکن نہیں ہے۔ اصلاح و تعمیر کے ہر اقدام کے حق میں خود فطرت انسانی اپنی پوری طاقت سے موجود رہتی ہے۔ پس ایک قوم یا ملک کو اپنی سے نکال کر فلاح کی راہ پر ڈالنے کے لیے جب کوئی تعمیری انقلاب نمودار ہوتا ہے تو انسانی فطرت ہی اس کے حق میں سب سے بڑی دلیل بنتی ہے اور یہی دلیل رائے عام کو اس کے حق میں ہموار کرتی ہے۔ رہا یہ امر کہ فطرت انسانی کے داعیات چونکہ ابہام کے دھندلکے میں ہونے کی وجہ سے واضح نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ قطعی معیار کیا ہے جو بتائے کہ کوئی انقلاب تعمیری و اصلاحی ہے یا نہیں تو اس کے جواب میں محسن انسانیت کی دی ہوئی آئیڈیالوجی خدائی ہدایت کو ہمارے سامنے رکھتی ہے انسانوں کے خوشنما دعووں کو پرکھنے کی کسوٹی یہ ہے کہ خدا نے اپنے انبیاء کے ذریعے تعمیر و فلاح کے راستے کی نشان دہی کس طرف کی ہے۔ عرب کو زواج کی حالت سے منظم سلطنت کی بندی پر لانا قبائلی ٹکڑیوں کو جوڑ کر ایک سیاسی وحدت بنانا، لاکھوں باشندوں کو علم و اخلاق سے آراستہ کرنا اور انہیں امن و انصاف کا ایک نیا دور عطا کرنا ایک ایسا مقدس کارنامہ ہے کہ اگر اس کے لیے قوت کا استعمال روا نہیں تو پھر سرے سے انسانی تاریخ میں قوت کے استعمال کا کوئی بھی مقام باقی نہیں رہ جاتا۔

تلوار کو استعمال کیا گیا۔ حالانکہ معاملہ نرے ایک مذہب کا نہ تھا، ایک انقلابی تحریک کا تھا جس نے جان و مال کی بیش بہا قربانیوں کے بل پر انسانیت کی تعمیر نو کے کام کا آغاز کیا۔ تھا۔ اور مفاد پرست، انقلاب دشمن طاقتیں اس کی تکمیل سے پہلے ہی اسے ملیا میٹ کر دینا چاہتی تھیں۔ پھر معاملہ ایک ریاست کا تھا جس کی نیوڈائمن کے لیے اس کے معماروں نے تیرہ برس تک انتہائی مظالم سہنے کے بعد گھر بار سب لٹوا، ایسے تھے اور بالکل بے وطن اور تہی دست ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو ایک چھوٹے سے خطہ میں سمیٹ لیا تھا جہاں وہ اپنی پسند کے نظام زندگی کے سائے میں زندگیاں گزار سکیں اور جہاں سے وہ دنیا بھر کو سدا ہی یاد رکھ سکیں۔

یہ نیا تہذیبی باب جو تاریخ میں کھولا جا رہا تھا اس سے مدینہ کے ہودی اور منافق ایسے طرف اور مد کے فریش اور ان کے حمایتی قبائل دوسری طرف اور بعد ازاں کچھ دور میں بعض بڑے بڑے سپر رنی حکم ان تہذیبی اور سماجی تبدیلیوں سے قبل ہی غارت کر دینا چاہتے تھے اور ان کے مقصدوں کو اس کے موقع ہی دینا چاہتے تھے کہ وہ اس کے خلاف پر زندگی کی تقدیر کو منسخت کر سکیں۔ مذہب اور سماجی لوگوں کا ایک اہم جزو اور وہ بھی لفظ مذہب کے ناسمج شدہ تصور سے مختلف مفہوم کے ساتھ ضرور تھا۔ لیکن اس کے ساتھ بت سے دوسرے اہم اجزاء کو تحریک سے دور پھینکنا۔ چنانچہ دین کی ریاست کے مذہب کے محدود اثر سے میں غیر مسلم عناصر کو پوری عزت آزادی کی ضمانت فراہم کی۔ اور اس کے مذہب کے سیمے میں بدلتی تحریک اور دین اور سماجی ریاست کے تقاضوں کے تحت تلوار کو استعمال کیا۔ ان کے مسلہ پنی اس مقدس سیاسی ہیئت کے بقا اور نشوونما کا تھا جو سارے عرب اور سارا عالم اسلام سے جیسے باعث فلاح تھی۔ ان کا وسیع ترین دائرہ کشمکش سیاسی تھا، اور ان کے مقصد پرستانہ اور انقلابی بنیادوں پر سیاست کا رٹی کا ایک نیا ترین تجربہ شروع کر چکے تھے۔ جس کو فزائش و وجود اور بدوی قتل و غارتگریوں کا ناکام بنا دینے کے لیے مضطرب تھے۔ اس صورت عادت میں یہ لایعنی کوشش پیدا ہی کہاں ہوئی ہے کہ حضور اور آپ کے ساتھیوں نے تبلیغ کے لیے تلوار استعمال کی یا نہیں؟ یہ سوال ہی ایسے احمقانہ ہے کہ جنگی کارروائیاں دفاعی تھیں یا جارحانہ؟ — مگر ہمارے غیر میں مسلمانان کو مسلمان اپنی جانوں کو قبول کر لیا۔ اور ان کی ناپاک اور باڈہ روح استرہا کو تہذیب کے انہوں سے اپنے دامن تاریخ سے بڑھ کر خویش کچھ شرمناک وجہ دھونے کے لیے کاعارتی کھانا لہجوں دیے۔ اور اپنے اوپر سے سارا اعنما و شتم کر کے مستشرقین کے نظر باقی دربار میں بڑی لجا جت سے معذرت خواہی پر اتر آئے۔ انہوں نے اسلام کا نہایت غلط اور محدود تصور ذہنوں میں بٹھا لیا۔ اور کچھ لفظی جہاد کو باطل مسخ کر کے رکھ دیا

ان کے مغربی آئمہ تہذیب کا اپنا حال یہ ہے کہ ان کے مذہبی اکابر نے محض نفسانیت کے لیے اور ان کے تاجداروں نے فقط توسیع سلطنت کے لیے جو گھناؤنی جنگیں ماضی میں لڑی ہیں وہ ان کی دنیاۓ شعراء میں آج تک سرمایہ افتخار بنی ہوئی ہیں۔ مختلف ممالک کو غلام بنانے کے لیے جو ظالمانہ کارروائیاں کی گئی ہیں ان کے گیت ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ گائے گئے ہیں اور خود محکوم قوموں کے ذمہوں میں بسا دیتے گئے ہیں۔ ان کے بحری قزاقوں کے جرائم اگر نوآبادیاتی مہموں میں مفید بیٹھے گئے ہیں تو ان کو انہوں نے ہمیشہ کے لیے اپنا ہیرو بنا لیا ہے۔ لیکن اگر مدینہ کی اسلامی ریاست چو طرفہ خطروں میں گھرے ہوئے نظام نوکا تحفظ اور بعض جان لیوا اور خنامی قوتوں کا انسداد کرنے کے لیے، نیز وحدت، نظم، امن، سلامتی، عدل آزادی اور جمہوریت کی نعمتوں سے خود اپنے ہی ملک کو مالا مال کرنے کے لیے بالکل بے لوث جدوجہد کرتی ہے تو اس کے خلاف چارج شیٹ مرتب کرنے اور مقدمہ ثابت کرنے کے لیے مغرب کے بے شمار بہترین دماغ یکے بعد دیگرے اپنی کاوشیں کھپاتے چلے جاتے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ اب خود ان مدعیوں اور ان وکیلوں کے خلاف تاریخ کی عدالت میں علمی مقدمہ چلایا جائے اور ان کی دسیسہ کاریوں کا پول کھولنے کے لیے فرد قرار داد جرم مرتب کی جائے۔ ہماری یہ ملی ضرورت منتظر ہے کہ تاریخ و سیرت کے نوجوان طالب علم اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے آگے بڑھیں۔

ہمارا نظر یہ جہاد قطعاً اس محدود دفاعی تصور پر مبنی نہیں ہے جو عام طور پر ذہنوں میں رچا بسا ہوا ہے۔ البتہ وہ اس معنی میں دفاعی ہے کہ :-

اس کا مقصد قائم شدہ اسلامی ریاست اور اسلامی سماج کا تحفظ ہے۔

اس کا مقصد اس آئیڈیالوجی کا تحفظ ہے جس کی اساس پر نظام حق قائم ہوتا ہے۔

اس کا مقصد اس فعال تحریکی فوت کا انسداد ہے جو اسلامی انقلاب کے کیے ہوئے کام

کے لیے باعث حصر ہو اور جو اس کی تکمیل میں حائل ہونے والی ہے۔

اس کا مقصد ہر ایسے ظالمانہ اقتدار کے سلب و ازالہ اور انسانیت کی بھلائی کے راستے کا روڑا بن رہا ہو۔

کافی قمع کرنا ہے جو تہذیب کے سٹوارڈ اور انسانیت کی بھلائی کے راستے کا روڑا بن رہا ہو۔

قرآن کا فائدہ جنگ :

یہاں تفسیر سکتوں کا موقع نہیں، تاہم قرآن کی دو تین انتہائی ضروری آیات کو نگاہ میں رکھنا ضروری

ہے کہ کیا گیا ہے کہ :

”ان لوگوں کو تم لوگ انجانے کی اجازت دی جاتی ہے۔ جن کے خدات جنگ

چھیڑی جا رہی ہے — کیونکہ ان کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا ہے اور ان مظلوموں کے مخالفین کان کھول کر سن لیں کہ اللہ ان کی مدد کرنے کے لیے پوری پوری طاقت رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کسی جائز بنیاد کے بغیر محض اس بنا پر گھروں سے نکالے گئے ہیں کہ ان کی پکار یہ ہے کہ ”اللہ ہی ہمارا رب ہے“ اور اگر اللہ تعالیٰ (یوں اذن جنگ دے کر) کچھ لوگوں کو (جو بگاڑ کے علمبردار ہیں) کچھ دوسرے لوگوں کے ہاتھوں (جو اصلاح و تعمیر کے داعی ہیں) اقتدار سے برطرف نہ کر دے تو بدی کے زور پکڑ جانے کے باعث (درویشوں کے صومعے، نصاریٰ کے گرجے، یہودیوں کے معبد اور مسلمانوں کی مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا نام پکارا جاتا ہے، اُبڑ جائیں۔ اور اللہ تو انہی کی مدد کرے گا جو اللہ کے کام میں اپنا تعاون پیش کرتے ہیں۔ اور یقیناً ان کو مدد دینے کے لیے) اللہ پوری طاقت رکھتا ہے اور غالب و برتر ہے۔

یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دیں تو یہ زلفش پرستی، ورغالت میں پڑنے کے بجائے، نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور ناپسندیدہ برائیوں، ناانصافیوں اور کینہوں کے ساتھ تمام معاہدات جاری رکھیں گے۔ اختیار ہے۔

حج - ۲۵ تا ۳۱

خدا کی راہ میں وہاں کے ظالموں کی امانت اور تحفظ کے لیے، ان لوگوں سے جنگ کرنا جو ہمارے خلاف ہیں۔ بیڑی زیادتی نہ کرو۔ اللہ کو زیادتی کرنے والے لوگ پسند نہیں ہیں۔ دشمنوں کو جہاں بھی پڑیں کہ جہاں نہ چھوڑو اور جہاں سے تم کو انہوں نے نکال دیا تھا تم بھی ان کو نکالو۔ اور بیوند قائم رکھو۔ ان کی مزاحمت میں مزاحمت کا ہونا قتل سے زیادہ بڑی بُرائی ہے۔ ان کے خلاف مسجدِ حرم سے ماحول میں نہ لڑو، تا آنکہ وہ خود ہی (اس حرمت کا پاس ختم کر کے، تم سے لڑیں۔ پھر اگر

نہ تفسیری نکات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ لیکن تناظرہ کو دینا ضروری ہے کہ زیادتی سے روکنے کا وسیع معنی ہے ایک نو آدمی کے ساتھ کھن کو نہ پسیا جانے۔ یعنی جو غصہ یا غفلت پر امن ہو اس پر قوت آزمائیوں سے روکنے کے لیے جس کا وہاں اس حد سے زیادتی نہ کی جائے جتنی باطن ناکر ہو۔ اور تیسرے دوران جنگ میں عدم کے خلاف حدود کا پورا احترام کرنا ہے اور قانون جنگ کو چھوڑنا۔



وہ واقعی (حدود حرم میں) تم سے جنگ آزما ہوں تو تم بھی (کسی جھجک کے بغیر) ان سے جنگ کرو۔ ان کافروں (یعنی اسلامی انقلاب کے دشمنوں) کو اسی طرح کیفر کردار تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجاویں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور (ہاں) ان کے خلاف اس وقت تک جنگی کارروائی جاری رکھو کہ نظامِ حق کی راہ سے مزاحمتوں کا قلع قمع ہو جائے اور پورے کا پورا نظامِ حیات اللہ کی ہدایت کے تابع ہو جائے۔ پھر اگر وہ مزاحمت چھوڑ دیں تو ان پر — ماسوائے مجرمین کے — کوئی گرفت نہیں۔“ (بقرہ - ۱۹۰ تا ۱۹۳)

”تمہیں ہو کیا گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں — اور خصوصاً ان بے بس مردوں عورتوں اور بچوں کو ظلم سے بچانے کے لیے جنگ کرنے کو نہیں اٹھ رہے ہو، جن کا حال یہ ہے کہ وہ دعائیں کرتے ہیں کہ ”اے ہمارے رب! ہمیں اس ابستی سے نکال جہاں کے لوگ ظالم ہیں اور ہمارے لیے اپنی جناب سے کسی کو حمایتی بنا کے بھیج۔ اور اپنی جناب سے کسی کو ہمارا مددگار بنا کے اٹھا۔“ (نساء - ۷۵)

”پھر اگر وہ قول و قرار کرنے کے بعد اپنے پیمان توڑ دیں۔ اور تمہارے معاملات میں نشتر زنی کریں (اور یہ ثابت کر دیں کہ وہ شرانگیزی پر تلے ہوئے ہیں) تو تم ان مخالف اسلام طاقتوں کے سربراہ کاروں کے خلاف دھاوا بولو۔ ان کے لیے پیمان کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ شاید (تم ان کی خبر لو تو) یہ باز آجائیں۔ کیا تم ایسے ٹوٹے کے خلاف نہیں لڑو گے جنہوں نے عہد و پیمان توڑ ڈالے اور جنہوں نے (اسلامی تحریک کی جڑ اکھاڑنے کے لیے رسولؐ کو (مدینہ سے) نکال دینے کے منصوبے باندھے اور جنہوں نے تمہارے خلاف شرارت کرنے میں پہل کی ہے۔“ (توبہ - ۱۲)

”اگر تم (جہاد کے لیے) نہیں نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ اقتدار پر کسی اور گروہ کو لے آئے گا۔ جس کا تم بال بھی بیکانہ کر سکو گے

اور اللہ ہر اقدام پر قادر ہے۔“ (توبہ - ۱۳۹)

اسلام کے نظریہ جہاد اور حضور پاک کی اختیار کردہ جنگی پالیسی پر قرآن میں اور بہت سے اہم اور غور طلب مقامات ہیں لیکن ہم نے نہایت ہی واضح قسم کی وہ آیات لے لی ہیں جن سے اصولی باتیں اخذ ہو سکتی ہیں۔ ان آیات میں جو نکات ذہن نشین کرائے گئے ہیں وہ یہ ہیں :-

۱۔ یہ حیثیت مجموعی اسلامی جماعت سالہا سال سے مظلومی کے مقام پر چلی آرہی تھی اور حضور اور آپ کے ساتھیوں کو مکہ بدر کر کے اجتماعی ظلم کا آخری وار کیا جا چکا تھا۔ مقابل کی طاقت کا موقف شروع سے ظالمانہ تھا۔ کیونکہ وہ مسلم معاشرہ کو پینے نہیں دے رہی تھی۔ وہ یہ موقع نہیں دے رہی تھی کہ حق شناس لوگ اللہ کو اپنا رب بنا کے اس کی ہدایت کے تحت زندگیوں کی تشکیل کر سکیں۔ وہ عقیدہ ورائے، اظہار خیال، دعوت حق اور جماعتی تنظیم کی آزادیوں کو سلب کیے ہوئے تھے۔ اور اس نے کئی سال تک شان بربریت کے ساتھ شریف، پرامن اور صبر کیش مسلم انقلابیوں پر تشدد کے وار کیے تھے اور بالآخر ان کے لیے اپنے زادیوں میں سانس لینے کا موقع نہ ہی چھوڑا۔

۲۔ اسلام اپنے مخالفین کو زیادہ سے زیادہ حد تک بات کو سمجھنے اور تباہی قبول کرنے کا موقع تو دیتا ہے اور یہی موقع فراہم کرنے کے لیے وہ اپنے پیروں کو ایک دور صبر سے گزارتا ہے لیکن وہ اسے گوارا نہیں کر سکتا۔ کہ اس کے صبر کیش علمبردار مستقل طور پر مظلومی میں پڑ کر ظالموں کے کبر نفس کو نڈبنتے ہیں۔ اس کا منشا انسانی تمدن میں کچھ درندوں کو ہال رکھنے کے لیے سستے شکار فراہم کرنا ہے اور نہیں ہے۔ وہ اپنے صبر کیشوں کو تباہ ہی اس لیے کرتا ہے کہ وہ نظام طاقتوں کا استیصال کرے انسانیت پر فلاح کی راہیں کھول دس۔

۳۔ نظام اور تخریب پسند طاقتوں کا استیصال اس بن پر ایک نہایت ہی عمدہ تمدنی تدبیر ہے۔ اگر فاسد گروہوں کو بزور اقتدار سے ہٹا دیا جائے اور ان کو کام کرنے کی جھوٹ ہمیشہ کے لیے دیا جائے رہے تو خدا پرستی اور نیکی اور شرفیت کی ساری قدریں غارت ہو کے رہ جائیں۔

۴۔ اسلامی نظریہ انقلاب بوقت ضرورت قوت شمشیر کا استعمال کر کے اقتدار کو ایسے ہاتھوں سے سلب کر لینا چاہتا ہے جو انتشار، جمالت، بدی اور ظلم کے پشت پناہ ہوں اور ایسے ہاتھوں میں دنیا تو ہٹا دے جو خدا پرستی اور نماز و زکوٰۃ کے نظام کو قائم کریں جو نیکیوں کو فروغ دیں اور برائیوں کا سدباب کریں۔

۵۔ ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے خلاف ہیں، کا مطالبہ یہ نہیں ہے، کہ اگر کبھی مخالفین تمہارے اوپر چڑھائی کر دیں، تو تم کچھ ٹھوڑا بہت بچاؤ کر لیا کرو۔ یہاں اشارہ یہ ہے کہ ایک تو وہ لوگ ہیں جو مخالفت و مزاحمت میں فعال نہیں ہیں سو ان سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ لوگ جو تمہارے کام میں مزاحمت ڈالتے ہیں اور لڑ کر تمہیں اور تمہارے نظام کو ختم کر دینے کے درپے ہیں ان کے خلاف تو تلوار اٹھائے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ اسلامی ریاست پر ان کے حملہ آور ہو جانے ہی کا انتظار کیا جائے۔ ہندو جہاں کہیں بھی ہوں ان کی سرکوبی کی جائے۔ اس کی واضح دلیل بھی سامنے رکھ دینی گئی ہے

اور وہ یہ کہ قتل مقاتلہ فی نفسہ کوئی اچھا کام نہیں، لیکن دوسری طرف اسلامی تحریک اور اسلامی نظام کے خلاف فتنہ یا مزاحمت کی موجودگی کئی گناہ زیادہ برائی ہے جسے اگر پھیننے دیا جائے تو سرے سے وہ اسلام ہی کی جڑیں اکھاڑ پھینکے۔ اس لیے ناگزیر ہے کہ اس بڑی برائی سے بچنے کے لیے خنجر جہاد کو متحرک کیا جائے۔ اس وقت تک پوری قوت سے معرکہ آرائی کی جائے کہ راہِ حق کی مزاحمتوں کی سرکوبی ہو جائے اور پورے کے پورے دائرہ حیات میں خدا کا پورے کا پورا دین جاری ہو جائے۔

۶۔ جہاں یہ تاکید کی گئی کہ دینی شعائر کی حرمتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے وہاں اس غلط تصور تقویٰ سے مسلمانوں کو بچایا گیا کہ اگر مخالفین ان حرمتوں کو توڑ کر دراز دستی سے کام لیں تو تم چپ چاپ ذبح ہوتے رہو اور دم نہ مارا کرو کہ ہم تو حرم یا ماہِ حرام کا احترام کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ اگر کسی حرمت کو توڑیں تو انہیں بھرپور جواب دیا جائے۔

۷۔ مسلمانوں کا دینی و اخلاقی فرض صرف اپنا ہی بچاؤ نہیں قرار دیا گیا۔ بلکہ انسانیت کے کمزور طبقے اور بے بس عناصر اگر کسی علاقے یا ماحول یا نظام میں پس رہے ہوں اور وہ ظالم طاقتوں سے نجات پانے کے لیے تڑپ رہے ہوں تو اسلامی نظام کا فرض ہے کہ ان کی پکار پر لبیک کہے۔ یعنی اسلامی تحریک محمد بنی آدم کے لیے نجات دہندہ بنائی گئی ہے۔ اور اس کا حقیقی وسیع فریضہ تہذیب و دین کی اعلیٰ قدروں کا تحفظ ہے۔

۸۔ مزاحمتوں کو توڑنے کے لیے عہد و پیمان بھی ایک پُر امن ذریعہ ہے۔ اور اس ذریعہ سے رسول پاک نے پورا پورا کام لیا۔ لیکن عہد شکنی کرنے والوں کے بارے میں قرآن نے سخت تاکید کی کہ ان کا دماغ قوت سے درست کر دیا جائے۔ خصوصاً ایسے عناصر جو عہد توڑ کر اسلامی مرکز کو برباد کرنے، قائم نظام کو برطرف کرنے اور قائم شدہ نظم کو اجاڑ دینے کے لیے منصوبے باندھیں اور پھر شرانگیزی میں پہل کریں۔ وہ اگر اعلانِ جنگ نہ بھی کر چکے ہوں تو بھی ان کی ہر حرکت ایک اعلانِ جنگ ہے۔ ان کو پھیننے پھوننے نہیں دیا جاسکتا۔

۹۔ اسی سلسلے میں اس امر پر مسلم حکومت کو توجہ دلائی گئی کہ جنگی کارروائیوں کا اصل مقصود عوام کی جانیں لینا نہیں بلکہ آئٹھ کفر اور انقلاب دشمن قیادتوں کو کچلنا ہے۔

۱۰۔ جہاد کے فریضہ کی ادائیگی میں تغافل کرنے کے معنی یہ بتائے گئے ہیں کہ تمہاری یہ ریاست، تمہارا یہ اقتدار، تمہارا یہ نظام ختم ہو جائے گا۔ تم آگے نہیں بڑھو گے، تو مخالف قوتیں اُٹھ کے آئیں گی اور تمہیں مٹا کر بلکہ پوری طرح پامال کر کے اپنا سکہ چلائیں گی پھر تم ٹک ٹک دیکھا کرو گے اور دم نہ مار سکو گے

سوچ لو کہ ایسی صورت میں تم کتنے بڑے دردناک عذاب سے گزر دو گے۔

## تم نہیں یا ہم نہیں :

ان اشارات کی روشنی میں اسلامی نظریہ جہاد کو ذہن نشین کیے بغیر ہم ان معرکہ ہائے کارروائی کی نوعیت سمجھ ہی نہیں سکتے۔ جو اسلامی انقلاب کے علمبرداروں اور انقلاب دشمنوں کے درمیان واقع ہوئے سمجھنے کی بنیادی حقیقت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ عرب کے میدانِ تاریخ میں دو قوتیں مقابل ہو گئی تھیں۔ ایک فاسد اور ظالمانہ جاہلی نظام سے عوام کو نجات دلا کر امن و انصاف کا دور نو پیدا کرنا چاہتی تھی۔ دوسری فرسودہ جاہلی نظام کو جووں کا توں قائم رکھنے کے لیے اسلامی تحریک کو ملیا میٹ کرنے کے لیے بیڑی چوٹی کا نور لگا رہی تھی۔ دونوں کے نظریات و مقاصد میں کوئی سمجھوتہ ممکن نہ تھا، اور نہ بین دین کر کے فریقین کو ٹی سودا کر سکتے تھے۔ پوزیشن ”تم نہیں، یا ہم نہیں“ کی تھی۔ یا مشہور انگریزی محاورے کے مطابق یوں کہیے۔ کہ تم اسے پہلے مار لو، ورنہ وہ تم کو ختم کر دے گا۔ معاہدہ کی نوعیت وہ ہے جو ایک باغبان اور جنگل کے وحشی جانوروں کے درمیان اس وقت پیدا ہو جاتی ہے جب کہ کوئی پتھر پھینک کر زمین کو تیار کرے اس میں چمن بندی کرے لگے۔ وہ اگر جنگلی جانوروں سے تعرض نہیں کرتا تو ان کو کھانا نہ ملتا ہوتا ہے۔ اور باغ کو وہ بچاتا ہے تو جنگلی جانوروں سے بے سے ہر جان سبک دے دیتا ہے۔ تاریخ میں کوئی بھی جامع انقلاب ایسا نہیں آیا جس نے نہور پر ایسے ممبروں اور مخالفوں کے درمیان یہی فیصلہ کن صورت پیدا ہو گئی ہو۔ یہ حقیقت اگر ذہن نشین ہو جائے تو سرے سے یہاں کوئی بحث غیر ضروری ہو جاتی ہے کہ اسلامی جنگوں کی نوعیت دفاعی تھی، یا نہیں تھی، اس نامعلوم خطہ کے کارکن بھی بنا ہو جاتا ہے کہ توڑ کر اپنی بات منوانے کے لیے استغوں یا بیابان چہرے لہرائیں۔ رہتی کہ ایک ایک رٹاتی کو الٹ الٹ سے کر کے فوری اور وقتی سبب و عہدے کی پھپھیاں اڑا کر جاتے اور جہاد بوجہ کر تعلق کو غلط ثابت دینے والوں کو یقین دلا یا جاتے کہ مسلم حکومت کو یہ جہاد سے مدد لینے سے چارو نامیاد لڑنی پڑی اور اس کی نسل ذمہ داری دوسرے فریق پر تھی۔ اس جہاد کو دیکھتے ہیں کہ ہمارے بس فائنل پیش روں نے مختلف جنگوں اور خصوصاً اولیٰ میں مددگار بدستار ہوا۔ اس کا تجزیہ کرنے اور حقائق کا ایک خاص نقشہ تیار کرنے میں بری طرح دماغ سوزیوں کی چس و پیسہ لگاؤ ہے کہ ایسی ایسی بریبت نمٹا آرائیاں کیے والوں کو وہ سیدھی سی بنیادی حقیقت یوں نہ ہائے کہ انہیں ایک بار روٹھ کر دیکھے وہ معذرت خواہانہ نقطہ نظر سے نجات پا جاتے۔ سیرت پر ان کے انتہائی محنت سے کیے ہوئے قیمتی کارناموں میں ایسی جہاد سے کیا گویا یہ مناسب تو بس اہل مغرب کا ہے کہ وہ مسلمان

کہ حقیقت کیا تھی اور کیا نہ تھی اور ہم لوگ ان کے دربار میں اپنا صفائی کا بیان مرتب کر کے گھگھیا گھگھیا کے ایک ایک بات پیش کرتے پھر اس عدالت عالیہ کے چہرے کو پڑھا کریں کہ کیسا اثر مرتب ہو رہا ہے۔ ہم مجلس کی اس ترتیب کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ اپنے دین، اپنی تاریخ اور اپنے نبی کی سیرت کو سمجھنے سمجھانے والی سب سے بڑی افتخار ٹی ہم خود ہیں۔ اور ہمارا دین اور ہمارا رسول اپنے پاس سے ہیں فکر و نظر کے معیارات دیتا ہے۔ اولین مرتبے پر ہم خود اپنے معاملات کو جانچنے والے ہیں۔ مغرب کے لوگ ہوں یا شمال کے یا جنوب کے — یہ ان کا منصب نہیں کہ وہ ہم کو ہمارا دین اور ہماری تاریخ سکھائیں۔ ان کا مقام یہ ہے کہ وہ ہم سے معلوم کریں کہ ہمارے دین و تاریخ کی کونسی حقیقت کیا مفہوم رکھتی ہے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ اپنے ماضی کے کارناموں کا مفہوم ہم خود بیان کریں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے ہاں کی اصطلاحات کا مدعا سمجھائیں۔ ہمارا دین، ہماری تاریخ اور ہمارے نبی کی سیرت کو سرے سے وہ کسوٹیاں ہی قبول نہیں ہیں جو قدیم عیسائی کلیسا یا جدید مادہ پرستانہ تمدن نے وضع کی ہیں۔ ہم ان باطل کسوٹیوں پر اپنے سرمایہ ماضی کی جانچ کر کے دکھانے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔

### مدینہ کی جنگی کارروائیوں کی نوعیت :-

اس جملہ معترضہ کی روشنی میں یہ امر خوب اچھی طرح پیش نظر رکھیے کہ اسلامی زیاست کی جنگی کارروائیاں نہ تو دو سلطنتوں کی باہم آویزی کی نوعیت رکھتی ہیں۔ اور نہ وہ دو مذہبی فرقوں کے تضادم کی تعریف میں آتی ہیں۔ یہاں سکندر اور نپولین کی طرح دنیا کو فتح کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں تھا اور نہ بالینڈ فرانس اور انگلستان کی طرح آزاد اقوام کی آزادی سب کر کے نو آبادیات پیدا کرنے کا کوئی پروگرام تھا یہاں ایک ہی ملک اور ایک ہی نسب کے لوگوں کے درمیان کشمکش اس بات پر تھی، کہ ایک فریق تعمیر نو کے لیے بے لوث جانفشانیاں دکھا رہا تھا اور دوسرا اُسے ناکام بنانے بلکہ صفحہ ہستی سے محو کر دینے پر تیار تھا۔ تاریخ کے صالح ترین انقلاب کے خلاف قریش اور یہود اور بدوی قبائل ایک ردِ عمل جذبے میں بہک کر وہ گھٹیا حرکات۔ شرارتیں۔ سازشیں اور قاتلانہ تدبیریں پے در پے کر رہے تھے جن کو ہم اُد پر بیان کر آئے ہیں۔ برسوں کے معاندانہ اقدامات کے بعد اب اگلا قدم ان کے لیے رہ ہی گیا تھا کہ وہ اپنے خنجر غضب کو بالکل بے نیام کر کے کھلے میدان میں آجائیں اور بس چلے تو اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیں۔ چنانچہ آگے آگے قریش اٹھے اور پیچھے پیچھے دوسرے عناصر! — لیکن ان کا اپنا ہی قصہ پاک ہو گیا۔ ان جنگوں کی نوعیت — بلا تشبیہ تام — ویسی تھی جیسے

کہ روس میں انقلاب فروری سے انقلاب اکتوبر تک معرکہ آرائیاں ہوئیں یا انقلاب فرانس کے زیر عنوان شاہ پسندوں اور انقلابیوں میں آویزش ہوئی یا جیسے امریکہ میں سول وار ہوئی۔ مکہ اور مدینہ کی لڑائیاں بھی معنوی طور پر ایک طرح کی سول وار ہی تھیں۔ اس سول وار کی اولین بناٹے زل یہ تھی کہ محسن النساء صلی اللہ علیہ وسلم آباؤی نظام جاہلیت کی اندھی تقلید کو چھوڑ کر خدا کی ہدایت کے مطابق ایک روشن فکر اختیار کر رہے تھے۔ اور قریش ان کی آزادی ضمیر سے کام لینے کا حق نہیں دینا چاہتے تھے۔ جاہلیت کے پاس انور نے جبراً اشد سے کام لے کر نوجوانوں کی بیدار دل قوت کو عنقاہ و مساک کی آزادی سے محروم رکھنا چاہا۔ اور اس بیدار دل قوت نے اپنا فطری حق حاصل کرنے اور دوسروں کو اسی حق سے بہرہ مند کرنے کی کھانی۔

مدینہ کی ابتدائی ریاست کی وہ سالہ جنگی کارروائیوں کی یہ خاص نوعیت جانی نقصان کے عدد و شمار سامنے رکھنے سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ ماننا پڑتا ہے کہ حضور نے مکہ سے مکہ جو زمین کا اصول سامنے رکھا۔ اور ہمارے نامحدود قبیل جانی نقصان کے سامنے دس لاکھ مہاجر میں رفیقہ کی سعادت ازم کر دکھائی۔ مسیلم شہداء اور دشمن مقتولین کی کھنڈر جو تمہیل انقلاب کے لیے کام آتی وہ علی مرتضیٰ شہدے اور دوسرے تھے۔ کئی لاکھ عربوں کی فدا کی جا رہی تھی۔ کھونٹے کے لیے صرف ۱۰۰ ہلکے بچے ہیں۔ ان کو کھنڈر اور مسیلم شہداء کو کھنڈر کے کھنڈر کے طور پر منہ و منہ سے کھنڈر کو کھنڈر میں کھنڈر کے طور پر دیکھیں۔ یہ جنگیں گراہی تبلیغ کے لیے ہوتی ہوئیں تو نہ صرف یہ کہ بیسیوں درہم ہونے لگیں۔ بلکہ جفا کاریوں سے کام لیا گیا ہوتا۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ تعدد تو ایسا ایسا ہوا کہ موت کے لیے مسیلم اتار دی گئی ہوتی۔ گرفتاری نامنگوں کے ساتھ حضور ﷺ ہونے لگے۔ جس طرح ان کے جنگجوؤں کے دل کھول کر خونہ یزیاں کی ہیں اور تاریخ کے دامن کو زار کر دیا ہے۔ اس طرح اپنے بھی یہاں تار مار کے ذرے ذرے کو انسانی خون پلا دیا ہوتا۔ یہ گریو مخالف سلطنتوں کی آویزش ہوتی تو بھی جانی نقصان بہت زیادہ ہونا چاہیے تھا۔ اسی طرح اسیرن جنگ کی تعداد گرجہ ۶۵۶۴ تھی لیکن ان میں سے صرف دو قیدیوں کو ان کے ثابت شدہ جرائم کی بنا پر سزائے موت دی گئی۔ ۶۳۴۰ کو رہا کر دینا ثابت ہے۔ موقوفہ جہاد کے ساتھ اس بارے میں بڑا قفوض کر کے بتایا ہے کہ صرف ۲۱۵ قیدیوں کے بارے میں ابھی وضاحت نہیں ہو سکی شاید بعد کے لوگ ان کے متعلق بھی تحقیقات کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اغلب یہ ہے کہ یہ لوگ

اسلام قبول کر کے مسلم معاشرہ کا جز بن گئے ہوں گے۔ یہاں تو ایک نشوونما پاتے ہوئے نظام اور اپنی تکمیل کرتی ہوئی ریاست کو داخلی مزاحمت کا سامنا تھا۔ اور ایک ہی سر زمین کے قرابت دار باشندوں کے درمیان آویزش پیدا ہو گئی تھی۔ یہ بہت تھوڑی مدت میں تین چار بڑے بڑے معرکوں کے بعد بہت تھوڑے جانی نقصان پر فیصل ہو گئی کیونکہ درحقیقت اس کا فیصلہ رائے عام کے وسیع دائرہ میں ہو رہا تھا۔

غور کیا جاسکتا ہے کہ اگر سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ صحیح معنوں میں کوئی جنگجو شخصیت میدان میں آئی ہوتی تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے سپاہیوں کو بدر کے عرصہ پیکار میں یہ ہدایت دیتی کہ بنو ہاشم کو قتل نہ کرنا، کیونکہ وہ اپنی مرضی سے لڑنے نہیں آئے۔ چار و ناچار شامل ہیں۔ عباس بن عبدالمطلب اور ابوالبحرہ بن عتبہ کو نہ مارنا دسوا مؤخر الذکر مارا گیا، کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ بدر کے قیدیوں کی بے چینی سے متاثر ہو کر مدینہ کا فتح مند حاکم سکون سے سونہ سکے۔ اور شب میں جا کر ان کی بندشیں ڈھیلی کر آئے؟ کیا یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خوزیری کے لیے کوئی صاحب خنجر اٹھا ہوتا تو وہ عین حالت جنگ میں مکہ کی درخواست پر غلہ کی رُکی ہوئی رسد میاں سے جاری کر آتا۔ بلکہ پانچ سو اشرقیات قحط زدہ غرباء کے لیے اپنی جانب سے بھجواتا؟ اور پھر فتح مکہ کے دن جس شخص کا پھر برا آسمانوں میں اڑ رہا تھا وہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے کوئی اور ہوتا اور اس کا مشن نظام حق کے غلبہ کے علاوہ کوئی دوسرا ہوتا تو کیا وہ پندرہ بیس برس کے وحشیانہ مظالم کے زخموں کی بھاری تاریخ کو طاق عفو پر ڈال کر لاتثنویب علیکہ الیوم اذہبوا وانتم طلقاء! کا اعلان کر سکتا؟ جی نہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو مکہ کی گلیوں میں قریشی خون کے دریا بہ گئے ہوتے۔

دراصل حضور کو اگر چہ چار و ناچار میدان جنگ میں اترنا پڑا، کیونکہ شہادت گہر اُفت کے باہر باہر سے کوئی راہ نصب العین کی طرف جاتی نہ تھی، لیکن آپ زمین کے ٹکڑوں کے بجائے روحوں کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ آپ تلوار کے زور سے بدنوں کو مطیع بنانے کے بجائے دلیل سے دماغوں کو اور اخلاق سے دلوں کو مسخر کرنا چاہتے تھے۔ آپ کا اصل معرکہ رائے عام کے میدان میں تھا۔ اور اس میدان میں حریفوں نے زک پہ زک اٹھائی۔ اور تیزی سے بازمی ہرتے چلے گئے۔ جنگی کارروائی اس تصادم کا بہت چھوٹا جز ہے جو حضور کو انقلاب دشمنوں سے پیش آیا۔

**حضور کی جنگی پالیسی :**

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی پالیسی کا اساسی کلیہ یہ تھا کہ مخالف عنصر کا خون بہانے

کے بجائے اسے بے بس کر دیا جائے۔ تاآنکہ یا تو وہ تعاون کرے یا وہ مزاحمت چھوڑ دے۔ یہاں چھوڑنے کی حیثیت طیبہ کے ابواب کو جن محققین و مفکرین نے ہمارے سامنے بے نقاب کیا ہے ان میں ابن ہند و پاک کا ایک مایہ ناز فرزند ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ہے۔ موصوف سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی پالیسی کو یوں بیان کیا ہے :-

”اصل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن کو تباہ و نابود کرنے کی جگہ محصور کرنا پسند فرمایا۔ دوسری جگہ لکھا ہے کہ :-

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست قریش کو تباہ و نابود کرنے کے لئے تھی۔ مگر محفوف نے اسے اس لئے بے بس اور مغلوب کر دینے پر مشتمل تھی۔

اپنے اس نظریے کو حضور کی صحابہ کردہ تدبیر کی تفصیل دے کر اور سادہ انداز و الفاظ میں بیان کر کے فاضل محقق نے بڑی ثبوتی سے ثابت کیا ہے۔ اس پالیسی کے لیے حضور پاک نے عملی طور پر سب ذیل اختیار کیے :

اپنی دفاعی طاقت کو تعداد، تنظیم، جنگی تباہی اور اخلاقی تربیت کے لحاظ سے دوسروں سے نشوونما دی اور پھر اس کو مشین کی طرح نقل و حرکت میں لکھا اور مخالفین کو عملاً تباہ و نابود کا ہدف بنایا۔

مکہ والوں کی تجارتی شاہ راہ کی ناکہ بندی (Blockade) کر کے ان کا زور توڑ دیا۔ معاہداتی رابطوں کے ذریعے مختلف قبائل کو تدریجاً دشمن سے ٹوٹ کر اپنے ساتھ لایا گیا۔

فوجی کارروائی کے لیے کبھی سپانک کسی موقع پر دشمن کو تیاری کا موقع دینے بغیر تباہ کر دیا (مثلاً فتح مکہ)۔ کبھی غیر متوقع راستے اختیار کر کے اور نقل و حرکت کی منزل مقصود کو خفا میں رکھ کر مخالفین کی طاقت کو غلط فہمی میں ڈالا۔ (مثلاً غزوہ بنو مصطلق)۔ کبھی اپنا نقشہ جنگ پہلے سے پتے حق میں بنایا۔ (مثلاً معرکہ بدر)۔ اور کبھی کوئی ایسی نئی دفاعی تدبیر اختیار کر لی جس کا تجربہ دشمن کو نہ ہو۔ (مثلاً غزوہ خندق)۔ ریاست مدینہ کا پورا وہ سالہ نظام دفاع مذکورہ بالا اصولی پالیسی کا بہین ثبوت ہے۔ پھر جب ہم اس

سے عہد نبوی کے میدان ہائے جنگ۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی صفحہ ۴۴

سے عہد نبوی میں نظام حکمرانی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی صفحہ ۲۲۹۔



کے ساتھ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عالی ظرفانہ نقطہ نظر کو لیتے ہیں جو اپنے اندر کسی فاتح کے بچنے ایک مشنری کی سی روح رکھتا ہے اور ایک جنگجو کے سے جذبہ غیظ و غضب کے بجائے ایک معلم کی سی ہمدردی و خیر خواہی کے گہرے احساس کا ترجمان ہے تو وہ تمام معترضانہ نکتہ آرائیاں عبث قرار پاتی ہیں جو کرنے والوں نے کیں اور پھر ہم ان کی صفائی دینے کے لیے نقشہ واقعات ہی کو مسخ کرنے بیٹھ گئے حضور پاک کے سینے میں انسانیت کے لیے جو ہمدردانہ جذبہ اصلاح کار فرما تھا اسے عیاں کرنے کے لیے ہم چند موقعوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مکہ میں جب مظالم کا دور شدت اختیار کر گیا اور قریش کے آفتابِ غضب میں بڑی تمازت آگئی تو اس وقت تشدد کے محاذ پر دو سرگرم ترین افراد حضور کے سامنے تھے۔ ایک ابو جہل، دوسرے ابن الخطاب ایسے کٹر دشمنوں کے بارے میں کسی دنیوی سیاست کار کا ذہن سخت عناد میں پڑے بغیر نہ رہتا۔ اور وہ دل سے ان کی ہلاکت کا خواہاں ہوتا۔ لیکن تشدد کی گرم بھٹی میں اذیت پر اذیت برداشت کرتے ہوئے حضور بہ الحاح یہ دعا کرتے ہیں کہ خدا ان دونوں میں سے کم سے کم کسی ایک کو اسلامی محاذ پر لے آئے۔ یہ دعا گواہی دیتی ہے کہ انسانیت کا معیار اپنے مخالفوں کی ہلاکت پر ان کی اصلاح کو ترجیح دیتا تھا۔ اور آخر دم تک ان سے اچھی امیدیں رکھتا تھا۔ اور یہ دعا حضرت عمرؓ کے اسلام لانے سے پوری ہوئی۔

دوسرا موقع طائف کے باشندوں کے ہاتھوں ان کی خیر خواہی کے جرم میں زخمی ہونے کا ہے۔ دنیوی سیاست کے کسی علمبردار سے اس موقع پر آپ اس کے علاوہ کچھ توقع نہیں کر سکتے کہ اس کے دل کے دروازے ان لوگوں کے لیے ہمیشہ کو بند ہو جائیں اور اس کا بس چلتا تو وہ اسی وقت پوری بستی کو الٹ دیتا ورنہ یہ زخم اس کے کلیجے میں عمر بھر ہرا رہتا۔ اور جب بھی اسے قوت حاصل کرنے کے بعد پہلا موقع ملتا تو وہ ایسے ناہنجار شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا۔ حضور کے ساتھی کا کلیجہ طائف کی اس ظالمانہ کارروائی سے جب شق ہوتا ہے تو وہ فی الواقع اسی ہنج پر سوچتا ہے اور عرض کر تے ہیں کہ ان لوگوں کے لیے بد دعا کیجیے۔ بلکہ جبرئیلؑ بھی جذبہ پہنایا کے امتحان کے لیے یہ پیش کش کر دیتا ہے کہ اشارہ ہو تو کوہستانوں کا فرشتہ مکہ اور طائف کو پہاڑوں کے درمیان پیس کے رکھ دے۔ مگر حضور کہتے ہیں کہ نہیں۔ یہ لوگ نادانی کی وجہ سے غلط روش پر چل رہے ہیں۔ یہ اگر نہیں مانتے تو ان کی اولادیں سچائی کا پیغام قبول کر کے خدا سے واحد کی پرستار بنیں گی۔

تیسرا موقع وہ ہے جب کہ میدانِ احد میں مسلمانوں کو بعض کوتاہیوں کی وجہ سے خدا کی طرف سے انتہائی ہزیمت میں ڈالا گیا تھا۔ اور خود حضور کو شدید قسم کے زخم آئے تھے۔ یہ وقت ایسا تھا کہ

انتہائی تلخ جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ ان حالات سے بظاہر بجا طور پر متاثر ہونے والے بعض ساتھیوں نے عرض کیا کہ آپ ان مشرکوں کے لیے خدا سے بددعا کریں کہ ان پر لعنت برسے۔ آپ نے جواب دیا کہ مجھے لعنت برسانے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ بلکہ ایک پیغام پہنچانے اور رحمت کا مترادف سنانے پر مامور ہوں۔ یہ کہہ کر میدان جنگ میں حملہ کر کے سخت نقصان پہنچانے والے دشمنوں کے لیے دُعا یوں فرمائی کہ :- "اے اللہ! میری قوم کے لوگوں کو ہدایت دے۔ کیونکہ وہ اصل حقیقت کو جانتے نہیں ہیں۔" یعنی قریش کی تلواروں کے زخم کھا کر بھی یہ جذبہ نہیں اٹھتا کہ ان کو تہمتیں نہس بوجانا چاہیے۔ بلکہ حالت جنگ میں بھی یہی آرزو اور امید ہے کہ وہ ہدایت پا جائیں۔

غزوہ خیبر کی مہم کے دوران میں قلعہ قموص کو فتح کرنے کے لیے حضرت علیؑ کو سردارِ عالم نے علمِ خاص عنایت فرماتے ہوئے تاکید کی کہ :-  
اے علیؑ! اگر تمہارے ذریعے سے ایک شخص کو بھی ہدایت ہو گئی تو یہ تمہارے لیے سب سے بڑی نعمت ہوگی۔"

یعنی اصل مطلوب دشمن کا جانی نقصان اور خونریزی نہیں ہے بلکہ فوقیت اس بات کو ہے کہ زیادہ سے زیادہ افراد کے دل و دماغ میں تبدیلی واقع ہو۔ اور وہ نظام نو کو قبول کریں۔ یہ چند نمایاں مواقع ہم نے محض بطور نمونہ لے لیے ہیں۔ درنہ ایسے شواہد کی کمی نہیں جی سے حضورؐ کا بنیادی نقطہ نظر سامنے آجاتا ہے۔ جنگجوئی اور خونریزی کرنے والے لوگ مغضوب، غضب اور جلد باز ہوتے ہیں۔ بخلاف اس کے ہم انسانیت کے محسن کو ٹھنڈے عزم و رعبے جوصلے سے آراستہ پاتے ہیں۔ اور آپ کی سیاست میں قوت کے استعمال کے بجائے حکمت و زیر کی کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔ سیاسی حکمت و زیر کی کا اس سے بڑا معجزانہ ثبوت اور کیا ہوگا کہ حضورؐ مدینہ میں جاتے ہی مختلف عناصر کو گفت و شنید سے جوڑ جاڑ کر اسلامی سلطنت کی اساس رکھ دیتے ہیں۔ کسی انقلابی نظریے پر بغیر ایک قطرہ خون بہائے نظام ریاست کو یوں استوار کر دینے کی مثال شاید ساری تاریخ میں نہ مل سکے۔ صحیح معنوں میں غیر خونی (Bloodless) انقلاب ہمیں یہی ایک ملنا ہے جس کی بنیادوں میں انسانی خون کا ایک قطرہ نہ گرا اور جس کی نیو کے پتھروں میں کسی ایک فرزندِ آدم کا لاشہ شامل نہیں ہے۔ یہ محیر العقول واقعہ خود مزاج نبوت کی مخصوص شان کا ترجمان ہے۔

یہ بھی نہ بھولیے کہ واقعاتی تاریخ خود گواہ ہے کہ اسلامی ریاست کی ساری جنگی کارروائیاں تیش اور ان یہودی قبائل کے خلاف ہوتی ہیں، جنہوں نے اسے مجبور کر کے میدان جنگ کی طرف کھینچا ہے۔

بقیہ سارا عرب اپنی معمول کی زندگی میں سرگرم رہا۔ تھوڑے سے علاقے کو چھوڑ کر باقی ماندہ خطے میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ بلکہ عرب کی عام آبادی دونوں طاقتوں کے مقاصد، کردار اور سیاسی قوت کا خاموشی سے جائزہ لیتی رہی اور جب مسلم طاقت نے اپنی فوقیت ہر پہلو سے ثابت کر دی، تو مختلف علاقوں اور قبیلوں کے نمائندہ وفد نے آگے بڑھ کر اسلام کو لبیک کہی۔ یہ امر کسی بھی تحقیق پسند کی توجہ کھینچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تمام بڑی بڑی لڑائیاں، بدر، احد، احزاب دشمن نے بہ حیثیت حملہ آور مدینہ کے گرد پیش میں خود آ کر لڑی ہیں۔ اور حضور کو مجبور کر دیا ہے کہ اس سلسلے کا خاتمہ کرنے کے لیے دشمن کے مراکز قوت کو زیر نگین کریں۔ چنانچہ قریش اور ان کے حمایتیوں کا زور توڑنے کے لیے مدینہ کی طرف سے ایک ہی بار فیصلہ کن اقدام ہوا۔ اور فتح مکہ کے بعد حنین اور طائف کے معرکوں نے حریف کی قوت ختم کر دی۔ دوسری طرف کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ یہود کے اڈے اکھیر دیے گئے۔

### ایک وسیع غلط فہمی :

غزوات و سرایا کی جو لمبی فہرست حدیث، سیرت اور مغازی کی کتابوں میں ملتی ہے اس کی وجہ سے اغیار تو اغیار، خود مسلمانان کرام بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا ہوتے رہے ہیں۔ حالانکہ غزوہ اور سر یہ کتب امدایت و مغازی کی خاص اصطلاحات ہیں۔ اور ان کا اپنا اپنا منہیں مفہوم ہے۔ فوجی اور دفاعی اقدام، دیدہ بانی یا طلبہ گردی اور باغیوں یا مجرموں کی سرکوبی یا تعلیم اور دعوت عام دینے یا معاہدہ باندھنے وغیرہ مختلف ضروریات کے تحت جب کبھی کوئی دستہ (خواہ وہ دو ہی نفوس پر مشتمل ہو) بھیجا گیا ہے تو اسے سر یہ کا عنوان دیا گیا ہے۔ اور جس دستہ کے ساتھ حضور خود بہ نفس نفیس نکلے ہیں وہ غزوہ کہلایا ہے ضروری نہیں کہ واقعی کوئی تصادم یا کسی اور طرح کی کارروائی عملاً واقعہ بھی ہوئی ہو۔ علاوہ ازیں اگر کچھ مسلم افراد کو اتفاقاً کسی تصادم یا سرحدی جھڑپ سے دوچار ہونا پڑا ہو تو ایسے واقعات کو بھی سرایا کے زیر عنوان درج کیا گیا ہے۔ اس طرح کے تمام واقعات کو اگر چھانٹ دیا جائے تو صحیح معنوں میں جنگی معرکے صرف چند رہ جاتے ہیں۔ یعنی بدر، احد، احزاب، خیبر، مکہ (مع حنین)۔ واضح رہے کہ تبوک اور لمحہ علاقوں کو جیش عسرت کی ترسیل شام کی غیر ملکی حکومت کی طرف سے اندیشہ جنگ ہونے پر کی گئی تھی۔ اور اس کی نوعیت مختلف ہے۔ ہم اجمالاً ان جنگی کارروائیوں پر ایک نگاہ ڈالیں گے۔

سب سے پہلے توجہ اس سوال پر جاتی ہے کہ آویزش کا آغاز کیسے ہوا؟ اس کا جواب دینے

کے لیے ہم فریقین کی یوزلین کا جائزہ لیتے ہیں۔

## قریش کی جارحانہ ذہنیت :

قریش کی پوزیشن اس واقعہ سے از خود متعین ہو جاتی ہے کہ انہوں نے جب حضورؐ کے قتل کی اجتماعی سازش باندھی تھی تو اس میں مکہ کی قیادت نے بحث کرتے ہوئے اپنا ذہن کھول کر رکھ دیا تھا۔ ایک تجویز آئی تھی کہ سچائی کے اس داعی کو آہنی زندان میں بند کر دیا جائے اور اس کا دروازہ مقفل رکھا جائے۔ یہاں تک کہ وہ گھل گھل کر ختم ہو جائے۔ ایک شیخ نجدی نے اس پر کہا تھا کہ ”اگر تم ہا سے قید کرو گے تو اس کی دعوت آہنی زندان کے بند دروازوں سے بھی نکل نکل کر پھیلے گی اور اس کے ساتھیوں تک اس کے اثرات پہنچیں گے بلکہ بعید نہیں کہ یہ لوگ اسے نکال کے لے جائیں۔ پھر تمہارے مقابلے میں وہ بلحاظ تعداد بڑھ جائیں اور آخر کار اس جدوجہد میں تم کو زک دے دیں۔ دوسری تجویز یہ بھی آئی تھی کہ تم اس شخص کو اپنے درمیان سے الگ کر دیں اور اپنے وطن سے خارج کر دیں۔ پھر جب وہ ہمارے ہاں سے نکال دیا گیا ہو تو پھر ہمیں کیا کاوش کہ وہ کدھر گیا اور کہاں ٹکا۔ بس وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو جائے اور ہم اس سے نجات پا کر اپنے معاملات کو ٹھیک بٹھاک کر لیں اور باہمی الفت کو حسب سابق بحال کر لیں۔ نہایت عمدہ دے ہے جو اس تجویز کو مسترد کرنے کے لیے شیخ نجدی نے کیا اور جسے مجلس نے قبول کر دیا۔ مدحتہ ہو :

”نہیں، خدا کی قسم! تمہارے لیے یہ صورت مناسب نہیں۔ کیا تم اس کی خوبی گفتار اس کی شیرینی کلام کو نہیں دیکھتے کہ جس کے ہاں پر لوگوں کے دلوں پر وہ اپنا اثر بٹھاتا ہے۔ خدا کی قسم! اگر تم نے ایسا کیا تو پھر تم اس صورت میں اپنا کوئی بچاؤ نہیں کر سکتے کہ وہ عرب کے کسی قبیلے کے پاس پہنچے اور اپنے کلام و گفتار سے لوگوں پر اپنا اثر بٹھالے اور وہ اس کے پیچھے لگ جائیں۔ پھر وہ انہیں لے کر تم پر چڑھائی کر دے اور تمہاری بستیوں میں آگے اور تمہارے ہاتھوں سے تمہارا اقتدار چھین کر تمہارے ساتھ جو سلوک چاہے روا رکھے۔ پس کوئی اور تدبیر نکالو۔“

شیخ نجدی کے یہ الفاظ پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کم بخت کتنا زیک اور معاملہ فہم تھا اس نے محسن انسانیت کی شخصیت کو پڑھنے میں ذرا بھی سہو نہیں کیا۔ اسی کے ساتھ اس ساری بحث سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مکہ کے کارپرداز تیرہ برس کے تجربہ کی روشنی میں حضورؐ کے وجود اور

پیغام اور حسن کردار کو اب ایک مستقل سیاسی خطرہ اور ایک مہلک خطرہ سمجھتے تھے۔ اب ان کو یہ صورت بھی گوارا نہ تھی کہ انسانیت کا یہ محسن زمین کے کسی بھی گوشے میں زندہ رہ سکے اور کہیں بھی بیٹھ کر اپنے مشن کو چلا سکے۔ ورنہ وہ جانتے تھے کہ جو مظالم انہوں نے ڈھائے ہیں اور مسلم نوجوانوں کو ان کے گھروں سے نکال کر جو جرم کیا ہے اس کا حساب ایک دن انہیں دینا پڑے گا۔ پھر ان کا حضور کے قتل پر متفق ہو جانا اور آپ کے بچ کر نکل جانے پر قابو پانے کے لیے دوڑ دھوپ کرنا اور بھاری انعام مقرر کرنا اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ اگر بس چلے تو وہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی کی سانس لینے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے اب حضور کا عین وجود ان کے لیے خطرہ اور آپ کی زندگی ہی ان کے لیے چیلنج تھی قریش کی اس ذہنیت سے کوئی وجہ نہیں کہ محسن انسانیت کو فوراً اطلاع نہ مل گئی ہو۔

ذرا اس موقع سے بھی پیچھے چلے جائیے۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر حضرت عباس نے انصار کو انتباہ دیا تھا کہ جس مقصد کے لیے حضور کو دعوت دے رہے ہو اگر اسے نبھا سکو اور ان کی جو مخالفت کی جائے گی اس کا مقابلہ کر سکو تو پھر تمہارا وہ بھاری ذمہ داری اٹھانا درست ہو تم نے اٹھائی ہے پھر حضور کا بیعت کے مضمون میں یہ افتتاحی کلمات شامل کرنا کہ جس طرح تم اپنے ان وعیال کی مدافعت کرتے ہو، اسی طرح میری مدافعت کرو گے۔ پھر انصار کا یہ جواب دینا کہ اطمینان رکھیے۔ ہم جنگجو لوگ ہیں اور یہ سوال اٹھانا کہ آپ کی خاطر ہمارے بہت سے معاہدانہ رابطے ٹوٹ جائیں گے تو ایسا تو نہ ہو کہ ہم سب کچھ بھگتیں اور آپ پھر اپنے خاندانی لوگوں میں لوٹ آئیں۔ اور ہمیں چھوڑ دیں۔ اس پر حضور کا یقین دلانا کہ "انا منکم وانتم منی"۔ پھر عباس بن عبادہ انصاری کا اپنے ساتھیوں کو تاکیداً انتباہ دینا کہ تم لوگ انسانوں کے متعدد سرخ و سیاہ گروہوں سے جنگ مول لے رہے ہو پھر ایسا نہ ہو کہ جب تم بالوں کی تباہی اور اپنے سرداران قوم کے قتل کے حادثوں سے دوچار ہو تو پھر حضور کو دشمنوں کے حوالے کر دو۔ یہ سب کچھ اسی لمحے سوچ لو۔"

ان گفتگوؤں کے معنی یہ ہیں کہ قریش کی طرف سے ماحول کے قرطاس پر مستقبل کا اعلان جنگ ایسے جلی الفاظ میں لکھا ہوا موجود تھا کہ حضور اور حضرت عباس ہی نہیں اسے دور دراز سے آنے والے انصار نے بھی پڑھ لیا تھا۔

پھر اس مجلس بیعت کی روداد کسی شیطان نے چھپ کر سنی اور قریش کو آگاہ کر دیا تو اکابر نے انصار کی قیام گاہوں پر جا کر لوگوں کو بات چیت کی کہ "ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم ہمارے اس شخص یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ہو اور اس کو ہمارے درمیان سے نکال لے جانا چاہتے ہو اور تم نے اس

کے ہاتھوں پر ہمارے خلاف جنگ کرنے کا معاہدہ باندھا ہے حالانکہ ہمیں عرب کے کسی بھی قبیلے اور اپنے درمیان جنگ چھڑانے سے زیادہ ناپسند ہے کہ تمہارے ساتھ ہماری لڑائی ٹھن جائے۔ یعنی انصار اگر حضور کو مکہ سے نکال لے جائیں اور ان کو اپنی حفاظت میں رکھیں تو مکہ سے اعلان جنگ کے معنی میں لے گا۔ اور اس صورت میں قیادت تریبش کی جانب سے گویا واضح طور پر پیشگی اعلان جنگ سنا دیا گیا، لیکن کچھ لوگ تو اس قصے سے ناواقف تھے۔ اور جو جانتے تھے انہوں نے رازداری سے کام لیا۔

پھر جب انصار کے اصحاب بیعت مکہ سے نکل گئے۔ تو بعد میں معاہدہ پر بحث و تخیل ہونے اور مشورہ کر کے لعاقب کیا گیا۔ مدنی قافلہ بچ بھاگ کر نکلا گیا۔ بعد مکہ سے سعد بن ابی ہریرہ اور منذر بن عمرو کو پکڑ لے گئے اور ان کو مارا پٹا۔ یہ واقعہ بھی قیامت کا ہے کہ حضور کو مکہ سے بچ کر نکلنا بہت مشکل تھا۔ گو کتنا ناپسند تھا اور انہیں حضور کو اپنی حفاظت میں ہی سے ہٹا کر نکلنے والوں پر کتنا عداوت تھا۔ عداوت انہیں مہاجرین جہنہ کو واپس لانے اور مہاجرین کو ہٹانے سے مہاجرین کو ہٹانے اور مہاجرین کی طرف سے ہونے والے بھی تھے۔ انہوں نے گورنر کو لکھا کہ کسی روز تیری سرزمین میں اسلامی تحریک جڑ پکڑ سکے۔ ایسے ہر مکان کا عداوت سزا بے شک ہے۔ بیٹھے تھے۔

ان سارے واقعاتی شواہد سے یہ بالکل واضح ہے کہ تہذیب سے قبل ہی تہذیب کی طرف سے کسی بھی ایسی طاقت کے لیے جنگی چیلنج فضا میں موجود تھا جو مسلمانوں کو اپنے ہار و جھکاؤ سے بچانے اور تحریک کے پودے کی جڑ اپنی سرزمین میں لگنے دے۔ اسلامی انقلاب کے عمبردار ان کے ساتھ تھے اور خوش فہم نہ تھے کہ وہ اس چیلنج سے صرف نظر کر سکتے۔

آخر ماحول کے قرطاس پر لکھا ہوا یہ اعلان جنگ اس سازشی غلطی کی شکل میں واضح طور پر سامنے آ گیا جو مکہ سے عذاران مدینہ کے سرخیل عبداللہ بن ابی کویوسول ہو۔ جس میں ان کے ساتھ انصار بھی تھے۔ یہ دھمکی مرقوم تھی کہ یا تو تم از خود ہی صلہ اللہ علیہ وسلم کو اپنے ہار و جھکاؤ سے بچاؤ یا پھر ہم چڑھائی کریں گے اور تمہیں قتل کرنے تمہاری عورتوں کو مار ڈالنے کا حکم دے دیں گے۔ پھر یہودیوں سے ساز باز کر کے قریش نے براہ راست مسلمانوں کو پیغام بھجوایا کہ تم لوگ اس پر مغرور نہ ہو جاؤ کہ مکہ سے صحیح سادست نکل گئے۔ ہم مدینہ پہنچ کر تمہاری خیر نہیں گے۔

اسی زمانے میں سعد بن معاذ کو ابو جہل نے طواف کعبہ سے روکا اور صاف صاف کہہ دیا

کہ مجھے یہ گوارا نہیں کہ تم لوگ کعبہ میں قدم رکھ سکو۔

پھر اس دوران میں مکہ سے برابر شرارت اور غارت گری کے لیے چھوٹی چھوٹی فوجی ٹوئیاں نکلنے لگیں۔ حضور ان اقدامات کی اطلاع ملتے ہی جو اباً طلا یہ گرد دستے بھیجتے۔ متعدد بار مدینہ کے دستوں نے مکہ کی ان ٹوئیوں کو دیکھا جو مسلم طاقت کو چوکس پا کر بلٹ جاتی رہیں۔ ہجرت کے تیرھویں ہی مہینے کا یہ واقعہ انتہائی چونکا دینے والا تھا کہ کرز بن جابر فری نے ڈاکہ زنی کی اور مدینہ کی چراگاہ سے حضور کے مولیٰ، سرکاری اونٹ اور دوسرے لوگوں کے جانور ہنکالے گیا۔ اس واردات کا واضح مدعا یہ تھا کہ ہم تین سو میل سے آ کر تمہارے حدود میں سے یوں تمہاری دولت پر ہاتھ صاف کر سکتے ہیں۔ حضور یہ نفس نفیس ایک مختصر دستہ لے کر تعاقب کو نکلے اور مدینہ میں زید بن حارثہ کو قائم مقامی کا منصب سونپا۔ وادی صفوان (متصل بہ بدر) تک گئے لیکن کرز دسترس سے نکل گیا تھا۔ یہ دشمن کی ایک ایسی جسارت تھی کہ جسے کوئی بھی ایسی ریاست برداشت نہیں کر سکتی جس کے کارپرداز حمیت و شجاعت سے مالا مال ہوں اور ان کو اپنی آزادی اور اپنی سرزمین کی حرمت کا پاس ہو۔ یہ ڈاکہ زنی سیاسی لحاظ سے حملہ کے مترادف تھی۔ اب ایک دور کارزار اور ایک خون آلود مستقبل مدینہ کے سامنے تھا۔

مکہ کا مدینہ پر حملہ آور ہونا ۲۳ھ تک اگر ٹوخر ہوا تو اس کی ایک بڑی اہم وجہ تھی۔ کوئی رکاوٹ اگر حائل نہ ہوتی تو شاید قریش کی تلوار اس سے بہت قبل برہنہ ہو جاتی اور وہ مدینہ کے نئے اسلامی مرکز کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ دیتی۔ مکہ اور مدینہ کے درمیان بنو کنانہ کا علاقہ حائل تھا۔ جن سے قریش کی دیرینہ خصامت تھی۔ اندیشہ تھا کہ بنو کنانہ ادل تو قریش قوم کو اپنے علاقہ سے گزرنے نہ دیں گے۔ اور ایسا ہو بھی تو دوسرا خطرہ یہ تھا کہ بنو کنانہ مکہ کو خالی دیکھ کر حملہ نہ کر دیں۔ یا کم سے کم قریشی فوج کا مکہ سے رابطہ کسی نازک موقع پر کاٹ نہ دیں۔ سراقہ بن مالک مدلجی کنانی اس درمیانی علاقہ کا سردار تھا۔ اسے جب اطلاع ہوئی کہ قریش ایسے ایسے اندیشوں کی وجہ سے اقدام نہیں کر رہے تو اس نے خود مکہ جا کر قریش کو تعاون کا یقین دلایا۔ اس گٹھ جوڑ کے معنی جنگ بدر تھے۔

اس تصریح سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ قریش کو مسلمانوں کی طرف سے نہ کسی اقدام کا انتظار تھا اور نہ

۱۔ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۳۸۔ ۱۔ صحیح السیر۔ مولانا عبدالرؤف صفحہ ۱۲۵۔ رحمة للعالمین قاضی سلمان منصور پوری

وہ جنگی کارروائی کے لیے کسی چھترے کی تلاش میں تھے۔ ان کے اندر جارحیت کی روح پوری آتشیں  
شان سے کام کر رہی تھی یہ

مدینہ کا دفاعی نظام :-

اب آئیے دوسرے فریق کو بھیجئے :

جب ہم محسن انسانیت اور آپ کی انقلابی جماعت کے حالات کا گہرا تجزیہ کرتے ہیں تو ہر پہلو  
سے یہی شہادت ملتی ہے کہ اس فریق کے لیے جنگی کارروائی سے زیادہ ناپسند صورت کوئی اور نہیں ہو  
سکتی تھی۔ اُجڑے پجڑے لوگوں کا ایک نئے ماحول میں داخل ہونا۔ آدھی جماعت کا معاشی تباہی سے  
دوچار ہو کر اپنی بحالی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا، ایک نئے ماحول کو انقلابی دعوت کے لیے آہستہ آہستہ  
تیار کرنا۔ مختلف قبائلیت زدہ عناصر میں اخوت کا جوڑ لگانا اور ان کی ذہنی و اخلاقی تربیت کرنا نیز ایک  
نئی ریاست قائم کر کے اس کے جملہ شعبوں کا نظم و نسق تعمیر کرنا یہ سارے کام بیک دم اسلامی انقلاب  
کے علمبرداروں کے سامنے آگئے تھے اور ان میں سے ہر کام دیر تک پوری پورس توجہ اور محنت چاہتا  
تھا۔ ایسے کٹھن مسائل میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی جماعت کبھی بھی کوئی لڑائی مول لینے کو تیار نہیں  
ہو سکتی تھی۔ لیکن دوسری طرف یہ لوگ ایک عظیم بین الاقوامی مشن رکھنے والے لوگ تھے۔ ان کے سامنے  
دنیا بھر کی بھدائی کا ایک مقدس نصب العین تھا۔ انہوں نے زندگی کی عنبر ترین سچائی — یعنی ایک  
ہی خدا کی ربوبیت و الہیت — کے نور سے تمدن کو جگمگا دینے کے لیے اپنے سارے مفاد و آرزو  
قربان کر رکھے تھے۔ اور صبر اور ایثار کی خوف ناک وادیاں طے کر کے وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ انہا  
تو سرمایہ حیات ہی نظریہ حق تھا۔ اپنی چھوٹی سی جماعت تھی اور مدینہ کی نو تشکیل یافتہ ریاست تھی۔  
ان کا سارا مستقبل اسی پونجی سے وابستہ تھا۔ وہ اس کی حفاظت کے لیے ٹھیک وہی مقدس فخری تیار  
رکھتے تھے۔ جس سے سرشار ہو کر کوئی مرغی جب کسی چیل کو منڈرتے دیکھتی ہے۔ تو سب کچھ فراموش  
کر کے اپنے چوزوں کو پروں تلے سمیٹ لیتی ہے۔ وہ ناقے کاٹ کر مال خرچ کرتے تھے۔ رہ سولکے  
ہوتے جسموں کے ساتھ چٹالوں سے ٹکرا جانے کے لیے تیار تھے۔ وہ ساری لذتیں اور مفاد فراموش  
کر کے دیوانہ وار ہر اس طاقت کے بازو توڑ دینے کے لیے سچا دلوانہ رکھتے تھے جو ان کے مقصد حیات  
کو غارت کرنے کے لیے ٹیڑھی نگاہ سے دیکھے۔ وہ مدینہ کی سرور انگیز ہواؤں در بانگوں میں اور اخوت



کی لامثال فضائل ہیں آکر بھی تشدد کے ان زخموں کو فراموش کر کے کبھی چین سے غفلت کی نیند نہ سوئے اور ان کی نگاہ سروں پر لٹکتے ہوئے اس خنجر پیکار سے کبھی نہ مہٹی جس کے قبضہ پر مکہ کی قیادت کا ہاتھ تھا اور جس کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا کہ کب وہ برقِ خرمن سوز کی طرح اچانک لوٹ پڑے۔ نہ حضورؐ نے حفاظتی انتظامات سے تغافل برتا۔ اور نہ آپ کے رفقاء نے اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کرنے میں کوئی کوتاہی دکھائی۔ آخر یہ لوگ درویش اور جوگی نہ تھے۔ ہنایت زیرک اور فعال شخصیتوں کے ساتھ ایک نئی دنیا بنانے چلے تھے۔ ایسے تاریخ ساز لوگ مخالفین کو طاقت کا بواب طاقت سے دینے کا دماغ رکھتے تھے۔

### حضورؐ کی دفاعی تدابیر :

آئیے جائزہ لیں کہ حضورؐ نے حفاظتی تدابیر کیا کیا اختیار فرمائیں۔

مدینہ میں محسنِ انسانیت کے ساتھ آنے والے مہاجرین محض اپنے لیے جائے امن و سکون تلاش کرنے والے لوگ نہ تھے۔ اور نہ ان کی تبدیلی وطن کا اقدام کچھ معاشی حوصلوں کی تکمیل کے لیے تھا وہ ایک اُونچے مقصد کے لیے آئے تھے اور اُسے فراموش کر کے وہ اپنے لیے ٹھکانے حاصل کرنے اور اقتصادی عروج کی راہیں تلاش کرنے میں گم نہیں ہو گئے۔ بلکہ حضورؐ نے ان کو منظم طریق سے بسایا اور انصار کے ساتھ ان کی معاشی و سماجی اتھوت قائم کی۔ اور پھر ان کو مسجدوں کے تمدنی مراکز کے ذریعے جماعتی تنظیم میں پرو لیا۔ عبادات، مواعظ، تعلیم قرآن اور دوسری تدابیر سے ان کی ذہنی، عملی اور اخلاقی تربیت کا کام فوراً شروع کر دیا۔ اور اس کام کو تیزی سے توسیع دی۔ اسی کے ساتھ ساتھ نظامِ ریاست کے ذریعے ان کی شیرازہ بندی کر دی۔ یوں وہ بے سرو سامان مہاجرین انصار سے مل کر ایک مضبوط قوت بن گئے اور یہ قوت برابر نشوونما پاتی چلی گئی۔ دوسرے لفظوں میں انسانی قوت کو اولیت دے کر اُسے تیار کیا گیا۔

ضمناً یہاں یہ اہم نکتہ بیان کر دینا ہنایت ضروری ہے کہ مکہ کی طرح مدینہ دفاعی لحاظ سے بہت ہی موزوں مقام تھا، قطع نظر اس جغرافیائی پوزیشن کے جو مدینہ کو حاصل تھی کہ شام و عراق کے اہم علاقوں کے وہ بالکل سامنے تھا۔ عرب کی عظیم ترین تجارتی شاہ راہ کے سرے پر تھا۔ اور سمندر سے صرف ۷۰، ۷۵ میل کے فاصلہ پر تھا۔ خود اس شہر کو قدرتی تحفظات کا ایک مضبوط قلعہ مہیا تھا۔ اور ذرا سی چوکسی، باشندوں کی تنظیم اور دفاع کی مناسب تدابیر اسے مضبوط تر بنا سکتی تھیں۔ شہر تقریباً دس میل لمبے اور دس میل چوڑے میدان میں پھیلا ہوا تھا۔ اور فاصلے فاصلے پر مختلف قبائل کی چھوٹی چھوٹی بستیاں

اس وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ قطعہ ”جوف مدینہ“ کہلایا اور اسی کو ”حرم“ قرار دیا گیا۔ اس نامہوار میدان کے بیچ میں ”سلع“ نامی پہاڑ واقع ہے۔ اور کچھ دوسری چھوٹی پہاڑیاں ہیں۔ جبل عمیر اور جبل ثور نے اسے گھیرے ہیں لے رکھا ہے۔ قبائلی بستیوں میں آجام یا ظام کے نام سے مضبوط حفاظتی گڑھیاں موجود تھیں۔ جن کی تعداد ایک وقت میں ایک صد بھی رہی ہے۔

”مدینۃ النبی“ جہاں مسجد النبی اور حجرات نبوی تھے اور جو دارالسلطنت تھا وسطی حصے میں واقع تھا۔ اس کے جنوب میں گنجان باغ تھے۔ جنوب مشرق میں قبا اور عواتی کی بستیاں اپنے باغوں سمیت موجود تھیں۔ مشرق میں قبا سے اُحد تک یہودی محلے شرقاً غرباً پھیلے ہوئے تھے۔ جنوب مغرب میں بھی آبادیوں اور باغوں کا نسبتاً چھدر اسلسلہ تھا۔ قدیم فصیل مدینہ کے باب الشامی کے پاس بنو ساعدہ (جن کی چوپال میں خلیفہ اول کی نامزدگی ہوئی تھی) رہتے تھے اور ان سے آگے جبل سلع پر بنو حرام کی آبادی تھی۔ شمال مغرب میں وادی العقیق کے کنارے بئر رومہ تک بکثرت باغات تھے۔ جنوب میں بندر پہاڑیاں تھیں۔ اور کھٹن راستہ وادیوں اور گھاٹیوں سے گزرتا تھا۔ مدینہ کے مشرق اور جنوب میں ناوے کے پتھریلے میدان تھے جو نہ جنگی پڑاؤ کے لیے موزوں تھے۔ اور نہ میدان کارزار بننے کے لیے۔ نہ وہ شمال کی جانب سے شہر کا راستہ فوجی لحاظ سے کھلا تھا۔ چنانچہ بدر و اُحد کی جنگیں لڑنے کے لیے قریش نے وہی سمت پسند کی۔ لیکن مکہ کی فوجوں کا شمال کی طرف سے جا کر حملہ کرنا جنگی لحاظ سے یہی چھیدگیاں رکھتا ہے۔ جو مدینہ کے لیے مفید ٹھسکتی ہیں۔

لیکن مدینہ کے محل وقوع اور اس کی موزوں ترتیب سے فائدہ اٹھانے کا ایشمار اس پر تھا کہ اس کی آبادی کو ایک نظم میں پرودیا جائے۔ اس غرض کے لیے دوسرا بڑا کارنامہ حضور نے یہ نہ نجا دیا کہ معاہدات کے ذریعے یہود اور اوس اور خزرج اور دوسرے متضاد قبائل کو ان کے مذہبی، تمدنی اور معاشی فروق کے باوجود ایک نظم میں پرودیا۔ حضور کی سیاسی مہارت کا یہ ایک درخشاں ثبوت ہے کہ ایک شخص بالکل اجنبی ماحول میں جاتا ہے اور وہ متضاد عنانہ کو چند ہی ماہ میں ایک سیاسی وحدت بنا دیتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ اس سیاسی وحدت کے تحریری دستور میں نہایت واضح طور پر عدالتی، تشریحی فوجی اور تنقیدی اختیارات حضور کے ہاتھوں میں دے دیئے جاتے ہیں اور یہ نوشتہ خدا کی حاکمیت کی سوں روح سے آراستہ ہے۔ اس سیاسی دستاویز میں عجمہ شکر کا، سے یہ منوا لیا گیا کہ عہد نبوی قبائل میں جو مشرک

اور یہودی شامل ہوں۔ وہ مسلمانوں کے تابع اور جنگ کی صورت میں ان کے معادن ہوں گے۔ نیز یہ کہ وہ قریش مکہ کے جان و مال کو نہ تو خود کوئی امان دیں گے اور نہ مسلمانوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ اس صورت میں ڈالیں گے جب کہ وہ کسی قریشی پر حملہ آور ہوں۔ اس میں یہ بھی منوا لیا گیا کہ جنگ و صلح کے معاملات مشترک ہوں گے۔ کوئی جنگ سب کے لیے جنگ ہوگی۔ فوجی خدمت لازمی اور جبری ہوگی۔ البتہ حملہ حلیف اپنے اپنے حصے کے مصارف جنگ خود ادا کریں گے۔ یہودیوں کے ساتھ یہ امر پوری وضاحت سے طے ہو گیا کہ وہ ان سب سے لڑیں گے جن سے مسلمان لڑیں۔ اور وہ ان سب سے صلح کریں گے جن سے مسلمان صلح کریں۔ وہ مدینہ کی مدافعت میں مساویانہ طور پر حصہ لیں گے۔ مسلمانوں پر کوئی حملہ آور ہو تو یہودی مسلمانوں کی مدد کریں گے اور جواباً اگر یہودیوں پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمان انکی مدد کریں گے۔ مدینہ کی دستوری دستاویز میں اس سلسلے کی دفعات اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ سردِ عالم کے سامنے واضح طور پر قریش کی طرف سے جنگی کارروائی کا اندیشہ تھا اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے سیاسی طور سے پوری پوری پیش بندی کر لی گئی تھی۔

ایک نہایت ہی اہم اقدام مدینہ کو حرم (City of Peace) قرار دینا ہے۔ یہ بہت بڑا فیصلہ بھی اسی دستوری دستاویز میں طے ہو گیا۔ اس کی معنویت مذہبی لحاظ سے یہ تھی کہ پورے ماحول کو ایک تقدس حاصل ہے اور اس ماحول کا احترام اس کے باشندوں کو کرنا ہوگا۔ اس کا سیاسی مفہوم یہ تھا کہ جس طرح قریش ایک حرم میں محفوظ تھے اسی طرح حضورؐ نے ریاست مدینہ کے باشندوں کے لیے تحفظ فراہم کر دیا۔ گویا اب مکہ اور مدینہ کی اس لحاظ سے پوزیشن مساویانہ تھی۔ اور اس میں ایک چیلنج اہل مکہ کے لیے مضمر تھا کہ اگر تم حرم مدینہ کا احترام توڑ کر اس کے باشندوں پر زیادتی کرو گے تو پھر تم بھی حرم مکہ کے حصار تقدس میں محفوظ نہ رہ سکو گے۔

مدینہ کے حدود حرم — جو اسلامی مرکز حکومت کی حد بندی بھی کرتے تھے۔ کو مستقل طور پر معین کرنے کے لیے حضورؐ نے خاصا اہتمام کیا اور کعب بن مالک کو مامور فرمایا کہ حرم مدینہ کی بلندیوں پر منارے یا برجیاں (روایت میں اصطلاحی لفظ "علم" آیا ہے) تعمیر کراؤ۔ چنانچہ انہوں نے ذات الجبیش (حفیہ پہاڑی کے ساتھ جو بیدا کے وسط میں ہے اور مکے اور مدینہ کے راستے پر ہے) کے ٹیلوں پر مشیرب (ذات الجبیش سے متصل) پمخنیض کے پہاڑوں پر (شام کے راستے میں) حفیہ (مدینہ

۱۔ عبد نبوی میں ننام حکمرانی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی۔ مقالہ۔ دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور۔

کے شمال کا جنگل) میں۔ ذوالعشیر کے مقام پر۔ (حفیاً کے کنارے واقع ہے) اور تیم پہاڑ پر (مدینہ کے مشرق میں) جا بجا علامتی بڑجیاں نصب کیں۔ جن کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ یہ نشان زدہ علاقہ تقریباً ایک منزل طویل اور ایک منزل عریض ہے۔

مدینہ کے داخلی نظم کی تاسیس کرنے کے ساتھ ساتھ حضور نے گرد و نواح کے قبائل کی طرف فوراً توجہ دی۔ چنانچہ مدینے کے جنوب مغرب کے علاقے اور بحر احمر کے ساحلی حصے کا آپ نے متعدد بار دورہ کیا۔ سب سے پہلے آپ دوان کے مقام پر گئے، جو مکہ کے راستے پر ابواء سے سات میل کی دوری پر واقع ہے۔ وہاں بنی حمزہ سے حلیفانہ تعلق قائم کر لیا۔ اسی طرح ینبوع کے اطراف میں رہنے والے قبائل سے بھی بہت جلد معاہدہ تعلق استوار کر لیے۔ اس اہم سیاسی علاقہ میں ۱۱ھ میں حبشہ کا دورہ ۱۲ھ کے اوائل میں بنو ضمیرہ، بنو زعم، بنو الرعبہ اور ۱۳ھ کے اواخر میں بنو مدلیح کا تعاون بھی حاصل ہو گیا۔ بعض کے ساتھ تو مشترکہ دفاعی معاہدات طے پا گئے کہ ان پر حملہ ہو تو مسلمان مدد دیں گے اور مسلمانوں پر حملہ ہو تو وہ امداد کو آئیں گے بعض معاہدوں میں اتنے پر اکتفا کیا گیا کہ حضور کے دشمنوں سے دوستانہ تعلقات نہ رکھے جائیں۔ اور بعض میں غیر جانبداری تسلیم کرائی گئی کہ اسلامی ریاست کے ساتھ اگر کسی دشمن کی لڑائی ہو تو معاہدہ قبیلہ غیر جانبدار رہے گا۔ گویا تدبیر کے دائرے میں حضور کی سیاسی حکمت بہت ہی لچک رکھتی تھی۔

ظاہر بات ہے کہ اس حلیفانہ فضا نے ان قبائل میں دعوتِ اسلامی کے رستے کھول دیئے اور تحریک کے علمبردار اور حامی بھی پیدا ہونے لگے۔

بعد ازاں سیاستِ نبوی کی یہ تدبیر ایک مستقل باب بن گئی اور ہر زمانے میں متعدد سفرِ آپ نے اسی غرض سے کیے اور دیدہ بانی کی مہمات ہوں یا جنگی اقدامات جب بھی آپ مدینہ سے نکلے ہمیشہ مدینہ کو توسیع دینے کا لائحہ عمل ہمیشہ سامنے رہا۔ یہاں ہم تفصیل نہیں دے رہے، اس کا موقع کسی اور باب میں آئے گا۔ دشمن کو کمزور کرنے، اسلامی تحریک کو آگے بڑھانے، اپنی دفاعی سیاست کو مضبوط کرنے اور حدودِ ریاست کو وسیع کرنے کا ایک نہایت ہی موثر ذریعہ یہی معاہدہ تعلق تھا پھیلاؤ تھا۔

۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵ ۲۶ ۲۷ ۲۸ ۲۹ ۳۰ ۳۱ ۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱ ۴۲ ۴۳ ۴۴ ۴۵ ۴۶ ۴۷ ۴۸ ۴۹ ۵۰ ۵۱ ۵۲ ۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳ ۶۴ ۶۵ ۶۶ ۶۷ ۶۸ ۶۹ ۷۰ ۷۱ ۷۲ ۷۳ ۷۴ ۷۵ ۷۶ ۷۷ ۷۸ ۷۹ ۸۰ ۸۱ ۸۲ ۸۳ ۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷ ۸۸ ۸۹ ۹۰ ۹۱ ۹۲ ۹۳ ۹۴ ۹۵ ۹۶ ۹۷ ۹۸ ۹۹ ۱۰۰

۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵ ۲۶ ۲۷ ۲۸ ۲۹ ۳۰ ۳۱ ۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱ ۴۲ ۴۳ ۴۴ ۴۵ ۴۶ ۴۷ ۴۸ ۴۹ ۵۰ ۵۱ ۵۲ ۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳ ۶۴ ۶۵ ۶۶ ۶۷ ۶۸ ۶۹ ۷۰ ۷۱ ۷۲ ۷۳ ۷۴ ۷۵ ۷۶ ۷۷ ۷۸ ۷۹ ۸۰ ۸۱ ۸۲ ۸۳ ۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷ ۸۸ ۸۹ ۹۰ ۹۱ ۹۲ ۹۳ ۹۴ ۹۵ ۹۶ ۹۷ ۹۸ ۹۹ ۱۰۰

۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ ۱۵ ۱۶ ۱۷ ۱۸ ۱۹ ۲۰ ۲۱ ۲۲ ۲۳ ۲۴ ۲۵ ۲۶ ۲۷ ۲۸ ۲۹ ۳۰ ۳۱ ۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ ۳۹ ۴۰ ۴۱ ۴۲ ۴۳ ۴۴ ۴۵ ۴۶ ۴۷ ۴۸ ۴۹ ۵۰ ۵۱ ۵۲ ۵۳ ۵۴ ۵۵ ۵۶ ۵۷ ۵۸ ۵۹ ۶۰ ۶۱ ۶۲ ۶۳ ۶۴ ۶۵ ۶۶ ۶۷ ۶۸ ۶۹ ۷۰ ۷۱ ۷۲ ۷۳ ۷۴ ۷۵ ۷۶ ۷۷ ۷۸ ۷۹ ۸۰ ۸۱ ۸۲ ۸۳ ۸۴ ۸۵ ۸۶ ۸۷ ۸۸ ۸۹ ۹۰ ۹۱ ۹۲ ۹۳ ۹۴ ۹۵ ۹۶ ۹۷ ۹۸ ۹۹ ۱۰۰

ان تدابیر کے ساتھ اسلامی انقلاب کے داعیِ اول اور اس کے رفقاء نے یہ امر واقعہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ ہمیں ایک طوفانی سمندر کے درمیان جو نہ تھا سا جزیرہ پاؤں لگانے کے لیے نصیب ہوا ہے۔ اس کا وجود ہر آن معرضِ خطر میں ہے یا تو طوفانوں کا منہ پھیر کر چو طرفہ سمندر کو مسخر کرنا ہوگا یا پھر یہ جزیرہ بھی ایک بلبے کی طرح طوفانوں میں گم ہو جائے گا۔ انہوں نے نہایت تیزی سے اپنے آپ کو ایک متحرک جنگی قوت میں بدل لیا۔ یہ ہستیاں بدلتے ہوئے حالات میں تحریکِ اسلامی کے نت نئے تقاضوں کو اس خوبی سے سمجھتی تھیں کہ نئے مراحل کے لیے فوراً نئی صلاحیتیں اپنے اندر ابھار لیتی تھیں۔ مدینہ میں جب دورِ جہاد نے ان کو پکارا تو یہ ایک ثانیہ کے لیے بھی اپنی سابق پوزیشن سے نئے موقف پر آتے ہوئے نہیں جھکتے۔ ان میں سے کبھی کسی نے یوں نہیں سوچا کہ ہم تو داعی اور واعظ لوگ ہیں۔ ہمیں بھلا جنگ و پیکار کے ہنگاموں سے کیا واسطہ، یہ تو دنیوی سیاست کاروں اور سلطنتیں فتح کرنے والوں کے مشغلے ہیں اور اصلاح پسندوں کو یہ کہاں ذیب دیتے ہیں۔ حکومت و سلطنت اور جنگ و پیکار کی راہ مبلغوں کی راہ کہاں ہو سکتی ہے۔ مبلغوں کا کام تو بس پڑے پڑے مار کھاتے رہنا اور اس حالت میں برداشت کا کمال دکھانا ہوتا ہے۔ اگر مدینہ کی جماعتِ اسلامی اس طرح سوچتی۔ تحریک کے تقاضوں کی تبدیلی کا شعور نہ پاسکتی آگے بڑھتے بڑھتے بحث و نزاع میں لگ جاتی۔ تو چار تنکوں سے تحریک نے جو آشیانہ بنایا تھا، وہ آشیاں سازوں کے جذبات کی اپنی ہی کسی چنگاری سے جل چکا ہوتا۔ اس کے لیے کسی خارجی برق درخشاں کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

یہ عقابانی نشان کے گنے چنے افراد جہاں اپنے نظریہ صداقت کے سرگرم داعی تھے۔ وہاں یہ اس نظریہ پر قائم ہونے والی ریاست کا دفاع کرنے کے لیے بہترین جانناز سپاہی بھی ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنے آپ کو منظم سپاہ میں بدلنے کے لیے فوری اقدام کیے اور جہاں مدینہ ایک دارالامن ایک تعلیم گاہ اور تہذیبِ اسلامی کا ایک چمن زار بن رہا تھا۔ وہیں وہ ایک مضبوط فوجی کیمپ کی حیثیت بھی اختیار کر گیا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے سراب ایک کمانڈر کی ذمہ داریاں بھی آپڑی تھیں۔ جن کی انجام دہی انتہائی بے سرو سامانی کے عالم میں آپ نے اس خوبی، کمالِ فن اور حکمت بالغہ کے ساتھ فرمائی کہ تنہا یہ موضوع تصانیف کا ایک دفتر بے پایاں چاہتا ہے۔

طلابہ گروہی کا نظام اور اس کے مقاصد :

ریاستِ مدینہ کے عظمت آتب سربراہ نے ہجرت کے چار چھ ماہ بعد ملحقہ علاقے میں طلایہ گروہی

کے لیے فوجی دستوں کی ترسیل شروع کر دی۔ معرکہ بدر سے پہلے حسب ذیل دستے روانہ کیے گئے:

۱۔ امیر حمزہ بن عبدالمطلب کی سرکردگی میں ۳۰ آدمیوں کا دستہ سیف البحر کی جانب دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کو بھیجا گیا تھا۔ ابو جہل تین سو آدمیوں کے ساتھ مکہ سے نکلا تھا۔ لیکن مسلمانوں کو چونکہ اپنا پرکھنا پڑا تھا (رمضان ۱۰ھ)

۲۔ ۶۰ سپاہیوں پر مشتمل حبیش رابع عبیدہ بن حارث کی کمان میں اہل مکہ کے فوجی حالات معلوم کرنے کو بھیجا گیا۔ دشمن کے ۲۰۰ آدمی عکرمہ یا ابوسفیان کی سرکردگی میں ثنیۃ المرۃ کے مقام پر موجود پائے گئے۔ گشت لگا کر یہ حبیش سلامتی سے واپس آیا۔ (شوال ۱۰ھ)

۳۔ سعد بن ابی وقاص کی قیادت میں ۸۰ افراد کا حبیش طلحہ گردی کے لیے حجرت تک بھیجا گیا۔ یہ لوگ بغیر کسی واردات کے واپس آ گئے (ذی قعدہ ۱۰ھ)

۴۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود ۶۰ افراد کو لے کر ابواء کے علاقے میں تشریف لے گئے جہاں سے قریشی شاہ راہ تجارت گزرتی تھی۔ حضور عمر و بن مخشمی ضمیری سے معاہدہ کر کے بغیر کسی تصادم کے واپس آ گئے۔ (مشر ۱۰ھ)

۵۔ حضور نے یہ نفس لٹھیں ۲۰۰ سپاہیوں کو لے کر بوۃ کی جانب (رضوی پہاڑ کا علاقہ) بھیجا۔ شہر قریب ہے، اقدام کیا۔ راستہ میں امیہ بن خلف کی سرکردگی میں سو افراد پر مشتمل قبیلہ قریظہ کے لوگوں نے حضور کو روکا۔ (ربیع الاول ۱۰ھ)

۶۔ کرز بن جابر الصخری نے مدینہ کے موشیوں پر ڈاکہ ڈالا تو اعلانِ جنگ ہو گیا۔ حضور نے ۶۰ سپاہیوں کا دستہ بھیج دیا۔ کرزہ اگرچہ بچ کر نکل گیا، مگر اس کا عاقبہ سے مدینہ کی طرف پڑا کہ مدینہ بہرہاں ایک متحرک قوت ہے۔ (ربیع الاول ۱۰ھ)

۷۔ حضور ۱۵۰ افراد کا ایک حبیش لے کر ذوالعشیرہ (ہجرت) اور مدینہ کے درمیان یثرب کے قریب ہے، تشریف لے گئے اور وہاں بنی مدلیج اور بنی صخرہ سے معاہدہ کیا۔ (جمادی الثانی ۱۰ھ)

۸۔ عبد اللہ بن حبش کی سرکردگی میں ۱۲۵ افراد کے ساتھ ایک مہم سحاح کی جانب طلحہ گردی سے لیے بھیجی گئی۔ قریش کے ایک قافلے سے ملت بھیڑ ہو گئی۔ (رجب ۱۰ھ)

ان تمامات کی ترسیل تصادم کے لیے نہیں کی جاتی رہی تھی۔ بلکہ سحاح میں وقتی نفع کے زیر اثر مدینہ کی طے شدہ پالیسی کے خلاف جو تصادم ہوا۔ اُسے حضور نے ناپسند (Discourage) فرمایا اور قیدی رہا کر دیے گئے اور مقتول کا خون بہا ادا کیا گیا۔ ان سے دوسرے بہت ہی بڑے بڑے مفاہم

والبتہ تھے۔ یعنی ۱

ان مہمات کے ذریعے ریاستِ مدینہ کی سرحدات کی حفاظت کا انتظام رہے اور دشمن کی نقل و حرکت کا اندازہ رہے۔ قریش اور دیگر قبائل کو یہ نئی حقیقت محسوس کرانا بھی مقصود تھا۔ کہ اب یہاں ایک باقاعدہ نظامِ حکومت موجود ہے اور مدینہ اس کا مرکز ہے۔

مسلم انقلابی جماعت کے رضا کار سپاہی آس پاس کے علاقہ، اس کی بستیوں اُس کے نشیب و فراز، اس کے راستوں، اس کے چشموں سے براہِ راست واقف ہوں۔

ان کو کمان کرنے، کمان میں رہ کر فرض ادا کرنے، باہم تقسیم کار اور تقسیم اوقات کرنے، تدبیریں سوچنے، وقت کے وقت فیصلے کرنے کی مہارت حاصل ہو جس کے بغیر کوئی دفاعی نظام چل نہیں سکتا۔

قریش کو محسوس ہو جائے کہ اب اُن کی معاشی شاہِ رگِ مدینہ کے پنجے میں آچکی ہے۔ اور وہ اُن کی تجارتی شاہِ راہ کو روک کر اُن کے کاروانوں کا گزر جب چاہیں بند کر سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ حضور نے یحیٰ میں بصری اور مدینہ کی طرف اور جوانی میں دوبارہ شام کی جانب جو سفر کئے تھے۔ اس کے دوران میں آپ نے مدینہ کی جغرافی اور سیاسی اہمیت سمجھ لی تھی اور قریش کی تجارتی شاہِ راہ کے ہر پیچ و خم سے آپ واقف تھے۔ اپنی سابق واقفیت کی بنا پر خوف دلانے اور دباؤ ڈالنے کی پالیسی نورا بنانے میں آپ کو کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ دوسری طرف آپ نہ صرف قریش کا ایک قریبی فرد ہونے کی بنا پر خود تاجر رہ کر اور کاروانوں میں شریک ہو کر قریش کی معیشت کے سب سے بڑے تجارتی ذریعے سے آگاہ تھے۔ طائف اور یمن و نجران کی تجارتی مہمات کو درکنا رکھ کر دیکھیں تو محض شام و عراق کی شاہِ راہ پر تجارتی سفروں سے قریش کو ۲۱ لاکھ اثرنی سالانہ کی آمدنی تھی۔

ان مہمات کی ترسیل جس تربیتی نقشے کے تحت کی گئی۔ اس میں اہتمام تھا کہ سپاہیوں کو منظم جنگی کارروائی کی مشق ہو۔ وہ ایک مرکزی کمانڈ کے تحت مشین کے پُرزوں کی طرح حرکت کر سکیں، صف، بندی کی مشق پیدا کریں۔ علم اور فوجی رموز و اشارات کا استعمال کرنا سیکھیں۔ روزہ داری اور نمازوں کی پابندی اور مشکل ترین حالات میں احکام کے مطابق ادا ثے فرض کر کے جفاکشی کی صلاحیت پیدا کر لیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے خبر رسانی کا ایک مضبوط نظام قائم کر دیا۔ جس کے بل پر آپ مکہ

اودگرد پیش کے قبائل اور اپنے سرحدی علاقے کے حالات سے پوری طرح باخبر رہتے۔ اسی سلسلہ میں آپ نے مرکز ریاست کی حفاظت کے لیے دیدبانی اور پہرہ کا انتظام بھی کیا۔ یہ تھے دو طرفہ حالات جن کے زیر اثر قریش نے معرکہ بدر لڑنے کا فیصلہ کیا۔

### دو واقعاتی محرکات :

اس میں کیا شک ہے کہ جنگ کے لیے ماحول تیار بہ تیار موجود تھا۔ کرز بن جابر فہری کی ڈاکہ زنی مدینہ کے لیے قلعی طور پر ایک جنگی چیلنج تھی۔ کیونکہ کوئی زندہ و بیدار حکومت اپنی حدود میں غیروں کی ایسی مجرمانہ مداخلت کو جنگ کے ہم معنی سمجھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ دوسری طرف نخلہ کا حادثہ ہو گیا جس کی نوعیت اگرچہ ویسی ہی سرحدی جھڑپوں کی تھی۔ جیسی حکومتوں اور جنگی کمانڈروں کی مرضی کے بغیر سپاہیوں کے درمیان ہردو ملکوں کی سرحدوں پر واقع ہوتی رہتی ہیں۔ مگر اہل مکہ کو اس واقعہ کی بنیاد پر مخالفانہ پروپگینڈا کی مہم چلانے کا سنہری موقع ملا۔ انہوں نے خوب غوغا مچایا کہ لیجیے نئے دین کے علمبرداروں نے ماہِ حرام کی حرمت بھی پامال کر دی۔ ادھر حضور نے قیدی چھوڑ دیے۔ مقتول کا خون بہا اور کیا اور اپنے آپ کو بہ حیثیت سربراہ حکومت کے اس حادثہ کی ذمہ داری سے بری قرار دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قرآن نے مکہ کے پروپگینڈے کی دھجیاں یوں بکھیر دیں کہ ماہِ حرام میں قتال کوئی چھی بات نہیں لیکن تمہارا لوگوں کو خدا کے دین سے روکنا، ان کو حرم سے نکالنا اور اصداوح انسانیت کی راہ میں روڑے اٹکانا اس سے زیادہ بڑی برائی ہے۔ اور اس برائی کا قلع قمع کرنے کے لیے مسلمان اگر نخلہ قتلہ کو روکنے میں لائیں تو وہ ایک خرابی ست انجام دیں گے۔ واقعہ نخلہ کا افادی پہلو یہ تھا کہ قریش کی کمانیں کھل گئیں کہ جن لوگوں کو انہوں نے بے سروسامان بنا کر نکالا تھا۔ اور جنہیں وہ خالہ جلی کے منہ کا نوالہ سمجھ رہے تھے۔ وہ ضرورت پڑنے پر اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتے ہیں۔ تاہم مکہ کی پروپگینڈا مشینری نے آتش غضب کو بھڑکانے میں واقعہ نخلہ سے خوب فائدہ اٹھایا۔

### قریش کی سرگاہ ضروریات :

مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لیے قریش کے سامنے تین بڑے مسائل تھے۔ ایک بنو کنانہ کے تعاون کا حصول۔ دوسرے جنگجو سپاہیوں کی فراہمی اور تیسرے جنگی مصارف کا بندوبست اول الذکر الجھن کے حل ہونے کا ذکر ہم آدر پر کر آئے ہیں۔ دوسری ضرورت یوں پوری ہوتی کہ قریش کا معاملہ احابش سے طے پا گیا۔ مکہ کے قریب حبشی نام کی ایک پہاڑی ہے۔ جس کے متصل چند قبائل رہنویضیر بنو مالک اور مصعبین نے حلیفانہ معاہدہ استوار کیا تھا۔ اور اس سے ان کا نام احابش پڑا۔ مکہ کے شہریوں کے مقابل میں یہ لوگ



جنگجو یا نہ صلاحیتوں میں بڑھے ہوئے تھے۔ اور حلیفانہ بنیادوں کے علاوہ معاوضے پر بھی لڑائیوں میں کام دیتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ جلدی کی وجہ سے پہلے معرکہ میں عملاً ان کو ساتھ نہ لیا جاسکا۔ اور قریشی سرداروں کو جنگ بدر کا نتیجہ دیکھ کر اس کو تباہی کا افسوس بھی ہوا۔ ادھر بنو مصطلق سے بھی (جو بارہ ضمنی خالوادوں پر مشتمل تھے) قریش کا معاملہ طے پا گیا۔

تیسرے مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ قریش کا جو تجارتی قافلہ اپنے موسم پر شام جا رہا تھا۔ اس کے سامنے مکہ نے اپنا زیادہ سے زیادہ سرمایہ لاکر ڈھیر کر دیا۔ غیر تاجر عورتوں تک نے اپنے زیورات اور اندوختے لالا کے دیے۔ خود ابوسفیان کا قول ہے کہ مکہ کے قریشی مرد وزن میں سے کوئی ایسا نہ تھا کہ جس نے اس موقع پر حصہ نہ لیا ہو۔ مدعا یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ لگا کر زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے۔ اور اس آمدنی کے بل پر جنگی مہم بھیج کر ریاست مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔

**قریشی قافلہ تجارت جنگ کا دیباچہ تھا :**

ظاہر بات یہ ہے کہ معرکہ کی دوسری تیاریوں کے ساتھ (جن کی اطلاع حضور کو ساتھ کے ساتھ رہتی) اس تدبیر کے اختیار کرنے کے معنی یہ تھے کہ قریش کا یہ قافلہ تجارت بجاٹے خود جنگی کارروائی کا دیباچہ تھا۔ یوں کہیے کہ اسلامی تحریک کا گلا کاٹنے کے لیے یہ قافلہ سونے کا خنجر لینے نکلا تھا۔ حالات ایسے ہوں تو کونسی مذہب ترین حکومت آج بھی لمحہ شاہ راہوں، پانیوں اور نضاؤں سے حریف سلطنت کو سلامتی سے گزر جانے کا موقع دے سکتی ہے۔ ہوائی جہاز مار گرائے جاتے ہیں۔ بحری جہازوں کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ یا تار پیڈو کر دیا جاتا ہے۔ سرمائے ضبط کر لیے جاتے ہیں۔ ڈاک روک دی جاتی ہے۔ تجارتی مبادلہ ختم ہو جاتا ہے۔ آخر مدینہ ہی کی ریاست کے لیے یہ انوکھا تقاضا کیوں وضع کر لیا گیا ہے کہ اسے حریف کو اپنے سینے پر مونگ دلنے کی کھلی چھٹی دیے رکھنی چاہیے تھی۔ اور اگر نہیں دی تو اس کی مزاحمتی کارروائیوں کو لوٹ مار کی مہموں کا نام کیوں دیا جاتا ہے؟ جب یہ حقیقت واضح ہے کہ تجارتی شاہ راہ ایسے علاقوں سے گزرتی تھی جو معاہدہ نہ تعلقات کی بناء پر مدینہ کے زیر نگین علاقے تھے، تو آخر اسلامی حکومت کیوں اپنے علاقوں سے حریف طاقت کو گزرنے کا موقع دیتی؟

کوئی وجہ نہیں کہ مدینہ میں اس قافلہ پر چھاپہ مارنے کا جو رجحان پایا جاتا تھا اس کے سلسلے میں

۱۔ رحمتہ للعالمین۔ قاضی سلمان منصور پوری جلد ۲ صفحہ ۲۶۲ - ۲۶۱

۲۔ سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ شبلی نعمانی جلد ۱ صفحہ ۲۹۲

کچھ بھی معذرت کی جائے۔ اور کسی بھی درجے میں اس کو سیاسی یا دفاعی گناہ تصور کیا جائے۔ اس قافلہ پر ہاتھ ڈالنے کے لیے اگر مسلم طاقت میں کچھ بھی داعیہ موجود تھا تو وہ اپنی جگہ بالکل بجا تھا اور ابوسفیان کو اس قسم کا اندیشہ ہوا تو نہایت درست ہوا۔ اندیشہ کی اس فضا میں یہ افواہ بھی مدینہ کے کسی اقدام سے قبل شائع ہو گئی کہ قافلہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ادھر ابوسفیان نے شام جاتے ہوئے بھی مدینہ کی فضا کو سونگھنے کی کوشش کی تھی۔ اور واپسی پر وہ بہت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اس نے جائزہ لے کر جب یہ محسوس کر لیا کہ پڑا سر اس قسم کی نقل و حرکت ہو رہی ہے اور خطرہ بالکل سامنے ہے تو اس نے فوجی امداد طلب کرنے کے لیے اپنا قاصد مکہ دوڑا دیا اور قافلے کا راستہ بدل دیا۔ قاصد نے مکہ پہنچ کر عربوں کے مخصوص اسلوب پر اونٹ کے کان کاٹے۔ ناک چیری۔ کجاوا اٹا کر دیا۔ قبض پھاڑ دی۔ اور روایتی نذیر عربیاں بن کر دی کہ قریش کے لوگو! اپنے قافلہ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بچانے کے لیے نکلو۔ کہیں تمہارے پہنچنے سے قبل اس کا خاتمہ نہ ہو جائے۔ اس مروج ڈرامائی انداز نے مکہ بھر میں سخت جذباتی مہجماں پیدا کر دیا۔ اور جلد از جلد ایک مضبوط فوج جس کے ساتھ ابولہب کے علاوہ تمام کے تمام اکابر خود شامل تھے۔ کیبل کانٹے سے لیس ہو کر نکل کھڑی ہوئی۔ سرداران فوج کے سامنے قافلے کو بچالانے کا محدود مشن ہی نہ تھا۔ بلکہ جس صنطنے سے وہ نکلے تھے وہ خود گواہ ہے کہ وہ مسلم طاقت کو پہلے ہی دور میں کچل کر ہمیشہ کے لیے قصہ پاک کر دینا چاہتے تھے۔

اس موقع پر اگر مسلم طاقت ذرا بھی کمزوری دکھاتی۔ دیک کے بیٹھ رہتی۔ اور کوئی فوجی نقل و حرکت نہ کرتی۔ ابوسفیان اپنا قافلہ بھی احمیان سے گزار لے جاتا اور قریشی فوج بھی مدینہ کے علاقے میں گھس کر مدینہ کے دروازے پر تار بجی دشتک دے کر بخیریت واپس چلی جاتی تو پھر اس نو خیز ریاست کی ہوا اکھڑ گئی ہوتی۔ مدینہ کے یہود اور منافق الگ سرکش ہو جاتے۔ اس پاس کے قبائل کی نگاہوں میں وقعت نہ رہتی اور اس حکومت میں اتنا اثر ہی نہ رہتا کہ وہ حلیفانہ تعلقات کو بڑھاسکے بلکہ مسمی بھر افراد کا اپنے جان مال اور آبرو کو بچا رکھنا بھی مشکل ہو جاتا۔ کشمکش کرنے والی طاقت کو ایسے مراحل پیش آتے ہیں کہ اپنی قلت تعداد و وسائل اور سنگین مشکلات کے باوجود اسے نہایت جرات مندی سے حالات کے چیلنج کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ ایسے موقعے کبھی کبھی آتے ہیں اور ان موقعوں پر اگر وقت کا فرض مردانگی سے ادا کر دیا جائے تو اس بڑی طرح پسپائی ہوتی ہے کہ پھر برسوں میں تلافی نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ کبھی تو وقت سے پیچھے رہ جانا ہمیشہ کے لیے پوری بازی کو چوٹ کر دیتا ہے۔ ایسے تاریخی موقعے ہائے تصادم جب سامنے آجاتے ہیں تو پھر سپاہیوں کی گنتی اور اسلحہ اور رسد کی مقداروں ہی کو سامنے رکھ کر منصوبہ اقدام نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ

سوال یہ پیش نظر ہوتا ہے کہ وقت سے پیچھے رہ جانے پر تاریخ کی روکیں سروں کے اوپر سے نہ گزر جائے۔ درحقیقت ایسے ہی مواقع پر قیادت کی صلاحیتوں کی جانچ بھی ہو جاتی ہے۔ اور سپروکاروں کی بھی۔ سو مدینہ کو ایسا ہی فیصلہ کن تاریخی موقع درپیش تھا۔ نہی سی مسلم ریاست اگر کافی قوت رکھتی تو یقیناً اسے نہ قافلے کو بچ کے جانے دینا چاہیے تھا اور نہ قریشی فوج کے چھکے چھڑانے میں کوتاہی کرنی چاہیے تھی۔ مگر بیک وقت دونوں مہمات چونکہ دسترس سے باہر تھیں اس لیے مشیت کا فیصلہ بھی یہی ہوا کہ کوئی ایک ہی بازی (احمدی الطائفین) لی جاسکتی ہے۔ خدانے یہ چاہا کہ معرکہ ہو تو ایسا کہ جس سے احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہو جائے۔ اور کفر کی جڑیں کٹ جائیں۔

محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نظامِ خبر رسانی کے ذریعے قافلے اور فوج دونوں طرف کی اطلاعات مسلسل مل رہی تھیں، آخر آپ نے وادیِ ذفران میں مشاورتی اجتماع طلب کیا۔ اور پوری صورتِ حالات سامنے رکھ کر جائزہ لینا چاہا کہ آیا جماعت میں ایک بڑی بازی کھیل جانے کا بل بوتہ ہے بھی یا نہیں۔ خود آپ عزم رکھتے تھے کہ جو کچھ قوت فراہم ہے اسے زندگی اور موت کی بازی میں لگا

لے ہمارے دور کے سیرت نگاروں میں اس امر میں سخت اختلاف ہے کہ آیا حضور مدینہ ہی میں ہاجرین و انصار کی خصوصی مشاورت کر کے قافلہ کو چھوڑ کر قریشی فوج سے جھڑپ لینے نکلے تھے۔ یا مدینہ سے نکلنے وقت تو قافلہ بدر نظر تھا۔ اور بعد میں جب وادیِ ذفران پہنچ کر قافلہ کے نکل جانے سے نئی صورتِ حالات سامنے آگئی تو آپ نے وہیں ہنگامی مشاورت منعقد کی اور فوج سے معرکہ آراء ہونے کا فیصلہ فرمایا۔ یہ بحث مستشرقین کے اس گھٹیا الزام سے پیدا ہوئی ہے کہ مدینہ کی حکومت (نحوذ باللہ) لوٹ مار کی کارروائیاں کر کے معاشی بحران کا ازالہ کرنے کے درپے تھی۔ چنانچہ تفسیر حدیث، معازی اور سیرت کے کثیر دفاتر کے خلاف جا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش شروع ہوئی کہ حضور دستہ لے کر قافلہ کو نشانہ بنانے نہیں نکلے تھے بلکہ مدینہ ہی میں مشاورت ہو کر فوج سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس نقطہ نظر کے سب سے بڑے وکیل مولانا شبلی نعمانی تھے۔ اور انہوں نے قرآن کو اپنے حق میں ناطق قرار دیا۔ لیکن درحقیقت ان کی تعبیر واقعات کے حق میں نہ تو قرآن فی الواقع ایسا ناطق ہے، نہ کثیر التعداد مضبوط روایات کو بالائے طاق رکھا جاسکتا ہے، نہ سلسلہ واقعات ان کی تائید میں ہے اور نہ سرے سے وہ اعتراض ہی درست ہے جس سے یہ بحث پیدا ہوئی۔ ہم انشاء اللہ یہ بحث اس کے اصل موقع پر پوری تفصیل سے اٹھائیں گے۔ موخر الذکر نقطہ نظر ہی درست ہے۔

دیا جائے۔ حضور نے دونوں امکانات جماعت کے سامنے رکھ دیئے کہ ادھر قافلہ ہے ادھر فوج۔ کس طرف اقدام کیا جائے۔ ایک خاصے بڑے گروہ نے قافلے کی طرف اقدام کرنے کی تجویز کی حمایت کی اور قرآنی اشارے کے بموجب اس گروہ میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل تھے جو سہل پسندی کا شکار تھے اور جن کے لیے مالی مفاد بھی اہمیت رکھتا تھا۔ آپ نے دوبارہ سوال دہرایا جس کے معنی یہ تھے کہ حضور قافلے والی تجویز کے حق میں نہیں تھے۔ اس اشارہ کو سمجھ کر مہاجرین کی طرف سے حضرت ابو بکر صدیقؓ حضرت عمر فاروقؓ اور مقداد بن عمرو نے پھر پورا انداز سے تعاون پیش کیا کہ آپ حکم الہی کے مطابق جدھر بھی اقدام کریں گے ہم ساتھ ہوں گے اور بنی اسرائیل کی طرح یہ کہہ کر بیٹھ جائیں رہیں گے کہ موسیٰ! جاؤ تم اور تمہارا خدا مل کر لڑیں۔ ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ حضور نے پھر اپنا سوال دہرایا اور مدعا یہ تھا کہ انصار کا نقطہ نظر سامنے آئے۔ ان سے معاہدہ عقبہ میں صرف اتنی بات طے تھی، کہ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں وہ بچاؤ کریں گے۔ وہ اگر حضور کے ساتھ مدینہ سے نکلے تھے۔ تو محض قافلے سے تعرض کرنے کے لیے۔ لیکن بعد میں کیا کیا حالات نے باقاعدہ جنگی معرکہ واجب کر دیا۔ سو اب ان کا عندیہ سامنے آنا چاہیے تھا۔ اس مدعا کو سمجھ کر سعد بن معاذ انصار کی طرف سے بوسے اور انہوں نے پورے ایمانی جذبے سے پیش کش کی کہ آپ اپنے عزم کے مطابق عمل فرمائیے۔ ہم آپ کے ساتھ سمندر میں بھی اُورنے کو تیار ہیں۔

بہر حال ۱۲ رمضان ۳ھ کو ریاست مدینہ کا سربراہ کارِ رصلی اللہ علیہ وسلم، ہر نفس نفیس تین سو سے زائد سپاہیوں کے ساتھ رجن میں ۸۶ مہاجر، ۷۰ خزرجی اور ۶۱ افراد قبیلہ اوس کے تھے۔ حالانکہ مشہور عام تعداد ۳۱۳ ہے) شہر سے نکلا۔ حضور نے اقدام ایسے جلیانہ طریق سے کیا۔ کہ زردونوب طرف پڑتی معلوم ہو۔ ایک نگاہ قافلے کی طرف تھی تاکہ ابوسفیان کو محسوس ہو جائے کہ راستہ پُر خار ہے۔ دوسری نگاہ فوج پر تھی۔ یہ معلومات حاصل کرنا بھی اشد ضروری تھا، کہ قافلہ کدھر اور فوج کہاں ہے۔ دونوں کے درمیان فاصلہ کس قدر ہے۔ اور دونوں کے مل جلنے کا تو امکان نہیں۔ قافلہ پیچھے رکھا رہتا ہے یا ساحل کی طرف رخ کرتا ہے۔ تاہم مقام صفراء میں پہنچ کر آپ نے بسبن بن عمرو الجہنی اور عدی بن الرعباء کو بدر کی جانب بھیجا کہ قافلے کا پتہ لگائیں۔ اور خود وادی ذفران جا پہنچے۔ مدافع ملی کہ قافلہ بدر کا راستہ چھوڑ کر ساحل کے لمبے راستے کی طرف نکل گیا ہے۔ اور خاصا دُور جا چکا ہے حضور نے بدر کا رخ کیا۔

ادھر ابوسفیان نے ساحل علاقے میں پہنچنے کے بعد اپنے آپ کو محفوظ پاکر قریشی فوج کو پیام

بھیجا کہ اب ہم بچ کے نکل آئے ہیں۔ لہذا تم لوگ بھی لوٹ آؤ۔ مگر ابو جہل کے ذہن میں دوسرا ہی سودا سارا تھا۔ اس نے بدر جانے کا فیصلہ کیا۔ اور مسلمانوں پر حملہ کی ٹھان لی۔ قبیلہ زہرہ اور عدی کے سرداروں کو چونکہ قافلہ کے بچاؤ کے لیے ساتھ لیا گیا تھا۔ لہذا انہوں نے واپس چلنے کی تحریک کی۔ ان کی بات نہ سنی گئی تو وہ اپنے آدمیوں کو لے کر لوٹ گئے۔ حکیم بن حزام اور عقبہ نے بھی جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ مگر ابو جہل ان باتوں کو سن کر آگ بگولہ ہو گیا۔ اور اس نے حامیانِ امن کو سخت طعن و تشنیع کی اور ساتھ ہی واقعہٴ نخلہ کے مقتولِ حضرمی کے بھائی عامر کے جذبات کو بھڑکا دیا۔ عامر نے شور مچا کر ایک جذباتی طوفان برپا کر دیا۔ آخر قریشی فوج بڑے طنطنے کے ساتھ بدر کے کنارے آ پہنچی۔

حضور نے ساتھیوں کے مشورے سے زیادہ بہتر جگہ پر قبضہ کیا اور مناسب جنگی منصوبہ بنا کر محاذ کی ترتیب سوچ لی۔ دشمن کی تعداد اور اہم افراد کے بارے میں تجسس کرایا۔ اور حیب نام بنام ہر ایک کا علم ہوا تو رفقائے فرمایا، کہ مکہ نے اپنے جگر پارے تمہارے سامنے لا ڈالے ہیں۔ دشمن کی ایک ہزار سپاہ جس میں چھ سو زره پوش، یکصد سوار شامل تھے۔ جس کے ساتھ اونٹوں کا ہجوم تھا، اسلحہ کی فراوانی تھی، رسد بافراں تھی۔ جانبازوں کی خوشنودی کے لیے شراب کے ٹکے اور گانے کے لیے لونڈیاں حاضر تھیں۔ اس کے مقابل میں تین سو سے کچھ زائد بے سرو سامانوں کو میدان میں اتار دینا محض تہور نہ تھا۔ جنگی قوت، تعداد اور اسلحہ کے علاوہ اور بہت سے عناصر پر مشتمل ہوتی۔ ہے حضور خوب جانتے تھے کہ وہ جن سپاہیوں کو تین کے مقابلے میں ایک کے تناسب سے لا رہے ہیں ان میں مظلومی کی روح موجزن ہے ان میں اپنے نظریہ کی صداقت پر زلزلہ افکن ایمان کا فرما ہے۔ وہ تنظیم اور کردار کے لحاظ سے فائق تر ہیں۔ پھر ان پر یہ احساس چھایا ہوا ہے کہ سوال محض ایک جنگ کے جیتنے یا ہارنے کا نہیں بلکہ تحریک کی پوری بازی مار لینے یا گنوا دینے کا ہے۔ ان کا ماضی، حال اور مستقبل سارا کچھ میدانِ بدر میں سمٹ آیا تھا۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کو خدا کی نصرت پر یقین تھا جو ان کی نگاہ میں اصل فیصلہ کن طاقت تھی۔ اور نصرتِ الہی کے بادل اس لمحے کس شان سے اُٹ آئے ہوں گے جب حضور نے گڑ گڑا کر بھگی ہوئی پلوں کے ساتھ اپنے پروردگار کو ان درد بھرے لفظوں میں پکارا ہوگا کہ:

اے اللہ! یہ ہیں قریش! یہ اپنے کبر و اعجاب کے نشے میں سرشار ہو کر اس غرض سے آ رہے ہیں کہ تیرے بندوں کو تیری اطاعت سے باز رکھیں اور تیرے رسول کو جھٹلائیں۔ پس اے اللہ!

اللَّهُمَّ هَذَا قَرِيشٌ قَدِ اقبلت  
بِخِيْلَةٍ هَا وَفَخِرْهَا مَحَادِكُ وَ  
تَكذِبُ رَسُوْلَكَ، اللَّهُمَّ  
فَنَصْرِكَ الَّذِي وَعَدْتَنِي!

اللَّهُمَّ اجْنُهمُ الغداة ! اپنی نصرت بھیج جس کا تو نے مجھ سے وعدہ

کر رکھا ہے۔ اے اللہ! کل ان کو ہلاکت میں ڈال دیا

اور پھر یہ جملہ کہ ”خداوند! اگر یہ چند جہانیں آج ختم ہو گئیں تو پھر قیامت تک تیری عبادت نہ ہوگی“ حضور جیسی ہستی جب اپنا کل سرمایہ تحریک میدانِ عمل میں رکھے کر ایسی رقت آفرین دعا کا عرش پر دستک دینے کے لیے بھیجے تو کیوں نہ فرشتوں کی فوجیں اتر پڑیں۔ چنانچہ فتح کی بشارت آگئی۔

معرکہ بدر کا نتیجہ :

وقت کی تاریخ گویا بدر کے چھوٹے سے میدان میں سمتِ آئی تھی اور اس کو حرکت میں رکھنے والی دو گونہ قوتیں اپنے جذبہ میں پوری طرح سرشار ہو کر آمنے سامنے تھیں۔ ایک طرف آئی فوجیں قدیم رسم و رواج، اپنی قیادت اور معاشی مفاد کا بچاؤ کرنے کے لیے خون کھول رہا تھا۔ اور دوسری طرف کربوں کا ایک غول تھا جو مدینہ کے فتنے سے نمودار کرنے والی بھیج نو کو پورے خطہ حیات میں پھیل رہی تھی۔ اور جس کی نگاہ میں جاہلیت کی تاریکیوں کا سینہ چھیدنا ایک مقدس فریضہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

معرکہ میں باپ اور بیٹے، چچا اور بھتیجے، بھائی اور بھائی، خسر اور داماد، خودی رشتوں کو توڑ موٹا کر کے ساتھ ساتھ تصورِ حیات کے بچاؤ کے لیے آمنے سامنے آگئے تھے۔ اس موقع پر انصار نے یہ جانتے ہوئے نہ ہوئے کہ

صلی اللہ علیہ وسلم کا دل و جان سے ساتھ دیا کہ وہ پورے عرب کے تیروں درگاہوں کی تار و پود سے بڑا کٹھن امتحان بنا جس میں سرخرد ہو کر حضور کے رفقاء نے ثابت کر دیا کہ وہ تخریب کاری کے سچے اور بے لوث اور جید اور علمبردار ہیں۔ یہ معرکہ محیر العقول نتیجہ کے اعتبار سے تاریخِ انسانی میں ایک بے نظیر ٹھہرا، کہنا چاہیے کہ ابابیلوں کے ذریعہ قدرت نے ایک بار پھر باغیوں کے لشکر کو غلبہ سے روکا۔

۱۴ رمضان کو مقابلہ ہوا۔ اسلامی فوج کے ۲۲ جانبازوں نے اپنی جانیں اپنے نصب العین پر قربان کر دیں۔ دکھا دیا کہ وہ عظیم ترین سچائی کے اخلاص مند گواہ ہیں۔ لیکن دوسری طرف دشمن کے ستر آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا اور اپنا کوئی آدمی ان کے ہاتھ میں دیئے بغیر۔ یہی افراد کو جنگی قیدی بنایا۔ نیز ماں نمیشہ حاصل کیا۔ عظیم درجے کے رؤسائے قریش جن میں شیبہ، عقبہ، ابو جہل، ابو البختری، زمعه بن لاسود، عاص بن ہشام، امیہ بن خلف، منبہ بن الحجاج جیسی شخصیتیں شامل تھیں۔ اسلامی تیغ جہاد کا لقمہ ہو گئے۔ ان کی قیادت کی صفیں غارت ہو گئیں۔ قریش کی کمر درحقیقت اسی پہلے معرکہ میں ٹوٹ گئی اور ان کا غور و قوت

پامال ہو کے رہ گیا۔ اور اسلامی تحریک یکایک اپنا سر اونچا کر کے مستقبل کے نئے افق دیکھنے کے قابل ہو گئی۔ اسی بناء پر قرآن نے معرکہ بدر کے دن کو ”یوم الفرقان“ یعنی حق و باطل کو منتہا دینے والی کسوٹی قرار دیا۔ اس معرکہ نے درحقیقت فیصلہ کر دیا کہ قریش کے محبوب نظام جاہلیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ اسلام میں سے کس کو زندہ رہنے اور پینے کا حق ہے اور کس میں یہ صلاحیت ہے۔ اسی لیے قرآن نے اپنے تبصرہ میں کہا کہ دونوں میں سے اب زندہ اسی کو رہنا ہے جو اپنے زندہ رہنے کے لیے واضح دلیل جواز رکھتی ہو۔ اور عوام کو بھی جس کا دامن تھامنا ہو۔ وہ دلیل کی بنیاد پر تھا میں۔ پھر چاہیں تو جاہلیت کی خندق ہلاکت میں گریں اور چاہیں تو اسلام کی زندگی افروز فضاؤں میں پرواز کریں۔ قیدیوں کو چار چار ہزار درہم (بعض امراء سے زیادہ رقم لی گئیں) فدیہ لے کر واپس کر دیا گیا۔ اس طرح قریش پر ۲۲ لاکھ درہم سے زائد کا مالی بار پڑ گیا۔ اور اس معاشی چوٹ نے ان کی طاقت کو اور بھی مضحل کر دیا۔ سیاسی حیثیت سے بدر کے اس غیر متوقع (قریش کے نقطہ نظر سے) نتیجے کا اثر یہ ہوا کہ قبائل عرب کی نگاہوں میں اسلامی تحریک اور ریاست مدینہ کا وزن بڑھ گیا۔ اور یہ قوت اُمید گاہ مستقبل قرار پانے کے قابل ہو گئی۔ چنانچہ (ایک نقطہ نظر کے مطابق) مدینہ کے بعض یہودی قبائل جنگ بدر کے بعد ہی مدینہ کے دستوری معاہدہ میں شریک ہوئے۔ بکثرت باشندگان مدینہ ایمان لائے۔ صحیح معنوں میں اسلام معرکہ بدر کے بعد ہی ایک مسلمہ عام ریاست بنا۔ کیونکہ اس نے اپنا سیاسی قوت ہونا بیچ کھیت منوالیا۔

اور یاد کرو وہ وقت جب کہ تم تھوڑے تھے

زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا، تم ڈرتے

رہتے تھے کہ کہیں لوگ تم کو مٹانہ دیں۔ پھر

اللہ نے تم کو جائے پناہ مہیا کر دی۔ اپنی مدد

سے تمہارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمہیں اچھا

لذق پہنچایا تاکہ تم شکر گزار بنو۔

وَ اذْ كُرُوا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيلٌ

مُسْتَضْعَفُونَ فِي الْاَرْضِ

تَخَافُونَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمْ النَّاسُ

فَاَوْلٰكُمْ وَاَيَّدَاكُمْ بِنَصْرِهِ وَا

رَزَقَكُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ

تَشْكُرُوْنَ (الانفال - ۲۶)

یہ آیت درحقیقت ہر دور کی اسلامی تحریک کے دو بڑے ادوار کو عیاں کرتی ہے ایک قلت،

ضعف اور خوف و خطر کا دور۔ دوسرا جماؤ، مضبوطی، اقتدار، فاتحانہ اقدام اور معاشی فلاح کا دور

اسلام میں جیسے پہلا مرحلہ فطری اور لازم ہے ویسے ہی دوسرا مرحلہ بھی طبعی اور واجب ہے۔ اس

آغاز کا منطقی انجام یہی ہے۔ لیکن جو تصویر اسلام افراد اور اقوام کو مستقلاً اولین حالت میں ڈالے۔

اسی پر فائز کر دے اور آگے کے دور روشن کی طرف کوئی راہ نکال کے نہ دے رہا ہو وہ محسن انسانیت

کے سکھائے ہوئے اسلام سے کہیں نہ کہیں انحراف کر جانے والا ہوگا۔

اس موقع پر کفار کو بھی نصیحت کے ساتھ چیلنج کیا گیا۔ کہ اگر تم لوگ واضح فیصلہ چاہتے تھے تو لوہہ فیصلہ تمہارے سامنے آ گیا۔ اب باز آ جاؤ۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے، ورنہ اگر تم پھر لمپٹ کر اس حماقت کا اعادہ کرو گے۔ تو ہم بھی دوبارہ تمہاری خبر لے ڈالیں گے۔ (الانفال - ۱۹) پھر مسلم قوم کی طرف رُخ پھیر کر کہا گیا کہ اب کمریں کھول دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ اب ان ہاتھوں کو مثل کیے بغیر دم نہ لو جنہوں نے تیغ کارزاری کو بے نیام کر لیا ہے۔ ”اب ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔“ (انفال - ۳۹) یعنی جنگ اور فتنہ کی ہوا آگ قریش نے دھکا دی ہے اب اُسے پوری طرح بجھائے بغیر کار دین کی تکمیل ہو نہیں سکتی۔

### دو قوتوں کا فرق :

معرکہ بدر کو حق تعالیٰ نے جس بنا پر یومہ لفرقان قرار دیا جس بنا پر کہا کہ جبکہ  
الفتح (لوہ فیصلہ تمہارے سامنے آ گیا) جس بنا پر سورۃ آل عمران میں مزایا کہ ”تمہارے لیے نشان ہے  
دو لشکروں کے تصادم میں“ نیز توجہ دہانی کہ ”اس واقعہ میں دیدہ بینا رکھنے والوں کے لیے نصیحت ہے  
وہ درحقیقت نظریاتی و اخلاقی فرق ہے جو دونوں حالتوں کے باہم مقابل آنے پر پوری شرح واضح ہو گیا۔ اب  
لشکر دنیوی مقاصد و غراض اور دنیاوی و نسلی تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر محض اللہ کی راہ میں نوع انسانی  
کی عظیم فلاح کے لیے اٹھتا ہے۔ دونوں لشکر اپنی سروری، اپنے نسلی غرور، اپنے تجارتی مفاد اور اپنے  
اندھے جذبات کی خاطر آگے بڑھتا ہے، وہ لشکر خدا کے سامنے عاجزی کرتا ہوا، نمازوں اور رکوع و سجود  
میں لگن اور رضائے الہی پر نگاہیں جمائے میدان میں اترتا ہے۔ یہ لشکر دعوتیں اور ضیافتیں کرتا، شرابیوں  
کے دور چلاتا، موسیقی کی تانوں میں بہکتا اور رقاصوں کی بدنی حرکات سے دل بہاتا سامنے آتا ہے۔  
وہ لشکر افراد کی تعداد اور اسلحہ کی کمی کے ساتھ ایمان، وحدت، نظم اور کردار کے لحاظ سے زیادہ  
اوپنی قوتوں سے آراستہ ہے۔ یہ لشکر تعداد میں بڑا اور سامان کے لحاظ سے بھاری ہے مگر اخلاقی قوت  
کے لحاظ سے نہایت ہوا، اور پھر قدرت دونوں کے درمیان فتح و شکست کا انتہائی بین فیصلہ کرتی ہے  
کہ اندھوں کو بھی دلکھائی دینے لگے کہ مٹنے والی قوت کون سی ہے اور پھلنے پھوسنے والی  
کون سی :

یہ فرق بعض واقعات کو سامنے رکھنے سے اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔



ابو حذیفہ بن یمان اور ابو حیل و مسلم نوجوان اس زمانے میں مکہ سے آئے۔ راستے میں کفار نے روکا کہ ہم تم کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدد کے لیے نہ جانے دیں گے۔ انہوں نے عدم شرکت کا وعدہ کر کے نجات حاصل کی۔ حضور کی خدمت میں آکر سارا واقعہ سنایا۔ قلتِ تعداد کے ساتھ یہ نازک موقع جب کہ ایک چیونٹی کی مدد بھی ملتی تو گراں بہا محسوس ہوتی حضور نے فیصلہ فرمایا کہ تم نے جو وعدہ کر لیا ہے، اسے لازماً ایفا کرو۔ ہماری مدد اللہ تعالیٰ خود فرمائے گا۔ تاریخ کے پاس ایسی زریں مثالیں کتنی ہوں گی؟

کفار مقتولین کی لاشوں کو آپ نے گڑھا کھدوا کر دفن کرایا۔ کسی لاش کی بے حرمتی نہیں ہوئی۔

مالِ غنیمت کے بارے میں عام طریقہ یہ تھا کہ جو کچھ جس کے ہتھے چڑھ گیا وہ اس کا ہوتا اور اس قاعدے کی وجہ سے فتح کے آثار پیدا ہوتے ہی ہڑ بونگ اور ہاتھ پائی مچ جاتی۔ لیکن قرآن نے مالِ غنیمت کا نیا ضابطہ مقرر کیا جس کے لیے اساسی تصویر یہ دیا کہ ”الانفالِ بئذِ و لرسول“ یعنی مالِ غنیمت اللہ کا اور رسول کا ہے اور اس میں تصرف کرنا اور اسے تقسیم کرنا اسلامی حکومت کا کام ہے۔ اس نئے ضابطہ کی بناء پر پورا مالِ غنیمت پائی پائی اور رتی رتی سالار لشکر کے قدموں میں ڈال دیا جانے لگا۔ اور پھر اس میں سے پانچواں حصہ ریاست کی اجتماعی ضروریات کے لیے روک کر بقیہ کو سپاہ پر تقسیم کیا جاتا۔

جاہلی نظام میں اسیرانِ جنگ فاتح کے رحم و کرم پر ہوتے۔ اور ان پر ظلم توڑے جاتے۔ ان سے بدسلوکی کی جاتی۔ اور ان کو غلامی میں ڈال دیا جاتا۔ اور آج کے دورِ تہذیب میں بھی جنگی قیدیوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے وہ واضح ہے۔ لیکن حضور نے جنگی قیدیوں کو نیا مرتبہ دیا۔ ہدایت دی گئی تھی کہ قیدیوں کو نہایت آرام سے رکھا جائے۔ بعض صحابہ نے اس کی تعمیل میں خود کھجوریں کھا کر اپنے چارج میں آئے ہوئے قیدیوں کو پیٹ بھرا چھٹا کھانا کھلایا۔ خود ایک بدری قیدی ابو عزییر (مصعب بن عمیر کے بھائی) کا بیان ہے کہ جن انصاریوں کے ہاں مجھے رکھا گیا تھا، وہ خود کھجوریں پر گزر کرتے اور مجھے اچھا کھانا لاکر دیتے۔ اس سلوک کی وجہ سے میں سخت شرمسار ہوتا۔ جن اسیروں کے پاس لباس کم تھا۔ ان کو کپڑے دیتے گئے۔ حضرت عباس کے بدن پر لمبے قد کی وجہ سے کوئی کڑتا پورا نہ اترتا تھا۔ اس لیے ان کے لیے عبداللہ بن ابی نے کڑتہ بھجوایا۔ اسی احسان کے بدلے میں حضور نے اس کے کفن کے لیے اپنا کڑتہ عطا کیا تھا۔ قیدیوں میں سہیل بن عمرو بھی تھا۔ جو اپنا پورا

زور فصاحت حضور کے خلاف تقاریر کرنے میں صرف کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس کے سامنے کے دانت اکھڑا دیئے جائیں تاکہ آئندہ یہ جوشِ خطابت نہ دکھاسکے۔ کوئی اور ہوتا تو اپنے ایک لمبے پس قیدی کے ساتھ بدترین سلوک کرنے میں بھی تامل نہ کرتا۔ لیکن حضورؐ نے فرمایا کہ اگر میں اس کے کسی حصہ بدن کو بگاڑوں (اصطلاح میں اسے مُثلہ کرنا کہتے ہیں) تو میرے نبی ہونے کے باوجود خدا اس کی سزا کے طور پر میرے بھی اسی حصہ بدن کو بگاڑے گا۔

فاتح طاقت بالعموم نشہ پندار میں بدمست ہو کر نہایت غیر سنجیدہ ہو جاتا کرتی ہے۔ لیکن حضورؐ اور آپ کے ساتھیوں میں ایسے اوچھے پن کی کوئی جھلک نہیں دکھائی دیتی۔ یہاں تک کہ جب ابو جہل کی ہلاکت کی خبر ملتی ہے اور اس کا سر آپ کے سامنے لایا جاتا ہے تو اس وقت خدا کی تعریف کے کلمات آپ کی زبان پر جاری ہوتے ہیں۔ مدینہ کی طرف فاتح فوج کا مارچ ہوتا ہے تو اس وقت بھی نہ کوئی مینڈا بھجے کا انتظام ہوتا ہے۔ نہ گانا بجانا ہوتا ہے۔ اور نہ مدینہ پہنچ کر کوئی جشنِ مسرت منایا جاتا ہے۔ فقط ایک جذبہ شکر دلوں پر طاری ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد اس احساس پر ہے کہ یہ فتح اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔

سجائے اس کے کہ مسلمہ سپاہی اپنے زعمِ قوت کا شکار ہو جائیں۔ ان کا لٹانڈا (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن کی آیات کے آئینے میں ان کو رہی سہی ذہنی و اخلاقی کمزوریوں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ان کے جنگی کردار پر ناقدانہ تبصرہ کر کے نامطلوب پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔ اس طرح ان میں مزید تعمیہ و صدح کے لیے تحریک پیدا کی جاتی ہے۔

اس بحث میں اگرچہ گنجائش اتنی نہیں کہ ساری جنگی کارروائیوں پر ایک فصل میں اتنی تفصیلات سے کام لیا جائے لیکن ہم نے اولین معرکہ پر اتنی توجہ اس لیے صرف کی ہے کہ قاری اس کے ذریعے وہ نقطہ نظر حاصل کرے جس کے بغیر بعد کے جنگی واقعات کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ بقیہ جنگوں کی روداد ہم نسبتاً اختصار سے بیان کریں گے۔

۱۔ جنگ بدر کے متعلق اوپر کی معلومات فراہم کرنے کے لیے حسب ذیل کتاب پیش نظر ہیں۔

۱) تفسیر القرآن - مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جلد ۲ سورہ انفال کا دیباچہ اور حواشی (۱) سیرت ابنی زینب (۱) سیرت

لبنانی جلد ۱ صفحہ ۳۳۴ - ۳۳۵ (۲) صحیح السیر - مولانا عبدالرزاق صفحہ ۴۴ - ۴۵ (۳) عمد نبوی کے میدان (۱) صفحہ

جنگ - ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی صفحہ ۲۵ - ۱۴ - ۵۱ حدیث دفاع - میوزیم لکھنؤ صفحہ ۶۵ - ۶۶

## معرکہ بدر کے بعد :

معرکہ بدر میں اسلامی ریاست کے ایک مختصر دستہ نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں اگرچہ قریش کو ایک سبق سکھانے والی شکست دی، لیکن اس کے ساتھ مستقبل میں ایک سلسلہ آویزش واجب ہو گیا۔ مکہ کی تلوار کے ایک بار بے نیام ہو جانے کے بعد اب قیام امن بغیر اس کے ممکن نہ رہا کہ اس تلوار کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ اور اسے لہرانے والے ہاتھوں کو شل کر دیا جائے۔ حریف جب زخم کھا لیتا ہے تو پھر اس کا جذبہ انتقام اس سانپ کی طرح بیچ و تاب کھاتا ہے جس کی دم کچل دی گئی ہو۔ یہ بات بالکل واضح تھی کہ اگرچہ قریشی قیادت کی صف سرگرم اور ذی فہم سرداروں سے یکا یک خالی ہو گئی تھی۔ ان کا اقتصادی مستقبل خطرے میں پڑ چکا تھا۔ اور ان کی طاقت کی جو ہوا بندھی چلی آرہی تھی وہ پہلی بار کسی قدر اکھڑنے لگی تھی۔ لیکن تاریخ کا یہ بھی ایک کلیتہ ہے کہ مذہبی، سیاسی یا معاشی اقتدار جس کسی کو حاصل ہوتا ہے وہ اُسے بچانے کے لیے آخری بازی تک کھیلتا ہے۔ خصوصاً پشت یا پشت سے جو طبقے اور عناصر سماج پر تسلط پالیتے ہیں وہ کسی ایسی طاقت کے لیے جیتے جی راستہ نہیں چھوڑ سکتے جس کے فروغ کا لازمی نتیجہ ان کی قیادت کے خاتمہ کی صورت میں رونما ہونے والا ہے۔ وہ دانتوں اور ناخنوں کا پورا زور صرف کر کے آخری سانس تک لڑتے ہیں۔ پس حضورؐ خوب سمجھتے تھے کہ بدر کی فتح اسلامی ریاست کے لیے دفاعی لحاظ سے مستقبل کی کتنی بھاری ذمہ داریاں اپنے ساتھ لے کے آئی ہے۔ حضورؐ کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ قریش اپنے پورے کے پورے مذہبی و سیاسی اثر، اپنے پرانے حلیفانہ تعلقات اور اپنی مکمل معاشی قوت کو کھپا کر بھی اپنے اس جنگی پھریے کو بند رکھنے کی کوشش کریں گے جسے لہراتے ہوئے ان کی نوج مکہ سے پہلی بار نکلی تھی۔ یوں گویا تعمیر و اصلاح کے داعی اور سچائی اور انصاف کے علمبردار کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ تعمیری کام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جماعت کی مختصر سی قوت کو ہر آن چوکنا اور نت نئے معرکوں کے لیے تیار رکھے۔ چنانچہ عملاً معرکہ بدر کے بعد پے در پے حضورؐ کو دفاعی اقدامات کرنے پڑے۔ معرکہ بدر سے واپسی کے بعد سات ہی روز گزرے تھے کہ حضورؐ کو فوجی مہم لے کے مدینہ سے ماہ الکدر جانا پڑا۔ جہاں سے اطلاع ملی تھی کہ بنی سلیم اور بنی عطفان کے کچھ لوگوں نے جنگی ارادے سے کچھ قوت اکٹھی کی تھی۔ مگر حریف سامنے نہیں آیا اور تین روز پڑاؤ رکھ کر آپ واپس آگئے۔ بعد میں پھر ان لوگوں کے جمع ہونے کی خبر آئی تو غالب بن عبد اللہ ایک دستہ لے کے گئے، مختصر سی جھڑپ ہوئی اور مفسدین بھاگ گئے۔ حضورؐ جب بدر کی مہم پر مدینہ سے باہر تھے تو پیچھے بنی تینقار نے معاہدہ توڑ کر بلوہ کر دیا تھا۔ اتنے بڑے واقعہ کو نظر انداز کرنا گویا آئندہ کے لیے

مدینہ کو تباہی کے حوالے کرنا تھا۔ اس لیے شوال ۱۱ھ میں حضور نے ان کے خلاف فوجی طاقت کے ساتھ ایک نوع کی پولیس کارروائی (Police Action) کی اور ان کے حسبِ خواہش تماشی کرانی گئی۔ جس کے فیصلے کے بموجب اس عنصر کو حدودِ مدینہ سے نکال دیا گیا۔

معرکہ بدر کے دو ماہ بعد (ذی الحجہ، اہلسفیاء، درسو آدمیوں کے ساتھ مدینہ کے علاقہ میں آیا اور خفیہ طور پر سدوم بن مشکم سے مل کر جنگی ساز باز کرنا چاہا۔ گامیانی کی کوئی صورت نہ دیکھ کر مقامِ عریض میں درختوں کو تباہ کر کے اور ایک انصاری کو قتل کر کے فرار کر گیا۔ حضور تعاقب کرتے ہوئے قرقرہ اکدر کے مقام تک گئے۔ مگر غارت گردوں کا دستہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ بھاگتے ہوئے ان لوگوں نے بوجھ کم کرنے کے لیے ستوڑوں کے تھیلے گرا دیئے۔ جو اسلامی دستہ کے قبضے میں آئے۔ اس لیے ہمہ کا نام غزوةِ سویت پڑ گیا۔ ذی الحجہ کا بقیہ مہینہ مدینہ میں گزارا۔ لیکن محرم ۱۱ھ میں اللہ عزوجل نے نبی کریم ﷺ کو نبی محمد کے لیے مجتمع ہو رہے ہیں۔ مہینے کے آخر میں آپؐ نجد تشریف لے گئے۔ درقریباً صفر کا پورا مہینہ اسی علاقے میں گزارا۔ دشمن مقابلے پر نہیں آیا۔ بغیر تصادم کے واپسی ہوئی۔ اتنا وقت آپؐ نے اس غرض سے صرف کیا کہ اس علاقے میں حلیفانہ تعلقات بڑھ جائیں۔ تاکہ ترییش اور عریض سے تجارتی راستہ اختیار کر سکیں۔

ربیع الآخر میں ترییش کی ارض سے حماد کا اندیشہ ہوا۔ مدینہ میں بن مکتوم کوئی نہ مقام بن کر حضورؐ مقابلہ کے لیے بحران کے مقام تک پہنچے اور جمادی الاولیٰ تک سرحدوں کی حفاظت کے لیے فوجی کمپ ڈسے رکھا۔ بغیر کسی تصادم کے واپسی ہوئی۔ ستر میں ترییش کا ایک تجارتی قافلہ پھر لنگر ٹوس کے مجوزہ راستے میں اتباہ کے لیے فوجی نقل و حرکت کی گئی۔ زید بن سہل شہزادہ جمادی الآخری میں یک ندر سپاہ کے ساتھ موقع پر پہنچے۔ قافلہ کا رہنما دگامیڈ، قرقرہ بن حیان گرفتار ہو کر سامانی جماعت میں شامل ہو گیا۔ درہم کی چاندی قافلہ سے چھین لی گئی۔

حالات کا یہ تسلسل تھا جو مہرہ کہ احمد پر منتج ہوا۔

دوسرا بڑا معرکہ — اُحد

تاریخِ انسانی میں جب بھی کبھی مثبت اور منفی نظریاتی قوتوں کا تصادم ہوتا ہے اور ایک انسانیت کو راستی اور فلاح و ترقی کی راہ پرے جانے کے لیے اٹھانا چاہتی ہے اور دوسری اپنی نظام کا تحفظ کرنے

لے اس مہم کو غزوةِ ذی امرہ اور غزوةِ انمار کا نام بھی دیا گیا ہے۔

کے درپے ہوتی ہے تو ایسے تصادم میں بڑا جوش و خروش کام کرتا ہے۔ اسلام اور جاہلیت کی آویزش نے معرکہ اُحد میں ایسے ہی غیر معمولی جوش و خروش کا سماں دکھایا۔

قریش کو معرکہ بدر میں جو دوسرے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے تھے، ان کے علاوہ اقتصادی چوٹ سخت کاری لگی تھی۔ ۲ ½ لاکھ درہم سے زائد قیدیوں کے فدیہ میں دینے پڑے۔ پھر قافلہ کے لمبے راستے سے گھوم کر آنے کی وجہ سے مصارف بڑھ گئے۔ اور نفع کی مقدار پہلے سے کم رہی۔ اس امر پر مستزاد یہ کہ آئندہ کے لیے نظامِ تجارت مستقلاً خطرے میں پڑ گیا۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں قریش کے تجارتی قافلہ سے ایک لاکھ درہم کی چاندی مسلمانوں نے ضبط کر لی۔ ہندوستان اور یورپ کے درمیان بین الاقوامی تجارت کی جتنی بھی نقل و حرکت ہوتی تھی۔ وہ مین و مکہ کے راستے سے ہوتی تھی اور قریش مکہ کے راستے سے ہوتی تھی۔ اور قریش مکہ اپنے معاہداتی نظام کے بل پر خفارے کا انتظام کر کے خاصی بڑی کمائی کرتے تھے۔ طائف اور دوسرے علاقوں کی تجارتی آمدنی درکنار رکھتے ہوئے محض شامی راہ سے قریش کو ۲ ½ لاکھ اشرفی سالانہ کی آمدنی ہوتی تھی۔ اب مکہ کے سر پر ایک خوفناک اقتصادی بحران منڈلا رہا تھا۔ ان حالات میں بدر کے انتقام کا لاوہ اندر ہی اندر کھولنے لگا۔

نئے معرکہ کے لیے بہت جلد تیاریوں کا آغاز ہو گیا۔ قافلہ شام سے حاصل شدہ مجموعی منافع جنگی فنڈ میں لے لیا گیا۔ عمرو جمحی اور مسافع جیسے نامور شعرا نے اپنے فنِ لطیف سے پوری طرح کام لے کر جنگ کی آگ بھڑکاٹی۔ مکہ کی عورتوں نے اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی موت کے جو زخم کھائے تھے ان کی ٹیسوں سے بیتاب ہو ہو کر وہ منیتیں مان رہی تھیں۔ کہ آئندہ جنگ میں وہ مسلم شہداء کا خون پیش گی۔ چنانچہ عملاً فوج کے ساتھ بڑے بڑے گھرانوں کی ممتاز عورتیں میدانِ جنگ کو روانہ ہوئیں۔ مثلاً ہند (عقبہ کی بیٹی ابوسفیان کی زوجہ اور امیر معاویہ کی ماں) ام حکیم (عکرمہ بن ابوجہل کی زوجہ) فاطمہ (حضرت خالد کی بہن)۔ برزہ (مسعود ثقفی رئیس طائف کی بیٹی) رلیطہ (عمرو بن العاص کی زوجہ) حناس (حضرت مصعب بن عمیر کی والدہ) وغیرہم۔

قریش نے اپنی رضا کارانہ سپاہ کو تیار کرنے کے ساتھ ساتھ احابیش کو بھی ساتھ ملایا۔ نیز عمرو بن العاص، عبداللہ بن الزبیر، ہیرہ بن ابی وہب، مسافع بن عبدمناف اور عمرو بن عبداللہ جمحی کو مختلف عربی قبائل میں مدینہ کے خلفائے ترغیب جنگ دلانے کے لیے روانہ کیا۔ اس طرح خاصی طاقت جمع ہو گئی۔ تین ہزار سپاہ جس میں سات سو زرہ پوش اور دو سو گھوڑ سوار شامل تھے اپنی جگہ دل دہلا دینے والی طاقت تھی۔ فوجی طاقت کا یہ سیلاب تھا جو سال بھر کی تیاری کے بعد مکہ سے روانہ ہوا، مدینہ کی چرگا ہوں میں پہنچا

تو اطمینان سے اپنے جانوروں کو سبز چارہ کھلا کھلا کر موٹا کیا اور کئی دن راستے میں گزار کر بڈھ کے روز اس پر انہوں نے پڑاؤ ڈالا۔

حضرت عباس دل سے حضور کے وفادار اور اسلامی تحریک کے حامی تھے اور اذن خاص سے مکہ میں تھے تاکہ دشمن کے کیپ کے اندرونی حالات پر نظر رکھیں۔ انہوں نے تیز رفتاری سے دوڑا کر ان تیاریوں کی اطلاع حضور کو پہنچا دی۔ پھر حضور کو اپنے خاص جنگی نظام خبر رسانی کے ذریعہ ۵ شوال ۳۱ھ کو اطلاع ملی کہ قریشی لشکر مدینہ کے پاس پہنچ گیا ہے۔ اور عربوں کی چڑگانہ کو اس کے جانوروں نے صاف کر دیا ہے۔ پھر اس کی تعداد اور اس کی قوت کے صحیح اندازے کی رپورٹ بھی پہنچ گئی۔ شہر میں رات کو پہرے کا انتظام فوری طور پر کر دیا گیا۔ صبح کو آپ نے مشاورت طلب کی۔ بیشتر مہاجرین اور انصار نے شہر میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تجویز رکھی۔ لیکن بدر کی شرکت سے محروم رہ جانے والے نوجوانوں نے جوش و خروش سے اس رائے پر زور دیا کہ باہر نکل کر مقابلہ کیا جائے۔ حضور ہر دو نقطہ ہائے نظر کے سامنے آجانے کے بعد گھر تشریف لے گئے۔ اور زرہ پہن کر واپس تشریف لائے گویا دوسری تجویز کو آپ نے قبول فرمایا۔ اس سلسلے میں نہ بھویسے کہ عبداللہ بن ابی بھی اول الذکر رائے کا علمبردار تھا اور یہ بات معلوم عام تھی کہ قریشی ساز باز کے تار اس کی ذات سے آکر جڑتے تھے۔ دوسری بڑی جنگ کے موقع پر قریش نے اس سے قہار زرہ لے رکھا تھا۔ حضور نے اسی حقیقت کو جانتے ہوئے کوئی بحث کیے بغیر خاموشی سے نوجوان طبقے کی رائے قبول کر لی۔ جمعہ کے روز جمع پڑھ کر آپ کی کمان میں ایک ہزار مسلم سپاہ روانہ ہوئی۔ عبداللہ بن ابی بھی ساتھ تھا۔ اپنی پہلی تجویز مسترد ہونے کے بعد اس نے شہر انگیزی کی ایک کوشش کرتے ہوئے ایک خاص موقع محاذ بنانے کے لیے تجویز کیا۔ یہ تجویز بھی جب حضور نے نامنظور کر دی تو وہ فتنہ گر مایوس ہو گیا اور مقام شوط سے تین سو حمایتیوں کو ساتھ لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ اسے شکایت تھی کہ ہماری بات جب نہیں مانی جاتی اور اختیار میں ہمارا کچھ حصہ نہیں ہے تو ہم کیوں لڑیں۔ اس منافقانہ حرکت کا بڑا اثر دوسروں پر بھی پڑا۔ مثلاً بنو سلمہ اور بنو ناسرہ بھی دل شکستہ ہو کر واپس جانے لگے۔ لیکن حیدر ہستیوں نے ان کی ہمت بندھائی۔

مدینہ سے باہر جا کر میدان میں اترنے سے قبل حضور نے سپاہ کا جائزہ لیا۔ متعدد لڑکے بھی جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر ساتھ چلے تھے۔ ان کو حضور نے واپس جانے کا حکم دیا۔ پھر بھی ہر ایک کی کوشش تھی کہ کسی طرح اسے شریک معرکہ ہونے کا موقع ملے۔ رافع بن خدیج نے ایڑیوں کے بل کھڑے ہو کر اپنے آپ کو بڑائی کا اہل ثابت کیا اور سمرہ نے کشتی میں رافع کو پچھاڑ کر اپنی قوت تسلیم کر لی۔ نئی نسل

کایہ کردار نتیجہ تھا ایک صالح ماحول کی تربیت کا! مسلم خواتین پر اگر چہ جہاد فرض نہ تھا۔ لیکن تحریک کے لیے نہایت ہی نازک صورت حال کو دیکھ کر ان کے جذبات بھی اُٹ رہے تھے۔ چنانچہ متعدد خواتین مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، ام سلیط (ابوسعید خدری کی والدہ)، ام سلیم (حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ)، ام عمارہ اور بعض دوسری خواتین مسلم فوج کے ساتھ روانہ ہوئیں۔ اور انہوں نے شاندار خدمات انجام دیں۔ مسلم فوج کی کئی سپاہ سات سو تھی جس میں ایک سو افراد زره پوش تھے۔ ان کی ایمانی قوت تھی کہ یہ اپنے سے چار گنی اور خوب آراستہ فوج سے ٹکر لینے جا رہے تھے۔

حضور نے کوہ احد کو پشت پر لے کر محاذ کا نہایت بہترین نقشہ ترتیب دیا۔ معصب بن عمیر کو اسلامی علم تفویض کیا۔ زبیر بن عوام رسالے کے افسر مقرر ہوئے۔ حضرت حمزہ غیر زره پوش سپاہیوں کے کمانڈر بنائے گئے۔ پشت کی طرف جبل عینین (جبل رماة) کے درے پر سپاس تیر اندازوں کا دستہ تعینات کیا گیا۔ اور اس دستہ کی قیادت عبداللہ بن جبیر کو سونپی گئی۔ قریش نے بھی بدر کے تجربے کی روشنی میں منظم جنگ کے اس نئے طریقے کی تقلید کی جسے اسلامی سپاہ نے اختیار کیا تھا۔ میمنہ، میسرہ، سواروں اور تیر اندازوں کے دستے الگ الگ کمانوں میں ترتیب دیے گئے۔

جنگ کی تمہید کے طور پر چودہ قریشی عورتوں کی ایک ٹولی نے ہندہ کی قیادت میں دف بجا کر جنگی راگ الاپنا شروع کیا۔ اس نغمہ کی جذباتی تحریک کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہو سکتا ہے۔

نخن بنات طارق نمشی علی النمارق

ان تسبلو الغانق اوتدبرو الفارق

ہم آسمانی ستاروں کی بیٹیاں ہیں اور ہم قالینوں پر خرام کرتی ہیں۔ اگر تم آگے قدم بڑھاؤ گے تو ہم تمہیں گلے لگائیں گے اور پیچھے ہٹو گے تو تم سے الگ ہو جائیں گے۔

ایک طرف یہ شاعرانہ روحانی اور شہوانی اکساہٹ تھی اور دوسری طرف اللہ کی رضا کے علاوہ کوئی چیز باعث تحریک نہ تھی۔

یہ ایک میدان میں مشہور ابو عامر راہب نمودار ہوتا ہے۔ اور انصار پر اپنے اثر کے زعم میں ان کو پکارتا ہے۔ انصار اس کے زُہد کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے جس کا رشتہ قریش کے جاہلی، مشرکانہ اور انتہائی فاسد نظام سے جا ملا تھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ”او فاسق! ہم تجھے خوب پہچانتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی کہ اسی ابو عامر کے بیٹے حضرت حنظلہ نے حضور سے والد پر حملہ کرنے کی اجازت طلب کی مگر حضور کے جذبہ رحمت کو یہ پسند نہ آیا کہ بیٹے کی تلوار سے باپ

کا خاتمہ ہو۔ اس کے بعد طلحہ کس بل دکھاتا ہوا لٹکارنے لگا۔ حضرت علیؑ نے بڑھ کر اس کے وجود کو معاً پوند زمین کر دیا۔ پھر اس کا بیٹا عثمان اس شان سے فخر یہ اشعار پڑھتا سامنے آیا کہ اس کے پیچھے عورتوں کا ایک غول رجز گارہا تھا۔ حضرت حمزہ کی تلوار نے اسے بھی ڈھیر کر دیا۔ بس اب معرکہ عام شروع ہو گیا۔ یوں تو ساری ہی مسلم فوج اپنی قلت تعداد و سامان کی تلافی و البانہ ایمانی جذبے سے کر رہی تھی دشمن مستقبل کی لہریں قدامت کے ساحل سے خوب ہی ٹکرائیں۔ مگر حضرت حمزہؓ، حضرت علیؑ اور حضرت ابو جہانہ رضی اللہ عنہم کی شانِ جاننازی سب سے بڑھ کر نمایاں تھی۔ آخر جاہلیت پرستوں کے قدم اکھڑ گئے اور ان کی رجز خوان ناز نہیں بدحواسی میں بھاگیں تو چھلا دوں کی طرح غائب ہو گئیں۔ مسلم سپاہ نے محسوس کیا کہ بس اب بازی تمام ہوئی۔ سوانہوں نے دشمن کو آئندہ کے لیے بے سرو سامان کرنے کا مقصد سامنے رکھ کر سامانِ جنگ اور رسد اور دوسری اشیاء پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ محاذ کا نظام ٹوٹ گیا۔ بڑے بڑے پھیل گئی۔ افراد مرکزی کمانڈ سے بے توجہ ہو گئے۔ اور غضب یہ ہوا کہ نازک ترین عقبی ناکے کو تیر اندازوں کے اس دستے نے بھی چھوڑ دیا جسے تاکید کی گئی تھی کہ وہ فتح و شکست کسی بھی حالت میں وہاں سے نہ اٹھے۔ حضورؐ کے یہ الفاظ تھے کہ اگر تم دیکھو کہ پرندے ہماری بوٹیاں نوچ لیں تو بھی تم جگہ سے نہ اٹھنا۔ اس سجدت کا بڑا خوف ناک خمیازہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ اور جیسے ان کے قدموں کو چومتی ہوئی فتح روٹھ کر پیچھے ہٹ گئی۔ قریشی فوج میں خالد جیسازیرک اور بہادر جنگی لیڈر موجود تھا۔ اس نے دُور ہی سے پوچھے بخار کا سماں دیکھا تو چند سو روں کی معیت میں پہاڑ کے پیچھے سے ہو کر اسی نازک عقبی ناکے سے جبل عینین جو خالی پڑا تھا۔ اپنا ٹک بٹ بول دیا۔ اب تو قریشی فوج کے مزید سنے بھی پاٹ کر حماہ آور ہوئے۔ اپنی فتح کے سرور سے مسلمان چونکے تو دیکھا کہ تلواروں کی برق ہانے بے تاب سردیوں پر چمک رہی ہیں۔ ادھر دشمن نے حضورؐ پر حماہ کرنے کے لیے جوم کر دیا۔ آپ دوڑتے ہوئے مسلمانوں کو پہنچے رہے تھے۔ اے عباد اللہ۔ اے عباد اللہ! (خدا کے بندو! ادھر میری طرف آؤ) مگر نوگ بدحواسی میں کچھ سن نہیں رہے تھے۔ ایک نازک لمحہ ایسا آیا کہ صرف گیارہ رفقاء آپ کے گرد رہ گئے۔ موقعہ پا کر عبداللہ بن قتیبہ نے چہرہ مبارک پر تلوار ماری جس سے مغز کی کڑیاں ٹوٹ کر جبرے میں گر گئیں ایک بار دشمن کے جوم کی وجہ سے آپ گڑھے میں گر گئے اور کچھ چوٹیں بھی آئیں۔ لیکن مٹھی بھر رفقاء نے دور لو کے اس آسمانی نقیب کا بچاؤ کرنے میں جس کا وجود تحریکِ اسلامی کی روح رواں تھا ایسی ندر کاری کا مظاہرہ کیا کہ اس کی مشکل ہی سے کوئی مثال تاریخ کے دوسرے ابواب میں مل سکتی ہے۔ حضورؐ کا اس محشر انگیز لمحے میں جے کھڑے رہنا بلکہ چوکس رہتے ہوئے مدافعت کرنا اور ابی بن خلف کی گردن پر چھوٹے



حربے سے خود زخم لگانا غیر معمولی شجاعت کا ثبوت ہیں۔ تاہم اس موقع پر حضور کے زخمی ہونے اور گرہے میں گر کر لگا ہوں سے اوجھل ہونے، اور پھر آپ کے ہم شہادت مصعب بن عمیر کے شہید ہو جانے کی بناء پر مخالفین نے حضور کی وفات کا نل مچا دیا۔ اس سے مسلمانوں میں اور زیادہ پریشانی پھیل گئی۔ اس غلغلہ کا رد عمل دو گونہ ہوا۔ حضرت عمرؓ نے ہتھیار پھینک کر کہا کہ اب لڑکے کیا لینا حجب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، بھی شہید ہو گئے۔ ان پر حضور کی محبت کا اتنا غلبہ تھا کہ ان کی نگاہ میں اس سب سے قیمتی متاع کو کھودینے کے بعد بڑی سے بڑی فتح بھی فتح نہ تھی۔ ابن نصر (حضرت انس انصاری کے چچا) نے یہ سنا تو کہا۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کے بعد ہم زندہ رہ کر کیا کریں گے؟" اور پھر اس بے جگری سے لڑے کہ چند ہی لمحوں میں اسی سے زیادہ زخموں کی لذت سمیٹ کر شہادت کا پیالہ لبوں سے لگا لیا۔ بہر حال اس پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں مسلمان مسلمانوں کی زد پر آئے یہاں تک کہ حضرت حذیفہ کے والد اپنے ہی رفیقوں کی تلواروں سے شہید ہو گئے۔

پھر حالت پلٹنا شروع ہوئی۔ ہر مسلم سپاہی اپنی اپنی جگہ تلواروں میں گھرا تھا اور حضور کو دیکھنے کے لیے بے تاب۔ سب سے پہلے کعب بن مالک نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا۔ اور پکار کر کہا کہ "مسلمانو! یہ رہے خدا کے رسول!" پھر جوں جوں یہ مژدہ جانفزا پھیلتا گیا۔ مسلم سپاہ میں نئی رود ڈرنے لگی۔ جانباز ہر طرف سے مرکز کی طرف سمٹتے گئے۔ دشمنوں کا ہجوم کم ہونے لگا۔ تو حضور پہاڑ کی چوٹی پر چلے گئے، ابوسفیان نے ادھر کا رخ کیا تو صحابہ نے بلندی سے پتھر برساکر اسے لوٹا دیا۔ اب دشمن کو اندیشہ ہوا کہ اسے جو اتفاقی غلبہ حاصل ہو چکا ہے، کہیں وہ ہاتھ سے با تانہ رہے۔ لہذا مکی فوج کے دستے بھی سمٹنے لگے۔

ابوسفیان نے مقابل کی ایک پہاڑی پر چڑھ کر حضور کے متعلق یقینی معلومات حاصل کرنا چاہیں۔ آخر اس نے بلند آواز سے حضور اور ابوبکرؓ اور عمرؓ کے نام لے کر پکارا کہ کوئی ہے۔ ادھر سے مصلحتاً کوئی جواب نہ دیا گیا تو کہنے لگا۔ "سب مارے گئے" حضرت عمرؓ تڑپ کر بول اٹھے: "او خدا کے دشمن! ہم سب زندہ و سلامت ہیں" ابوسفیان نے نعرہ لگایا۔

"اے ہبل! تو سر بلند رہے"

جواب ملا:

"اللہ ہی کی ذات بلند و برتر ہے"

ابوسفیان نے پھر ہانک لگائی :-

”ہمارے ساتھ عزٹی ہے! تمہارے ساتھ عزٹی نہیں!“

ادھر سے پکارا گیا :-

اللہ ہمارا آقا ہے، تمہارا کوئی آقا نہیں!“

در اصل ان مختصر نعروں میں وہ دونوں نظریات بول رہے تھے جن کے ٹکراؤ نے تاریخ میں یہ سارے

مدوجز پیدا کیا تھا۔

اس معرکہ میں ۶۰ مسلمان شہید ہوئے اور ۲۰ زخمی۔ دوسری طرف مخالف فوج کے نہتے ۳۰

آدمی موت کے گھاٹ اتارے جاسکے۔ حضور کے چچا حضرت حمزہ جیسا بہادر جرنیل اور آپ کے چھوٹے

بھائی عبداللہ بن محش، ذی مرتبت صحابیوں میں سے مصعب بن عمیر، حنظلہ بن ابی عامر، رافع بن مالک

بن عجلان (ہر سب بیعت ہائے عقبہ میں شریک ہوئے) عبداللہ بن عمرو خزرجی۔ عمرو بن جموح اور متعدد

بدری صحابی دنیا کی عظیم ترین سچائی کے شجرِ طیبہ کو اپنے خون سے سیراب کر گئے۔

بہر حال جو نہی مسلم فوج اپنے آپے میں آئی۔ اور ہائی کمانڈ سے اس کا تعلق بڑا ناقص دیکھیں

طاقت جلد جلد چھپے ہٹ کر میدانِ جنگ سے کوچ کر گئی۔ اس طرح اتفاقی فتح کے پردے میں چھپی ہوئی

کمزوری کا پول کھل گیا۔ اور مسلم فوج نے ایک بار پھر اپنا وزن محسوس کیا۔

مسلمانوں نے اپنی ایک لغزش کے سبب نقصان نرور اٹھایا تھا۔ لیکن نہ وہ شکست خوردہ

تھے اور نہ ان کی قوت نے کوئی خم کھایا تھا۔ چنانچہ حضور کے ارشاد سے ستر آدمیوں کا ایک دستہ قریشی

فوج کے تعاقب کو نکلا۔ ادھر ابوسفیان نے روجاء کے مقام پر پہنچ کر جب صورتِ حالات کا جائزہ لیا تو

اسے سخت پشیمانی ہوئی کہ احد کی حاصل شدہ فتح کا طرہ تو وہ جلدی میں میدانِ احد ہی میں چھوڑ آیا ہے

اور مدینہ کی قوت کو چکنا چور کرنے کا کام ناتمام رہ گیا ہے۔ اب اسے تلافی تلافی کی فکر ہوئی مگر بعد از

وقت۔ یہ گویا مٹتے کہ بعد از جنگ یاد آید کی صورت تھی۔ حضور کو پہلے سے اس کا اندیشہ تھا۔ آپ مدینہ

واپس جانے کے بجائے اپنی پوری فوج ساتھ لے کر مدینہ سے ۸ میل دور مقامِ حمرہ الیاسد تک جا پہنچے

اسی اثنا میں قبیلہ خزاعہ جو اسلام نہیں لایا تھا مگر اسلامی حکومت کا دل سے حمایتی تھا، کے رئیس معبد

نے ابوسفیان کو بطور خود جا کر خوف دلایا کہ ”محمد صلی اللہ علیہ وسلم بہت بڑی قوت کے ساتھ آ رہے

ہیں۔ اس خبر سے ہراساں ہو کر ابوسفیان رخصت ہو گیا۔

معرکہ احد کے چند خاص پہلو :

اب ہم اس معرکہ کے خاص خاص قابلِ غور پہلوؤں پر ایک اجمالی نگاہ ڈالتے ہیں۔

۱) نظم اور ڈسپلین سحر کیوں کی اصل طاقت ہوتا ہے اور پھر ہر قسم کے مقابلوں میں اس کی اہمیت اسٹی ہے۔ اور نظم اور ڈسپلین کی بنیاد اس اخلاقی صفت پر استوار ہوتی ہے جس کا نام صبر ہے۔ یعنی اپنے اوپر اتنا قابو ہونا کہ خوف و نقصان اور مفادات کے مقابلے میں تباہ نہ اور جاؤ برقرار رہے۔ اسلامی جماعت چونکہ زیر تربیت تھی۔ اور خصوصاً میدان جنگ کا اسلامی کردار مضبوط کرنے کے لیے ابھی تک تجربہ وسیع نہیں ہوا تھا، کیونکہ اُحد سے پہلے ایک ہی معرکہ پیش آیا تھا اس لیے لغزش ہو گئی۔ کوئی بھی انسانی عادت کسی نظریے پر نیا کردار تعمیر کرتے ہوئے لغزشوں سے بالکل محفوظ رہ کر کمال حاصل نہیں کر سکتی۔ لیکن اس ذرا سی لغزش پر مشیت نے جماعت کو ایسا واقعاتی سبق دیا کہ جو محض وعظ و نصیحت سے کبھی دلوں میں اتر نہ سکتا۔ اس سبق نے یہ نکتہ بھی کھول کے سمجھا دیا کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین نہایت بے لاگ طریقے سے کام کرتے ہیں اور اگر ان کو توڑا جائے تو بہترین انسان بھی عقوبت سے بچ نہیں سکتے۔

پھر اس معرکہ پر قرآن نے مفصل تبصرہ کرتے ہوئے ان کمزوریوں پر شدید گرفت کی جو ابھی تک جماعت میں کام کر رہی تھیں۔ ان کو صبر پر کاربند ہونے کی تلقین کی (آل عمران - ۱۲۵) ان کو مال و دولت کی اس اندھی ہوس سے اجتناب کی نصیحت کی جو سود خواری کا اصل سبب تھی۔ اور جس نے میدان جنگ میں مال غنیمت حاصل کرنے کا اضطراب پیدا کر دیا۔ ان کو اشارۃً سمجھایا کہ سود خورانہ ذہنیت کے ساتھ نہ صبر قائم رکھا جاسکتا ہے۔ نہ ضبط و نظم کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور نہ کسی اعلیٰ نصب العین کے لیے تاریخی معرکہ لڑے جاسکتے ہیں۔ اس نفسیاتی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان پر سود خواری کو حرام کر دیا (آل عمران - ۱۳۰) ان کو بتایا کہ اسلامی انقلاب کی علمبرداری تو ایسے لوگ کر سکتے ہیں جو سود کی کمائیاں سمیٹنے اور مال و دولت کی ہوس میں پڑنے کے بجائے الٹا اپنے مال مقصد کے لیے خرچ کرنے والے ہوں۔ اور جذبات کی زد میں بہنے کے بجائے ان پر قابو رکھتے ہوں (آل عمران - ۱۳۲) یہ بھی سنا دیا کہ جو کوئی دنیوی مفاد حاصل کرنے کے درپے ہوگا اس کو جو کچھ یہاں مل گیا، سولہ گیا۔ آخرت میں اس کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور جو کوئی دنیوی مفاد کا نقصان گوارا کر کے اپنی عاقبت بنانا چاہے اس کی کارگزاری کی قدر کی جائے گی۔ (آل عمران - ۱۲۵) ساتھ ہی ان کو تاکید کی کہ ایک چوٹ کھا کر دل شکستہ اور اندوگین نہ ہو۔ تم کو آج اگر یہ چوٹ آئی ہے۔ تو کل دشمن کو تمہارے ہاتھوں کی زخم لگ چکے ہیں۔ کسی بھی کشمکش اور تصادم کے دوران میں اتنا چڑھاؤ کے دور تو آتے ہی رہتے ہیں۔ یقین رکھو کہ آخر کار تم ہی کو غلبہ ملنا ہے (آل عمران - ۲۰) پھر ان کو صاف صاف آگاہ کر دیا کہ اللہ کی رضا اور اس کی جنت کوئی سستا مال نہیں ہے اس سعادت کو وہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو خدا کی راہ حق میں جانیں لڑانے والے اور صبر و ثبات کا مظاہر

کرنے والے ہیں۔ یہی کھٹن آزمائشیں چھانٹ چھانٹ کر ان لوگوں کو نمایاں کرتی ہیں جو سچے ایمان سے مالا مال ہوں۔ اور سچائی کے گواہ بننے کے قابل ہوں (آل عمران - ۱۴۰ تا ۱۴۲) ان کے اس مایوسانہ ردِ عمل پر گزرت کی گئی جو رسول خدا کی سچی محبت کی وجہ سے نمودار ہوا تھا۔ صاف صاف کہا گیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا نہیں ہیں۔ ایک رسول ہیں اور جیسے پہلے رسول وفات پا گئے۔ ان کو بھی ایک نہ ایک دن تم سے جدا ہو جانا ہے۔ پھر یہ کیوں کر درست ہو گا کہ ان کے اٹھ جانے پر تم تحریکِ حق کی باری بساطِ پیٹ کے رکھ دو اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہو (آل عمران - ۱۴۴) تمہیں ان خدا پرستوں کا نمونہ سامنے رکھنا چاہیے جنہوں نے سابق تاریخ میں انبیاء کے ساتھ ہو کر جانیں دیں اور باطل کے سامنے سرنگوں ہونے پر تیار نہیں ہوئے۔ اللہ ایسے ہی صبر کیش لوگوں کو پسند کرتا ہے (آل عمران - ۱۴۶) ان اصولی تلقینات کے ساتھ قرآن نے مسلمانوں کی اس حالت کا عبرت انگیز نقشہ جماعت کے سامنے کھینچ کر رکھ لیا۔ جو نظم توڑ دینے کی وجہ سے پیش آتی۔

تفہیم القرآن کے ترجمہ کے الفاظ میں ملاحظہ ہو :-

اللہ نے تائید و نصرت کا جو وعدہ تم سے کیا تھا۔ وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ بتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا۔ تو جو نبی کہ وہ پیغمبر اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے۔ اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا۔ تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا۔ کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نسیب عنایت رکھتا ہے۔

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تکس کا ہوش تمہیں نہ تھا اور رسول تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس ہوش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے۔ تاکہ آئندہ کے لیے تمہیں سبق ملے اور جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ہلے نہ ہو اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔ (آل عمران - ۵۳ - ۱۵۲)

اس تبصرے کو دیکھیے جو حضور کی زبان سے معرکہ اُحد میں اسلامی فوج کے کردار پر ہو رہا تھا اور پھر اندازہ کیجیے کہ دنیا کے جنگجو حکمرانوں سے اس کا مزاج کتنا مختلف ہے۔ نہ سپاہیوں کے من پر چا

کا اہتمام، نہ انہیں خود فریبی میں ڈالنے کی تدبیر نہ واقعات کی غلط تعبیر کرنے کی کوشش۔ یہ ایک بے لاگ لڑی تنقید تھی، جس میں خدا پرستی کی روح رچی بسی تھی۔ اور جس کا مقصود اخلاقی تربیت ہے۔

(۲) اس معرکہ میں حضور کے مٹھی بھر رفقائے نے جس سرفروشانہ محبت اور الہانہ فداکاری کا مظاہرہ کیا، اس کا تصور بھی رہتی دنیا تک عالم اسلام کو اپنی روح مقدس سے مالا مال کرتا رہے گا۔ دراصل کوئی بھی تحریک ہو اس کے داعی اول اور اس کے قائد اعلیٰ کی شخصیت بہر حال اس کی ایک اہم قوت ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی تحریک میں تو داعی اور قائد کے لیے گہری محبت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ خصوصاً اس منصب پر جب رسول و نبی کی ہستی رونق افروز ہو تو اس کے لیے انتہائی فداکاری لازم ہے۔ اسلامی تحریک کسی طرح بھی اپنے داعی و قائد کو ایک طرف ڈال کر آگے نہیں بڑھ سکتی۔ تحریک اور اس کے داعی دونوں کی قوت، عزت اور دائرہ اثر کی وسعت بالکل مشترک ہو جاتی ہے۔ وہ جماعت بہت ہی اندھی جماعت ہو سکتی ہے جو داعی و قائد کو نظر انداز کر کے اور اس کو بے وقعت بنا کر یا محض "یکے از مینا" قرار دے کر تحریک کے مجرد اصولوں کو غالب کرنے جانا چاہتے تحریکوں کے لیے اصول اور قیادت دونوں ایسے لازم ملزوم عنصر ہیں کہ اصولوں پر محکم ایمان اور قیادت کے لیے گہری محبت و فداکاری ایک دوسرے پر انحصار رکھتے ہیں۔ حضور کے رفقائے آپ کی ہستی پر رسول ہونے کی حیثیت سے بھی پروانہ وار فدا ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف یہ شعور رکھنے کی وجہ سے بھی کہ آپ کا وجود تحریک کی جان ہے، آپ کی زندگی کے تحفظ آپ کی عزت کی بلندی اور آپ کے اثر و رسوخ کی توسیع کے لیے جانیں نثار کرتے تھے۔ حضور کی سچی محبت کے لازوال نقوش انہوں نے میدانِ احد کے قرطاس پر ثبت کیے ہیں۔

دشمن کے دل کے دل نے جب ہجوم کیا تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صدا گونجی۔ کون مجھ پر جان قربان کرتا ہے؟" زیاد بن سکن چند انصاریوں کے ساتھ بڑھے اور یکے بعد دیگرے سب عاشق نے اپنے آپ کو نثار کر دیا۔ ان میں ایک زیاد تھے جن کو نیم جان حالت میں لایا گیا تو آخری قوت سے کام لے کر انہوں نے اپنا سر آگے بڑھا کر حضور کے قدموں سے مس کرایا۔ عبداللہ بن قتیہ نے جب تلوار کا وار کیا تو اتم عمارہ لپک کر حضور کے سامنے آگئیں اور بہت گہرا زخم کندھے پر لیا۔ انہی کے حائل ہونے کی وجہ سے یہ وار حضور کے حق میں اوجھا ہو گیا۔ ابو دجانہ نے آپ کو اپنے جسم سے ڈھانپ لیا اور اپنی پیٹھ کو سپر بنا دیا جس پر کتنے ہی تیر آ آ کے پویست ہو گئے۔ طلحہ نے دشمن کی تلواریں ہاتھوں پر روکیں اور ان کا ایک ہاتھ کٹ کر گر گیا۔ ابو طلحہ حضور کے سامنے سپر لیے کھڑے رہے اور ساتھ ہی اس جوش سے ناک اندازی کی کہ دو تین کمانیں ٹوٹ گئیں۔ ایک سیدھا سادہ مسلمان کھجوریں کھاتے کھاتے اتفاقاً آ پہنچا۔ یہ

عالم دیکھ کر اس کے اندر بھی جذبہ شوق اُٹھ آیا۔ حضور سے پوچھا کہ میں اگر لڑ کر قربان ہو جاؤں تو میرا انجام کیسا ہوگا۔ فرمایا: ”جنت“ کہنے لگا۔ اچھا! اگر میں نے ان کھجوروں کو کھانے کی مہلت پالی تو بڑی عمر پائی وہ ایک دم ٹوٹ پڑا اور زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ شہادت کہ عشق میں کشتگانِ نخر تسلیم میں شامل ہو گیا جس تحریک میں ایسا ایثارِ محبت کام کر رہا ہو اس کی موجوں کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ پھر ایک نمونہ تھا جو سعد بن ربیع نے پیش کیا حضور چونکہ خود بھی اپنے رفیقوں سے گہری محبت و شفقت رکھتے تھے اور ہر ایک پر آپ کی نگاہ توجہ رہتی تھی۔ اس لیے جنگ کے خاتمے پر ایک ایک کی تحقیق حال قرآنی۔ اس سلسلہ میں پوچھا کہ سعد بن ربیع کہاں ہیں؟ تلاش کیا گیا تو ایک طرف جسدِ جاں بلب پڑا مٹھا۔ آخری لمحے حضور کے لیے سلام شوق اور دعائے محبت کا ہدیہ بھیجا نیز ساتھیوں کو بطور وصیت پیغام دیا کہ اگر نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) تک دشمن کا ہاتھ پہنچ گیا تو تم میں سے ایک آنکھ بھی دیکھنے والی موجود ہوتی تو پھر بارگاہِ الہی میں تمہاری کوتاہی کا کوئی عذر نہ سنا جائے گا۔ نہ اپنے کرب کا خیال، نہ اعزہ و اقربا کی فکر نہ مال و جائداد کے مستقبل پر کوئی کاوش —۔ لے دے کے خیال ہے تو نصب العین کا اور اس کے داعی کا۔

(۳) مکہ کی انقلاب دشمن فوج نے اپنے گھناؤنے جذبات کا مظاہرہ یوں کیا کہ مسلم شہداء کی لاشوں کی بے حرمتی کی۔ خصوصاً ان کی خواتین نے اپنی منتوں کو پورا کرنے کے لیے لاشوں کے پیٹ پھاڑے اور ان کے ناک کان کاٹ کر ہار بنا بنا کے گلوں میں ڈالے۔ ”ہند“ زوجہ ابوسفیان جو زنانے دستے کی سربراہ تھی۔ اس نے شانِ درندگی کا افسوس ناک نمونہ پیش کیا۔ اور حضرت حمزہ کا چہرہ بگاڑا اور پیٹ چاک کر کے ان کا کلیجہ نکال کے چبا یا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن جحش کا مثلہ کیا گیا۔ خود ابوسفیان کی یہ حرکت دیکھیے کہ وہ حضرت حمزہ کے دہن مبارک پر کمان سے مار مار کر کتا دیکھا گیا کہ لو اب مزہ چکھو۔ لیکن دوسری طرف حضور نے مسلم فوج کو سختی سے باز رکھا کہ وہ دشمن کی لاشوں کا مثلہ کریں۔ یا ان کی بے حرمتی کے مرتکب ہوں۔ اسلامی تحریک کے اصولوں میں انسانیت کا احترام شامل تھا۔ اور وہ اپنے علمبرداروں کو یہ اذن نہیں دیتی تھی کہ دوسرے اگرستی میں گریں تو جو اباً مسلمان بھی پستی میں گر سکتے ہیں۔

ابوسفیان کو جب اپنے لوگوں کی اس کرتوت کی خبر ملی تو اس نے خوشی سے اس کا خیر مقدم کیا مگر ایک ساتھی کے گرفت کرنے پر اسے تنبہ ہوا کہ ایسی ذمہ داری لے کر کہیں کوئی جوابی کارروائی نہ جھگتنی پڑے۔ نیز رائے عامہ کے دائرے میں اپنا اثر اور نہ گر جائے۔ ابوسفیان جب آخر وقت میں پہاڑی پر آیا تھا تو اسی احساس کے تحت اس نے اعلان کیا کہ یہ واقعات میری مرضی سے نہیں ہوئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ گیا، کہ ”ان کے ہونے پر میں رنجیدہ بھی نہیں ہوں۔“

آج اندازہ کرنا مشکل ہے کہ انقلاب دشمن قوت کی اس کینہ حرکت نے اس کے عوامی اثر میں کتنی کمی کی ہوگی۔ البتہ ایک واقعہ سامنے ہے کہ ابوسفیان کو حضرت حمزہ کے چہرے پر کمان مارتے دیکھ کر جلیس بن زبان کنانی نے اپنی قوم سے کہا کہ اے بنی کنانہ! قریش کے بڑے سردار کو دیکھتے ہو یہ اپنے بنی عم کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے؟ اس پر ابوسفیان چونکا۔

(۴) حضورؐ اپنی جماعت کو میدان جنگ کا جو پاکیزہ اخلاق سکھارے تھے اس کی ایک جھلک اس واقعہ میں دیکھی جاسکتی ہے کہ ابودجانہ دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے بڑھے تو ہندان کے سامنے آگئیں۔ ہند اگرچہ میدان میں شریک جنگ تھی اور مسلمانوں کے خلاف اس کے جذبات نہایت زہریلے تھے۔ لیکن ابودجانہ نے اس کے سر پر تلوار رکھ دینے کے بعد اس احساس سے چونک کر اٹھالی، کہ رسول اللہ کی عطا کردہ تلوار کے شایان شان نہیں کہ اس سے کسی عورت کی جان لی جائے۔ کتنا زریں واقعہ ہے۔

(۵) مسلم خواتین نے معرکہ اُحد کے سلسلے میں جس ایمان، شجاعت، صبر اور تحریک کی وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ حضورؐ کی تحریک نے اس صنف کو حالت جمود میں پڑا نہیں رہنے دیا۔ بلکہ اسے متحرک کیا۔ اس کی تربیت کی۔ اور اس سے خدمات لیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:- ہم نے اوپر بیان کیا کہ کس طرح ام عمارہ نے ایک عورت ہوتے ہوئے اپنے آپ کو حضورؐ کے لیے سپر بنا دیا۔

حضرت حمزہ کی بہن جناب صفیہ رنجہ۔ ہ اطلاعات سن کر مدینہ سے جب اُحد پہنچیں تو حضورؐ نے ان کے صاحبزادے زبیر سے کہا کہ ان کو اپنے والد کی نعش تک نہ جانے دو۔ کیونکہ اس منظر کی یہ تاب نہلا سکیں گی۔ صفیہ کہنے لگیں۔ کہ میں سارا قصہ سن چکی ہوں اور راہِ حق میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں ان کو اجازت دے دی گئی۔ بڑے صابرانہ طریق سے ایک نگاہ ڈالی۔ دعائے مغفرت کی اور چلی آئیں۔ ہند نامی ایک انصاریہ (جو عمرو بن جوح کی زوجہ اور خلد بدری کی والدہ تھیں) کے لیے یہ آزمائش بہت ہی کڑی تھی۔ کہ ان کے باپ، بھائی، شوہر سبھی اسلام پر نثار ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں نے ان سارے زخموں کو حوصلہ مندی سے کلیجے پر لے کر بار بار یہی دریافت کیا۔ کہ کیا خدا کے رسولؐ صبح سلامت ہیں؟ جب ان کو ادھر سے اطمینان ہوا تو پکار اٹھیں: **مَلَّ مُصِيبَةٌ بَعْدَكَ جَلَلٌ** یعنی آپ سلامت ہیں تو پھر کوئی مصیبت بھاری نہیں، سب کچھ گوارا ہے۔

حضرت عائشہ، ام سلیم اور ام سلیط جیسی معزز پردہ نشین خواتین ہنگامی مصیبت کے عالم

میں پانیچے چڑھائے ہوئے دوڑ دوڑ کر پانی کی مشکیں بھر کر لاتیں اور زخمیوں کو پلاتیں۔

مسلمانوں کی شکست کی اطلاع اور حضور کی وفات کی غلط خبر پا کر جناب فاطمہ زہرا بھی اُحد آ

گئی تھیں۔ انہوں نے آکر حضور کے زخموں کو دھویا اور مرہم پٹی کی۔

(۶) قائدِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار جب حضرت ابودجانہ کو عنایت کی تو وہ سر پہ

سرخ رومال باندھے تلوار لہراتے ہوئے خوب اکڑا کر دشمن کی صفوں کی طرف بڑھے۔ اس منظر کو دیکھ

کر حضور نے فرمایا۔ کہ یہ چال خدا کو سخت ناپسند ہے مگر اس طرح کے مواقع پر پسند ہے۔ آپ نے گویا

بڑے اہم نکتہ کی وضاحت کر دی۔ عام زندگی میں افراد کا کسی بھی پہلو سے اکڑ دکھانا اسلام میں سخت

ناپسندیدہ ہے لیکن دشمنوں سے کش مکش اور تضادم کرتے ہوئے مفاخرت اور اکڑ کا اندازہ عین مطلوب

ہے۔ انکسار خوبی ہے مگر وہ کوئی غیر حکیم شخص ہی ہو سکتا ہے، جو جنگ کے میدان میں بھی ایک چھتے

اخلاقی اصول کو غلط طور پر استعمال کر کے دشمن کے سامنے تواضع اور عجز و انکسار کا مظاہرہ کرنے لگے۔

حضور نے اس ایک کلمے سے اس غیر حکیمانہ مذہبی ذہنیت کا ازالہ کر دیا جو اصول پرستی کے غلامی میں

پڑ کر بعض اخلاقی قدروں کو بے محل طور پر اُلٹے مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگتی ہے۔ عہدِ نبوی کے عہد

شع و سلطابت کے میدان میں بھی جو اس دور میں سیاسی رنگ رکھتا تھا۔ آپ نے اپنے شاعروں اور صحابہ

کے ذریعے مفاخرت کرنی ہے۔ اسی طرح عمرہ الفضا کے موقع پر حضور نے صحابہ کو عوف میں بھی پھیل کر

مظاہرہ قوت کا حکم دیا۔ اور سعی کرتے وقت بھی تین قدم اٹھانے اور مٹی کے بعد درڑنگانے ہر دوں

کی تاکید کی۔ بعد میں یہی سنت قائم ہو گئی۔ اس موقع پر آپ نے بطور دعایہ بھی کہا کہ خدا اس شخص پر رحم

کرے جو آج کفار کے سامنے قوت کا ثبوت کرے گویا شمشک کے نسی بھی دے دے میں عجز و انکسار، شع و

مہلک مذہب غلط ہوگا۔ اسلامی تحریک ایسے اندھے جنون کے بل پر نہیں چل سکتی جو اخلاقی اصول و قدر

کا صحیح استعمال مواقع کے فرق کو پہچان کر نہ کر سکے۔

۷۔ سچائی اور سچی ایسی طاقتیں ہیں کہ جو انسانی جوہر کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ مدینہ کے ایک صحابی کو جو

عمر بن صامت تھے جن کا معاملہ مسلمانوں سے حامیانہ و ہمہ دراندہ تھا۔ لیکن اب تک انہوں نے اسلام قبول

نہ کیا تھا۔ معرکہ اُحد نے ان کے سونے جذبے کو جگایا۔ ایمان لائے اور تلوار لے کر جیسے سے جنگ میں شریک

ہو گئے اور شہادت پائی۔ دمِ آخر نبی عبد اللہ اللہ کے لوگوں نے اپنے آدمی کو بھانا اور ماجہ بوجھا تو نبی

نے بتایا کہ خدا اور رسول کی نسبت سے حق کی حمایت میں لڑا ہوں حضور نے بشارت دی کہ یہ ایسا جنتی

ہے جس نے ایک مانا بھی نہیں پرہے۔ دوسری مثال مخیر لوق یہودین پر نبی تعالیٰ کی ہے جس نے سچی یہودیت



کا تقاضا سمجھتے ہوئے حضور کی حمایت میں لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اور دوسرے یہودیوں کو بھی دعوت دی۔ انہوں نے ایک مقدس غدر پیش کر دیا کہ آج یوم سبت ہے۔ جنگ کے لئے نکلنا روا نہیں مخیرتی نے کہا اس وقت سبت وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ وہ تنہا ہی میدان میں پہنچا۔ لڑا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دیا بالکل دوسری نوعیت کی ایک مثال قرمان کی بھی ہے جس کے جہنمی ہونے کی خبر حضور نے دی تھی۔ یہ شخص مسلمانوں کے ساتھ ہو کر خوب لڑا اور زخموں سے نڈھال پایا گیا۔ لوگوں نے تحسین کی کہ تو نے بڑا کام کیا۔ اس نے کہا، کہ میں تو فقط قومی حمیت میں لڑا ہوں۔ بد نصیب نے زخموں کے کرب کے مارے خود کشی کر لی۔ خدا نے اس سے کفار کے خلاف کام بھی لے لیا۔ اس کی جان بھی کھپ گئی اور ٹھکانہ بھی جہنم ہوا۔ خدا اس انجام سے بچائے۔

۸۔ جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ اس موقع پر جاہلیت کی منفی قوت بھی نشہ پندار میں خوب مست تھی۔ اور کفر کی حمایت کا جذبہ بھی پورے زور سے کام کر رہا تھا۔ قریش کا جھنڈا اٹھانے والے علمبردار اگرچہ ایک ایک کے قتل ہوئے اور کسی کو حرم کے کھڑا رہنا نصیب نہ ہوا۔ لیکن نئے افراد آگے بڑھ کر انکی جگہ لیتے گئے۔ آخر جب صواب نامی ایک شخص نے جھنڈا اتھا تا تو ایک ہی ایسی تلوار پڑی کہ اس کے عدول ہاتھ کٹ کر گر گئے۔ اور علم کے ساتھ ہی سینہ کے بل اس کے اوپر گرا۔ اور یہ کہتے ہوئے ختم ہو گیا۔ کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ کچھ دیر علم اسی طرح خاک پر پڑا رہا آخر عمرہ بن علقمہ نامی، خاتون بہادری سے آگے بڑھی اور علم اٹھا لیا۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مثبت انقلابی قوت کے ظہور سے قدامت میں بھی کچھ دیر کے لیے نئی رو دوڑنے لگتی ہے۔ مگر اُحد میں درحقیقت مکہ کی قوت نے اپنا آخری اُبال دکھا یا تھا۔

(۹) مسلم فوج کی مادی بے سروسامانی کا رقت انگیز منظر شہداء کی تجھیز و تکفین کے وقت سامنے آیا۔ جملہ ستر میتیں تھیں مگر ان کے لیے کفن کا انتظام تک کرنا مشکل تھا۔ مصعب بن عمیر کی نعتش پر صرف سر کی جانب کپڑا ڈالا جاسکا اور پیروں پر اذخر گھاس رکھ دی گئی۔ ان حالات کی جب بھی یاد آتی تو مسلمانوں کی آنکھیں ڈبڈب جاتیں۔ یہ حالات خود گواہ ہیں کہ مسلم ریاست کے لیے جنگ کرنا کتنا مجبورانہ اقدام تھا۔ مگر جب یہ مجبورانہ اقدام کرنا پڑ گیا۔ تو انہوں نے ہر کمی کی تلافی اپنے نظریہ حیات کے یقین اور اپنے عظیم نصیب العین کی محبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی رفاقت سے کی۔

(۱۰) قرآن نے مسلمانوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرنے اور ان کی اصلاح پر توجہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے سپاہیانہ شعور کی آبیاری بھی کی۔ ان کو ذہن نشین کرایا کہ معرکہ کارزار میں فیصلہ کن طاقت

اخلاقی طاقت ہوتی ہے۔ اور اس اخلاقی طاقت کا اہم ترین شعبہ صبر ہے۔ ان کو تلقین کی کہ وہ رزمِ خیر و شر میں عصبیتی جذبات اور دنیوی مفادات کو بالکل بلائے طاق رکھ کر صرف خدا کی رضا حق کے غلبے اور آخرت کی کامیابی کو پیش نظر رکھیں۔ ان کے دلوں میں یہ بات بھی بٹھائی کہ فتح و شکست کا فیصلہ بہر حال اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اسی کی تائید و نصرت کسی قوت کو غالب کرتی ہے۔ لہذا اسی کے قوانین اور اسی کی خوشنودی کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس حقیقت کو ایک دعائیہ پیرائے میں سمو کر ان کے وردِ زبان کیا کہ :-

”کہو! خدایا! ملک کے مالک! توجہ سے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ رات کو دن میں پروتا ہوا ہے آتا ہے اور دن کو رات میں۔ جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے۔ اور بے جان میں سے جاندار

کو اور جسے چاہے بے حساب رزق دیتا ہے۔“ (آل عمران ۲۷-۲۶)

ان کے دلوں سے موت کے خوف کو بھی یہ حقیقت کھول کر نکالا گیا کہ موت بہر حال مقررہ وقت پر اللہ کے اذن سے آئے رہے گی۔ اور جان بچانے کے لیے ادھے فرسخ سے کوتاہی کرنا زندگی کی گھڑیوں کو طویل نہیں بنا سکتا۔ لہذا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تمہیں اقدام کرنا ہے۔ ان قیمتی باتوں کے ساتھ ان کے سامنے ایک زبردست نکتہ یہ بھی رکھا کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں (سچائی کے گواہ بن کر) اپنی جانیں نچھاور کر تے ہیں ان کا مرنا عام لوگوں کا سامرنا نہیں ہے۔ ان کی موت نہایت ہی قابلِ احترام ہے۔ سو ان کو عام مرنے والوں کی طرح سے مردہ نہ سمجھو اور مردہ نہ کہو۔ وہ اپنے رب کی بارگاہ میں حیاتِ نو سے بہرہ مند ہیں۔ ان کی رُوحیں نورانی رزق پاتی ہیں۔ وہ عطیاتِ الہی پاکر سرور میں اور اپنے ہم مسک ساتھیوں کے بسے ہیں بھی اطمینان رکھتے ہیں۔ یوں شہادت کا ایک اعلیٰ مفہوم نمایاں ہوا۔ اور خدا کی راہ میں پیش آنے والی موت کے معنی ایسے بدلے کہ اس سے خوف کھانے کے بجائے اس کے لیے دعائیں مانگی جانے لگیں۔ اسی سلسلے میں آپ نے ممانعت فرمائی کہ شہدائے غم کا اظہار نہ کریں اور سینہ کو بونی کی صورت میں نہ کیا جائے۔ ایک صانعِ انقلابی تحریک جب رونما ہوتی ہے تو وہ اسی طرح اپنی خاص اصطلاحات پیدا کرتی ہے۔ اور ان میں مخصوص معانی رکھتی ہے اور مروجہ تصورات کے معنی بدل دیتی ہے۔ ان باری تلقینات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہاں جنگِ کوئی دنیاوی کارروائی نہ تھی۔ عین دینی تقاضا اور خاص عبادتِ الہی تھی۔

(۱۱) منافقین کی کچھ تعداد میدان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاں ایک نازک لمحہ میں مسلمانوں کے اندر انتشار پھیلانے اور نظم توڑنے میں ان کا خاصا ہاتھ تھا۔ وہاں معرکہ کے بعد بھی انہوں نے خوب خوب چہ میگوئیاں کیں کہ اگر یوں تھا

توفلاں نتیجہ نکلتا اور ووں نہ ہوتا تو فلاں واقعات رونما نہ ہوتے۔ نیز یہ کہ اگر قیادت میں ہمارا کچھ بھی دخل چلتا۔ تو جنگ اُحد کا نقشہ یوں نہ ہوتا۔ خود عقبی درہ کے تیر اندازوں کے ذہن پوری طرح صاف نہ تھے۔ ان سے مدینہ میں جب باز پرس کی گئی۔ کہ تم نے اپنا مورچہ کیوں چھوڑا؟ تو انہوں نے بوجہ عذرات پیش کیے جنہیں سن کر حضورؐ نے فرمایا، کہ نہیں۔ بلکہ حقیقت میں تم لوگوں کو یہ بدگمانی ہوئی کہ ہم تمہارے ساتھ خیانت کریں گے۔ اور تمہارا حصہ ادا نہ کریں گے۔ قرآن نے اسی بدگمانی کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ کہ کسی نبی کی شان سے یہ توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ وہ خیانت کرے گا۔ (آل عمران - ۱۶۱)

۱۲۔ دشمن نے جب حضورؐ کو زخمی کر دیا تو کسی ساتھی نے کہا کہ ان ظالموں کے لیے بد دعا کیجیے کہ خدا ان کو ہلاک کر دے۔ آپؐ نے جواب دیا۔ کہ مجھے دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے نہ کہ لعنت برسانے کے لیے۔ پھر دعا فرمائی۔ "اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے، یہ لوگ مجھے، میرے مشن کو اور زندگی کی حقیقتوں کو جانتے نہیں۔" ہم پہلے بھی اشارہ کر آئے ہیں کہ اس جواب اور اس دعا میں حضورؐ کا وہ نقطہ نظر پوری طرح منعکس ہے جس سے آپؐ اپنے مخالفین کو دیکھتے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ آپؐ کے اندر کوئی ذاتی جذبہ انتقام موجود نہ تھا۔ آپؐ ان کا خاتمہ نہیں چاہتے تھے۔ صرف ان کی اصلاح چاہتے تھے۔ ان کے جنگی اقدامات کا بھی آپؐ نے جواب دیا تو مجبوری سے دیا۔ کیونکہ اس کے بغیر چارہ کار کوئی تھا نہیں۔

### اُحد کے بعد :

اگرچہ مسلم فوج نے اُحد میں پہلے فتح کا اور پھر عارضی ہزیمیت کا دور دیکھا۔ لیکن آخر وقت میں انہی کے حق میں پلٹا جھکنے لگا تھا۔ خصوصاً قریش کا اپنی فتح کو ناقص چھوڑنے کے چل دینا اور مسلم فوج کا ان کے تعاقب میں نکلنا اور ابوسفیان کا ایک بار پھر پلٹنے کا ارادہ کرنے کے بعد کہہ کر روانہ ہو جانا مسلم فوج کی ہوا بندھنے میں مدد ہوا۔ درحقیقت قریش اس جنگ کا قطعی فیصلہ کیے بغیر اسے متعلق حالت میں چھوڑ کر چلے گئے تھے دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کا زور توڑنے میں کامیاب نہ رہا تھا۔ ایسی صورت لازماً باقی آئندہ کا مفہوم رکھتی ہے۔ اور قریش کی طرف سے تو ابوسفیان صاف صاف چیلنج دے گیا کہ اب آئندہ سال بدر میں ہم پھر لڑنے آئیں گے۔ بدر کی جنگ ایک فیصلہ کن نتیجہ رکھتی تھی۔ مگر اُحد کا معرکہ فیصلہ کن نہ ہو سکا۔ یہ فیصلہ آئندہ کے لیے مؤخر ہو گیا۔

مسلم طاقت اگر فاتح نہیں تھی تو بلاشک وہ شکست خوردہ بھی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی بدر کی فتح کا جواثر اردگرد کے علاقوں میں پڑا تھا اس میں کچھ نہ کچھ کمی آئی اور قدامت پسند قبائل کی اُمیدیں ایک بار پھر قریش کی جاہلی قوت سے وابستہ ہونے لگیں۔ بعض جرائم پیشہ اور شر پسند عناصر میں بغاوت کا رجحان بھی ابھر آیا۔ چاروں

طرف کے نیم متاثر قبائل بے باکی سے باغیانہ حرکات کرنے لگے۔ گویا اُحد کے وقتی اثر سے اسلامی ریاست کو شدید سچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن جماعت اتنی چاق و چوبند اور قیادت اتنی مضبوط تھی کہ اس نے شرارت کی فوری سرکوبی کی اور آہستہ آہستہ حالات کے دھارے کو صحیح رُخ پر ڈال لیا گیا۔ لوگوں کو محسوس کرادیا کہ اسلامی حکومت جان رکھتی ہے اور لائینڈ آرڈر قائم رکھتے اور اپنے علاقے کا تحفظ کرنے کے لیے کوئی کوتاہی کرنے والی نہیں ہے۔ تاہم ایک اچھا خاصا دور اسلامی ریاست کے اثر کی بحالی میں صرف ہوا۔

مخالف رجحانات رکھنے والے جن عناصر نے واقعہ اُحد کے بعد سر اٹھانا شروع کیا ان میں پہلے قطن کے طلحہ بن خویلد اور سلمہ بن خویلد نے کی۔ ان سرغنوں نے بنی اسد بن خزیمہ کو مدینہ کے خلاف باغیانہ اقدام پر تیار کیا۔ صحیح تر نقطہ نظر غالباً یہی ہے کہ پروگرام ایک طرح کی مسلح ڈاکہ زنی کا تھا۔ محرم ۳۸ھ کا چاند ہونے کے ساتھ ہی یہ اطلاع موصول ہوئی۔ ابوسلمہ مخزومی کی سرکردگی میں ڈیرھ سو آدمیوں کا دستہ خطرے کا انسداد کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ یہ لوگ قطن پہنچے تو مویشیوں کا گلہ چھوڑ کر ڈکیتیوں کی ٹولی تتر بتر ہو گئی۔ مویشی اسلامی حکومت نے ضبط کر لیے۔ اور رضا کاروں میں تقسیم کر دیے۔ بغیر کسی وقفے کے دھرم کو یک اور جانب سے خبر آئی کہ خالد بن سفیان الہذلی نے حملہ کرنے کے لیے جمعیت اکٹھی کی ہے۔ عبداللہ بن نسیب جہنی انصاری کو روانہ کیا گیا جو اس فتنہ گر کا خاتمہ کر کے اس کا سر کاٹ لائے۔ تن تنہا ایسا بہادرانہ کارنامہ انجام دینے پر حضور نے اپنا عصا بطور انعام ان کو عطا فرمایا۔

پھر دو تین ہفتوں ہی کے وقفے سے ایک بڑا حادثہ پیش آیا۔ ماہ صفر کے آغاز میں قبیلہ مہشل ہذا کے لوگ سازش کر کے مدینہ آئے اور حضور سے درخواست کی کہ ہم میں سے کچھ لوگ مسلمان ہو گئے ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کے لیے آپ اپنے معتمد بھیجیے۔ اس اہل علم کا ایک تعلیمی وفد روانہ کیا گیا۔ یہ وفد صحیح بخاری کی روایت کے بموجب ہے، سیرت نگاروں نے وفد کو سات آدمیوں پر مشتمل قرار دیا ہے، جس کے امیر امیر بن ابی المرثد تھے۔ مقام بصرہ پر یہ نو بزمیوں کا گھنٹا تھا، میں پنج کرساڑھیوں نے بجز خبیب اور زید کے باقی سب کو تہ تیغ کر دیا۔ ان دونوں کو قریش مکہ کے ہاتھ بیچ دیا جنہوں نے دونوں کو صلیب دے کر شہید کیا۔ اس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ اس واقعہ سے خوب اندازہ ہو سکتا ہے کہ جنگ اُحد کے بعد نئی لہر عناصر میں کیسی کیسی جہالتیں ابھر آتی تھیں۔ اس سانحہ نے حضور کے دل کو کس قدر صدمہ پہنچا، وہ جب کہ آپ کی قبیلہ التعداد جماعت کے متعدد قیمتی افراد تعلیمی مشن پر جاتے جاتے ہی کے عالم میں شہید ہو گئے۔ یہ نورانی ہستیاں علم کی شعاعیں پھیلا کر جن لوگوں کو کسی معاد فیض کے بغیر نئی زندگی دینا پڑتی تھیں۔

ان ظالموں نے ان سے استفادہ کیے بغیر ان کی زندگیوں کے چراغ گل کر دیئے۔ لیکن اسی مہینہ میں اس سے بڑا حادثہ بڑھ معونہ کا پیش آیا۔ ابو براء عامر بن مالک علاقہ نجد سے آکر حضور کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے اسلام کی دعوت دی۔ مگر اس نے نہ اُسے قبول کیا نہ رد۔ البتہ بڑے مخلصانہ انداز سے مشورہ دیا کہ آپ اپنے رفقاء کو نجد روانہ فرمائیں۔ امید ہے کہ لوگ اسلام کے پیغام کو قبول کریں گے۔ حضور نے نجد کے بارے میں اندیشہ ظاہر کیا۔ واقعہ رجب تو سامنے تھا ہی۔ ابو براء نے حفاظت کی ذمہ داری لی۔ چونکہ بعض سیاسی صرورتیں مقامی تھیں کہ نجد کے علاقے میں اسلامی حکومت کا اثر پھیلے۔ اس لیے حضور نے ابو براء کے قول پر اعتماد کرتے ہوئے ستر آدمیوں کی ایک جمعیت (یہ تعداد صحیح بخاری نے بیان کی ہے۔ ابن اسحاق کے ہاں چالیس مذکور ہے) جس میں اول درجے کے حفاظ، قاری اور معلم و داعی شامل تھے۔ منذر بن عمرو کی امارت میں روانہ کی۔ یہ دعوتی وفد جب بڑھ معونہ پہنچا جو ارض بنی عامر اور حرہ بنی سلیم کے درمیان واقع ہے تو وہاں سے حرام بن ملحان رسول اللہ کا خط لے کر عامر بن طفیل کی طرف روانہ ہوئے۔ اس نے خط دیکھنے سے پہلے ہی اپنے آدمی کو اشارہ کر کے انہیں قتل کر دیا۔ اس کے بعد اس نے بنی عامر میں اعلان کیا کہ ہرنیکے وفد پر حملہ کرنے کو نکلو۔ بنو عامر نے ابو براء کی ضمانت کا احترام توڑنا گوارا نہ کیا۔ تب اس مفسد نے بنی سلیم کی شاخوں یعنی رعل، ذکوان، عَصِیَّہ، اور بنی لحيان کو دعوت دی۔ یہ لوگ تیار ہو گئے۔ اور مدینہ کے دعوتی وفد کو آکر گھیر لیا۔ وفد کی طرف سے کہا گیا کہ ہم لوگ لڑنے نہیں آئے اور یہاں ہمیں ٹھہرنا بھی نہیں بلکہ آگے جانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ تعرض نہ کرو۔ لیکن وہ ظالم نہ مانے اور ۶۹ افراد تہ تیغ کر دیئے۔ سترویں رکن وفد کعب بن زید بھی لوہا ہوا ہو کر لاشوں کے ڈھیر میں شامل ہو گئے۔ لیکن زندگی باقی تھی۔ بچ کر مدینہ پہنچے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ مخالفوں سے گھری ہوئی ایک نوخیز جماعت کی اس آزمائش کا اندازہ کیجیے کہ اس کی ۶۹ قابل شخصیتیں نہایت بے رحمی سے یکبارگی شہید ہو جاتی ہیں۔ حضور کا قلب حساس اس واقعہ سے بے حد دکھا۔ آپ نے دُکھے ہوئے دل کے ساتھ ایک مہینہ تک نماز فجر میں اپنے معلمین کے قاتلوں کے حق میں بددعا کی۔ اس بددعا کا اصطلاحی نام قنوت نازلہ ہے۔

ان ظالموں کے ردیہ کے مقابلہ میں محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل دیکھیے کہ عمرو بن امیہ دو احد بچ کر آنے والے داعی، نے راستہ میں دو آدمیوں کو سوتے ہوئے پایا اور غلطی سے سمجھے کہ یہ قاتلوں کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے دونوں کو قتل کر دیا۔ دراصل یہ لوگ حلیف قبیلہ کے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا خون بہا اور انہیں اس ظلم انگیز راج کے مقابلہ میں حضور اسی نظام عدل کے لیے سارے جتن کر رہے تھے۔

ان بیرونی حالات کی اصلاح بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ مدینہ داخلی طور پر مستحکم رہے۔ مگر یہاں شرانگیز عناصر موجود تھے۔ اور اپنی دوات، زمینوں اور قلعہ بندیوں کے بل پر خاصاً دم خم رکھتے تھے۔ اور اسلامی ریاست کے عین قلب میں بیٹھ کر انتہائی غدارانہ سازشیں کرتے اور مسلم جماعت کے ہر اقدام میں رخنہ اندازی کرتے تھے۔ خصوصاً یہودی قبائل و حدت مدینہ کے معاہدہ میں شریک ہونے کے باوجود آئے دن باغیانہ حرکات کرتے تھے۔ ان میں سے بنو نضیر کا گڑھ بڑا مضبوط تھا اور وہ عناد اور سرکشی کی راہ پر سرپٹ بڑھے جا رہے تھے۔ انہوں نے اُحد اور واقعہ رجب اور بدر معونہ کے سانحہ کے بعد نازک ترین ہنگامی حالت میں حضورؐ کے قتل کے لیے کھلم کھلا اقدام کیا جس کا ہم ذکر پہلے کر چکے ہیں، پچھلی حرکات کے بعد یہ کھلم کھلا اقدام اس امر کے لیے کافی بلکہ ضروری تھا کہ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کن کارروائی کی جائے حضورؐ نے جنگ چھیڑنے اور کوئی جانی نقصان پہنچانے سے بچنا چاہا۔ اس لیے فقط سلب شہریت کا نوٹس دیا کہ وہ دس روز کے اندر اندر پُر امن طریق سے حدود مدینہ سے نکل جائیں ورنہ پھر ان کے ساتھ دشمن کا سا معاملہ کیا جائے گا۔ عبداللہ بن ابی نے بھاری مددینے کا وعدہ کر کے انہیں حضورؐ کے غلاف لڑنے پر اکسایا بنو نضیر اس کے بھترے میں آگئے۔ اور اسلامی ریاست کو انہوں نے صاف صاف چیلنج کر دیا کہ نوٹس کی ہم تعمیل نہیں کرتے۔ جو چاہو کرو۔ ربیع الاول ۳ھ میں حضورؐ اسلامی فوج کو لے کر نکلے اور بنو نضیر کو محاصرہ میں لے لیا۔ کوئی بھی ان کی مدد کو نہ آیا۔ لہذا بے بس ہو کر انہوں نے بستی خالی کر دی۔ حضورؐ کی کریمانہ شان تھی کہ نہ صرف جانیں بلکہ اونٹوں پر اپنے قیمتی اموال بھی وہ لوگ لاد کر لے گئے۔ کھچاؤ کے اس انتہائی خونخوار ماحول میں بھی بنو نضیر کے اندر سے دو سعیدرو میں ایسی نکلیں جنہوں نے اپنے قبیلے کی نامعقولیت کے ساتھ ساتھ حضورؐ کی دعوتِ حق کے نور کو پہچانا۔ اور حلقہ اسلامی میں شریک کی۔ یہ تھے یامین بن عمیر اور ابوسعید بن وہب۔

اس موقع پر مسلم فوج کو چند درخت کاٹنے پڑے اور یہ کوئی اہم بات نہ تھی، لیکن مغربی نکتہ طرازوں نے اس میں سے بھی پروپیگنڈا کا مواد نکال لیا۔ یہ بالکل ایسا ہی ناگزیر اقدام تھا جیسا آج بھی کسی فوج کو راستہ بنانے، دشمن کی کمین گاموں کو ختم کرنے اور دوسری ضروریات کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ پولیس کو بھی مجرموں

سے اسلامی تحریک اپنے مزاج کے اعتبار سے جنگ پسند نہیں۔ علاوہ ازیں معاملہ دنیا کے ایک مستقل مذہبی گروہ سے تعلق رکھنے والے افراد کا تھا۔ اور تحریک اسلامی کو بہر حال اس گروہ کے دائرے میں کام کرنا تھا۔ ورنہ ان کے جرائم ایسے تھے کہ انہیں زندہ رہنے کا بھی حق نہ رہا تھا۔

کی گرفتاری کے لیے بسا اوقات اس طرح کی کارروائیاں عمل میں لانی پڑتی ہیں۔ عمارتیں گرا دی جاتی ہیں کھیتوں اور باغوں میں حسب ضرورت تصرف کیا جاتا ہے۔

خطرناک ترین حالات کے باوجود شریکیند عناصر کی سرکوبی کر کے حضور نے نہ صرف اپنی مشکلات گھٹالیں بلکہ آس پاس کے لوگوں پر یہ اثر بھی بحال کر لیا کہ مسلم حکومت میں پورا پورا دم خم موجود ہے۔ ابوسفیان میدان احد کے اعلان کے مطابق دو ہزار پیادوں اور ۵۰ سواروں پر مشتمل ایک مضبوط لشکر لے کر حملہ کے لیے نکلا۔ حضور بھی اطلاع پاتے ہی پندرہ سو پیادوں اور دس سواروں کے ساتھ بدر پہنچے۔ آٹھ روز وہیں کپ ڈال کر قریش کی فوج کا انتظار کیا۔ مگر ابوسفیان مکہ سے ایک منزل دور ہی پر۔ بمقام ظہران یا عسفان — آکر واپس چلا گیا کہ خشک سالی کی وجہ سے یہ سال جنگ کے لیے مناسب نہیں آئے۔ آخر حضور بھی ابوسفیان کی واپسی کی اطلاع پا کر مدینہ تشریف لے آئے۔

محرم ۳۲ھ (بعض روایات کی رو سے جمادی الاولیٰ) میں بنی غطفان کے ذیلی قبائل بنی محارب اور بنی ثعلبہ کی جنگی تیاریوں کی اطلاع آئی حضور چار سو (بعض روایات کے مطابق سات سو) سواروں کی جمعیت لے کے نکلے۔ مقابلہ کے لیے ایک جمعیت واقعی موجود تھی۔ لیکن وہ عملاً معرکہ آرا نہ ہو سکی۔ اسی مقام کا واقعہ ہے کہ غورث نامی مشرک اپنی قوم کے سامنے یہ عزم بیان کر کے نکلا کہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر کے رہوں گا۔ وہ آیا تو حضور ایک درخت کے سائے میں تنہا استراحت فرما تھے، آپ کی تلوار درخت سے لٹک رہی تھی۔ غورث نے وہی تلوار تان کر لٹکارا کہ بتاؤ اب کون تمہیں بچا سکتا ہے۔ حضور نے بے خوف ہو کر کہا کہ خدا بچانے والا ہے۔“

دومتہ الجندل تجارتی کارروائیوں کا جنکشن بھی تھا اور یہاں عبسائیوں اور یہودیوں کے مذہبی مبلغ اور سیاسی گماشتے بھی کام کرتے تھے۔ پھر بنو نضیر کے خیبر وغیرہ میں جانے کی وجہ سے ان کی مدینہ کے خلاف ریشہ دوانیوں کا بھی یہ اڈا بننے لگا تھا۔ خصوصاً یہ واقعہ بڑی سیاسی اہمیت رکھتا ہے کہ قریش مکہ اور یہود خیبر کی ساز باز کے زیر اثر نصرانی سردار اکیدر نے مدینہ کے لیے غدے لانے والے کارروائیوں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ حضور تک اطلاع پہنچی کہ دومتہ الجندل میں دشمن اپنی طاقت جمع کر کے مدینہ پر حملہ آور ہوتا چاہتا ہے۔ ربیع الاول ۳ھ میں آپ نے ایک ہزار کی جمعیت لے کر فوراً اقدام کیا۔ دومتہ الجندل میں جب مسلم فوج کی روانگی کی اطلاع پہنچی تو دشمن بکھر گئے۔ حضور نے پیش قدمی کی ضرورت نہ سمجھی اور راستہ میں حلیفانہ تعلقات بڑھانے کا کام کیا۔ چنانچہ عینیہ بن حصیب سے معاہدہ ہوا۔ بعد میں سلاہ حضرت عبدالرحمن بن عوف ایک دعوتی و سیاسی ہم لے کے گئے۔ اور قبیلہ کلب کی فضا مدینہ کے حق میں سازگار ہونے

لگی۔ اس سے بعد بھی تبوک کی مہم کے سلسلے میں (۹۰ھ) میں اس علاقے پر پورا پورا غلبہ ہو گیا۔  
 اب بنو مصطلق کے بارے میں خبر آئی کہ وہ حملہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ بڑیہ اسلمی کو بھیج کر تختیقات  
 کرائی گئی۔ خبر صبح نکلے۔ حضور نے ۳ شعبان ۹۰ھ کو فوجی اقدام کیا۔ نہایت تیز رفتاری سے مریسج دیا  
 کا چشمہ) جا پہنچے۔ حارث بن ابی ضرار سردار بنی مصطلق آمادہ جنگ تھا۔ حضور کے یکایک جا پہنچنے سے اس  
 کی سپاہ بکھر گئی۔ اور صرف اسی کے قبیلہ کے لوگ باقی رہے۔ پہلے ہی ہلہ میں حارث کے جتنے کو پوری طرح  
 شکست ہو گئی۔ بکثرت مولیشی مال غنیمت میں آئے اور ساری تعداد جنگی قبیری بن گئی۔ گرفتار شدگان میں  
 جویریہ بھی تھیں۔ انہوں نے حضور کے سامنے کلمہ حق پکارا اور کہا کہ میں اسلام لا کر حاضر ہوئی ہوں۔ حضور نے  
 ان کی رضامندی سے انہیں اپنے نکاح میں لے لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ مسلمانوں نے تمام قبیلوں کو  
 یہ کہہ کر آزاد کر دیا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کو ہم اب اسیر نہیں رکھ سکتے۔  
 یہی وہ موقع ہے کہ اسلام کی فتح کو دیکھ کر منافقین جل اٹھے اور پہلے انہوں نے پانی پر جھگڑا  
 کھڑا کر کے ہاجرین و انصار کو لڑانا چاہا۔ اور واپسی میں سارے راستے ہاجرین کو مدینہ سے نکلوانے کے  
 لیے انصار کو اشتعال دلانے میں لگے۔ بے اسی سفر میں حضرت عائشہ کے قافلہ سے بچھڑ جانے کی بنا پر  
 ان کو انک کا طوفان اٹھانے کا موقع ملا۔ یہ سارا حال ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔

جنگِ اُحد کے بعد اور معرکہ خندق سے پہلے یہ مختلف چھوٹی چھوٹی کارروائیاں تھیں جو اسلامی  
 ریاست کو اپنے تحفظ، لائینڈ آرڈر کی بحالی اور دستوری نظام کے بچاؤ کے لیے کرنی پڑیں۔ ان میں سے  
 معلمین کے وفود کے واقعات کو چھوڑ کر بقیہ صورتوں میں یا تو محض سرحد پر فوجی طاقت بڑھانی یا ایک  
 نوع کی پولیس کارروائی کی گئی۔ خالص جنگی نوعیت کی جھڑپیں بہت کم تھیں اور وہ بھی بالکل چھوٹی چھوٹی۔  
 ان کو خواہ مخواہ اہمیت دے کر تفصیل سے بیان کیا جائے تو پڑھنے والے کو بڑا مغالطہ ہوتا ہے۔ اصل  
 صورتِ حالات یہ تھی کہ عرب قبائل کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں منقسم تھا۔ اور ہر قبیلہ بدلتے بدلتے  
 شاخیں اپنی اپنی جگہ مستقل تنظیمی و سیاسی یونٹ تھیں۔ کبھی ایک ٹولی مخالفت کے لیے سر اٹھاتی۔ کبھی  
 دوسری حملے یا ڈاکے کے لیے تیار ہو جاتی۔ ایک شرارت پر قابو پایا جاتا تو کسی اور طرف سے فتنہ اٹھ  
 کھڑا ہوتا۔ ایسی حالت میں جب بھی کبھی ایک مرکزی نظم قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تو بکھرے ہوئے  
 مختلف قبیلوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی جھڑپیں بار بار لیے بغیر کبھی کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا۔

تیسرا بڑا معرکہ — خندق :

جنگِ اُحد میں اگرچہ قریش کو ایک اتفاقی موقع مسلمانوں کو زور دکھانے کا مل گیا تھا۔ اور بظاہر انہوں



نے بدر کے زخموں کا انتقام لے لیا تھا۔ لیکن وہ خوب سمجھتے تھے کہ وہ اُحد سے فاتح بن کر نہیں بوٹے اور یہ بھی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ اپنی موجودہ طاقت کے ساتھ مدینہ کی مسلم ریاست کو زک دینے کے قابل نہیں ہیں۔ وہ ایک سال کے وقفے میں مزید تیاری اور فراہمی سپاہ کے بعد لڑنے کا تہیہ لے کر اُحد سے رخصت ہوئے تھے۔ اور اس ارادے کا اعلان بھی ابوسفیان نے کر دیا تھا۔ مگر مکہ سے فوج لے کر نکلنے کے بعد وہ حالات کی ناسازگاری کے باعث واپس لوٹ گیا۔ قریش اور مسلم ریاست میں ایک بڑا بھاری فرق تھا جاہلیت کی طاقت اپنی روح کے اعتبار سے جاہد اور مصنحل بھی تھی اور کسی طرح کے نشوونما کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ اس کا کچھ نہ کچھ جز ہر آن کٹ کر مدینہ کے پلڑے میں گر رہا تھا۔ مدینہ کی مسلم طاقت ایک اصولی۔ نظریاتی۔ دعوتی اور عوامی طاقت تھی۔ لہذا وہ متحرک تھی۔ فعال تھی۔ سرگرم تھی۔ اور اس میں نشوونما کی صلاحیت تھی۔ اس فرق کی وجہ سے وقت کا گزرنا مدینہ کے حق میں مفید پڑتا تھا۔ بلحاظ تعداد افراد، بلحاظ تربیت اخلاق، بلحاظ معاہدہ تعلقات، بلحاظ دفاعی طاقت اور بلحاظ رقبہ کی وسعت کے مدینہ برابر نشوونما پار رہا تھا۔ اسلامی ریاست قریش کی تجارتی شاہراہیں عملاً بند کرنے میں کامیاب تھی۔ مکہ معاشی بحران کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ اسلامی جماعت اُحد کے بعد کے دو سالوں میں سخت پھیدگیوں سے دوچار ہونے کے باوجود خاصا ارتقاء کر چکی تھی۔ اور قریش نے جس معرکہ کو ایک سال کے لیے مؤخر کیا تھا۔ وہ ایک سال کی دیر ہو جانے کی وجہ سے اب ان سے بہت زیادہ جارحانہ قوت مانگتا تھا۔ تنہا قریش شاید اتنی مطلوبہ قوت آسانی سے نہ لا سکتے۔ لیکن مسلم ریاست کے مختلف دشمنوں نے حالات کی مجبوری سے باہمی اتحاد کی راہیں نکالیں خیبر اور وادی القرئی میں جا بسنے والے جلاوطن شدہ یہود نے خاصی سرگرمی سے مدینہ پر حملہ کرانے کے لیے ٹنگ و تازگی۔ ان کی شرانگیزی کا آغاز مدینہ کے لیے غلہ لانے والے کاروانوں کے لیے رکاوٹیں پیدا کرنے سے ہوا۔ پھر جب اُحد کے حالات ان ٹنگ پہنچے، اور ابوسفیان کے مزید ارادہ جنگ کی اطلاع ان کی ملی اور ان کی جسارتیں برہمیں تو انہوں نے بنی عطفان کو خیبر کی کھجوروں کی سال بھر کی پیداوار دے کر اور آئندہ کے لیے بھی ایک مقررہ حصہ ادا کرنے کا پیمانہ باندھ کر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔ اتنا کام کر چکنے کے بعد انہوں نے اپنا ایک وفد مکہ بھیجا۔ جس میں سلام بن ابی الحقیق۔ سلام بن مشکم، حنی بن اخطب، کنانہ بن الربیع (بنو نضیر) اور ہوزہ بن قیس، ابو عمارہ (بنو اہل) جیسے اکابر شامل تھے۔ انہوں نے قریش کو یقین دلایا کہ تم حملہ کرو اور جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پوری طرح استیصال نہ ہو جائے، ہم ساتھ نہیں چھوڑیں گے یہ وفد یہاں سے کامیاب ہو کر لوٹا تو بنو عطفان کے علاوہ بعض دوسرے قبائل میں گھوما۔ قریش نے بھی اپنے حامیوں اور حلیفوں میں تحریک کی اور اہل ایش کو امداد کے لیے پکارا۔ گویا اب کی بار جاہلیت نے پورے عرب

ہیں سے اپنی حمایتی قوت نچوڑی۔ اور غالب کے شعر کا سماں پیدا کر دیا کہ :

پھر پُرسشِ جِراحتِ دِل کو چلا ہے عشق

سماںِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

ابوسفیان کی کمان میں ۴ ہزار سپاہ روانہ ہوئی۔ جس کے ساتھ تین سو گھوڑے اور ایک ہزار اونٹ تھے۔ یہ لشکر جب مرالظہران کے مقام پر پہنچا تو بنی سلیم بھی جو قریش سے روابط رکھتے تھے آئے۔ ادھر نواسدہ فزارہ۔ اشجع اود بنومرہ۔ بھی اپنے علاقوں سے نکلے۔ بنی غطفان نے عینیبہ بن حصن کی سرکردگی میں مارچ کیا۔ مجموعی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض نے ۷۶ ہزار، بعض نے ۱۰ ہزار اور بعض نے ۲۴ ہزار تک کا اندازہ دیا ہے۔ ترجیح کے قابل غالباً درمیانی روایت ہے جسے اکثر سیرت نگاروں نے لیا ہے۔

حضور کو ان تیاریوں کی اطلاع دومتہ الجندل کے سفر ہی میں مل گئی تھی اور آپ اسی کے اندیشے سے جلدی واپس بھی آگئے تھے۔ مشاورت منعقد ہوئی۔ تجویز مدینہ ہی میں رہ کر مدافعت کرنے کی ہوئی اور شہر کی حفاظت کے لیے حضرت سلمان فارسی کا یہ مشورہ قبول کیا گیا کہ ایران کے طریقے پر خندق کھودی جائے اس میں جہاں افادیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ اس طریق دفاع کا نیا پن عرب حملہ آوروں کے لیے مشکلات کا باعث ہو سکتا تھا وہاں زیادہ بڑے مفید پہلو یہ تھے کہ سخت جسمانی محنت سے وہ کام ہو سکتا تھا جو کسی مضبوط اور بلند فصیل سے ہوتا۔ نیز اس طریقے سے کم تعداد کے ساتھ کثیر التعداد دشمن کو روکا جا سکتا تھا۔ اور جانی نقصان بھی کم سے کم حد تک متوقع تھا۔ حضور گھوڑے پر سوار ہو کر خود خندق کا نقشہ متعین کرنے لگے چونکہ شہر تین اطراف سے مکانات اور احاطہ بند باغات کے ذریعے گھرا ہوا تھا۔ سدا خندق کی صورت شمالی تینوں حصے کی طرف تھی۔ طے پایا کہ حرم شرقی اور حرم غربی اور سے کے میدان کو ممانی ہوئی خندق نیم دائرے کی صورت میں جبل سلع کے مغربی کنارے تک پہنچائی جائے۔ اس حصے کی کھدائی تو ذیجی انتظام سے کرائی گئی۔ لیکن بعض قبائل نے بطور خود اپنے اپنے مسکن کی حفاظت کے لیے اسے اور آگے بڑھایا اور جنوب میں عبدگاہ (مسجد غمامہ یا مصلی) کے مغرب سے گزار کر قبائلی جانب دو تک طویل کر دیا۔ خندق کی کھدائی کے لیے وہی تین ہزار مسلم رضا کار مزدور بنے جنہیں پیہبہ ذمہ داری دلائی تھی۔ اس دس آدمیوں کی ٹوبیاں بنائی گئیں اور ہر ٹولی کو ۴۰۰ ذراع (۱ ذراع ۱۰۰ گز) مقرر کیا گیا۔ اندازاً اس کی چوڑائی ۱۰ گز رکھی گئی ہوگی۔ کیونکہ دشمن کے بعض سوار گھوڑوں کو اس پر سے کداتے ہوئے اندر گر کر ہلاک ہو گئے تھے۔ یہی طرح اس کا تخمینہ عمق ۵ گز سے کم نہیں ہوگا۔ مجموعی طور پر اس کا طول ۳۱۰ میل تھا۔ یہ واقعہ حیرت انگیز ہے کہ تین ہفتے میں اتنا بڑا کام مسلم رضا کاروں نے مکمل کر لیا۔ تقریباً ۳ لاکھ آٹھ ہزار مکعب گز مٹی کی کھدائی

اور اسے منتقل کرنا کوئی کھیل نہ تھا، فی کس ایک صد سے زیادہ مکعب گز مٹی آتی ہے۔ پھر بمحاذ سامان کے حالت یہ تھی کہ کھدائی کے کچھ آلات بنو قریظہ سے معاہدہ کے تحت مستعار لیے گئے تھے۔ اور لوگ ریاں نہ ہونے کے سبب عام مسلمان تو کیا، ابو بکر و عمرؓ جیسی ہستیاں چادرول اور داموں میں بھر بھر کے مٹی اٹھاتی تھیں۔ خندق کے ساتھ جا بجا چوکیاں بنا دی گئیں جہاں سے اس کے ہر حصے کی نگرانی کی جاسکے۔

ادھر خندق کی تکمیل ہوئی ادھر شوال ۳۰ھ میں اسلامی ریاست کے متحدہ دشمن ٹڈی دل فرجیں لیے آہنچہ قریش، کنانہ اور احابش (یا احباش) نے وادی عقیق کے قریب بئر رومہ پر پڑاؤ ڈالا غطفان اور بنو اسد مشرق میں وادی النعمان کے پاس ذنب نعیمی نامی مقام سے جبل احد تک پھیل کر خمیہ زن ہوئے۔ ادھر مسلم فوج نے جبل سلع کو پشت پر لے کر مرکزی کیمپ قائم کیا۔ یہاں حضورؐ کا کپ جس موقع پر نصب ہوا۔ اس کی یادگار کے طور پر آج مسجد فتح موجود ہے۔

انقلاب دشمن اگرچہ بڑی تعداد میں محاذ آرا تھے۔ مگر یہ خندق ان کے لیے بالکل نیا مسئلہ تھی۔ اس طرح کی مزاحمت کا سامنا پہلے انہیں کبھی نہ ہوا تھا۔ اور اس سلسلے کی تدابیر سے وہ ناواقف تھے۔ ان کے گھوڑے اور اونٹ خندق کے بیرونی کنارے تک ہی کار آمد ہوتے۔ اکا دکا گھوڑ سواروں نے جوش میں آکر خندق پار کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس کے اندر گر کر ختم ہو گئے۔ مختلف مواقع سے وہ رخ کرتے مگر مسلم دستے غفلت سے کام لیے بغیر سامنے موجود ہوتے۔ اور تیر انداز دشمن کا منہ پھیر دیتے۔ تلوازیں اور نیزے بالکل سیکڑے تھے۔ بس دونوں طرف سے کچھ نہ کچھ تیر اندازی ہر روز ہو جاتی۔ کئی روز کے محاصرے سے تنگ آ کر ایک دن دشمن نے بڑا زور دکھایا۔ کبھی یہاں سے حملہ کیا، کبھی وہاں سے مگر کچھ پیش نہ جاتی۔ آخر کار قریش کا شہرت یافتہ مہم ہر سوار عمر بن عبدود جوش میں بچھ کر نکلا اور اس نے عکرمہ بن ابوہل، ہیرہ بن ابی وہب اور ضرار بن الخطاب کو اکسایا اور پھر بنی کنانہ کے کچھ لوگوں کو ساتھ لیا۔ اور ایک مناسب مقام تک کر گھوڑا گدا کر پار ہو گیا دو چار ساتھی بھی اس کے پیچھے پیچھے خندق پار کر گئے۔ بقیہ رگ کنارے پر کھڑے رہے۔ اندر پہنچ کر اس نے لاکارہ حضرت علیؓ مقابلہ پر آئے اور ایک زخم کھانے کے بعد اس کا کام تمام کر دیا۔ یہ ایک دن مسلم فوج کے لیے اتنا سخت تھا کہ مختلف اطراف سے دشمن ٹولیوں کی مدافعت کرنے میں چار نمازیں قضا ہوئیں۔ محاصرہ کی طوالت مسلمانوں کے لیے بھی باعث اضطراب تھی۔ مگر حریف بھی اپنی جگہ پریشان تھا۔ صلاح مشورے کے بعد ایک بھر پور حملہ کرنے کے لیے یہ طے پایا، کہ بنو قریظہ کو حضورؐ کے خلافت عہد شکنی پر آمادہ کیا جائے۔ اور وہ اندر سے حملہ آور ہوں۔ ابوسفیان کے کہنے پر حنی بن اخطب نے یہ مشن اپنے ذمے لیا۔ وہ بنی قریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس پہنچا۔ اور مدعا بیان کیا۔ اس نے پہلے تو انکار کیا۔ کہ

ہیں نے محمد کو ہمیشہ صادق اور خدا پایا ہے، ان سے عہد شکنی کرنا مروت کے خلاف ہے۔ مگر ابی خطاب نے  
یہ سب بات دہرائی کہ ہم لوگ فوجوں کا سیلاب لے کر آئے ہیں۔ تمام عرب ہمارے ساتھ آئے آیا  
ہے۔ اور یہ ساری طاقت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خون کی پیاسی ہے یہ موقع لاہڑ سے دینے کا نہیں۔ اس  
سب اسلام کے خاتمہ کا وقت آگیا ہے۔ غرض فن ترغیب کا جادو چل گیا۔ اس صورتِ حالات کی شہرہ لمانوں  
تک پہنچ گئی۔ حضور نے تحقیق کرائی۔ بات صحیح نکلی۔ صحابہ کے وفد نے جب آکر افواہ کی تصدیق کی۔ تو حضور  
نے زبان سے بس اتنا کلمہ نکلا: اللہ اکبر! حسبنا اللہ ونعم الوکیل

غزویٰ کی وسعت، محاصرہ کی طوالت، تعداد کی قلت، بے سرو سامانی کی انتہا۔ فائقہ کشتی کا عالم، اس  
تعمیر کا شہرہ، دریاں، منافقین کا غارت گھر گھر کر (بیوتنا عورت) کنارہ کش ہوتے جانا۔ اور پھر اس  
دریہ کی جان باری کہ نمازیں تصانیب ہو گئیں۔ یہ کچھ معمولی۔ وجہ کا استخفاف نہ تھا۔ اس پر جب مدینہ کے لوگوں میں  
شہادت کی بارودی سرنگ بچھری۔ اور جو قافلہ اونٹوں کے پاؤں پہ اجڑے زخمیوں کی طرف سے  
نکل پھرا۔ تو پتے کا مسودہ سر پر آیا۔ تو آج ہم اندازہ نہیں کر سکتے کہ تین سو سالوں کے عہدِ نبوت کی  
تاریخوں کے تحت اب تک صدیوں کا بیان ہے کہ اس اطلاع کے ملنے کے بعد بڑی تشویش یہ تھی کہ ہمیں ہمارے  
بچھے ہوئے اور بچوں پر حملہ نہ ہو جائے۔ اور یہی تشویش کے مارے میں بار بار کوہِ سلع پر چڑھ کر دیکھتا تھا کہ  
کئی واقعہ ہو تو نہیں گیا۔ اپنے گھروں کو پڑ سکون دیکھتا تو خدا کا شکر ادا کرتا۔ حضور نے تین سو افراد تک دست  
بندی حفاظت کے لیے روانہ فرما دیا۔ اس وقت کا نقشہ قرآن کریم نے یوں کھینچا ہے

باد کرو جس وقت کہ دشمن با لاتی جانب سے بھی اور زیریں جانب سے بھی تمہاری  
طرف بڑھے اور جب کہ آنکھیں پتھر اگئیں اور کلبے مومنوں کو آگئے اور اللہ کے بارے  
تمہارے دلوں میں طرح طرح کے گمان آنے لگے (احزاب - ۱۰)

حق یہ ہے کہ اس موقع پر مسلم طاقت کا جیسا کڑا امتحان ہوا۔ ایسا پہلے کے دونوں بڑے محروکوں میں  
نہ ہوا تھا۔ احد میں رنج و غم کے پہاڑ ٹوٹے تھے۔ مگر جو کچھ ہوا ایک دن میں ہو گیا۔ اب بار تو لمبی منہاں تھی  
اور مقابل میں صرف قریش نہ تھے اور بہت سارے عناصر تھے۔ مسلمانوں کے کرب و اضطراب کو دیکھ کر حضور  
نے یہ تدبیر نکالی کہ دشمن کی کسی نہ کسی طاقت کو منساحاً تدریج سے محاذ سے الگ کرایا جائے۔ آپ نے بنی  
نظفان (جن کو مابی مفاد بہت عزیز تھا) کے دوسرے داروں عیینہ بن حصن اور ہارث بن عوف کو بلوایا اور  
بات چیت کی۔ مدینہ کی تہائی پیداوار پر سمجھوتہ ہونے کا امکان نکلا اور معاہدہ کا مسودہ تیار کرایا گیا۔ لیکن  
دستخط فرمانے سے قبل حضور نے سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ (اوس اور خزرج کے سردار) سے مشورہ لینا ضروری

سمجھا۔ آپ نے بات واضح کی کہ آپ لوگ اتنے کثیر دشمنوں میں گھر گئے ہیں کہ ان سے عمدہ برآینا آسان نہیں پس دشمنوں کا زور توڑنے کے لیے یہی ایک راستہ ہے۔ ان حضرات کی حمیت حرکت میں ہو گئی۔ انہوں نے عرض کیا کہ جب ہم کفر کی حالت میں تھے اس وقت تو یہ قبائل ہمارا مال اس طرح نزلے سکے۔ اور آج جب کہ ہم نور اسلام سے مالا مال ہو کر پہلے سے زیادہ قوی ہیں تو اب ہم اپنے ہاتھوں سے انہیں اپنے مال سونپیں؟ خدا کی قسم! ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہمیں ایسے معاہدہ کی ضرورت نہیں۔ حضور یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئے۔ وہ تحریر آپ نے حضرت معاذ کو دی اور انہوں نے چاک کر دی۔

لیکن صورت حالات کی کٹھنائی اپنی جگہ پر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یکا یک ایک صورت حل نکالی۔ کتنا عجیب واقعہ ہے اور تحریک اسلامی کی عقلی و اخلاقی صداقت کا ثبوت کہ اس قیامت خیز لمحہ میں نعیم بن مسعود آگے بڑھتے ہیں اور حضور کی خدمت میں آکر عرض کرتے ہیں۔ کہ "اے اللہ کے رسول! میں مسلمان ہو گیا ہوں" اور پھر عقیدہ حق کا اعلان کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے پیش کش کی کہ ابھی تک چونکہ دشمنوں کو میرا اسلام لانا معلوم نہیں۔ لہذا اذن ہو تو میں قریش اور بنو قریظہ کا اتحاد توڑنے کے لیے کچھ کام کروں۔ حضور نے اجازت دی۔ نعیم بنو قریظہ کے پاس گئے ان سے ابتدائی بات چیت کے بعد کہا کہ اگر فتح ہو تو خیر لیکن شکست کی صورت میں قریش اور بنو غطفان سمی چلے جائیں گے اور تم لوگ تنہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دپر رہ جاؤ گے۔ پس تم احتیاطاً قریش اور بنو غطفان سے کہو کہ وہ کچھ آدمی تمہارے پاس بطور رہن رکھیں۔ یہ شرط پوری ہو تو ساتھ دینا ورنہ کندہ کر لینا۔ پھر وہ قریش کے پاس پہنچے ان سے کہا کہ مجھے کچھ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے تمہیں مطلع کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ بنو قریظہ نے اب موقف بدل لیا ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ آپ لوگوں سے بطور یہ خیال کچھ اشخاص کا مطالبہ کریں گے۔ چنانچہ جب قریش نے بنو قریظہ کو پیغام بھیجا کہ ہم محاصرہ کی طوالت سے تنگ آگئے ہیں۔ لہذا اب تم ساتھ دو تو ہلہ بول دیا جائے بنو قریظہ نے ان سے اپنے آدمی رہن رکھنے کا مطالبہ کیا۔ قریش کو اب نعیم کی بات کا یقین آ گیا۔ اور وہ بنو قریظہ کے تعاون سے یایوس ہو گئے۔ اس تدبیر سے حالات کا نقشہ معاً بدل گیا۔

انقلاب دشمن عناصر پھوٹ پڑنے کی وجہ سے اب محاصرہ کی ساری کھکیڑ کی تھکن محسوس کرنے لگے۔ گھروں سے نکلے ہوئے ہینہ بھر ہونے کو آیا۔ کاموں کا نقصان ہوا۔ مصارف بے تحاشا اٹھانے پڑے۔ اور نتیجہ کچھ نہیں۔ ادھر اتنی بڑی فوج کے افراد اور جانوروں کے لیے رسد کا مسئلہ پیچیدگی اختیار کرنے لگا۔ قریش کی رسد کی ایک بھاری قسط راستے ہی میں ایک مسلم فوجی دستے کے ہاتھ آگئی۔ پھر موسم ناسازگار ہو گیا۔ اور سردی ناقابل برداشت حد تک بڑھ گئی۔ ایسے تاریخی مواقع پر ایسا اوقات طبعی عناصر

فیصلہ کن عمل کرتے ہیں۔ اور مثبت ایک اشارے سے معاملات کو کسی شکل میں طے کرادیتی ہے۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ طبعی عوامل بھی نازک لمحوں میں اپنا وزن حق کی قوت کے پڑے میں ڈالا کرتے ہیں۔ ایک رات اچانک سخت طوفانی آندھی چلی جس نے حملہ آوروں کے خیمے اکھاڑ دیئے، طنائیں توڑ ڈالیں، چوڑھے بجھا دیے۔ ہانڈیاں اور برتن الٹ دیئے۔ جانوروں کو وحشت زدہ کر دیا۔ اور فی الجملہ جنگی حوصلوں پر اوس پر گئی۔ بلکہ ایک جو اس باختگی کا عالم طاری ہو گیا۔ اسی غیبی امداد کا احسان اللہ تعالیٰ نے بیان کیا کہ۔

”اپنے حق میں اللہ کی اس نعمت کا تصور کرو جب کہ تمہارے خیاف لشکر جمع ہوئے اور ہم نے ان کے خلاف آندھی کی مصیبت بھیجی اور وہ غیبی لشکر بھیجے کہ جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے“ (احزاب - ۹)

سرطرف گھبراہٹ اور باہوسی پھیل گئی جس کی بنا پر ابوسفین نے فیصلہ کیا کہ اب ہم مزید نہیں بھڑکتے۔ چنانچہ ٹڈی دل فوجیں یکایک کوچ کر گئیں۔ مدینہ کا مطاح ممانہ تھا جنہوں نے خوب دبا دیا کہ اب قریش کی چڑھائیاں ختم ہو گئیں، یعنی اپنی قوت کو تو وہ بدر و احد میں آزمائے گئے تھے۔ اور جسکی بارگاہوں نے عرب بھر سے مخالفین اسلام کو مشکلوں سے سمیٹ کر دھارا بولا تھا سو وہ بھی ناکام ہو گئے۔ اب جب کہ تیز قوت کو بھی دوبارہ مجتمع کرنا ممکن نہیں تو قریش کس طرح آئندہ کوئی معرکہ لڑ سکتے ہیں۔ جب کہ بدر کا معرکہ اس سے زیادہ قوت طلب کرے گا۔

اس معرکہ میں دو طرفہ جانی نقصان برائے نام ہوا۔ اور سادہ فوج کا تو اور بھی کہ۔ کل ۶ آدمی شہید ہوئے۔ لیکن ان میں سعد بن معاذ جیسی عظیم شخصیت بھی شامل تھی۔ ان کو تیر کا زخم آیا۔ اور چند روز بعد ان کا انتقال ہوا۔

## غزوہ خندق کے اسم نکات :

اس غزوہ کے سبق آموز واقعات پر ایک نگاہ ڈال لیجیے۔

۱۔ سب سے بڑھ کر ایمان پرورد چیز مسلم دنیا کاروں کا و الہانہ طرز عمل ہے۔ جنوں نے نہ صرف اتنے خوف ناک حالات میں۔ حیثیت مجموعی صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ خندق کی کھدائی کا کام اس طرز کیا جیسے کہ جنات کی کوئی فوج زمین کا تختہ الٹ دے۔ یہ لوگ نغمے گا گا کر اور شعر پڑھ کر حقوق و حقوق کا کام کرتے دکھائی دیتے ہیں کوئی ٹولی الپتی ہے۔

نحن الذین بالیعوا محمدًا علی الجهاد ما بغینا ابداً

ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے تاجین حیات جہاد کرنے کا عہد محمد کے ہاتھ پر باندھا ہے۔ کسی دوسرے گروہ کی صدا کو بختی ہے :-

اِنَّ الْاَوْلٰىیَ قَدْ اَبْعَا عَلَیْنَا . اِذَا ارَادَ وَاغْتَنَّةً اَبَیْنَا

دشمن ہم پر چڑھ آئے ہیں، یہ لوگ ہمیں راہِ حق سے روکتے ہیں اور ہمیں رکنے سے سخت انکار ہے پھر "ابینا ابینا" کی جب تکرار ہوتی تو فضا میں جذبہ عزیمت کی لہریں اٹھ جاتیں۔ اس والہانہ جذبہ کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کا حاصلِ عمر خطرے میں تھا۔ اور اسلامی تحریک اور دین کی ریاست ان کے لیے ایک محبوب کی حیثیت رکھتی تھی کہ جس کے قدموں پر وہ ساری متاعِ حیات نچھاور کر دینا سعادت سمجھتے تھے۔ انسانی فلاح کا مقدس مشن ان کے لیے ایک جنونِ آموزِ دلبر تھا۔ لیکن اس کی دوسری وجہ اور بہت بڑی وجہ بھی یہ تھی کہ ان کا محبوب لیڈر ان کے درمیان میدانِ عمل میں نہ صرف موجود تھی۔ بلکہ بہ نفسِ نفیس کام میں شریک۔ جو نہی کھدائی کا کام شروع ہوا۔ حضور اپنے مکان سے منتقل ہو کر موقع پر آگئے اور ایک لمحہ پہاڑی پر آپ کا خیمہ نصب ہو گیا۔ آج اس مقام پر مسجدِ ذباب جلوہ گر ہے۔ پھر حضور خود بھی دس افراد کی ایک ٹولی کے رکن تھے۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت سلمان فارسی چونکہ دوسروں سے دس گنا کام کرتے تھے۔ لہذا ہر ٹولی ان کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس کشمکش کا فیصلہ آپ نے یہ فرمایا کہ "سلمان منا اهل البیت" (یعنی سلمان ہمارے اہل بیت کی ٹولی میں ہیں) اس طرح جناب سلمان کا اعزاز بھی ہوا۔ اور مختلف ٹولیوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں رشک کرنے کا موقع بھی نہ رہا۔ حضور نے نہ صرف مٹی ڈھوئی۔ بلکہ کدال کا کام بھی کیا۔ بلکہ جب کوئی سخت چٹان آجاتی۔ تو آپ خود مہینچتے اور کدال لے کر اسے اپنے ہاتھوں سے توڑتے۔ دو چٹانوں کے توڑنے کا واقعہ مذکور ہے۔

۲۔ ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اس موقع پر کس درجہ بے ہوش سامانی تھی۔ کھدائی کا سامان بنو قریظہ سے مستعار لیا گیا۔ مٹی ڈھونے کے لیے ٹوکریوں تک کا انتظام نہ تھا۔ لوگ اپنے کپڑوں کو اس کام میں استعمال کرتے رہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ سامانِ خوراک کی سخت قلت تھی۔ پھر چونکہ تین ہزار مردانِ کار دو تین ہفتے کھدائی کے کام میں اور پھر دو تین ہفتے محاذِ جنگ پر مصروف رہے اور تمام زرعی و تجارتی کاروبار معطل رہے اس لیے اقتصادی بحران ناگزیر تھا۔ مسلم سپاہیوں نے پسینہ بہاتے ہوئے تین تین دن کے متواتر فاقے کاٹے۔ یہ حالت بھی خوشی خوشی سے اس لیے قابل برداشت ہوئی کہ اس فاقہ کشی میں جماعت کا سربراہ کار خود حصہ دار تھا۔ بلکہ اس نے بھوک کی تکلیف میں سے زیادہ حصہ حاصل کیا۔ دوسرے لوگوں نے اگر بیان کیا کہ ان کے پیچھے ہوئے پیٹوں پر پتھر بندھے ہیں تو حضور نے کپڑا اٹھا کے دکھایا کہ یہاں تو

ڈوڈ پتھر باندھنے کی نوبت آگئی ہے۔ ایثار اور قربانی کی یہ صفت جمعی قائم رہتی ہے جب کہ ساری جماعت اس میں حصہ دار ہو۔ لیکن اگر کچھ لوگ اپنے آپ کو بالا تر رکھ کے ایثار و قربانی کی ذمہ داری دوسروں کے سر ڈالنا چاہیں۔ تو ساری جماعت سے یہ خوبی جاتی رہتی ہے خصوصیت سے اسلامی جماعت کے۔ براہ کارڈ کے لیے لازم ہے کہ وہ اس خوبی میں عام جماعت سے پیش پیش رہیں۔

۳۔ معاشرہ میں نظم اور ڈسپلن پیدا کرنا یوں بھی اسلامی تخریب کا ایک لازمی تقاضا تھا۔ یمن میدان جنگ میں تو مشینی نظم کے بغیر دشمن سے بخوبی عمدہ برا ہونا قطعاً ناممکن ہے۔ حضور نے ادین معرکہ ہی سے جنگی نظم کی تربیت دی تھی۔ اب تو تجربات وسیع ہو چکے تھے۔ اس لیے معرکہ خندق پر تیار کیا پہلوانی عام مشیروں نے۔ خندق کی کھدائی بھی انتہائی نظم اور تقسیم کار کے ساتھ کی گئی تھی۔ پھر اس کی نگرانی کے لیے مرنی اور خلیفہ کے لیے جا بجا چوکیاں قائم کی گئیں اور پہرے کی ذمہ داری مقرر تھیں۔ عائدہ ازین مسیروں نے ان کے درمیان باہمی شناخت کے لیے کوڈ مقرر تھے۔ بنو قریظہ کی غداری کی تصدیق کر کے وہی کوڈ پڑا اور ان کو سزا دی گئی۔ اس سے حضور کو اطلاع دی۔ ارکان وفد نے صرف اتنا کہا کہ حضور کو کوڈ کے بارے میں سزا دینا اور اسی طرح غداری کی ہے جیسے عثمانی وقارہ کے لوگوں نے عثمان کے ساتھ کیا ہے۔ پھر ان کی سزا سن کر ان پر رات کی تاریکی میں سو ہو جانے کے باعث سزا سننے والے کوئی اور نہ تھا اور وہ سزا سن کر ان کی غداری کی کھدائی کا کام شروع ہونے سے سے کوڈ پڑا اور ان کی غداری کی اجازت سے ان کو سزا دی گئی۔

۴۔ حضور نے بنو غنمیان کے ساتھ معاہدہ کیا اور ان کو سزا دینے کی ہمتی سے منع کیا۔ یہ معاہدہ ہونے سے کہ تخریب اسلامی کو شدید مخالفتوں سے بچا۔ اور انہوں نے ان کے ساتھ ہاتھ دھوئے۔ ان کے قدم پیچھے بٹانا پڑے یا جھکاؤ اختیار کرنا پڑے تو یہ کوئی ناممکن کام نہیں ہے۔ یکساں سزا سننے کرتے ہوئے جن مختلف عناصر سے سابقہ پڑتا ہے، ان سے بار بار ایسے معاملات کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تخریب اسلامی کی یہی وہ پیچیدہ ضروریات ہیں جو اسے چلانے کے لیے حکمت کو لازم ٹھہراتی ہیں۔ حالات کو سمجھنا اور ان میں سے بہترین راستہ نکال لینا ایک بصیرت مند قیادت کی لازمی صفت ہونی چاہیے ایسے لوگ جو اصولوں کی طرح طریق کار کے دائرے میں بھی ایک ہی فارمولا کو ہر قسم کے حالات میں استعمال کرنا چاہیں، مشکل ہی سے تاریخ میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دے سکتے ہیں۔

یہ الگ بات ہے کہ حضور کے لیے اس مصالحانہ بخوریز کا اصل محرک یہ احساس تھا کہ کہیں انصار مبینہ یہ محسوس نہ کریں کہ ان کے سر ناقابل برداشت معیبت آپڑی ہے۔ آپ نے چاہا کہ ان کی طرف سے



ایسے کسی اظہار سے پہلے ہی حل نکالا جائے۔ مگر اوس و خیزج کے سرداروں نے مضبوطی دکھائی اور آپ کو تسلی ہو گئی۔

۵۔ اس مصالحانہ تجویز کو آخری طور پر عمل میں لے آنے سے قبل حضور نے انصاری سرداروں سے مشورہ کر کے اصول شورایت کو مستحکم کر دیا۔ میدان جنگ میں بھی آپ نے بطور خود فیصلہ کا بڑا قدم نہیں اٹھایا۔

۶۔ نعیم بن مسعود نے دشمن میں پھوٹ ڈلوانے کا جو پارٹ ادا کیا، وہ حضور کی منظوری سے کیا۔ اور حضور نے اس کی اجازت "الحرب خدعة" کے کلیہ کے تحت دی۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ کشمکش اور خصوصاً جنگ کرتے ہوئے مختلف تدبیریں اور چالیں (اٹل اخلاقی حدود کے اندر رہ کر) اختیار کی جاسکتی ہیں۔ بلکہ بعض صورتوں میں یا شد ضروری ہو جاتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر سادگی سے بیٹھے حالات کو دیکھتے رہیں تو ہلاکت تک کا خطرہ ہوتا ہے۔ ابن اسحاق کی کمزور روایت کو درکنار رکھ دیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ نعیم بن مسعود نے بغیر جھوٹ بولے اور بغیر کسی اخلاقی حد کو توڑے بڑی خوبی سے ایک عظیم فہم سر کر دکھائی۔

۷۔ حضرت سلمان کا بیان ہے جو حضورؐ والی ٹولی میں شریک تھے کہ ایک چٹان کھدائی میں ایسی آئی کہ مجھ سے ٹوٹتی نہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریب ہی تھے۔ آپ نے کدال مجھ سے لے کر صخریں لگائیں۔ پہلی ضرب لگا کر فرمایا کہ میں میرے لیے فتح ہوا۔ دوسری ضرب پر فرمایا کہ شام اور المغرب میرے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ تیسری بار فرمایا کہ خطہ مشرق (ایران) مفتوح ہوا۔ یہ بشارت دو پہلوؤں سے بڑی اہم ہے ایک تو اس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ حضور شروع سے لے کر آخر تک اپنی تحریک کے آخری مراحل کامیابی کا ایک مستقل تصور رکھتے تھے۔ اور اس تصور کے حق میں آپ کے دل پر آسمانی القاد بھی ہوتا رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ انتہائی ناسازگار حالات میں جب کہ قوت کم اور مصائب زیادہ تھے، آپ کو یقین رہا کہ یہ یہ ہو کر رہنا ہے۔

بلکہ ضمناً ہم یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آپ کا یہ مقولہ کہ اسلام کے سامنے عرب و عجم مفتوح ہوں گے، مکہ سے لے کر مدینہ تک اتنی بار سامنے آتا ہے اور اس دور میں ایسا زبان زد عام رہا ہے کہ اس کی نوعیت تحریک اسلامی کے مستقل سلوگن کی سی معام ہوتی ہے۔ ہم اس پر مفصل کلام کسی دوسرے مقالے میں کریں گے۔ اضطراب کی سخت گھڑیوں میں اسی بشارت پر طنز کرتے ہوئے معتب بن قشیر نے کہا تھا کہ ایک طرف تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم، ہمیں قیصر و کسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں دلو اتے ہیں اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی شخص مارے خوف کے اجابت کے لیے بھی نہیں نکل سکتا۔

۸۔ اس معرکہ میں مخصوص حالات کی بنا پر اگرچہ خواتین اور بچوں کو قلعوں میں بھیج دیا گیا تھا تاہم اس موقع پر بھی خواتین نے اونچے کردار کا ثبوت دیا۔ ایک خاتون رشیدہ کچھ دوا میں اور مرہم پٹی کا سامان لے کر محاذ پر پہنچیں اور انہوں نے زخمیوں کی خدمت کی۔ سعد بن معاذ کی مرہم پٹی بھی انہی نے کی۔ خواتین کے ایک کپ کے گرد ایک یہودی چکر لگاتا دیکھا گیا۔ حضرت صفیہ (حضور کی پھوپھی) وہیں تھیں۔ انہوں نے حسان بن ثابت سے جو عدالت کی وجہ سے وہیں رکھے گئے تھے کہا کہ اس کی خبر لے ڈالو۔ انہوں نے معذرت کی تو اس شیر دل خاتون نے خود ہی چوب سے اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر اس کا سر بھی کاٹ کر خود ہی ندر سے پرے پھینکا۔ اس واقعہ کے بعد کسی دشمن کو ادھر آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ حضرت عائشہ جس قلعہ میں تھیں۔ اسی میں سعد بن معاذ کی والدہ بھی مقیم تھیں۔ حضرت عائشہ قلعہ سے نکلیں اور قدموں کی آہٹ سن کر دیکھا تو سعد حرب ہاتھ میں لیے تیز تیز جا رہے تھے یہ شعر ان کی زبان پر تھا۔

لَبَّتْ قَلْبِي لَاتُ دَرَكُ الْمِيحَا جَمَلٌ      لَا بَأْسَ بِالْمَوْتِ إِذِ الْمَوْتُ نَزَلُ

ذرا رکو کہ ایک اور جوان بھی معرکہ میں شریک ہوئے۔ موت کی جب گھڑی آگئی ہو تو پھر موت

سے کیا ڈرنا!

سعد کی والدہ نے بیٹے کی آواز سنی تو پکاریں "بیٹا لپک کے جاؤ، تم نے تو دیر لگا دی" شعر کا مفہوم پورا ہو گیا۔ جب سعد کی رگ کھل میں تیر آئے لگا اور پھر زخم جان یسا ثابت ہوا۔ ایک ماں کا بارہ جذبہ دیکھیے۔

۹۔ معرکہ احزاب (خندق) کے زلزلہ افکن حالات میں گھرے ہوئے مجلس مسلمانوں نے جب مناسک کا یہ طوفان دیکھا تو ڈوبے اختیار کیا۔ اٹھے کہ یہ تو ٹھیک وہی مراحل ہیں جن کے پیش آنے کی اطلاع پہلے سے خدا و رسول نے ہمیں دے رکھی تھی۔ وہ مراحل کہ جن سے گزرے بغیر نہ دنیا میں نمائندہ حق نہیں ہے۔ اور نہ آخرت میں جنت ہانڈا آسکتی ہے۔ سورہ احزاب میں ایسے پیکر ہائے اخلاص کی تحسین کی گئی یہی لوگ تحریک کا اصل سرمایہ قوت تھے۔

۱۰۔ حضور کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ آپ نے اپنی جماعت کو ایک مستقل جبروت بنا کر پیش کیا۔ اٹھانے ہوئے یہ کلیتہً خوب اچھی طرح دلوں میں اتارا کہ معاشرت و ثقافت کے دائرے میں درمری قوموں اور ملتوں کی تقلید ہرگز نہ کی جائے بلکہ نئی تمدنی قدیں اپنے ہی اصولوں کے سانچے میں ڈھالی جائیں۔ یہ ثقافتی نقش اپنے ہی مخصوص اسلامی ذوق کے رنگ سے تیار کیا جائے۔ لیکن جب ہم حضور کو خندق کے ایرانی طریقِ دفاع کو کھلے دل سے قبول کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت کھلتی ہے کہ مادی ذرائع و وسائل، عمل و

(Technology) اور تجربی تدابیر کا لین دین ساری انسانیت کے درمیان کھلا رکھا گیا ہے کسی ایک وقت میں جو وسائل، عملی فنون اور تجربی تدابیر زیر عمل آئیں، ہرگز ضروری نہیں کہ ان کو ہمیشہ ہر قسم کے علائق اور ہر دور تمدن میں جوں کا توں لازم سمجھا جائے اور یوں سوچا جائے کہ ان چیزوں پر بھی شریعت یا سنت کا عنوان دیا جاسکتا ہے۔ اس دائرے میں دوسری قوموں اور تہذیبوں سے استفادہ لازم ہے۔ ایک مسلم ریاست اور اس کی قیادت کا دینی فرض یہ ہے کہ وہ وقت کے زیادہ سے زیادہ موثر ذرائع کو کام میں لائے۔ عملی فنون ہیں اپنے باشندوں کو پیش پیش رکھے اور کامیاب ترین تجربی تدابیر دوسروں سے بھی اخذ کرے اور خود بھی ایجاد کرے۔

### معرکہ خندق سے فتح مکہ تک

ان دو بڑی جنگوں کے درمیان دو برس کے زمانے میں بعض اہم سیاسی اقدامات اور چھوٹی چھوٹی فوجی کارروائیاں عمل میں آئیں۔ حالات کے تسلسل کو نگاہ میں رکھنے کے لیے ان پر نگاہ ڈالنا ضروری ہے۔ بنو قریظہ یہود کے فساد ذہن و اخلاق کی ایک گھناؤنی مثال تھے۔ بیزبانی اور بدکرداری ان میں عام تھی۔ اسلامی ریاست کے دستوری معاہدہ میں بندھ کر اس کے شہری ہونے کے باوجود ہر طرح کی سازشیں اور فتنہ انگیزیاں کرتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن معرکہ خندق میں کھلم کھلا عہد شکنی کر کے حملہ آور دشمنوں سے ان کا ساتھ گانٹھ کر لینا انتہا درجہ کا غدارانہ اقدام تھا۔ جس کے مجرمین کے لیے سزائے موت کسی بھی دور اور کسی بھی نظام میں خلاف انصاف نہیں ہو سکتی۔ ان لوگوں نے اپنے ارادوں کے لحاظ سے تو گویا سرورِ عالم، اسلامی جماعت تحریک امن و انصاف اور مدینہ کی ریاست کا خاتمہ کر ہی ڈالا تھا۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ ان کو کیفر کر دیا نہ پنچایا جاتا۔ حملہ آوروں کے رخصت ہو جانے کے بعد حضور اور مسلم رضا کار صبح صبح خندق کے مورچے چھوڑ کر گھروں میں واپس پہنچے۔ ہتھیار اتار کر حضور نے غسل فرمایا۔ اور اسی دوران میں انصار ہوا کہ بنو قریظہ کی طرف کوچ کیا جائے۔ ابھی سپاہ نے کمرس بھی نہ کھولی تھیں کہ ان کو ایک نئی مہم کے لیے طلب کر لیا گیا۔ مسلم فوج نے اس غدار قبیلے کو محاصرہ میں لے لیا۔ جس کا تسلسل ۲۵ روز قائم رہا۔ عین اس نازک موقع پر انہوں نے قلعہ پر سے حضور کو گالیاں بتا دیں۔ آخر بنی قریظہ بالکل زچ ہو گئے۔ اور ان کے سردار کعب بن اسد نے الجھن سے نکلنے کے لیے ان کے سامنے مختلف صورتیں رکھیں جن میں سے کسی کو انہوں نے قبول نہ کیا۔ آخر بلا شرط انہوں نے اپنے آپ کو مسلم ریاست کے حوالے کر دیا۔ حضور نے ان سے گفت و شنید کر کے ان کی رضامندی سے سعد بن معاذ کو حکم ٹھہرایا اور دونوں طرف سے پورے اعتماد کے ساتھ فیصلہ ان پر چھوڑ دیا گیا۔ سعد بن معاذ نے یہودی کے قانون تورات کو سامنے رکھ کر فیصلہ دیا کہ ان کے نوجوانوں کو قتل کی سزا دی جائے۔ اس طرح ایک فتنہ طراز گروہ کا بحیثیت ایک جنگی و سیاسی قوت کے خاتمہ ہو گیا۔ واضح رہے کہ تلخی کے اس موقع پر بھی

نو قریظہ کا ایک فرد عمر بن سعد بن حنظلہ کے حصہ میں آیا۔ اس سعید رُوح نے بنو قریظہ کو پہلے سے بد عمدی سے روکن چاہا تھا۔ انتہائی بجز زمین نے بھی ایک گل رنگین تلواروں کی کرطکتی بجلیوں کی چھاؤں میں پیش کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد انقلاب دشمن سازشیوں کا ایک نہایت ہی سرگرم لیڈر ابو رافع عبداللہ بن ابی الحقیق (جسے سلام بھی کہتے تھے) جس نے جنگ خندق کے لیے فوجیں چڑھا لینے میں خاصی تگ و دو کی تھی۔ قبیلہ خزرج کے چند نوجوانوں کے ہاتھوں شام میں قتل ہوا۔

محمد بن مسلمہ انصاری ۳۰ سواروں کے ساتھ سرحدی گشت پر تھے کہ علاقہ نجد کے سردار ثامہ بن اثال سے ڈبھیٹ ہوئی۔ مدینہ کی طرف اس کا رخ دیکھ کر کمانڈر موصوف نے گرفتار کر لیا۔ اور حضور کے سامنے پیش کیا۔ اس نے دربار نبوت میں اتنا ہی کہا کہ "اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر قتل کرو تو ایک مستوجب قتل کو قتل کرو گے۔ اگر چھوڑو گے تو ایک احسان شناس کو چھوڑو گے۔ اور اگر مال چاہتے ہو تو مقدار بتاؤ۔ دیا جائے گا" حضور نے عزت مندانہ طریق سے اسے رہا کر دیا۔ اور وہ اس محنانہ طرز عمل سے متاثر ہو کر سدیی جماعت کا رکن بن گیا۔ ثامہ نے قبول اسلام کے بعد اپنا دل حضور کے سامنے یہ کہہ کر پوری طرح کھول دیا۔ کہ "آج سے پہلے حضور کے چہرے سے بڑھ کر کوئی اور چہرہ مبغوض نہ تھا۔ اور آج اس چہرے سے زیادہ محبوب چہرہ کوئی نہیں" اس طرح گویا نجد جیسے اہم سیاسی علاقے میں تحریک کے لیے راستے کھل گئے۔ اسی ثامہ نے مکہ میں جا کر قریش کو چیلنج کیا تھا کہ اب تم کو نملہ کا ایک دانہ بھی نہ مل سکے گا۔

اہل رجب جو تعلیمی وفد کے دس ارکان کے قاتل تھے۔ ان کی سزا دہی کے لیے بطور پولیس ایکشن حضور نے دوسو سواروں کے ساتھ اقدام فرمایا۔ وہ لوگ بھاگ گئے۔ بغیر کسی جھڑپ کے واپسی ہوئی۔ بطور سیاسی تدبیر کے حضور نے دس آدمیوں کو طلائی گردی کے لیے کراہ النعیم تک بھیجا تا کہ قریش جان لیں کہ مدینہ جاگتا ہے۔

علاقہ بنی غطفان کی جانب مدینہ سے ایک منزل کی دوری پر ذی قرد نامی چشمہ ہے اس طرف مدینہ کے سرکاری اونٹوں اور مویشیوں کی چراگاہ تھی۔ غطفان کا ایک شخص راعی تھا۔ حضور نے رباح نامی غلام کو نجات گیری کے لیے بھیجا۔ سلمہ بن الاکوع فوجی حیثیت سے ممانعت تھے۔ وہ بھی ڈیوٹی پر جا رہے تھے۔ علی الصباح یہ لوگ راستہ ہی میں تھے کہ عیینہ بن حسن فزاری دیا عبد الرحمن بن عیینہ نے اونٹوں پر ڈال ڈالا۔ اور ان کو ہلکے پھلکے راعی کو ڈاکوؤں نے قتل کیا اور اس کی عورت کو بھی ساتھ لے گئے۔ سلمہ نے یہ غارت گری دیکھی تو مدینہ کی طرف رخ کر کے "ایسا صبا حیا" کا نعرہ لگایا اور رباح کو کمک لینے کے لیے دوڑایا۔ خود تین تھنڈا ڈاکوؤں کے تعاقب میں دوڑے۔ تیر اندازی کے ماہر تھے۔ ٹولی کے پیچھے سے نعرہ لگا کر تیر

پھینکے۔ اور ہر تیر نشانہ پر لگ کر ایک نہ ایک مجرم کو زخمی کر دیتا۔ پکارتے کہ "میں ابن الاکوع ہوں آج امتحان کی گھڑی ہے کہ کس نے اپنی ماں کا کتنا دودھ پیا ہے" راستہ پہاڑی تھا اور اس پاس درخت تھے۔ ڈاکو متوجہ ہوتے تو یہ چھپ جاتے اور ناوک پھینکتے۔ گویا گوریلا طریق جنگ سے کام لے رہے تھے۔ ایک موقع پر پتھر برساکر دشمن کو زچ کیا۔ ڈاکوؤں نے بدحواس ہو کر پہلے تو اونٹ چھوڑے۔ پھر بوجھ گھٹانے کے لیے چادریں اور نیزے پھینکتے گئے۔ ادھر مدینہ سے فوری طور پر مقداد بن عمرو کو سلمہ کی امداد کے لیے روانہ کرنے کے بعد حضور بہ نفس نفیس ایک دستہ لے کر نکلے۔ چند مسلم سپاہی باقی ساتھیوں سے پہلے ہی پہلے ڈاکوؤں کے سر پر جا پہنچے۔ وہ بھاگے محرز بن نضدہ المعروف بہ انحرہ شہادت کے شوق میں تن تنہا سب سے آگے نکل گئے اور مقابلہ شروع کر دیا۔ شہادت پائی۔ بعد میں ابوقادہ نے ایک بڑے ڈاکو (عبدالرحمن بن عیینہ یا حبیب بن عیینہ) کو موت کے گھاٹ اتارا۔ حضرت سلمہ نے مزید تعاقب کیا۔ اور دو گھوڑے چھین کر واپس آئے۔ پلٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپ ایک سو سپاہی میرے ساتھ روانہ فرمائیے۔ تو میں سب کا خاتمہ کر آؤں۔ حضور نے فرمایا کہ "خدا نے جب تمہیں غلبہ دے ہی دیا ہے تو اب نرمی سے کام لو" ان حضرات کی جانبازی کو دیکھیے کہ ایک ایک فرد میں جیسے کہ بجلیاں بھری تھیں۔ ان کا کردار عام جنگجوؤں اور مار دھاڑ کرنے والوں سے بہن طور پر مختلف تھا۔ یہ ایک درخشاں نصب العین کے جانباز تھے۔ جس کی محبت انہیں بغیر کسی مزد کے جان جو کھوں میں ڈالتی تھی اور یہ جس معرکے میں پڑتے بھاری تھے۔

ایک طلایہ گرد دستہ عکاشہ بن حصن اسدی کی سرکردگی میں سرحدی گشت کے لیے نکلا۔ افواہ یہ تھی کہ بنی اسد مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے مجتمع ہو رہے ہیں۔ دستہ جب علاقے میں پہنچا۔ تو مفسدین مکان خالی چھوڑ کر منتشر ہو گئے۔ چراگاہ سے سپاہی ان کے دو سو اونٹ ضبط کر لائے۔

ربیع الاول ۳ھ میں ایک دعوتی و تعلیمی وفد محمد بن مسلمہ کی امارت میں بنی ثعلبہ کی طرف بھیجا گیا۔ تھا۔ یہ حضرات ذی القصبہ پہنچے کہ رات کو سوتے ہیں انہیں شہید کر دیا گیا۔ صرف محمد بن مسلمہ سخت زخمی حالت میں بچے اور کوئی مسلمان ان کو پیٹھ پر لا کر مدینہ لایا۔ چنانچہ ربیع الثانی میں حضرت ابو عبیدہ چالیس سپاہیوں کا دستہ لے کر حجاز کی سرکوبی کے لیے رات کو روانہ ہوئے اور صبح صبح تہ بول دیا۔ مفسدین بھاگ گئے بمفرودین کی امداد ضبط کر لی گئیں۔

زید بن حارثہ ایک طلایہ گرد پارٹی لیے ہوئے جموح (بطن نخلہ کے پاس) کی طرف سے گزرے۔ یہاں بنو سلیم کی بستیاں تھیں جو مدینہ کے لیے مصافی گروہ تھا۔ باہم برسر جنگ فریقین ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے

اور کمزور کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں دیا کرتے۔ پھر ایک عورت حلیمہ نے ان کے بارے میں مخبری بھی کی تھی۔ پارٹی نے ہڈکا سا چھاپہ مارا اور کچھ افراد کو قید کر لائے اور کچھ مویشی بھی قبضے میں کر لیے۔ بعد میں حضور نے گرفتار شدگان کو رہا کر دیا۔ کیونکہ حلیمہ نے غلط مخبری کی تھی۔

زید بن حارثہ ایک چھوٹا سادستہ اپنے علاوہ (۱۴ افراد) لے کر ماجرین ذی القصدہ کی سزا دہی کے لیے پولیس کارروائی کے طور سے برجانب طرق (بنی ثعلبہ کا چشمہ) روانہ ہوئے۔ ماجرین بھاگ گئے۔ ان کے ۲۰ شتر ضبط کر لیے گئے۔

دومۃ الجندل کی اقتصادی، سیاسی اور دفاعی اہمیت کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ابھی تک یہ انتہائی مرکزی مقام باعثِ خطر تھا۔ حضور پہلے ادھر اقدام کر کے تکمیل مہم کے بغیر واپس آگئے تھے۔ اب کی بار حضرت عبدالرحمن بن عوف کو دعوتی مشن پر دومۃ الجندل بھیجا گیا۔ ان کی افہام و تفہیم سے بہت بڑے مقامی قبیلہ کا عیسائی سردار اسم بن عمرو کلہبی دائرۃ اسلام میں آیا اور اس کے ساتھ عوام قبیلہ بھی عیسائیت ترک کر کے مسلمان ہوئے۔ سردار نے اپنی لڑکی تمار عبد الرحمن بن عوف کے نکاح میں دے کر مسلم ریاست سے اپنا سیاسی رابطہ مستحکم کر لیا۔

فدک سے مدینہ میں اطلاع آئی کہ قبیلہ بنی سعد بن بکر فوجی قوت جمع کر رہا تھا۔ تاکہ سلامی حکومت کے خلاف یہود خیبر کو حملہ کرنے میں مدد دے۔ حضرت علیؑ نے دو سو سپاہی لے کر بڑی احتیاط سے مارچ کیا۔ راتوں کو چلتے اور دن کو چھپ چھپا کے پڑ رہتے۔ راستے میں بنی سعد کا ایک قاصد خیبر جانا ہوا پکڑا گیا جو یہ پیغام لے جا رہا تھا کہ امداد اس شرط پر دی جائے گی کہ خیبر کی کھجور بنی سعد کو دی جائے۔ حضرت علیؑ نے ناگہانی حملہ کیا۔ اور دشمن گھبرا کر بھاگ نکلا۔ مسلم فوج نے بغیر کوئی نقصان اٹھائے بنی سعد کے مویشی قبضے میں لے لیے۔

ایک حادثہ یہ پیش آیا کہ زید بن حارثہ اپنا اور دوسرے صحابیوں کا مہ ماہ اور مال لے کر شام کے تجارتی سفر پر گئے۔ واپسی پر وادی القرئی میں بنی بدر نے ان کے قافلہ پر ڈاکہ ڈالا۔ قافلہ کی تعداد کم تھی، لہذا ڈاکوؤں نے ۹ آدمیوں کو شہید کیا اور ایک کو زخمی اور سارا مال چھین لے گئے۔ آخر دو مہینے بعد حضرت ابو بکرؓ کی سرکردگی میں مجرموں کی سزا دہی کے لیے مہم بھیجی گئی۔ چنانچہ کچھ ڈاکہ زن مقتول ہوئے، باقی بھاگ گئے۔

عقل اور عربیہ نامی دو قبائل کے کچھ لوگ مدینہ آ کر مسلمان ہوئے۔ مگر بنی آدہ میں بیمار پڑ گئے مدینہ کے باہر منتقل ہو کر سرکاری انتظام سے زیر علاج رہے۔ اچھے ہوئے تو سرکاری چرواہے کو پکڑا۔ اس کی آنکھوں میں گرم سلاخی پھیری۔ پھر اسے بے رحمانہ طریقے سے قتل کیا۔ اور مویشی ساتھ لے کر بھاگ گئے حضور

نے کرز بن خالد فہری کی سرکردگی میں ۲۰ سواروں کا دستہ ان کی گرفتاری کے لیے بھیجا۔ گرفتار ہوئے ارتداد ڈاکہ، قتل اور محاربہ اور بے رحمانہ کارروائیوں کے گونا گوں جرائم کے تحت ان کو عبرت ناک سزا دی گئی اور ٹھیک عدل سے انتقام لیا گیا۔ ورنہ اگر ایک منظم حکومت کے خلاف ہر کوئی اس طرح کی جسارت کرنے لگے تو سارا معاملہ مذاق بن کر رہ جائے اور کوئی نظم ایک دن نہ چلایا جاسکے۔

اس دور کا سب سے بڑا واقعہ جس کے دُور رس اثرات سیاسی اور دفاعی حالات پر پڑے، صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے۔ حضور ذی قعدہ ۶ھ میں حدیبیہ کے مقام پر فزوکش ہوئے۔ قریش سے مصالحتی معاہدہ باندھ کر آپ بہت بڑے حریف سے فارغ ہو گئے۔ اور دعوتی اور تعمیری کام کرنے کے لیے وسیع مواقع پیدا ہو گئے۔ نیز مدینہ کے متصلہ علاقوں میں شرانگیز عناصر کی سرکوبی آسان ہو گئی۔

حدیبیہ سے سرورِ عالم ذی الحجہ میں واپس مدینہ آئے اور چند روز مقیم رہ کر، محرم ۱۰ھ کو خیبر روانہ ہو گئے۔ خیبر اسلامی ریاست کے خلاف ایک نہایت ہی فعال سیاسی اڈا بھی تھا اور جنگی سازشوں کا مرکز بھی۔ خیبر کے یہود نہ صرف اُحد کے پس منظر میں محاربانہ حرکتیں کر چکے تھے بلکہ جنگِ احزاب میں ان کا پارٹ بہت ہی سرگرمی کا تھا۔ مدینہ کی زندہ و بیدار حکومت اپنی گردن پر ایک تنے ہوئے چھیرے کا وجود بہر حال گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس معرکہ کی نوعیت غیر معمولی ہے اور بڑے معرکوں میں شمار کیا جاسکتا ہے مگر ہم نے اسے معمولی کارروائیوں میں اس لیے رکھا ہے کہ یہ بدر، اُحد اور خندق کے سلسلہ جنگ کی کڑی نہیں ہے

یہ ایک مختلف نوعیت کی کارروائی ہے۔ تحریکِ اسلامی کی دعوت چونکہ ابھی تک بین الاقوامی دور میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ اور قریش اور اہل عرب کی طرح سے دوسری قوموں اور دوسرے مذہبوں کے لوگ درجہ اول کے مخاطب نہیں تھے۔ اس لیے یہودِ خیبر سے انقلابی دعوت کی بنا پر کوئی تصادم نہ تھا۔ ان کے سیاسی جرائم ہی اصل وجہ اقدام تھے۔ اور اسی لیے ان سے معاملہ بھی سیاسی جنگ کا سا کیا گیا۔ وہ بازی ہر گئے تو ان کی

سرزمین کو باقاعدہ مفتوح بنایا گیا۔ اور ان کو رعیت کی حیثیت دی گئی۔ حضور نے یہ طرزِ معاملہ صرف علاقہ خیبر ہی میں روا رکھا اور کہیں نہیں۔ بہر حال قریش کی طرف سے مامون ہو جانے کے بعد اب خیبر کی طرف چڑھائی کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ تھی۔ اس موقع پر صرف انہی لوگوں کو ہم میں شریک کیا گیا۔ جو خالصتاً لشکرِ جہاد کا جذبہ لے کر چلے۔ واضح رہے کہ اس ہم میں خواتین بھی بغیر اطلاع شریک ہو گئی تھیں بعد میں حضور کو پتہ چلا تو خفا ہو کر ان سے باز پرس کی۔ کہ تم لوگ کیوں آئے؟ لیکن جب انہوں نے لشکر کی خدمت کرنے کا جذبہ ظاہر کیا تو آپ نے رضامندی دے دی۔ بلکہ آخر میں مالِ غنیمت میں سے حصہ بھی دیا۔ مدینہ میں سباع بن عرفطہ کو قائم مقام بنا کر چودہ سو سپاہ کے ساتھ حضور روانہ ہوئے۔ بمقامِ ریحہ پڑاؤ ڈالا گیا۔ مسلم

فوج جب خیبر والوں کے سامنے اچانک نمودار ہوئی، تو وہ بھاگ کر قلعوں میں پناہ گزین ہو گئے۔ پہلا حملہ قلعہ النظاۃ پر ہوا۔ دونوں طرف سے تیر بھینکے جاتے تھے۔ بالآخر فتح ہوئی۔ پھر قلعہ صعب کا محاصرہ ہوا۔ مرحب یہودی مبارزت کو نکالا۔ عامر بن الاکوع مقابلے میں آئے اور شہادت پائی۔ بہر حال محاصرہ فتح پر منتج ہوا۔ قلعہ قنوص سب سے زیادہ مستحکم تھا۔ اور حضورؐ شدید دردِ سر کی وجہ سے خود شریکِ معرکہ ہونے سے معذور رہے۔ آپؐ نے خاص اعلان کے ساتھ حضرت علیؑ کو اس مہم کے لیے نامزد فرمایا۔ قلعہ سے مرحب رجز پڑھتا ہوا آیا۔ محمد بن مسلمہ نے بھائی کا انتقام لینے کے جذبے سے بڑھ کر ہاتھ مارا تو اس کی ٹانگیں کٹ گئیں۔ پھر حضرت علیؑ کی تلوار نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ مرحب کے بعد اس کا بھائی یاسر نکلا۔ مقابلے پر حضرت زبیر بن العوام آگے بڑھے۔ اور ان کے ہاتھوں اس کا خاتمہ ہوا۔ یہ اہم ترین قلعہ ۲۰ روز کے محاصرہ کے بعد حضرت علیؑ کی کمان میں فتح ہوا۔ اور اسی لیے آنجناب کو فاتحِ خیبر کہا جاتا ہے۔ یہود اس قلعہ سے جب بھاگ گئے تو مشہور دشمن اسلام حمی ابن اخطب کی صاحبزادی جناب صفیہ مع اپنی دو چچا زاد بہنوں کے اسیر ہو کر آئیں۔ یہ ایک معزز سردار کی بیٹی تھیں اس لیے صحابہ کے مشورے سے حضورؐ نے ان کو اپنے حرم میں لیا۔ پھر یہودی قلعہ الزبیر میں جا مجتمع ہوئے۔ یہاں سے روزِ محاصرہ کے بعد وہ باہر نکل کر شور سے لڑے۔ دس یہودی مارے گئے چند مسلم سپاہی شہید ہوئے۔ اور قلعہ پر قبضہ ہو گیا۔ اب تین قلعے الکتیہ، لوطیح، اور السلام باقی تھے۔ یہود کی تمام جانی و مالی قوت اب ان کے اندر اکٹھی ہو گئی تھی۔ مسلم فوج نے چودہ روز محاصرہ جاری رکھا۔ بالآخر منجیق نصب کر کے سنگ باری کرنے کا فیصلہ ہوا۔ محصورین کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے اپنے آپ کو بے بس پایا۔ گفتگوئے مصلحت کے لیے سلسلہ جنبانی کی۔ گفتگو کے بعد ان کے بیٹے فیصلہ ہوا کہ صرف جانیں لے کر چلے جائیں۔ جانے سے پہلے انہوں نے دوبارہ درخواست کی کہ ان کو زمین اور باغوں کی کاشت پر لگایا جائے اور یہیں رہنے دیا جائے۔ حضورؐ نے فراخ دلی سے یہ درخواست قبول کی۔ اور نصف پیداوار پر معاملہ ہوا۔ فدک والوں نے اس صورتِ معاملہ کی تہ سنی تو انہوں نے بھی اسی کے لیے منظوری مانگی۔ ان کو بھی منظوری مل گیا۔ اس کارروائی کے دوران میں دو یہودی نوجوان حویبہ اور مجیہہ اسلامی تحریک کے دائرے میں آ گئے۔

اس معرکہ کے دوران میں جب کہ قلعہ نظاۃ محاصرے میں تھا۔ اہل خیبر کا ایک حبشی چرواہا اسود راعی معاذ بنی انقلاب سے دوچار ہوا۔ اس نے یہود سے دریافت کیا کہ کس سے لڑا جا رہا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس شخص سے جو نبوت کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کی روح میں اتنی بات سن کر تحریک پیدا ہوئی اور اس نے حضورؐ کی خدمت میں آ کر معلوم کیا کہ آپؐ کی دعوت کیا ہے، حضورؐ نے اسلام کا نظریہ توہید اس پر واضح



کیا۔ اس کے دل و دماغ اسلام کے سامنے مفتوح ہو گئے۔ پھر اس نے پوچھا کہ یہود کی بکریاں میرے ساتھ ہیں۔ ان کو کیا کروں۔ حضور چاہتے تو ان محاربین کی بکریاں قبضہ میں کر کے فوج کے سامانِ خوراک میں شامل کر سکتے تھے۔ مگر آپ نے اسود راعی کو ایسے موقع پر بھی امانت داری کا حق ادا کرنے کی تلقین کی اور اس نے حضور کے ارشاد کے مطابق ان کو قلعہ کے قریب لے جا کر کنکریوں سے آبادی کی طرف ہانک دیا۔ پھر اس نے واپس آ کر دریافت کیا کہ میں اگر لڑ کر مارا جاؤں، تو آخرت میں میرا کیا بنے گا۔ حضور نے جنت کا مشورہ دیا۔ وہ پیکرِ اخلاص لڑا اور اپنی جان سچائی کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھا دی۔

ایک نو مسلم اعرابی خیبر کی مہم میں شریک ہو کر آئے تھے۔ ان کے لیے جب مالِ غنیمت میں حصہ لگایا گیا۔ تو انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! میں آپ کے پیچھے اس چیز کے لیے نہیں آیا۔ میں تو اس لیے آیا ہوں کہ میری رگ جان راہِ حق میں کٹے اور جنت نصیب ہو۔ حضور نے بشارت دی کہ تمہاری یہ مراد بھی پوری ہو جائے گی۔ یہ مجتہد ایمان بھی رن میں اُترا اور شہادت کی مقدس موت نے اسے سینے سے لگالیا۔ فتح خیبر کی مسترین کئی گنا بڑھ گئیں۔ جب یکایک حضرت جعفر بن ابی طالب بہت سے ساتھیوں کے ساتھ حضور اور اپنی مہم مسلک ایمانی برادری کے ساتھ آئے۔

حجاج بن علاط سلمی جو ارض بنی سلیم کی کانوں کے مالک تھے۔ اور اسی زمانے میں مسلمان ہوئے تھے۔ فتح خیبر کی تکمیل سے قبل حضور سے اجازت لے کر تیزی سے مکہ پہنچے تاکہ اپنی بیوی اور مالِ کثیر کو بروقت نکال لائیں۔ درپردہ انہوں نے حضرت عباس کو فتح خیبر کا مشورہ سنایا۔

خیبر کا قبضہ پاچکا تو مسلم فوج نے وادی القریٰ کا رخ کیا جہاں یہود کے ساتھ کچھ اہل عرب بھی مقیم تھے۔ یہاں بھی مخالفت کا گڑھ تھا۔ فوج کے جاتے ہی سامنے سے پتھر برسائے گئے اور مدغم نامی غلام گھائل ہوا۔ حضور کی طرف سے بار بار اسلام کی دعوت دی جاتی رہی۔ مگر ادھر سے ایک ایک آدمی مقابلے پر نکلتا اور ختم ہوتا گیا۔ متواتر گیارہ آدمی اس طرح آتے رہے۔ رات ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اگلے روز صبح کے جلد ہی بعد فتح ہوئی۔ سابق نظائر کے مطابق وادی القریٰ والوں کو بھی زمینوں اور باغوں کی کاشت کا کام دے دیا اور ان پر اپنا انتظامی حاکم مقرر کر دیا۔ اہل تیماکہ یہود نے جب اس صورتِ معاہدہ کی اطلاع پائی تو انہوں نے از خود مصالحت کی خواہش کی اور ان کو بھی اراضی پر برقرار رہنے دیا گیا۔

اس فاتحانہ کارروائی کے نتیجے میں جن وسیع زرخیز قطععات اراضی پر قبضہ ہوا ان میں سے ذک اور خیبر کے رقبے سرکاری زمین (State Land) قرار دیئے گئے۔ اور ان سے ریاست کے سربراہ کا ان کے لواحقین اور معاشرہ کے غربا کی کفالت کی جاتی تھی۔ انہی خاص قطععات کے بارے میں حضور کی دفعہ

کے بعد کچھ اختلاف ہوا۔ مگر جناب صدیق اور بصیرت مند صحابہ نے ان کو جوں کا توں سرکاری ملکیت میں رکھا۔  
بقیہ راضی مسلمانوں کی ملکیت میں دی گئی اور ان کی پیداوار ان میں تقسیم ہوتی تھی۔

عمر بن الخطاب طلباء گرد دستہ لے کر بنو ہوازن کو انتباہ دینے گئے۔ بنو ہوازن منتشر ہو گئے  
بشیر بن دارم (یا اسیر بن رزام) یہودی کے متعلق خبر آئی کہ بنو غطفان کو جنگ کے لیے تیار کر رہا ہے  
عبداللہ بن رواحہ ایک دستہ لے کر گئے۔ کسی طریقے سے انہوں نے بشیر کو دینہ چل کر حضور سے گفت و شنید  
کرنے پر آمادہ کر لیا۔ مسلمان چونکہ تیس کی تعداد میں تھے۔ اس نے بھی احتیاطاً تیس آدمی ساتھ لیے اور براونٹ  
پر ایک یہودی اور مسلمان مشترک ہو کر سوار ہوئے۔ بشیر یا اسیر نے رات کی تاریکی میں عبداللہ کی تلوار پر  
ہاتھ ڈالا۔ وہ چونک کر اونٹ سے کود گئے۔ اور تلوار سونت لی۔ دونوں سرداروں کو اس حالت میں دیکھ کر دونوں  
کے سامنے بھی لڑنے لگے۔ پورے اکتیس یہودی کھیت رہے۔

محرم ۸ھ میں یہ اطلاع پا کر کہ بنو غطفان۔ بنو محارب۔ بنو ثعلبہ اور بنو انمار حملہ کے لیے تیار ہو رہے  
ہیں حضور ۴۰۰ افراد کا دستہ لے کر گشت کے لیے نکلے۔ دشمن منتشر ہو گیا۔ یہ ذات الرقاع کی عہد کدنی ہے۔  
صلح حدیبیہ کے بعد قریش کے لیے تجارتی شاہ راہ کھل گئی تھی۔ مگر ابو جندل قریش کی قید سے بھاگے  
تو مدینہ میں معاہدہ کی وجہ سے جانے کا موقع نہ پا کر وہ ساحل کے متصل شام کی ایک پہاڑی پر مقیم ہو گئے۔ بدر  
ابو اسیر اور دوسرے لوگوں نے بھی وہیں ٹھکانا بنا لیا اور فتنی جمعیت ہونے لگی۔ انہوں نے قریش کے ایک تجار  
تلفے پر حملہ کیا اور مال چھین لیا۔ مگر حضور کی سفارش ان تک پہنچی تو انہوں نے مال واپس کر دیا۔ اب قریش  
کو اپنی سب سے کڑی شرط معاہدہ کے نقصان کا اندازہ ہوا۔ اور پھپھٹاٹے۔ بعد میں حضور نے ابو جندل کو  
مدینہ بلا لیا۔

بنو مویج نے اصحاب بشیر بن سوید کو قتل کیا تھا۔ ان کی تنبیہ کے لیے عبداللہ بیتی ایک پارٹی سے  
کر گئے۔ معمولی جھڑپ ہوئی۔ دشمن ٹوٹی کے کچھ اموال ضبط کر لیے گئے۔  
بنیہ بن عوص جزری نے مسلم ریاست کے خلاف یہ سنگین اقدام کیا تھا کہ ہر قیل کے دربار سے  
حضور کے سفیر وجیبہ کلبی تحائف لے کر واپس آ رہے تھے۔ اور اس نے ڈاکہ ڈال کر سب کچھ لوٹ لیا تھا  
اس کی سرکوبی کے لیے زید بن حارثہ ایک دستہ لے کر گئے جھڑپ ہوئی۔ بنیہ مارا گیا۔ اور اس کے سامنے  
تائب ہوئے۔

بنو کلاب شورش کی تیاریوں میں تھے کہ حضرت صدیق کارروائی کے لیے جا پہنچے۔ جھڑپ ہوئی  
اور دشمن بھاگ گیا۔

جہینہ کے علاقے میں شورش کا اندیشہ ہوا، تو اُسامہ بن زید حالات پر قابو پانے کے لیے بھیجے گئے انہوں نے پہلے افنام و تفتہیم کی کوشش کی۔ لیکن آخر جھڑپ ہوئی۔ اس موقع پر حضرت اسامہ سہیک بن مرداس کا تعاقب کر رہے تھے کہ اس نے کلمہ طیبہ پڑھ لیا۔ مگر حضرت اسامہ نے یہ سمجھا کہ قابو میں آکر جان بچانے کا حیلہ کر رہا ہے۔ انہوں نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ حضور کو اس سے سخت صدمہ ہوا۔ کیونکہ انسانوں کی اصلاح آپ کا اصل مطلوب تھا نہ کہ ان کا خاتمہ۔

اہل فزارہ و عذرہ نے معرکہ خیبر میں یہود کی امداد کی تھی، ان کی سرسری تہنیت کے لیے بشیر بن سعد بن ثعلبہ خزرجی مختصر سادستہ لے کے گئے۔ معمولی جھڑپ ہوئی اور حریف مغلوب ہوا۔

بنو سلیم کے بارے میں حملہ کی تیاریوں کی اطلاع ملنے پر ابن ابی العوجا سچاس آدمیوں کا دستہ طلب کر دی کے لیے لے کے دشمن کی سرحد تک گئے۔ مخالفین کی تعداد زیادہ تھی انہوں نے حملہ کر کے پورے دستہ کو شہید کر دیا۔ صرف کمانڈر زخمی حالت میں مدینہ پہنچ سکے۔ اسی طرح بنو قناعہ کی جانب اذات اطلح کا علاقہ، کعب بن عمیر انصاری بہت ہی چھوٹی چھوٹی پارٹی لے کر گشت کے لیے گئے۔ حریف طاقتور تھا۔ اس لیے یہ پورا دستہ بھی کام آیا۔ شاید کوئی ایک صحابی بچ کے لوٹے۔

بنی ہوازن اسلام دشمن طاقتوں کو متعدد جنگی مدد سے پکے پیسے۔ ان کے بارے میں اطلاع آئی کہ مدینہ سے نہ منزل کی دوری پر وہ حملہ کے لیے قوت جمع کر رہے ہیں۔ ایک مختصر سادستہ شجاع بن وہب اسدی کے زیر کمان گشت کے لیے بھیجا گیا۔ کوئی جھڑپ نہ ہوئی۔

اسی زمانے میں (جمادی الاولیٰ ۶ھ) جنگ موتہ واقع ہوئی۔ مگر چونکہ وہ بھیج معنوں میں ایک غیر ملکی طاقت سے لڑائی تھی۔ اس لیے اس کا تذکرہ ہم جنگ تبوک کے ساتھ علییٰ ذکر کریں گے۔ قیس بن رفاعہ (یا رفاعہ بن قیس) سردار بن حبشم کے بارے میں اطلاع ملی۔ کہ وہ حملہ کے لیے آدمی جمع کر رہا ہے۔ ابو حدرواسلمی کو دو آدمیوں کے ساتھ محض گشت کے لیے بھیجا انہوں نے بڑی حکمت سے بغیر کسی قوت کے دشمن جتنے کو خوفزدہ کر کے منتشر کر دیا۔ اور ان کے جانور بھی ضبط کر لائے۔

بنو قناعہ کے متعلق خبر ملی۔ کہ وہ کچھ دوسرے عناصر کو ساتھ لے کر چڑھائی کرنا چاہتے ہیں۔ عمرو بن العاص ذات السلاسل کے مقام پر ۳ سو سپاہیوں کا دستہ لے کے پہنچے۔ یہ جگہ وادی القریٰ سے آگے ہے اور یہ پورے کاپورا علاقہ اسلامی ریاست کے حق میں برسوں خطرناک رہا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ دشمنوں کی طاقت زیادہ ہے۔ عمرو بن العاص نے قاصد بھیج کر مزید کمک طلب کی۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کی کمان میں دو سو آدمیوں کا ایک دستہ فوراً بھیجا گیا۔ حملہ ہرتے ہی دشمنوں کا گروہ بھاگ گیا۔ ان کے کچھ پوشی

قبضے میں کر لیے گئے۔

ابوقنادہ اور محکم بن جثامہ کسی موقع پر گشت کے لیے نکلے اتفاقاً عامر بن الاشبیط اشجعی چند آدمیوں کو ساتھ لیے ہوئے ملا۔ اس نے مسلمانوں کی طرح سلام کہا لیکن محکم نے اس کے سلام کو ایک چال سمجھا اور دشمن قرار دے کر قتل کر دیا۔ اس واقعہ پر قرآن نے یوں گرفت کی۔ کہ یا ایہا الذین امنوا اذ ضربتم فی سبیل اللہ فتبیتنوا ولا تقولوا لمن استی علیکم سلاماً مستمبناً۔ یعنی گشت کو نکلو تو آدمیوں سے تعارف حاصل کرو اور تحقیق حال کر کے انہیں اچھی طرح سمجھو اور جو کوئی تم کو اسلامی طریق پر سلام کہے خواہ مخواہ اسے غیر مسلم نہ قرار دے۔ حضور نے بھی سخت تنبیہ کی۔ بعد میں مقتول قبیلہ کا سردار عبید بن بدقن ہما کا مطالبہ لے کر آیا۔ حضور نے ۵ اونٹ اسی وقت دے دیے۔ اور بڑی رد و کفر کے بعد سردار سے منوا یا کہ ذبنتیہ ۵ اونٹ بعد میں لے لے۔

جب شہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ابو عبیدہ بن الجراح سپاہیوں کی جمعیت لے کر سیف الجحش لے کر محض سمندر تک گشت کر کے اور چند روز ساحلی علاقے میں گھوم کر واپس آئے۔ اس نقل و حرکت کا مشاہدہ ایک طرف شاہ رانہ کی دید بانی تھا اور دوسری طرف قریش کو یہ تاثر ملا کہ آج کل حکومت مدینہ کی توجہ صرف مدینہ ہی ہے۔ واضح رہے کہ قریش کی عمدہ شکنجے کے بعد یہ نقل و حرکت فتح مکہ کی خبر کا پیرایہ آغاز ہوئی۔

## چوتھا بڑا معرکہ۔۔۔ فتح مکہ

اوپر قریش اور دوسرے مخالفین کی بڑی بڑی چڑھائیوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں اور واضح ہے کہ بدر احد اور خندق کے۔۔۔ معرکوں میں جاہلی قوتیں خود چڑھائی کر کے مدینہ آئیں اور ساری توجہیں سامی دولت کے آس پاس ہوئیں ان آویزشوں میں حکومت مدینہ نے محض مدافعتیہ پوزیشن اختیار کی۔ معرکہ خندق کے بعد حضور کی سیاسی بددیت نے بالکل صحیح پیش گوئی کر دی تھی کہ اب قریش کی چڑھائیاں ختم ہو گئیں۔ بلکہ بدبشارت بھی دے دی کہ اب انشاء اللہ ہم ان کے خلاف دھاوا بولیں گے۔ پناہ بیچ میں جب صلح حدیبیہ واقع ہوئی اور قریش کی تلوار نیام میں چلی گئی۔ تو اس موقع پر فائدہ اٹھا کر حضور نے ایک طرف تو مدینہ کی شورش پسند قوتوں سے تظہیر کرنی۔ اور دوسری طرف شمال کی جانب یہودی اپنی قوت کے جو مضبوط مراکز بنا کر ان سے جنگی سازشوں کے اڈوں کا کام لے رہے تھے ان کی حضور نے بیخ کنی کر دی۔ اسی کے ساتھ ساتھ قبائل کی چھوٹی چھوٹی شورشوں، جنگی نیابوں اور فتنہ پردازوں کا پے درپے اس سرگرمی سے فوٹاں لیا اور ہر کڑ بڑ کی اس پھرتی سے سرکونی کی کہ مدینہ کا ماحول دو۔۔۔ ایک خاص صاف اور نیا امن ہو گیا۔ معرکہ خندق سے فتح مکہ تک لے

و قہنے میں اسلامی ریاست کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور تحریک اسلامی نے اپنے سیاسی وجود کو اچھی طرح منوالیا۔ ہر طرف محسوس ہونے لگا کہ سچائی اور انصاف کی یہ نئی طاقت جو ابھر رہی ہے۔ تو یہ کوئی ایسا غبار نہیں ہے جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اڑنے لگے۔ اور اسلامی قیادت کا جھنڈا کسی کھوکھلے کھمبے پر نہیں لہرا رہا جسے پھونکوں سے گرا دیا جائے۔ عوامی عناصر کو محسوس ہونے لگا کہ مستقبل قریش کا نہیں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔

اب چونکہ دشمن سے نجات پانے کا کوئی راستہ ماسوا اس کے نہ تھا کہ اس کے گڑھ کو ختم کیا جائے۔ اور جاہلیت کی قیادت کا چراغ اس کے اپنے گھر میں گل کر دیا جائے، اس لیے دفاعی جدوجہد کی تکمیل کے لیے ایک نہ ایک دن جارحانہ اقدام ضروری تھا۔ قریش کی شامت اعمال کہ انہوں نے خود ہی معاہدہ حدیبیہ کو توڑ ڈالا۔ جو فریقین کے درمیان ایک حفاظتی فیصلہ امن بنا کھرا تھا۔

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ بنی بکر اور بنی خزاعہ کے درمیان پہلے سے مخالفت تھی اور انتقام و انتقام کا چکر چل رہا تھا۔ مگر بیچ میں یکایک اسلامی تحریک ایک نشوونما تک مسئلہ بن کے نمودار ہوئی۔ اور قریش و دیگر مشرک قبائل محض اس کی مخالفت کے لیے ایکا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے جذبات مخالفت کا لادہ کچھ دیر کے لیے اندر دب گیا۔ یہاں تک کہ جب صلح حدیبیہ واقع ہوئی، تو اس کی ایک دفعہ سے فائدہ اٹھا کر بنو خزاعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خلیفانہ رابطہ جوڑ لیا۔ اور بنو بکر قریش کے ساتھ رہے۔ کچھ مدت تو چپ چاپ گزر گئی۔ لیکن آخر کار پرانے جذبات عناد کی بارود بھڑک اٹھی۔ بنو بکر نے مصالحت کے اس دور کو غیبت سمجھا جس میں کسی اور جانب سے تصادم کا اندیشہ نہ تھا۔ انہوں نے بنو خزاعہ کا ایک آدمی قتل کیا۔ اور پھر بھر پور حملہ کر کے خوب ظلم ڈھایا۔ یہاں تک کہ حرم میں بھی ان کے پٹاہ گزنیوں کی جان بخشی نہ کی اور حالت نماز میں بھی درگزر نہ کیا۔ بنو بکر کی اس خونریزی میں قریش نے ان کی پوری پوری مدد دی تھی۔ اور اس احمقانہ حرکت سے انہوں نے معاہدہ حدیبیہ کو پامال کر دیا۔ بنو خزاعہ کی طرف سے عمرو بن سالم نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں جا کر فریاد کی۔ پھر بدیل بن ورقانے ایک وفد لے جا کر سارا حان سنایا۔ حضور پر خلیفانہ عہد کی وجہ سے واجب ہو گیا کہ بنو خزاعہ کی مدد کریں۔ حضور نے قاصد کے ذریعے قریش تک تین شرطیں صورت حالات کو درست کرنے کے لیے بھیجی ہیں۔ ایک یہ کہ مقتولین کا خون بہا ادا کریں۔ دوسرے یہ کہ بنو بکر کی حمایت سے الگ ہو جائیں۔ ورنہ تیسری یہ کہ معاہدہ حدیبیہ کے خاتمہ کا اعلان کر دیں۔ قریش تو ازن تو کھو ہی چکے تھے۔ کہلا بھیجا کہ صرف تیسری شرط منظور ہے۔ بعد میں پچھتائے۔

اب قریش کے حلقہ قیادت میں نشوونما پھیلی۔ لڑنے کی قوت ان میں ختم ہو چکی تھی۔ چند جنگی معرکوں

میں ان کے قیمتی افراد ان سے چھین گئے تھے۔ اور ان کی فوجی طاقت کو ناقابل اندمال چرکے آچکے تھے۔ اور ان کی معیشت کا دامن بری طرح پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ ان کی معاہدت کرنے والے یہود کچلے جا چکے تھے۔ اور دینہ ایک طرف دعوتی ذرائع سے اپنے اثرات اتنے وسیع کر چکا تھا کہ مکہ کے گرد بھی اسلامی ریاست کے حامی قبائل کا ایک حلقہ پیدا ہو چکا تھا۔ دوسری طرف معاہدانہ اور حلیفانہ تعلقات کا دائرہ پھیلا یا جا چکا تھا۔ تیسری طرف مفسد قوتوں کو دبا کر ایک وسیع علاقے میں لائینڈ آرڈر خوب اچھی طرح قائم کر کے نظام نوکی عمارت اٹھاتا جا رہا تھا۔ اب قریش جارحانہ اقدام تو کیا کر سکتے۔ اب تو درحقیقت ان کے لیے اپنی ہی پٹری پر اپنا دفاع کرنا سب سے مشکل تھا۔ ان کے لیے اب جو کچھ بھی بچاؤ تھا۔ معاہدہ حدیبیہ کے ذریعہ تھا۔ یہ وہ کسبھی نے خود ہی اپنے سامنے سے ہٹادی اور گویا از خود یہیر کو دعوت دی کہ آؤ اور ہمیں کیفر بردار بنا کر چھینو اور آخر مکہ کا سب سے بڑا جاہلی لیڈر پریشان ہو کر مدینہ روانہ ہوا کہ تمہیں یہ خبر دے دوں اور اس حوصلہ شکن فضا سے درچار ہوا کہ جس کا وہ شاید تصور بھی نہ رکھتا ہوگا۔ وہ اپنی بیٹی عمرہ مومنین حملہ آور ہونے کے گھر میں جا کر بستر پر بیٹھنے لگا، تو بیٹی نے پک کر کہہ دیا کہ تم شریک ہو کر خدا کے رسول کے پاس گئے ہو، پر نہیں بیٹھ سکتے۔ پھر وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما سے عرض کیا کہ میں نے تمہیں جیسے بھلا مسلمان لیڈروں سے جا جا کر ملا اور ہر ایک کے مدد سے مل کر تیار ہو گیا۔ حدیبہ کہ اس نے حضرت کو ہر طرف سے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارش کے لیے کہا اور جب یہ بھی نہ ہو سکا تو پانچ سو مسلمانوں کے ساتھ مدینہ کے دروازے پر حاضر ہو کر حضرت کو اس کی اجازت دیں۔ کوئی صورت نہ پا کر ہر سوں سے گزرتے ہوئے حضرت علیؑ کے مشورے کے مطابق مسلمانوں کے مجمع میں اپنی طرف سے ایک طرف ہو کر کھڑے ہوئے اور ان کا اعلان کر دیا۔ اور بغیر حضورؐ کی طرف سے جوابی قبولیت حاصل کیے نامہ واپس چلا گیا۔ مگر لوگوں نے وہاں پر چھپی اور اس کے یکطرفہ اعلان جو اس کا حال معلوم ہوا۔ تو سب نے کہا۔ کہ یہ تو حضرت علیؑ نے ہمارے ساتھ مذاق کیا ہے۔ دیکھیے کہ ان خطاط پذیر منفی طاقتوں کی بے لیت بھی کس طرح ماری جاتی ہے۔

جلد ہی حضورؐ نے اعلان کر دیا کہ مسلم رشتہ کا رتیار ہو جائیں اور اپنے گھر میں بھی حکم دیا کہ تمہیں ہاتھ دین۔ لیکن یہ امر بالکل راز میں رکھا کہ کدھر کا ارادہ ہے حتیٰ کہ حضرت عائشہؓ کو بھی علم نہ ہوا۔ ہاتھوں سے ہاتھوں سے حضورؐ کے لیے اسلحہ تیار کیے گئے۔ اغلباً قیاس سے بعض لوگوں نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ تمہارے چڑھائی ہونے والی ہے۔ کیونکہ اتنا بڑا لشکر کسی اور طرف سے جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔

عاطب بن ابی بلتعہ کے اہل و عیال مکہ میں گھرے ہوئے تھے اور چونکہ ان کا کوئی قبیلہ حمایت کے لیے نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے ان کے بچاؤ کے لیے مدینہ کی تیاریوں کا خاص ایک مفید خطے ذریعے قریش

کو لکھ بھیجے تاکہ وہ احسان کی بنا پر ان کے اہل و عیال سے تعزیر نہ کریں۔ اس کے ساتھ وہ یہ سمجھتے تھے کہ  
 ۳۱۔ اطلاع کے باوجود اسلامی فوج کی فتح یقینی ہے اور ان کا خط نتیجہ کے اعتبار سے کوئی بڑا نقصان اسلام  
 کو پہنچا سکے گا۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح خارجی حالات اور ذہنی تاثرات میں گھر کر  
 کبھی کبھار کسی صالح ترین آدمی سے بھی انتہائی درجہ کی لغزش ہو سکتی ہے۔ حضور کو اس خفیہ خط کا علم  
 فوق العام ذرائع سے ہوا۔ اور آپ کے فرستادوں نے روضہ خاخ میں جا کر مکہ جانے والی ایک عورت  
 کی چوٹی سے اسے برآمد کیا۔ اتنی بڑی خطا سے حضور نے اس لیے درگزر فرمائی کہ عاطف مخلص تھے۔  
 بدری صحابی تھے۔ ایمان اور حسن کردار رکھتے تھے۔ اور یہ ایک لغزش ان سے بہ تقاضائے بشریت ہو  
 گئی تھی۔

حضور نے دس ہزار سپاہیوں کا لشکر عظیم ساتھ لے کر اور رمن ان کو مدینہ سے کوڑا کیا۔ آپ نے  
 ایک عظیم فوجی جرنیل کی حیثیت سے ایسا سیر پھیر کا راستہ اختیار کیا کہ قریش کی جوگتی ٹولی دیکھ بھال کے  
 لیے نکلی تھی۔ وہ کسی اور طرف ماری ماری پھرتی رہی۔ اور مسلم فوج نے یکا یک مکہ کے سامنے جا پڑاؤ  
 ڈالا۔

حضور حجفہ پہنچے تو آپ کے چچا عباس مع اہل و عیال آئے۔ پھر مقام ابواء میں پہنچے تو ابوسفیان  
 بن حارث بن عبدالمطلب یہ دوسرے ابوسفیان ہیں جو حضور کے چچا زاد بھائی بھی تھے اور علیہ سعید  
 کے واسطے سے رضاعی بھائی ہیں، اور عبد اللہ بن ابی امیہ (حضور کے چھوٹے زاد بھائی اور ام المومنین ام سلمہ  
 کے سوتیلے بھائی) نے حاضر ہو کر باریابی کی اجازت مانگی۔ انہوں نے قریبی عزیز ہو کر اسلام کی مخالفت میں  
 جو شدید اذیتیں حضور کو دی تھیں ان کی بنا پر آپ نے ملنے سے انکار کر دیا۔ ابوسفیان نے عالم یاس میں  
 کہا کہ اگر معافی نہ ملے تو میں بال بچوں کو عرب کے آتشیں ریگستان میں لے جاؤں گا۔ اور ہم سب بھوکے  
 پیاسے رہ کر مر جائیں گے۔ حضرت ام سلمہ نے بھائی کی سفارش کی اور حضرت علیؑ نے دونوں کو مشورہ دیا  
 کہ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کے الفاظ میں طلب عفو کریں چنانچہ انہوں نے جا کر وہی کہا۔ تَا اَللّٰہُ  
 لَقَدْ اَشْرَکَ اللّٰہَ عَلَیْتَا وَاِنْ کُنْتَ لِنَاطِیْنِ۔ دُبْحَدَا! اللّٰہُ نے آپ کو ہم پر برتری بخشی اور واقف  
 ہم خطا کار تھے، حضور کا دل ان الفاظ سے گھٹل گیا۔ اور آپ نے بھی وہی حضرت یوسفؑ والا جواب  
 دیا۔ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَکُمْ وَهُوَ الرَّحِیْمُ الرَّحِیْمِمْ (تم پر آج  
 کے دن کوئی گرفت نہیں ہے۔ خدا تمہیں معاف کرے اور وہ رحم کرنے والوں سے سب سے بڑھ کر  
 کرنے والا ہے)

مرا الظہران کے مقام میں پہنچ کر حیب فوجی کیمپ لگا یا گیا تو بطور منسلحت رات کو سردی عالم  
 علی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ہر سپاہی اپنے لیے نیلچہ آگ روشن کرے۔ ابوسفیان بن حرب، حکیم بن  
 حزام اور بديل بن رزاق جیسے کابردیکہ جنال کے لیے نکلے۔ بلند ہی سے دس ہزار چولہوں کو روشن دیکھا  
 تو کہتے ہیں رہ گئے کہ اتنا بڑا لشکر مکہ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ پاس ہی سے حضرت عباس  
 گزرے، اذانیں پہنان کر ابوسفیان کو پکارا۔ بات چیت ہوئی۔ حضرت عباس نے بتایا کہ حضرت محمد صلی  
 اللہ علیہ وسلم اپنی فوج لے کے اچھے۔ اب قریش کی خیر نہیں۔ ابوسفیان نے پوچھا کہ اب چارہ کار کیسے  
 ہے؟ اس نے کہا کہ میرے ساتھ خچر پر بیٹھ جاؤ اور میں کے ستوڑے کے بات چیت کی جائے۔ خچر آگے بڑھا تو فوجی  
 طریق سے قدم قدم پر سپاہیوں نے پوچھا: کون جا رہا ہے؟ حضرت عباس تعارت کرتے تو راستہ میں  
 باٹا۔ قریب پہنچے تو حضرت عمرؓ نے دیکھ لیا اور ابوسفیان کو پھینک کر پھاڑے کہ اودھن خدا آج تجھے یہ قادی  
 دے۔ دروازے بڑے قتل کی اجازت لینے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے۔ حضرت عباس  
 نے بھی خچر تیار کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے پہلے پہنچ کر اپنی بات کہی اور حضرت عباس نے اپنا موقف بتایا۔  
 میں ابوسفیان آٹیاہ دے کر لایا ہوں۔ اس موقع پر یہ بات چیت ہوئی۔

رسول اللہ: کیا ابوسفیان، کیا اب۔ کبھی تم کو یقین آیا کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں؟

ابوسفیان: کوئی اور خدا ہوتا تو آواز ہمارے پاس نہ ہوتا۔

رسول اللہ: کیا اس بات میں کچھ شک ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں۔

ابوسفیان: اس میں قدرے شبہ ہے۔

بہر حال حضور کے چپانے اس کی کمزور نفسیات کو سمجھتے ہوئے ترغیباً لہا کہ چھوڑ دو بھی سب سیدیں  
 راج اسلام قبول کر لو۔ اور سب تک مکہ کا سب سے بڑا ایڈرنالٹ کے مجبور ہو کر اسلام کے دارلئے  
 داخل ہو چکا تھا۔ اسلامی کیمپ نے مکہ میں فوج کے داخلہ سے قبل ابوسفیان کو ایسے لطیف انداز سے  
 حراست میں رکھا کہ اسے محسوس نہ ہوا۔ صبح شہر میں داخلہ کے لیے فوج نے کد آگے راستے مارے  
 کیا حضرت عباس حضور کے ارشاد سے ابوسفیان کو ایک ٹیلے پر لے گئے تاکہ وہ ایک بار ہمیشہ اسلام کی  
 عظمت کا منظر دیکھ لے۔ سب سے پہلے منارِ کعبہ، پھر کعبہ، پھر بیت المقدس اور سب سے آخر میں منارِ مدینہ  
 اپنے اپنے علم لیے گزرتے رہے۔ ابوسفیان ہر دہانے کے اُسے میں پوچھتا جاتا۔ بعد میں عبادہ ان مقام  
 سے گزرے تو سپاہیانہ جوش میں آکر جس کے پس منظر میں وہ تاریخ کشمش موجزن تھی پھاڑتے کہ  
 البیہر یوم المدحمة۔ آج گھمسان کا دن ہے۔ البیہر تستقل اللعبة۔ آج کے دن کعبہ کا



ماحول معرکہ سے لیے کھول دیا جائے گا۔ آخر میں حضور کی سواری سادگی کی شان کے ساتھ گزری جس کے آگے آگے زبیر بن العوام علم اٹھائے ہوئے تھے۔ حضور کو سعد بن عبادہ کے نعرہ کا علم ہوا۔ تو فوراً ان سے علم واپس لے کے بیٹھے کے سپرد کر دیا۔ اور فرمایا کہ آج کا دن کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔ اور بروفا کا دن ہے۔ اس دن فقرے میں حضور نے اپنی فاتحانہ پالیسی کا اعلان کیا جو عفو و کرم پر مبنی تھی۔ پھر یہ اعلان عام کر دیا گیا کہ جو کوئی بھی مسجد حرام میں داخل ہوگا۔ یا ابوسفیان کے گھر میں چلا جائے گا اور جو کوئی بھی مقابلہ کے لیے ہتھیار نہ اٹھائے گا۔ اس کے لیے امن ہے۔ بشرطیکہ کسی قابلِ تعزیر مجرم کا مجرم نہ ہو۔ خود ابوسفیان ہی نے کہہ میں آگے بڑھ کے اس اعلان کو باوازِ بلند پکارا۔ یہ سن کر مندہ بن غنہ زوجہ ابوسفیان اس کی موٹھی کھینچ کر چلائی کہ اے بنی کنانہ۔ اس کج بخت کو قتل کر دو۔ یہ کیا بک رہا ہے وہ گالیاں دیتی رہی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ ابوسفیان نے کہا کہ اب ایسی باتوں سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کرنے کی تاب اب کسی میں نہیں حضور کا جب شہر میں داخلہ ہوا تو دنیا بھر کے فاتحین کے برعکس ہر مارے عجز کے خدا کے سامنے اس طرح جھک رہا تھا کہ پیشانی کجاوے کو چھو رہی تھی اور زبان سورہ فتح کی تلاوت میں مصروف تھی۔

عکرمہ بن ابوہل، صفوان بن امیہ اور سہیل بن عمرو نے خندمہ پہاڑ میں قریش کے چند کوتاہ اندیش اوباشوں کو جمع کر کے آمادہ شہرت کیا۔ حماس بن قیس بن خالد بھی ان لوگوں سے مل گیا۔ دو صحابی کرز بن جابر الضہری اور خنیس بن خالد بن ربیع لشکر سے جدا ہو کر کسی دوسرے راستے جا رہے تھے کہ اس ٹولی نے دونوں کو شہید کر دیا۔ حضرت خالد کو اطلاع ملی تو انہوں نے فوراً ان کی سرکوبی کی۔ بارہ آدمی کھیت رہے اور بقیہ بھاگ نکلے جس میں حماس بھی تھا۔ ایسی ہی ایک اور چھوٹی سی ٹولی شہر میں مزاحمت کرنے کے لیے مجتمع دکھائی دی۔ حضور کو معلوم ہوا تو حضرت ابوہریرہ کے ذریعے انصار کا دستہ طلب کیا۔ ان کو یہ منظر دکھایا کہ دیکھتے ہو ان کی شرانگیزی؛ یعنی ایک طرف تو عفو و رحمت کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اور فاتح قوت خون کا ایک قطرہ بھی بہانے سے گریز کر رہی ہے اور دوسری طرف یہ کینہ لوگ ہیں کہ اسے نیام کردہ تلواروں کو لہرانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ حکم دیا کہ یہ مزاحمت کریں تو ان کا پوری طرح صفایا کر دیا جائے۔ ابوسفیان کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم کی اطلاع ہوئی تو وہ دوڑا دوڑا پہنچا اور التماس کیا: یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، قریش پہلے ہی تباہ ہو چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو، کہ ان کا نام و نشان ہی دنیا سے مٹ جائے؛ ہلکی سی مزاحمت کے بعد شرار مار کھا کر بکھر گئے۔

حضور کے اس عفو و کرم کو دیکھ کر انصار میں بعض لوگوں نے یہ چہ میگوئیاں پھیلائیں کہ آخر آپ

پر اپنی قوم اور اپنے وطن کی محبت غالب آہی گئی۔ دراصل انہیں یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں محسن انسانیت ان سے جدا ہو کر اب مکہ والوں میں نہ رہنے لگیں۔ اور وہ اپنی محبوب بستی کے قرب سے محروم ہو جائیں۔ آپ نے ان سے خطاب کیا اور فرمایا یہ خدا کی قسم! ایسا نہیں ہے۔ میں خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں نے خدا کی طرف اور تمہاری طرف ہجرت کی۔ اب میرا جینا مرنا تمہارے ساتھ ہے۔ انصار پر رقت طاری ہو گئی۔ اور انہوں نے معذرت طلب کی۔ خدا و رسول نے ان کی معذرت قبول کی۔

لوگوں نے حضور سے دریافت کیا کہ شہر میں قیام کہاں فرمائیں گے؟ بھائی اپنے آبائی مکان میں حضور نے بڑا درد بھرا جواب دیا کہ عقیل نے ہمارے لیے گھر چھوڑا ہی کہاں؟ کہ اس میں اتروں۔ حضور کا صلہ جوں (جنت المعلیٰ) میں نصب ہوا۔ اور یہی قیام گاہ طے پائی۔ پہلے آپ اُس تاریخی مقام خیف میں گئے جہاں قبیلہ کے ساتھ نظر بندی کے دن گزارے تھے۔ پھر حرم پہنچے۔ خاص الخاص رفقاء کا ایک حلقہ ساتھ تھا۔ حجر اسود کا استسلام کیا۔ ہاتھ میں قوس لیے حرم میں نصب شدہ ایک ایک بت کے پاس جا کر پکارتے "حق آگیا اور باطل شک گیا۔ اور باطل کو تو میدان چھوڑنا ہی ہے۔" (الآیہ) قوس کے اشارہ سے ایک ایک بت گر گیا۔ پھر کعبہ کی کنجی منگا کر دروازہ کھلوا یا۔ اندر حضرت ابراہیمؑ و اسمعیل علیہم السلام کی تصویریں بنی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں پانسے کے تیر دکھائے گئے تھے۔ ان کو مٹانے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ خدا کفار کو تیر کرے۔ یہ دونوں خدا کے پیغمبر تھے اور انہوں نے جو اکبھی نہیں کھیدا تھا۔ بعد میں آپ کے حکم سے وہ تمام اصنام بھی توڑ ڈالے گئے جو مدتوں سے اُس پاس نصب تھے۔ پھر آپ نماز و ذکر میں مشغول رہے۔ مسجد کے سامنے جوم نام جمع تھا۔ اور لوگ اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے منظر ب تھے۔ انہوں نے خطاب فرمایا :

ایک خدا کے سوا کوئی اللہ نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ اچھا کر دیا  
اس نے اپنے بندے کو مدد دی۔ اسی اکیلے نے تمام شکاروں کو شکست دی !  
آج تمام کبر و غرور، خون کے تمام دعوے، مالوں کے تمام مطالبے میرے عقیدوں  
کے نیچے ہیں۔ البتہ حرم کعبہ کی توہیت اور حجاج کی آب رسانی کے عمدے اس سے  
مشتئی ہیں۔

اے قریش! اب خدا نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور نسب کے فخر کو مٹا دیا۔ تمام  
انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے۔ پھر قرآن کی آیت پڑھیں :-  
"لوگو! میں نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ ہے۔ اور تمہیں قبیلوں اور

خاندانوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے۔ کہ تم باہم دگر چھپانے جاؤ۔ لیکن معزز خدا کے نزدیک  
وہی ہے جو پرہیزگاری میں پیش پیش ہو۔ بلا شک اللہ دانادر باخبر ہے۔“  
پھر ایک قانونی اعلان کیا۔

”خدا نے شراب کی خرید و فروخت حرام کر دی ہے۔“

پھر حضور نے پوچھا :-

”تم کو معلوم ہے کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں؟“

ان الفاظ کے گونجتے ہی ظلم اور مکہ اور تشدد اور خونخواری کی وہ ساری گندی تاریخ قریش کی نگاہوں

کے سامنے سے ایک فلم کی طرح گزر گئی ہوگی جسے انہوں نے بیٹے اکیس برس میں تیار کیا تھا۔ ان کے ضمیر

بچٹ جانے کو ہوں گے۔ بے بسی اور ندامت کے عالم میں وہ لوگ پکار اُٹھے: ”اخر صریح و صریح“

اخر صریح۔ تو شریف بھائی ہے۔ اور ایک شریف بھائی کا بیٹا ہے۔“ جو اب آواز آئی۔ لا تثریب

عایکم ایود۔ اذہبوا فانتہم اطلقتا۔“ تم پر آج کچھ گرفت نہیں۔ جاؤ تم سب آزاد ہو۔“

کیا قریش کی تاریخ ظلم و جنگ کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی شخص بھی اس جواب کی توقع کر سکتا ہے؟

مگر جو کوئی بھی اس رحمتِ عالمِ سلی اللہ علیہ وسلم کی شان کریمی کو سمجھتا ہو وہ حضور سے اسی جواب کی امید بانڈے گا

کوئی اور ہوتا تو آج اکڑ کر کہتے ہیں داخل ہوا ہوتا۔ ایک ایک واقعہ کا انتقام لیتا۔ چن چن کے ان افراد کو تلواریں

کا لقمہ بناتا جنہوں نے ذرا بھی کوئی زیادتی کی ہوتی۔ مفتوح شہر میں قتل نام کر دیتا۔ لوگوں کے بال اور

عورتوں کی عصمتیں نیلام پر چڑھ گئی ہوتیں۔ لیکن فاتح چونکہ محسنِ انسانیت تھا اس لیے اس نے زمین پر قبضہ

حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انسانوں کو فتح کرنا چاہا۔ اور جسموں پر قابو پانے سے بڑھ کر دلوں کو ماتھے میں لینے

کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ مہاجرین سے کہا کہ وہ اپنے اپنے مکانات اور املاک سے دست بردار ہو

جائیں۔ شانِ لطف و احسان کا اس سے بڑا مظاہرہ کیا ہو گا کہ کعبہ کی کنجی قیامت تک کے لیے انہی عثمان

بن طلحہ کو تفویض فرمائی۔ جن سے ایک بار در کعبہ کھلوانے کی خواہش حضور نے دعوت کے ابتدائی دور

میں کی تو انہوں نے سختی سے انکار کر دیا تھا۔ اس موقع پر آپ نے مستقبل پر نگاہ جماتے ہوئے عثمان

سے فرمایا۔ ”ایک دن آئے گا کہ یہ کنجی میرے اختیار میں ہوگی۔ اور میں جسے چاہوں گا تفویض کروں گا

عثمان کی نگاہ اتنی دُور رس کیسے ہوتی۔ اس نے کہا۔ یہ شاید۔ اس روز تمام افراد قریش ہلاک ہو چکے

ہونگے۔“ فرمایا۔ ”نہیں! وہ تو قریش کی سچی عزت کا دان ہوگا۔“ اس مکالمہ کو ذہن میں تازہ کر لیجئے۔ تو

تصور یہی کہتا ہے کہ حضور کے علاوہ دوسرا کوئی بھی ہوتا تو اپنا اختیار دکھانے کے لیے لازماً کنجی عثمان سے

لے کر کسی اور کو دے دیتا۔ لیکن حضورؐ کلیدِ کعبہ حاصل کرنے کے لیے بنی ہاشم کی طرف سے حضرت علیؑ جیسے جگری عزیز تک کی درخواست سے صرف نظر کر لیتے ہیں اور کلیدِ کعبہ ہمیشہ کے لیے سابق ہاتھوں میں رہنے دیتے ہیں۔ حضورؐ نے کبھی دیتے ہوئے جب عثمان بن طلحہ کو برسوں پہلے کی وہ بات بطورِ لطیفہ یاد دلائی تو وہ پکار اُٹھے۔ کہ بے شک آپؐ خدا کے رسول ہیں: آپ نے فرمایا: کہ آج کا دن نیکی اور وفا کا دن ہے: "

اس کے بعد حضورؐ کے حکم سے حضرت بلالؓ نے کعبہ پر چڑھ کر اذان دی۔ یہ اذان گویا سلامی انقلاب کی کامیابی کا اعلان تھا۔ وہی کعبہ جہاں خدا کے بندوں کے لیے خدا کا نام پکارنا جرم بن گیا تھا اور اس سے روکنے کے لیے کتنی ہی سختیاں حضورؐ اور حضورؐ کے ساتھیوں نے جھیلیں۔ آج اس کی بندوبست پر سے باہر بلند اللہ کی بڑائی پکاری جا رہی تھی۔ اور کوئی قوت نہ تھی۔ جو مزاحم ہو سکے۔ اس لیے یوسفیہ بن حرب، عتاب بن اسید و حارث بن ہشام جیسے اکابر کعبہ کے متصل ایک گوشے میں بیٹھے اپنی بی بیوں بازی کا تصور کر رہے تھے۔ عتاب نے جلے دل سے کہا کہ اچھا ہوا کہ خدا نے سید کو اس آواز کے سننے کے لیے زندہ نہ رکھا۔ حضورؐ ان لوگوں کے پاس پہنچے اور جو جو باتیں انہوں نے کی تھیں۔ ان کے سامنے دو دیں۔ یہ لوگ شرمندہ ہوئے۔

پھر حضورؐ نے ام بانی کے مکان پر غسل کر کے آٹھ رکعت نماز بطورِ شکر نہ فتح پڑھی۔ فتح کے دوسرے روز کوہِ صفا پر سے حضورؐ نے دوسرا خطاب عام فرمایا۔ چہنہ خدا کی اس روش کی اور پھر مختصر کلمات میں حرم کی حرمت کو بیان کیا اور اسے ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا اور اس کے نظام بیان کیے۔ واضح رہے کہ مکہ کی حرمت کو اتنی بڑی انقلابی فتح کے لیے صرف ایک دن ایک پورا دن بھی نہیں مجبوراً اٹھو لا۔ کیونکہ آپؐ کی مرضی کے خلاف مکہ کے چند سر بھیرے اوباشوں نے مسلم سپاہ کے خلاف پیش دستی کر کے اسے مجبور کر دیا کہ وہ ان کا قلع قمع کرنے کے لیے قوت سے کام لے۔ سید بن ہونی یہ مجبوری ختم ہوئی۔ حضورؐ نے دوسرے روز حرم کی حرمت کو ہمیشہ کے لیے بحال کرنے کا اعلان فرما دیا۔ یوں تو عام معافی کا اعلان کر دیا گیا اور اس اعلان نے دلوں کو ایسا مسخ کیا کہ کسی میں تاب مقاومت نہ رہی لیکن مجرمین مناس کے بارے میں نام لے کر آپؐ نے فرما دیا کہ یہ لوگ جہاں بھی لپے جائیں قتل کر دیے جاویں۔ واضح رہے کہ مکہ پر قبضہ کرنے اور اسے زیرِ نظم لانے کے لیے چند روزہ مارشل لا نافذ رہا ہے یعنی تمام اختیارات فوجی کمان کے ہاتھ میں تھے اور حضورؐ نے بحیثیت سپہ سالار

حاشیہ اگلے صفحہ پر۔

افواج ہی یہ حکم جاری کیا تھا جس کی نوعیت ویسی ہی ہے جیسی کہ آج ”دیکھتے ہی گولی مار دو“  
 Shoot at sight کی ہوتی ہے اس فہرست مجربین میں چند مردوں اور چند عورتوں کے نام شامل  
 تھے۔ لیکن حضور کے عفو و حلم نے ان میں بھی اکثر کی جان بخشی کر دی۔ زیادہ سے زیادہ چار مجربین کو  
 سزائے موت دی گئی۔ ایک تحقیقی رائے یہ بھی ہے کہ صرف ایک شخص عبدالعزیز ابن حنظل کو ہلاک  
 کیا گیا۔ یہ شخص مسلمان ہوا۔ وصولی صدقات کے لیے ایک اور مسلم سائنٹی کی معیت میں اسے بھیجا گیا۔ سفر  
 ہی میں نزاع ہوئی اور مسلم سائنٹی کو قتل کر کے بیر صدقہ کے مویشیوں کو بھی ساتھ لے کر بھاگ آیا۔ دوسرے  
 بھاری بھاری فوجداری جرائم اس کے ذمے تھے۔

صفوان بن امیہ اسلامی تحریک کے کٹر مخالفوں میں تھے۔ بھاگ کر یمن جاتے ہوئے جدہ پہنچے  
 تھے۔ کہ عمیر بن وہب حجی حضور سے معافی کی منظوری لے کر جدہ سے واپس لائے۔ بعد میں اسلام  
 اختیار کیا۔

عکرمہ بن ابو جہل بھی یمن بھاگ گئے تھے۔ ان کی زوجہ ام حکیم بنت الحارث (ابو جہل کی بھتیجی)  
 خود مسلمان ہوئیں اور اپنے شوہر کے لیے حضور سے معافی کی منظوری لی۔ خود جا کر لائیں۔ عکرمہ کو جب  
 معافی کی خوش خبری ملی تو انہیں سخت تعجب ہوا کہ ان جیسے مخالف کو بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے  
 معاف کر دیا۔ حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔

عبداللہ بن سعد بن ابی سرح مسلمان تھے اور ان کو کتابت وحی کا موقع بھی ملا تھا۔ مگر منحرف ہو کر  
 مخالف محاذ سے تعاون کرنے لگے۔ یہاں تک کہ استخفاف کے لیے انہوں نے یہ بھی کہا کہ وحی خود اصل مجھ  
 پر آتی تھی۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو مجھ سے سن کر لکھوا لیتے تھے۔ ہرم سخت تھا لیکن حضرت عثمان کی طرف

لے پچھلے صفحہ کا حاشیہ: زیر جنگ علاقے میں عام شہری نظام کے مکمل قیام سے قبل اسلامی قانون کے رد سے بہر حال فوجی قوت  
 کے ہاتھوں کسی قدر کڑا عبوری نظام قائم کیا جاتا ہے اور اس نظام میں بعض احکام و ضوابط معمول کے شہری نظام سے منتقل نوعیت  
 رکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جدید اصطلاح میں اسی کو فوجی تسلط (مارشل لا) کہا جاتا ہے۔ مارشل لا اسلام کے رد سے علی الخصوص  
 اور ہر مذہب حکومت کے تحت علی العموم زیر جنگ علاقے میں محض ناگزیر حد تک مختصر سے عبوری دور کے لیے نافذ ہوتا ہے  
 اور وہ بھی مفتوح دشمنوں پر مارشل لا کے نام سے ہمارے اس دور میں کسی ملک کی فوج کا اپنے ہی ملک کے باشندوں کو شہری  
 نظم سے محروم کر کے لمبے غیر معین عرصے کے لیے اپنے تسلط میں لے لینا بالکل دوسری صورت ہے اور تم میں یہ اصطلاح  
 اس نئے مفہوم کے ساتھ استعمال نہیں کی گئی۔ اسلام میں حکومت کا ایسا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

سے باصرہ سفارش ہونے پر حضور نے یہ حیثیتِ حاکم اعلیٰ ان کو معافی دے دی۔ معافی کے بعد پھر یہ مسلمان رہے۔

مقیس بن صباہ (یا صباہ) منافقانہ طور پر اسلامی جماعت میں شریک ہوا اور دھوکے سے ایک انصاری کو قتل کر کے بھاگ آیا تھا۔ اس اقدام کا محرک یہ ہوا کہ مقیس کا بھائی غلسلی سے اس انصاری کے ہاتھوں مارا گیا۔ حضور نے اس کی دیت دلوادی۔ اس کے باوجود اس نے انصاری کو قتل کیا۔ ارتداد و فریب دہی کے علاوہ تنہا یہ ارتکابِ قتل ہی سزائے موت کے لیے کافی وجہ ہوا کرتا تھا۔

بتار بن الاسود وہ شخص ہے جس نے دوسری مخالفانہ حرکات کے علاوہ حضرت زینب پر ہجرت کے وقت حملہ کر کے اتنی اذیت دی تھی کہ ان کا حمل ساقط ہو گیا۔ پیلے چھپا رہا۔ پھر خود ہی پیش ہو کر عاجزی سے اعترافِ قصور کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سخت شرمندگی کا اظہار کیا ساتھ ہی کلمہ اسد کی قبولیت کا اعلان کیا۔ حضور نے فرمایا: میں نے تمہارا کو معاف کر دیا۔

حضرت حمزہ کا قاتل اسم بامسمیٰ وحشی سامنے آیا۔ اور اسلام قبول کیا۔ حضور نے اس سے حضرت حمزہ کے قتل کا حال سنا۔ اس کا جرم بھی معاف کیا اور اسے مشورہ دیا کہ تم میرے سامنے نہ آیا کرو۔ اس سے زخم نازہ ہوئے ہیں۔ یہ شخص اسلام لاکر بھی فسق و فجور خصوصاً شربِ نوشی سے نجات دیا سکا۔

سید القدر بن زبیر مشورہ باہل شاعر جس نے شعری قوت کو اسلام کے خدنگ آنتوں سے پیدا کیا۔ اس کے ہاتھ لیا تھا۔ یہیں ہوا۔ اور اسلام لایا۔ معافی دے دی گئی۔

کعب بن زبیر نے بھی اسلامی تحریک اور اس کے دائمی کے خلاف بھڑکے ہوئے ہوئے تھے۔ لیکن سزا سننے میں اپنے بھائی کے ساتھ حاضر ہوا۔ اسلام قبول کیا اور کئی کے پیچھے بڑبڑے سے تھپتھپا۔ سعادت پیش کیا۔ حضور نے معافی دی اور اپنی چادرِ عام میں سٹھا کر مائی۔

قیامِ مکہ ہی کے زمانے میں ایک بار حضور خانہ کعبہ کا طواف کر رہے تھے کہ فہناہ بن عمیر حبیبہ سے ارادۂ قتل سے آیا۔ حضور خود ہی پاس جا پہنچے۔ اور اس کے دل کی بات بتا دی۔ فہناہ اس کو بات پر تہمتا ہوا۔ آپ نے استغفار کے لیے کہا اور اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ معاف اس کے دل کی دنیا بول گئی۔ اور اس کے جرم سے یہ سلوک اور کس سے متوقع ہو سکتا ہے۔

عورتوں میں سب سے بڑی مجرمہ ہند بنت عتبہ تھی۔ جس نے سرگرمی سے مخالفین کی تحریکوں میں شرکت کی تھی۔ حضرت حمزہ کا مثلہ کیا تھا۔ بلکہ ان کا کلیجہ چبا گئی تھی۔ چہرہ چھپانے کے لیے نقاب پہن کر نہ خدمت ہوتی۔ حالات سے مجبور ہو کر یہ اسلام قبول کرنے آئی۔ لیکن اس لمحے بھی ڈھٹائی سے عجیب عجیب تہمتیں

باتیں حضور سے کہیں مکالمہ یوں ہوا۔

ہند : اے خدا کے رسول! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ہم سے کن باتوں کا اقرار لیتے ہیں؟  
رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) :- خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔

ہند :- یہ اقرار آپ نے مردوں سے تو نہیں لیا۔ مگر خیر۔ ہمیں یہ بھی منظور ہے۔  
رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) :- چوری نہ کرو۔

ہند :- میں اپنے شوہر ابوسفیان کے مال میں سے دو چار درہم کبھی کبھار نکال لیتی ہوں۔ معلوم نہیں کہ یہ بھی جائز ہے کہ ناجائز؟

رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) :- اولادوں کو قتل نہ کرو۔

ہند :- ہم نے تو چھٹپن میں ان کو پالا۔ بڑے ہوئے تو (جنگِ بدر میں) آپ نے ہی ان کو قتل کر ڈالا۔ اب آپ جانیں اور وہ!

جیسا کچھ قبولِ اسلام یہ مٹھا، ظاہر ہے۔ پھر یہ گستاخانہ اندازِ کلام، کوئی بھی دوسرا ہوتا تو اسے گوارا نہ کرتا۔ حضور کا بے پایاں علم تھا جس سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا تھا۔

قرشاً ابن خنظل کی لونڈی تھی۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہجوئیں گایا کرتی تھی۔ فتح کے وقت بھاگ گئی۔ بعد میں تائب ہوئی اور اسلام میں داخل ہوئی۔  
ایک عورت بہ سلسلہٴ قصاص قتل ہو گئی۔

چند مردوں اور عورتوں کے متعلق احادیث اور کتب سیرت کی روایات میں خاصا اختلاف ہے۔ لیکن قطعیت سے ان میں سے کسی کا سزائے موت پانا ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

ایسے کٹر دشمنوں کے لیے ایسے عفو عام کی مثال اس درجہ کی فتح کا ملہ حاصل کرنے کے بعد کسی اور کی زندگی سے تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

سرزمینِ مکہ کی فتح سے بڑھ کر عظیم فتح یہ تھی کہ حضور مقامِ صفا کی بلندی پر بیٹھے تھے اور لوگ جوق در جوق آکر اسلام قبول کر رہے تھے۔ ان سے توحید و رسالت کے اقرار کے ساتھ خصوصی طور پر بعض رائج الوقت خرابیوں سے اجتناب کا عہد بھی لیا جاتا۔ بیعت کے اجراء یہ تھے۔

• میں خدا کے ساتھ کسی کو بھی اُس کی ذات اور اُس کی صفات اور عبادت و استعانت کے استحقاق میں شریک نہ کروں گا۔

• چوری نہ کروں گا۔ زنا نہ کروں گا۔ خونِ ناحق نہ کروں گا۔ لڑکیوں کو ہلاک نہ کروں گا۔ کسی پر

ہتھان نہ لگاؤں گا۔

• معروف کے دائرے میں حسب استطاعت خدا کے رسول کی اطاعت کروں گا۔  
پندرہ روز یا کم و بیش قیام رکھنے کے بعد جب مکہ سے حضور روانہ ہوئے تو اصل تعمیری کام کے لیے حضرت معاذ بن جبل کو مامور کیا کہ وہ لوگوں کو اسلامی نظام حیات، اسلامی عقائد، اسلامی اخلاق اور اسلامی قانون اور اسلامی ثقافت کی تعلیم دیں۔ اسلامی عدلیہ کا نظام آپ کے اپنے ہاتھوں حد جاری کرنے کے اس مشہور واقعہ سے ہوا۔ جس میں ناطقہ بنت ابی الاسد کو چوری کے جرم میں بڑے سفارشی دباؤ کو سزا دینے کے قطع پر کی سزا دی گئی۔ خنہین و طائف سے فارغ ہونے کے بعد مکہ آ کر حضور نے عتاب بن اسید کو نائب حاکم مقرر کیا۔ اور ایک درہم یومیہ کا معاوضہ ان کے لیے طے کر دیا۔

### چند اہم اشارات :

۱۔ فتح مکہ تحریک اسلامی کی تاریخ کا سلیب ترین واقعہ ہے۔ اب گویا نظام حق کے رستے سے سب سے بڑی مزاحمت بہت گئی تھی۔ عرب کی یہ پہلی جمالی قیادت ہے یہ مرکز نظام اور اس قیادت کا ہمہ جہت نمک نہ ہو جاتا۔ درویشوں کی ذہنی وابستگی کا یہ قدیمی جوڑ بیک جگہ سے اٹل نہ ہاتا ممکن ہی نہ تھا۔ اسلامی انقلاب کی روپوشی رفتار سے آگے بڑھ سکتی۔ جب جمالی قیادت کا علم سرنگوں ہو گیا تو پھر نظام سماجی ہرگز نہ بنا اور ثابت کے گرد عوام کا سمنے رہنا ممکن نہ رہا۔

۲۔ اس وقت ہی پھیلاؤ کی فتح مکہ نے لہجہ کر دیں۔ بہت سے قبائل اسلام کو قبول کر گئے۔ ان سے یہ مندرجہ شدہ اقربائے سائے یا تو ان سے سلیفانہ تعلقات تھے یا وہ ان کے پڑوسیوں کے دست نگار اور مقرومن تھے۔ یا ان کی سماجی برتری سے مرغوب اور مذہبی لحاظ سے ان کی پرہیزی سے مسحور تھے۔ مذہب کی عظمت کا ثبوت جب ٹوٹ گیا۔ تو ان کے رستے صاف ہو گئے۔

۳۔ بہت سے عوامی حلقوں میں یہ اعتقاد پھیلا ہوا تھا کہ مکہ میں صرف وہی غالب رہ سکتا ہے۔ جسے اللہ کی تائید حاصل ہو۔ اور جو طاقت حق پر نہ ہو۔ اسے مکہ میں فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس طرح اعتقاد اور ہر مذہب کے بعد سے بہت قوی ہو گیا اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ قریش مقبول الہی ہیں۔ پناہ چھوگے کہا کرتے تھے۔ کہ اترکوه و قومہ فاندان ظہر علیہم فہو نبی صدق سے اپنی قوم سے نمٹ لینے دو۔ اگر اس نے قوم کو زیر کر لیا تو وہ نبی صادق ہے، اس اعتقاد کے مطابق ہی اب رائے عام کا مرجع اسلامی تحریک بن گئی۔ نہ صرف مکہ کے لوگوں نے بلکہ آس پاس کے قبائل کے وفود نے آ کر خوشی خوشی اپنے آپ کو اسلامی تحریک کا خادم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کا پیرو بنایا۔



اب دعوتی اور تعلیمی کام کے لیے میدان بالکل صاف ہو گیا۔ اور ایک ایک مسلمان کے لیے ہر طرف موقع نکل آیا کہ وہ تحریک حق کا پیغام عوام تک پہنچائے۔ کوئی اب رکاوٹ ڈالنے والا نہیں تھا۔

۲۔ مکہ کو حضور جب مہم لے کے چلے تو شروع ہی سے ایسی تدابیر اختیار کیں کہ خوئی ریزی نہ ہونے پائے۔ اپنے ارادہ کو اخفاء میں رکھ کر سفر کیا اور قریش کو کسی تیاری اور آس پاس سے کوئی مدد حاصل کرنے کا موقع دیے بغیر مکہ کے دروازے پر یکایک جا پہنچے۔ اس طرح مخالف طاقت جو پہلے ہی حد درجہ کمزور ہو چکی تھی۔ بالکل مہوت رہ گئی۔ پھر ابوسفیان جس کی ذہنی شکست کا آغاز بہت قبل ہو چکا تھا اسے مناسب تدابیر سے بالکل مرعوب کر دیا گیا۔ ابوسفیان کے جھک جانے کی وجہ سے کوئی موقع نہ رہا کہ اہل مکہ مزاحمت کریں۔ یہی مقصد تھا جس کے تحت آپ نے ایک فوجی افسر کو محض ایک سخت نعرہ لگانے کی بنا پر دستے کی کمان سے الگ کر دیا۔ اور اہل مکہ کو اطمینان دلایا کہ آج کا دن کعبہ کی حرمت کا دن ہے۔

۳۔ حضور نے تحریک کے کٹر دشمنوں اور خود اپنی ذات پر اور اپنے محبوب ساتھیوں پر کئی سال تک منظم دھانے والوں، تمسخر کرنے والوں، علاقیت پھینکنے والوں، راستے میں کانٹے ڈالنے والوں، قید کرنے والوں، قتل کی سازش کرنے والوں، وطن سے نکالنے والوں پھر تلوار لے کے میدان جنگ میں اترنے والوں کے گندے اور سنگین جرائم بالکل بھلا دیے اور عام معافی کا اعلان کر دیا۔ سختی کے بجائے نرم پالیسی کا مدعا ظاہر تھا۔ حضور ایک دنیوی فاتح نہ تھے کہ حیرت و قوت سے کچھ لوگوں کو محکوم بنا لینا اور ڈنڈے کے زور سے ڈرا دھمکا کر ان کو اپنے احکام کا پابند بنا لینا کافی ہوتا۔ آپ ایک دعوت، ایک مشن، ایک اخلاقی تحریک اور ایک پاکیزہ نظام کے علمبردار تھے۔ آپ کے مقصد کے لیے ایسے مفتوحین بیکار تھے جنہیں مارے باندھے اطاعت میں لیا گیا ہو۔ آپ کو دلوں کی تبدیلی درکار تھی۔ دلوں کی تبدیلی ہمیشہ نرمی اور احسان اور عفو کی صورت میں ہو سکتی ہے۔ آپ کا مدعا جیسی پورا ہو سکتا تھا کہ اہل مکہ شرمسار اور نادم ہو کر نیا دور شروع کریں۔ ایک نظریہ حق اور تعمیری نصب العین رکھنے والی ہستی کے لیے کوئی دوسری فاتحانہ پالیسی قابل عمل نہ تھی۔

محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ اس حقیقت نفس الامری پر بھی تھی کہ قریش بہر حال عربوں میں قیادت کرنے کے لیے موزوں ترین تجربہ کار عنصر ہیں۔ یہ قبائل عرب کے اوراق پر لیٹان کی شیرازہ بندی کے لیے ایک ایسا مضبوط بندھن ہیں کہ اگر ان کو ضائع کر دیا جائے۔ تو آسانی سے کوئی دوسرا بدل فراہم

نہیں کیا جا سکتا۔ اصولاً یہ اسلامی نظریہ برحق اور واجب القبول کہ امامت و قیادت کا مستحق وہ جو ایمان و تقویٰ میں پیش پیش ہو۔ مگر ایمان و تقویٰ کے ساتھ قیادت کی ذہنی و عملی صلاحیتوں کا ہونا تو ایک کھلی ہوئی عقلی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے اثر و رسوخ چاہیے۔ حکمرانی اور کمانڈ کا تجربہ چاہیے۔ تدبیر و مصلحت کا شعور چاہیے۔ زبان اور دوسری قوتوں سے کام لینے کی مہارت چاہیے نفسیات عامہ کا عرفان چاہیے پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ قیادت کرنے والے افراد یا عناصر کامیاب جیسی ہو سکتے ہیں کہ ان کی برتری عوام میں پہلے سے مسلم ہو۔ اور رائے عام کی سر زمین میں ان کی جڑیں گہری ہوں کسی قیادت کا درخت ہوا میں نصب نہیں ہو سکتا قریش کی قیادت کی صلاحیتیں جاہلیت کے تابع ستیں تو اسلام کی نگاہ میں مسترد تھیں۔ لیکن اب اگر وہ اسلام کے تحت آکر ایمان و تقویٰ کا جوہر حاصل کر سکتی تھیں۔ تو اب وہ ایک متاع گراں بہا تھیں۔ حضور نے فاتحانہ سلوک کی ساری پالیسی اسی مدعا کے تحت وضع کی کہ اسلامی نظام اور اسلامی تحریک کو لیڈر اور کارفرما افراد قریش سے مل سکیں۔ جوہر سے کچے ہوئے اور ذلیل شدہ قریش اس ضرورت کو پورا نہ کر سکتے تھے۔

۴۔ کسی بھی دنیوی سیاست کے علمبردار سے آپ اس شانِ خدا پرستی کی توقع نہیں کر سکتے جس کا نمونہ حضور نے پیش فرمایا۔ فاتحانہ داخلہ ہوتا ہے۔ تو کوئی طبل دمامہ نہیں، کوئی فخر و مباہات نہیں۔ کوئی دعویٰ نہیں۔ بلکہ اٹا و ادخلوا الباب سجداً کی تعمیل میں سر تسلیم بارگاہِ الہی میں خم ہو جاتا ہے۔ خدا کی حمد کے ترانے زبان سے جاری ہوتے ہیں۔ نعرہ بھی زبان پر آتا ہے تو اللہ کی بڑائی کا آتا ہے۔ ذرا پس اور نمازیں اور دعائیں مکہ کی لٹکا کو نور سے بھر دیتی ہیں۔ اپنا کوئی مفاد حاصل نہیں کیا جاتا بلکہ اپنے درمجاہدین کے املاک جو قریش نے ظالمانہ طور پر ہتھیائے تھے وہ بھی انہی کی تحویل میں رہنے دیے جاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض غیر نسفت شعارِ ناقدرین جنہوں نے حضور کی اسلامی تحریک کے خدا پرستانہ رنگ کو محض مصلحت کا مظہر قرار دیا ہے۔ بلکہ بعض نے تو کھلم کھلا اُسے (نعوذ باللہ) ایک ڈھونگ ثابت کرنا چاہا ہے، انہوں نے کبھی غور نہیں کیا کہ ڈھونگ۔ چانے والوں کو جب بھروسہ کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو پھر سارا پول کھل جاتا ہے۔ اور مصلحت کا کچا رنگ اڑ جاتا ہے۔ خدا نخواستہ یہ کوئی سیاسی سوئچ ہوتا تو فتح مکہ نے وہ موقع پیدا کر دیا تھا۔ جب کہ اصل حقیقت کھل جاتی۔ اور خدا کی بڑائی پکارنے والے اس دن اپنی بڑائی کا اعلان کرتے دکھائی دیتے۔ مگر وہاں حال یہ تھا کہ حضور اپنے خطبہ فتح میں کامیابی کا سارا کریڈٹ خدا تعالیٰ کو دیتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ اس نے اپنے بندے کی مدد کی۔

۵۔ حضور نے فتح مکہ کے موقع پر نہ صرف سیاسی جرائم معاف کر دیے۔ بلکہ بعض افراد کے ایسے

قانونی جرائم جن پر قصاص لیا جانا چاہیے تھا ان کی بھی معافی دے دی۔ ان نظائر کو پیش نظر رکھ کر قانونی نقطہ نظر سے دور حاضر کے حالات میں یہ سوچا جانا چاہیے کہ اسلامی نظام میں صدر حکومت سزاؤں میں معافی یا تخفیف کا اختیار کہاں تک پاسکتا ہے۔

## فتح مکہ کی تکمیل :

فتح مکہ صحیح معنوں میں فتح نہ ہوتی اور ہوتی تو اسے قائم رکھنا مشکل ہو جاتا اگر مکہ کے ارد گرد قریش کے دیرینہ حمایتیوں اور تقریباً مساویانہ شان رکھنے والے مضبوط قبیلوں کے گڑھ بھی مفتوح نہ ہو جاتے۔ مکہ کی جاہلی قیادت جہاں بجائے خود ایک وزن رکھتی تھی، وہاں اس کی مضبوطی میں بنو ہوازن، اہل طائف اور بنو ثقیف کا بھی بڑا حصہ تھا۔ یہ گویا ایک ہی تنے کی شاخیں تھیں۔ عرب کے مقابلے میں مکہ کے یہ لمحقر قبائل بھی قائدانہ مرتبہ رکھتے تھے۔ اگرچہ قریش کے سامنے یہ مرتبہ ثانوی نوعیت کا تھا۔ مکہ کے ساتھ ان کے حلیفانہ سیاسی تعلقات بھی قدیم تھے ان میں معاشی رابطہ بھی گہرا تھا۔ جنگی ضرورتوں میں بھی یہ اکثر ایک دوسرے کے ساتھی تھے اور کلچر کے اعتبار سے بھی یہ بالائی طبقے کے لوگ تھے۔ فتح مکہ اگر خون ریزی کے بغیر ہوئی تو بالکل معجزانہ طور پر ہوئی۔ ورنہ ہونی بات یہ تھی کہ بنو ہوازن اور بنو ثقیف اور اہل طائف سب کے سب متحدہ قوت سے قریش کی قیادت کا بچاؤ کرتے۔ اس صورت میں یہ معرکہ ایک انتہائی سنگین معرکہ ہوتا مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدابیر ایسی ماہرانہ تھیں کہ اہل مکہ کو ارد گرد سے کوئی تعاون حاصل نہ ہو سکا اور وہ اکیلے زد پر آ گئے۔

قبیلہ ہوازن کے لیڈر پہلے سے اندازہ رکھتے تھے کہ کیا پیش آنے والا ہے بدر سے جس آویزش کی ابتدا ہوئی تھی، اس کی تکمیل کا باب ابھی سامنے آنا باقی تھا۔ پھر قریش کی طرف سے معاہدہ حدیبیہ کے غاتمہ اور حضور کی طرف سے شرائط لانے والے قاصد کا مکہ سے لوٹایا جاتا اور پھر ابوسفیان کا تجدید معاہدہ میں ناکام رہنا۔ یہ پورا تسلسل واقعات اچھے آثار نہیں رکھتا تھا۔ چنانچہ قبیلہ ہوازن کے سرداروں نے سال بھر سے قوت کی فراہمی کی مہم شروع کر رکھی تھی اور انہوں نے قبائل میں دورہ کر کے اسلام کے خلاف جذباتی حرکت پیدا کر دی تھی۔ مگر جب وقت آیا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پراسرار نقل و حرکت سے ان کو سخت غلط فہمی ہوئی۔ بنو ہوازن نے سمجھا کہ ریح ان کی طرف ہے۔ انہوں نے اپنے ہی علاقے میں فوجی اجتماع کیا۔ اور جوش و خروش سے تباہیاں ہونے لگیں۔

ادھر واقعات کی روانہ کے اندازوں کے خلاف کسی اور شکل میں چل گئی۔ وہ اپنی جگہ بیٹھے رہے اور سقوط مکہ جیسا عظیم تاریخی حادثہ بڑے آرام سے واقع ہو گیا۔ فتح مکہ کا اثر دوسرے قبائل پر تو یہ پڑا کہ ان

کے وفود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر اسلامی تحریک کے سایہ دامن میں داخل ہوتے گئے۔ لیکن بنو ہوازن اور بنو ثقیف پر فتح مکہ کا اثر اٹلا پڑا۔ کیونکہ ایک طرف انہیں اپنی افرادی کثرت، اپنی معاشی طاقت اور اپنی جنگی مہارت پر بڑا بھروسہ تھا۔ اور دوسری طرف اسلامی انقلاب کے ردِ عمل میں پڑ کر مسلسل مخالفت اور حریفانہ کارروائیاں کرنے کی وجہ سے وہ اب اپنی شانِ مزاحمت کی تکمیل پر مجبور تھے۔ انہوں نے آخری معرکہ لڑنے کے لیے اپنی ساری قوت حنین یا اوٹاس نامی وادی میں دطائف اور مکہ کے درمیان سمیٹ لی تھی۔ صرف بنو کعب اور بنو کلاب نے پوری طرح علیحدگی اختیار کی تھی۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو ہوازن کی ان تیاریوں کا حال معلوم ہوا۔ آپ نے عبداللہ بن ابی حدرد کو بطور جاسوس بھیج کر مصدقہ معلومات حاصل کیں۔ اب مقابلہ کے لیے تیاری ہونے لگی۔ جنگِ ضرورت کے لیے حضور نے عبداللہ بن ربیعہ سے ۳ ہزار درہم کی رقم قرض لی۔ اور صفوان بن امیہ رئیس مکہ سے اسلحہ جنگ (خصوصاً... انڈین) مستعار لیے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کسی غیر معمولی جنگی تیاری کے ساتھ نہیں نکلے تھے۔ اور آپ کو پہلے ہی سے کسی خوزیزی کا خیال نہ تھا۔ موقع پر نئی تیاریوں کی ضرورت پیش آئی۔ کتنا نادر واقعہ ہے کہ ایک فاتح جس نے ملکی طور پر قریش کو زیر کر لیا تھا اور جوان سے مال اور اسلحہ بالجبر وصول کر سکتا تھا، اسے اس مقامِ عظمت پر ہوتے ہوئے بھی اخلاقی سوچ کا اتنا پاس تھا کہ جو کچھ لیا۔ قرض اور مستعار لیا۔ اسلامی تحریک کا امتیاز اس کی یہی اخلاقی روح ہے۔

سوال شدہ میں مسلم فوج بارہ ہزار کی تعداد میں مکہ سے مارچ کرتی ہے۔ انسان بہ جان انسان ہے۔ حق کے ان سپاہیوں کے دلوں میں کسی نہ کسی نوع سے یہ تاثر ابھرا کہ آج ہم مکہ کے فاتح ہیں۔ ہمارے تعداد کثیر ہے۔ اور ہمارے ساتھ سامانِ جنگ بافراط ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسا احساس کمزور کرنے ہی کا موجب ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا خیال نہ رہا کہ وہ شہنشاہِ حقیقی کے سپاہی ہیں جسے اپنے بندوں کی طرف سے غرور کی ایک رفق بھی گوارا نہیں۔ غرور خدا اور بندوں کے درمیان آہنی حجاب بن جاتا ہے اور تائب اللہ کی وہ تمنائے بے تاب باقی نہیں رہتی جو کسی بھی اسلامی معرکہ کی جان ہوتی ہے۔ اس تاثر پر چند لمحوں کے لیے ایسی گرفت ہوئی کہ تاریخی یادگار بن گئی اور قرآن نے انسانیت کے لیے اسے درس عبرت بنا دیا۔

ہوا یہ کہ مسلم فوج میں اب کی بار مکہ سے ایک نیا عنصر شامل ہوا تھا۔ مقدمۃ الجیش میں خالد کے زیرِ کمان نو مسلم نوجوان تھے۔ جنہوں نے جو شیلے پن میں پوری طرح مسلح ہونے سے بھی بے نیازی برتی۔ علاوہ ازیں مکہ کے ۲ ہزار طلا تھے جو اسلامی حکومت کے مطیع تو ہو چکے تھے۔ لیکن ابھی تک اسلام سے بہرہ نہ تھے۔ مخالف فریق کی وجہ فوجیت یہ تھی کہ وہ لوگ فنِ جنگ کے انتہائی ماہر اور تیر پھینکنے میں عرب بھروسے

مانے ہوئے قدر انداز تھے۔ انہوں نے میدان کے بہتر حصے پر قبضہ بھی پہلے جمایا تھا۔ مناسب پورے  
سنبھال رکھے تھے۔ اور ٹیلوں اور گھاٹیوں اور غاروں میں تیر اندازوں کے دستے چھپا رکھے تھے۔

پہلے ہی حملے میں جب اچانک بہر طرف سے تیروں کا ہمینہ برسا تو مقدمتہ الجیش بکھر گیا۔ اس کے ساتھ  
ہی ساتھ گھبراہٹ میں مسلم فوج کے تمام دستے منتشر ہونے لگے۔ ایک وقت آیا کہ حضورؐ اپنی جگہ پر تنہا کھڑے  
رہ گئے۔ یہ لمحہ ان لمحوں میں سے ایک ہے جن کی نزاکت نے حضورؐ کی عزیمت و پائردی اور یقین و اعتماد کی  
شہادت ہم پہنچائی ہے۔ ہمت سے سائیکوں کو پکارا اور سواری سے اتر کر جلال بھرے انداز میں فرمایا:

انا الذی لا کذاب انا ابن عبد المطلب

حضرت عباسؓ نے قریب ہی سے صدا بلند کی۔ یا معشر الانصار! یا اصحاب الشجرۃ!  
انا سننا تھا کہ بہر طرف سے مسلمان پیکے اور اپنے مرکز استقامت کے گرد جمع ہو گئے۔ پھر جو لڑے تو انا  
فاناً رنگ بدل گیا۔ دشمن کے ستر آدمی مارے گئے اور جب ان کا علمبردار ہلاک ہو گیا تو ان کے قدم اکھڑ گئے  
شکست خوردہ فوج کا ایک حصہ قلعہ ادطاس میں جا چھپا۔ ابو عامر اشعری مختصر سادستہ لے کے گئے۔ دشمن کئی  
ہزار کی تعداد میں تھا۔ ابو عامر اشعری خود شہید ہو گئے۔ لیکن اسلامی دستے نے بازی جیت لی۔

طائف بڑا ہی محفوظ مقام تھا۔ کیونکہ اس کے گرد فصیل موجود تھی۔ اس فصیل کو ہر مت کی جا چکی تھی  
اور سال بھر کا سامان رسد پہلے سے جمع تھا۔ اسلحہ وافر تھا۔ حضورؐ کا اصل ہدف یہی مرکزی مقام تھا۔ لیکن  
ترتیب ایسی اختیار کی کہ بنو ہوازن کی مدد سے اہل طائف کو پہلے محروم کر دیا۔ البتہ شکست خوردہ لوگ یہیں  
آگئے تھے۔ راستہ میں لیہ نامی گڑھی بھی گرا دی۔ طائف پر حملہ ایسے رُخ سے کیا گیا جدھر سے اہل طائف  
کو گمان نہ گزرا ہوگا۔ حضرت خالد ایک دستہ لے کر پہلے روانہ ہوئے۔ بعد میں حضورؐ بہ نفس نفیس پوری فوج لے  
کے پہنچے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ قلعہ شکنی کے لیے مسلم فوج نے منجیق اور دبابے استعمال کیے (حضورؐ نے کچھ آدمی  
مجرش نامی مقام پر قلعہ شکن بھاری آلات سے متعلق تربیت حاصل کرنے کے لیے بھجوائے تھے۔ جرش ان آلات  
کی صنعت کا مرکز تھا۔ اور غالباً یہودی اس صنعت پر قابض تھے) لیکن اندر سے سپاہ پر طوفانی ناوک اندازی  
کے ساتھ ساتھ قلعہ شکن آلات کو نقصان پہنچانے کے لیے گرم آہنی سلاخیں بھی برساتی گئیں۔ مسلم سپاہی بکثرت  
زخمی ہوئے اور فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

حضورؐ نے نوفل بن معاویہ سے خصوصی مشورہ طلب کیا۔ اس نے یہ دلچسپ جواب دیا کہ یومرطی  
بھٹ میں گھس گئی ہے۔ کوشش جاری رکھیں تو قابو میں آ کے رہے گی۔ اور اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ  
دیں۔ تو کوئی بڑا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ اس صائب مشورے کی روشنی میں حضورؐ نے سوچا کہ طائف اسلام کے

زیرِ نگیں آئے ہوئے عرب کے درمیان ایک جزیرہ اختلاف بن کر تورہ نہیں سکتا۔ اسے اگر اس وقت مسخر کیا گیا۔ تو دو طرفہ نقصان ہوگا۔ اور اگر چھوڑ دیا گیا۔ تو حالات اہل طائف کے اندر رضا کارانہ جذبہ اطاعت اُبھار دیں گے۔ بلکہ دلوں کے دروازے اسلام کے انقلابی نظریے کے لیے کھل جائیں گے۔ چنانچہ آپ نے دین کی مصلحت اور اہل طائف کی فلاح کو محفوظ رکھ کر محاصرہ اٹھا لیا۔ یہ ایک واضح ترین ثبوت ہے کہ حضورؐ خود زبیری سے بچنے کی کتنی فکر رکھتے تھے۔

ساتھیوں نے کہا کہ آپ ان لوگوں کے لیے بددعا کیجیے۔ مگر آپ نے یہ دعا کی کہ ”اللھم اھد ثقیفا و انت بھم“ (اے اللہ! تو ثقیف کو راستی کی ہدایت دے اور ان کو ہمارے ساتھ ملا دے)۔ یہ دعا اس طائف کے باشندوں کے لیے کی جا رہی تھی، جس نے پتھر مار مار کر ایک دن حضورؐ کے خون سے اپنی گلیوں کی مٹی کو لالہ زار کیا تھا۔ یہ دعا بھی اسی رحمت بھرے ذہن کی ترجمانی ہے جس نے قوت سے جہاں بھی کام لیا چارو تا چار لیا۔ مگر جس نے عفو اور احسان کے دریا بہانے میں کہیں بھی کوتاہی نہیں کی۔ جسرانہ میں بے شمار مال غنیمت — ۲۲ ہزار اونٹ، ۲۰۰ ہزار بکریاں، ۲۰ ہزار اوقیہ چاندی جمع تھا۔ اس میں سے قرآنی قانون کے مطابق پانچواں حصہ معاشرہ کے حاجت مند طبقوں اور اجتماعی ضرورتوں کے لیے بیت المال میں لیا گیا اور بقیہ فوج میں تقسیم کر دیا گیا۔ علاوہ اس بات کے کہ یہ سورت حریفانہ مانی اور جنگی قوت کو گھٹانے کا ذریعہ تھی۔ قرن ہاقرن سے یکجا مٹی ہوئی دولت کی ریخ بستہ ندی کو پہلی بار کھلے بہاؤ کا موقع ملا۔ اور اونچے اور نیچے قبائل کے پرانے معاشی عدم توازن کا ازالہ ہونے لگا۔

قرآن نے تالیفِ قلب کی جو تدبیر رکھی ہے۔ اس کے تحت حضورؐ نے مکہ کے باشندوں اور ان کے لیڈروں کو دل کھول کر بہت سا مال دیا۔ مقصود یہ تھا کہ ان کے زخموں پر مرہم رکھا جاسکے۔ ان سے زیادہ حرماں نصیب اس وقت آسمان کے نیچے کون ہوگا۔ جن کی قیادتوں کے تحت اٹل لٹے تھے۔ اور جن کے لیے تاریخ کی ساری فضا ہی نے رنگ بدل لیا تھا۔ ان کے احساسات کا مادہ کیا ہوا ہوگا۔ جب وہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار ہوتے ہوئے پھیلی صفوں میں کھڑے تھے۔ اور انصار اور مہاجرین حضورؐ کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ قانونِ الہی کی عدالت نے بیس برس لمبے مقدمے کا فیصلہ سنایا اور اس مقدمے میں اپنا بہت کچھ لگا کر قریش یکسر ہر گئے تھے۔ ان سے بڑھ کر دکھی اس دن کون ہوگا ان کے زخموں پر اگر احسان کا مرہم نہ رکھا جاتا تو ان کی میسیں بار بار دہی دہی ٹھکانی رہتی۔ اور وہ بادلِ ناخواستہ مطیع رہ کر اسلامی ریاست کے مقاصد کو اندر ہی اندر سے غارت کرنے کا موجب ہوتے۔ کیسا عجیب سماں ہوگا۔ کہ ابوسفیان، حکیم بن حزام، نضر بن حارث، سفوان بن امیہ، اقرع بن حابس اور ان

جیسے دوسرے اکابر اسی شخص کے ہاتھوں سے آج عطیات حاصل کر رہے تھے جسے انہوں نے برسوں  
گالیاں دی تھیں، جھوٹا کہا تھا، مذاق اور طنز کا نشانہ بنایا تھا۔ بدنی اذیتیں دی تھیں قید میں ڈالا تھا۔  
قتل کرنا چاہا تھا۔ گھر سے نکالا تھا۔ اور جس کے خلاف تلوار اٹھا کر اسے امن و چین کا ایک لمحہ بسر کرنے  
کا موقع نہ دیا تھا۔ انسان نوازی کی ایسی کتنی مثالیں تاریخ کے بے پایاں دفتروں میں ملتی ہیں؟  
انصار نے جب دریائے کرم کو قریش کے حق میں اس طرح اڈتے دیکھا تو ان کے بعض عناصر  
تھوڑی دیر کے لیے ادنیٰ جذبات کی لپیٹ میں آگئے ان کا تاثر یہ تھا کہ شاید حضور نسلی اور وطنی تعلق کی  
بنا پر ان لوگوں کو نواز رہے ہیں اور ہمیں پس پشت ڈال دیا ہے۔ کہا گیا کہ حق کی حمایت میں جان جو کھوں میں  
پڑنے کے لیے تو ہم ہیں اور ہماری تلواروں سے خون ٹپک رہا ہے۔ لیکن داد و دہش کے وقت قریش مقدم  
ہو گئے ہیں۔

یوں سوچنے والوں نے یہ نہ سوچا کہ حضور نے اپنے اہل بیت پر یہ بارش نہیں کی تھی قربانیاں  
دینے والے قرابت مند مہاجرین تک کو نہیں نوازا تھا۔ خود کوئی امتیازی استفادہ نہیں کیا تھا۔ تو پھر اگر  
قریش کے ساتھ یہ خصوصی سلوک ہو رہا تھا تو اس کی بنیاد کسی عظیم مصلحت پر ہوگی۔

بات حضور تک پہنچی تو جیسے کہ ہم پورا واقعہ پہلے بیان کر چکے ہیں، ایک شامیانہ تانا گیا اور انصار  
کو جمع کیا گیا۔ حضور نے ان کے سامنے دل ہلا دینے والی مختصر سی تقریر کی (یہ تقریر ہم پہلے درج کر چکے ہیں)  
جس کا آخری جملہ یہ تھا۔ کہ اے انصار! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ اور لوگ تو اونٹ اور بکریاں لے جائیں۔ اور  
تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کے جاؤ۔ انصار کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر ڈاڑھیوں کو تر کر رہے  
تھے۔ آخری بات سن کر وہ چیخ اٹھے کہ تم کو صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم درکار ہیں۔ پھر آپ نے انہیں  
زمی سے وہ مصلحت سمجھانی جس کے تحت قریش کی دلجوئی ضروری تھی۔

ادھر ۶ ہزار اسیران جنگ قسمت کے فیصلے کے منتظر تھے۔ حضور پورے دو ہفتے تک منتظر رہے  
کہ کوئی ان کے بارے میں آکر شاید بات چیت کرے۔ مال غنیمت کی تقسیم بھی اسی لیے روک رکھی۔ مگر جب  
کوئی نہ آیا تو تقسیم عمل میں آگئی۔ تقسیم کے بعد حلیمہ سعدیہ (حضور کی رضائی والدہ) کے قبیلہ کے معززین کا وفد  
زمیر بن عمرو کی سرداری میں قیدیوں کے متعلق بات چیت کرنے حاضر ہوا۔ زمیر نے حضور کو مخاطب بنا کر بڑی  
شوثر تقریر کی اور کہا۔

”جو عورتیں چھپروں میں مجبوس ہیں، ان میں تیری بھوپھیاں ہیں ان میں تیری خالائیں ہیں۔  
خدا کی قسم! اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے خاندان میں دیکھ لیا ہوتا۔ تو ان

سے بہت کچھ اُمیدیں ہوتیں۔ تجھ سے تو ہمیں اور بھی زیادہ توقعات ہیں۔“

حضور نے وضاحت کی کہ میں تو خود منظر تھا کہ کوئی آئے۔ مجبوراً تقسیم کر دی گئی۔ اب جو قیدی بنی ہاشم کے حصے میں آئے ہیں ان کو میں تمہارے حوالے کرتا ہوں۔ باقیوں کے لیے مسلمانوں کے مجمعِ عام میں نماز کے بعد بات کرنا۔ نماز کے بعد زہیر نے اپنی درخواست دہرائی۔ آپ نے فرمایا: مجھے صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے۔ البتہ میں تمام مسلمانوں سے سفارش کرتا ہوں۔ فوراً مہاجرین و انصار بول اُٹھے کہ ہمارا حصہ بھی حاضر ہے۔ صرف بنی سلیم اور بنی فزارہ کے لیے یہ تجربہ بڑا اٹوٹا تھا کہ لڑ کر مفتوح ہونے والے دشمن کے قیدی مفت میں رہا کر دیے جائیں۔ آخر حضور نے ان کو ہانڈی قیدی دے کر بقیہ کو بھی رہا کر دیا۔ پورے ۶ ہزار قیدی آزاد ہو گئے۔ متعدد قیدیوں کو حضور نے کپڑے بھی دیے۔ عام فاتحین کے بخلاف نہ صرف قیدیوں کی جان بخشی کی بلکہ بلا فدیہ ان کو بطور احسان کے رہا کر دیا۔ اصل مقصود یہاں لوگوں کو ہلاک کرنا یا غلام جمع کرنا نہیں تھا۔ مقصود تو صرف نظامِ حق کی اقامت اور دلوں کو اس کے لیے ہموار کرنا تھا۔

اس مہم سے فارغ ہو کر آپ نے عمرہ ادا کیا اور عتاب بن اُسید کو مکہ کی امارت کا منصب سونپا اور مدینہ واپس تشریف لے گئے۔

### فتح مکہ کے بعد :

ہمارے نقطہ نظر سے حرب میں داخلی طور پر مخالف انقلابِ تخریبی قوت کا سراں اس معرکہ سے پوری طرح کچلا گیا۔ اب گویا نظامِ اسلامی قطعی طور پر عرب کے لیے مقرر ہو گیا۔ اور کسی اور کے لیے آگے بڑھنے کا راستہ نہ رہا۔ چند چھوٹی چھوٹی کارروائیاں بچے کھچے شریکوں کو دبانے اور لائینڈ آرڈر قائم کرنے کے لیے کی گئیں۔ لیکن ان کی کوئی ایسی اہمیت نہیں ہے۔

قبیلہ بنو تمیم نے دوسرے قبائل کو بہکا کر اسلامی حکومت کو محاسل کی ادائیگی رکوا دی۔ یہ گویا ایک باغیانہ اقدام تھا۔ عبید بن حصن کو ۵۰ سواروں کے ساتھ بھیجا گیا۔ حملہ ہوتے ہی بنو تمیم ہبٹا گئے۔ کچھ قیدی مدینہ لائے گئے اور بعد میں چھوڑ دیے گئے۔

قبیلہ خثعم (بہ جانب تبالہ) نے شوش کی تیاری کی۔ قطیبہ بن عامر کی سرداری میں ۲۰ سپاہیوں کا مختصر ساد سنہ سرکوبی کے لیے گیا۔ شوش پسند منتشر ہو گئے۔ کچھ لوگ اسیر کیے گئے مگر حضور نے بعد میں ان کو رہا کر دیا۔

بنو کلاب کی طرف حضرت سخاک کو بھیجا گیا تھا۔ ان کے ساتھ اُسید بن سلمہ بھی تھے۔ جو اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اغلباً یہ تعلیمی و دعوتی وفد تھا۔ قبیلہ والوں نے ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے۔ اُسید کا



باب قتل ہوا۔ مزید تفصیل نہیں مل سکیں۔

خبر آئی کہ حبشہ کے کچھ بحری ڈاکو جدہ میں جمع ہیں۔ عبداللہ بن حذافہ قرشی (یا علقمہ بن مجزز) ۲ سو آدمیوں کا دستہ لے کے روانہ ہوئے۔ ڈاکو بھاگ گئے۔

ربیع الآخر ۹ھ میں حضرت علیؑ کو قبیلہ بنی طے میں ڈیرٹھ سو سواروں کے ساتھ بھیجا گیا کہ وہاں کے بڑے صنم خانے کو گرا دیں۔ یہاں شاید اس امر کی وضاحت کر دینا ضروری ہو کہ مدینہ کی اسلامی ریاست ایک اصولی اور مقصدی ریاست تھی۔ اور وہ جس اساسی اعتقاد پر قائم تھی اس کے خلاف انفرادی عقیدوں کو تو وہ گوارا کر سکتی تھی لیکن اس اساسی اعتقاد کے خلاف وہ کسی اجتماعی ادارے کو کیسے چلنے دے سکتی تھی۔ پھر جب کہ جاہلی عرب کے مذہبی و تمدنی نظام میں وہاں کے اصنام روح رواں کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے تصور سے وہ ذہنی اکساہٹ پیدا ہوتی تھی۔ جو جاہلیت پسندوں کو اشتغال دلادلا کر اسلامی حکومت کے خلاف صف آرا کرتی تھی۔ اور ان بتوں کے نام پر بڑی بڑی لڑائیاں لڑی جا چکی تھیں۔ تو اس خاص صورت میں کیسے ممکن تھا کہ جاہلی بت خانوں کو بہ حیثیت اجتماعی ادارات کے قائم رہنے دیا جائے اور مشرکانہ نظام اعتقاد کو موقع دیا جائے کہ وہ بار بار ردِ عملی مزاحمت کے لیے جذباتی اکساہٹ پیدا کرتا رہے۔ یہ بت دراصل ایک معروف ذہنیت کا تمثیل اور ایک باطل نقشہ زندگی کا نشان (Symbol) تھے۔ یہ اقدام کسی مسلمہ مذہبی اقلیت کے حقوق میں دخل اندازی کی نوعیت نہیں رکھتا بلکہ اسلامی ریاست کے مزاحم ہونے والے رجحانات کے مظاہر سے سیاسی فضا کو پاک کرنے کا ایک ناگزیر اقدام تھا۔ پھر معاملہ محض نظریاتی حد تک عملاً تھا بھی نہیں۔ قبیلہ طے بت پرستانہ تصور زندگی سے سرشار ہو کر باغیانہ رجحانات اپنے اندر پال چکا تھا۔ مدینہ کے خلاف ٹکرانے کے عزائم اندر ہی اندر انگڑائیاں لے رہے تھے۔ اس امر کا واضح ثبوت یہ ہے کہ حاتم کے نامور گھرانے میں خود عدی بن حاتم نے اسی مقصد کے لیے سواری اور اسلحہ کا بہت قبل از وقت انتظام کر لیا تھا۔ ایسے اور لوگ بھی ہوں گے۔

یہ بہر حال حضرت علیؑ نے قس کے مقام پر پہنچ کر علی الصبح حملہ کیا۔ عدی بن حاتم شام کو بھاگ گیا تاکہ وہاں سے کچھ قوت فراہم کرے۔ قبیلہ کے لوگوں نے معمولی مزاحمت کی۔ بت خانہ توڑ دیا گیا۔ قیدی اور جانور اور کچھ اسلحہ ہاتھ آئے عدی بن حاتم کی بہن بھی قید میں آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس نے درد بھرے انداز سے اپنا دکھڑا سنایا کہ میرا باپ مرحکا، میرا محافظ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ میں ضعیف ہوں اور کسی خدمت کے قابل نہیں۔ مجھ پر احسان کیجیے۔ اللہ آپ پر احسان کرے گا۔ یحییٰ نے اس کے حسبِ خواہش اس کے لیے سواری کا انتظام کیا اور آزاد کر کے روانہ کر دیا۔ اس خاتون نے جا کر

بھائی کو حضور کے خلق و مروت کا حال سنایا کہ بالکل تیرے باپ کی سی فیاضی دیکھ کے آئی ہوں۔ فلاں آیا تو اس پر یہ یہ احسان ہوا۔ اور فلاں پیش ہوا تو یہ یہ عنایت فرمائی گئی۔ تم ان سے لڑنے کا خیال چھوڑ دو۔ خود ہلا جاؤ۔ اور فیض پاؤ۔ چنانچہ بعد میں جلد ہی عدی بن حاتم مدینہ آکر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔

### دو غیر ملکی لڑائیاں :

حضور کے دور سعادت میں اصل کام تو ملک کی داخلی وحدت اور انقلاب کی تکمیل ہی کا ہوا۔ لیکن آپ نے اردگرد کے حکمرانوں کو دعوتی پیغامات بھیج کر تحریک کے بین الاقوامی دور کا بھی گویا افتتاح کر دیا تھا۔ حضور نے مختلف سلطنتوں میں اپنے سفیر روانہ فرمائے۔ ایک سفیر حارث بن عمیر ازوی شام یا بصری کو بھیجا تھا۔ اسے ہرقل کے نائب عیسائی حاکم شرجیل بن عمرو غسانی نے راستے میں قتل کر دیا۔ یہ بنیادی انسانی اخلاق اور وقت کے بین الاقوامی قانون کی ایسی خلاف ورزی تھی کہ اسے اگر کوئی حکومت چپ چاپ سہار لے تو پھر ایسی حکومت کا کوئی وزن باقی نہیں رہ جاتا۔ سہ ماہ میں حضور نے تین ہزار سپاہیوں کو اپنے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ کی کمان میں شام کے علاقہ بلقار کی طرف روانہ کیا۔ یہ واقعہ بجائے خود اسلامی انقلاب کا ترجمان تھا کہ ایک شخص غلامی کے مرتبے سے اٹھ کر فوج کی سپہ سالاری تک جا پہنچے اور واضح رہے کہ انہی کے صاحبزادے اسامہ کو بھی حضور نے آخری دم کے لیے سردار لشکر بنایا تھا۔ اس فوج کو حضور الوداع کہنے کے لیے بنفس نفیس ثنیۃ الوداع تک گئے۔ فوج معان کے مقام پر پہنچی تو معلوم ہوا کہ ان دنوں ہرقل دورے پر آیا ہوا ہے اور اس کے ساتھ اپنی بھی بہت بڑی فوج ہے اور بنی لخم، بنی جذام اور باقی بن اور بہر کے عیسائی لوگ ہر طرف سے جمع ہیں۔ مجموعی تعداد ایک لاکھ ہوگی۔ صورتِ حالات پر غور کیا گیا آخر واپس جا کر تھوڑے مسترد ہوئی اور نتیجہ کو خدا کے سپرد کر کے معرکہ آرا ہونے کا فیصلہ ہوا۔ آگے بڑھے تو مشارف کے مقام پر دشمن کی بہت بڑی فوج مجتمع تھی۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ زید بن حارثہ شہید ہونے اور مد حضرت جعفر نے سنبھالا۔ دامنا ہاتھ کٹ گیا تو علم بائیں ہاتھ میں لیا۔ بایں بھی کٹ گیا تو سینہ پر اسے سنبھالے رہے۔ آخر ۹ زخم کھانے کے بعد شہید ہوئے۔ ان کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ ترتیب کے مطابق عبداللہ بن رواحہ علمبردار بنے۔ جب وہ بھی شہید ہو گئے۔ تو اتفاقاً راستے سے خالد بن ولید نے علم سنبھالا۔ اور اس بے جگری سے لڑے کہ پے درپے ان کے ہاتھ سے ۹ تلواریں لوٹیں۔ آخر دشمن کی فوج پیچھے ہٹی اور حضرت خالد اپنے لشکر کو بچا کر لائے۔ جملہ ۱۲ مسلم سپاہی شہید ہوئے جن میں نہایت قیمتی شخصیتیں شامل تھیں۔

مسلمانوں نے وقتی لحاظ سے اپنی فتح کو غنیمت جانا۔ کیونکہ دشمن کی تعداد زیادہ تھی، غیر ملک تھا

حالات نئے تھے۔ رسد کا انتظام کرنا مشکل تھا۔ کمک کی امید بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے یہ لشکر مدینہ واپس آ گیا۔ حضور اور مسلمان مدینہ سے باہر آ کر ملے۔ بعض لوگوں نے دل لگی کے طور پر ان لوگوں کو "اوفرار یو" کہہ کر پکارا۔ حضور نے فرمایا۔ یہ فراری نہیں۔ کراری ہیں۔ یعنی دوبارہ جائیں گے۔ حضرت خالد نے اس معرکہ میں جو جو سہر دکھائے تھے ان کی بناء پر انہیں سیف اللہ کا خطاب ارزانی ہوا۔ اسی سلسلہ کی دوسری کڑی غزوہ تبوک ہے۔

فتح مکہ کے بعد جب ۹ھ میں شام سے آنے والے ایک قافلہ نے اطلاع دی کہ قیصر کی فوجیں مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔ قیصر اس بھاری سلطنت کا فرمانروا تھا جو ارد گرد کی آدھی دنیا پر پھیلی ہوئی تھی اور جس نے قریب ہی میں ایران جیسی حکومت کو زک دی تھی۔ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان جنہوں نے دنیا بھر میں ایمان و اخلاق کی روشنی پھیلانے کے لیے ایک مینار تیار کیا تھا، وہ بھلا کیسے کیسے کرائے کو غارت ہونے دے سکتے تھے۔ یہی ان کا دین تھا یہی ان کی دنیا تھی۔ یہی ان کی برادری تھی۔ یہی ان کی جائداد تھی۔ فوراً دفاع کی تیاری شروع ہو گئی۔ طے پایا کہ قیصر کی فوج کو عرب میں گھسنے سے پہلے ہی جالیا جائے تاکہ اس سر زمین پر تباہی نہ پھیلے۔ گرمی کا موسم قحط کا زمانہ اور عسرت کا عالم تھا۔ حضور نے جنگی چندہ کی اپیل کی۔ اس اپیل کا ایسا قابل یادگار جواب مسلم جماعت نے دیا کہ اس کی یاد انسانیت کو ایک قیمتی روح سے آراستہ کرتی رہے گی۔ حضرت عثمان نے ۹ سو اونٹ۔ ایک سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کیے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف نے ۴۰ ہزار درہم لا حاضر کیے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے مال کا بیشتر حصہ لاکے ڈھیر کر دیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ آئے تو پورا گھر خالی کر کے اپنا سب کچھ حاضر کر دیا۔ اور جذبہ انفاق کی اس مسابقت میں بازی بے گئے۔ لیکن شاید سب سے زیادہ ایشیا اس غریب محنت کش انصاری کا تھا جس نے دن بھر پانی کھینچ کھینچ کر ۴ سیر چھوہارے کماٹے اور دو سیر چھوہارے اہل و عیال کے لیے رکھ کر دو سیر حضور کے قدموں میں ڈال دیے۔ حضور نے فرمایا کہ ان چھوہاروں کو قیمتی اموال کے سارے ڈھیر پر بکھیر دو۔ عورتوں نے جہاد کے فنڈ میں اپنے زیورات پیش کیے۔

۳۰ ہزار فوج دس ہزار گھوڑوں کے ساتھ روانہ ہوئی۔ ثنیۃ الوداع میں دستوں کی ترتیب مقرر ہوئی۔ کمانڈر مقرر کیے گئے اور علم تقسیم کیے گئے۔ تبوک پہنچے تو معلوم ہوا کہ دشمن نے عرب پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ دراصل ان کو کسی نے غلط خبر دی تھی کہ مدینہ کے نبیؐ کا (نعوذ باللہ) انتقال ہو گیا ہے اور حماہ کے لیے یہ بہترین وقت ہے۔ اب جب معلوم ہوا کہ نبیؐ بھی زندہ ہے اور مدینہ بھی زندہ ہے تو ان کے عزائم پر اوس پڑ گئی۔ بہر حال اس فوجی پیش قدمی کا سیاسی لحاظ سے بہت ہی اچھا اثر پڑا۔ حضور

نے ایک ہیمنہ تک فوجی کمپ رکھا۔ اس دوران میں سیاسی اثرات پھیلانے کا کام کامیابی سے جاری رہا۔ ایلہ کا حاکم پیش ہوا اور جزیہ دے کر مصالحت تعلقات کا آغاز کیا جزباً اور اذرح کے لوگ آئے انہوں نے بھی اطاعت کی علامت کے طور پر جزیہ پیش کیا۔ دومۃ الجندل کا مسئلہ حضور کی نگاہ میں مدتوں سے اہمیت رکھتا تھا۔ حضرت خالد بن ولید کو زائد از ۴ صد سپاہیوں کا دستہ دے کر دومۃ الجندل کے حاکم اکبدر کی طرف روانہ کیا گیا۔ وہ اور اس کا بھائی شکار کر رہے تھے۔ اس کا بھائی مارا گیا۔ اور اکبدر گرفتار ہو کر پیش ہوا۔ اس سے جزیہ لینے پر مصالحت ہوئی۔ حضور نے اسے دومۃ الجندل، تبوک، ایلہ اور تیماء پر حکومت مدینہ کی طرف سے حاکم مقرر کر دیا اور تحریر لکھ دی۔ بعض روایات کے بموجب بغیر لڑے حضرت خالد نے بڑی حکمت سے اس کا قلعہ فتح کیا اور گراں بہا مال غنیمت حاصل کیا۔ حضور واپس آئے تو مدینہ میں شاندار طریق سے استقبال کیا گیا۔ منافقین نے جو جو شرارتیں اس غزوہ کے سلسلے میں کیں ان کو ہم پہلے ایک فصل میں بیان کر چکے ہیں۔ منافقین تعداد کثیر میں (اسی سے اوپر) شہر میں بیٹھے۔ سہے تھے۔ ان سے باز پرس کی گئی۔ تو انہوں نے جھوٹے عند گھڑ دیے اور حضور نے درگزر کیا۔ لیکن بعض اہل خداس بھی رہ گئے تھے۔ ان میں ابو خثیمہ بھی شمار ہوتے مگر ان کی روح بروقت چونک گئی۔ حضور کی روانگی کے کسی روز بعد ایک دن شدید گرمی میں اپنی دونوں بیویوں کے پاس ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کرنے آئے جہاں انہوں نے پانی ۲ چھڑکا کر رکھا تھا اور کھانے پینے کا انتظام تھا۔ یکایک ایک خیاں آگیا اور ازواج سے کہا۔ "ہائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو دھوپ، لو اور گرمی میں جوں اور ابو خثیمہ ٹھنڈی چھاؤں میں حسین عورتوں کے ساتھ مزیدار کھانے کھا رہا ہو۔ یہ انصاف نہیں ہے۔ خدا کی قسم! میں تم دونوں میں سے کسی کے حجرے میں نہ جاؤں گا میرے لیے زاد راہ تیار کرو" اونٹ منگوا یا اور سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ درجا کر لشکر سے مل گئے لیکن تین اہل ایمان کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع جانے جانے کے ارادوں میں رہے۔ ان سے حضور نے پچھے رہ جانے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے سانس سانس عرض کیا کہ ہم سے کوتاہی ہوئی ہے۔ حضور نے حکیم الہی آنے تک ان کو باعنی زندگی سے الگ رہنے اور اپنی بیویوں سے بے تعلق رہنے کا حکم دیا۔ یہ گویا ایک طرح کی قید تنہائی تھی جس میں نہ زنجیریں استعمال کی گئیں۔ نہ زندان کی کوئی عمارت۔ اجتماعیت سے کٹ کر منفرد ہو جانا انسان کے لیے بڑا سخت عذاب ہے۔ پھر وہ بھی اس حالت میں کہ یہ ساری پابندی اسے اپنے اوپر خود ہی نافذ کرنی ہو۔ مگر ان حضرات نے اطاعت امر کی وہ ندریں مثال قائم کی، کہ جس سے تاریخ کا ایوان ہمیشہ جگمگاتا رہے گا۔ یہاں تک کہ غسان حاکم کو جب یہ حال معلوم ہوا تو بہترین نفسیاتی موقع تک کر اس نے کعب بن مالک کو خط لکھا کہ تمہارے آقائے تم پر جفا کی ہے۔ حالانکہ تم بڑے قابل قدر آدمی ہو۔

ہمارے پاس چلے آؤ تو ہم تمہارا مرتبہ بڑھائیں گے۔ کتنی بڑی آزمائش تھی۔ مگر کعب نے اس خط کو تنور میں ڈال دیا۔ آخر پورے ۵۰ دن کے بعد وحی الہی نے ان کے اخلاص کی بنا پر ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان کیا۔ خوشی کی ایک لہر مدینہ میں دوڑ گئی۔ اور ہر طرف سے لوگ مبارک سلامت کی صدا میں بلند کرتے ہوئے ان تینوں کو بشارت دینے پہنچے۔ حضرت کعب نے قبولیت توبہ کی خوشی میں اپنا بیشتر مال صدقہ کر دیا۔ ایسا تھا وہ ان جو تحریک اسلامی نے اپنے سانچے میں ڈھلا۔

سفر تبوک میں ہی عبداللہ ذوالجہادین کی وفات ہوئی۔ یہ نوجوان حضور کو بہت ہی محبوب تھا۔ یہ بڑے انقلابی جذبے سے اسلام میں داخل ہوا تھا۔ اسلام کی دعوت نو عمری میں ہی اس تک پہنچی۔ اور دل متاثر ہو گیا۔ مگر چچا کے ڈر سے اپنے جذبات کو دبائے رکھا۔ آخر فتح مکہ سے حضور واپس آئے تو اس نے چچا سے کہا کہ :-

”پیارے چچا! مجھے برسوں انتظار کرتے گذر گئے کہ کب آپ کے دل میں اسلام کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ لیکن آپ کا حال جوں کا توں ہے۔ اب مجھے اجازت دیجیے کہ میں اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جاؤں“

سنگ دل چچا نے جواب دیا کہ اگر تم کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت قبول کرنا ہے تو میں نہ صرف سارے مال سے تم کو محروم کرتا ہوں بلکہ تن پر کپڑا بھی نہ رہنے دوں گا۔ عبداللہ نے کہا: ”چچا! آپ جو چاہیں کریں۔ میں تو اب بت پرستی سے بیزار ہو چکا ہوں۔ اور اب میں ضرور مسلم بنوں گا۔ آپ اپنا سارا مال لے لیجیے۔ یہ کہہ کر بدن کے کپڑے اتار دیے اور برہنگی کی حالت میں مال سے جا کر بیان کیا کہ میں توحید کا علمبردار بن گیا ہوں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جانا چاہتا ہوں۔ مجھے تن ڈھانکنے کو کچھ دیجیے۔ مال نے ایک کبیل دیا۔ پھاڑ کر آدھے کا تہ بند بنایا۔ اور آدھا اوپر لیا۔ اسی حالت میں مدینہ پہنچا اور اصحاب صفہ کے حلقہ میں شریک ہو گیا۔ یہ انقلابی نوجوان شوق جہاد میں حضور کے ساتھ تبوک روانہ ہوا۔ وہاں بخار آنے سے انتقال ہوا۔ رات کی تاریکی میں تدفین ہوئی بلالؓ پوراغ اٹھائے ہوئے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود قبر میں اترے۔ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما، ساتھ تھے ان سے فرمایا: ”اپنے بھائی کا ادب ملحوظ رکھو“ حضور نے اپنے ہاتھ سے اینٹیں رکھیں۔ پھر دعا کی: ”اللہم آج کی شام تک میں اس سے راضی رہا ہوں تو بھی اس سے راضی ہو“

یہ سماں دیکھ کر ابن مسعودؓ نے حسرت سے فرمایا: ”کاش! اس قبر میں دبایا جاتا“

## تبصرہ :

ہم نے اس فصل میں ان تمام جنگی اقدامات کو بیان کر دیا ہے جو مدینہ کی اسلامی حکومت کی طرف سے عمل میں آئے۔ ان سارے معرکوں کو سامنے رکھیے اور ان سیاسی حالات کو بھی نگاہوں میں تلازمہ کر لیجیے جن کے تحت یہ کارروائیاں واجب ہو گئی تھیں تو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ ایک ایسے شخص کو جو تصادم سے بچ کر تعمیری کام کرنا چاہتا ہے۔ جو حصولِ جاہ و جلال کے بجائے محض حق اور سچائی کا فروغ چاہتا ہے۔ جو بزورِ شمشیر اپنا اثر پیا کرنے کے بجائے دلیل اور اخلاق سے دنیا کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ جو انتقام کے بجائے درگزر سے اور تشدد کے بجائے لطف و احسان سے کام لیتا ہے جو خون بہانے والی تلوار کے بجائے معاہدہ لکھنے والے قلم سے مسائل حل کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اسے انقلاب دشمن حریفوں نے سخت مجبور کر کے میدانِ جنگ میں طلب کیا۔ طلب کیا کیا۔ آٹھ نو برس میں کوئی ایک لمحہ ایسا نہیں گزرا کہ وہ چین سے بیٹھ سکا ہو۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس عالم میں حضور نے کیسے وہ عظیم تعمیری کارنامہ سرانجام دے لیا۔ جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ بدلا دیا۔ اور انسانیت کو ایک نئے نقشے پر ڈھالا دیا۔ حضور کے تعمیری کارنامہ کی تفصیل ہم کتاب کے ایک مستقل حصہ میں عرض کریں گے۔

وہ ہستی اس لحاظ سے انسانیت کی عظیم ترین محسن ہے کہ اس نے سادہ سادگی کے پیغام کو پورے عرب میں اور پھر ساری دنیا میں پہنچانے کے لیے تلواروں کی چھانوں میں سے اپنا راستہ نکالا اور انتہائی جنگ پسند حریفوں کی مزاحمت کو توڑ کر نظامِ قسط کو برپا کیا اور اسے تکمیل دی۔ ورنہ اگر کوئی اور ہوتا۔ درمیان میں سے جنگ چیلنج کو سُن کر اپنے بدستے راستے سے کتر جاتا۔ تو اسلامی نظریہ کا نقش کرتا تاریخ سے محو نہ ہوتا تو بہت زیادہ سے زیادہ انفرادی سیرت کی حد تک جلوہ گرد مچھکتے۔ لیکن اس کا تصور ایک اجتماعی نظام کی صورت میں کرنا ہمارے لیے ممکن نہ ہوتا۔ اس صورت میں اسلام دنیا کے انفرادی مذاہب کے طرز کا ایک مذہب ہوتا یا صوفیانہ طرز کا ایک روحانی و اخلاقی مسلک ہوتا۔ جسے زندگی اور تمدن کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی ایسے اسلام کے سلیچے میں کیسے ہی اعلیٰ درجہ کے پاکباز کیوں نہ ڈھلنے وہ بہر حال ہر کفر، ہر تہذیبِ اظلم اور ہر نظامِ ظلم کے لیے نہایت وفادار پرزے ثابت ہوتے۔ پھر یہ ممکن نہ ہوتا کہ اجتماعی ظلم و فساد کو مٹانے کا جذبہ انسانیت حضور کے پیغام سے اخذ کر سکتی۔

دیکھو کہ ہماری فلاح و بہبود کے لیے حضور کن اذیتوں، کن مشکلوں، کن آویز ثنوں اور کن طوفانی ہنگاموں سے گزرے اور عزیمت آموز انداز سے گزرے۔ کس شجاعت سے ہر حریف کے چیلنج کو قبول کیا اور ظلم و فساد کی ہر طاقت کی سرکوبی کی۔ کبھر بے ہوئے قبائل کو ایک کر دیا۔ ان کو جاہلی قیادت سے

نجات دلائی۔ ان کو تعلیم و تزکیہ سے گزارا۔ امن کا ماحول فراہم کیا۔ قانون کی عملداری قائم کی۔ معاشرہ کو اخوت و مساوات کی بنیادوں پر استوار کیا۔ حکومت کے لیے شوراہیت کے اصول کو سنگِ اساس بنا کر جمہوری دور کا آغاز کر دیا۔

پھر یہ حضور کا کمالِ حکمت ہے، کہ اتنے معرکے لڑے اور اتنی مہمات روانہ کیں۔ مگر انتہائی کم خونریزی ہوئی کم سے کم جانی نقصان ہوا۔ عرب جیسی وسیع متحدہ سلطنت کی ایک اصولی نظریے میں پہلی بار تشکیل اتنے کم صرف خون سے ہونا تاریخِ انسانی کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔

حق یہ ہے کہ آج ہم میں سے ہر انسان — خواہ وہ اس حقیقت کو جانے یا نہ جانے — حضور پاک کا شرمندہ احسان ہے۔ ہمیں زندگی کے فلاح کے جو اصول، جو تہذیبی اقدار، جو اخلاقی رہدایات اس بارگاہ سے ملی ہیں۔ نیز انسانیت کا جو نمونہ آپ کے ذریعے ہمارے سامنے آیا ہے اور پھر تمدن کا جو بہترین متوازن نظام آپ نے تعمیر کر کے دکھایا ہے۔ ان ساری نعمتوں سے ہم کبھی بہرہ مند نہ ہو سکتے، اگر حضور ظلم کی تلواروں کے سامنے مٹھی بھر جماعت کو لے کر سینہ سپر نہ ہو جاتے۔ حضور نے اپنے بہترین محبوب ساتھیوں کو مقدس نصب العین کی خاطر قربان کیا۔ اور ان ستاروں کے خون سے صبح نو کا نقش تیار ہوا۔

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ!

## اور اُجالا پھیلتا ہی گیا

### اسلامی تحریک اور اسلامی ریاست کا پھیلاؤ

بہت سے لوگ تلوار کے زور سے قطعاتِ ارضی کے عارضی فاتح بنے ہیں۔ بہت سی بادشاہتیں اور آمریتیں جبر کے زور سے قائم ہوتی رہتی ہیں اور کشاکشِ مفاد کے بے شمار فیصلے جنگ کے میدانوں میں طے پاتے رہے ہیں۔ لیکن دنیا کی کوئی بھی انقلابی تحریک ہو اُسے اپنی قسمت کا فیصلہ ہمیشہ رائے عامہ کے دائرے میں کرنا ہوتا ہے۔ انسانی قلوب جب تک اندر سے کسی دعوت کا سا تڑو دینے پر آمادہ نہ ہوں اور اپنے ذہن و گور کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے راضی نہ ہو جائیں، محض جبر و تشدد سے حاصل کیے ہوئے علمبردار اس کے لیے مفید نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اَلطَّوْءُ اس کی کامل بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ پس ہر اصولی تحریک کا اصل مزاج تعلیمی ہوتا ہے۔ اور اس کے چلانے والوں میں مربیانہ اور معلمانہ شفقت کی روح کام کر رہی ہوتی ہے۔ اصولی تحریکوں کی نگاہ میں زندگی ایک مدرسہ کی نوعیت رکھتی ہے اور افرادِ انسانی اس مدرسہ کے طلبہ ہوتے ہیں۔ ان طلبہ کی مجموعی فلاح نفاذ کرتی ہے کہ شرارت پسندوں کی اصلاح کے لیے اور ان کے اثر سے شریف اور متوسط عناصر کو محفوظ رکھنے کے لیے تادیب کا عصا بھی کبھی کبھار حرکت میں آتا ہے لیکن مجموعی فتنہ بہر حال طلبہ کے حق میں رحمت و شفقت کی فصنا ہوتی ہے اور خود تادیب کے عصا کی جنبش میں بھی استاد کے مربیانہ جذبات ہی موجزن ہوتے ہیں۔ سچائی کے کلمے اور نیکی کے نظام کو لے کر اللہ کے جو بندگانِ پاک تاریخ کے مختلف ادوار میں اٹھتے رہے ہیں۔ انہوں نے چاروں اچار شر و فساد کی سرکوبی کے لیے میدانِ جنگ میں بھی قدم رکھا ہے۔ اور تلوار سے عصائے تادیب کا کام بھی جزئی حد تک لیا ہے۔ مگر فی الحقیقت ان کا مجموعی کام ہمیشہ مربیانہ و مشفقانہ روح کے ساتھ ٹھیک تعلیمی انداز سے جاری



رہا ہے۔ انہوں نے اصل فیصلہ کن معرکہ دلیل کی طاقت سے رائے عام کے وسیع تر دائرے ہی میں لڑا ہے۔ ان کا اصول ہر فرد میں یہ رہا ہے کہ جسے نئی زندگی حاصل کرنی ہو وہ دلیل سے حاصل کرے اور جسے اس زندگی سے محروم رہ کر اپنے آپ کو موت کے گھاٹ اتارنا پسند ہو وہ دلیل ہی کے مارنے سے مرے۔ حضور کے جنگی اقدامات کو دیکھیں تو معرکہ بدر سے لے کر فتح مکہ تک (فتح خیبر سمیت) کل پانچ بڑے معرکے ہوئے۔ جو دراصل حقیقت کے لحاظ سے سارے کے سارے مدافعتی ہی تھے۔ لیکن ان میں سے اول الذکر تین تو اسی صورت میں لڑے گئے جب کہ دشمن نے چڑھائی کر کے مدینہ پر دھاوا بولا۔ لے دے کے دو ہی کارروائیاں مدینہ سے خود حضور نے پیش قدمی کر کے کیں۔ یعنی ایک فتح مکہ (مع جنگِ خیبر) کے لیے اور دوسری فتح خیبر کے لیے، بس ان دو ہی اقدامات میں فیصلہ ہو گیا۔ مدت کے لحاظ سے دیکھیں تو معرکہ بدر سے فتح مکہ تک کل زمانہ ۶ برس کا ہے۔ حضور نے اپنے عظیم تبلیغی و تعلیمی اور تعمیری و اصلاحی کارنامے میں ۲۳ برس کی لمبی مدت کھپائی اور اس میں سے فقط ۶ برس ایسے ہیں کہ جن میں تعلیم انسانیت کے مختلف کاموں کے ساتھ ساتھ حرفیوں کی شمشیر جنگ پسند کا مقابلہ بھی مجبوراً کرنا پڑا۔ انتہائی مبالغہ سے اندازہ کریں تو بھی سارے کے سارے معرکوں میں مجموعی طور پر ۱۵ ہزار سے زیادہ افراد حضور کا مقابلہ کرنے نہ آتے ہوں گے ان میں سے صرف ۷۵۹ جانوں کو راستہ سے ہٹانے کے لیے عرب کی کئی لاکھ کی پوری آبادی سنور سدھر جاتی ہے۔ دس برس کے عرصے میں جو تاریخ کی دستوں میں بہت ہی محدود دکھائی دیتا ہے۔ عرب جیسے صحرا کو زندگی کے ایک مدرسہ فلاح میں بدل دینا اور تمام بکھرے ہوئے قبائل اور انتہائی وحشی، سر پھرے اور جنگجو افراد کو اس میں داخل کر لینا اور پھر ان کو عظیم سچائیوں اور پاکیزہ اخلاق کی تعلیم دینے میں کامیاب ہو جانا اور نہ صرف تعلیم دینا بلکہ نوعِ انسانی کے لیے ان کو معلم و مربی بنا دینا شاید حضور کی نبوت کا سب سے بڑا حسی معجزہ ہے۔

پس یہ امر ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو جاتا ہے کہ اسلام کی انقلابی تحریک کے خلاف جانتے بوجھتے کی کشمکش کا فیصلہ ہونے میں جنگی معرکوں کا کتنا بھی اثر پڑا ہو لیکن بہر حال فیصلہ کا اصل میدان رائے عام کا میدان تھا۔ بلکہ فدا روحانی زبان میں بات کہیں تو دلوں کا میدان تھا۔ عرب کے لاکھوں مردوزن مفتوح ہوئے تو اسی میدان میں دلیل اور اخلاق کے اسلحہ سے مفتوح ہوئے۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے ہم اپنے مقالہ کی آخری فصل میں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ہر جہتی مخالفوں اور مردانگن مزاحمتوں کے نت نئے طوفانوں کے باوجود یہ کیسے ممکن ہوا کہ ایک قلیل مدت میں دس بارہ لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی کشمکش اور آدمِ اسلامی نظامِ حیات کے سائے میں آگئی تو بر تو تاریخ کیوں کا سینہ چیر کر کیسے مورِ صبح مسکرائی اور

اس کی مسکراہٹوں نے ہر چہار جانب ایک پاکیزہ اجالا پھیلا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوتِ اگرحق ہو۔ تحریک اگر انسانی فلاح پر مبنی ہو۔ اور اس کے علمبردار اگر مخلص اور ایثار پیشہ ہوں تو مخالفتیں اور مزاحمتیں ہمیشہ نقیبانی قافلہ کے لیے ہمیشہ کا کام دیتی ہیں۔ ہر رکاوٹ ایک سنگ میل بن جاتی ہے۔ راستے کا ہر کنارہ ہماری کرنے لگتا ہے۔ درد کی ٹیسیں جب فغاں کا روپ اختیار کرتی ہیں تو فغاں ہی بانگِ جرس بن جاتی ہے۔ پیر ہولہان ہوتے ہیں، تو خون کی ہر بوند کو شرارہٴ عشق ایک چراغِ روشن میں بدل دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سچائی اگرچہ ایک اقلیت کے ساتھ ابھرتی ہے لیکن اکثریت کو فتح کر لیتی ہے۔ آئیے دیکھیں کہ تحریکِ اسلامی نے کن کن قوتوں سے کام لے کر رائے عام کے دائرہ میں تیزی سے قدم بڑھانے کے راستے بنائے۔

### دلیل کی قوت :

تحریکِ اسلامی کی سب سے بڑی قوت دلیل کی قوت تھی۔ پیری مریدی کا کوئی نظام ہوتا تو مخاطبوں کی عقول کو سن کرتا۔ روایتی مذہبیت کا کوئی پیغام ہوتا تو اوہام پسندی کے رجحانات کی آبیاری کرتا۔ یہاں تصدیف کا کوئی سلسلہ ہوتا تو چشمِ بند و گوشِ بند و لبِ بند کا افسوس پڑھتا۔ مگر وہاں تو ایسی ذی شعور روحوں کی مانگ تھی جو خدا پرستی کی بنیادوں پر پورا ایک نظامِ تمدن اٹھا سکیں۔ اور حسن و خوبی سے چلا سکیں اس لیے تحریکِ اسلامی نے اپنی دعوت پیش کی تو سوتی ہوئی عقلوں کو چونکایا۔ دماغوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھنے اور کان کھول کر سننے کی تلقین کی۔ نظامِ کائنات میں تدبیر کرنے کی ترغیب دلائی۔ نفس و آفاق کے احوال کا تجزیہ کرنے کا سبق دیا۔ نت نئے سوال چھیڑ چھیڑ کر فکروں میں تخیل پیدا کی۔ ذہنی تقلید کے بندھنوں کو توڑا۔ فضول روایات و رسوم کے جال پارہ پارہ کیے۔ آباد پرستی اور مانعہ پرستی کے سحر کو باطل کیا۔ اس نے کمالِ انعام قسم کی مخلوق کے اندر سے سوچنے سمجھنے والا انسان برآمد کرنے کی تدبیر کی اس نے **صَلِّ بِنَاكُمْ عُنِّي** قسم کے افراد کو مٹھونکے لگا لگا کر بے شعوری کی پنک سے نکالا۔ اس نے دماغوں سے زنگ دُور کیا۔ الغرض اس نے جاہلیت کے مسلط کردہ عقلمندی کو توڑ دیا۔ اس طرح جو جو وہیں جاگتی گئیں اور جن لوگوں کی عقلمندی انکڑاٹیاں لے کر اٹھنے لگیں ان کے سامنے زندگی کی بنیادی سچائیاں تھیں اور اپنے استدلال کے زور سے یکے بعد دیگرے ان کو متاثر کر کے چھوڑا۔

تحریکِ اسلامی نے خدائے واحد کو خالق، مالک، رازق، حاکم اور ہادی کی حیثیت سے پیش کیا تو اس زورِ استدلال سے پیش کیا کہ جو ابی اوہام کے اسلمہ کند ہو کر رہ گئے۔ اس نے انسانی قوتِ مشاہدہ کو اگسا کر دعوت دی کہ بین و آسمان کی نیزگیوں پر نگاہ ڈالو۔ چاند تاروں کی گردش پر غور کرو۔ موسموں کے چرخے کا گھاؤ دیکھو۔ ہواؤں اور بارشوں کے نظام میں کاوش کرو۔ نباتات کی روئیدگی و بائیدگی کے مناظر

سے سبق لو۔ حیوانات کی نشوونما اور ان کے تناسل میں دماغ کھپاؤ۔ انسانی گروہوں کی رنگارنگی اور تمدنوں کے مدوجزر کا مطالعہ کرو۔ اپنے نفوس و اذہان کی گہرائیوں میں جھانکو۔ تم دیکھو گے کہ ہر طوطا اٹل تو این اپنا کام کر رہے ہیں۔ ہر دائرہ وجود میں ایک نظم کی کار فرمائی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے واقعات و حوادث کا رخ کسی غایت کی طرف ہے۔ گونا گوں اصدا باہم دگر تعاون کر رہے ہیں۔ پورے کارخانہ ہستی میں ایک توافق کار فرما ہے۔ کثرت وحدت کے رشتے میں بندھی ہے۔ پھر ہر شے میں ارتقاء ہے۔ ہر چیز بہتری کی طرف جا رہی ہے۔ ہر علت کسی اہم نتیجہ کو پیدا کر رہی ہے۔ اور پھر ہر نتیجہ خود آگے کے لیے ایک علت بن رہا ہے، یہ قانون، یہ نظم، یہ توافق، یہ تعاون، یہ وحدت، یہ ارتقاء آپ سے آپ بطور ایک اتفاقی حادثے کے نمودار نہیں ہوا۔ چیزیں اپنے آپ کو خود بخود تجویز نہیں کرتیں۔ اپنا نقشہ خود نہیں بناتیں۔ بے شعور اور بے جان مادہ اُونچے موجودات کی تخلیق آپ سے آپ نہیں کرتا۔ عناصر باہمی مشورے سے توافق نہیں کرتے۔ بلکہ بالاتر ہستی۔ فعال و مختار اور حکیم و خبیر ہستی۔ ایک ناظم، ایک ڈائریکٹر، ایک حکمران اور ایک قانون ساز کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ تمام اقوات و عناصر اسی کی تسبیح کہتے ہیں۔ تمام موجودات اسی کے حضور سجدہ ریز ہیں۔ تمام مخلوق اسی کے طبعی دین کی پابند ہے۔ عظیم سورجوں سے لے کر ننھے سالموں تک ہر شے اس کی بارگاہ میں مسلم کی حیثیت سے سرانقباد ختم کئے ہوئے ہے۔ پھر اسلامی تحریک نے بتایا کہ اگر اتنے بڑے کارخانہ وجود کے اوپر ایک سے زیادہ مالک اور منتظم ہوتے تو ان کے درمیان ٹکراؤ ہو جاتا۔ اور یہ یک رنگی اور ہم آہنگی کسی طرح قائم نہ رہتی جس کا مشاہدہ تم کر رہے ہو۔ گویا کتاب کائنات کا ہر ورق خدا کی ہستی ہی پر نہیں بلکہ اس کی توحید پر اور اس کی مختلف صفات پر حکم دلائل سے جرا پڑا ہے۔

پھر اسلامی تحریک نے دلیل کے زور سے واضح کیا کہ یہ کائنات جو پوری کی پوری خدا کے دین اور قانون میں جکڑی ہوئی ہے اور جس کا ہر ذرہ اس کے سامنے مسلم بن کر حاضر ہے، اس میں کسی مخلوق کے لیے خدا کے سامنے بندگی و طاعت اور اسلام و انقیاد کا رویہ اختیار کیے بغیر کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم خدا کے مسلم بنو گے تو ساری کائنات سے ہم آہنگ ہو جاؤ گے۔ اور تمہارا نظام تمدن ویسے ہی امن و توافق کا مظہر بن جائے گا، جیسے مادہ کی مادہ نگری میں کار فرما ہے۔ اور تم اگر خدا سے بغاوت اور کفر کرو گے۔ تو نظام کائنات سے تمہارا نظام تمدن بے ربط ہو جائے گا۔ اور اس میں توازن و توافق نہیں رہے گا۔ جو زمین آسمان میں کار فرما ہے۔ اور جس کی وجہ سے موجودات سلامتی سے بہرہ مند ہو کر ارتقاء کر رہے ہیں۔ اس کائنات میں انسان کے لیے بھی فلاح کی واحد راہ یہی ہے کہ وہ خدا کے دین اور خدا کے قانون کا پابند ہو کر رہے۔ تم

جو خدا کے پیدا کیے سے پیدا ہوتے ہو۔ اس کے رزق پر پلٹتے ہو۔ اور ہاں تم کہ جن کے بدن کا عضو عضو اور جن کے اعضاء کا ذرہ ذرہ مسلم بن کر خدائی قانون میں جکڑا ہوا ہے، تمہارے لیے زندگی کی کوئی سی راہ ہے تو خدا کی بندگی ہی کی راہ ہے۔ تمہاری فطرت کا خمیر اسی بندگی کے عہد سے اٹھایا گیا ہے اور تمہارے ضمیروں میں احساسِ عبودیت پیوست ہے۔

پھر اسلامی تحریک نے اسی زورِ استدلال سے یہ حقیقت بھی اجاگر کی کہ خدا کی طرف سے ہدایت کی احتیاج ہر بر ذرے کو ہے۔ وہی عناصر کی تقدیریں مقرر کرنے والا ہے، وہی اجرامِ فلکی کے مدار اور ان کی رفتاریں طے کرتا ہے۔ وہی اشیا کو مختلف خواص دیتا ہے، وہی ہر بر قوت کو اس کے خاص فرائض میں لگاتا ہے۔ اور وہی ہر مخلوق کے لیے راہِ عمل معین کرتا ہے۔ دوسرے موجودات کی طرح انسان بھی اس کی ہدایت کا اسی طرح محتاج ہے جیسے وہ روشنی ہو، اور پانی کا محتاج ہے۔ خدا نے اپنی ہدایت سے مخلوق کو بہرہ مند کرنے کے لیے وحی کا نظام مقرر کیا ہے۔ بے جان عناصر کے لیے طبعی جبریت، نباتات کے لیے قوتِ نمو، حیوانات کے لیے جہتِ وحی کا ذریعہ ہے۔ لیکن انسان چونکہ شعور سے بہرہ مند ہے اس لیے اس کے لیے وحی کی وہ تکمیلی صورت مقرر کی گئی ہے جس کے تحت اس کے شعور کو مخاطب کیا جاتا ہے۔

پھر اسلامی تحریک نے اپنی اصولی دعوت کے اس جز کو بھی دلیل ہی کے زور سے قابلِ قبول بنایا کہ جب اس کائنات میں علت و معلول اور سبب و نتیجہ کا قانون کام کر رہا ہے تو انسان کے خدائی اعمال کو بھی اس جامع قانون کے تحت کسی تکمیلی نتیجہ تک پہنچنا چاہیے۔ اس نے قانونِ مکافات کو تاریخ میں دکھا کر ثابت کیا کہ اس قانون کے احاطے میں انسان کی تمدنی سرگرمیوں کو بھی آنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی دکھایا کہ انسان کی اس محدود امتحانی زندگی میں محدود قانونِ مکافات کے تحت پورے کے پورے نتائج اعمال سامنے نہیں آتے۔ بلکہ بسا اوقات ایک سلسلہٴ اعمال ہی کی تکمیل نہیں ہوتی نیز اس سے بھی بڑھ کر بہت سی صورتوں میں بالکل اُلٹے نتائج سے آدمی کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لہذا اس خدائی نظام سے توقع کرنی چاہیے کہ ارضی زندگی کے بعد کسی نئے دورِ حیات میں انسانی اعمال کے نتائج کو بھرپور طریق سے ظہور کرنا ہے۔ خدائی عدل جو ہر طرف کار فرما ہے، اس کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ جو جیسا کرے ویسا بھرے۔ اس طرح اس نے حیاتِ بعد الموت اور محاسبہٴ آخرت اور جزا و سزا کا تصور دیا۔

پھر ان ساری بنیادی سچائیوں کو ثابت کرنے کے لیے اس نے پھیلی پوری انسانی تاریخ پیش کر دی۔ ایک ایک قوم کی داستان کو لیا اور دکھایا کہ جن انسانی گروہوں نے زندگی کا نظام ان حقائق پر اٹھایا

انہوں نے فلاح پائی۔ اور جنہوں نے ان سے رُوگردانی کی، وہ خوار و رسوا ہو کر ملیا میٹ ہو گئیں۔ جن افراد نے ان کو قبول کیا، ان کے دل و دماغ روشن ہو گئے۔ اور ان کے کردار جگمگا اٹھے اور جنہوں نے ان کی مخالفت کی وہ پستیوں میں گرتے چلے گئے۔ دکھایا کہ یہ وہ سچائیاں ہیں جن کی دعوت ہر دور تاریخ میں ہر قوم کے سامنے ایک ہی طرز کے لوگوں نے بار بار پیش کی اور ان کو غالب کرنے کے لیے بے لوث جذبہٴ اخلاص کے ساتھ جان و مال کی ساری متاع سچھا اور کر دکھائی۔

اسلامی تحریک کی یہ اساسی دعوت اپنے پورے استدالات کے ساتھ قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسے بڑے حُسن تکرار سے پیش کیا گیا۔ اسے دلربا و تشریف آیت کے ساتھ لایا گیا۔ اس کے لیے بہترین ادبی زبان استعمال کی گئی۔ اس میں جذبات لطیف، کارس گھول دیا گیا۔ مخالفانہ اعتراضات کو ساتھ کے ساتھ صاف کیا گیا۔ منکروں اور حریفوں کی نکتہ آفرینیوں اور طنز و استہزاء کا سنجیدگی سے تجزیہ کیا گیا۔ پھر کہیں عبرت دلائی۔ کہیں تنبیہ کی۔ کہیں شرم دلائی۔ کہیں چیلنج کیا۔ کہیں نرمی اور لطافت سے دلوں کو گھلایا کہیں استغناء کا انداز اختیار کیا۔ کہیں استعجاب کا رنگ بھرا۔ غرضیکہ مختلف اسالیب سے انسانی ذہن کو اس طرح گھیرا کہ، اربابِ شعور کے لیے کوئی راہ فرار کھلی نہ رہنے دی۔

اگر بازی تلوار کے زور سے فتح کی جانے کی ہوتی تو آخر استدلال کے اتنے اہتمام کی ضرورت ہی کیا تھی جو قرآن کے دو تہائی بلکہ زائد حصے میں پھیلا ہوا ہے۔

درحقیقت اسلامی تحریک کی بے پناہ قوتِ استدلال نے اپنے مخاطبوں کو بے دم کر دیا۔ اور ان میں سے اہل سعادت نے قبولِ حق کے لیے دلوں کے دروازے کھول دیے اور اہل زلیخ مجبور ہوئے کہ دلیل کی بازی ختم کر کے تشدد کے اوجھے ہتھیاروں پر اتر آئیں۔ جو بھی دعوت و تحریک اپنے مخاطبوں کو اس مرحلے پر پہنچا دیتی ہے وہ آخر کار میدان مار لے جاتی ہے۔

### خیر خواہانہ اپیل :

دلیل مجرد دلیل ہی نہ تھی بلکہ دلیل کے ساتھ دلوں کو گھلایا کر موم کر دینے والی، دُور بھاگنے والوں کو قریب کھینچنے والی رُوحوں کے بند دروازوں پر دستک دے کر ان کو کھلوا لینے والی اپیل بھی برابر شامل تھی دعوتِ حق کی اپیل نے چٹانوں میں احساس ابھار دیا۔ نگرہی کے کندوں میں جذبات کی لہریں پیدا کر دیں۔ اور اکھڑ شمتوں کو اشک آلود کر دیا۔ اسلامی تحریک کے ساز سے ایسے ایسے رُوح پرور نغمات اُڑے کہ دلوں میں حیاتِ نو کی رو دوڑا گئے۔ جاؤ، قرآن کھول کے دیکھو کہ کس طرح اس کے ایک ایک جملے میں شعور کے نور کے ساتھ جذبوں کی گرمی گھٹی ہوئی ہے۔ یہ دو آتشہ جہبائے طور تھی کہ جس نے بڑے بڑے سنگدلوں

کو مسخر کر لیا۔ اور جس نے حق کے دشمنوں کو حق کا خادم بنا دیا۔ پھر اس کا ادنیٰ زور ایسا سحر آفرین تھا کہ اُس نے چمن فصاحت کی بلبلوں کو ساکت اور وقت کی بزم سخن میں نغمہ آفرین شعر کو گنگا کر دیا۔ اس نے ایسی عربی مبین میں کلام کیا کہ سارا عرب ویسا کلام پیش کرنے سے عاجز رہ گیا۔ ہم یہاں دعوت حق کے نغمہ کے چند بول پیش کر رہے ہیں۔

ان سے کہو داے پیغمبر! میری طرف سے، کہ اے میرے بندو! جو اپنی جانوں پر نعلم ڈھاتے رہے ہو، اللہ کی رحمت سے اپنی آس نہ توڑو۔ یقیناً تم رجوع کرنے والے بنو تو، خدا سارے کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔ اور یقیناً وہ درگزر کرنے والا مہربان ہے۔ اور تم اپنے رب کی طرف جھکو اور اس کے حضور میں سر تسلیم خم کر دو۔ قبل اس کے کہ تم کو عذاب آگھیرے اور پھر تمہیں کوئی مدد نہ مل سکے۔ اور پیر دی کر دو اس بہترین توشہ ہدایت کی جو تمہارے رب کی بارگاہ سے تمہاری جانب بھیجا گیا ہے۔ پس اس کے کہ تمہیں عذاب اچانک آپکڑے جب کہ تمہیں خبر بھی نہ ہو۔ پھر اس وقت کوئی جان یہ کہتی رہ جائے کہ ہائے افسوس میری اس کوتاہی پر جو میں نے اللہ کے حق میں دکھائی اور میں تحقیقت کی ہنسی اڑاتا رہا۔ یاد وہ دمایوس ہو کر، کہے کہ اگر اللہ مجھے راستہ سمجھاتا تو میں سنبھل کر چلنے والوں میں شامل ہوتا۔ یا جب وہ عذاب کو دیکھے تو یوں کہے کہ اگر ایک موقع اور ملے تو میں احسان کپش لوگوں میں جا ملوں۔ (الزمر - ۵۳ تا ۵۸)

اس ایک ٹکڑے میں بڑے ایجاز سے وہ ساری بنیادی سچائیاں سموتی ہوئی ہیں جن کی آیت دار محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تھی۔ پھر اس میں عقلی استدلال بھی موجود ہے۔ اور اس کے نغمہ دل ہادینے والا جذباتی پہل ہے۔ اس میں بشارت بھی ہے اور انتباہ بھی۔ قرآن اس طرح کی رنگارنگ پکاروں سے بھرا پڑا ہے۔ مٹی سے بنے ہوئے انسانی پتلوں کے بس میں نہ تھا کہ ایسے انقلاب آفرین کلام کی موجوں کے سامنے کھڑے رہ سکتے۔ جب کہ اس کے ریٹے مسلسل چلے آ رہے تھے۔ ہر صبح، ہر شام، ہر آن!! — تیس سال تک متواتر یہ سیل معنی اڑتا رہا۔ تو آخر کیسے تصور میں آسکتا ہے کہ نغمہ اور حرارت کی ان لہروں کی زد پر آنے والے آدم زاد اپنی جگہوں پر جوں کے توں جامد رہ سکتے۔ اور الہام پارے جن میں عمومی خطاب ہے ملاحظہ ہوں :-

”اے آدم کی اولاد! کیا میں نے تم کو متنبہ نہ کر دیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا، وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ میری ہی عبادت کرنا، یہی ہے راہ راست اور وہ راستہ“

کے باوجود تم میں سے بہت سی خلقت کو بہکائے گیا۔ پھر کیا تم لوگ سوچو جو جھوٹے کام نہ لے سکتے تھے؟ (یس ۶۰ تا ۶۲)

”کہہ دو (اے پیغمبر!) کہ اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے حق تم تک آچکا۔ سو اب جو کوئی بھی راہ یاب ہو تو اس کا راہ یاب ہونا اس کی اپنی ہی جان کے لیے (سو مند) ہے۔ اور جو کوئی بھٹکے تو اس کا بھٹکنا خود اسی کے لیے (موجب خسراں) ہے۔ اور میں

تم پر مختار نہیں ہوں“ (یونس - ۱۰۸)

وہ لوگ جنہوں نے مخالفت کے محاذ کھولے ان کے بھی بہترین احساسات کو لپکارا گیا۔ اور زیادہ

سے زیادہ موثر اور دل گداز اسلوب سے ان کی اساسی فطرت کو اپیل کیا گیا۔ مشرکین مکہ ہوں یا اہل کتاب ہر گروہ کے بہترین عناصر کو بہترین اسلوب سے خطاب کیا اور ان کے بہترین جذبات کو حرکت میں لانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ منافقین کو بھی اصلاح کی دعوت دی۔ اس سلسلے کی مثالیں بھی الگ الگ پیش کی جاتی ہیں۔

مشرکین مکہ سے خطاب :-

”اللہ نے ایک بستی کی مثال دی ہے جو امن چین سے دن گزار رہی تھی اور اس کی روزی سہر چہار جانب سے بافراط چلی آرہی تھی۔ پھر اس (کے باشندوں) نے خدا کے احسانوں کی ناشکری کی۔ سو اللہ نے ان کے کرتوتوں کے بدلے میں انہیں بھوک اور خوف (کی حالت) کا لباس پہنا کہ مزہ چکھایا اور ان کے درمیان خود انہیں میں سے پیغمبر مبعوث ہو چکا تھا، پھر انہوں نے اُسے جھٹلا دیا۔ پس ان کو عذاب نے آکھڑا اور وہ تھے ہی ظالم!“

اہل کتاب سے خطاب :-

”اے اہل کتاب! ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا جو کتاب الہی کی ان بہت سی حقیقتوں کو تمہارے سامنے منتقل کر لارہا ہے۔ جنہیں تم چھپاتے ہو اور وہ بہت ساری چیزوں سے درگزر بھی کرتا ہے۔ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی آچکی اور واضح کتاب پہنچ چکی جس کے ذریعے اللہ ایسے لوگوں کو سلامتی کی راہ پر لاتا ہے جو اس کی مرضیات کے پیچھے چلیں اور انہیں تاریکیوں سے نکال نکال کر اپنے حکیم خاص کے مطابق اُجالے میں لاتا ہے۔ اور انہیں راہِ راست کی طرف رہنمائی دیتا ہے (المائدہ - ۱۶)

”کہو! اے پیغمبر! کہ اے اہل کتاب! اپنے دین میں ناحق کے مبالغہ سے کام نہ لو اور اپنے ہاں کے، ایسے لوگوں کے نفسانی رجحانات کے پیچھے نہ چلو جو پہلے سے گمراہ ہیں اور جنہوں نے بہتوں کو بہکا دیا ہے اور جو سیدھی راہ سے دُور جا پڑے ہیں۔“  
(المائدہ - ۷۷)

”اے اہل کتاب! رسولوں کے سلسلہ بعثت میں ایک لمبے وقفے کے بعد ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا جو حقیقتوں کو تمہارے سامنے منظر کر ڈالے۔“ — (ممکن ہے کہ کہیں تم بطور عذر کہو کہ ہم کب تو کوئی بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا آیا تو نہ تھا۔ سو اب بشارت دینے والا تمہاری طرف آچکا۔) (المائدہ - ۱۹)

اور ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل کے لیے فیصلہ دے دیا کہ تم زمین میں دو مرتبہ فساد کرو گے اور بہت بری طرح سرکشی دکھائو گے۔ سزا اسے بنی اسرائیل، جب یہ وعدہ کا موقع آیا تو ہم نے تمہارے اوپر اپنے سخت جہنگ جو بندوں کو سناٹا کر دیا۔ کثیر وہ شہروں میں پھیل گئے۔ اور وہ وعدہ تو پورا ہوتا ہی تھا۔ پھر ہم نے ان کے مقابلے میں تمہیں ایک موقع دیا اور اموال و اولاد سے تمہیں تقویت دی۔ اور تمہاری آغوشوں دی۔ اور تمہیں پھر مہلت دی کہ اگر تم نے بھلائی اختیار کی تو اپنی ہی جانوں کا بدلہ کیا۔ اور اگر برائی کی تو وہ بھی اپنے ہی حق میں کی! پھر جب دوسرے وعدہ کا موقع آیا کہ وہ لوگ تمہارے چہروں کو دکھ اور ذلت کی سیاہی سے، کھونسا دیں اور <sup>میں</sup> بے ہوشی میں اسی طرح گھسیں جیسے وہ پہلے گھسے تھے اور جہاں وہ غلبہ پائیں۔ وہاں سیاہی پھیل دیں (تو تم نے پورا پورا مزہ چکھ لیا)۔ — اب جب کہ دعوتِ محمدی کے نمودار ہونے سے تمہارے سامنے ایک فیصلہ کن موقع اور پیدا ہوا ہے، تمہارا رعب چھوٹا ہے کہ تم پر رحم کرے۔ لیکن اگر تم پھر وہی کچھ کرو گے، تو ہم بھی ویسا ہی مزہ آکھنا نہیں گے اور آخرت میں، ہم نے جہنم کو نافرمانوں کے لیے ٹھکانا بنایا ہے۔ (بنی اسرائیل - ۱۷۰)

”کہو کہ اے اہل کتاب! اس سیاھے سیدھے کلمہ کی طرف آؤ جو تمہارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے۔ — یہ کہ ہم ایک اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اور نہ کسی شے کو اس کے ساتھ شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم لوگ اللہ کو چسپو کر با ہم دگر ایک دوسرے کو رب بنالیں۔“ (آل عمران - ۶۴)



## عیسائیوں سے خطاب :-

اور تم (یہود کے مقابلے میں) ان لوگوں کو مسلمانوں کی محبت میں قریب تر پاتے ہو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان لوگوں میں علماء اور رویش ہیں اور اس وجہ سے کہ یہ لوگ تکبر میں مبتلا نہیں ہیں۔ اور یہ لوگ جب اس کلام کو سنتے ہیں جو رسولؐ پر اترا ہے تو ان کے حق کو پہچانتے کے باعث تم ان کی آنکھوں کو دیکھتے ہو کہ آنسوؤں سے ڈبڈب جاتی ہیں۔ وہ پکار اُٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے۔ پس ہمیں حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔ (المائدہ)

## منافقین سے خطاب !

”کیا یہ منافق، لوگ سوچتے نہیں کہ یہ ہر سال دو ایک بار آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں۔ پھر بھی توبہ نہیں کرتے۔ اور نہ نصیحت قبول کرتے ہیں۔ اور جب کبھی کوئی سورۃ نازل ہوتی ہے۔ تو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں کہ آیا کوئی تمہاری طرف دیکھ رہا ہے۔ پھر اُٹھ کے چلے جاتے ہیں۔ ان کے دلوں کو خدا نے اس لیے پھیر دیا ہے کہ یہ لوگ سوجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے۔ دیکھو! تمہارے اندر سے رسول تمہارے پاس آچکا ہے، اس کے لیے بارِ خاطر ہے ہر وہ چیز جو تمہیں تکلیف دے۔ وہ تمہارا مشاق ہے اور وہ اہل ایمان کے لیے شفیق اور مہربان ہے۔“ (یونس — ۱۲۶ تا ۱۲۸)

قرآن دلوں کو لگھلا دینے والے ایسے بولوں سے بھرا پڑا ہے۔ دوتوں میں پیوست ہو جانے والے جملے، ضمیروں میں تحریک پیدا کر دینے والے موتیوں جیسے الفاظ، احساسات کے تاروں کو چھیر دینے والے ادبی اسالیب! — کتنی بڑی طاقت ہے قرآن اور کتنی ہنگامہ خیز رہی ہوگی دعوتِ حق! حقیقت کی یہ شعاعیں جب پے در پے برستی ہونگی تو اوسط درجے کے انسانوں کے لیے کیسے ممکن رہا ہوگا کہ وہ انکار کر دار کی تاریکیوں کو سینے میں آراستہ کیے رکھیں۔ دلیل کی طاقت کے ساتھ جب اپیل کی طاقت آلتی ہے تو یہ دو دھاری تلوار پتھروں کو بھی کاٹ جاتی ہے۔ پھر جہاں قرآن کی بارانِ کلام کی پھواریں متواتر پڑتی ہیں، وہاں صاحبِ نبوت کا تکلم بھی درسوں، خطبوں، تقریروں اور گفتگوؤں میں ہر آن نور کی لہریں اٹھا رہا تھا۔ زمانے نے اس بحرِ مواج کے جو موتی محفوظ رکھے ہیں ذرا آج ان کو جانچو۔ چھوٹے چھوٹے بول محفوظ لفظوں میں زیادہ معنی، ادبیت و خطابت کا زور، بات میں روحِ اخلاص گھٹی ہوئی، گفتگو حالات پر منطبق، کسی دوسری شخصیت کا سمندر ایسے موتی پھر پیدا نہ کر سکا۔ پھر اسلامی تحریک کے شعراء اور ادیب

اور خطیب تھے کہ جنہوں نے نئے فنی معیارات اور انقلابی اسالیب کے ساتھ جب سازِ نطق پر اسلام کے کلمہ انقلاب کا زخمہ چلایا تو ان کی ہر موج آہنگ نے ریت کے ذروں میں بھی دھڑکتے ہوئے دل پیدا کر دیئے ہونگے۔ آج بھی اس دور کے دفترِ سخن کو اٹھا کر دیکھو، تو حسان بن ثابت اور کعب بن مالک کا حسین تخیل ان کے مخلصانہ جذبوں کے پُر لگا کر عجیب عقابِ شان سے اڑتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے نغمے جب روزِ مرہ واقعات سے ہم آہنگ اور کش کش کے ماحول سے مربوط ہو کر نمودار ہوتے ہوں گے تو آخر انسانی دلوں پر کوئی تو کیفیت گزرتی ہوگی۔ مدعا یہ کہ اصل طاقت قولِ حق کی تھی۔ جس، کہ سامنے ممکن نہ تھا کہ باطل میدان میں جبارہ سکے۔ ان الباطل کان زھوقا!

تنقید :

تحریکِ اسلامی کی دعوتِ دلیل کے ساتھ محض اپیل ہی نہیں لائی بلکہ اس نے اپیل کے ساتھ بھرپور تنقید سے بھی کام لیا۔ صوفیانہ مذاہب میں تو شاید دعوت کا ایک ہی اسلوب چل سکتا ہے۔ یعنی منت و لجاجت اور خوشامد و التماس کا اسلوب۔ آخر جہاں محض افراد کی ذات اور ان کی محدود نجی زندگی تک ہی سے واسطہ ہو اور نظامِ اجتماعی کی اصلاح یا تعمیر نو کا کوئی سوال ہی سامنے نہ رہا ہو۔ وہاں اس اسلوب سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ صوفیانہ مسلکوں اور انفرادی دھرموں میں صرف یہ پیش نظر ہوتا ہے کہ زیر اثر افراد کو کچھ عقیدوں اور کچھ انفرادی خوبیوں سے آراستہ کر دیا جائے اور پھر ان کو برائی کی طاقت سے اپنا آپ بچاتے رہنے کا درس دیا جائے۔ لیکن بدی کی اجتماعی طاقت سے لڑنے اور فاسد ماحول سے ٹکرا لینے کا کوئی داعیہ موجود نہیں ہوتا۔ نظمِ قیادت کی مسند پر بیٹھا اپنا ڈنکا بجاتا رہے اور انسانیت اس کے قدموں میں ذبح کی جاتی رہے۔ آخر ان دنیوی جھمیلوں سے ایک اللہ مست زاہد کو کیا مطلب! چنانچہ ایسے محدود روحانی نظاموں میں آدمی کی سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات اور سیاست کے جھمیلوں سے الگ تھلاک رہے۔ ہر کسی کے آگے یکساں انکسار اور لجاجت دکھا دے۔ ”یا مسلمان اللہ اللہ! بابر ہم رام رام! کا کیش اختیار کرے تو اضع ہر ایک کے سامنے کرے اور درشتی کسی سے بھی نہ برتے۔ ایسے نظاموں میں جنہیں آدمی کو میدانِ کشمکش میں نہ اتارنا ہو بلکہ اسے تمدن کی جدوجہد سے نکال کر غاروں اور خانقاہوں میں جا بٹھانا ہو، تنقید سے کام لینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ تنقید تو ذہنی دنیا میں کشمکش کا آغاز ہوتی ہے چنانچہ محدود روحانیت اور انفرادی مذہبیت کی نگاہوں میں یہ آدمی کی پستی کردار شمار ہوتی ہے کہ وہ کسی طاقت کے خلاف زبانِ تنقید کھولے۔ جیسے یہ دامنِ تقویٰ پر دھبے ڈالنے والا کوئی کام ہو۔ اور اس کے

کرنے سے روح کی شناسائی ماری جاتی ہے۔

لیکن جو نظریے اور دعوتیں تمدن میں انقلاب برپا کرنے اٹھیں ان کے اسلم خانہ فکر میں دلیل اور اسل کی طرح تنقید بھی درجہ اول کی اہمیت رکھتی ہے۔ صرف احقاقِ حق پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ابطلِ باطل بھی واجب ہوتا ہے۔ کیونکہ ابطلِ باطل کے بغیر احقاقِ حق بھی پوری طرح نہیں ہو پاتا۔ یہاں خدا پر ایمان لانا اور طاغوت سے کفر کرنا لازم و ملزوم ٹھہرتا ہے۔ یہاں امر بالمعروف تنہا نہیں کیا جاسکتا بلکہ نہی المنکر بالکل متوازی طور پر کرنا پڑتا ہے۔ یہاں ”إلا اللہ“ کہنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ”لا إله“ پکارا جائے۔

اسلامی تحریک جب بھی رونما ہوتی ہے تو وہ عوام کے سوچنے کا رخ بدلنے کے لیے وقت کے تمدن، اجتماعی ماحول، سیاسی و معاشی نظام اور پھر خاص طور پر مروجہ افکار و معتقدات اور پیمانہ ہائے قدر پر کڑی تنقید کرتی ہے۔ مذہبی سیاسی اور معاشی لحاظ سے ان پیش رو طبقوں کے افکار و اعمال کی حقیقت وہ لازماً کھول دیتی ہے جو عوام کو اپنی غلامی کے جال میں پھانس کے مزے اڑاتے ہیں۔ اس کے لیے چارہ کا ہی اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ زندگی کی قیادت کرنے والوں کا پول وہ عام انسانوں کے سامنے اچھی طرح کھول دے۔ جب تک فاسد کو فاسد، باطل کو باطل اور غلط کو غلط ثابت نہ کر دیا جائے، اس کے مقابلے میں نہ سچائی اور راستی کی کوئی پیاس پیدا ہو سکتی ہے اور نہ تبدیلی کی اُمنگ اُبھر سکتی ہے۔ کسی بھی نبی کی دعوت اور روٹا دیکار کو لیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ نہ صرف معاشرے کے فاسد تصورات و احوال کو نشانہ تنقید بنایا گیا ہے بلکہ ہر نبی نے وقت کے جبارہ کو ٹھیک ان کے درباروں میں جا کر غلط کار کہا ہے۔ یہاں تو نظامِ تمدن کی ساخت کو سامنے رکھ کر یہ حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ ہر بستی، قوم اور ملک میں کچھ ”اکابر مجربین“ پائے جاتے ہیں جو مکارانہ سیاست سے اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں (الانعام - ۱۲۴) ان کو ان کے مناصب پر قائم رکھ کر کوئی اصلاح نہیں کی جاسکتی۔

اسلام جب عربوں کے درمیان جاہلیت کے نظام کو مٹانے اور تاریخ میں نئے ذریعے باب کا افتتاح کرنے اٹھا تو اُس نے جھوٹ اور ظلم اور فساد کی ہر ہر شکل پر بغیر کسی رحم کے تنقید کی۔ اور وقت کے جتنے بھی عناصر جاہلی نظام اور طاغوتی ماحول کے رہبر اور پاسبان اور کار پرواز بن کر معاشرے پر مسلط تھے۔ اور جو اپنے مرتبے اور مفاد کے تحفظ کے لیے فلاحِ انسانی کے پیغام کا مقابلہ کرنے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان سب کا پول ایسی چیرہ دستی سے کھولا کہ ان کے ناپاک کرداروں کے بدن پر اعزازات کی مصنوعی پوشاکوں کا ایک تار بھی لگا نہ رہنے دیا۔ جوں جوں انسانیت دشمن طاقتوں کی حقیقت معاشرے

پر کھلتی گئی، راتے عام میں ایک بیداری شعور پھیلتی چلی گئی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ تبدیلی کی سپاس تیز ہوتی گئی۔ اسلامی تحریک کے تنقیدی محاذ نے عوام الناس میں سوچنے، سمجھنے، جانچنے، پرکھنے اور موازنہ و تقابل کرنے کی صلاحیتوں کو نشوونما دی۔ دعوت کا یہ وہ پہلو تھا جو حق و باطل، خیر و شر اور درست و نادرست میں فارق بنا۔ اسی سے قد تبین الرشدا صغی کا سماں پیدا ہوا۔ اسی کے ذریعے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی منتقل کیا۔ اسی کے ذریعے اندھیرے اور اجالے کا فرق کرنے والی بصارت کام کرنے لگی۔ اسی کے ذریعے زہر اور شکر کے آمیزے کا تجزیہ ہو گیا۔ فاسد طاقتوں کے مظالم کو تو اسلامی تحریک کے جاں باز اپنی جانوں پر اُف کیے بغیر سہتے رہے۔ لیکن ان طاقتوں کے گھٹیا کرداروں سے خوشنما پردے اٹھانے میں انہوں نے کوئی کوتاہی نہیں کی، ان کے کام کے خطوط سیاست و تمدن کے دائروں سے باہر ہی باہر سے نہیں گزرتے تھے کہ وہ جاہلی نظام کی مذہبی و سماجی قیادتوں کو یہ اطمینان دلا کر اپنا فرض انجام دے سکتے، کہ تم نچنت ہو کر اپنے منصبوں اور مرتبوں پر بیٹھے رہو، ہم اللہ والے تمہارے کسی مفاد سے تعرض کرنے والے نہیں ہیں۔ ہمیں تو بس خدا کا نام لینا ہے۔ اور اس کا کلمہ لوگوں کو سنبھانا ہے۔ ان کے جیسے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ان قیادتوں کے سامنے شانِ انکسار سے کچھ خوشامدانہ باتیں کہہ کر ان کو دم دلا سا دلا کر اور ان کی گرفت سے بچ کر اس انقلابی کلمہ حق کو پکار سکتے جس کا واضح منتہا نظامِ قسط کی قامت تھا۔

اس دن تحریک نے عین اپنے داعیِ عظیم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک کو اس تیغِ فریبینہ کی نجات دہی کے لیے استعمال کیا اور سماج کے پھوڑوں کو چیرا دینے کے لیے ٹھیک الہامی لفاظ سے نشتروں کا کام لیا۔ یہ تنقید مجرد اصول و تصورات ہی تک محدود نہ تھی۔ بلکہ مزاحم ہونے والے باثر طبقات اور حریف افراد سبھی اس کی زد پر آئے اور بار بار آئے۔ یہ تنقید روزمرہ کے واقعاتی پس منظر کے ساتھ کی جاتی تھی اور جو کچھ اقدامات اور کارروائیاں مخالف کپ کی طرف سے ہوتی تھیں۔ ان سب کا تجزیہ ساتھ کے ساتھ کر دیا جاتا تھا اس طرح سے عوامی شعور کو تیار کیا گیا۔ یہ کام اگر نہ کیا جاتا تو کچھ پاکباز افراد و ریلے کے چہرے مجبر العقول محسوس ممکن تھا کہ تیار ہو جاتے اور وقت کی دنیا بھی ان کو خراجِ تحسین پیش کرتی اور بعد سے لوگ بھی عجائب خانہ تاریخ میں ان کی یادگاری تصاویر دیکھتے تو عیش عیش کرتے۔ لیکن ماحول کا سارا دریا جوں کا توں سچ بستہ رہتا اور جاہلیت کی اندھیاریاں اس کو بدستور محیط رہتیں۔ نہ اندھیروں کے جاگ چیرا باسکتا اور نہ اس دریا کی زیر آب خوابیدہ موجوں کو جگا یا جاسکتا۔ ممکن ہی نہ تھا کہ عوام میں انقلابی شعور پیدا ہوتا۔ اور کارکنانِ اسلام کے اندر کشمکش کے رجحانات ابھرتے۔ پھر تو بات غارِ حرا پر ہی ختم ہو جاتی۔ کجا کہ کلمہ حق عرب کا فاتح بن کر مکہ میں داخل ہوتا۔

محسن النساءیت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی الہامی زبان میں تنقیدیں کر کے وقت کے اکابر کو نہ صرف عقل و دلیل کے لحاظ سے دیوالیہ ثابت کر دیا۔ بلکہ اخلاق و کردار کے لحاظ سے بھی زمانے پر ہیراز کھول دیا کہ مرعوب کن اور نظر فریب پردہ ہائے عظمت و سیادت میں نہایت مکروہ غلاظتوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ اسی تنقید نے عوام میں یہ احساس پیدا کیا کہ جب تک تحریک اسلامی سے تعاون کر کے ان طاقتوں کو زندگی کی قیادت سے برطرف نہ کر دیا جائے زندگی سفورنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

قریش کو لیا تو ان کی بت پرستی، ان کے اوہام، ان کے مضحکہ انگیز مذہبی رسوم، ان کی اخلاقی پستی اور ان کے زعم سیادت سارے ہی پہلوؤں سے کھولنے کی ہر بات کھول دی۔ ان کے محبوب معبودوں کی بے بسی کو واضح کرنے کے لیے مثال دے کے بتایا کہ یہ سب کے سب مل کر بھی ایک مکھی تک خلع کرنے سے عاجز ہیں بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز اڑا لے جائے تو یہ اس سے واپس لینے کی مجال بھی نہیں رکھتے حضرت ابراہیمؑ کے نام لیوا ہونے پر ان کو جو فخر تھا، اس کو یوں توڑا کہ حضرت ابراہیمؑ کے پورے کے پورے زمانہ حیات کو بار بار ان کے سامنے پیش کر کے دکھایا کہ جس مشن کے لیے انہوں نے اپنی پوری زندگی کھپا دی تھی، گھر بار چھوڑا، پیری کی گدی پر لات ماری۔ نمرود کے سامنے بغاوت کے مقدمہ میں ملزم بنائے گئے اور زندہ جلائے جانے کی سزا تجویز ہوئی۔ پھر وہ اپنے رب کے ہاجر اور خانہ بدوش بنے۔ پھر انہوں نے ایک اجاڑ وادی میں آ کر اپنی دعوت اور خدا کی عبادت کا یہ مرکز قائم کیا جسے اب تم نے اپنی کمائی اور مذہبی پیشواؤں کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ اب تم کو کیا حق پہنچتا ہے کہ اس موحّد حنیف کے تم نام لیوا اور جان نشین بن کے بیٹھو۔ درآں حالیکہ تمہارا بال بال شرک اور جاہلیت کے بندھنوں میں بندھا ہوا ہے۔ پھر دکھایا کہ کیسے تم لوگوں نے حلال و حرام کی ایک انوکھی شریعت گھڑ رکھی ہے۔ دکھایا کہ تم نے استھانوں پر چڑھاؤں کے لیے کیسے کیسے منابطے بنا رکھے ہیں۔ دکھایا کہ پانسے پھینکنے اور قمار بازی کرنے کو بھی تم نے رنگ تقدس دے رکھا ہے۔ دکھایا کہ کس طرح تم بیٹیوں کی پیدائش پر منہ چھپاتے پھرتے ہو۔ اور سنگدل بن کر ان کو مٹی کے انباروں میں زندہ دفن کر دیتے ہو، اور پھر تمہیں خدا کے ساتھ بیٹیوں کو منسوب کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اسی طرح جب کشمکش چھڑی تو ان کی لالیعنی باتوں اور خفیف الحریکتوں میں سے ایک ایک کو ان کے سامنے رکھ کر دکھایا۔ کہ ذرا اپنے کردار کی شکلیں دیکھو۔ ان کے جرائم ان کے سامنے گنوا کر کہا کہ تم مسجد حرام کی تولیت پر نازاں ہو۔ حالانکہ اپنے کفر و شرک کی بناء پر تم اس منصب کے مستحق ہی نہیں ہو، تم نے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکا۔ تم نے کعبہ کے دروازے بند گاہ حق پر بند کیے۔ تم نے اپنے بھائیوں کو جلاوطن کیا۔ اور تم نے دین کی راہ فتنہ انگیزی کو اپنا شعار بنایا۔

پھر اہل کتاب کو لیا تو ان کا صدیوں کا نامہ اعمال کھول کے اُن کے سامنے لکھ دیا کہ کس طرح تم پیروانِ موسیٰؑ نے خود موسیٰ علیہ السلام کو قدم قدم پر اذیت دی تھی۔ بار بار نافرمانیاں کیں۔ بار بار بگاڑ کے راستوں پر پڑتے رہے۔ تم نے جھگڑے کیے۔ فساد اٹھائے بچھڑے کی پوجا کی۔ جہاد سے جی چرایا۔ پھر آپس میں خون خرابے کیے۔ اپنے بھائی بندوں کی بے خانماں کرتے رہے۔ ان کے خلاف ظلم و غدوان کے ساتھ دھاوا بولتے رہے۔ تم نے کتاب الہی میں تحریف کی۔ حق بات کو ہمیشہ چھپایا، اور احبار و رہبان کو اپنا معبود بنا لیا۔ حد یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں سے طرح طرح کی باتیں لکھ کر ان کو خدا سے منسوب کرتے ہو۔ اور خلقِ خدا کو فریب دے دے کر حرام کمائیاں سمیٹتے ہو نہ خود راہِ حق پر چلتے ہو نہ دوسروں کو چلنے دیتے ہو اور کوئی دوسرا اگر انسانی فلاح کا کام کرنے اٹھتا ہے تو اس کے ساتھ تعاون کے بجائے اس کے راستے میں کانٹے بچھاتے ہو۔ کل تک تم خود خدائی نوشتوں کی بنا پر زمانے بھر کو مشردہ سنا تے رہے ہو کہ نبی آخر الزمان آنے والا ہے اور جب وہ واقعی آ پہنچا تو تم اس کے خلاف سف آ رہو گئے مسلم جماعت جو بہت سے دجہ سے تم سے اقرب ہے۔ اور تمہارے انبیاء اور پہلے کی ساری کتابوں کو مانتی ہے اس کے مقابلے میں تمہارا قارورہ اگر ملتا ہے تو اربابِ شرک سے جا کر ملتا ہے۔ ان کر تو توں کو کرتے ہوئے خدائی کتاب برابر تمہاری پیٹھوں پر سوار رہی۔ بالکل ایسے کہ جیسے کسی گدھے پر غلہ کے دفتر لہے ہوں۔ اور وہ ان سے بے خبر نپا جا رہا ہو۔ تم اگر سچے ہوتے تو اپنی زندگیوں پر تورات کو قائم کر کے دکھاتے۔ جب تک نہ لے کتاب انہی کو پس پشت ڈال رکھا ہے تمہارے خوش نما دعویوں کی کچھ بھی وقعت نہیں ہے۔ آج تمہاری تعدادِ کثیر اس پستی میں آ پہنچی ہے کہ ایک دمڑی بھی اگر ان کے پاس امانت رکھوائی جائے تو ان کی خیانت سے بچ کر وہ مشکل ہی سے واپس مل سکتی ہے۔ اپنے اس رویے کی وجہ سے تم نے خدا کا غضب سہیڑا اور تم پر ذلت و مسکنت چبیک دی گئی۔

پھر منافقین کو پکڑا تو ان کا پورا پورا نفسیاتی تجزیہ کر کے انہیں دکھایا کہ تم کس ٹیڑھے زاویے سے ہر معاملے کو سوچتے ہو تنہائی میں بیٹھتے ہو تو تحریک کے حالات و واقعات پر کس انداز سے اُلٹے تہسہرے کرتے ہو۔ مجالس میں آتے ہو تو تمہارا ڈھنگ کیا ہوتا ہے اور کس کس طرح باہم دگر اشارے کرتے ہو کبھی نگرہی کے کندوں کی طرح ساکت ہو جاتے ہو اور تمہاری آنکھیں پھرائی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی چپکے سے شک جاتے ہو، مسلم جماعت میں ہوتے ہو، تو اور طرح سے زبان چلاتے ہو اور پھر دشمنوں میں جا بیٹھتے ہو تو دوسرا ہی ساگ لاپتے ہو۔ ہر معاملے میں تمہارا رویہ جماعت سے الگ الگ اور مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔ دوسروں کو اگر نعمتِ الہام سے دس حیات اور سرائیہ تسکین ملتا ہے تو تمہارے دل اُسے سن کر

بھینچنے لگتے ہیں۔ دوسروں کے لیے رسول پاک کا وجود مرکز محبت بنا ہوا ہے۔ اور تم اپنے آپ کو دوردور رکھنا پسند کرتے ہو۔ دوسروں کے جذبہ دروں انہیں نماز کے لیے کھینچ کھینچ کے لاتا ہے۔ اور تم ہو کہ دل سے کسماتے ہوئے آتے ہو۔ جیسے مارے باندھے کوئی بیگار آدمی کو پوری کر دینی ہو۔ دوسرے اپنا سب کچھ تحریک کے قدموں میں نچھاور کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ اور تم ہو کہ خود بھی خرچ نہیں کر سکتے اور اوروں کو بھی روکتے ہو، دوسرے اپنے نصب العین کی خاطر دل کی اُمنگ سے جہاد کے لیے نکلتے ہیں لیکن تم ہمیشہ جان بچانا چاہتے ہو اور غدر گھر گھر کے راہ فرار نکالتے ہو۔ دوسروں کے لیے جس واقعہ میں خوشی کا پہلو نکلتا ہے۔ اس سے تمہارے دل ملول ہو جاتے ہیں۔ اور دوسروں کو جن حالات میں تکلیف پہنچتی ہے۔ تم ان پر گھبی کے چراغ جلاتے ہو جماعت کے ساتھ کسی طرح بھی تمہارا جوڑ نہیں لگتا۔ گویا اسلامی تحریک نے ہر منافق کے سامنے اس کی تصویر کھینچ کے رکھ دی کہ اپنے خدو خال ملاحظہ فرمائیے۔

جاہلی شعراء جو تحریک اسلامی کے خلاف فن کا محاذ آراستہ کیے ہوئے تھے۔ اور خود اس کے داعی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جو یہ کلام لکھ لکھ کر اسے شائع کرتے رہتے تھے اور خود اس کو بھی لیا گیا۔ چند الفاظ ہیں ان کا ایسا نقشہ کھینچا گیا کہ جو پوری طرح ان پر راست بھی آتا تھا اور جسے دیکھ کر عرب کا عام آدمی فوراً اس نقشہ کی پستی کا اندازہ بھی کر سکتا تھا۔ جاہلی شعرا کی شان یہ بتانی گئی کہ یہ وہ عنصر ہے جس کے گرد جمع ہونے والے اور جس کی امامت میں چلنے والے صرف گم کردہ راہ لوگ ہیں۔ پھر یہ وہ عنصر ہے جو اپنے بے اصول پن کی وجہ سے ہر ہر وادی میں آوارہ گردی کرتا پھرتا ہے پھر یہ وہ عنصر ہے جو زبان سے وہ باتیں کستا ہے جن کے مطابق اس کا اپنا عملی کردار نہیں ہے۔

پھر اسلامی تحریک نے وقت کے خاص خاص گھناؤنے کرداروں کو چھانٹ کر کسی نام کے بغیر ان کی تصویریں اعلیٰ درجہ کے آرٹ کے ساتھ مطابق حقیقت ادبی رنگوں سے تیار کیں اور سماج کے عوامی شعور کے ایوان میں آویزاں کر دیں۔ تاکہ ہر کوئی ان کو دیکھے ان کو سمجھے اور ان کو واقعاتی دنیا میں خود پہچانے۔ کہیں اس کردار کو دکھا یا جو اپنے ہاتوں ہی کے زور سے لوگوں کو مرعوب کر لیتا ہے۔ لیکن عملی کے میدان میں اپنی خوشنما باتوں کو پامال کر کے انسانی سماج میں فتنہ انگیزی کرتا اور تباہی کی آگ لگاتا ہے۔ کہیں اس کردار کو بے نقاب کیا۔ جو خاندانی اور قائدانہ غرور کے نشے میں بدمست رہتا ہے اور اپنی عزت کے حد سے بڑھے ہوئے احساس نے اس کی ناک کو اتنی اہمیت دے دی ہے کہ وہ گویا ہاتھی کی سونڈ کے مماثل ہو گئی ہے۔ اور قیامت کے دن ٹھیک اس سونڈ پر داغ دے کر اسے سزا دی جائے گی۔ کہیں اس انسانی کردار کو دکھا یا کہ جس کی ہوس دنیا نے اسے کتے کی سی عادتوں پر لا ڈالا ہے۔ جسے دھتکارو تو بھی زبان دکھا دیتا

ہے۔ اور چھوڑ تو بھی زبان لٹکا دیتا ہے۔ یہ کردار سماج میں موجود تھے۔ اور چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ان ناقدانہ تصاویر کی وجہ سے ان کو پہچانا اور ان کی پستی کا شعور حاصل کرنا عوام کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

یہ تنقید محض نظری نہ تھی، واقعاتی کشمکش کے ساتھ متعلق تھی۔ اور اس میں بہر حال تحریک اسلامی کے محاذ سے مخالف طاقتوں کو مخاطب کیا جاتا تھا۔ سنانے والے کو بھی معلوم تھا کہ وہ کس کو سنا رہا ہے۔ اور سننے والوں کو بھی اندازہ ہوتا تھا کہ کون ان کی خبر لے رہا ہے۔ یہ تنقیدیں آسمان سے لاؤڈ اسپیکر لگا کر نہیں سنائی جاتی تھیں۔ بلکہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نشر ہوتی تھیں۔ اور انہیں مسلم جماعت کے ارکان گوشے گوشے تک پہنچاتے تھے۔ اس لیے ان کے جذبات ان میں شامل اور ان کی رو میں ان میں عمل ہوتی تھیں۔ یہ واقعاتی مدوجزر پر منطبق کر کے ہی سنائی جاتی تھیں اور سننے والے بھی ان کو زیر تشکیل تاریخ بد منطبق کر کے ہی سمجھتے تھے۔ عوام ان کو اسی حیثیت سے لیتے تھے کہ یہ اس تعمیر پسند انقلابی طاقت کی لپکا ہے۔ جو ہمارے درمیان اُبھری ہے، اور قدیم نظام کو چیلنج کر رہی ہے اور اس کی زوان حریفوں پر پڑ رہی ہے جو انقلابی رو میں مہم جو رہے ہیں۔ ان کو موقع ملتا تھا کہ وہ دونوں طرف کی باتیں سنیں اور فریقین کو انقباض پر رکھ کر جانچیں۔ اس طریقے سے ان کا شعور بنتا چلا گیا۔

دلیل شعور کی روشنی بن سکتی ہے مگر جذبات کو نہیں پکارنی۔ اپیل جذبات کو حرکت دے کر دوست اور بچہ گیری پیدا کر دیتی ہے۔ مگر وہ تاریخ میں عمل معرکہ پیدا نہیں کر سکتی۔ یہ تنقید ہی کی ہی قیمت ہے اور اس کو اپیل کے ساتھ مل کر جب کام کرتی ہے، تو تمدن کے سارے سالمات گردل میں آجاتے ہیں۔ صرف یہ طاقت ہے کہ وقت کے سمندر میں مدوجزر پیدا کر دیتی ہے۔

خلاصہ مدعا یہ کہ اسلامی تحریک نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے دلیل اپیل اور تنقید کے ساتھ عناصر سے کام لیا۔ اور ۲۳ برس تک مسلسل کام لیا۔ انہی سہ گانہ طاقتوں نے حریفوں کو بھی محسوس کرادیا کہ تم علمی و عقلی لحاظ سے فرومایہ، استدلال کے لحاظ سے کمزور اپنے مقاصد کی جذباتی کشش کے لحاظ سے پس ماندہ اور اپنے کردار کے لحاظ سے بہت ادنیٰ سطح پر ہو۔ مخالفین میں مسلم جماعت کی برتری کا اعتراف اور اپنی کمزوری کا احساس غیر شعوری طور پر بڑھتا ہی چلا گیا اور دوسری طرف رائے عام بھی فریقین کو ہر پہلو سے بانجھ کا کافر سمجھتی گئی۔ دعوت کی یہ وہ اصل طاقتیں تھیں جنہوں نے عرب کے لاکھوں باشندوں کو مغنوح کر دیا۔ دعوت اگر برحق نہ ہوتی دعوتوں کے لیے جاذب نہ ہوتی، اپنے علمبرداروں کو متحرک کر کے رزم خیر و شر میں اتار نہ سکتی۔ اور دلیل، اپیل اور تنقید کے ذریعے اپنا لوہا منوانہ لیتی تو مسلم جماعت نہ سیاسی حکمت کے دائرے میں



بازی جیت سکتی تھی اور نہ میدانِ جنگ میں کوئی معرکہ سر کر سکتی تھی۔ ان جزوی میدانوں میں بھی اگر جیت ہوئی تو اس وجہ سے ہوئی کہ رائے عام کے وسیع محاذ پر اسلام کی پیش قدمی بڑی ہی فاتحانہ تھی۔

### مسلم کردار کی اخلاقی قوت :

کوئی دعوت بھی اگر صرف لفظی دعوت ہو، اور اس کے ساتھ اخلاقی زور موجود نہ ہو تو وہ کیسی ہی زریں کیوں نہ ہو۔ اور تھوڑی دیر کے لیے دلوں پر کتنا ہی سحر کیوں نہ طاری کر لے، آخر کار دھوئیں کے مرغولوں کی طرح فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ تاریخ پر الفاظ سے کبھی کوئی اثر نہیں ڈالا جاسکتا۔ اور اکیلی زبان کبھی انقلاب نہیں اٹھا سکتی۔ الفاظ جبھی مؤثر ہوتے ہیں۔ جب کہ عمل کے لغت کے رُو سے ان کے کچھ معنی ہوں۔ زبان کا جادو صابن کے سے خوشنما جھاگ اور رنگین بلبے پیدا کر سکتا ہے۔ مگر یہ بلبے کسی ایک ذرہ خاک کو بھی اس کی جگہ سے ہلانہیں سکتے اور ساتھ کے ساتھ ملتے چلے جاتے ہیں۔ دلیل جب کردار کے بغیر آئے اپیل جب اخلاص سے خالی ہو، اور تنقید جب اخلاقی لحاظ سے کھوکھلی ہو تو انسانیت اس سے متاثر نہیں ہوا کرتی۔ کردار کی اخلاقی طاقت ہی کسی دعوت میں اثر بھرتی ہے۔ عمل کی شہادت کے بغیر زبان کی شہادت بیکار ثابت ہوتی ہے۔ حتیٰ یہ ہے کہ **كَلِمَةً مَّقْتَدَةً عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ** اسلامی تحریک کی دعوت زری منطقی دعوت نہ تھی اور وہ اکیڈمک طرز کی نظریاتی بحثیں لے کے نہیں آئی تھی۔ وہ سراسر ایک پیغامِ عمل تھی اور ایک تحریکِ اقدام! وہ ایک خاص طرز کا انسان بنانے آئی تھی۔ اور وہ انسان اس نے اول روز سے بنانا شروع کر دیا۔ اس انسان کا طرزِ فکر، اس کے اخلاقی اوصاف اور اسی کا من موہنا کردار تھا، جو اس کے دلائل کو حقیقی وزن، اس کی اپیلوں کو سچی جاذبیت اور اس کی تنقیدوں کو گہرا اثر دینے والا تھا۔ تحریکِ اسلامی کا نیا انسان خود ایک محکم دلیل تھا۔ خود سب سے بڑھ کر مؤثر اپیل تھا اور اس کا سارا وجود پرانے نظام، حیوانی ساخت کے انسان، فاسد جاہلی ماحول، جادو سماج اور اس کی نااہل قیادت پر ایک بھرپور تنقید تھا۔ جاہلیت کے پاس اس زندہ دلیل۔ اس زندہ اپیل اور اس زندہ تنقید کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس کا کوئی ٹوڑ نہ تھا وہ اس کے مقابلے میں بالکل بے بس تھی۔ وہ نیا انسان کہ جس کا انتہائی معیاری نمونہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں دنیا کے سامنے تھا اور جس کے بے شمار پیکر اپنی اپنی سیرتوں کے چراغ اس قہرًا منبرِ اکی شاعروں سے روشن کر رہے تھے۔ وہ ایک ایسی قطعی اور ٹھوس حقیقت تھا کہ اس سے آنکھیں بند کرنا بھی اس کی نورانیت پر ایک شہادت تھا۔ اس کا انکار کرنے سے ٹھکرانے اور اس سے ٹکرانے والے بھی اپنے رویتے سے اس کی عظمت کا اعلان کر رہے تھے۔ مکہ میں اس انسان نے اپنی انفرادیت کی شان دکھائی تھی اور مدینہ میں آکر اس نے اپنی اجتماعیت کا جلوہ دکھایا۔

تحریکِ اسلامی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نئے انسان کی تعمیر کے اصل کام سے کبھی غفلت نہیں۔ برقی۔ دوسروں کی اصلاح کرنے کے جذبے میں اسے کبھی فراموش نہیں کیا۔ اور دوسروں پر تنقید کرنے میں گم ہو کر اس کی کمزوریوں پر گرفت کرنے اور اس کی اصلاح کرنے میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیا۔ وہاں دوسروں کی اصلاح سے مقدم اپنی اصلاح تھی۔ دوسروں پر تنقید کرنے سے زیادہ اہم اپنے اوپر تنقید کرنا تھا۔ باہر تشریحی رونما کرنے سے پہلے اپنے اندر مطلوبہ تغیرات لانا ضروری تھا۔

ایک ایسے معاشرہ کے درمیان جس کی نگاہوں میں کمانے اور کھانے پینے سے زیادہ اونچا کوئی مقصد نہ تھا۔ جس کی ہر مجلس ایک میکہ اور ایک قمارخانہ اور رقص گاہ تھی۔ جہاں شجاعت کا استعمال، دنگے نساد، قتل، انتقام، در ارتقام اور لوٹ مار کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ اور جہاں تمدن ایک ایسے جنگل میں بدل گیا تھا جس کے کچھاروں میں انسانی درندے دھاڑتے رہتے تھے۔ اور شریب اور مسکین لوگ ان کے لیے سستے شکار بنے ہوئے تھے۔ وہاں جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب انسانیت کے ایک صالح قافلے کو جہوں میں لیے ہوئے نمودار ہوئے تو اس کا وجود اول روز سے ماحول میں انتہائی نمایاں تھا۔ لوگ انسانیت کے اس نئے نمونے کو اچھنبے سے دیکھتے اور اسے ہر پہلو سے مختلف اور ممتاز پاتے۔ پھر اس کی پوری نشوونما ان کی آنکھوں کے سامنے ہوئی اور اس کی تعلیم و تربیت کا سارا کام از اول تا آخر عوامِ اناس نے خوب اچھی طرح دیکھا۔

خواص اور عوام ہر صبح اور ہر شام دیکھتے تھے کہ کلمہ اسلام یکے بعد دیگرے اچھے اچھے اندر در اچھنبے پڑنا چلا جاتا ہے۔ یکایک دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ اٹھتے ہیں اور اپنے آپ کو اس انقلابی تحریک کے سپرد کر دیتے ہیں۔ وہی جو پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف دانوں اور ناخنوں تک کا زور صرف کر کے لڑ رہے ہوتے ہیں، اچانک وہی سہرا لگندہ ہو جاتے ہیں، جیسے کسی نے ان پر جادو کر دیا ہو۔ پھر جو کوئی بھی کلمہ حق کو قبول کرتا ہے آنا فانا اس کے ذہن و کردار میں خوشگوار تبدیلیاں آنے لگتی ہیں۔ اس کی دوستیاں اور دشمنیاں بدل جاتی ہیں۔ اس کی عادات اور اس کے ذوق میں انقلاب آ جاتا ہے۔ اس کے مشاغل نیازگاہ اختیار کر لیتے ہیں اس کی پیل دھچپیاں ختم ہو جاتی ہیں اور نئی دلچسپیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ معاشرتی فعال اور سرگرم شخصیت سے آرتہ ہو جاتا ہے۔ اس میں ایک نئی طاقت ابھر آتی ہے۔ اس کی سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں، اس کے خیر کا چراغ پوری لودینے لگتا ہے۔ اس کا احساس انگڑائی لینے لگتا ہے۔ اس کے تخیل کو نئے بال و پر مل جاتے ہیں۔ اس کے سینے میں حسنِ خلق کی کلیاں ایک ایک کر کے چلکنے لگتی ہیں اور ان کی نگہت فضا میں پھیلتی ہے۔ جو شخص کافر سے مسلم بنتا تھا۔ اس کے اندر سے گویا بالکل ایک دوسرا آدمی نمودار ہو جاتا۔ وہ خود بھی محسوس کرتا کہ میں اپنے ماحول سے کچھ مختلف اور بالکل نئی چیز ہوں اور ماحول بھی دیکھتا کہ وہ اب ویسا نہیں رہا۔ بیسیا

پہلے ہو کر تا تھا۔ قاتل آتے اور انسانی جان کے محافظ بن جاتے۔ چور آتے اور امین بن جاتے۔ زانی آتے اور عفت و حیا کے پیکر بن جاتے۔ ڈاکو آتے اور صلح و آشتی کے معلم بن جاتے۔ کج خلق آتے اور حلیم اور متواضع بن جاتے۔ سود خوار آتے، اور انفاق کرنے والے بن جاتے۔ کندہ بن آتے اور سان کے اندر سے اعلیٰ قابلینوں کے سوتے ابل پڑتے۔ ادنیٰ سماجی مرتبوں سے اٹھتے اور شرف کی بلندیوں کو چھو لیتے۔ جیسے یہ کسی اور ہی دنیا کی مخلوق بن گئے ہوں۔ جیسے یہ مٹی کے پتلے نہ ہوں، بلکہ کسی دوسرے جوہر سے انہوں نے وجود پایا ہو۔

یہ خدا کے پرستار، رسول کے دیوانے، شمع صداقت کے پروانے، نیکی کے نقیب، بھلائی کے داعی، بدی کے دشمن، ظلم کے مخالف! — یہ رکوع و سجدہ میں قرار پانے والے، یہ قرآن پڑھتے ہوئے گریٹ بے تاب میں کھو جانے والے، یہ دنوں کو مقصد کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والے اور راتوں کو اللہ سے لو لگانے والے، مسکینوں کو کھانا کھلانے والے، مسافروں کی خیر گیری کرنے والے، یتیموں اور یتیموں کے سروں پر شفقت کا ہاتھ رکھنے والے، لہو و لہب سے بے تعلق، تعیبات سے مجتنب، فضول بحثوں سے کنارہ کش سنجیدگی و وقار کے پیکر، شائستگی و سلیقہ کے محسوس — اور یہ محفل ہستی میں اجنبی بن جانے والے لوگ، یہ اپنی ہی بستیوں میں رہ کر غریب الوطن — آخر کیسے ممکن تھا کہ سارے عرب کی نگاہیں ان پر مرکوز نہ ہو جاتیں۔

یہ علمبرداران اسلام! جو بغیر کسی لوٹ کے ایک مشن کی خدمت میں ہمہ تن محو تھے۔ کسی معاوضے کے بغیر تحریک کے ہمہ وقتی کارکن تھے۔ اور دنیا کی بھلائی کے لیے اپنے مفاد کو بالکل بالائے طاق ڈالے ہوئے تھے۔ یہ اپنے مقدس نصب العین کے لیے دماغوں کی کاوشیں، جسموں کی طاقتیں، جیبوں کے مال اور وقت آنے پر اپنی اور اپنے بچوں کی جانیں تک صرف کرنے والے لوگ تھے۔ نہ ان کو معاش کی فکر تھی۔ نہ تن بدن کا ہوش تھا۔ نہ راتوں کی نیند کا خیال، نہ بیوی بچوں میں گن رہنے کی مہلت نہ کھیل تماشوں سے دل بہلانے کی فرصت، بلکہ ان کا پیشہ تھا تو وہی مشغلہ تھا تو وہی، تفریح تھی تو وہی اور ذریعہ آرام و سکون تھا تو وہی کہ سچائی کا بول بالا ہوا انہوں نے ہنستے، مسکراتے مخالفوں کی گایاں سنیں۔ بہادرانہ شان سے جبر کے وار ہے۔ خوشی خوشی ناقے کاٹے۔ دماغی مسرت کے ساتھ وطن چھوڑے۔ صبر کے موقع پر انتہا درجہ کا صبر دکھایا اور مقابلہ کرنے کا وقت آیا تو مضبوط ہاتھوں سے مقابلہ کیا۔ احد احد کہتے تھے ریت پر لوٹ گئے۔ وجد آفرین شعر پڑھنے پڑھتے سو بیوں پر لٹک گئے۔ گھائل ہو کر گرسے تو مائل پرواز روح جھوم کر پکار اٹھی "فزت بربوب الکعبۃ" رب کعبہ کی قسم! میں تو مراد پا گیا — یہ کردار ہو اور پھر بھی دنیا سرنگوں نہ ہو جاٹے۔ اس مسلم کردار نے ہر موقع پر ایسی ذریں مثالیں قائم کیں کہ زندگی کی پیشانی ان کے نور سے یوم آخر تک جگمگاتی رہے گی۔ اس کردار کے مرتب نے مقتل سے روانہ ہوتے ہوئے اپنے قانون کی امانتوں کی واپسی کا اہتمام

کیا۔ اس کردار نے زنا کا جرم سرزد ہو جانے پر بطور خود پیش ہو کر اقرار جرم کیا۔ اور اسلامی عدالت سے باصرہ انتہائی سنگین سزائے موت اپنے لیے قبول کی۔ تاکہ وہ خدا کے حضور میں پاک ہو کر پیش ہو سکے۔ اس کردار کو قبول اسلام کے چند ہی منٹ بعد جب ایک پیکرِ حُسن نے دعوتِ عیش دی تو اس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ اب میں خدا اور رسول کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔ ایک جنگی سفر میں قبیلہ اُرد سے فوج کا گزرا۔ ہوا تو ایک مسلمان سپاہی نے ضرورتاً وہاں سے ایک لوٹا لے لیا۔ لیکن یہ اس مسلم کردار کی شان تھی کہ باز پرس کی اور فوراً لوٹا واپس کر دیا۔ ایسی صد ہا مثالیں، نت نئی مثالیں جس انسانی ماحول میں نمودار ہوتی ہوں گی، اس پر تو ہر روز زلزلہ طاری ہوتا ہوگا۔

کیا دنیا ان کا ایثار دیکھ دیکھ کر مبہوت نہ ہوتی ہوگی کہ انصار نے اپنے گھر بار اور مال و منال و دھنوں آدھ بانٹ کر مہاجرین کے سامنے رکھ دیئے؟ کیا عوام کے دل اس مساوات کا سماں دیکھ کر کھینچتے نہ ہوں گے۔ کہ ادنیٰ ترین غلامِ خاندانی ہستیوں کے ساتھ اور غریب طبقوں کے افراد، اہل ثروت کے ساتھ اور گھروں سے بہرہ کر آنے والے لوگ مدینہ کے مقامی باشندوں کے ساتھ صغیر و عظیم کھڑے ہیں۔ ہر ایک کو اہمیت حاصل ہے۔ ہر ایک کی عزت ہوتی ہے۔ ہر ایک کی رائے وزن رکھتی ہے اور ہر ایک کو ذمہ داریاں اٹھانے اور جوہر دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ایک برادری ہے جس کے سارے افراد اچھے حالات میں بھی شریک رہتے ہیں اور تکلیف اور مصیبت میں بھی حصہ دار بنتے ہیں۔ ان کے غم مشترک، ان کی مسرتیں مشترک، ان کا سوچنا مشترک اور ان کے اقدام مشترک! بھوک کا دور ہے تو اس میں سب سے بڑا حصہ دار سوسائٹی کا قائد ہے اور خوشی کا دور آتا ہے تو اس میں سب سے کم حصہ وہ اپنے لیے لیتا ہے۔ جاہلی تصورات کے مطابق اونچے اور نیچے خاندانوں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات لوگوں کو حیرت میں ڈال دیتے ہوں گے۔ رسوم و رواج کی جو جھل بیڑیاں کاٹ کر سادہ معاشرت کا جو پنچ نکال گیا تھا، اس کی طرف طبائع از خود کھینچتی ہوں گی۔ کتنی محبت بھری زندگی تھی۔ کتنی ہلکی چمکی، کتنی پُرسن اور کتنی اطمینان بخش! صحیح معنوں میں ”حیاتِ حلیہ“!

پھر ماحول دیکھتا ہوگا کہ کیسی کیسی قابلین ان لوگوں میں ابھر رہی ہیں۔ سچائی کے ہلمے کی گتھا، جب کہہ کسی مقام پر برس جاتی ہے تو دلوں اور دماغوں کی سرزمین سے ایسی روئیدگی ہوتی ہے کہ بجز فضاؤں میں گناہوں کے تختے آراستہ ہو جاتے ہیں۔ سارا عرب اس جماعت کو دیکھ رہا ہوگا کہ جس میں بعض لوگ علوم میں ترقی کر رہے ہیں بعض لوگ قانون میں ماہرانہ مقام حاصل کر رہے ہیں، بعض لوگ اچھے ذراعت کار۔ اور تاجران رہے ہیں بعض لوگ اعلیٰ درجہ کے کمانڈر ثابت ہو رہے ہیں، بعض لوگ انتظامی مناصب کی ذمہ داریاں اٹھانے کے اہل بن رہے ہیں۔ کچھ سفارت سے فرائض انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ ہر ادنیٰ کے اندر سے ایک نئی

شخصیت رونما ہو کر برگ و بار لاری ہے۔

اس کردار کی تصویریں قرآن نے کھینچ کھینچ کر بار بار مخالفین کو بھی اور عوام کو بھی یہ احساس دلایا کہ دیکھو انسانیت کا یہ نمونہ جو نظریہ حق کے نور سے بنتا ہے کتنا افضل ہے۔ اور امن و سلامتی کا حصول اگر ممکن ہے تو اسی کے ذریعے ممکن ہے۔ اس کردار کو تحریک اسلامی نے اپنی دعوت کی سچائی کی دلیل بنا کر سامنے رکھا۔ پھر بار بار اس کردار کا تقابل جاہلی کردار سے بھی کیا۔ اہل کتاب کے کردار سے بھی کیا اور منافقین کے کرداروں سے بھی کیا۔ دونوں کو آمنے سامنے رکھ کر دکھایا کہ دیکھو اور خود رائے قائم کرو۔ میدان واقعہ میں تو یہ تقابل از خود ہو ہی رہا تھا۔ اور زندگی کے ہر دائرے میں ہر پہلو سے ہو رہا تھا۔

کشمکش کی حالت بہ پہل وقت دوڑے اثرات رکھتی ہے۔ کشمکش میں پڑ کر کردار بنتے بھی ہیں اور کشمکش میں پڑ کر ہی کردار تباہ بھی ہوتے ہیں۔ تحریک اسلامی نے پورا پورا اہتمام کیا کہ مسلم کردار کشمکش میں پڑ کر اور نھڑے از سنورے، اور اچھی طرح پروان چڑھے۔ چنانچہ تلقین اور تربیت اور تزکیہ کے کڑے اہتمام کی وجہ سے مسلم کردار ترقی کرتا چلا گیا۔ اور دوسری طرف جاہلی کردار کشمکش میں پڑ کر مسلسل پستی کی طرف اڑھکتا گیا۔ اور آخر کار بالکل غارت ہو گیا۔ مسلم کردار کو بار بار صبر کا درس دیا گیا۔ اس میں برداشت کی قوت اور اپنے موقف پر جے رہنے کی صلاحیت پیدا کی گئی۔ کبھی تاکید کی گئی کہ اشتعال میں نہ آؤ، کبھی نصیحت کی گئی کہ فرزند ان بھالت سے نہ الجھو، کبھی ہمت بندھائی گئی کہ ڈھیلے نہ پڑو۔ یا یوسی کا شکار نہ ہو، کبھی سٹھنایا گیا۔ کہ برائی کا جواب بھلائی سے دو۔ اور زیادتیوں پر عفو و درگزر سے کام لو۔ کبھی تعلیم دی گئی کہ کسی گروہ کی دشمنی کے جذبے میں آ کر انصاف کی راہ سے نہ ہٹو۔ کبھی ہدایت دی گئی کہ دنیا پرستوں سے اصلاح کی امید نہ لگاؤ اور ان کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ کبھی ارشاد ہوا کہ مخالفین کی صف میں اہل جاہ و حشمت کو دیکھ کر ان کے ٹھاٹھ باٹھ سے خدا بھی مرعوب نہ ہو اور کبھی سبق دیا گیا کہ نتائج تک پہنچنے کے لیے عاجلانہ ذہن سے کام نہ لو۔ ان کے ہر نفسیاتی آثار چڑھاؤ پر نگاہ رکھی گئی اور ساتھ کے ساتھ ان کو فلاح کی راہ سمجھائی جاتی رہی۔ خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جماعت کے ایک ایک فرد پر پوری طرح توجہ کی۔ اور بہترین مواقع پر کبھی نصیحت سے، کبھی گرفت سے، کبھی زجر و توبیخ سے کبھی ناراضی سے، کبھی اظہارِ خوشنودی سے کام لے لے کر مسلم کردار کو نشوونما دی۔

جس میں جیسی صلاحیتیں دیکھیں اور مزاج کی جیسی ساخت پائی اس کو اسی کی ضروریات کے مطابق مشورے دیے اور جس میں جس نوعیت کی کمزوری دیکھی، اس کے سامنے دین حق کا ویسا ہی اخلاقی تقاضا بیان کیا۔ پھر اجتماعی عمل و اقدام کے دائرے میں مسلم جماعت نے جو کچھ طرز عمل دکھایا، اس پر ہر اہم واقعہ کے بعد کڑی تنقید کی۔ بدرواہد کے معرکے ہوں۔ یا صلح حدیبیہ کا مقابلہ۔ تحویل قبلہ ہو یا واقعہ انک، ہر اہم تاریخی واقعے کے بعد ایک طرف مخالفین

کا ہر عمل عوام کے سامنے رکھ دیا۔ اور دوسری طرف اپنی جماعت کا بے لاگ محاسبہ کر کے ساری کمزوریاں بر سر عام واضح کیں۔ اور ان کے انسداد کے لیے تدابیر بتائیں دشمن کے حق میں اگر اپنے رفقا کوئی غلط اقدام کر بیٹھے تو اس پر پردہ ڈالنے اور اسے صحیح ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ دشمن کے سامنے غلطی کا اعتراف کیا۔ انوں جان سہواً لی گئی تو اس کا خون بہا ادا کیا۔ واقعہ نخلہ کے سلسلہ میں اپنے رفقا پر گرفت کی حسرت خاندان نے کلمہ پکارنے والوں کو غیر مخلص سمجھ کر سہواً قتل کر دیا تو ان کے فعل سے بریت اور بیزاری کا اظہار کیا۔ صورت واقعہ یہ نہ تھی کہ مسلم کردار (بائبل) آئینہ معصوم عن غطا تھا اور کسی سے کوئی سہو یا لغزش نہ ہوتی تھی۔ نہ اسے اس حیثیت سے پیش ہی کیا جاتا۔ بلکہ وہ اپنی مجموعی ساخت کے اعتبار سے پاکیزہ تھا۔ اور اس میں قبول اصلاح کی استعداد اور نشوونما کی صلاحیت تھی۔ وہ بحیثیت ایک کل کے باہمی کردار سے تیار تھا اور یہی اس کی فطرت تھی۔ اور براہ پیش قدمی کر رہا تھا۔

کسی جمعی قیادت اور بننے بنائے ماعوں کا مقابلہ کرنا کوئی کھیں نہیں ہوتا یہ کام جسے ہم دیکھتے ہیں ان میں بڑی مار کھانی پڑتی ہے اور بڑے ٹھنڈے جوش سے ان معکوں کو سر کیا جاسکتا ہے۔ جس کی فطرت سے برخصنے والوں کو کم سے پکڑ پکڑ کر برابر کھینچتی رہتی ہے۔ اصدات کرنے والوں کو از سر نو بگاڑ دینا پڑتی ہے۔ ان کے دیوں میں نفوذ کے لیے رخنے تلاش کر کر کے کوشاں رہتی ہے کہ اپنے سے عقیدوں اپنی ہی دیوں اور اپنی ہی عادات کو کسی طرح پھران میں گھس دے اور کوئی ذہنی مصالحت کی نکان کر پیش قدمی کرے۔ ان کے ہونے میں بھی کشمکش جب قوتوں کو مضحمل کر دیتی ہے اور امتوں کو تھکا دیتی ہے تو بڑے بڑے محض ان کے ہونے میں پیچھے کھسکنے لگتے ہیں۔ آدمی کچھ انقلابی قدروں کو چھوڑ کر پرانی قدروں کو قبول کرنے پر تیار ہوجاتا ہے۔ اس میں اعتقاد میں نہ سہی ثقافتی آداب و اطوار، رہن سہن، وضع قطع میں بیرونی اثرات قبول کرنے پر تیار ہوجاتا ہے۔ اس میں تناسل سارا سارا کھل جانے کو پھر ماحول اسے آہستہ آہستہ فراخ کرتا چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر اپنے سارے لوازم و گھسائے جاتا ہے۔ تکمیل کا ایک نسل کے دور میں نہ ہی اکل نسل کے عہد میں ہی، مگر تخریب سدق نے مسئلہ کردار کو تعمیر کرتے ہوئے اس خطرے کا پورا پورا لحاظ رکھا۔ اسے بہت ہی آہنی ساخت دی۔ اور تحفظ کی پوری تدابیر اختیار کیں۔ ایک حرف تو اسے ایشاء علی الکفار یعنی مخالفوں کے مقابلے میں ایک عبور چٹان بنانے کے لیے دُحْمَاءَ بَيْنَهُمْ ہونے کا درس دیا۔ اور دوسری طرف غیروں کی تقیید غیروں سے ہوتی غیروں سے راز دارانہ تعلقات اور بے تکلفانہ قربت۔ لہنے سے بالکل روک دیا۔ یہی ذہنی استحکام جماعت میں پیدا کرنے کے لیے نو مسلموں کو حکم تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ میں آجائیں۔ اور اگر کسی جگہ معذہبہ افراد کیجا ہوتے اور ان سے "بیعت اعرابی" (یعنی ایسی جس سے ہجرت واجب نہ ہوتی جاتی تو ان کو بھی یہ تاکید ضرور ہوتی کہ

فارتوا لمشركين“ یعنی اہل شرک سے برادری، دوستی، شادی بیاہ کے تعلقات نہ رکھو بلکہ اپنی سوسائٹی الگ اٹھاؤ۔ غیر مسلم والدین کی اطاعت کی تاکید کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کڑا حکم بھی دیا گیا۔ کہ اسلام سے انحراف کے لیے کہیں تو فلا قطعہ صما“ اسلام کے خلاف کسی کی کوئی اطاعت نہیں کی جاتی۔ اس کردار کی شان یہ تھی کہ وہ نہ ایران کی پُرشکوہ تہذیب سے متاثر ہوا اور نہ روم کے ٹھاٹھ دار تمدن کے سامنے اس کا دل پسینا۔ وہ بڑے بڑے درباروں میں اپنی بدویانہ شان کے ساتھ قابیلوں کو روندتا ہوا بغیر اپنی گردن جھکائے پہنچا۔ اور کہنے کی بات اس طرح کہی جیسے وہ لونوں کے درمیان کھڑا بات کر رہا ہو، اس کردار کو جب ذہنی لحاظ سے اتنا مستحکم بنا دیا گیا اور ہر قسم کے احساس کمتری سے اُسے بالاتر کر دیا گیا تو پھر اسے حریفوں نے میدان جنگ میں بھی پکارا تو اس نے شجاعت و استقامت کی زندہ جاوید نظیریں قائم کر دیں۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ کردار قلت تعداد اور کوتاہی اسباب کے باوجود نرم چارہ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے آویزش لوہے کے چنے چبانے کے ہم معنی ہے۔

اس مسلم کردار کے بے شمار کٹر مخالفین ہوں گے۔ جو اس کا طنز و استہزاء کرتے ہوئے دل ہی دل میں محسوس کرتے ہوں گے کہ یہ ہم سے ہزار درجے افضل اور برتر ہے۔ بے شمار حریف ظاہراً مخالفت کرنے کے باوجود باطن میں رشک کرتے ہوں گے کہ کاش کہ ہم بھی اس برادری میں شامل ہوتے۔ اس کردار کو گالیاں دینے والے، اس کی ہجو کرنے والے اور اس کے خلاف پراپیگنڈا کرنے والے، کبھی کبھی لمحہ فکریہ میں پڑ کر اپنے آپ سے کہتے ہوں گے۔ کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں اور اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ چنانچہ بے شمار مواقع پر مخالفین نے زبانوں سے بھی اپنا ولی اعتراف بیان کر دیا۔ معرکہ احد کے خاتمہ پر جب پہاڑی پر کھڑے ہو کر اہل بیت نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ کیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قتل ہو گئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ کہ بخدا وہ زندہ ہیں اور تمہاری بات سُن رہے ہیں۔ تو اہل بیت نے کہا کہ اگرچہ اہل بیت کہتا ہے کہ میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دیا مگر ہم تم کو اس سے زیادہ سچا سمجھتے ہیں۔ اسی طرح معاہدہ حدیبیہ سے قبل عروہ بن مسعود سفیر قریش نے مسلم جماعت کا جو منظر دیکھا، اسے جن لفظوں میں اکابر قریش سے بیان کیا، وہ اس تاثر کے گواہ ہیں جو اخبار پر برابر پڑا ہوا تھا۔ اسی طرح قبصر کے دربار میں اہل بیت نے جو بیان اسلام کا مخالف ہونے کے باوجود حضور اور آپ کی تحریک کے بارے میں دیا۔ وہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ دشمنی کرنے والے بھی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اسلام کی عظمت کا اعتراف رکھتے تھے۔ مدینہ کا تحصیل دار خیبر کے یہودیوں سے وصولی کرنے جاتا ہے تو اس کی تقسیم کی صحت دیکھ کر وہ گواہی دیتے ہیں کہ یہی عدل ہے جس پر آسمان وزمین قائم ہیں۔

آئے دن عرب کے کونے کونے میں نوخیز مسلم سوسائٹی کے انوکھے احوال کے چرچے ہوتے ہوں گے۔ اس کے افراد کے تذکرے رہتے ہوں گے۔ لوگوں کی نگاہیں مدینہ پر لگی رہتی ہوں گی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہوں گے کہ آج تاریخ میں کیا دو جزر کیا واقعہ ہوا۔ مسافروں اور قافلوں کے ذریعہ روز بروز اتوار کی اطلاعات دور دور تک پھیلتی ہوں گی۔ اور لوگ ہر آہند و روند سے دریافت کرتے ہوں گے کہ "کوئی نئی بات سناؤ" گویا مدینہ کی ہر بات میں حد درجہ کی تحریریت (News Value) پیدا ہو گئی ہوگی۔ جہاں دو آدمی اکٹھے ہوتے ہوں گے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلم سوسائٹی اور اسلامی تحریک اور مدینہ کی حکومت گفتگو کے آدین موضوع ہوتے ہوں گے۔ عورتیں مل بیٹھتی ہوں گی۔ تو مدینہ کے بارے میں طرح طرح کی افواہوں کو ناسمجھ لگا کر بیان کرتی ہوں گی۔ ماں باپ کو خوش کرنے، بہو نے اور ڈرانے کے لیے زجانے مدینہ کے واقعات سے کیا کیا مواد لیتے ہوں گے۔ ہوا کا ہر جھونکا، اسی مسلمہ کردار کی خوشبو لیے لیے نخلستانوں اور صحرائوں اور چشمہ گاہوں سے گزرتا ہوگا۔

اسلامی تحریک کی یہ اخلاقی قوت ہی اس کی دیبل اور اپیل کو موثر اور نتیجہ خیز بنانے والی بنی۔ اور یہ لکھنؤ کی عظمت کا اعتراف تھا۔ جس نے لاکھوں دیوں کو مسخر کر دیا۔ یہاں ہم چند مثالیں بیان کریں گے کہ کس طرح اسلام کا مقناطیس ہر جہاں سے بکھرے ہوئے ذرات انسانیت کو اپنی طرف کھینچتا چلا گیا۔

پہلے مکہ کے دور کو بھیجیے۔ مشہور شاعر عطفیل دوسی آتا ہے اور قریش سے حضور کے ملنے سے باز رہتے ہیں۔ آخر وہ خود حاضر ہوتا ہے۔ اور قرآن کی چند آیات سن کر محض ان کے اثر سے اسلام مقبول کر دینا ہے۔ عمرو بن عبسہ حضور کا چرچا سن کے آتے ہیں اور اسلام دل میں جگہ پالینا ہے۔ حضور کے بچپن کے ساتھی حماد بن عبدمنذر اور چاہہ گرن کے آتے ہیں۔ مگر زبان مبارک سے خدا کی حمد کے چند بول سن کر ہی مفتوح ہو جاتے ہیں۔ ایک صحرائی قبیلہ جس کا پیشہ ڈاکہ زنی ہے، اس کا ایک نوجوان ابو ذرؓ اسلام کا چرچا سن کے آتا ہے۔ اور مخالفانوں سے بچ کر حضور تک پہنچتا ہے۔ دعوت سنا ہے اور تحریک حق کو اپنا دل دے بیٹتا ہے۔ اس میں ایک ایک نذر ہٹتا ہے اور وہ حرم میں جا جا کر کلمہ حق کا اعلان کرتا ہے۔ اور پھر اس جرم عشق کی تعزیر کا مزہ چکھتا ہے۔ پھر جو جو شخص تحریک اسلامی کے حلقہ میں داخل ہوتا ہے، وہ اپنے اپنے دائرہ اثر میں خود ایک داعی بنتا ہے۔ بعض کے اثر سے قبیلے کے قبیلے اسلام کو قبول کرتے گئے۔ سوید بن عمامت حضور سے مدافعت کرتا ہے اور گھر اثر لے کے جاتا ہے۔ ایسا بن معاذ مدینہ سے آکر حضور کی دعوت کا قائل ہو جاتا ہے اور پھر مدینہ میں نظام حق کی عصب پیدا کرتا ہے۔ بخران سے ۲۰ بیسیوں کاوند آکر حضور سے اسلام کے پیغام کا شعور حاصل کرتا ہے۔ اور ابوہریرہؓ قریش ان کو ورنہ داتے ہیں، یہ لوگ حق کی روشنی کو سینوں میں جذب کر کے رخصت ہوتے ہیں۔ وہاں جہاں بہتر



سے یمن کے لوگ متاثر ہو کر اسلام کو سینوں میں جگہ دیتے ہیں اور انہی کے ذریعہ شاہِ سخاشی کا دل ایمان سے منور ہو جاتا ہے۔

مدینہ میں اوس اور خزرج کے لوگ تو حضور کی آمد سے پہلے ہی تیزی سے اسلام میں آ رہے تھے اور حضور کے ہجرت کر کے آ جانے کے بعد تو کوئی گھر خالی نہ رہا جس میں اسلام کی روشنی نہ جا پہنچی ہو۔ ہجرت تک، یہ تھا کہ یہود کا ایک عالم عبداللہ بن سلام حضور کے ایک سادہ سے خطاب یا یہا الناس افشو السلام والطعموا الطعام وصلوا الامصار وصلوا باللیل والناس نيام) کو سن کر قریب آ جاتا ہے۔ اور تھوڑے سے غور و فکر کے بعد فیصلہ کر کے سرورِ عالم کی خدمت میں شہادتِ حق ادا کرتا ہے۔ اسی طرح عیسائیوں میں سے ایک نامور راہب و عالم ابوقیس صرمہ بن ابی انس تحریکِ اسلامی کی پکار پر لبیک کہتا ہے۔ جبیر بن مطعم بدر کے قیدیوں کو چھڑانے آئے تھے، اور حضور کی زبان سے چند آیات کو توجہ سے سننے کا موقع ملا۔ حقیقت ایسی منکشف ہوئی کہ انہوں نے محسوس کیا کہ جیسے دل پرواز کر گیا ہے۔ قریش کے غلام ابورافع مکہ کی طرف سے سفیر بن کر مدینہ آئے تو سینہ اسلام کے لیے کھل گیا۔ واپس جانے پر تیار نہ تھے۔ حضور نے سمجھایا کہ سفیر کو روکا نہیں جاسکتا۔ تم واپس جاؤ اور پھر اسلام کی کشش ادھر کھینچے تو مدینہ آ جاؤ۔ چنانچہ وہ مکہ گئے اور واپس آ کر اسلامی جماعت میں شریک ہو گئے۔ بنو قریظہ کے خلاف ان کے جرائم کی سزا دینے کے لیے چڑھائی ہوتی ہے، تو اس عالم میں ان کا ایک فرد عمرو بن سعد اسلام قبول کرتا ہے۔

ثمامہ بن اثال حنفی رئیسِ یمامہ قید ہو کر آتا ہے اور حضور کے طرزِ عمل سے متاثر ہو کر اسلامی جماعت کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ غزوہٴ احد برپا ہے۔ کہ عمرو بن ثابت اصیرم (بنی عبدالاشہل) عین اسی لمحے حق کے سامنے سر تسلیم خم کر کے سیدھے معرکہ کارزار میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اور شہادت سے فائز ہوتے ہیں۔ معرکہ خندق کے کٹھن حالات میں نعیم بن مسعود تحریکِ اسلامی کے قدموں میں آگرتے ہیں، ابوالعاص مدینہ آتے ہیں۔ تو بالکل غیر متوقع طور پر اسلام کا اعلان کرتے ہیں۔ خیبر کے یہود کو جنگی تیاریاں کرتے دیکھ کر ان کا ایک چرواہا اسود معلوم کرتا ہے کہ کس سے جنگ ہے اور کیوں؟ پھر جب اُسے معلوم ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تیاریاں ہیں۔ جنہوں نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، تو وہ جذبہٴ بیتابی لیے حاضر ہوتا ہے۔ اور حقیقت معلوم کرتا ہے۔ اور پھر مفتوح ہو جاتا ہے۔ حضرت خالد اور عمرو بن عاص جیسے ممتاز افراد (صلح حدیبیہ اور جنگِ موتہ کے درمیان) یکایک قریش سے ٹوٹ کر اسلامی ریاست کے ساتھ آلتے ہیں۔ جاہلیت کے محاذ سے لڑتے لڑتے اندر سے دل اکتا چکے تھے، سو یکایک ان کو تحریکِ اسلامی نے کھینچ لیا۔ فضالہ فتح مکہ کے موقع پر اور شیبہ بن ابی طلحہ معرکہ جنین کے موقع پر حضور کے قتل کے ارادے کر کے پہنچے، مگر خود ہی تیغِ حق سے گھائل ہو گئے۔ وفد ہوازن و بنو سعد کے

آنے پر حضور نے مالک بن عوف کو یاد کیا اور خواہش کی کہ وہ اسلام لائیں پیغام پہنچنے پر مالک بن عوف ثقیف سے چھپ کر اگلے ہی دن حاضر ہو گئے اور اسلامی محاذ پر آگے رقبیہ طے پر اسلامی دستہ نے فتح پائی تو حاتم کی بیٹی قیدیوں میں مدینہ لائی گئی۔ اس نے حضور سے حسن سلوک کی درخواست کی۔ جسے قبول فرما کر آپ نے اسے سواری کا انتظام کر کے واپس بھجوایا۔ اس نے اپنے بھائی عدی بن حاتم کو جس کے دل میں اسلام کے خلاف غصہ کی آگ مشتعل تھی۔ سارا حال سنایا اور مدینہ حاضر ہونے کی تلقین کی۔ عدی آیا اور آکر پچشم خود حالات کا پورا جائزہ لے کر جب محسوس کر لیا کہ حضور خدا کے سچے نبی ہیں تو حلقہ اسلام میں داخل ہو گیا۔ کعب بن زبیر جس نے حضور اور اسلامی تحریک کے خلاف شاعری کا محاذ کھول رکھا تھا از خود مدینہ آیا اور عرض کیا کہ تائب ہو کر مسلمان ہو۔ ہوں امان دیجیے۔ امان مل گئی۔ پھر اس نے وہ قصیدہ (بانٹ سعادت) پڑھا جو تاریخی حیثیت اختیار کر گیا۔ عبداللہ ذوالجہادین کو دیکھیے کہ یہ بھولا بھالا نوجوان مدینہ سے چلنے والی نسیم کے جھونکوں سے متاثر ہو جاتا ہے۔ مگر چچا کے ڈر سے اپنے ارمان کو سینے میں کچھ عرصہ دبائے رکھتا ہے۔ چچا سے مایوسی ہو جاتی ہے تو چچا اس کے ماں دجاہ اس کے دیے ہوئے لباس اور گھر کے ماحول کو سدھار دواغ کہہ کر کبل پوش بنا بٹو مدینہ پہنچتا ہے اور زندگی اسلامی تحریک کے حوالے کر دیتا ہے۔ بحرین کے قید عبد القیس کے ایک تاجر منقذ بن حبان کاروباری سفر پر نکلے۔ مدینہ راستے میں پڑتا تھا۔ وہاں کچھ وقت کے لیے ٹھہرے۔ حضور کے پیش نظر یہ نقشہ کار تو رہتا ہی تھا کہ بیرون حجاز کے مدقوں سے رابطہ بڑھانے کے ذرائع پیدا ہوں اور کام کے آدمی وہاں بھی تحریک کو حاصل ہوں۔ اس لیے مدع ملتے ہی خود شریف لے گئے۔ دعوت پیش کی اور منقذ نے قبول کی۔ گھر گئے تو بحث و تمحیص کے بعد ان کے والد بھی مدق سدی میں آ گئے۔ بعد میں قبیلہ کے عام لوگوں نے بھی ان کی مساعی سے اسلام اختیار کیا۔ متعدد لوگوں نے بادشاہتیں، سیادتیں اور عہدے چھوڑ کر اپنے آپ کو خدا کی عبودیت کے مقام پر لاکھڑا کیا۔

ان مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دعوت حق کی کمیٹی کس طرح آگے رہی تھی راج یہاں حج پھوٹا، اکل وہاں سے تھم اٹھا، اس نے کونسل نکالی۔ صبح ادھر کوئی کلی چنگ گئی۔ شام ادھر کسی کھوے نے آنکھ کھولی۔ جیسے شام کو آسمان پر تارے جگمگاتے ہیں۔ پہلے ایک پھر دو چار پھر دس بیس، پھر سو پچاس، پھر ہزاروں لاکھوں بلکہ ان کی گویا ریت کے ذرے خواب جمود سے ایک ایک کر کے چونک رہے تھے۔ ایک نے انگریزی لی۔ دوسرے نے سر اٹھایا۔ تیسرے نے حرکت کا آغاز کیا، چوتھے نے آنکھ کھولی۔ اور پھر جیسے وہ کرنوں کے پر لکا کے اڑنے لگے۔ آواز کر باہم گلے مل گئے۔ اور ان سے ایک نئی دنیا وجود میں آ گئی۔

ہم قبول اسلام کی تیز رفتار، عوامی رو کا ذکر تو پھر بعد میں کریں گے جو ایک خاص مرحلہ آنے پر چلی اور لوگ جوق در جوق خود آگے بڑھ بڑھ کر تحریک کے دھارے پر بہتے چلے گئے۔ یہاں ہم صرف ان خواہش کا ذکر کر رہے ہیں

جو اپنے اپنے حلقوں میں پیش رو نکلے۔ ایسے لوگوں میں جب کوئی ایک بھی مسلم بن جاتا تو پھر وہ اپنے قبیلے اور اپنے علاقے میں خود ایک داعی و معلم بھی ہوتا۔ اس کی ذات میں تحریک کا ایک مقامی مرکز کھل جاتا۔ وہ اپنے قول اور اپنے کردار سے کتنے ہی دوسرے ساتھیوں کو — بسا اوقات پورے پورے قبیلوں کو — اسلام کی بارگاہ میں لاپیش کرتا۔ علاوہ انہی خود مدینہ کے مرکز دعوت کی سرگرمیاں بھی اور اس کے علاقائی کارکنوں کی کوششیں بھی بے شمار ایسے آدمی پیدا کرتی جاتیں جو اگرچہ براہ راست اسلامی تحریک کے حلقے میں فوراً شامل نہ ہوتے لیکن اس کے ساتھ ہمدردی اور حمایت کا رویہ اختیار کر لیتے۔ اور ایسے لوگوں کی ہمدردیاں اور حمایتیں بھی اپنی جگہ بڑا کام کرتیں۔ ایسے حامیان تحریک غیروں اور مخالفوں میں بھی بھڑکے کر بات کر سکتے تھے اور ان کی بات سننے میں کسی طرح کا تعصب مائل نہ ہوتا۔ ایسے لوگ قریش مکہ کے درمیان بھی بکثرت تھے۔ یہودیوں میں بھی تھے اور بدوی قبائل میں بھی ایسے ہی افراد تھے جنہوں نے صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کو معاہدہ کرنے کے لیے تیار کیا۔ ایسی ہی ایک شخصیت تھی جس نے جنگ اُحد کے بعد ابوسفیان کو پلٹ کر مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کرنے سے روکا ایسی ہی ایک شخصیت وہ بھی تھی جس نے حضور کے زمانہ نظر بندی میں شعب ابی طالب کو جانے والے غلہ کو رکوانے کی مخالفت کی۔ اور ایسی ہی شخصیتیں تھیں جنہوں نے سرے سے بائیکاٹ کے اس ناپاک معاہدے کو ختم کرایا۔ جو حضور کے خاندان کے خلاف باندھا گیا تھا۔ ایسی ہی ایک شخصیت مخیر لوق یہودی کی بھی تھی۔ جس نے یہودی ہوتے ہوئے اپنی جان تحریک اسلامی میں لگا دی۔ اور دوسرے یہودیوں کو بھی احساس دلانے کی کوشش کی۔ غزنیہ اسلام لانے والی تعداد کے ارد گرد ایک بڑا حلقہ ایسے حمایتیوں کا بھی سر جگہ بنتا گیا۔ اور وہ بھی تحریک کے فروغ کے ساتھ وسیع تر ہوتا گیا۔ اس عنصر کا بھی اسلام کے لیے راستے ہموار کرنے میں بہر حال حصہ دیا ہے اور اس میں سے بیشتر لوگ بعد میں داخل اسلام ہونے کی سعادت سے بہرہ مند بھی ہوئے۔ غزنیہ اسلامی انقلاب کے نقیبوں کا ایک سا سارے عرب میں از خود بھیلتا گیا۔ مدینہ ان سب کے لیے مرکز تحریک تھا جس سے قوت حاصل کر کے ہر طرف پھیلے ہوئے حق پرست کلمہ اسلام کی برقی رد اپنے اپنے ماحول میں دوڑا رہے تھے۔ مدینہ گویا دھڑکتا ہوا دل تھا۔ جس سے انکار و جذبات خوں کی موجوں کی طرح عرب کے کونے کونے میں پہنچ رہے تھے۔ وہ ایک سورج تھا اور اس کے گرد در در تک پہلے ہوئے اجرام روشنی حاصل کر کے فضاؤں کو منور کر رہے تھے۔

یہاں ہم سرسری طور پر ایسی چند مثالیں بیان کرتے ہیں، جن سے اندازہ ہوگا کہ ایک یا چند افراد نے کس طرح پورے پورے قبیلوں یا علاقوں کو متاثر کر لیا۔ ایک مثال تو خود مدینہ ہی کی ہے۔ اور شاید سب سے بڑی اور شاندار مثال ہے۔ کہ ایک نوجوان سوید بن صامت مکہ جا کر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے کلمہ اسلام

کی روشنی حاصل کرتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ بہت سی تعداد متاثر ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ مدینہ اسد می تحریک کا مرکز بننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ طفیل دوسی اپنے مزاج کی وجہ سے اگرچہ قبیلہ کو جلد متاثر نہ کر سکے۔ لیکن ان کی وجہ سے یمن میں تحریک اسلامی کا تعارف ہو گیا۔ اور ہاجرین حبشہ سے متاثر ہو کر قبیلہ اشعر نے کسی خارجی تحریک کے بغیر اپنے آپ کو اسد کے محاذ پر پیش کر دیا۔ ضناد بن ثعلبہ کی دعوت سے پورا قبیلہ از دشنویہ حاکم اسد میں آ گیا۔ حضرت ابو ذر غفاری اسلامی نظریہ انقلاب کی روح سے سرشار ہو کر مکہ سے لوٹے تو ان کی دعوت سے ان کا آدھا قبیلہ نظام حق کا علمبردار بن گیا۔ اور بقیہ آدھا حضور کے مدینہ جانے پر سلمان ہوا۔ پھر اسی قبیلہ غفار کے اثر سے قبیلہ اسلم میں بھی اسد نے نفوذ کیا۔ اور آہستہ آہستہ یہ پورا قبیلہ بھی جاہلیت سے اکت کر اسلامی انقلاب کا علمبردار بن گیا۔ منقذ بن حبان مدینہ سے صداقت کا نور جذب کر کے اپنے وطن بحرین پہنچے تو دعوت حق کا کام شروع کر دیا اور لوگ متاثر ہونے لگے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد یہ ۱۴ مسلمہ ریفیوں کا وفد سے مدینہ حاضر ہوئے۔ غرضیکہ بات وہی انجیل کی سامنے آتی ہے کہ خدا کی بادشاہت دعوت حق کی مثال خمیر کی سی ہے کہ یک عورت نے ذرا سا خمیر آٹے میں مل دیا اور وہ سارے کا سارا خمیر ہو گیا۔

جہاں کہیں اسد پہنچتا اور مناسب تعداد متاثر ہوتی، وہاں نماز مسجد کی بناء ڈالی جاتی۔ مسجد نہ صرف ایک عبادت گاہ ہی کی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ بلکہ وہ اسد کا تمدنی مرکز ہوتی تھی۔ اور یہ ایک وقت تعمیر گاہ۔ دار المشورہ، سماجی، جماع گاہ اور مہمان خانہ کا کام بھی دیتی تھی۔ مسجد درحقیقت اسلامی تحریک کی علامت (Symbol) ہوتی تھی اور علاقہ بھر میں مسجد کا وجود اس امر کا اعلان ہوتا تھا کہ جہاں اسد منبج چکا ہے۔ اسی لیے حضور ایک طرف تو مسلم قبائل کو ہدایت دیتے تھے۔ کہ وہ مسجدیں بنائیں۔ اور دوسری طرف فوج کو حکم تھا کہ جہاں کہیں مسجد دکھائی دے اور جس بستی سے اذان کی پکار گونجے وہاں تو رکھی حرکت میں نہ لائی جائے۔ یہ گویا مزید ترغیب تھی تعمیر مسجد کی۔ لوگ اپنے نئے نقابوں کا اعلان و اظہار کرنے کی ایک مناسب شکل ہی پاتے تھے کہ بستی میں مسجد بنائیں۔ اس سے اذان کے پیرائے میں تحریک اسلامی کے عقیدوں کا اعلان کریں۔ اور اس میں نظام نماز قائم کر کے اجتماعیت سے رہ نہ لائیں۔ حضور کی ترغیب کا نتیجہ تھا کہ خود مدینہ میں آپ کے جین حیات میں نو مسجدیں تعمیر ہو گئی تھیں۔ ایک مسجد اہل ہی میں بنائی تھی بھی موجود تھی۔ اور مسجد نبوی کے علاوہ پہلا جمعہ اسی مسجد میں دیا ہوا۔ مساجد جہاں عوامی ادارت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ وہاں انہیں سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوتی تھی۔ مدینہ سے جن حضرات کو کسی عہدہ یا بستی میں سول انسر بنا کر بھیجا گیا، وہی وہاں کی مسجد کے امام سلوۃ بھی ہوتے تھے۔ جو قبائل مدینہ کے پیرائے میں سے باہر ہوتے ان کی مسلم آبادی امام کے تقرر کے لیے حضور سے مشورہ لیتی۔ اور پھر حضور کے پاس سے

ہوئے معیار پر خود کسی آدمی کا انتخاب کر لیتی۔ بہت سی مسجدیں ان تمام تاریخی مقامات پر تعمیر ہوئی تھیں جہاں حضور نے کسی غزوہ یا سفر میں قیام کیا یا نماز ادا فرمائی۔ یا کوئی اہم واقعہ رونما ہوا۔

### معابدانہ روابط :

عوام میں دعوت و تعلیم کا جو وسیع کام مذکورہ بالا براہ راست طریق پر ہوا، اس کے ساتھ جو دوسرے بڑے بڑے اقدامات مؤثر حد تک مدد ہوئے، ان میں سے ایک مدینہ کے سیاسی اثرات کی توسیع کا کام تھا۔ جو بیشتر معابد اور حلیفانہ تعلقات کے ذریعے عمل میں آیا۔ معابدانہ رابطے کے ذریعے حضور کا حکومت کے دائرہ اثر کو وسیع کرنا اور اس معاملے میں غیر معمولی حد تک توجہ دینا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ جنگ و جدل سے انتہائی ممکن حد تک بچنے کے نکلنا چاہتے تھے اور امن و آشتی کی فضا چاروں طرف قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ ایسی پرسکون فضا میں دعوت حق کا ٹھنڈا کام بخوبی ہو سکے۔ اور جنگی جذبات بیچ میں حائل نہ ہوں۔ جنگی کارروائیاں جہاں کہیں بقاء کے لیے امن یا بقاء کے لیے ناگزیر ضرورت بن گئیں، وہاں تو آپ نے کسی درجے کی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا۔ لیکن اگر جنگ سے بچنے کے نکلنا چاہتا ہو اور ریاست کا سیاسی تحفظ و استحکام اور دعوت کے لیے کھلا میدان امن و آشتی سے حاصل کرنا ممکن ہو تو پھر آپ نے لازماً صلح و آشتی کا راستہ اختیار کیا۔ خود ریاست کا وجود تلوار کے زور سے نہیں، بلکہ دستوری معاہدے کے بل پر قائم ہوا۔ اور پھر اس کے تحفظ کے لیے اور اس کے اثرات کی توسیع کے لیے آپ نے حلیفانہ روابط کو اتنے بڑے پیمانے پر ذریعہ بنایا کہ جنگی کارروائیاں ان کے مقابلے میں بالکل ہلکا تناسب رکھتی تھیں۔

معابدات استوار کرنا اور حلیفانہ تعلقات قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ خصوصاً جب کہ مذہبی اختلافات موجود ہوں۔ سیاسی تعصبات پیدا ہو جائیں۔ درمیان میں کھلی کھلی مخالف طاقتیں مدخلت کر رہی ہوں۔ اور معاملہ بالعموم ایسے قبائل اور عناصر سے ہو جو سابق تعلقات نہ رکھنے کی وجہ سے بالکل اجنبی ہوں۔ اس کام کے لیے بڑی سیاسی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ مخاطب کے حالات اور رجحانات کو دیکھنا۔ قوت کو پہچاننا، اس توازن قوت کو سمجھنا جو کسی خاص لمحے مختلف اجزائے معاشرہ کے درمیان کار فرما ہو۔ مخالف طاقتوں کے اثرات کا مطالعہ کرنا۔ شرائط کی وہ خاص درمیانی لکیر تلاش کر لینا جہاں تک کسی قبیلے یا عنصر کو لایا جاسکتا ہو۔ اور پھر نفسیاتی لحاظ سے گفت و شنید میں اثر پیدا کرنا۔ ایسے بے شمار لوازم پورے کرنے پڑتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دائرہ کار میں جس درجے کی سیاسی بصیرت اور فائدہ مہارت اور ڈپلومیٹک قابلیت کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔ اور اس وجہ سے نہیں مل سکتی کہ حضور نے اتنے وسیع تعلقات مختلف حالات میں پیدا کرتے ہوئے کسی بھی موقع پر نظریہ حق اپنے اخلاقی

اصولوں اور اپنے سیاسی مرتبے کو ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچنے دیا۔ ورنہ ڈپلومیٹک دائرے میں جس بری طرح سے اصول اخلاق کا قتل عام ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے لفظ ڈپلومیسی بدنام ہو کر رہ گیا۔ خود سیاست آج ایک کردہ مشغلہ اسی لیے بن کر رہ گئی ہے کہ سیاست کا کوئی اخلاق نہیں ہوتا اور یہ ایک ایسا ٹینک ہے کہ جدھر کو حرکت کرتا ہے۔ انسانیت کی قیمتی قدروں کو روندنا چلا جاتا ہے۔ مگر حضور نے ڈپلومیسی اور سیاست کا بالکل مفہوم بدل کے رکھ دیا۔ اور ان کاموں کو نہ صرف آلائشوں سے پاک کر دیا۔ بلکہ نیکی اور عبادت کی روح سے سجا رہا۔ اور اصولوں کے ساتھ سیاسی اور ڈپلومیٹک سرگرمیوں کو جاری رکھنا اور پھر ان میں غیر معمولی درجے کی کامیابی حاصل کرنا اور اس کے ذریعے بشمار بکھرے ہوئے قبائل کو اپنے گرد مجتمع کر لینا آج کتابوں کے اوراق میں پڑھتے ہوئے آسان معلوم ہوتا ہے۔ مگر ریگستان عرب میں جب عملاً یہ سب کام ہو رہا ہوگا۔ تو کرنے والا ہی جان سکتا ہے کہ کیسی کٹھن مہم ہوگی۔

معاہدہ نہروابط کا یہ سلسلہ نہ صرف اس لحاظ سے دعوت کی توسیع میں مدد تھا کہ حدیث قبائل میں مسلمہ دنیوں کو مدد رفت اور عوام سے گھلنے منے کے کھلے مواقع حاصل ہو جاتے تھے۔ اور خود ان قبائل کے افراد کا رابطہ بھی مہذب سے بڑھ جاتا تھا۔ بلکہ یہ اس لحاظ سے بھی تحریک کے اثرات کی توسیع کا موجب تھا کہ اس کی وجہ سے مسلم طاقت اپنی سیاسی بصیرت کی وجہ سے عوام کی معتمد علیہ بنتی چلی گئی۔ لوگ محدود مذہبی اور صوفیانہ تصورات سے بنائے ہوئے نیک آدمیوں پر کتنے بھی فریفتہ ہوں اور ان کے تقدیر سے مرتوب رہیں، لیکن وہ زندگی کی قیادت کی باگ ڈور سنبھال سکیں نہیں سونپا کرتے۔ زندگی کی قیادت دنیا میں ہمیشہ ان عناصر کو دی جاتی ہے جن کے پاس ہے۔ اندازہ ہو کہ یہ کارپردازی کے لیے ضروری بصیرت رکھتے ہیں۔ بسا اوقات یہ ہوتا ہے کہ وہ اس امر کے بارے میں بڑی ستائش سے کام لے کر کما کرتے ہیں کہ وہ تو بڑے اچھے لوگ ہیں۔ بڑے نیک کام کرتے ہیں۔ بڑی خدمت خالق میں مصروف ہیں لیکن اس ستائش میں یہ تاثر بھی مضمحل ہوتا ہے کہ کار دنیا کے لیے یہ سخت ناموزوں بھی ہیں۔ ایسے گروہ لوگوں کی یہ باتیں سن کر بارہ مغالطوں میں بھی پڑ جاتے ہیں کہ رائے عام ہمارے حق میں اچھی ہے۔ مسئلہ طاقت مگر ایسا انسانی کردار بنا کے سامنے لائی ہوتی، جو مذہبی رنگ میں نیکی کا پیرور روحانی لحاظ سے نتوئی کا مجسمہ تو ہوتا لیکن معاملات دنیا اور مسائل تمدن و سیاست میں کوئی اہمیت نہ دکھنا سکتا تو تاثر یہ تو ہوتا کہ کچھ بھلے لوگ ہیں۔ اللہ وائے ہیں اچھی باتیں کہتے ہیں اور لوگوں سے نیک سلوک کرتے ہیں لیکن ایسا قطعاً ممکن نہ تھا کہ عوام ان سے کسی نظام نو کی اقامت کی امیدیں باندھ سکتے اور ان کو سلطنت چاہے اور سماج کی قیادت کرنے کا اہل مان سکتے اسلامی تحریک ایسے "ابد لوگ" بنانے نہیں آئی تھی جو بحیثیت فرد بہت ہی اللہ وائے بھلے مانس اور مسکین تسلیم کیے جائیں لیکن اجتماعی دائرے میں کارفرما اور کارپرداز

بننے کے لیے سیاسی بصیرت کا مزدوری سرمایہ نہ رکھتے ہوں۔ لوگ ان کو ایک متبادل مگر صالح تر قیادت کی حیثیت سے قبول نہ کریں۔ اور ان کے ہاتھوں کسی روشن مستقبل کی تعمیر کی توقع نہ رکھیں۔ مسلم کردار جتنا زیادہ خدا پرست اور متقی تھا اتنا ہی زیادہ سیاسی بصیرت سے بھی آراستہ تھا۔ اس معاملے میں اس نے اپنا سکہ اپنی عملی کارگزاری سے منوالیا۔ جوں جوں لوگ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جلو میں اقدام کرنے والی مسلم طاقت کی قائدانہ صلاحیتوں سے متاثر ہوتے گئے، مدینہ ان کی امیدوں کا مرکز بنتا گیا۔ اور اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ ان کے دل بھی اسی ندریج سے اسلام کے لیے کھلتے چلے گئے۔ گویا دین کی دعوت اور سیاسی اثرات کی توسیع دونوں کام ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔ اور ایک دوسرے کے لیے مدد!

یہ حقیقت ذہن میں رکھ کر ان معاہدات تعلقات کا جائزہ لیجیے۔ جو حضور نے بڑے وسیع پیمانے پر قائم کر دکھائے۔ اور اس کام میں آپ کی رفتار کا حیرت انگیز حد تک تیز رہی۔ — باوجودیکہ ذرائع رسل رسالت کے لحاظ سے حالات سخت ناموافق تھے۔

### ۱۔ بیعت عقبہ :

معاہدات روابط میں سرفہرست بیعت عقبہ آتی ہے۔ جو بیک دم ایک پہلو سے مذہبی میثاق ہے۔ اور دوسرے پہلو سے سیاسی معاہدہ۔ پہلی بار کی مجلس میں محسن انسانیت کے ہاتھ پر انصاری نوجوانوں نے قبول رسالت کی بیعت کی۔ اور دوسری بار آپ کی سیاسی قیادت کا عہد بھی شامل کیا۔ مکہ سے مناکو جاتے ہوئے راستے کے دونوں طرف پہاڑوں کی متوازی دیواریں آتی ہیں۔ مناسے کوئی ایک فرلانگ بھر پہلے بائیں ہاتھ کی پہاڑی میں نصف دائرے کا ایک خم ہے اور اس خم کے دامن کے طور پر ایک میدانی قطعہ دکھائی دیتا ہے یہی وہ محفوظ جگہ ہے جہاں راتوں کے پردہ سکوت میں بیعت ہائے عقبہ واقع ہوئی۔ مدینہ میں یہود کی موجودگی کی وجہ سے انصار الہامی دین کا ذوق رکھتے تھے۔ اور سلسلہ نبوت سے انہیں تعارف حاصل تھا۔ نیز آخری نبی۔ موعود کی پیش گوئیاں ان کے سامنے تھیں اور یہود کا یہ چیلنج بھی کہ جب وہ نبی آجائے گا تو ہم اس کے ساتھ ہو کر تم لوگوں کو مغلوب کریں گے۔ اس طرح انصار میں جہاں الہامی ہدایت کی طلب پیدا ہو چکی تھی وہاں غیر شعوری طور پر یہ جذبہ بھی اثر انداز تھا کہ وہ نبی آجائے تو ہم پہلے لبیک کہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس و خراج کے درمیان باہمی آویزش کا جو سلسلہ چلا آ رہا تھا اس سے تھک کر وہ ایک دور امن کے خواہاں تھے مگر رکاوٹ یہ تھی کہ دونوں میں سے کوئی قبیلہ بھی سابق حریفانہ فضا کی وجہ سے دوسرے قبیلہ کی قیادت قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ ان کو تیسری طاقت کی احتیاج تھی۔ یہ سارے وجوہ تھے جن کے زیر اثر مدینہ کے ذہن اور

شریف لوگوں کو جو نبی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست تعارف ہوا۔ اور حضور کی دعوت سننے کا موقع ملا۔ تو قبولیت کے لیے ان کے دل کھل گئے۔ نبوت کے چرچے تو ان تک پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ لیکن بالمشافہ گفتگو نے انہیں قطعی فیصلہ تک پہنچا دیا۔ آنحضرت کی وجاہت اور شخصیت کا اثر جب کلمات دعوت میں شامل ہوا ہوگا، تو اس ذہنی انقلاب کی تکمیل ہوگئی ہوگی جس کے لیے انصار کی فطرت میں پہلے سے آمادگی موجود تھی۔ وہ لمحہ ایک عجیب نازک تاریخی لمحہ تھا یعنی انصار پہلی بیعت کے موقع پر، مدینہ سے یہ ارادہ لے کے چلے گئے، کہ قریش سے حلیفانہ رابطہ استوار کریں۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو تحریک اسلامی کی تاریخ کا رخ کچھ دوسرا ہوتا۔ مگر بین وقت پر جماعت انصار کا ارادہ بدلتا ہے اور وہ قریش کا خیمہ چھوڑ کر اس نئی قوت سے رابطہ جوڑ لیتے ہیں۔ جو تاریخ کے افق سے اپنی ابتدائی کمزوریوں کے ساتھ آغازِ طلوع کر رہی تھی۔

پہلی مرتبہ کی بیعت میں حضور نے چند اعتقادی و اخلاقی امور کا عہد لیا۔ یعنی معاہدہ باندھنے سے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ گردانیں گے۔ چوری نہیں کریں گے۔ زنا نہیں کریں گے۔ اولادوں کو قتل نہیں کریں گے۔ کسی کے خلاف کوئی بہتان نہیں گھڑیں گے اور معروف کے دائرے میں رسول خدا کی نافرمانی نہیں کریں گے۔

دوسری بیعت میں انصار نے ان امور کا اضافہ کیا کہ ہم رسول اللہ کے سامنے ہر حال میں سب و طاقت سے ایمان لیں گے۔ چنانچہ مشعلات درپیش ہوں یا آسانیاں ہوں۔ ہمارے دلوں کو کوئی حکم پسند نہ پائے۔ ان لوگوں کوئی بات ہماری رایوں کے خلاف ہو رہی ہو اور یہ کہ ہم اپنی قیادت سے کشمکش نہیں کریں گے اور یہ کہ ہم کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔

ان مختصر الفاظ میں گویا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور انصار کے درمیان سیاسی رابطہ استوار ہو گیا۔ اور اس جماعت نے واضح طور پر ایک سیاسی جماعت کی حیثیت اختیار کر لی۔ حضور کی قیادت کو انہوں نے سمع و طاعت کے ساتھ پوری طرح قبول کیا۔ یہ اقرار بھی باندھا کہ ارباب قیادت کے خلاف کوئی کشمکش نہ کی جائے گی۔ اور جاہ و منصب کو چھیننے چھیننے کے لیے کوئی اقدام نہ ہوگا۔ مشاورت کا اصول طے پایا گیا کہ ہر موقع پر حق بات پیش کی جائے گی۔ اور اقامت دین کی جدوجہد کے بارے میں پیمانہ بندھ گیا کہ جو جو کچھ فرائض اور مطالبات اور ذمہ داریاں ہم پر عاید ہوں گی۔ انہیں دنیا بھر کے طعن و ملامت سے بے نیاز ہو کر سرانجام دیں گے۔ یہ ایسی بیعت تھی کہ اس کے بعد جو نئی کوئی قطعہ ارضی (territory) اس جماعت کے زیر اثر آجائے، جس میں اس کے اوپر کوئی اور سیاسی اقتدار کارفرما نہ ہو بلکہ قیادت اس کے اپنے ہاتھوں میں ہو تو یہ جماعت معاً ایک ریاست میں بدل جائے۔



ان امور کے ساتھ مزید یہ بھی طے پا گیا کہ حضور کے مدینہ منتقل ہو جانے پر معاہدہ باندھنے والے انصار حضور کی ایسی ہی حفاظت کریں گے۔ جیسی کہ وہ اپنی ازواج و اولاد کی کرتے ہیں۔ گویا مدینہ کی اسلامی جماعت اور حضور کے درمیان دفاعی وحدت کا تعلق بھی قائم ہو گیا۔ اور اس لحاظ سے بیعت عقبہ کی سیاسی قدر و قیمت اور زیادہ بڑھ کر "انقلابی" ہو جاتی ہے۔

پھر حضور کے ارشاد سے انصار مدینہ کی اسلامی جماعت کی طرف سے بارہ نمائندہ نقیب نامزد کیے جاتے ہیں۔ جو حضور کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ان نقیبوں کے سر دعوت اسلامی کو پھیلانے کے علاوہ سیاسی ذمہ داری بھی ڈالی گئی۔ بقول عبداللہ بن ابی بکر حضور نے ان نقیبوں سے فرمایا کہ "تم لوگ اپنی اپنی قوم کے اسی طرح ذمہ دار ہو جیسے حضرت عیسیٰ کے سامنے ان کے حواری ذمہ دار تھے، اور میں بھی اپنے گروہ — یعنی مکی جماعت — کا ذمہ دار ہوں۔"

نقیبوں کے تصور کے ساتھ مدینہ کے لیے جو تنظیمی ہیئت تشکیل دی گئی، وہ فقط مذہبی نہ تھی۔ بلکہ سیاسی و انقلابی تھی۔ ایسی ہیئت کی فطرت تقاضا کرتی ہے کہ وہ جلد از جلد — پہلا موقع ملتے ہی — ریاست کی شکل اختیار کرے۔ عالم واقعہ میں ہوا بھی یہی کہ حضور کے جانے کے چند ماہ بعد اسلامی ریاست کی نیوڈال دی گئی۔

گویا اسلامی تحریک ابتدائی دعوت کا دور پورا کر کے سیاسی تعمیر کے دور میں داخل ہوئی تو معاہدہ کے ذریعے داخل ہوئی۔ نہ کہ جنگی قوت کا استعمال کر کے۔

## ۲۔ دستوری معاہدہ :

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں چلنے والی تحریک اسلامی کی تاریخ میں دوسرا عظیم ترین معاہدہ وہ ہے جس پر مدینہ کی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ شاید دنیا بھر کی تاریخ میں مجر کسی ایک ریاست کا قیام بھی بغیر تھوڑی بہت قوت استعمال کیے نہیں ہوا ہو گا کجا کہ معاہدہ ایک نظریاتی ریاست کا ہو جس کے اساسی نظریے نے ماحول میں ہل چلی مچا دی ہو۔ پھر اس کا قیام ایک اجنبی ماحول میں اور گونا گوں عناصر کے تعاون سے عمل میں آئے۔ یہ دستوری معاہدہ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی بصیرت اور قائدانہ مہارت کی ایک ایسی مثال پیش کرتا ہے جس کا کہیں جواب نہیں اس معاہدہ کے فریقوں کو دیکھیے تو ان میں مہاجرین شامل ہیں۔ انصار کے دو بڑے قبائل اوس خزرج کے مسلم افراد شامل ہیں۔ ان کے مشرک اور یہودی

۱۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۳۶ تا ۵۵، عمد بنوئی کے میدان ہائے جنگ، ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی صفحہ ۱۰ تا ۱۱

انفراد شامل ہیں۔ یہود کے متعدد قبائل شامل ہیں۔ درآ نخالیکہ ان میں باہمی چپقلش موجود تھی۔

درحقیقت حضور پاک نہالی تعلقات کی وجہ سے مدینہ کو بچپن سے جانتے تھے کیونکہ وہاں رہ چکے تھے پھر یہ حیثیت داعی حق آپ نے مکہ ہی کے آخری دو تین برس میں مدینہ سے رابطہ قائم ہو جانے کے بعد وہاں کے مخصوص حالات پر سیاسی نقطہ نظر سے اچھی طرح کاوش کی تھی اور ہجرت کے بعد مدینہ آکر تو براہ راست وہاں کے جملہ عناصر کے باہمی معاملات کا فہم حاصل کر لیا تھا۔ مدینہ کی کل آبادی اس وقت اندازاً پانچ ہزار ہوگی اور اس تعداد میں تقریباً نصف یہودی تھے اس ساری آبادی میں مہاجرین اور انصار کو ملا کر مسلمہ گروہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ پانچ سو ہوگی۔ اسی فعال، بیدار اور منظم اقلیت کے بل پر حضور نے ۵ ہزار کی آبادی کو اپنی قیادت کے حلقہ میں لے لیا۔ انصار کے دونوں قبیلے جو ۱۲ صمنی قبائل میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک تاریخ آویزش رکھتے تھے اور عام آبادی بھی تصادم کے چکر سے تھکی ہوئی تھی کیونکہ ہمیشہ کچھ عرب اور کچھ یہودی ایک طرف اور کچھ عرب اور کچھ یہودی دوسری طرف ہو کر جنگ و جدل میں پڑتے رہتے تھے۔ اب امن کی پیاس موجود تھی اس مقصد سے ایک تعمیری قیادت کی طلب کار فرما تھی۔ کچھ ہی مدت پہلے قیادت کا خلاء پُر کرنے کے لیے عبداللہ بن ابی کی تاجپوشی کی تیاریاں شروع بھی ہو چکی تھیں۔ لیکن یکایک حضور اور آپ کی دعوت سے تعارف حاصل ہو جانے پر انصار ادھر متوجہ ہو گئے۔ خود یہودیوں کا حال بھی یہ تھا کہ ان کے دہرے گردہ جو داخلی طور پر دشمنیوں میں منقسم تھے، باہم دگر حریف تھے۔ اور ایک غیر نسل اور غیر علاقے میں انہیں اندیشہ نفاذ کہیں نہ مٹا نہ جائیں۔ پھر جب یکایک حضور نے انصار کو اپنے ساتھ وابستہ کر لیا اور ان کے سابق حریفانہ روابط یہودیوں سے ٹوٹنے لگے تو اس وقت یہودیوں نے اپنے پیروں تلے سے زمین سرکٹی محسوس کی۔ اس صورتِ حالات میں نبی اکرم نے یہود کے حق میں وحی الہی کے تحت تالیفِ قلب کرنے اور ان کے بہترین جذبات کو اپیل کرنے کی سعیِ بلیغ کی، تو سیاسی وحدت قائم کرنے کے لیے میدان ہموار ہو گیا۔ مدینہ کی آبادی کے جملہ عناصر کو سمجھنا، ان کے مفاد اور مسائل کا شعور حاصل کرنا اور ان کی نفسیات کو مناسب رخ پر ڈھکانا اور پھر اس عظیم سیاسی کارنامہ کو بہت ہی کم مدت میں سرانجام دے لینا محسنِ انسانیت کی سیاسی عظمت سے ہمیں مرعوب کر دیتا ہے۔

مسلم جماعت جو اعتقاد اور اخلاقاً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کے تحت انتہائی مضبوط تنظیم رکھتی تھی۔ اور پھر بیعت عقبہ نے اسے ایک سیاسی انقلابی پارٹی کی حیثیت بھی دے دی تھی۔ نیز یہ اپنی اصولی دعوت کے نور سے نشوونما پانے کی صلاحیت بھی رکھتی تھی۔ اس نے مدینہ میں سیاسی لحاظ سے مرکزی اہمیت حاصل کر لی۔ انصار کے قبائل میں نہ کوئی جوانی نظریہ یا ردِ عمل موجود تھا اور نہ کوئی مقابل کی منہبستی

ذہن کی قیادت — کیونکہ ان کے سرداروں کی بیشتر تعداد پہلے ہی اسلامی تحریک کی طرف کھنچ آئی تھی۔ ان کے اندر کے مشرک اور یہودی افراد اچھی خاصی بڑی تعداد رکھنے کے باوجود کوئی مخالفانہ حرکت نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ پرسکون تھے اور سیاسی حیثیت سے سرکردہ مسلم عناصر کے پیچھے چلنے والے تھے۔ یوں بھی کوئی اکاؤنٹ کا عرب یا یہودی قبیلہ مسلم جماعت کے مقابلے میں کچھ وزن نہیں رکھتا تھا۔ مدینہ کی آبادی کے عناصر کی یہ ترتیب حضور کے نقشہ کار کے لیے بالکل سازگار تھی۔ اور آپ نے ابتدائی مسائل سے فارغ ہوتے ہی چند ماہ کے اندر اندر ہیثیت سیاسیہ کی تشکیل کر لی۔ مذکورہ بالا معاہدہ جو یورپین مستشرقین کے تجزیہ کے مطابق ۵۳ دفعات پر مشتمل ہے۔ تاریخی ریکارڈ کی بنا پر اس معاہدے کے متعلق ایک اختلاف یہ ہوا ہے کہ بعض لوگوں نے پوری دستاویز کا سہہ میں لکھا جانا بیان کیا ہے۔ اور بعض نے تحقیقی رائے یہ بھی دی ہے کہ اس کا ایک حصہ سہہ کا ہے اور دوسرا حصہ اس میں غزوہ بدر کے بعد شامل کیا گیا ہے یعنی مغربی تقسیم کے مطابق دفعات ۲۳ تا ۲۴ اور ۲۴ تا ۲۷ دو الگ الگ حصے ہیں۔ ہم اگر اس دوسری رائے کو قبول کر لیں تو اس صورت میں بھی رسول خدا کی سیاسی حکمت کا راز نظر آتی ہے۔ حضور نے پہلے مہاجرین اور جملہ انصار (مسلم + غیر مسلم) پر مشتمل ہیثیت سیاسیہ کی تشکیل کر دی۔ اس کے وجود میں آجانے کے بعد یہودی قبائل نے اپنے آپ کو الگ رکھتے ہوئے کمزور اور معرض خطر میں محسوس کیا ہوگا۔ کیونکہ سیاسی لحاظ سے وہ بالکل ہوا میں معلق رہ گئے تھے پھر سب انہوں نے مسلم طاقت کو میدان بدر سے اپنی توقعات کے خلاف فاتح بن کر نکلتے دیکھا ہوگا۔ تو انہیں فکر ہوئی ہوگی کہ ہم کو بروقت مدینہ کی ہیثیت سیاسیہ میں اپنی جگہ بنا لینا چاہیے۔

یہ دستوری دستاویز جس کی نظیر بقول ڈاکٹر جمید اللہ پہلے کی تاریخ میں قطعاً نہیں مل سکی، اعلیٰ درجہ کے سیاسی سلیقے سے لکھی گئی ہے۔ نہایت ہی محتاط دستاویزی زبان میں ہے اور اس میں حضور نے اپنی مطلوبہ نظریاتی و سیاسی اقدار کو مختلف عناصر سے تسلیم کرایا ہے۔ یہ مناسب موقع ہے کہ اس دستاویز کے اہم ترین مندرجات پر نگاہ ڈالیں تاکہ اس کی سیاسی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کیا جاسکے۔

اس دستاویز کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوا۔ اور اس کا سرعنوان ہے ”ہذا کتاب من محمد النبی صلی اللہ علیہ وسلم“۔ یعنی نوشتہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے جو نبی ہیں۔ گویا پیرایہ آغاز ہی میں نظریہ اساسی کی بنیاد رکھ دی گئی۔

اس دستاویز پر مبنی ہیثیت اجتماعیہ کا مرکزی عنصر بہر حال مسلم جماعت کو قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً پیرایہ آغاز میں دستوری نوشتہ کا دائرہ یوں نامزد کیا گیا ہے: ”بین المؤمنین والمسلمین من قد پیشی ویشی اور اس پر اضافہ ہے: ”ومن تبعہم فلدنق بہم وجاهد معہم“ (دفعہ ۱) گویا ریاست کا مرکزی

عنصر کہ اور مدینہ کے اہل ایمان ہیں اور بقیہ ان کے تابع، لائق اور حامی ہونے کی صورت میں شہریت سے بہرہ مند ہیں۔ چنانچہ یہود کے قبائل کو شریک معاہدہ کر کے "مومنین کے ساتھ" کے الفاظ سے سیاسی امتداد میں شمار کیا گیا (دفعات ۲۵ تا ۲۵) پھر مندرج ہے کہ "اہل ایمان دوسرے انسانوں کے بالمقابل آپس میں ایک دوسرے سے بھائی چارہ رکھتے ہیں" (دفعہ ۱۵) پھر صلح و جنگ میں تمام مسلمانوں کو مشترک قرار دیا گیا ہے۔ (دفعہ ۱۶) پھر ایمان والوں پر لازم بھٹرایا گیا ہے کہ وہ قتاس کے لیے مل کر اٹھیں اور قاتلوں کو پناہ نہ دیں۔ نیز اگر ان پر زیادتی کر کے خون بہایا جائے، تو اس کا انتقام لیں (دفعہ ۱۹-۲۱-۲۲) پھر لازم کیا گیا کہ کوئی ایمان والا کسی کافر کے بدلے میں کسی ایمان والے کی جان نہ لے گا۔ اور نہ کسی ایمان والے کے خلاف کسی کافر کی مدد کرے گا (دفعہ ۱۴) مسلمانوں کا ادنیٰ ترین فرد بھی کسی کو پناہ دے سکتا ہے اور اسے اللہ کے ذمہ کی حیثیت سے سب کو نبھانا ہوگا (دفعہ ۱۵) جب کوئی اختلاف واقع ہو تو خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے گا (دفعہ ۲۳) متقی ایمان والوں پر واجب کیا گیا۔ کہ وہ ہر حرم، گناہ اور تعدی کی صورت میں اس کے انداز میں متحرک ہوں (دفعہ ۱۳) ابتدائی حصہ میں دستور کی نظریاتی روح کو نمایاں کرنے کے لیے بار بار یہ جملہ آتا ہے کہ نماں فدا (مسلم) قبیلہ فدیہ وغیرہ کے معاملات میں "معروف" اور "قسط" پر کاربند ہوگا۔ اور وہ بھی اس مفہوم کے ساتھ جو "بین المؤمنین مسلمہ" (دفعہ ۲ تا ۱۲) نہایت ہی جمہ اسلامی اصطلاح "فی سبیل اللہ" بھی شامل دستور کی گئی (دفعہ ۱۹) اسی طرح "ظلم" اور "ظلم" کی اصطلاحات بھی متن میں داخل ہوئیں (دفعہ ۳۶) اس سے بھی بڑھ کر یہ تک شامل دستاویز ہے کہ متقی ایمان والے سب سے سیدھے راستے پر ہیں (دفعہ ۲۰) پھر "وان النصر للمظلوم" کے الفاظ سے ایک خاص اسلامی کلیہ جو بین الانسانی بھی بے تسلیم کر لیا گیا۔ اور یہ بھی کہ خدا اس کے ساتھ ہے جو اس صحیفہ کے مندرجات کی تعمیل زیادہ سے زیادہ اخلاص و وفا شجاری سے کرے" (دفعات ۲۲-۲۶-۲۷)

اس دستاویز میں سیاسی امور کو جس خوبی سے طے کیا گیا ہے اس کا بھی جائزہ لیجیے۔ دستاویز میں شہر کاہ کے سکنی علاقے یعنی جو ف مدینہ کو جس کا قبضہ تقریباً ایک صدمہ ربع میں تھا۔ (مدینہ کا جغرافیائی ماحول ہمہ بیان کر چکے ہیں اور وضاحت کے لیے نقشہ بھی دیا گیا ہے) نہ صرف یہ کہ اسلامی ریاست کی ابتدائی نہ زمین (Territory) قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اسے حرم مقدس بھی قرار دیا گیا (دفعہ ۲۹) اس معاہدہ کے جملہ شرکاء کو ایک سیاسی وحدت (انھم امت واحدۃ من دون الناس) قرار دیا گیا (دفعہ ۱) یہ دفعہ سیاسی حکمت کی منظر ہے کہ پہلے سے طے کر دیا گیا کہ یہود میں جو بھی ہماری اتباع کرے اسے مدد اور مساوات بہ حقوق شہریت حاصل ہوگی۔ یہ گو یا پیش بندی بھی تھی۔ اور ترغیب بھی (دفعہ ۱۶) کمال سیاست

کا شاہکار یہ ہے کہ اختلاف ہونے پر اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائیگا (دفعہ ۲۳) کوئی جھگڑا یا قتل واقع ہو تو خدا اور خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ (دفعہ ۲۲) کسی زخم یا مار کا بدلہ لینے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی (دفعہ ۳۶) ظالم کے ظلم یا قاتل کے جرم کا وبال صرف اس کی ذات یا اس کے گھرانے (خون بہا میں خاندان شریک ہوتا تھا) پر ہوگا۔ کسی دوسرے پر نہیں (دفعہ ۲۵، ۲۶) سیاسی ہیئت کے ابتدائی واحد سے قبیلوں کو قرار دیا گیا۔ اور ان کو تسلیم کر کے ان پر مرکزی اقتدار قائم کیا گیا۔

دفاعی سیاست کے لحاظ سے یہ باتیں طے پائیں کہ :- اگر شریک پر حملہ ہو۔ تو شرکاء کے لیے باہمی امداد کرنا ضروری ہوگا۔ (دفعہ ۲۲) اگر معاہدہ کے کسی فریق سے کوئی جنگ کرے تو اس کے خلاف سارے شرکاء سچے جذبے سے امداد کریں گے (دفعہ ۳۴) اس دستاویز نے ایک دفعہ کے ذریعے دفاعی بالادستی بھی حضور کے ہاتھ میں دے دی کہ کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر فوجی کارروائی کے لیے نہیں نکلے گا (دفعہ ۲۶) کسی فریق کی اپنی مذہبی لڑائی کے بارے میں شرکاء کی کوئی ذمہ داری نہ ہوگی (دفعہ ۲۵) اگر شرکاء کو کسی صلح کے لیے مدعو کیا جائے تو سب کے ساتھ وہ بھی صلح کریں گے (ایضاً) قریش کے لیے جلیفانہ تعلقات کا قطعی خاتمہ کرنے کے لیے یہ بھی منوا لیا گیا کہ کوئی مشرک (غیر مسلم شہری) قریش کے جان و مال کو کوئی پناہ نہ دے گا۔ اور نہ اس سلسلے میں کسی مومن کے آڑے آئے گا (دفعہ ۲۱) اور قریش کو کوئی پناہ نہ دی جائے گی اور نہ اس کی جو انہیں مدد دے (دفعہ ۲۳) جنگی مصارف کے متعلق یہ حقیقت پیش نظر رکھتے ہوئے کہ یہودی اپنا حصہ ادا کرنے میں کجوسی دکھائیں گے اور اگر اجتماعی فنڈ ان کے ہاتھ میں گیا۔ تو وہ خیانت سے کام لیں گے۔ حضور نے کمال بصیرت سے معاملہ یوں طے کیا کہ ہر فریق اپنے اپنے جنگی مصارف خود برداشت کرے گا (دفعہ ۲۲-۲۴) اقتصادی لحاظ سے ایک طرف خون بہا اور قیدیوں کے فدیہ کا بار عرب کے معروف طریقے پر شخص متعلق کے قبیلے پر پھیلا دیا گیا، غیر مستطیع مقروض کے قرض کی ذمہ داری بھی اجتماعی کر دی گئی۔

مذہبی آزادی کے لیے وضاحت کر دی گئی کہ مسلمانوں کے لیے ان کا دین اور یہود کے لیے ان کا مذہب (دفعہ ۲۵) درحقیقت مسلم جماعت تو سیاست اور دین دونوں کے لحاظ سے ایک وحدت تھی اور اس پر دوہری ذمہ داریاں عاید تھیں مگر خالص سیاسی رابطے کے دائرے میں جملہ شرکاء کو اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی دی گئی۔

اب ان نکات کو دستاویز کے خلاصہ کی حیثیت سے زیر نظر لائیے۔ اور پھر ایک ایک جز پر غور کیجیے کہ مصنف نے کس حکمت سے اپنی آئیڈیالوجی کو دستور کی اساس اور روح بنایا۔ مسلم جماعت کو مرکزی حیثیت دلائی اپنی قیادت اور انتھارٹی — سیاسی، دفاعی، عدالتی — ہر لحاظ سے منوائی۔ قریش کا مقابلہ کرنے کے لیے سب کو مشترک نکات پر جمع کر لیا۔ اور بے شمار خطرات کے رخنے پہلے سے بند کر لیے۔ واضح رہے کہ اس معاہدہ کی نوعیت ایک دستاویز کی ہے۔ جس کے کسی ایک فریق کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ جب چاہے علیحدگی اختیار کرے یا معاہدہ توڑ دے۔ ایسا کرنا سرے سے اس حق شہریت کو ختم کر دیتا ہے جسے اسلامی ریاست کے حدود میں ہی معاہدہ خالق کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جن یہودی قبائل نے بعد میں اس معاہدہ کو پوری طرح پامال کر دیا ان کے خلاف وہ کارروائی کی گئی جو غداروں اور باغیوں کے خلاف کی جاتی ہے۔

یہاں ضمناً فرضیت ہجرت کے اہم نکتہ کو اس دستاویز کی روشنی میں سمجھ لینے کا موقع ہے۔ مدینہ کی ریاست کی اساس جس مسلم جماعت پر رکھی گئی تھی، فرضیت ہجرت کا ایک مقصود یہ تھا کہ یہ جماعت زیادہ سے زیادہ منضبط ہو اس میں شک نہیں کہ عرب کے قبائلی نظام میں متفرق اکاد کا مسلمانوں کا پڑے رہنا اس امر کا موجب ہو سکتا تھا کہ وہ تھوڑی بہت کشمکش کر کے بالآخر جاہلی معاشرے میں تحلیل ہو جائیں یا جبر و تشدد کا شکار ہو جائیں اس وجہ سے بھی ایک ایک ذرے کو سمیٹ لینا ضروری تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ مدینہ کی اسلامی ریاست کا استحکام بھی پوری اہمیت سے اس کا متقاضی تھا۔ بعد میں جب یہ دونوں ضرورتیں باقی نہ رہیں تو ”لاہ جسیرۃ بعد الفتح“ کا اعلان کر دیا۔ یعنی جب سارا عرب دارالاسلام بن گیا۔ اور مدینہ کی قیادت کے زیر نگین آ گیا۔ اور اسلام لانے والوں کے لیے کسی علاقے میں بھی مزاحم فضا باقی نہ رہی تو مدینہ ہجرت کر کے آنے کی پابندی اٹھالی گئی۔

اس معاہدے کے مطابق مدینہ کی اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت قائم ہوئی۔ ایک صد مربع میل علاقے میں جو ۵ ہزار کی آبادی رکھتا تھا مسلمانوں کو دعوتِ حق کے لیے بالکل کھلا دائرہ پہلی بار حاصل ہوا۔ جہاں اسلام کا سیاسی اقتدار بھی دعوت کے کام میں از خود ممد تھا۔ پھر اس علاقے کے آس پاس جا کر کام کرنے کے لیے بھی اسلامی حکومت کا وجود کارکنوں کے لیے پشتیں بنا بن گیا۔

### (۳) متفرق قبائل سے معاہدات :

مدینہ کو ایک سیاسی واحد بنانے اور اسلامی حکومت کی نیوڈالانے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ حضور نے آس پاس کے قبائل کو ساتھ ملانے کی فکر کی۔ دونوں بار صحابہ کی جماعتوں کو مہمات پر بھیجا۔ ہجرت کے بارہویں پہلے یعنی صفر میں فرمانزدائے مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس ودان (مدینہ سے سبھانہ ایک قبیلہ ہے،

کارخ کیا۔ یہاں پہنچ کر آپ نے قبیلہ بنی حمزہ (یا بنی ضمہ) بن بکر بن عبدمناف سے معاہدہ استوار کیا۔ قبیلہ کی جانب سے عمرو بن مخشہ الضمیری نے دستخط کیے۔ یہ اس سے قبل مہاجرین کا ایک وفد اسی جانب عیص کے مقام تک گیا اور حلیفانہ تعلقات کے لیے اچھی مصلحت پیدا ہو گئی۔ یہ پھر ربیع الاول ۳ھ (ہجرت کے تیرھویں ماہ) حضور دوبارہ بواط (ینبوع کے علاقے میں جہینہ کے پہاڑوں میں سے ایک) کی جانب تشریف لے گئے۔ یہاں کی آبادی سے بھی گفت و شنید کامیاب رہی اور حلیفانہ تعلقات قائم ہو گئے۔

پھر جمادی الآخری میں بمقام ذوالعشیرہ (علاقہ ینبوع) تشریف لے گئے۔ وہاں بنو مذلج اور ان کے حلیف قبیلہ بنو ضمہ سے معاہدہ روابط کے لیے گفت و شنید بہت دنوں جاری رہی۔ ان سے بھی معاہدہ ہو گیا۔

ہمارے پیش روؤں کی ایک رائے یہ ہے کہ ان معاہدات سے یہ قبیلے اور علاقے درحقیقت مدینہ لے بیاسی واحدہ کا جز بن گئے تھے۔ اور متعلقہ علاقہ مدینہ کی سلطنت کا ایک حصہ ہو گیا تھا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ معاہدات کے بعض اہم اجزاء اور بعض اصطلاحات دستوری معاہدہ سے ملتی جلتی ہیں۔ لیکن اگر بالکل ابتدائی دور کے متعلق ایسا نہ بھی تسلیم کیا جائے۔ تو اس میں کوئی شک نہیں کہ بعد میں جہینہ سے حلیفانہ تعلقات کا ارتقاء اس بیچ پر جاری رہا۔ کہ یہ لوگ دوسرے عرب قبائل سے بہت پہلے اسلام میں داخل ہوئے۔ اور ایک ہزار کی جمعیت نے مدینہ آ کر حضور کی خدمت میں تعاون پیش کیا۔ اور عملاً غزوات میں حصے لیتے رہے۔ اس قبیلہ کی مختلف شاخوں سے اسلامی ریاست کے معاملات کا جو ریکارڈ موجود ہے۔ وہ اسی کی توثیق کرتا ہے۔ مثلاً بنی الجرمرز (جہینہ کی ذیلی شاخ) کو حضور نے امن و سلامتی کا تحریری پروانہ عطا کیا۔ بنی شمش یا شمش (جہینہ کی ذیلی شاخ) کو ان کا پورا علاقہ بطور جاگیر مستقل طور پر تفویض کر دیا۔ اسی طرح عوسجہ بن حرمہ جہنی کو اس کے مسکن فدالمہ (بہ جانب ساحل) کے قریب جاگیر کا پروانہ عطا کیا گیا۔ ابو بصیرہ اور ان کے ساتھیوں کے لیے جب معاہدہ مدینہ کی وجہ سے مدینہ جانے کا موقع نہ رہا۔ تو وہ مکہ سے ہجرت کر کے اسی ساحلی علاقے میں آ گئے تھے۔

۱ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۴۲۳۔ زاد المعاد جلد ۱ صفحہ ۳۳۲ رحمۃ للعالمین جلد ۱ صفحہ ۱۳۸

۲ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی۔ ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی صفحہ ۳۵۹

۳ رحمۃ للعالمین جلد ۱ صفحہ ۱۳۹ زاد المعاد حوالہ سابق

۴ ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۳۶ رحمۃ للعالمین جلد ۱ ص ۱۲۹

عین ممکن ہے۔ کہ عجمیہ جیسے سرداروں کی حمایت بھی انہیں حاصل رہی ہو۔ اور وہ مقامی لوگوں کے تعلقات ہی سے قریشی قائلوں کی مزاحمت کرتے ہوں گے۔

تعلقات اور آگے بڑھے، میل جول کی وجہ سے دعوت کا کام جاری رہا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائل پرچیت مجموعی اسلامی تحریک کے علمبردار بن گئے۔ عقبہ تہنی کی بیعت اسلام کا حال ہمارے سامنے ہے حضور کے دورِ آخر میں ایک نیا پرانا امن بنی بئر منہ، بنی الحرقہ اور عمر بن عبدمنی کے نام جاری ہوا جس میں دو قبائل ہیں جو مسلم قبائل پر عائد ہوتی تھیں۔ یعنی ہاز و زکوة کی پابندی ختم کی اور ایسی مخالفتیں اسلام سے انقطاع قریش کے سود کا ترک ان کے لیے لازم کیا گیا تھا۔ شہزادہ بنی قبیلہ ہبیلہ کے نام کی مسجد بھی دورِ نبوت میں بن گئی تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خاصی تعداد میں جہنی لوگ اسلامی جماعت میں شامل ہو کر رہنے لگے ہوں گے۔

بنو غنار ان چند قبائل میں سے ہیں جنہوں نے بڑی تعداد میں ہجرت کی تھی۔ اسلام قبول کیا۔ یہ قبائل سے مثالی نوجوان حضرت ابوذر کی دعوت سے متاثر ہوئے۔ جناب بدر کے قریب رہنے میں ان قبیلہ کے لوگوں نے حضور سے معاہدہ کیا۔ جس کی اساس اس جملے پر ہے کہ "انہم من المسلمین و علیہم اعلیٰ سہم" ہماری رائے میں اگرچہ اس کے ایک جزو میں اس قبیلہ کے غیر مسلم عناصر کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن بنی غنار یہ قبیلہ گویا ہبیلہ کی بیعت اجتماعیہ، جزیہ بن گیا۔ اور ان قبیلہ میں کہ اس کے علاوہ کوئی قبیلہ نہ رہا۔ سمجھا جائے۔

بنو منہرہ جس کی بہت سی شاخوں میں سے ایک بنو غنار کی شاخ تھی۔ اس کا ایک ذریعہ تو یہاں تو ان کے عدنی بھی تھا جس کا قیام حدودِ حرم میں تھا۔ اس شاخ نے قریش سے مجبوراً تعلق و صلحت کے باوجود مسلم حکومت سے دوستانہ تعلقات استوار کیے۔ صرف قریش کے خلاف ہجرت میں شامل ہونے سے انہیں حاصل کر کے بقیہ ہر لحاظ سے حضور کے ساتھ بیعتاً رابطہ جوڑ لیا۔

نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی ڈاکٹر حمید اللہ مدنی نے "عقبات نامہ" میں

تعلقات۔

شہ ایضاً

تہ ایضاً



قبیلہ خزیمہ مدینہ سے صرف ۲۰ میل کی دوری پر فرّح کی سمت میں بجانب شمال مغرب (قبول ابو یوسف، آباد تھا۔ شہر میں یہ قبیلہ حاکم اسلام میں شامل ہوا۔ لیکن ان سے حلیفانہ تعلقات لازماً ان کے ہمسایہ قبائل کے ساتھ ہی ساتھ آغاز پانچے تھے۔ اس قبیلہ کے ایک سردار بلال بن حارث کو قبیلہ دیا قبیل (کی سونے کی کانیں حضور نے بطور جاگیر عطا کیں۔ چنانچہ ایک حالیہ کھدائی میں یہاں کے قبرستان سے جاگیر کے فرمان کا کتبہ ملا ہے۔ فتح مکہ کے بعد سردار مذکور کو بہت سی زرعی زمین بھی بطور جاگیر دی گئی۔ ان باتوں سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ فرما زادائے مدینہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کتنی زیادہ توجہ ساحلی علاقے کے قبائل پر صرف کی۔ کیونکہ سیاسی جغرافیہ کے لحاظ سے یہ خاص کلیدی مقامات پر قابض تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جاگیروں کے فراہم یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ علاقہ شروع ہی میں (ان قبائل کے قبول اسلام سے قبل) حکومت مدینہ کی سرزمین سے سیاسی طور پر محقق ہو چکے تھے۔

قبیلہ غطفان کی ایک شاخ بنو اشجع تھے۔ یہ بھی تجارتی شاہ راہ کے متصل آباد تھے۔ شاہ راہ کی ناکہ بندی سے جب قریشی سلسلہ تجارت رک گیا۔ تو ان کی معاش پر اس کا اثر پڑا۔ کیونکہ یہ کاروانوں کی خدمت کر کے کمائی کر لیتے تھے۔ معاشی بحران سے مجبور ہو کر ان کا وفد مدینہ پہنچا اور معرکہ خندق سے قبل ہی انہوں نے اسلام قبول کر کے معاہدہ استوار کیا۔ ان کی طرف سے معاہدہ پر دستخط نعیم بن مسعود نے کیے نعیم بن مسعود تو چند ساتھیوں سمیت عین غزوہ خندق کے دوران میں اسلامی تحریک کے دائرے میں آئے۔ اس لیے بوقت معاہدہ سارا قبیلہ داخل اسلام نہ ہوا تھا۔ تاہم معاہدہ کی اساس اس فقرے سے واضح ہوتی ہے کہ ”حالفہ علی النصر والنصیحة“ یعنی حمایت و نصرت اور خیر اندیشی و خیر سگالی کے وسیع تعلقات استوار ہوئے۔ اسی قبیلہ کی ایک شاخ بنو عامر بن عکرمہ نے قافلوں کے پڑاؤ کا کاروبار چلانے کے لیے استحقاق خصوصی کا پروانہ حضور سے حاصل کیا۔ اس شاخ کے ایک سردار کو بھی غزوہ خندق سے قبل جاگیر دی گئی تھی۔ اب ہم ان چند حلیفانہ رابطوں کا ذکر کرتے ہیں جو غزوہ خندق کے بعد قائم ہوئے قبیلہ خزاعہ یمن کی قحطانی نسل سے تعلق رکھتا تھا اور بہت سی شاخوں پر مشتمل تھا۔ یہ اوگ مکہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے تھے۔ بنی مصطلق کے علاوہ اس قبیلہ کی اکثر شاخیں مسلمانوں سے اچھے روابط رکھتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ جناب عبدالمطلب نے ان کے ساتھ مستقل حلیفی رکھی تھی۔ اس قبیلہ نے معاہدہ حلیفیہ

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی از ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی مضمون عام قبائل عرب سے تعلقات  
۲۔ ایضاً۔

کی گنجائش سے فائدہ اٹھا کر علی الاعلان قریش کو چھوڑ کر مدینہ کی اسلامی حکومت سے حلیفی قائم کر لی۔ اسی واسطے کی بنا پر ایک طرف تو اس قبیلے نے جنگِ احزاب کے لیے قریش کی تیاریوں کی اطلاع حضور کو پہنچائی اور دوسری طرف حضور نے بھی فتح مکہ سے قبل ان کو ایک مکتوب میں اطمینان دلایا تھا کہ ان کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ نیز اطلاع دی گئی کہ بنو کلاب اور بنو ہوازن نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ لیکن وقت آنے سے قبل یہ بنو کلاب کے ظہم دستم کا نشانہ بنے اور ان کی مظلومی ہی فتح مکہ کی محرک بنی۔

خزاعہ کی ایک شاخ بنو اسلم تھے۔ ان کے نام حضور کا جو پروانہ ملتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ نسبتاً پہلے ہی سے اسلام میں داخل اور اسلامی ریاست کے زیرِ نگیں ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو مدینہ میں ہجرت کر کے آئے تھے۔ اس خاندان کے سردار الحصین بن اوس کو حضور نے جاگیر بھی عطا کی تھی۔ جو حلیفانہ تعلقات کی محکم کی دلیل بھی ہے اور اس سے متعلقہ علاقہ کا الحاق مدینہ سے ہونا بھی متبادر ہوتا ہے۔ بنوک کے شمالی علاقے میں جذام، قضاعہ اور عذرہ کے قبائل آ رہے تھے۔ جنہوں نے اپنے مخالفانہ رویے سے خاصی مشکلات اسلامی حکومت کے لیے پیدا کی تھیں۔ ان لوگوں نے مدینہ کے سفیر کو بوٹ لیا تھا۔ پھر تاریخی مہم ان کے خلاف بھیجی گئی۔ اس مہم کی زد میں غلطی سے بعض بے تصور لوگ بھی آئے۔ پس یہ لوگ مدینہ میں فریاد لے کے آئے اور تلافی کی گئی۔ اس طرح تعلقات کی راہیں بھی کھلیں۔ حضور کی دستاویزات میں ایک مکتوب رفاع بن زید جذامی کے نام ملتا ہے جس میں بڑا بھاری الٹی میٹم ہے۔ اس سردار کو مخاطب کر کے اس کی ساری قوم کو متنبہ کیا گیا ہے کہ یا تو وہ اسلامی دعوت کو قبول کر کے اللہ اور رسول کی جماعت میں شریک ہو جائے ورنہ رد گردانی کرنے کی صورت میں درماہ کی امان ہے۔ حالات کا اس پنج سے ارتقا باآخر جس صورت پر منبج ہوتا ہے۔ وہ یہ تھی کہ حضور کی بنوک سے واپسی پر سہ ماہک بن احمد جذامی نے مدینہ میں آکر حضور سے ملاقات کی۔ اور پروانہ حاصل کیا۔ اس پروانہ میں وہ شرائط درج ہیں جو معمولاً صرف مسلم قبائل کے لیے ہوتی تھیں، یعنی ان لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اسی طرح قضاعہ کا ایک سردار بریدہ بن الحصبیب کسی مہم کے دوران میں حضور سے مدینہ کے باہر ہی ملا اور اس نے اپنی قوم کی طرف سے قبولِ اسلام کا قول دے کر پروانہ حاصل کیا۔

سہ ماہ میں قبیلہ کلاب کی طرف حضور نے عبدالرحمن بن عوف کو ایک دعوتی مہم پر بھیجا۔ نتیجہ حسبِ مشاہد

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی۔ از ذاکر حمید اللہ صدیقی۔ مضمون عام قبائل عرب سے تعلقات۔

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

اور سردار نے اظہارِ وفاداری اور استحکامِ رابطہ کے لیے اپنی بیٹی کا نکاح عبدالرحمن بن عوف سے کر دیا۔ اسی طرح بارگاہِ نبوی سے ایک پروانہ کلبیوں کے نو مسلم سردار حارثہ بن قطن کے نام جاری ہوا۔ جو دومتہ الجندل کے قرب و جوار کے کلبیوں سے متعلق ہے۔ خود اکبدر (دالی دومتہ الجندل) سے معاہدہ ہوا۔ اختلافِ روایات ہے۔ کہ آیا وہ اسلام لایا یا بغیر اسلام لائے جزیرہ دینے کی شرط پر سرداری پر بحال رکھا گیا۔ بہر حال بعد میں اس نے اپنے اسلام یا معاہدہ اطاعت سے انحراف کیا اور حضرت خالد کے ہاتھوں قتل ہوا۔ بعد میں اس کے قلعے اور افتادہ زمینوں کو اسی کلبی سردار حارثہ بن قطن کی تحویل میں دے دیا گیا۔

اہل طائف کے عمومی قبولِ اسلام سے قبل عمرو بن عبداللہ مبنی اسلامی تحریک کے علمبرداروں میں آئے حضور نے ان کو اس علاقے میں فوجی کارروائیوں کے لیے کمانڈ تفویض کی۔ حضور ہی کے اذن سے انہوں نے جریش کے قلعے کا محاصرہ کیا۔ جو معاہدہ صلح پر منتج ہوا۔ مصالحت کے بعد یہاں کی گورنری ابوسفیان کو سونپی گئی۔

بنو ازد جو عمان شہر میں آباد تھے اور عبید اور جعفر نامی دو اشخاص ان کے رئیس تھے ان کی طرف عمرو بن العاص حضور کا نامہ دعوت لے کے شہر میں گئے۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

ہم نے ان قبائل کا تذکرہ آئندہ اوراق کے لیے مؤخر کر دیا جنہوں نے عام الوفود میں بطور خود مدینہ میں وفود بھیج کر اسلام قبول کیا یا کم سے کم حکومتِ مدینہ کی سیاسی اطاعت اختیار کی۔

علاوہ ازیں فوجی کارروائی کے نتیجے میں جہاں کہیں کسی گروہ نے اطاعت قبول کرنے یا مصالحت کرنے کی خواہش کی وہاں فوراً اس کے لیے راستہ دیا گیا۔ مدینہ کی مستقل اصولی پالیسی یہ تھی کہ جو محارب بھی صلح کا خواہاں ہو اس کی خواہش امن کا احترام کیا جائے۔ چنانچہ متعدد قبائل نے میدانِ جنگ میں اترنے کے بعد یا تو سیاسی اطاعت اختیار کی یا اسلام قبول کیا۔ اس سلسلے کی ایک نمایاں مثال عمیر اور ثحفة علاقہ کے یہودیوں کی ہے کہ مفتوح ہونے پر جب انہوں نے وہیں رہنے کی درخواست کی تو شرائط طے کر کے ان کو رکھ لیا گیا۔

ان سارے واقعات کو سامنے رکھتے تو ماننا پڑتا ہے کہ تصادم سے بچ کر حلیفانہ تعلقات پیدا کرنا حکومتِ مدینہ کی سرگرمیوں کا اہم ترین شعبہ تھا اور حضور اور آپ کے رفقاء نے بہت ساری ہمت اسی شعبہ کار

۱۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی۔ از ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی۔ مضمون۔ عام قبائل عرب سے تعلقات۔

۲۔ ایضاً

۳۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم شبلی نعمانی ج ۲ ص ۳۳

کے لیے اٹھائیں اور متعدد سفر کیے۔ یہ سرگرمیاں اسلامی ریاست کے امن پسندانہ نقطہ نظر کا بڑا بین ثبوت ہیں۔ پھر اس معاملے میں حضورؐ نے ایک اصولی و نظریاتی ریاست کے تقاضے سامنے ہونے کے باوجود پالیسی میں یہاں تک وسعت رکھی کہ اسلام نہ لانے والے قبائل کی طرف سے محسن سیاسی عیسیٰ کو بھی قبول کر لیا۔ اور متعدد مصروفوں میں غیر مسلم سرداروں اور حاکموں کو اپنی طرف سے مامور یا بجال فرمایا۔ وغیرہی تھا کہ تصادم کے مواقع کم سے کم رہ جائیں۔ بعد کا یہ فیصلہ تو بہت سارے تلخ تجربات کی روشنی میں کیا گیا۔ کہ کم سے کم جو سرزمین اسلامی تحریک کے گھر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے ماتوں کو پاک اور پُر امن رکھنے کے لیے اسے مخالف عناصر سے خالی کر لیا جائے۔ ورنہ ان کی فداکارانہ حرکات سارے کام کا نتیجہ خراب کر دیں گی۔

اوپر کے رد ہنگامہ کا تجزیہ کر کے دیکھیں تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ جہاں کہیں اسلام پہنچتا وہاں سے مدینہ کو سیاسی اور امت از خود محاسن ہوتی۔ اور اسی طرح جہاں کہیں سیاسی سلبینی یہ تعلق قائم ہو گیا۔ وہاں بھی کچھ ہی مدت میں اسلام کا چہرہ لہرے لگا۔ اس کی وجہ تو ہر جگہ کہ قبائل کا نسب مدینہ سے میل جول بڑھتا ہوا تو وہ اسلامی نظریہ سیاست کے احیاء اور نہ کی آنکھوں سے دیکھ کر متاثر ہوتے ہوں گے نیز ان کے مذہبی تحریک کے کارکنوں کو دعوتی کام کرنے کے لیے یہ سب فائدہ مند بن جاتی تھی۔ اور یہی سیاست کی یہی وحدت، وحدت نے دن باندہ لاکھ مربع میل علاقے کو چند برس میں اسلام کے رنگ میں رنگ دیا۔

### (۳) معاہدہ حدیبیہ :

حضورؐ کی اسلامی تحریک کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریخی ایک ایسا واقعہ ہے جس کے نتیجے میں اسلام کے دھارے نے ایک ہم ترین موزمٹ۔ اور تحریک کو ایک نئی جست سکا۔ نئی وسیع سے عمومی دور میں داخل ہو گئی۔ محسن انسانیت کی سیاسی بصیرت کی نشان دہی اس واقعے سے ہوتی ہے کہ درجہ اولیٰ معاہدہ اور ہجر جنگ کی فتنہ کو حضورؐ نے اس آسانی سے مصالحت پر تیار کر لیا۔ اور اس کے پختہ کسی ہونے سے لیے باندھ دیئے۔

تقداری و اجاوت کے برعکس جو وہاں فساد پیدا ہوا اور اس کے نتیجے میں جہاں جہاں اسلام کو مدینہ پہنچا۔ وہاں بھی ان کے درمیان اور فتنوں کے نکالنے کے سبب سے شکر جمع کر کے مدینہ کے سامنے

۱۔ اس عنوان کا مواد جمع کرنے میں مسک دین لکھنؤ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ حضرت بن مشرک اور صفور دی خانہ کعبہ  
۲۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہما نے مدینہ سے شکر جمع کر کے مدینہ کے سامنے  
۳۔ مدینہ سے مدینہ کے درمیان اور فتنوں کے نکالنے کے سبب سے شکر جمع کر کے مدینہ کے سامنے

لاکھڑے کیے تھے۔ جنگِ احزاب سے بخیریت عہدہ برآہوتے ہوئے حضور کے سامنے یہ سچیدہ مسئلہ آگیا کہ کیسے اس دوسرے محاذ کو توڑا جائے۔ موجودہ حالت میں مکہ کی طرف اقدام کریں۔ تو خیبر کے یہودی اور بنو غطفان میں پرچھٹائی کر سکتے تھے۔ اور اگر خیبر کی طرف متوجہ ہوں تو قریش دھاوا بول سکتے تھے۔ یہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ دور رس کا کتنا صحیح اندازہ تھا کہ ان دونوں میں سے خیبر کا محاذ ایسا محاذ تھا جسے ایک ہلہ میں توڑا جاسکتا تھا۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ دونوں میں سے قریش مکہ ہی کو باسانی صلح پر آمادہ کیا جاسکتا تھا۔ درحقیقت قریش کی قوت اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اور اگرچہ وہ ظاہراً برابر شورا شوری دکھا رہے تھے۔ لیکن اب تابِ مقاومت کچھ زیادہ تھی نہیں۔ پھر مکہ اور اس کے آس پاس حضور کے حامی عناصر موجود تھے جن کو آپ کے بعض اقدامات نے مضبوط کر دیا۔ حضور نے قحط کے دنوں میں مکہ کو غلہ اور نقدی سے مدد دے کر وہاں کے غرباء اور عوام کے دلوں میں گھر کیا تھا۔ چنانچہ ابوسفیان نے کہا بھی تھا کہ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے لوگوں کو ان طریقوں سے مدد دینا چاہتے ہیں۔ پھر حضور نے ایک اقدام یہ بھی فرمایا کہ مکہ کے سردار اعلیٰ ابوسفیان کی صاحبزادی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ازدواجی رشتہ جوڑا۔ یہ شادی بڑا اہم سیاسی نتیجہ رکھتی تھی۔ بہر حال اب کسی طریقے سے ایک نئے اقدام کی ضرورت تھی۔ جس پر حضور برابر کاوش کرتے رہے۔

ادھر ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو مکہ سے بچھڑے ہوئے چھ برس ہونے کو آٹے تھے۔ معاملہ محض حبِ وطن ہی کا نہ تھا بلکہ کعبہ دعوتِ ابراہیمی کا مرکز تھا۔ اور اسی دعوتِ ابراہیمی کی تجدید اب مسلم جماعت نے کی تھی۔ اس جماعت کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو اپنے اعتقادی مرکز سے منقطع رکھ سکے۔ قریش اب تک راستہ نہیں دے رہے تھے اور بظاہر کشمکش کا آخری فیصلہ ہونے کے لیے لمبی مدت درکار تھی۔ اس پہلو سے جذبات آہستہ آہستہ مضطرب ہو رہے تھے۔ ضرورت تھی کہ جماعت اسلامی کی طرف سے حرم پر اپنے حق کا اظہار ہو۔

اسی اثنا میں حضور کو ایک بڑا نئے صادقہ میں حج کرنے کا اشارہ ہوا۔ بس وہ اشارہ پلتے ہی آپ کی بے مثل بصیرت نے بہترین لائحہ عمل بہترین وقت میں اختیار کیا۔ اور اسے بہترین شکل میں جامد عمل پہنایا۔ آپ نے ایک بڑی جماعت کو ساتھ لے کر حج کے حرام مہینوں میں عمرہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۴ سو افراد جو اپنی خوشی سے تیار ہوئے صرف ان کو ساتھ لیا۔ نمیلہ ابن عبد اللہ لیسلی کو مدینہ میں نیابت سونپ کر مسلمانوں کی کافی تعداد بغرنی حفاظت میں رہنے دی۔ قربانی کے سٹر اوٹ ساتھ لیے۔ جنگی ہتھیار نہیں لگائے گئے۔ روانگی بڑی خاموشی سے ہوئی۔ مقام ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانیوں کو نشان زد کیا گیا۔

یہ سفر ایک طرف مذہبی بھی تھا۔ اور دوسری طرف اس میں بڑا زبردست سیاسی پہلو بھی از خود شامل تھا

دین دیاست کا یہ ایک تو ہمیں حضور کے سارے کارنامہ حیات میں ملتا ہے۔ پھر حج کے سفر میں ذیوی کا روبرو باسیسی اقدامات کا شامل کرنا شرعاً بالکل روا ہے۔ سو یہ سفر قریش کے لیے ایک بھاری چیلنج بن گیا۔ اگر وہ ان نازین حرم کی مزاحمت نہ کریں تو گویا مکہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے لیے کھل گیا۔ پھر حضور ادران کے رفقہ کے حرم میں آنے سے بہت ہی گہرے اثرات شہروالوں پر پڑ سکتے تھے۔ کیونکہ اسلامی انقلاب کے ان داعیوں کی آمد سے پھیلی تاریخ دعوت کے ان سارے نقوش میں جان پڑ جاتی جو ذرے ذرے پر ثبت تھے پھر عوام میں یہ چرچا بھی پھیل جاتا کہ بس اب قریش ٹائیں ٹائیں فٹش ہو گئے۔ چنانچہ سہیل بن عمرو گفتگوئے مصالحت میں مکہ کا نمائندہ بنے کہہ بھی دیا تھا کہ اگر ہم آپ لوگوں کو حرم کعبہ میں داخل ہونے دیں تو سارا عرب یہ کہے گا کہ ہم نے آپ کی قوت سے ڈر کر راستہ کھول دیا۔

حضور کو راستہ ہی میں صورتِ حالات کا علم ہو گیا تھا۔ ایک خزاعی خبر رساں بشیر بن سفیان نے مقام عسفان پر آکر اطلاع دی کہ قریش مزاحمت کی تیاری میں ہیں۔ اور ان کا فیصلہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ علیہ وسلم، مکہ میں کبھی داخل نہیں ہو سکتے؛ آپ کو رد کرنے کے لیے خالد سوادوں کا دستہ لے کر مقام کراع الغمیم تک آچکا ہے۔ حضور نے اس پر فرمایا: یہ قریش کی بدبختی ہے! جنگوں نے ان کا کچھ مر نکال دیا ہے۔ ان کا کیا حرج ہے کہ وہ بیچ میں سے ہٹ جائیں اور مجھے اور پورے عرب کو نمٹ لینے دیں۔ اگر وہ مجھے ختم کر دیں تو ان کی مراد پوری ہوئی۔ اگر مجھے غائب حاصل ہو جائے تو وہ چاہیں تو اپنی تعداد کثیر کے ساتھ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ در نہ وہ قوت رکھتے ہیں اور اس وقت لڑیں۔ ایسا نہ ہو تو پھر خدا کی قسم میں اس حق کو لے کر جس کے ساتھ مجھے خدا نے اٹھایا ہے آخر دم تک لڑوں گا۔۔۔ یہاں تک کہ یا تو اس حق کو خدا غالب کر دے یا میری یہ گردن کٹ جائے؛ گویا آپ نے مصالحت کی راہ کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔ الٹی میٹم بھی دے دیا۔ اور قریش کی پتلی حسرت پر بھی توجہ دلا دی۔

لیکن دوسری طرف نازین کے قافلے کو رد کرنے میں بھی قریش کی پوزیشن سخت خراب ہوتی تھی۔ رائے نامہ میں مذکور ہے کہ ان لوگوں نے ایک مذہبی حق میں رکاوٹ ڈالی۔ لڑنے میں پہل کرتے ہیں تو یہ الزام سہرا آتا ہے۔ کہ حرام مہینوں کی حرمت توڑ دی۔ حضور کی طرف سے پہلے ہی سے حرم کی حرمت کا احترام کرنے اور فقط عہدہ کے لیے غیر جنگی سفر کرنے کا خوب اچھی چرچا ہو چکا تھا۔ پھر جنگی اسلحہ ساتھ نہ تھے اور قربانی کے نشان زد جانوروں کا گلہ نوعیت سفر کی شہادت دے رہا تھا۔ گویا قریش سخت پیچیدگی میں گھر گئے تھے۔ اور اس نازک وقت میں ان کا قائد اعلیٰ ابو سفیان سفر میں تھا۔ یہ حضور ہی کی نگاہ جانتی تھی کہ ساری لڑائیوں کے باوجود اس وقت قریش کے لیے مصالحت کے ماسوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اور یہی اندازوں کی صحت ہی حالات کا رخ بدلتی ہے۔ اور

اسی سے کسی کار پرواز کی بصیرت کا معیار سامنے آتا ہے۔

قریش نے پرانی ضدِ منہ کے نشے میں جلد از جلد حلیف قبائل خصوصاً احابش کی فوجیں بلدح کے مقام پر جمع کر لیں۔

فوراً ہی سفارتی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا۔ سب سے پہلے قبیلہ خزاعہ کے سردار بدیل بن ورقاء جو اسلام کے لیے حامیانہ جذبات رکھتے تھے، چند اہم ساتھیوں سمیت حضور سے آکر ملے۔ حضور نے بتایا کہ ہم صرف زیارتِ حرم کے لیے آئے ہیں اور اس کی تعظیم ہمارے مد نظر ہے، جنگ مقصود نہیں۔ قریش جنگ کے بڑے شائق ہیں حالانکہ اس میں سر اسمران کا گھانا ہے۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ قریش چند سال کے لیے مصالحت کر لیں۔ اس طرح آپ نے اسل مدعا کا بیج شروع ہی میں ڈال دیا۔ انہوں نے قریش سے جا کر بات چیت کی۔ کہ دیکھو جلد بازی نہ کرو۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جنگ کے لیے نہیں، زیارت کے لیے آئے ہیں۔ مگر سر پھرے نوجوان تو پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتے تھے۔ البتہ معمر لوگوں نے ساری بات سنی۔ پھر مکہ سے عقیس بن علقمہ سردار احابش کو بھیجا گیا۔ اس نے جب قربانی کے جانوروں کا گاہ وادی میں متحرک دیکھا تو متاثر ہوا۔ اس نے قریش کے سامنے جا کر صاف صاف کہا کہ ان زائرینِ حرم کو روکنا عیج نہیں اور ہم اس غرض کے لیے نہیں آئے۔ اس سردار کی استمالت یہ کہہ کر کی گئی کہ ذرا ہمیں اپنی شرطیں تو منوا لینے دو۔ پھر قریش نے عروہ بن مسعود ثقفی کو نمائندہ بنا کر بھیجا۔ عروہ نے کہا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر آپ نے اپنی ہی قوم کو تباہ کر دیا۔ تو یہ کونسا اچھا کارنامہ ہوگا۔ یہ جو ادبائش سے لوگ آپ نے اکٹھے کر لیے ہیں یہ چند روز میں چھنٹ چھنٹا جائیں تو آپ تنہا رہ جائیں گے۔ یہ بات سن کر حضرت صدیقِ غضب ناک ہو گئے اور ذرا سخت لفظوں میں عروہ کو ڈانٹا۔ عروہ عربوں کے بے تکلفانہ طریق پر بات کرتے ہوئے اپنا ہاتھ حضور کی ڈاڑھی کی طرف بڑھاتا تو ہر بار حضرت مغیرہ بن شعبہ تلوار کی نوک سے اس کا ہاتھ ہٹا دیتے۔ حضور نے عروہ کے سامنے بھی اپنا موقف رکھ دیا۔ اس شخص نے جو سماں دیکھا اس سے دل میں بے حد متاثر ہو کر واپس ہوا۔ اور جا کے بیان کیا کہ محبتِ اطاعت کا جو منظر وہاں میری نگاہوں سے گذرا ہے۔ وہ تو بڑے سے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں بھی نہیں پایا جاتا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے تو اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ اور ایک ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہیں۔ اس کے سامنے کوئی شخص اونچی آواز میں بولنے تک کی جرأت نہیں کرتا۔ عروہ کے اس تاثر سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ اسلامی تحریک کی قوت کا ایک راز یہ ہے کہ جماعت اپنی قیادت کس درجہ گہری محبت رکھتی ہے۔ اور کس والہانہ طریق سے اطاعت کرتی ہے۔ محبت و اطاعت کے جمع ہو جانے سے ناقابلِ فتح قوت پیدا ہوتی ہے اور جماعت میں ایسی فضا موجود ہو تو مخالفین کو مرعوب اور کمزور کر دیتی ہے۔ یہاں

محض کسی جمہوری ایسوسی ایشن کا سامعہ نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے ہیں۔ نہ صدر کو ارکان سے کوئی قلبی تعلق۔ نہ ارکان کو صدر سے کوئی روحانی علاقہ۔ بس دستور اور قاعدے کی ظاہری اطاعت کر دی گئی۔ کیا گندی فضا ہوتی ہے ان جماعتوں کی جو اپنی قیادت پر زہریلی تنقیدیں کرتی ہیں۔ غیبت اور سجوی کے محاذ کھولے رہتی ہیں اور طرح طرح کی سازشیں گانٹھتی رہتی ہیں۔ اسلامی نظام جماعت کی فضا خیر خواہی، وفاداری، اخلاص، محبت اور اہمانہ طاعت سے بنتی ہے اس میں ہر رکن کی شخصیت کی اہمیت ہوتی ہے۔ اور قائد کی شخصیت تو سب کے لیے مرکز محبت ہوتی ہے اس کے بغیر نہ رحماء بیتھو کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ علمبرداران حق بٹیان مضموم بن سکتے ہیں۔ مسلم جماعت کی یہی فضا اپنی شان کماں کے ساتھ جیبہ کے میدان میں جلوہ گر ہوتی۔ جس نے عروہ کے دل کو مرعوب کر دیا اور اس نے جا کر اسی تاثر کا پر تو مکہ کے خواص پر ڈالا۔

گفت و شنید کے اسی سلسلہ کو آگے بڑھانے کے لیے حضور نے خراش بن امیہ کو قریش کی طرف بھیجا مکہ میں لامرکزیت اور انتشار تو سقا ہی۔ کچھ لوگوں نے حضور کے اس اونٹ کو مار ڈالا۔ جس پر سوار ہو کر خراش شہر میں گئے تھے۔ خود ان کی جان بھی مشکل سے بچی اور وہ لوٹ آئے۔ پھر حضرت عثمان کو بھیجا گیا۔ ادھر سر پہرے عناصر کا ایک دستہ دیکھ بھال کے بیٹے نکلا تھا۔ ان لوگوں نے مسلمانوں سے چھیر خانی کی۔ اور تیر اور پتھر پھینکے۔ ان لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ مگر حضور نے مصلحت کے پیش نظر ان کو رہا کر دیا۔ یعنی قریش کا جنگ پسند عنصر برابر اس کوشش میں تھا کہ کس طرح سے جنگی جذبات کی بارود بھڑک اُٹھے۔ مگر خدا نے بہ لطف خاص کات ابدیہم عنکم و کفایتیکم عنہم کی فضا کو غالب کر دیا۔ حضرت عثمان کو قریش نے لیا اور واپسی میں دیر ہو گئی ناخوشگوار واقعات کی وجہ سے فضا ایسی بنتی کہ جس میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمان شہید کر دیے گئے۔ حضور نے فوراً جماعت کو اکٹھا کیا اور لڑنے مرنے کی بیعت لی۔ فرمایا کہ تم ان لوگوں سے لڑے بغیر نہ پلٹیں گے۔ حضرت عثمان کی جان اس لمحے بے حد قیمتی ہو گئی تھی۔ کیونکہ بارشاد حضور، ہر واقعہ یہ تھا کہ ”عثمان اللہ اور اس کے رسول کی تفویض کردہ نسبت پر گئے ہیں۔ اپنے آپ کو عثمان کا ہاتھ قرار دیا۔ اور اس پر دوسرا ہاتھ اپنی طرف سے رکھ کر کہا کہ قرآن بانڈھو آپ کے ہاتھ سے ہاتھ سے بھر لو۔“

تھے۔ اخلاص سے پیک پیک کر بیعت کرنے لگے۔ یہ اتفاقی لمحہ از یاد ایمان اور تعمیر کردار کا لمحہ تھا۔ اور اس وقت جماعت نے اپنے آپ کو اتنا ارتقا دے دیا کہ حضور نے فرمایا۔ ”آج کے دن تم لوگ تمام زمین والوں سے افضل ہو۔ اس لمحے کے طفیل ان کو رنائے الہی حاصل ہوئی۔ صرف ایک منافق (عبد بن قیس) تھا جو اس لمحے کی سعادتوں سے محروم رہا۔ حق کے علمبرداروں کی راہ میں ایسے بے شمار لمحات آتے ہیں اور اخلاص مند



روحیں ان لمحات سے آبیاری حاصل کرتی ہیں۔ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر چودہ سو مسلمانوں کو لڑ مرنے کی جڑا مل گئی۔ قریش کو جب اس صورتِ حالات کا علم ہوا۔ تو انہوں نے فوراً حضرت عثمان کو واپس روانہ کر دیا۔ کیونکہ فی الحقیقت لڑنے سے وہ بھی کترانا چاہتے تھے۔

پھر مکہ سے مکرز بن حفص آیا۔ رسول اللہ کی مردم شناسی ملاحظہ ہو کہ دُور ہی سے نظر پڑی تو پکار اٹھے۔ "یہ ایک مکار آدمی ہے" مراد یہ تھی کہ اس کے ذریعے معاملات کبھی بخیر و خوبی طے نہیں ہو سکتے۔ بالآخر قریش نے سہیل بن عمرو کو بھیجا۔ نظامِ حق کے داعی کی نگاہِ حقیقتِ رس نے دیکھتے ہی اندازہ کر لیا۔ کہ قریش نے اس آدمی کو بھیجا ہے تو پھر وہ صلح پر تیار ہو گئے ہیں۔ "شرائط پر ضروری بات چیت ہوئی اور معاہدہ لکھنے کے لیے حضرت علیؑ کا تب بنے۔

معاہدہ ایسے نازک حالات میں لکھا جا رہا تھا کہ بات بات پر کھپاؤ پیدا ہونے لگتا حضور نے پیرایہ آغاز کے طور پر "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" لکھنے کا حکم دیا۔ سہیل نے کہا۔ کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ رحمن درجیم کیا ہوتا ہے۔ ہمارے معمول کے مطابق "بِاسْمِکَ اللّٰہِ" لکھا جائے حضور نے یہ مطالبہ بھی قبول کر لیا۔ پھر فرمایا۔ لکھو۔ ذیل کا معاہدہ محمد رسول اللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے پایا۔ سہیل نے کہا کہ اگر میں یہ مانتا کہ آپ خدا کے رسول ہیں تو آپ کے خلاف لڑتا ہی کیوں؟ پس اپنا اور اپنے والد کا نام لکھو ایسے حضرت علیؑ۔ محمد رسول اللہ کے الفاظ لکھ چکے تھے اور فرطِ ادب میں اپنے ہاتھ سے "رسول اللہ" کے الفاظ مٹانا ان کو گوارا نہ ہوا۔ حضور نے تحریر لے کر خود یہ لفظ کاٹ دیے۔ اور ان کی جگہ "محمد بن عبد اللہ" لکھا گیا۔

سہیل کی ان زیادتیوں کو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء دیکھ دیکھ کر بیچ و تاب کھا رہے تھے مگر احترامِ رسالت کی وجہ سے دم بخود تھے۔ اب ذیل کی شرائط لکھی جانے لگیں۔

• فریقین دس سال کے لیے جنگ بندی اور صلح رکھیں گے۔

• مسلمان اس سال واپس چلے جائیں اور اگلے سال زیارت کعبہ کے لیے آئیں اور سرفت نیام کردہ تلواروں کے ساتھ تین روز حرم میں گزاریں۔

• قبائل عرب کو آزادی ہوگی۔ کہ وہ فریقین معاہدہ میں سے جس کے ساتھ چاہیں۔ حلیفانہ تعلق قائم کریں۔

• قریش کے تجارتی قافلے حدودِ مدینہ سے گزر سکیں تو ان کو امان حاصل ہوگی۔

• قریش کا کوئی آدمی اگر بلا اجازت مدینہ پہنچا جائے تو وہ واپس کر دیا جائے گا۔ اور اگر کوئی مسلمان مکہ میں آ

جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

نہیں کیا جائے گا۔

اس آخری شرط نے جذبات میں سخت ہل چل پیدا کر دی۔ پورا ذہنی ماحول سامنے آئیے تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ جماعت میں ایسے جذبات کا پیدا ہونا فطری تھا۔ اول تو سرے سے یہی صورت واقعہ کچھ کم نادر نہ تھی کہ وہ قریش جنہوں نے لوگوں کو گھروں سے نکالا۔ جنہوں نے اسلام کے علمبرداروں پر جنگ مسلحہ کر دی۔ جو آج بھی ان کو حرم سے روک رہے تھے۔ اور قربانیوں کو لوٹا رہے تھے۔ ایسے ظالم اور برسرِ جنگ مشرکین کے ساتھ یکایک مصالحت کی راہ نکالنا جماعت کے لیے بڑا کاوش طلب واقعہ تھا۔ ان کے سامنے تو ایک ہی کلیہ بد بیننا بینکم العداوة والبغضاء ابدًا حتیٰ تو منوا باللہ وحدہ۔ متناوہ تو ایک ہی میٹھے اصول کو جانتے تھے کہ وقتا تو ہم حتیٰ لاتکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ! ان کے سامنے سیدھا سا فارمولا ہی تھا کہ کلمۃ اللہ کو برتر بنا چاہیے۔ اور کافروں کے کلمہ کا سر نیچا ہونا چاہیے۔ کفر و باطل کے درمیان سمجھوتہ کی گنجائش ان کے ذہنوں میں نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اصولوں کو اگر محسن نظر یاقی اور فلسفیانہ طور پر لیا جائے تو بات دوسری ہوتی ہے لیکن جب ان کو واقعات کے عملی میدان میں سے کے موکر ہوجا جائے تو پھر وقت اور مصالح اور حریف اور حامی قوتوں کے حالات کو سامنے رکھ کر مختلف اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہوتا کہ آپ بس آنکھیں بند کر کے سیدھے ہی سیدھے ایک ہی رفتار سے بڑھتے جائیں کہیں رکتا پڑتا ہے۔ کہیں دو قدم کا لٹھا اختیار کرنا پڑتا ہے اور کہیں تیاراً تہ نکلانے کے لیے دو قدم پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ مختلف دشمنوں کو شکست دینے ہی کے مقصد سے بسا اوقات ان میں سے کسی ایک سے تاریخی مصالحت ناگزیر ہوتی ہے۔ تاریخ کے یہ وسیع عملی حقائق حضور کی نگاہوں کے سامنے تو تھے ہی لیکن جماعت کی نگاہ آپ کی نگاہ جتنی رسائی نہ رکھتی تھی۔ پھر جب اس جماعت کے سامنے بسم اللہ الرحمن الرحیم اور رسول اللہ کے الفاظ قلمزد کیے گئے تو جذبات میں خاصا درد جزر پیدا ہو گیا۔ اس سے بھی بڑھ کر جب وہ غیر مساریہ اور غیر عادلانہ شرط سامنے آئی تو صبر و ضبط بحال رکھنا مشکل ہو گیا۔ حضور اس معاہدے کے ذریعے جن بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے کی راہ نکال رہے تھے ان پر جہاں قریش کی نظر نہ تھی۔ وہاں مسلمہ جماعت بھی پوری طرح ان کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کبھی کبھار بڑی بڑی تحریکوں کے دوران کار میں ایسے نازک لمحے بھی آجاتے ہیں جب کہ قائد اور جماعت کے درمیان مستقبل کے معاملات کی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ذہنی فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ قیادت کی نگاہ زیادہ فاصلے پر دیکھتی ہے اور جماعت نسبتاً نزدیک حقیقتوں تک سوجھتی ہے۔ یہی مواقع بحران کے مواقع بن جاتے ہیں۔ اور انہی شاذ مواقع پر نسا بیلے کی حد سے بڑھی ہوئی جمہوریت خطرناک ہو جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر صرف وہی قیادت اپنا فرض ادا کر سکتی ہے جو رائے عام کا اعتماد و تعاون اس حد

تک رکھتی ہو کہ اس کا کوئی بدل نہ پیدا کیا جاسکے۔ ایسی مخلص اور مستحکم قیادت جماعت کو اہم مصالح کی راہ پر مجرد اپنی اخلاقی قوت سے کھینچ کر لے جاتی ہے اور عقلی اطمینان جماعت کو بعد کے حالات و واقعات کو دیکھ لینے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔

غضب یہ ہوا کہ عین اسی حالت میں نمائندہ قریش سہیل کے صاحبزادے ابو جندل بیڑیاں پہنے ہوئے موقع پر آ پہنچے۔ ان کو مارا پٹیا گیا تھا اور وہ مظلومی کا ایک مجسمہ تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ مجوزہ شرط کے مطابق یہی پہلا شخص ہے جسے آپ کو واپس کرنا ہوگا۔ حضور نے معاملہ سمجھانے کے لیے فرمایا۔ کہ ابھی معاہدہ لکھا نہیں جا چکا۔ سو ابو جندل کو مستثنیٰ رہنے دو۔ سہیل نے کہا تو پھر کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ پھر آپ نے زمی سے یہ بھی فرمایا۔ کہ اچھا اسے میری خاطر میرے ساتھ آنے دو۔ نہیں مانا۔ مجبوراً حضور نے اس ظالمانہ مطالبہ کو بڑے مصالح کی خاطر قبول کر لیا۔ اب ابو جندل نے جماعت کو مخاطب کر کے فریاد کی۔ کہ مسلمانو! تم مجھے مشرکوں کے حوالے کر رہے ہو جو مجھے ایمان سے ہٹانے کے لیے مجھ پر تشدد کریں گے۔ یہ اپیل اپنے ماحول میں بڑی اشتعال انگیز تھی۔ مگر حضور اس وقت ٹھنڈے مزاج کا ایک بے مثل نمونہ تھے۔ ابو جندل کو زمی سے سمجھایا۔ کہ ہم نے معاہدہ میں ایک بات تسلیم کر لی ہے تو اب ہم عہد شکنی نہیں کر سکتے۔ تمہارے لیے اور دوسرے مظلوموں کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی راہ نجات نکالے گا، ذرا صبر سے کام لو۔

جماعت کا اضطراب اس وقت آخری حد کو چھو رہا تھا اور قریش کے خلاف ساری جماعت کے جذبات مجتمع ہو کر جس شخص کے اندر کھول رہے تھے وہ حضرت عمرؓ تھے۔ ان کا کوئی ذاتی اور نفسانی معاملہ نہیں تھا ان کے اندر حمیت حق ہی کام کر رہی تھی۔ بیچ دتاب کے عالم میں انہوں نے پہلے حضرت ابو بکرؓ سے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں مکالمات کی :-

حضرت عمرؓ: "اے اللہ کے رسول! کیا آپ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟"

رسول خدا: "کیوں نہیں؟"

حضرت عمرؓ: "پھر کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟"

رسول خدا: "کیوں نہیں؟"

حضرت عمرؓ: "اور کیا وہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟"

رسول خدا: "کیوں نہیں؟"

حضرت عمرؓ: "پھر ہم دین کے معاملے میں دب کر کیوں معاملہ کریں؟"

رسول خدا ﷺ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ میں اس کے کسی حکم کو توڑ نہیں رہا۔ اور بندہ

مجھے اپنی بدد سے محروم رکھے گا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہم نے بیکن جذبات میں دیر تک کھڑا نہیں آسکا۔ معاہدہ کنعا گیا اور اس پر

حضرت عمر رضی اللہ عنہم نے بطور گواہ دستخط ثبت کر کے اعانت کی یہ باتیں مثال ہی پیش کر دی کہ شہداء پر دل مطمئن نہیں  
مگر حضور نے فیصلہ کر دیا تو پھر سرکشی بھی نہیں۔

معاہدہ ہو چکا تو حضور نے جماعت کو نحر ادا کرنا شروع کرنے اور حق دسر ہونے کے کانٹے پر کھڑے ہو کر

اور غم و اندوہ کی وجہ سے جماعت میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ دربارہ کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر

تو بھی وہی حالت طاری رہی۔ اندازہ کیجیے کہ خود حضور کی تربیت یا نئے جماعت میں سے وہ حالت کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر

تھا۔ اور سبق لیجیے کہ انسانی سرگرمیوں میں جیسے لوگوں کو عالم ہوش سے ہیں۔ حضور کو یہ کلمہ دیا کہ

قیام گاہ پر آئے۔ اور حضرت ام سلمہ سے نصیحت کی کہ لوگوں کو کراہیوں سے بچانے کے حکم دیا اور حضور نے

حضرت ام سلمہ سے نصیحت کر دی کہ معاہدہ کی شرط سے وہ معاہدہ میں پہنچے۔ اور شہداء کو کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر

عالم اصلی اللہ رب العالمین اور باہر آ کر قرآن کی تلاوت کر کے اور حق دسر ہونے کے کانٹے پر کھڑے ہو کر

پر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر

اور کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر

اندازہ لیجیے کہ جنک سے بہت اور جماعت کی مثال کا جس ایک سے جیسے کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر

حالات سے کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر

کی قرآنی اس مقصد کے لیے دی۔

آپ نے اس معاہدہ کے ذریعے حلیر مٹا، مددگار ہوا اور اس معاہدہ کے ذریعے کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر

و عرب کے درمیان برحمت سے میل جول سے کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر کھڑے ہو کر

ہوئے عزیز و قارب آگئے ہوئے ہوئے ہوئے ہوئے ہوئے ہوئے ہوئے ہوئے ہوئے ہوئے ہوئے ہوئے

مشترکین کی طرف سے سامنے آئے نہیں۔ اور مسلمان ان کو سامنے آئے ہوئے ہوئے ہوئے ہوئے ہوئے

انہیں اپنی روحانی و ذہنی علمی اور فنی اور فنی اور فنی اور فنی اور فنی اور فنی اور فنی اور فنی

آئے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہیں سادہ سادہ تہذیبی کے پسند کہ صلح حدیبیہ سے ہی لے کر کھڑے ہو کر

خوشی خوشی حق سے محاذ پر آئے تہذیبی اور فنی اور فنی اور فنی اور فنی اور فنی اور فنی اور فنی

تھی۔ حتیٰ کہ خالد اور عمرو بن العاص جیسے کلمہ کو وہ ان میں سے ہی تھے۔ کلمہ ہی حلقہ اور کلمہ ہی

ہوئے۔

دوسرا مقصود یہ حاصل ہوا کہ جنگ و جدال سے نجات پا کر جماعت کی ذہنی و اخلاقی اصلاح اور خود ریاست کے نظم و نسق کی تعمیر کا کام انجام دینے کے لیے یکسوئی حاصل ہو گئی۔ علاوہ ازیں غیر ملکی حکومتوں کو دعوت دینے کا موقع نکل آیا۔

تیسرا فائدہ یہ پہنچا کہ حکومتِ مدینہ خیبر کے معاندانہ مجاذ کا قلع قمع کرنے کے لیے قریش کی طرف سے بالکل بے فکر ہو گئی۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد فوراً ہی اسلامی حکومت اس قضیے سے فارغ ہو گئی۔

چوتھا مفاد یہ حاصل ہوا کہ عرب کے قبائل کو آزادی حاصل ہو گئی کہ ان میں سے جو بھی چاہے حکومتِ مدینہ کا ساتھ دے۔ یہ ایسا دروازہ کھلا کہ جس میں سے گزر کر نئے نئے عناصر مسلم جماعت کو تعاون بہم پہنچا سکتے تھے اور قریش کو ٹی روک ٹوک نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ بنو خزاعہ نے تو عین موقع ہی پر اسلامی حکومت سے تعلق جوڑ لیا۔

اور چوتھا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہی تھا کہ ایک ہی سال بعد بڑے بڑے ٹھانڈے سے یہی جماعت زیارتِ حرم کے لیے مکہ میں داخل ہوئی اور اس وقت قرآن کی پیش گوئی کے مطابق ”لا تخافون“ کی فضا تیسر تھی۔ سوکھنا چاہیے کہ قریش جیسے کڑے دشمنوں کو مصالحت پر لے آنا حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست کاری کا ایک نمایاں معجزہ تھا۔ اور ایک شرط میں بظاہر ذرا سادب کر حضور نے وہ فوائد اور نتائج حاصل کر لیے جن کا تصور بھی قریش اس وقت نہ کر سکے ہوں گے۔ انہیں کب یہ خیال آسکا ہوگا کہ اب ایک طرف ان کے حامی یہودیوں کا جنگی اڈا اکھڑ جانے والا ہے اور وہ اکیلے رہ جائیں گے۔ اور دوسری طرف اسلام لوگوں کو اتنی بڑی تعداد میں کھینچ لے جائے گا۔ بلکہ خود ان کے شہر میں اتنے اثرات پھیلا دے گا کہ ان کی طاقت موجودہ معیار سے بھی گر جائے گی۔ درحقیقت اس معاہدہ نے وہ راستہ بنا دیا جس پر چل کر اسلامی انقلاب کی طاقت چند برس کے اندر اندر اسی مکہ میں فائن خانہ شان سے داخل ہونے والی تھی۔

واپسی پر راستے میں ہی سورہ فتح کی آیات نازل ہوئیں۔ جن میں پچھلے واقعات پر تبصرہ تھا اور مستقبل کے مصالح کی جھلک دکھا کر مسلم جماعت کو اللہ تعالیٰ نے بشارتیں دیں۔ ان کو بتایا کہ تم عنقریب ایک ایسے معرکے (یعنی خیبر) میں فتح حاصل کرو گے۔ جس میں تم کو بہت سا مالِ غنیمت ملے گا۔ اور اس کے بعد وہ کچھ حاصل ہوگا جو اس وقت تمہاری طاقت سے باہر ہے اور جس کو اللہ ہی نے گرفت میں لے کر محفوظ کر رکھا ہے۔ پھر بتایا کہ اگرچہ مشرکین مکہ کو تم آج بھی شکست دے سکتے تھے اور وہ یقیناً پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ لیکن

ان کے درمیان ایسے مرد و زن گھرے ہوئے ہیں جو مخفی طور پر دین حق کو مان چکے ہیں۔ اور بن کے دل تمہارے ساتھ ہیں۔ اب اگر جنگ ہو جاتی تو وہ مجبوراً تمہارے مقابلے پر آتے اور تم انہیں نہ جاننے کی وجہ سے نشانہ بناتے۔ پس اللہ تعالیٰ کی یہ خاص مہربانی ہوئی کہ اس نے دونوں گروہوں کو تکرار سے روکا خصوصاً وہ لمحہ یاد دلایا۔ جب کہ کفر کی جانب سے حمیت جاہلیہ کا بڑا کڑا مظاہرہ کیا گیا تھا اور ”السوحمن الہیچہ اور رسول اللہ کے الفاظ تک کی کتابت گوارا نہ کی گئی۔ نیز ابو جندل کے معاملہ میں انتہائی ضد سے کام لیا گیا ایک فریق جب اس طرح کا بیڑھا رو بہ اختیار کر رہا ہے تو پھر دوسری طرف بھی نرم اور ٹھنڈے جذبات برسر کار نہیں آسکتے۔ لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ رسول اور تمہارے مسلمانوں کے اوپر اس سے سکینت اتاری تمہیں جذبوں پر قابو دیا اور تمہیں تقویٰ اور خلیفہ کے اصول پر کار بند رکھا۔ اور تم لوگ مشرکین کے مقابلے میں اسی شان کے مستحق اور اہل فخر۔ ورنہ اگر دوسرے بھی اشتعال سے کام لیا جاتا تو تصادم ہو جاتا اور وہ سارے مصالح ختم ہو جاتے جو نہایت آسانی سے حاصل ہو رہے تھے۔

سورۃ فتح کا آغاز اس کلمے سے ہوتا ہے کہ ”انما فتحنا لک فتحاً مبیناً“ حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ فتح مبین ہے حضور نے فرمایا: ”اس یہ فتح مبین ہے۔ گویا واقعات کی روشنی میں قتل و غارتگری ختم ہو کر پیدا ہوئی۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے مخلصانہ جذبے میں جو جذباتی مظاہرہ کیا گیا اس کی تلافی کے لیے وہ دنوں نفل عبادت انجام دے دے کہ خدا سے عفو طلبی کرتے رہے۔ خدا اس کو اپنا پیارا بھی ہے۔ دوسری طرف حسرت ہو کر توبہ کی شان رکھنی کہ اس عمومی لمحہ اضطراب میں ان کو پورا پورا اطمینان رہا۔ اور انسانی جماعتوں کو مزاجوں کی جی رنگا رنگی ایک خاص ترکیب دیتی ہے۔ ان کا ایک سراسر اندیشہ ہوتا ہے جتنا ہے تو دوسرا سراسر فاروقی انداز سے۔

اب جیسے کہ کیسے معاہدہ کی وہی دفعہ تشریح کے لیے وہاں جان بن گئی۔ جسے تسلیم کر لیا کہ وہ اپنا چہرہ جھکتا محسوس کر رہے تھے۔ اول تو اس کی وجہ سے مکہ میں خفیہ طور پر اسلام قبول کرنے والوں کا حلقہ تدریجاً بڑھنا گیا اور ان کی وجہ سے قریش کی اجتماعیت کھو کھلی ہوتی گئی۔ دوسری طرف ایک بہت ہی سنگین واقعہ پیش آیا۔ ابوبصیر عقبہ بن اسید کسی نہ کسی طرح مکہ سے نکلے اور مدینہ جا پہنچے۔ ان کو لینے کے لیے قریش نے دو مہربان کا وفد بھیجا۔ حضور پابندی عہد کے اہل اصول سے خبر رکھتے۔ سو ابوبصیر کو لوٹا دیا گیا۔ آپ نے ابوبصیر کو بھی وہی تاکید کی کہ تم لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی راستہ نکالے گا۔ چاروں چار ابوبصیر لوٹ گئے۔ راستہ میں موقع پا کر انہوں نے دو میں سے ایک نگران کو اسی کی تلوار سے قتل کر دیا اور خود بھاگ کر مدینہ آ گئے۔ دوسرا نگران پھر شکایت لے کر آ موجود ہوا۔ ابوبصیر نے حضور کے سامنے وناحت کر دی کہ آپ نے اپنا عہد نبھا دیا اور مجھے

دشمنوں کے سپرد کر دیا۔ لیکن میں اپنے آپ کو مشرکوں کے سپرد کر کے ایمان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ سو میں نے اپنی ذمہ داری پر یہ اقدام کیا ہے۔ آپ پر کوئی ذمہ داری ہے ہی نہیں۔ خدا نے مجھے بچا لیا۔ حضور نے بڑے پر معنی طریق سے فرمایا "اسے کچھ آدمی مل جائیں تو یہ تو جنگ بھڑکا دے گا۔" ابولبصیر کو اندیشہ ہوا کہ شاید مجھے پھر مکہ روانہ کر دیا جائے اس لیے وہ چپکے سے مدینہ سے نکل کر ساحلِ سمندر کی طرف مقامِ عیص (قریب بہ ذوالمرہ) جا پہنچے۔ اور وہاں ڈیرہ ڈال دیا۔ بعد میں ابو جندل بھی وہیں آگئے پھر مکہ سے اور لوگ بھی نکلتے اور سیدھے ساحل کا رخ کرتے۔ ہوتے ہوتے ستر جوانوں کا دستہ یہاں جمع ہو گیا۔ مکہ والوں سے ان کی اصولی کشمکش بھی تھی۔ اور ذاتی مظلومی کا جذبہ انتقام بھی تھا۔ اور یہ حکومتِ مدینہ کے شہری بھی نہ تھے کہ ان پر معاہدہ کی ذمہ داری ہوتی۔ یہ گویا ایک "آزاد اسلامی محاذ" تھا۔ ان لوگوں نے قریش کے قافلوں کی مزاحمت شروع کی۔ یہاں تک کہ قریش عاجز آگئے۔ سو انہوں نے خود ہی درخواست کر کے معاہدہ سے اپنی مجبوری منسوخ کروائی۔ بعد ازیں ان نوجوانوں کو حضور نے مدینہ بلا لیا اور نو مسلموں کے لیے مکہ سے ہجرت کرنے کا راستہ بالکل کھل گیا۔

ایک اہم مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب اہم کلثوم جو مکی سردار عقبہ ابن ابی معیط کی صاحبزادی تھیں ہجرت کر کے مدینہ آ پہنچیں۔ ان کو واپس لے جانے کے لیے ان کے در بھائی عمارہ اور ولید بھی ساتھ آگئے۔ معاہدہ حضور کے سامنے آیا۔ تو بحکمِ الہی آپ نے اہم کلثوم کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک اصولی مسئلہ کی خواتین کو دشمن یا مخالف کے سپرد کرنے کا معاملہ مردوں سے بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے اس انکار میں ایک ایسا اخلاقی وزن موجود تھا۔ اور معاہدہ کے الفاظ بھی ایسے عمومی سے تھے کہ عورتوں کے مسئلہ میں تعبیری اختلاف کی گنجائش نکلتی تھی۔ اس لیے جب دونوں بھائی واپس پہنچے تو قریش نے اس صورت کو قبول کر لیا۔ حضور نے سورہ ممتحنہ کے احکام کے تحت اسی انکار کے ساتھ چونکہ چند اور فیصلے کیے تھے کہ ایک تو مسلمان اپنی ان سابق کافرہ بیویوں کو طلاق دے دیں۔ جو مکہ میں تھیں اور دونوں طرف سے مہر ادا کیے جائیں۔ اس لیے بحیثیتِ مجموعی یہ معاملہ قریش کو بھی اچھا معلوم ہوا۔

یہ کتابہ تاریخی معاہدہ جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بجائے خود فتحِ عظیم کی حیثیت رکھتا تھا اور جس تک قریش کو لانے اور اس سلسلے کے جملہ پیرزنیج مراحل کو طے کرنے میں حضور نے ایسی سیاسی حکمت اور فائدانہ بصیرت کا مظاہرہ کیا۔ جس سے بعد والوں کو تا قیامت رنجانی ملتی رہے گی۔ یہ مصالحت حضور کی سیاستِ کاری کا ایک بے مثل شاہکار ہے۔

## عمرۃ القضا :

معاہدہ میں طے تھا کہ اس سال مسلمان واپس چلے جائیں اور اگلے سال آکر زیارت کر لیں۔ چنانچہ دوسرے سال ۶۱۰ھ میں حضور نے رفقاء سمیت مکہ کا رخ کیا۔ یہ سفر بھی اگر مرتبہ اول میں دینی تھا تو مرتبہ دوم میں سیاسی۔ اس سے گہرے اثرات فضا میں مترتب ہوئے۔ اور اس کی وجہ سے اسلام کا نفوذ نہ صرف مکہ میں بڑھ گیا۔ بلکہ مکہ کے عرب میں بھی مسلمانوں کا حرم میں آزادانہ داخلہ نہایت اچھے ذہنی اثرات کا موجب ہوا۔

دو ہزار افراد - وگھوڑوں اور قربانی کے ساتھ (یا اسی) اونٹوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اسلحہ کا ذخیرہ بند حالت میں ساتھ لیا گیا۔ مگر آگے جا کر مقام یحج میں رکھ دیا گیا۔ بروئے معاہدہ قریش کو تین دن کے لیے مسلمانوں کے لیے حرم بالکل کھول دینا پڑا۔ بعض کٹر منافقین تو شہر چھوڑ کے بدرجہل قبیقعاں وغیرہ کی طرف چلے گئے تاکہ اس منظر کو دیکھنے نہ پائیں۔ لیکن عام باشندے عورتیں اور بچے دار اندر وہ کے پاس سنہ باندھے کھڑے تھے اور اس انقلابی طاقت کا نظارہ کر رہے تھے۔ جس نے مکہ ہی کی فنڈوں میں ابتدائی نشوونما پائی تھی۔ داخلہ اس شان سے ہوا۔ کہ عبداللہ بن ربیعہ حضور کی سواری کی باگ تھامے ہونے آئے۔ ایک رجز یہ گیت الاپ رہے تھے چند بول یہ تھے :-

باسمک لذی لادین لادینہ۔ باسمک لذی محمد رسولہ۔

اس مستی کا نام ہے کہ ہم داخل ہوتے ہیں جس کے دین کے مدد کوئی دین نہیں۔ اس ہستی کا نام ہے کہ ہم داخل ہوتے ہیں۔ محمد اسمی اللہ نعیمہ وسلم جس کے رسول ہیں۔

خلوبنی الکفار عن سبیبہ۔ فدا نورا سرجمن فی تائبہ۔

کفار کی اولاد اس کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ ارجمن سے اپنی نازاں رو کہ کتاب میں تعمیر دی ہے۔

بان خیر القتل فی سبیلہ۔ یارت فی مسو من بقیہ۔

کہ بہترین جنگ وہ ہے جو خود اسی کی رہ میں لڑی جائے۔ اے میرے پروردگار! میں تیرے نبی کے گناہوں پر ایمان رکھتا ہوں۔

گیت ہی گیت میں پوری دعوت حق بیان ہو رہی تھی جس کی لونچ سے مکہ کی فضا میں برسوں سے نئی ہو چکی تھیں۔ اس میں جہاد تک کا رجز شامل تھا اس میں رحمن کے اسی پیارے نام کی پکار ہو رہی تھی جس سے قریش کو چڑھتی۔ اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان ہو رہا تھا۔ اسلام دشمن طاقت کو چڑھتی نڈر سے کما جا رہا تھا کہ اس رسول کے راستے سے ہٹ جاؤ۔ مزاحمت چھوڑ دو۔ آج کوئی نہ تھا جو مکہ میں رکاوٹ ڈال سکے۔ معاہدے نے ہاتھوں اور زبانوں کو باندھ رکھا تھا۔



حضور نے داخلہ کے وقت جماعت کو حکم دیا کہ خوب مونڈھے کھول کر اور سینہ تان کر چلو اور پھیل پھیل کر طواف کرو۔ تاکہ اس پروپگینڈے کی تزیید ہو جائے کہ مہاجرین کی حالت بھوک اور بخار نے پتلی کر رکھی ہے۔ اس وقت دشمنوں کو سرخوب کرنا ضروری تھا۔ حضور نے کیا خوب فرمایا کہ بد خدا کی رحمت ہو اس شخص پر جو آج کفار کے سامنے قوت کا اظہار کرے۔ اسی مصلحت سے آپ استلام کربن یانی سے استلام رکن اسود تک نرم چال (مشی) چلتے اور اس حصے میں دیکھنے والا مجمع اوجھل ہو جاتا۔ پھر بعد کے دور میں ہکی دوڑ (سروں) لگاتے اور یہی حصہ مجمع کے سامنے تھا۔ معلوم ہوا کہ مخالف حلقوں میں علمبرداران اسلام کی کمزوری (خواہ وہ جسمانی ہو) کے چرچوں کو روکنا اور ان پر قوت و شوکت کے مظاہرے سے رعب ڈالنا اسلامی سیاست کی ایک اہم حکمت ہے یہ اتنی اہم حکمت ہے کہ عین حرم میں اور عین دوران طواف میں بھی اس کو ملحوظ رکھا گیا۔ یہ مظاہرہ قوت کبر و غرور کی تعریف میں نہیں لایا جاسکتا۔ بلکہ یہ عین کارِ ثواب ہے۔ ایسے موقع پر اگر فرد تنی اور انکسار دکھایا جائے تو وہ بالکل الٹا پڑے۔ ان چھوٹے چھوٹے امور سے شہادت ملتی ہے کہ حضور وقت و وقت کے سیاسی تقاضوں پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے۔ اور ان کو پورا کرنے کا کتنا اہتمام کرتے تھے۔ آخر یہ سیاست ذاتی جاہ کے لیے نہ تھی خدائی نظامِ عدل کی سر بلندی کے لیے تھی۔ اس لیے سراسر دین تھی اور اس کا ہر اقدام ایک عبادت تھا۔ غور کیجیے کہ نظامِ حق کے داعیوں کی اس جماعت کو جب مکہ کا مجمع دیکھ رہا ہو گا تو مردوں اور عورتوں اور بچوں پر کیسے کیسے اثرات پڑ رہے ہوں گے۔ خیال آتے ہوں گے کہ یہ اسی دین کی فصل ہے جس نے مکہ سے آغاز کیا تھا۔ اور پھر غارِ حرا، خانہ ارقم، شعب ابی طالب اور الندوہ اور غارِ ثور کے تاریخی مقامات ان کے سامنے سر اٹھا اٹھا کر کہتے ہوں گے کہ دیکھو نیکی کی یہ طاقت کتنی عظیم ہے اور تم اس کے مقابلے میں کتنے فرد تر ہو کے رہ گئے ہو۔ مکہ کی گلیوں کے فترے تڑپ کے اٹھے ہونگے اور ان لوگوں سے کہتے ہوں گے کہ یہ وہ صبر کیش لوگ ہیں۔ جن کو تم نے بغیر کسی جرم کے کئی سال تک دکھ دیے تھے، دیکھو کہ آج وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے کتنے ہی کانٹوں نے سر اٹھا کر کہا ہو گا کہ تم نے ہماری نوکوں سے ان جسموں کو اذیت دی تھی۔ پھر کہیں سے حضرت ابوذرؓ کی کلمہ کی وہ پہلی پکار کعبہ سے گونجنے لگی ہوگی جس پر منگامرچ گیا تھا۔ کہیں سے حضرت بلالؓ کی اعداد کی صدا میں بلند ہونے لگیں ہونگی جو پیتی ریت کے بستر پر پڑ کر دل سے اٹھتی تھیں۔ دارالندوہ چھیننے لگا ہو گا کہ تم لوگوں نے جس کے قتل کی سازشیں کی تھیں اس کا پیغام گوشے گوشے میں تبدیلی لا رہا ہے۔ تیرہ برس کی تاریخ ہر چہار جانب سے اُٹ پڑی ہوگی۔ اور پھر بدر اور احد میں کام آنے والوں کی یادیں خونیں پیراہن سجائے نمودار ہوتی ہونگی۔ اور ان کی رگوں سے صدا اُٹھی ہوگی کہ تم بھی جاگو۔ تم بھی بدلو۔ تم بھی آگے بڑھو اور اس سبیل رداں میں شامل ہو جاؤ۔

ایک طرف اس جماعت کے طرز عبادت کا مظاہرہ ہوا ہوگا۔ اور دوسری طرف یہ اخلاقی مثال قائم ہوئی ہوگی کہ اتنی بڑی تعداد شرمکے میں تین دن تک موجود رہی لیکن باوجود سخت عناد کے کسی کے جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ گھر جس طرح مقفل کر کے مشرکین باہر نکل گئے تھے۔ اسی طرح صحیح سلامت رہے۔ اسلام کے حامی عناصر جو مکہ میں ایمان چھپاتے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں اس نظارے سے کیسی ٹھنڈی ہوئی ہوگی۔ ان کے جذبوں کو ایک نئی طاقت ملی ہوگی۔ ان کے اندر تازہ امیدیں ابھر آئی ہوں گی مخالفین اپنے آپ کو کتنا ہنسنا ہوا محسوس کر رہے ہوں گے۔ اور ان کی آنکھوں کے سامنے کتنا تاریک مستقبل ہوگا۔

تین دن تک شہر کی فضاؤں میں یہ گھٹا موقی برساتی رہی۔ چوتھے روز سہیل بن عمرو اور خویط بن عبد العزیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ جب کہ آپ انصار کے درمیان بیٹھے بات چیت کر رہے تھے سہیل نے کہا کہ تین دن پورے ہو چکے اب میری زمین سے نکل جاؤ۔ سعد بن عبادہ اس طرز خطاب پر ضبط نہ کر سکے۔ انہوں نے کہا: زمین نہ تیری ہے نہ تیرے باپ کی۔ ہم ہرگز نہ نکلیں گے۔ حضور نے فوراً ہی فنا کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ذرا لطیف انداز گفتگو اختیار کیا۔ حضور نے حضرت میمونہ سے سی موقع پر نکاح فرمایا تھا فرمایا کہ دیکھو ہم نے یہاں سے نکاح کیا ہے۔ کیا حرج ہے کہ ذرا کھانا و ٹاپک جائے۔ ہم بھی کھائیں اور آپ لوگ بھی شریک ہوں۔ اس فقرے میں کئی پہلو تھے۔ مگر ان کی کثافت مزاج میں فرق نہ آیا۔ کہا گیا کہ ہمیں کھانے دانے کی ضرورت نہیں۔ بس آپ چلے جائیے۔ وہ بچارے بھی کیا کرتے۔ دیکھ رہے تھے کہ ساری دنیا متاثر ہو رہی ہے۔ ان کے اصرار کی وجہ سے حضور نے جماعت کو کوچ کا حکم دیا۔ چلتے وقت حضرت حمزہ بن عبد المطلب کی چھوٹی سی بچی یا عم! یا عم! پکارتی دڑی دڑی آتی اور آپ سے لپٹ گئی۔ کیا ہی رقت آمیز سماں ہوا حضور نے اس بچی کو ساتھ لے لیا۔ اور کسی قدر نزاع کے بعد اپنی خالہ کے سپرد کی گئی۔ جو زید بن حارثہ کی بیہقیس اب یاد کیجیے اس واقعہ کو کہ حرمیہ سے واپسی میں حضور پر اعتراض ہوا تھا کہ آپ نے تو فرمایا تھا کہ ہم حرم میں داخل ہوں گے اور طواف کریں گے۔ سو اس کا مدعا یہ تھا کہ ایسا ہوا تو نہیں بل حضور نے جو سب دیکھا ہے اس نے یہ کب کہا تھا کہ اسی سال! — اور اگر واقعی سچ ہے وہ بات پوری ہی ہوتی تو اس شان سے نہ ہوتی بلکہ خون خرابے کے ساتھ ہوتی۔ ایک سال کا فاصلہ شریکوں کی تاریخ میں ایک لمحہ کی سی نوعیت رکھتے۔ ذرا سے وقفے کے بعد بے خوفی کی حالت میں اور پوری آن بان سے حرم میں داخلہ اور عمرہ کا ہونا بے حرج برکات رکھنا تھا۔

پھر حسب اس واقعہ کا قبائل عرب میں چرچا ہوا ہوگا تو رانے عام اس تبدیلی حوں کے جو سال متاثر ہوئی

ہوگی۔ لوگ محسوس کرتے ہونگے کہ جس مکہ سے مسلمانوں کو نکال گیا تھا، اس میں وہ سینہ تانے اور مونڈھے کھولے داخل ہوئے۔ جو قریش مسلم جماعت کو مٹا دینے کے ورپے تھے، انہوں نے اسی سے مصالحت کر کے اپنے آپ کو بے بس کر لیا۔ اس سے یہ انداز نے لازماً باندھے گئے ہونگے کہ مستقبل مدینہ کا ہے! ظاہر بات ہے کہ لوگوں کے دروازے اسلام کے لیے اور زیادہ کھل گئے ہونگے۔

مختصر یہ کہ عمرۃ القضا بھی اسلام کے فروغ میں بہت مدد ہوئی۔

### جہاد کا اثر رائے عام پر :

بسیا کہ ہم ادھر ادھر سے زور سے یہ بات واضح کر چکے ہیں کہ تحریک اسلامی اور جاہلیت کے درمیان اصل معرکہ رائے عام کے وسیع میدان میں ہوا، مسلسل اٹھارہ بیس برس جاری رہا اور اسی وسیع میدان میں آخری فیصلہ بھی ہوا۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مسلم جماعت کے معرکہ ہائے جہاد کا سرے سے اس فیصلے کے ہونے میں کوئی دخل ہی نہ تھا۔

اصلاح و تعمیر کے کلام میں قوت بجائے خود ایک اہم ضرورت ہے لیکن اجتماعی دائرے میں کوئی انقلاب آج تک بجز اس صورت کے نہیں آیا کہ اس کے علمبردار اپنے آپ کو مضبوط اور غالب و برتر ثابت کر دیں۔ اور راستہ کی رکاوٹوں کو ہٹانے اور شریکیندہ مزاحمتوں کو ختم کرنے کے لیے بوقت ضرورت قوت کا استعمال کامیابی سے کر دکھائیں۔ مجرد مذہب جسے انسانی زندگی کے صرف ایک چھوٹے سے خانے سے واسطہ ہوتا ہے، اسے لے کے چلنے تو وعظ اور فیضانِ نظر سے بڑھ کر کسی سرگرمی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اوپر کوئی سا نظام سایہ پھیلائے ہوئے ہو اور ہمیشہ معاشرت کے معاملات کسی بھی پنج پر چل رہے ہوں، لوگوں کے ذہنوں میں کچھ بھلے سے عقائد کی جگہ بھی نکالی جاسکتی ہے۔ ان کو کچھ جاپ اور منتر اور — وظیفے سکھائے جاسکتے ہیں۔ اور ان کو مسکینی و تواضع اور رحم دلی و ہمدردی جیسی خوبیوں سے بھی کسی نہ کسی حد تک آراستہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک فاسد اور ظالم نظام میں اپنی خدایات کھپاتے ہوئے اور اس کے بنائے ہوئے نہایت ہی انسانیت کش راستوں سے رزق اور مفادات حاصل کرتے ہوئے صنمیر میں جو گھاؤ پڑتے رہتے ہیں، صوفیانہ طرز کے انفرادی مذاہب اور ان کے بنائے ہوئے پیری مریدی کے ادارے ان کو ساتھ کے ساتھ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیتے رہتے ہیں۔ اور ان پر مرہم لگے پچا ہے رکھتے ہیں۔ بدترین تمدن کے اندر چھوٹا سا گوشہ عافیت نکال لینے والے مذاہب بھی درحقیقت انسان کے ذوقِ فراریت کی تخلیق ہیں۔ وہ اجتماعییت کے دائرے میں بڑے بڑے جرائم کرنے اور خونناک مظالم میں حصہ لینے کے بعد انفرادیت کی کٹیا میں بیٹھ کر اپنے خدا کو راضی کرتا اور اپنے روٹھے ہوئے صنمیر کو مناتا ہے لیکن جو دین غیر الہی نظامِ زندگی کے گاڑھے میں یادِ خارا کے مغل کا ذرا سا پیوند لگا کر مطمئن نہ ہوتا ہو بلکہ جسے پورے



بلنے جلنے کی جرات نہیں کر سکتے۔ بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی حد تک حق و باطل کا معیار ہی اس چیز کو بنا لیتے ہیں کہ دو نظریوں میں غالب و برتر کو سارہتا ہے۔ خصوصیت سے جب دعوت اسلامی ہوتی ہے طرز فکر عوام میں زیادہ بڑے پیمانے پر پھیلتا ہے۔ عوام کی یہ وہ ذہنی و نفسیاتی کیفیات ہوتی ہیں جو کسی تعمیری و اصلاحی پیغام کی قبولیت میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ اور کشمکش کے مدوجزر سے ان کیفیات میں جیسی جیسی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، دعوت کو انہی کے مطابق اپنے فروع میں سہولت یا دقت پیش آتی ہے۔ پس کسی بھی نئی دعوت کے علمبرداروں کے لیے راستہ جہی کھل سکتا ہے جب کہ وہ کشمکش میں اتنی ثابت قدمی دکھائیں اور مزاحمت قوت پر اتنے کاری دار کریں کہ عوام ایک طرف یہ محسوس کرنے لگیں، کہ پرانی قیادت کو بدلنا اور پرانے نظام کو توڑنا کوئی ناممکن عمل نہیں ہے اور دوسری طرف وہ نئی قوت سے امیدیں وابستہ کر لیں کہ اس کے بازوؤں میں اتنا بل بوتہ ہے کہ یہ ظلم اور جاہلیت کے علمبرداروں کو اچھی طرح جھنجھوڑ سکے۔ پس جب بھی رائے عام کی فضا میں ایسا تاثر چھا جاتا ہے تو ایک اصلاحی و تعمیری دعوت کے لیے دلوں کے دروازے پوری طرح کھل جاتے ہیں۔

مدینہ کی اسلامی حکومت نے قریش اور یہود کے جنگی چیلنج کا جواب جس جرات اور شجاعت سے دیا۔ اور بھر پور طریق سے دیا۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ تلوار کے زور سے کچھ لوگوں کو میدان جنگ میں اسلام کا قائل کر لیا جائے۔ بلکہ جنگ جو یا نہ مزاحمتوں سے اپنا بچاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ مطلوب یہ تھا کہ عامۃ الناس کے حوصلے بڑھیں ان کی امیدیں مدینہ کی انقلابی قوت سے وابستہ ہوں۔ وہ نظریہ اسلامی سے ایک روشن مستقبل کے ظہور کی توقع کریں۔ اور جاہلی نظام کے ٹوٹ جانے کا امکان کم سے کم ان پر واضح ہو جائے۔

چنانچہ بدر کا آدین معرکہ ہوا تو ہر چہار جانب سے لگا ہوا زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے پر لگی تھیں کہ دیکھیں پہلے تصادم میں کون کس کو پچھاڑتا ہے۔ اب جب یہ منظر عوام کے سامنے آیا ہوگا کہ مسطحی بھر مسلم سپاہی جن کے پاس ضرورت کا سامان کم سے کم حد تک بھی کمل نہ تھا، انہوں نے اپنے سے تین گنا تعداد کے لشکر جرار کو بڑی طرح زک دے رہی ہے۔ اور مکہ کے نامی گرامی سرداروں کا مع ابو جہل کے صفایا کر دیا ہے تو کیا سارے عرب میں اس محیر العقول واقعہ کی دھوم نہ مچ گئی ہوگی۔ اس کے چرچے اور تذکرے گھر گھر نہ ہوتے ہوں گے اور اس نے رائے عام پر گہرا اثر نہ ڈالا ہوگا۔ اس واقعہ سے پہلی بار عرب میں یہ امید پیدا ہوئی ہوگی کہ مدینہ کی اسلامی طاقت محض کچھ ایسے اللہ والوں پر مشتمل نہیں ہے جو ساری عمر مار کھا کھا کر خدا کی رضا اور روح کی شانتی حاصل کرنے کے لیے بھگت بن گئے ہوں۔ بلکہ اس طاقت کے ہاتھوں ایک نہ ایک دن کا یا پلٹ جانے والی ہے۔

پھر اُحد میں معاملہ برابر برابر کار ہا، تو اثرات بھی بین بین قسم کے رہے ہونگے۔ اس کے بعد خندق کا معرکہ

پیش آیا۔ تو عرب نے دیکھا کہ چاروں طرف سے لشکر کے لشکر ایک تباہ کن طوفانوں کی مانند اُڑ کر آئے۔ اور  
 مہینہ پھر مدینہ کا محاصرہ کرنے کے لیے چھنٹ چھنٹا گئے۔ جیسے مٹھی بھر بھوسے کو کوئی پھونک مار کر اڑا دے۔  
 اس واقعہ سے یہ اثر بہر حال پھیلنا ہوگا۔ کہ مسلم طاقت کی جڑیں اب اتنی مضبوط ہیں کہ مخالفین کی مستحضرہ قوت بھی  
 ان کو نہیں ہلا سکی۔

ان بڑے معرکوں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی قبائلی قیادتوں کی طرف بھی مدینہ نے پوری توجہ رکھی۔ یہ  
 مقامی قیادتیں چونکہ ملک گیر جاہلی نظام قیادت کی لمبی زنجیر ہی کی کڑیاں تھیں اور ایک ایک کر کے ان کو توڑے  
 بغیر اس لمبی زنجیر سے عوام کو رہائی دلانا ناممکن نہ تھا۔ اس لیے اس کی کچھ کڑیاں تو دعوت کے اثر سے از خود  
 ٹوٹ گئیں۔ کچھ کو معاہدہ اور صلح نامہ روابط کے ذریعے زنجیر جاہلیت سے کاٹ لیا گیا۔ اور بقیہ نے جدھر  
 سے بھی مزاحمت کے لیے سر اٹھایا اسلامی حکومت نے فوراً اُدھر توجہ کی۔ اور دقت کے وقت سر کو بی کر  
 دی۔ باغیوں۔ چوروں، ڈاکوؤں، جنگجوؤں، شورش پسندوں کی ایسی متواتر اور بردقت خبریں گئی۔ جیسی کہ مدینہ  
 اعلیٰ کی طرف شیا لین کے رخ کرنے پر شہابیوں سے ان کی تو انصاف کی جاتی ہے۔ مدینہ کے اس پاس لائیڈ  
 آرڈر پوری طرح جمادیا گیا۔ اور پرامن ماحول پیدا کر دیا گیا۔ ورنہ اگر چوہرہ بکھرے ہوئے عربی قبائل کو ذرا بھی  
 ڈھیل ملتی تو مدینہ کی پہلی منظم حکومت کا تجربہ ابتدا ہی میں ناکام ہو گیا ہوتا۔ تاریخی ریکارڈ دیکھیے تو ہجرت کے  
 پہلے سال سے لے کر فتح مکہ تک کا دور انتہائی بغاوتوں، شورشوں اور اجتماعی منادات سے بھر پور ہے۔ اور  
 ادھر جنگی اجتماع ہو رہا تھا۔ آج اُدھر ڈاکوؤں کی ٹولیاں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ایک دن اس جانب کسی ہتھیار  
 غارت ڈالی۔ دوسرے دن اس جانب کسی دستے نے مدینہ کے شہریوں کو گناہوں اور بدگواہیوں کی سازش سے  
 رہی ہے۔ کوئی باغیانہ منصوبہ اُدھر بن رہا ہے۔ مگر مدینہ خوب چوکس تھا۔ کہیں غلطی نہ گزری۔ کوئی ٹولیاں نکل  
 رہی ہیں۔ کہیں فوجی مہم کی تزیین کی جا رہی ہے اور کہیں پولیس کا ردائی کے لیے کوئی ٹیم روانہ ہو رہی ہے۔  
 ان سارے حالات نے عرب پر بہر حال یہ اثر ڈالا ہوگا۔ کہ مسلم طاقت مدینہ پر بند و چشمہ بند ہو  
 بند قسم کی طاقت نہیں ہے۔ وہ ایک زندہ، بیدار اور فعال حکومت ہے جو چوکھی ہو کر مخالف قبائل کے  
 بے شمار محاذوں سے نمٹ رہی ہے۔ ایک نہ ایک دن یہ بازی لے جائے گی۔

پھر جب مدینہ میں یہودی اثر کا خاتمہ کر دیا گیا ہوگا۔ اور اس کے بعد موزوں وقت آئے ہی خیر کا مخالف  
 محاذ توڑ دیا گیا تھا۔ تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسے نام کی نفسان قبول دعوت کے لیے ان واقعات سے کس  
 طرح سازگار ہوتی گئی ہوگی۔

اور فتح مکہ کے زائرہ افگن واقعہ نے عرب کو اس سرے سے اس سرے تک جھنجھوڑ کر جاہلیت کی بندر

سے جگا دیا ہوگا۔ اور تحریکِ اسلامی نے نئے نئے دور کی اذان پکار کر پیغام دیا ہوگا کہ اٹھو! اُجالا ہو گیا۔ اب ہر اندھے نے بھی دیکھ لیا ہوگا کہ جاہلیتِ مٹنے والی تھی۔ اور مٹ گئی۔ اب انتہائی قدامت پسند اور مقلد اور مرعوب ذہن کے نچلے طبقوں کو بھی یقین آ گیا ہوگا کہ قریش کی فرسودہ قیادت کا دور ختم ہو گیا۔ اب سربلید ترین بددینے بھی سمجھ لیا ہوگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام، علم، کردار، زندگی، حرکت، ترقی، تعمیر، نظم، امن انصاف اور قوت سے آراستہ کرنے والا پیغام ہے۔ اور عوامی ذہن نے اپنے کواڑوں کی کنڈیاں کھول دی ہوگی اور اپنے روزوں سے پردے ہٹا دیے ہوں گے۔ تاکہ اسلامی تحریک کی شعاعیں اندر آ سکیں۔

پھر ان جنگی کارروائیوں کے اندر خود اسلام کی دعوت کام کر رہی ہوتی تھی۔ یہ لڑائیاں محض تباہی اور تیروں کی لڑائیاں نہ تھیں۔ یہ عقیدوں اور نظریوں اور کرداروں کی لڑائیاں بھی تھیں۔ ان لڑائیوں میں مسلم طاقت تکبیر کا نیا سرہ لے کے آئی تھی۔ وہ میدانِ جنگ میں بھی فوق رکوع و سجود اپنے ساتھ لاتی تھی۔ وہ دشمن کے خلاف اگر پورے جوشِ قوت سے حملہ آور ہوتی تھی تو دوسری طرف دشمن کے سامنے وہ اپنے خدا کے حضور عاجزی سے سر رکھتی تھی۔ پھر اس کا نئی طرز کا ڈسپلن تھا۔ اور اس کے قواعد تھے اور اس کے مخصوص اطوار تھے۔ پھر وہ شہادت اور جنت اور عنائے الہی اور حیاتِ ابدی کے تصورات لے کے آئی تھی۔ جن کی مستی میں اس کے سپاہی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آگے بڑھتے تھے اور سنتے مسکراتے اپنی متاعِ حیات اپنے نصب العین کے قدموں میں نچھاور کر دیتے تھے۔ پھر ان کا ایک درخشاں جنگی اخلاق تھا۔ دوسرے لوگ موسیقی کی تانوں پر حرکت کرتے تھے۔ اور اسلامی تحریک کے جانباز فقط نعمتِ توحید کی تانوں سے تحریک لیتے تھے۔ دوسرے لوگ شرابیں پی کر شجاعت کا مظاہرہ کرتے اور اسلام کے سپاہی فقط احساسِ فرسنگ کی مقدس صہبائے سرشار ہوتے تھے۔ دوسرے لوگ مالِ غنیمت کی ہوس لے کر جو ہر دکھاتے تھے۔ اور محسنِ انسانیت کے پیروں پر رنائے الہی کی طلب میں خاک و خون میں لوٹ جاتے تھے۔ دوسرے لوگ قوم قبیلے اور نسل کی عصبیت میں بہک کر حملہ آور ہوتے تھے مگر اللہ کے مجاہد صرف دین اور حق اور سچائی کی حمایت میں معرکہ آرا ہوتے تھے۔ دوسرے لوگ قتال کے دوران میں ہنایتِ درجہ کی وحشیانہ کارروائیاں کرتے تھے۔ مثلاً مخالفین کو آگ میں جلانا یا باندھ کر مارنا۔ ان کے مقتولوں کی لاشوں کی بے حرمتی کرنا۔ ان کی کھوپڑیوں میں شرابیں پینا، کلیجہ چبانا۔ عورتوں اور بچوں کو ذبح کرنا، حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑ دینا، لیکن مسلم طاقت ایسی انوکھی فوج تیار کر کے میدان میں لاتی جو قتال میں بھی انسانیت کی اخلاقی حدود کا احترام کرنے والی تھی۔ جس نے نہ کبھی کسی کو وحشیانہ طریق سے قتل کیا۔ نہ لاشوں کی بے حرمتی کی۔ نہ عورتوں اور بچوں پر اپنی تیغِ شجاعت کو آرایا۔ بلکہ اس پہلو سے اخلاقِ باختمہ مخالفین کی چہرہ دستیوں پر صبر کر کے اپنی طرف سے بہترین، نو نہ پیش کیا۔ دوسرے قیدیوں کے ساتھ جانوروں

کا سا سلوک کرتے تھے۔ مگر مسلم طاقت نے ان کو اپنے شہریوں کے ساتھ بھائی بھائی بنا کر رکھا۔ دوسرے قول قرار کر کے پھر جاتے تھے۔ مگر مسلم طاقت نے نازک ترین مواقع پر ہر نقصان اٹھا کر بھی اپنے عہد کو نبھایا۔ اور اگر ذمہ اٹھایا تو اس کا حق ادا کر دیا۔ دوسرے مفتوح شہروں میں گھس کر سول آبادی کو ظلم کا نشانہ بناتے تھے۔ مگر مسلم طاقت نے اپنی سپاہ کو ہمیشہ کے لیے اس بات سے روک دیا کہ گھروں میں گھس کر کسی شہری کو نہ مارا بنے۔ اور نہ کسی کے ذاتی سامان کو قبضہ میں لیا جائے بلکہ دشمن کی سول آبادی سے جبراً سزا تک حاصل کرنا حرام کر دیا گیا۔ دوسروں کے لیے لڑائی ایک دنیوی کارروائی تھی۔ لیکن مسلم جماعت نے اسے انتہائی بلند عبادت قرار دیا۔ پھر محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عین میدان جنگ میں بھی دشمن کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی جاتی تھی۔ تین راستے مخالف کے لیے کھلے ہوتے۔ اولاً اسلام میں آؤ۔ اور بھائی بھائی بن جاؤ۔ ثانیاً سیاسی اطاعت قبول کر لو۔ ثالثاً میدان جنگ میں مقابلہ کر لو۔ حالانکہ دوسروں کے ہاں ایسی کوئی اصولی دعوت نہ ہوتی۔ ان کی طرف سے وہی راستے کھلے ہوتے کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کر دو یا میدان جنگ میں آؤ۔

دو قوتوں کا یہ عظیم الشان فرق میدان جنگ کے سکریں پر کٹنا نمایاں ہوتا ہوگا۔ اور اس فرق سے آگاہ ہو کر سارا عرب متاثر ہوتا ہوگا۔ یعنی مدینہ کی اسلامی قوت کا ایک طرف تیزی سے نشوونما پانا اور دوسری طرف اپنے کردار سے اپنے نظریے کی صداقت درباہتری کو ثابت کرنا یہ دو گونہ اثرات تھے جو جنگی کارروائیوں کے ذریعے عرب کی رائے عام پر برپڑتے رہے۔ ان اثرات نے جوں جوں دعوتِ حق گئے۔ یہ راستہ صاف کیا۔ لوگ اسلام سے وابستہ ہوتے گئے۔ یہ اثرات نسلوں تا بیسیہ کے بعد خاصے نمایاں ہو گئے تھے۔ اس لیے اس قدر میں عوام تیزی سے اسلام کی طرف بڑھے۔ پھر فتح مکہ کے بعد یہ اثرات پوری طرح غائب ہوئے۔ اس لیے پورے کا پورا عرب بیک دم اصلاحی تحریک کے سایہ رحمت میں آ گیا۔ ان دونوں دورانوں میں عوام نے جس تیزی سے اپنے آپ کو اسلام کے حوالے کیا ہے اسے دیکھ کر یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے۔ کہ قیادت کی قیادت عوام کے راستے میں کتنی بڑی روکاؤں تھیں۔ اور اس رکارڈ کے نکلنے ہی ذمہ انقلاب رونما ہوا۔ جہاں کہیں بھی کوئی غائب طبقہ اس طرح سے رکارڈ بنا موجود رہتا ہے وہاں عوام میں وعظ و نصیحت کا اثر کسی بڑے پیمانے پر کبھی رونما نہیں ہو سکتا۔ اجتماع فیضا کو بدلنے کے لیے خیریت اندازوں سے ایسی روکاوٹ کو مٹایا جائے۔ اور اس کے لیے پوری پوری سیاسی جہاد کی بجائے دعوت کی تبلیغ سیاسی جہاد ہی تکمیل ہی پر منحصر ہے۔

حکومت خود معلم انقلاب تھی :

پھر جو علاقے متعلقہ قبائل کے اسلام لانے، معاہدات و تعلقات قائم کرنے یا سیاسی اطاعت قبول کرنے



سے مدینہ کی اسلامی حکومت کے زیر نگیں آئے تھے ان کو یونہی چھوڑ نہیں دیا جاتا کہ وہ جس حال میں پڑے ہوں پڑے رہیں اور جو بھی خیالات و کردار ان میں رائج ہوں ہوتے رہیں۔ بلکہ ان تک دعوت پہنچانے اور ان کی تعلیم و تربیت کرنے کے لیے مؤثر انتظامات کیے جاتے۔ معاملہ صرف اتنا نہ تھا کہ قوت کی لاٹھی گھما کر کسی علاقے کو زیر نگیں کیا اور پھر انسانوں کو اندر سے تبدیل کیے بغیر بیٹر بکریوں کے ریوڑوں کی طرح ہانکتے پھرے۔ اگر ہر چیز تلوار کی نوک سے منوائی جاتی اور ہر تبدیلی ڈنڈے کے زور سے کی جاتی تو یہ جباری چار دن چل سکتی تھی لیکن دل بغاوت پر آمادہ ہو جاتے اور پھر عوام کی بیزاری کا لاوہ پھٹتا تو سارا کیا کرایا ہوا ہو جاتا۔ قوت کے استعمال کا بڑا تجربہ اسلامی کے کام میں دوسرے ہر نظام کے مقابلے میں انتہائی قبیل تھا۔ اور دعوت اور تعلیم و تربیت کا عنصر بہت ہی غالب تھا۔

اصولی نظریوں پر قائم ہونے والی حکومتیں اپنے اندر تبلیغی روح رکھتی ہیں اور ان کی ساری سرگرمیوں میں مقدم ترین مقصود یہ ہوتا ہے کہ عوام کے دل اس اصول اور اعتقاد کو سمجھیں اور اخلاص سے قبول کریں جس پر نظامِ حیات کی اساس قائم ہے ان کے تمام کے تمام محکموں کو اپنے مخصوص کاموں کے ساتھ ساتھ اس مرکزی فرض کو بھی انجام دینا ہوتا ہے۔ ایسی حکومتیں ہر اس مفید ترین چیز کو مسترد کر دیں گی جو ان کے اساسی نظریہ کو نقصان پہنچائے اور ہر اس نقصان دہ صورت کو بھی اختیار کر لیں گی جو لوگوں کے ذہنوں میں بنیادی اصول کو راسخ کرے۔ ان کے سامنے تمام مصلحتوں میں سے اہم ترین مصلحت یہی ہوتی ہے کہ شہری نئے نظام کی روح کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائیں۔ اور ہم آہنگ رہیں۔ اور اس کے دست و بازو بن کر اپنے اندرونی جذبے سے کرنے کے کام کریں اور مٹانے کی چیزوں کو مٹائیں۔

چنانچہ مدینہ کی اسلامی حکومت نے ایک طرف تو یہ اہتمام کیا کہ سخت ترین جنگی حالات میں بھی ملحقہ علاقوں میں دعوتی اور تبلیغی و فود روانہ کیے۔ کم از کم چار مواقع ایسے ہیں کہ جن میں مدینہ سے جانے والے داعیانِ حق کو شریک عناصر نے شہید کر دیا۔ دعوت کی راہ میں انتہائی مظلومی کے ساتھ شہید ہونے والوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ جنگ بدر، جنگ اُحد اور جنگ خندق کے جملہ مسلم شہداء سے زیادہ تھی۔ بہر حال انتہائی نازک اور مشکل حالات (Emergency) میں بھی اس بنیادی فریضہ سے غفلت نہیں برتی گئی۔ بلکہ قربانیاں دے دے کر اسے جاری رکھا گیا۔ پھر بعض اصحاب کو مدینہ میں کچھ تربیت دے کر انہی کے قبائل میں داعی کے طور پر مامور کر دیا گیا۔ ایسے چند نام ہمارے سامنے ہیں (۱) طفیل بن عمرو سی (قبیلہ دوس) (۲) عمرہ بن مسعود ثقیف (۳) عامر بن شہر (حباران) (۴) صنمام بن ثعلبہ (بنو سعد) (۵) منقذ بن حبان (بحرین) (۶) ثمامہ بن اثال (نجد) علاوہ ازیں بعض قبائل یا افراد کی طرف خصوصی اصحاب دعوت کو مامور کر کے روانہ کیا گیا۔ جیسے حضرت علیؑ کو ہمدان۔

حزبہ اور مذبح کی طرف۔ مغیرہ بن شعبہ کو بصران کی طرف، ادرب بن نخلین کو ابناء سے فارس (فارس) کے رڈراہ جو بین میں مقیم ہو۔ صحیح کی طرف۔ مجیبہ بن مسعود کو فدک کی طرف۔ احنف کو قبیلہ سلیم کی طرف۔ خالد بن ولید کو علاقہ مکہ کی طرف، عمرو بن عاص کو عمان کی طرف اور ماجر بن ابی امیہ کو عارضہ بن کلالہ شہزادہ یمن کی طرف روانہ کیا گیا۔

لیکن اس سے بہت بڑے پیمانے پر اسلامی حکومت نے اپنے سول حکام سے اسلام کی اشاعت اور تحریک اسلامی کے فروغ کی خدمت لی۔ اسلامی حکومت کے افسر کچھ نوکری پیشہ لوگ نہ تھے اور نہ وہ لدنی کمانے کے خیال سے بھرتی ہوتے تھے۔ وہاں تو مقصود صرف کلمتہ اللہ کو سر بلند کرنا اور انسانوں کو نبھلانے کے راستے پر ڈالنا تھا۔ یہ کام تنخواہ کے پجاریوں کے کرنے ہی کا نہ تھا۔ یہ تو صرف اس نورانی انقلاب کے بے لوث خادموں ہی کی دلچسپی کی چیز ہو سکتی تھی۔ اور انہی کے ہاتھوں یہ ہو بھی سکتا تھا۔ وہ لوگ نہ تو کسی عہدے کا لالچ رکھتے تھے اور نہ گریڈوں اور ترقیوں کے چار میں پڑتے تھے۔ ان کو تو عہدے خود اپکار تھے اور فرائض خود چن چن کر جلاتے تھے اور اگر ریسر کے مدارفے پر ان سے انتزاعی اور پچی خدشات لی جاتی تھیں یہاں ایک ہی مثال کافی ہوگی۔ کہ عتاب بن امیہ کو مکہ کا گورنر مقرر کیا گیا تو ایک درہم پر یہ تنخواہ مقرر کی۔ اس گورنر نے تقریر میں خود کہا۔ کہ خدا اس شخص کو بھوکا رکھے جو ایک درہم روزانہ پا کر بھی بھوکا رہے اور انہی کے یہ لوگ اپنے عقیدے اور اپنے محبوب نظام کے داعی پہلے تھے اور کچھ اور اس کے بعد تھے پس مدینہ کی حکومت جن لوگوں کو بھی جگہ گورنر، جج، تحصیلدار اور مال افسر مقرر کرتی تھی۔ وہ اپنے اپنے حدود عمل میں توجید کے داعی اسلام کے معلم اور اخلاق عامہ کے معمار بھی ہوتے تھے۔ ان حضرات کو نبی ﷺ کے فرائض سے آگاہ کیا جاتا تھا۔ تو اس وقت حضور اس اساسی فرض پر بھی ان کو متوجہ فرمایا تھے مثلاً حضرت معاذ بن جبل کو نجد (یمن) میں مالی، انتظامی اور عدالتی فرائض سونپ کر افسر مقرر کیا تو ان کو یہ تلقین بھی فرمائی کہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دو۔ اور انہیں اسلام کے احکام سکھاؤ۔ پھر انہیں اہل کتاب مخاطبین کو ملحوظ نظر رکھے کہ تفسیر سے دعوت کا اسلوب سمجھایا کہ انہیں توجید کی دعوت دیتا۔ اسے مانیں تو پھر ناز نہ کرے ایسے کہنا اور اس کے بعد نوبت کے لیے۔ یہی افسر اکثر و بیشتر اپنے ہیڈ کوارٹر میں امام سلوۃ بھی ہوتے تھے۔ ابنت بڑی آبادیوں میں جہاں تقسیم فرائض ناگزیر ہوتی وہاں انتظامی افسروں کے ساتھ مستقل ائمہ سلوۃ کا تقرر بھی کیا جاتا جیسے کہ عتاب بن اسید کا۔ میں۔ عثمان بن ابی العاص طائف میں اور ابو زید انصاری عمان میں مامور ہوئے۔

سول افسروں کی تعداد چونکہ خاصی زیادہ ہے اس لیے ہم یہاں فہرست نہیں دے رہے لیکن اس تعداد کو دیکھا جائے اور ان کے علاقہ ہائے تقرر کو دیکھا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ اسلامی حکومت کی سول سہرا

نے اسلام کی روشنی کو پھیلانے میں کتنا بڑا کام کیا ہوگا۔ پھر یہ داعیانِ حق اپنی افسری میں اس عام تصور سے بالکل مختلف تھے۔ جو اس وقت پھیلا ہوا ہوگا۔ نہ وہ خدا سے بے خوفی، نہ وہ ٹھاٹھ باٹھ۔ نہ وہ جوڑو تعدی، نہ وہ عوام سے دُور دُور رہنا۔ نہ لوگوں کی ضروریات و حاجات سے غفلت نہ ہٹو بچو کی صدا میں، نہ دربانوں اور چاؤشوں کا ہنگامہ۔ نہ محلات و قصور، نہ سلب و نہب، نہ رشوت ستانی، نہ خوشامدیوں کے حلقے، نہ اندھی داد و دہش، نہ ہنترابوں کے دور، نہ موسیقی کے زیر و بم، نہ رقاصوں کے ہجوم۔ یہ سول افسر بالکل نئی قسم کے افسر تھے۔ یہ حاکم نئے انداز کے حاکم تھے۔ لوگوں کے لیے ان کی حکومت کا تجربہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ کم تنخواہیں لینے والے، سادہ گذر بسر کرنے والے۔ دیانتداری سے فرائض ادا کرنے والے۔ رعایا سے رحم و کرم رکھنے والے، بے لاگ انصاف پر چلنے والے اور پھر اپنے خدا کے سچے پرستار۔ یہ نیا حاکمانہ کردار دلوں کو مسحور کر کے تریب لاتا ہوگا۔ اور پھر جب یہ لوگ سچائی کا پیغام دیتے ہوں گے تو وہ سیدھا سینوں میں جاگزیں ہو جاتا ہوگا۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو علاقہ زبید و عدن کا حاکم مقرر کیا گیا تو ان کی دعوت سے وہاں کے سارے لوگ بہت جلد مسلمان ہو گئے۔ اسی طرح جریر بن عبداللہ سجلی کو یمن کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے حمیر لوں (ذوالکلاح حمیری) پر افسر مقرر کیا گیا تھا۔ انہوں نے اتنا اثر ڈالا کہ وہ لوگ اسلامی تحریک میں شامل ہوئے اور اسی خوشی میں انہوں نے ۴ ہزار غلام آزاد کیے۔

گویا حکومت کے سول محکمے اس سرگرمی اور یک جہتی سے متواتر کام کر رہے تھے۔ اور اسی وسیع پیمانے کی تعلیمی مہم کا نتیجہ تھا کہ عرب کی بعید ترین آبادیوں میں صرف سیاسی نہیں ذہنی اور قلبی انقلاب رونما ہوتا چلا گیا۔ اور اسی کے ساتھ اخلاقی لحاظ سے کابینہ گئی۔ بالآخر عرب کا اجتماعی انسان بدل کر بالکل نئے روپ میں اُبھرا۔

### عوام کی معاشی فلاح :

عرب کی کثیر التعداد بدوی آبادی تو بالعموم بالکل ہی خستہ حال تھی اور بیشتر صحرائی قبائل خانہ بدوش رہتے اور مویشیوں سے حاصل شدہ قلیل معیشت کے ساتھ مسلح لوٹ مار کا پیشہ اختیار کر لیتے۔ شہروں سے دودا اعرابوں کے مقیم قبائل کی حالت بھی پتلی تھی۔ ان کے اندر کے شیوخ اور سردار معاشی جدوجہد کے بیشتر ثمرات لے اُڑتے۔ شہر تھے ہی کتنے۔ مکہ، مدینہ، طائف، صنعاء، حضرموت وغیرہ۔ پھر یہ بھی بہت بڑے شہر نہ تھے۔ قلیل آبادیاں تھیں۔ یہ قلیل آبادیاں بہ حیثیت مجموعی خوش حال تھیں۔ مگر خود ان میں بھی بالائی اور زیریں طبقات تھے۔ بالائی طبقے زیریں طبقات سے بھی ان کا حق نچوڑ لے جاتے تھے۔ مدینہ میں یہودی تجارت اور زراعت کے ساتھ ساتھ سود خواری کے جال پھیلائے ہوئے تھے۔ اسی طرح مکہ اور طائف کے بڑے

بڑے مالدار لوگ بھی دوسرے ذرائع کے ساتھ ساتھ مہاجنی کاروبار کرتے تھے۔ اوپر کے چند خاندانوں کے اسراف کا یہ عالم تھا کہ شرابیں پی کر چاہیں تو پچاسوں اونٹوں کی گردنیں کاٹ دیں اور پھر فیاضی کا سکہ جما لیں۔ گانا بجانا، معاشقہ، بدکاریاں ان کے کلچر کے نمایاں ابواب تھے۔ لیکن دوسری طرف عوام عرب کا یہ حال تھا کہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے گوہ تک کا شکار کرتے۔ ٹڈی دل آتے تو ٹڈیاں کھاتے۔ چھپکلیاں تک چٹ کر جاتے۔ مردہ جانوروں کا گوشت اور حجا کر خشک کیا ہوا خون اور سوکھا ہوا چمڑا تک بھون لیتے زندہ جانوروں کے بدن سے ٹکڑے کاٹ کر کھا لیتے۔ سرے سے حلال و حرام اور طیب و مکروہ کی تمیز ہی نہ تھی لباس اور غذا اور اقامت ہی کا مسئلہ حل نہ ہو پاتا تھا۔ تو تعلیم اور صحت اور اس سے اوپر کے مسائل کا کیا ذکر علاج کے لیے وہاں تہوں کے حضور پرارتھنا ہوتی اور کچھ ٹونے ٹوکے چلتے تھے اور کاہنوں اور نجومیوں کی چاندی ہو جاتی تھی۔ تعلیم نہایت محدود پیمانے پر شہروں کے صرف اعلیٰ خاندانوں کے اندر بھی تھوڑے سے افراد کو حاصل ہوئی۔ بقیہ سارا عرب جو کچھ بھی علم حاصل کرتا تھا۔ اپنی روزمرہ کی عملی زندگی کے مدرسے سے حاصل کرتا تھا۔ بہر حال وہاں کا ایک بنیادی اور ٹھوس سوال روٹی تھا۔ جس قوم کی عظیم اکثریت بروقت کھانیں کھا کر "کیا" کے سوال پر سوچتی رہے اسے نہ تو انسانی تحقیقتوں کا ذوق دیا جاسکتا ہے۔ اور نہ وہ بڑے بڑے مفاسد کے بیٹے کوئی عظیم کارنامہ انجام دے سکتی ہے معاشی محرومی کی پستی میں گرے ہوؤں کو اگر سہارا دے کر کوئی نظریہ اوپر نہ اٹھا سکتا ہو۔ اور ان کی تواضع فقط و عظوں سے کرے تو کبھی بھی بڑے پیمانے پر وہ عوام کو حرکت میں نہیں لاسکتا۔ پھر اگر وہ تلوار کے زور سے اپنی حکومت بھی جمالے۔ لیکن وہ حکومت زندگی کے اولین معاشی مسئلے کا کوئی حل نہ دے سکے، تو ایسی صورت میں زری اخلاقی مفہوم میں تعمیر و اصلاح کو قبول کرنے پر عام لوگ کبھی تیار نہیں ہو سکتے بلکہ ایسی تعمیر و اصلاح کو ایک مصیبت اور عذاب سمجھ کر اس سے نجات پانے کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں۔ انسانیت نظریہ حق سے جمعی مفتوح ہوتی ہے۔ جب کہ وہ عاقبت کے ساتھ دنیا کو بھی سنو اسے اور اخلاقی اصلاح کے ساتھ معاش کے قضیے کا حل بھی نکالے۔ لوگ اسی قوت کی زبان سے وعظ سن کر متاثر ہوتے ہیں، بلکہ اس کے عصائے تادیب کی ضربیں بھی ہنسی خوشی برداشت کر لیتے ہیں جس کے ہاتھوں سے ان کے مشہد ذوق کا نقل کھلے۔ جس طرح زامسہ معاش لے کے اٹھنا انسانیت کو اخلاقی لحاظ سے ہلاکت میں ڈالنا ہے، اسی طرح اخلاقی اصلاح کے کام کو زندگی کے معاشی تقاضوں سے الگ کر کے لینا اسے اخلاقی اصلاح ہی کو ناکام بنا دیتا ہے۔ اسلام دونوں ضرورتوں کا جامع ہے۔ محسن انسانیت نے جو تحریک چلائی وہ جہاں دلوں کو نور ایمان اور روحوں کو اخلاقی اقدار دیتی تھی۔ وہاں وہ پیٹ کی روٹی بہم پہنچانے کے لیے بھی بہترین تدابیر عمل میں لاتی تھی۔ عین آغاز ہی میں اسلام کے مختصر سے اخلاقی ضابطہ میں "اطعام مساکین"

بڑی اہمیت کے ساتھ شامل تھا اور پھر پٹیموں اور ہواؤں اور مسافروں کی خبر گیری کرنا ہر مسلم پر لازم تھا۔

عرب جیسے کم پیداوار ملک میں دولت — سیم وزر اور اجناس کی شکل میں بھی، اندر ہی ارمانی کی شکل میں بھی اور مویشیوں کی شکل میں بھی — نہایت محدود حلقوں میں سمٹی ہوئی تھی۔ دولت کی ان جھیلوں اور تالابوں کے بند کاٹ کر اس کو عوامی طبقوں کی طرف بہاؤ میں لانا بڑا ہی ٹیڑھا مسئلہ تھا۔ اور اس مسئلے کا حل کیسے بغیر زندگی کے بڑے بڑے معاملات کی درستی ممکن نہ تھی۔ اسلام کے معاشی قوانین (جو تدریجاً نازل ہوئے) ایک متوسط حالت میں تو دولت کو گردش میں رکھنے کے لیے بالکل کافی تھے۔ لیکن ان قوانین کے نفاذ سے بھی قبل بڑا مسئلہ دولت کی ان جھیلوں کا تھا جو عرب کے صحرا میں پائی جاتی تھیں۔ یہ ادق مسئلہ سرگرمی جہاد سے از خود اس خوبی سے حل ہوا کہ کوئی متبادل صورت اتنی کامیاب مشکل ہی سے ہو سکتی۔

دنیا کے ہر دینی اور لادینی قانون میں — اس قدر سے لے کر موجودہ دور تک — مغلوب دشمن کے اسلحہ اور ساز و سامان کو بطور غنیمت قبضے میں لینا ایک مسلمہ حق رہا ہے جنگ کو روکنے کے لیے انسانی جانیں لینے سے زیادہ کارگر تدبیر ہے کہ حلیف کو اسلحہ اور ساز و سامان اور رسد سے محروم کر دیا جائے۔ نیز فی الجملہ اس کی جنگی معیشت کو کمزور کر دیا جائے۔ اسلام نے بھی غنیمت کا حق برقرار رکھا اور اس کے لیے اپنے خاص اخلاقی ضوابط نافذ کر دیے۔ یہاں ہم کوئی نظری بحث نہیں کر سکتے۔ لیکن عملاً اس حق کے سخت مدینہ کی اسلامی فوج نے جگہ جگہ سے سمٹی ہوئی دولت کو قید سے نکالا اور گردش میں ڈال دیا۔ یہودی سود خواروں کی دولت جو عوام میں سے چوڑی گئی تھی، قانون غنیمت کے تحت بہاؤ میں آئی۔ ثقیف والوں کی دولت ان کے قبضے سے نکلی اور عرب بھر میں پھیل گئی۔ اسی طرح مدینہ کے گرد و نواح کے جن جن شہر پسند قبائل نے شورش اٹھائی، ان کے شیوخ اور دولت مندوں کے اموال کا ایک بڑا حصہ اسلامی فوج نے ان کے قبضے سے نکالا اور گردش میں ڈال دیا۔

جاہلی ریت مال غنیمت کے متعلق یہ تھی کہ میدان میں جس کے ہاتھ جو کچھ پڑ گیا وہ اڑا لے گیا۔ کسی نے چوری کر لی، کسی نے فریب دے لیا اور پھر جو جتنا زیادہ بڑا اور نور آور ہوا اس نے اپنی بڑائی کی دھونس سے اتنا ہی زیادہ حصہ چھینا اور جو کچھ بہتر بن ہوا، وہ ہتیا لایا۔ اسلامی نظام جنگ بالکل نیا اخلاق ساتھ لایا۔ اس کے تحت سارا مال سوٹی سوٹی اور پائی پائی یک جا ہونے کے بعد کمانڈر کے حکم سے تقسیم ہوتا۔ پھر اس میں سے بیس فیصدی حصہ اسلامی خزانہ میں جاتا اور بڑی حد تک غربا اور حاجت مند طبقوں تک پہنچایا جاتا۔ اس طرح ملکی دولت میں ایک عمومی حرکت آگئی اور بعد میں جوں جوں معاشی قانون نافذ ہوتے گئے اس کے بہاؤ کو

انضباط میں سے لیا گیا۔

پھر اسامی ریاست نے تمام ان طبقوں سے جو زمینوں، سوائیوں یا تجارتی سرکاری کے مالک تھے۔ مسلم ہونے کی صورت میں زکوٰۃ اور عجزہ مسلم ہونے کی صورت میں خراج اور بزیہ کی آمدنیاں مانگی ہیں اور ان آمدنیوں (خصوصاً زکوٰۃ) کا ایک عظیم حصہ غریب طبقوں کے لیے ختموں کر دیا۔ ہر سال نئے اور کھجوروں اور مویشیوں کی ایک بھاری مقدار اس سے غربا کی طرف منتقل ہونے لگی۔

پھر معاشی مسئلہ کو تنہا قانون ہی کے زور سے نہیں حل کیا گیا۔ بلکہ انسانی ذہن سے جسے اس کے سلجھانے کی تدبیر کی گئی۔ مدینہ کی مرکزی سوسائٹی میں سماجی مساوات کے ساتھ اقتصادی اخوت (Economic Brotherhood) کا انتہائی کامیاب تجربہ محسن انسانیت نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ سارا عرب دیکھ رہا تھا کہ گھروں سے اکھڑے ہوئے لوگ اتنی دست بند مہربان قسمت بدو اور استراحت کشم نے تو جنوں جب اسلام کے سایہ رحمت میں پھیسے جاتے ہیں تو ایک طرف تو وہ بڑے بڑے شہرانی شرف کے شانے سے شانہ ملا کے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور پھر وہ کس بے خوفی سے متکبر ترین مخالفین کو راج کر سکتے ہیں۔ درود ساری طرف ان کی ساری پریشانیوں کا امداد ہونے لگتا ہے۔ کھٹکانا بھی مل جاتا ہے۔ روزگار بھی پیدا ہوتا ہے۔ سبھی مہیا ہو جاتا ہے۔ سوائی بھی کبھی نہ کبھی ہاتھ آجاتی ہے اور نکاح کے لیے بھی راستے نکھلتے ہیں۔ پھر یہی نظام اخوت کی یہ برکات صرف مدینہ ہی تک محدود نہ تھیں۔ بلکہ چاروں طرف آہستہ آہستہ پھیلنے لگیں۔ اور ایک دن آیا کہ سارا عرب ان سے کیسا فیض یہاں تھا۔

اس سماجی مساوات اور اقتصادی اخوت کے نئے نظام کو عرب کے نو سو دورستہ میں طرح محسوس کرتے ہوں گے جیسے وہ آسمانی دنیا کی کوئی جنت ہو جس میں عقیدہ توحید کی کبھی سے رشتہ لگتا ہے۔ آفریقا، عرب اور معاشی کبریائیوں تلے پسنے والے لوگ کیسے ارمان نہ کرتے ہونگے کہ وہ بھی اس جنت میں جانا پڑیں۔

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے تمام انسان کی مشکلات کو محفوظ رکھ کر ان کی صورت پر سب دور دورہ کے جو درد و سنا کا مظاہرہ کیا اور بحیثیت صدر ریاست بھی بڑی فراخ دلانہ اور کریمانہ پالیسی اختیار کی ہوتی ملک میں کبھی کوئی مال جمع نہ رہنے دیا۔ بلکہ جلد سے جلد اسے مقامی حاجت مندوں اور بیرونی مسلمانوں کے تقسیم کر دیتے۔ حکمران کی حیثیت میں بیت المال میں کبھی کوئی رقم پڑی نہ رہنے دی بلکہ جب کوئی حاجت مند سامنے آتا تو جو کچھ ممکن ہوا اسے دلا دیا۔ حضور کی نگاہ میں اصل اہمیت انسان کی تھی۔ اور دولت کو انسانیت کی خدمت قرار دیا۔ حد یہ تھی کہ بسا اوقات بیت المال اور ذاتی ملک میں کچھ نہ ہوتا تو مسلمانوں کی امداد کے لیے قرضیں تک لیا۔

مثلاً ترمذی، دور دور سے مصیبت کے مارے دیہاتی اور صحرائی ان فیاضوں کا چرچا سن کر مدینہ آتے۔ اور اس

دریائے سخاوت سے جام بھر بھر کے رخصت ہوتے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک بار ایک بدو آیا اور حضورؐ کی چادر کھینچ کر اکھڑ بن سے کہنے لگا: محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ مال خدائی مال ہے۔ تمہیں کچھ اپنے مال یا اپنے باپ کے مال میں سے نہیں دینا ہے۔ لاؤ ایک بار شتر مجھے لدا دو! اس مجسمہ رحمت نے قدرے سکوت کے بعد ٹھنڈے انداز میں فرمایا: بے شک یہ مال خدا کا مال ہے اور میں اس کا غلام ہوں۔ پھر حکم دیا کہ ایک بار شتر جو اور ایک بار شتر کھجوریں بدو کو دی جائیں۔ وہ خوش خوش رخصت ہوا۔ ایک مرتبہ بحرین سے خراج کی بڑی کثیر دست آئی کہ اس سے زیادہ مال کبھی مرکز حکومت میں نہ آیا تھا۔ حضورؐ نے صحن مسجد میں اس کا ڈھیر لگوا دیا اور پھر جو جو آتا گیا اسے دیتے گئے۔ یہاں تک کہ کپڑے جھاڑ کر اٹھے۔ اور گھر تشریف لے گئے۔ دادو دہش کے ایسے واقعات مدینہ میں منت ہوتے اور مختلف اطراف سے مسافر اور رسائل اور حاجت مند آ کر مستفید ہوتے۔ یہ لوگ جب علاقوں میں جاتے ہوں گے، تو اسلامی حکومت کی غریب پردری کی مجسم داستانیں بن کے جاتے ہوں گے۔ ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ ان داستانوں سے کتنے دلوں نے اثر قبول کیا ہوگا اور کتنے سینے اسلام کے لیے کھل گئے ہوں گے۔

اسلامی ریاست کے سربراہ اعلیٰ کی فیاضانہ پالیسی کے ذہنی اثرات کا اندازہ دوسری ایک مثال سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ایک شخص آیا اور اس نے اپنی معاشی بد حالی کا دکھڑا رونے کے بعد سوال کیا۔ حضورؐ نے پہاڑوں کے درمیان چرتی ہوئی بکریوں کا ایک ریوڑ اسے عنایت فرمایا۔ وہ یہ عطیہ پا کر جا مے میں پھولانہ سماتا تھا اور قبیلہ میں جا کر کھتا پھرا۔ کہ: اے لوگو! اسلام قبول کرو! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو ایسی سخاوت کرتے ہیں کہ تنگ دستی کا خطرہ باقی نہیں رہتا! واللواہب اللدینہ، اسی طرح صفوان بن امیہ کا خود اپنا بیان ہے کہ حضورؐ نے مجھے کچھ مال عطا کیا۔ (جس میں تین سو بکریاں تھیں) تو اس عنایت کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ جہاں اس سے قبل آپ سے بڑھ کر کوئی شخص مجھے ناپا زرنہ تھا وہاں اب آپ۔ زیادہ کوئی محبوب نہ رہا۔ ذیل کا شعر اسی واقعہ سے متعلق ہے۔

هو الذی لا یتقی فقراً اذا یعطی ولو کثر الانام و داموا

یہ وہ ہستی ہے جو عطا و بخشش پر آتی ہے تو اسے تہی دست ہو جانے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ خواہ

اس کے سامنے کتنی ہی کثیر مخلوق کیوں نہ سائل بن کے آئے اور متواتر یہ تانا باننا بندھا رہے۔

سخاوت کے اسی عام چرچے کا نتیجہ تھا کہ حنین کے اموال تقسیم کر کے آپ واپس ہوئے، تو اس پاس کے بدو درڑے دوڑے آئے۔ اور آکر لپٹ گئے کہ ہمیں بھی کچھ عنایت ہو۔ حضورؐ نے پریشانی کے عالم میں ایک درخت کے تنے کا سہارا لیا۔ اور معذرت کرتے ہوئے کہا کہ اگر ان جنگلی درختوں کے برابر بھی میرے پاس اونٹ ہوتے

تو میں سب تم میں بانٹ دیتا۔ تم مجھے نہ بخیل پاتے۔ نہ غلط گو اور نہ کم حوصلہ۔ (بخاری)

ممکن ہے کہ ایک گھٹیا ذہن اس عطا و بخشش کو یہ معنی پہناتے کہ مال و دولت کے زور سے ذہن فتح کیے گئے، انعوذ باللہ اور رشوت دے کر لوگوں کو حامی بنایا گیا۔ مگر حقیقت بالکل دوسری تھی۔ معاشی بد حالی میں پیسے ہوئے لوگوں کو سنبھالنا اور ان کو ذہنی پستی سے نکالنا اسلام کے بالکل اصولی تقاضوں میں شامل تھا۔ انسانیت کے وہ طبقات تو بڑے ہی قابلِ رحم ہوتے ہیں۔ جو معاشرہ کے ظلم کی وجہ سے پیٹ کے مسئلے میں اس بری طرح گمراہی میں کہ زندگی کے اعلیٰ تقاضوں پر توجہ تک کرنے کا انہیں موقع نہیں ملتا۔ ایسے مصیبت کے ماروں کو تو شاید عند اللہ بھی کچھ رعایت مل جائے۔ عرب کی بیشتر آبادی اسی حال میں تھی۔ اور ان کو جہاں بھمکے طیبہ کی ضرورت تھی وہاں روٹی کپڑے کی بھی محتاجی تھی مدینہ کے لیے نئے معاشی نظامِ اخوت سے بہرہ مند ہونے والوں کو شاید پہلی بار موقع ملا ہوگا کہ وہ بدن کی ابتدائی ضروریات کے لیے گھٹیا اچھا دوس سے بالاتر ہو کر زندگی کے اعلیٰ مسائل پر سوچیں۔ عظیم حقیقتوں کو سینے میں بگڑیں۔ اور قیمتی اخلاقی اقدار کو اپنے اندر نشوونما دیں۔ لازماً اقتصادی اصلاح نے اسلام کے پیداوار کے لیے راستے ہموار کیے ہوں گے۔ اسلام کا معاشی نظام تو بعد میں تکمیلی شکل تک پہنچا ہوگا جب کہ اس کے سارے اصول نافذ ہو کر کام کرنے لگے ہوں گے۔ لیکن ابتدائی آثار ہی سے عوام کی امیدیں مدینہ سے وابستہ ہو گئی ہوں گی کہ یہاں سے ہمیں نور حق کے ساتھ ساتھ معاشی مسئلے کا حل بھی حاصل ہونے والا ہے۔

### قائد ریاست کے وسیع تعلقات

کوئی بھی نصب العین لے کے چلیے اور کتنا بھی اعلیٰ درجہ کا اصولی کام کیجیے، ذاتی تعلقات اور رابطہ کی وسعت بہر حال اس کی کامیابی میں اثر انداز ہوتی ہے۔ معمولی کاروبار سے لے کر نظریاتی انقلاب تک کے مختلف کام جو اجتماعی دائرے میں سرانجام پاتے ہیں، ان میں کوئی بھی ایسا شخص مشکل سے کامیاب ہو سکتا ہے۔ جو عام انسانی تعلقات کے لحاظ سے کوتاہ ہو۔ خلوت گزین اور بے نیاز خلائق ہو۔ نسبی اور رحمی رابطے۔ ازدواجی رشتے، خود پیدا کردہ دوستیاں اور علاقہ، غموں اور مسترتوں کی شرکت، ملاقاتیں اور سلام و پیام اکہ انسان کی قوتِ نفوذ کو بڑھاتے ہیں۔ ذاتی تعلقات اور شخصی لحاظ داریاں غیر شعوری طور پر بڑے بڑے اصولی معاملات کا رخ بدلتی ہیں اور ان کی وجہ سے کتنے ہی سیاسی فیصلے کسی خاص صورت میں طے پا جاتے ہیں۔ بالعموم انسانی قیادت میں وہی شخصیت کامیاب رہتی ہے جس کے علاقہ کا دائرہ وسیع ہو اور وہ خود وسیع تر کرے۔ اور بہ تعلق کے حقوق ادا کرے۔

اس پہلو سے جب ہم محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقارن شخصیت پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ تو نسبی اور خوبی اور صہری اور رضاعی اور ولایتی علاقہ کا دائرہ بڑا وسیع پاتے ہیں۔ نیز اس کے ساتھ ساتھ دوستی اور رفاقت اور عام شخصی تعلقات کا حلقہ روز افزوں دیکھتے ہیں۔ پھر ان گونا گوں علاقہ سے حضور کسی انسان گریز برتر شخصیت کی طرح



بے نیازی نہیں برتنے اور ان کو بارگراں اور دوسرے نہیں سمجھتے بلکہ ان کو حسن و خوبی سے بناتے ہیں۔ ان کے حقوق ادا کرتے ہیں اور ان کو استحکام دیتے ہیں۔ بعید ترین رشتوں کا بھی اتنا احترام اور لحاظ حضور کو تھا کہ جماعت کو تاکید کی کہ جب تم مصر کو فتح کرو تو اس کے باشندوں سے حسن سلوک کرنا کیونکہ ان کی طرف سے تم پر صلہ رحمی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ وضاحت فرمائی کہ حضرت اسمعیل کی والدہ انہی ہیں سے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان وسیع ذاتی تعلقات نے بھی اسلامی تحریک کے فروغ اور دعوت حق کے عوامی نفاذ کو بڑھانے میں بڑا بھاری اثر ڈالا ہے۔

موضوع تقاضا کرتا ہے۔ کہ ان علاقوں کا بھی اجمالی تذکرہ کیا جائے۔ اور دکھایا جائے کہ یہ علاقے کس طرح تحریک اسلامی کے حق میں مفید ثابت ہوئے۔ اور انہوں نے انقلاب کے سیاسی عمل کو کتنا آسان اور کامیاب بنایا۔ ہم مختلف علاقوں کو الگ الگ کر لیتے ہیں:-

### ۱) نسبی علاقے :

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے :

محمد صلی اللہ علیہ وسلم، بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد منات بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن ہزیمہ (قریش)، بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان بن اؤد بن مقوم بن ناخور بن تیزج بن یعرب بن یثجب بن نابت بن اسمعیل بن ابراہیم۔

حضور کے اپنے ارشاد کے بموجب عدنان سے اُوپر حضرت اسمعیل تک کے نام کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں ہیں۔ چنانچہ نسبوں اور روایات نسب کو پیش کرنے والوں نے ان ناموں میں اختلاف کیا ہے۔ عدنان کے ساتھ حضور کا تعلق اکیسویں نسبی درجے پر آتا ہے۔ زمانی ناصلاً ۱۱۵۸ برس کا ہے۔ قبائل عرب کا تعلق کسی نہ کسی مرتبے پر حضور کے سلسلہ نسب سے جڑ جاتا ہے۔

حک بن عدنان (برادرِ معدؑ) نے علاقہ عسٹان (مین) میں جا کر سلطنت قائم کی۔ اور اشعرین کے خاندان میں ازواجی تعلق قائم کیا۔ ان اطراف میں اسلام نے بہت جلد جگہ پیدا کی۔ اور پھر شریعت سے اپنا سایہ رحمت پھیلایا۔ مین کے مختلف علاقوں سے وفود مدینہ پہنچے جن میں خود اشعرین کا وفد بھی تھا۔ نزار (نمبر ۲۰) کے چار بیٹے تھے جن میں سے انار کی اولاد نجد اور اطراف حجاز میں بسی۔ ایاد کی اولاد نے ثغور اور اس کے اطراف کو مسکن بنایا اور مضر (نمبر ۱۹) اور بقیہ وسط عرب میں فروکش ہوئے۔

اب مشہور قبائل کو لیجیے۔ جو حضور کے ہم نسب ہیں اور ان قبائل کے نام سیرت اور تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں کثرت سے آئے ہیں۔

بنو تمیم — تیمم بن مروان عد بن طابخ بن الیاس (نمبر ۱۸)

بنو عطفان — عطفان بن سعد بن الیاس (ایضاً)

بنو اشجع — اشجع بن عطفان بن سعد بن الیاس (ایضاً)

بنو ذبیان — ذبیان بن بعین بن رائس بن عطفان بن الیاس

بنو فرزه — فرزه بن ذبیان بن الیاس

بنو ہوازن — ہوازن بن منصور بن عکرم بن حنظلہ بن قیس عیلان بن الیاس (نمبر ۱۹)

بنو سعد — سعد بن بکر بن ہوازن . . . . . تا الیاس

بنو ثقیف — ثقیف بن ہوازن . . . . . تا الیاس

بنو سلیم — سلیم بن منصور . . . . . تا الیاس

ہذلی — ہذلی بن مدرکہ (نمبر ۱۶)

بنو ہون — ہون بن خزیمہ (نمبر ۱۶)

دیشی — دیش بن قارہ بن ہون بن خزیمہ

عضلی — عضل بن قارہ . . . . . تا خزیمہ

بنو اسد — اسد بن خزیمہ . . . . . تا خزیمہ

بنو نصر

{ نصر بن کنانہ (نمبر ۱۵)

بنو کنانہ

بنو مصطلق — مصطلق (خزیمہ) بن عبدمنانہ بن کنانہ (نمبر ۱۵)

الاحابیش — احابیش بن کنانہ

بنو مالک — مالک (نمبر ۱۳) بن نصر بن کنانہ

قریشی — فہر یا قریش (نمبر ۱۲) بن مالک . . . . .

بنو محارب — محارب بن نصر

بنو تمیم — تیمم بن غالب (نمبر ۱۱) بن نصر . . . . .

بنو عوف — عوف بن لوی (نمبر ۱۰) بن غالب

بنو عامر — عامر بن لوی

بنو حرث — حرث بن لوی

بنو ہبصیص — ہبصیص بن کعب (نمبر ۹) بن کوی

بنو سہم — سہم بن کعب

بنو جمح — جمح بن کعب

بنو عدی — عدی بن کعب

بنو کلاب — کلاب (نمبر ۷) بن مرہ (نمبر ۸)

بنو تیمم — تیمم بن مرہ (نمبر ۸)

بنو مخزوم — مخزوم بن مرہ

بنو قصی — قصی (نمبر ۶) بن کلاب

بنو زہرہ — زہرہ بن کلاب

اسدی — اسد بن عبدالعزی بن قصی (نمبر ۶)

مطلبی — مطلب بن عبدمناف (نمبر ۵)

بنو امیہ — امیہ بن عبدالشمس بن عبدمناف

نوفلیون — نوفل بن عبدمناف

بنو ہاشم — ہاشم بن عبدمناف

یہ وسیع نسبی تانا بانا اتنی دور تک پھیلا ہوا ہے۔ کہ مراتب اعلیٰ پر فائز ہونے والے بیٹا زرقلاشے

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مربوط ہیں۔ مثلاً حضرت عمر فاروق کا نسب ذراچ بن عدی بن کعب (نمبر ۹)

اور حضرت ابو عبیدہ کا نسلی رشتہ ذراچ بن عدی سے ملتا ہے۔ سیدہ آمنہ (والدہ حضور) وہب بن عبدمناف

بن زہرہ بن کلاب (نمبر ۷) کی اولاد ہیں۔ کلاب بن مرہ ہی کے بھائی تیمم کی اولاد میں سے حضرت ابو بکر ہیں۔ سعد

(یکے از عشرہ مبشرہ) مالک بن ابیب بن مناف کے واسطے سے حضور کے تعلق دار ہیں عثمان بن طلحہ کلینہ

کعبہ عبدالدار بن قصی (نمبر ۶) کے صلب سے ہیں۔ حضرت زبیر (یکے از عشرہ مبشرہ) عوام بن خویلد بن اسد بن

عبدالعزی بن قصی (نمبر ۶) کے فرزند ہیں۔ اسی طرح حضرت خدیجہ طاہرہ خویلد بن اسد بن عبدالعزی بن قصی

کی صاحبزادی تھیں اور ورقہ بن نوفل بن خویلد ان کے بھائی تھے۔ حادث بن مطلب بن عبدمناف (نمبر ۵)

کے تین بیٹے ابو عبیدہ (شہید بدر) طفیل اور حصین مشہور صحابی تھے۔ امام شافعی کا نسب بھی مطلب ہی سے

جا کر ملتا ہے۔ حضرت عثمان امیہ بن عبدالشمس بن عبدمناف کی لڑی میں شامل ہیں۔

حضور کے چچاؤں کی تعداد میں روایات کا اختلاف ہے دو کے حالات ہی محفوظ نہیں ہیں۔ ایک

چچا مزار نے بہت پہلے وفات پائی۔ آپ کے چچاؤں میں حسب ذیل شخصیتیں بہت نمایاں تھیں جن کا تعلق اسلامی تحریک کی تاریخ سے ہے۔ اور جن کے حالات بھی محفوظ ہیں۔

ایک چچا حارث تھے جو دورِ اسلام سے قبل ہی فوت ہوئے ان کے چاروں بیٹے نوفل، عبداللہ، ربیعہ اور ابوسفیان دائرہ اسلام میں داخل ہوئے اور اسلامی تاریخ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہی ربیعہ بن حارث ہیں جن کے خون کا مطالبہ اپنی طرف سے حضور نے سب سے پہلے ساقط کر کے فتح مکہ کے موقع پر اعلان کیا تھا کہ جاہلیت کے مطالبہ ہائے خون آج ختم کیے جاتے ہیں۔

ایک چچا ابوطالب تھے جنہوں نے حضور کی حمایت کا حق ادا کیا۔ اور اسلامی تحریک میں باوجود باہر رہنے کے دل و جان سے پوری پوری مدد پہنچائی۔ ان کے چار بیٹوں میں سے تین اسلام میں آئے اور ہر ایک نے مقام بلند حاصل کیا۔ آج کون عقیل بن ابی طالب، جعفر طیار اور علی ابن ابی طالب کے ناموں سے ناواقف ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ابوطالب کی دونوں صاحبزادیوں اُمّ ہانی اور حبانہ بھی نور اسلام سے بہرہ مند ہوئیں۔ امّ ہانی کا نام واقعہ معراج کی وجہ سے بہت ہی نمایاں ہوا۔

ایک چچا حمزہ تھے جنہوں نے معرکہ اُحد میں شہادت پائی اور ان کی نعش کے ساتھ بندہ نے نہایت درندگی کا سلوک کیا۔ جس کا حضور کو سخت صدمہ ہوا۔ یہی تھے جنہوں نے حضور کے خلاف ابوجہل کی بدسنوکی پر غیرت دکھائی اور اُسے اڑے ہاتھوں لیا۔ اور بڑے چیلنج کے ساتھ اس کا قبول کیا۔

ایک چچا عباس بن عبدالمطلب تھے۔ انہوں نے بھی شروع سے سرپرستانہ طرز عمل رکھا۔ خصوصاً بیعت عقبہ کے وقت گفتگو میں بڑا اہم حصہ لیا۔ اور انصار کو ان کی ذمہ داری کی نزاکت پر توجہ دلائی۔ عبادہ زین مکہ میں رہ کر حضور کو حالات سے باخبر رکھا۔ اور جب کشمکش کے نازک مراحل سے تحریک گزر گئی تو پھر اپنے اسد کا اعلان کیا اور مدینہ چلے گئے۔

ایک چچا زبیر بھی بعثت سے قبل انتقال کر گئے تھے۔ نیک دل تھے اور حلف الفضول کے قیام میں انہوں نے بڑی جدوجہد کی تھی۔ انہی کے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر کا نام تاریخ اسلام میں درخشاں ہوا۔

ایک چچا ابولہب تھا۔ یہ نہ صرف کٹر مخالف تھا بلکہ مخالفانہ محاذ کا سرگرم کمانڈر تھا۔ اس کی بیوی بھی پکی دشمن اسلام تھی اور حضور کو اذیت دینے میں پیش پیش رہتی اس شخص کا انجام بڑا ہی عبرت ناک ہوا۔ طاعون سے موت ہوئی۔ تین دن لاش پڑی سڑتی رہی۔ لوگ قریب نہ جاتے تھے۔ آخر دیواروں پر سے اتنے پتھر پھینکے گئے کہ لاش اُن کے ڈھیر میں دب گئی اور یہ ڈھیر قبر بنا دیا گیا۔ ابولہب کی بیوی بھی رسی کا پھندا گلے میں پڑنے سے عبرت کی موت مری۔ ابولہب کے دو بیٹے بحالت کفر مرے اور دو۔ نے جنگ حنین کے موقع پر حضور کی اطاعت اختیار

کی۔ درہ بنت ابی لہب کو بھی اسلام لانے کی سعادت ملی۔

حضور کی پھوپھیوں میں ایک ام حکیم بیضا تھیں۔ کزیر بن ربیعہ (نسل عبدمنات) کی زوجہ تھیں۔ ان کے فرزند عامر فرقہ نامہ کے دن اسلام میں داخل ہوئے اور پھر عبداللہ بن عامر بھی صحابی ہوئے اور درہ عثمانی میں دائی نثر اسان بنے۔ انہی ام حکیم کی دختر اروی حضرت عثمان ذوالنورین کی والدہ ہیں۔ دوسری پھوپھی امیمہ تھیں جن کا نکاح بحش بن رباب سے ہوا۔ ان کی ایک صاحبزادی ام حبیبہ عبدالرحمن بن عوف کی اہلیہ تھیں۔ دوسری صاحبزادی محمدہ کا پہلا نکاح مصعب بن عمیر، دوسرا اللہ بن عبداللہ سے ہوا۔ دوسرے نکاح سے محمد اور عمران دو فرزند اسلام کے علمبردار بنے۔ عبداللہ بن حش معرکہ احد میں شہادت پا کر اپنے ماموں حمزہ کے ساتھ مدفون ہوئے۔ نسیری پھوپھی عاتکہ تھیں جنہوں نے جنگ بدر سے قبل رویائے صادقہ دیکھا اور اس سلسلے میں طنز کیا گیا کہ اب تو بنو ہاشم کی لڑکیاں بھی نبوت کرنے لگیں۔ چوتھی پھوپھی حضرت صفیہ تھیں جو اولاً حارث بن حرب بن امیہ کے نکاح میں تھیں۔ بعد میں یوہ ہو کر عوام بن خویلد کے ازدواج میں گئیں۔ اس نکاح سے زبیر (یکے از عشرہ مبشرہ) متولد ہوئے۔ سائب بن العوام بھی ان کے بطن سے ہیں جنہوں نے معرکہ ہاتھ جہاد میں نمایاں حصہ لیا۔ انہوں نے حمزہ جیسے بھائی کی لاش خاک و خون میں پڑی دیکھی اور زندگی کا جو سلوک اس کے ساتھ روا رکھا گیا تھا، اس پر انتہائی صبر کا مظاہرہ کر کے انہوں نے ایک زریں مثال قائم کی۔ پانچویں پھوپھی بڑھ تھیں، جو عبدالاسد بن ہلال کی زوجہ تھیں۔ ابوسلمہ انہی کے فرزند ہیں۔ جو ام المومنین ام سلمہ کے پہلے شوہر تھے ایک پھوپھی جن کا نکاح عمیر بن دہیب سے ہوا تھا اروی ہیں۔ ان کے فرزند طلیب نے جب انہیں اپنے قبول اسلام کی اطلاع دی تو انہوں نے کس والہانہ جذبہ سے کہا کہ ا۔

”تیرے لیے تیرے ماموں کا بیٹا سب سے بڑھ کر خدمت اور مدد کا حقدار ہے۔ بخدا اگر

ہم عورتوں کو بھی مردوں جیسی طاقت ہوتی۔ تو ہم ان کا بچاؤ کرتیں، اور اس کے دشمنوں کو

جواب دیتیں۔“

ان لفظوں میں ایمان بھی موجزن ہے۔ اور ایک پھوپھی کی سچی محبت بھی بول رہی ہے حضور کے وسیع نسبى تعلقات کے اور بہت گوشے ہیں۔ مگر یہاں ہم صرف قریب ترین دائرے کی ایک محدود جھلک دکھا کر یہ حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حضور کی ان قرابتوں نے مختلف مراحل پر تحریک کے حق میں مفید اثرات دکھائے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ چونکہ کشمکش اصولی اور اساسی اور ہمہ گیر ہونے کی وجہ سے بڑی سنگین تھی اور قریش

نے بڑا مضبوط مخالفانہ محاذ دیر تک جمایا۔ لیکن اندر ہی اندر قرابتیں اپنا کام لیتی رہیں ہوا شتم نے بحیثیت محبوبی درمیان کے مقابلے میں حامیانہ ردیہ کا ثبوت دیا۔ قرابت مندی کی وجہ سے ابو جہل کے ظلم پر حضرت حمزہ کا خون کھول گیا۔ اور وہ جاہلی محاذ چھوڑ کر حضور کے ساتھ ہو گئے۔ ابو البختری نے محصوری کے زمانے میں ابو جہل کو اس زیادتی پر ٹوکا کہ وہ کسی غذائی بہیرہ کو شعب بی طالب میں جانے سے روکے حضرت عباس نے خاموشی سے مکہ میں رہ کر حضور سے تعاون کیا۔ قریش کی مجال میں بارہ گفتگوؤں میں اپنی قرابتوں کی وجہ سے حامیانہ رنگ پیدا ہو جاتا رہا۔ اور لوگوں نے یہ تک سوچا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کم از کم مکہ سے باہر عرب میں کام کرنے دیا جائے اور کامیابی ہو جائے۔ تو اس کی کامیابی ہماری ہی کامیابی ہوگی۔ پھر برسوں تک عندم ضد کا چکر چلانے کے بعد جب مکہ فتح ہو گیا۔ تو لوگ حضور سے یہ کہتے سنا دیے۔ کہ ”تو ایک شریف بھائی ہے۔ اور شریف بھائی کا بیٹا ہے“ پھر یہی قرابتیں دوسری جانب سے بھی برابر اثر انداز ہوتی رہیں۔ حضور کے اعزہ و اقربا قیدی بن کر لائے گئے۔ اور اتوں کو بندھنوں کی سختی کی وجہ سے ان کی کراہیں آپ کی نینداڑنے کا باعث بنیں۔ مکہ میں قحط پڑا تو بھی حضور کا دل سچا، اور غلہ اور نقدی سے مدد کی۔ مکہ فتح کیا۔ تو اس کے باشندوں پر احسانات کی بارش فرمادی۔

#### (۲) مدینہ میں نہالی تعلقات :

حضور کے والد جناب عبداللہ کی والدہ فاطمہ بنت عمر مدینہ کے مشہور خاندان بنو نجار میں سے تھیں۔ اس سے پہلے حضور کے پردادا ہاشم نے بھی قبیلہ خزرج کی ایک خاتون بن بنت عمرو بن ثعلبہ سے نکاح کیا تھا۔ اس واسطے سے حضور کے والد جناب عبداللہ کے روابط بھی مدینہ میں خاصے گہرے تھے۔ اور اتفاق کی بات ہے کہ ایک تبارتی سفر میں وہیں آپ کے والد کی وفات ہوئی۔ اور قبر بنی۔ حضور کی والدہ مدینہ کے اقربا کو بلانے اور اپنے شوہر کی قبر کو دیکھنے کے لیے آپ کو لے کر (بچھڑے سال) یثرب گئیں۔ وہاں ایک ماہ تک حضور کا قیام رہا۔ دار النابغہ مستقر تھا ہجرت کر کے تشریف لے گئے تو ۴۴ برس قبل کا وہ دور آنکھوں میں پھر گیا۔ مجالس میں کبھی کبھار ذکر فرماتے۔ کہ یہاں ایک لڑکی ایسہ ہوتی تھی جو ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ فلاں قلعہ کے اوپر ایک پرندہ برابر بیٹھا کرتا تھا اور نچتے اُسے اڑایا کرتے تھے۔ اس گھر میں میری والدہ فلاں جگہ بیٹھا کرتی تھی۔ اور والدہ کی قبر فلاں جگہ بنائی گئی تھی۔ حضور نے یہ بات بھی بیان کی کہ بنو عدی بن النجار کی باؤلی (مادہ) میں میں نے تیرنا اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔ اسی سفر میں واپسی پر حضور کی والدہ کا انتقال ابواء کے مقام پر ہوا۔

ظاہر بات ہے کہ مدینہ سے آپ کے تحرکی تعلقات بعد میں جب نشوونما پانے لگے ہوں گے تو اس تعلق نے بھی اپنا اثر ڈالا ہوگا۔ مدینہ کے لوگ خصوصاً بنو نجار آپ کو اپنا قریبی عزیز سمجھتے ہوں گے۔ آپ کا استقبال

کرنے میں بنو نجار پیش پیش تھے۔ اور ان کی بچیاں بڑے والہانہ انداز میں خیر مقدم کے ترانے الاپ رہی تھیں۔

### (۳) رضاعی تعلقات :

ابولہب کی ایک کنیز ثویبہ کا دودھ آپ نے چند روز تک پیا تھا۔ اس کا اتنا لحاظ تھا کہ ثویبہ کے لیے مدینہ سے کپڑے بھجوا کر تے تھے۔ مستقل رضاعت حلیمہ سعدیہ کے حتمے میں آئی جو بنو ہوازن سے تعلق رکھتی تھیں۔ بڑی لڑکی حذافہ (جن کا لقب الشماء تھا) نے بچپن میں حضور کی خدمت کی تھی۔ غزوہ حنین کے موقع پر گرفتار ہو کر آئیں۔ انہوں نے فوجی نگرانوں سے کہا کہ میں تو تمہارے قائد کی بہن ہوں۔ یہ آپ کے سامنے لائی گئیں تو حضور نے بڑی مسرت سے استقبال کیا۔ اور اعزاز کے لیے چادر بچھائی۔ اور آپ پر رقت طاری ہو گئی پھر فرمایا۔ اگر چاہو تو میرے پاس رہو اور چاہو تو تمہیں قبیلے میں پہنچا دیا جائے۔ انہوں نے واپس جانے کی خواہش کی۔ آپ نے بہت کچھ دے کر رخصت کیا۔ انہیں اسلام لانے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

رضاعت کا یہی رشتہ تھا جس کا واسطہ معرکہ حنین کے بعد بنو ہوازن کے وفد نے اپنے قیدی چھڑانے کے لیے آپ کے سامنے دیا۔ اور آپ نے بنی ہاشم کے سارے قیدیوں کو فوراً رہا کر دیا۔ اور آپ کی تقلید میں ساری جماعت نے بنو ہوازن کے قیدی چھوڑ دیے۔

### (۴) اپنی صاحبزادیوں کے نکاح :

سیدہ زینب کا نکاح مکہ ہی میں ابوالعاص بن ربیع سے ہو گیا تھا۔ ابوالعاص کی والدہ حضرت خدیجہ کی سگی بہن تھیں۔ یعنی حضور ان کے خالوتھے۔ سیدہ زینب نے والدہ کے ساتھ ہی اسلام قبول کیا تھا۔ وہ ہجرت کر کے مدینہ آگئیں۔ بعد میں ابوالعاص بھی ایمان لائے اور مدینہ آ گئے۔ سابق نکاح بحال رہا۔ میاں بیوی میں دلی تعلق بڑا گہرا تھا۔ چنانچہ مکہ والوں کی طرف سے ابوالعاص کو مجبور بھی کیا گیا کہ وہ حضرت زینب کو طلاق دے دیں۔ مگر وہ نہ مانے۔ اسی تعلق کی وجہ سے یہ حالت کفر ابوالعاص کو مسلمانوں کے اذن سے بغیر فدیہ کے رہا کیا گیا اور ایک بار قبضے میں آیا ہوا ان کا تجارتی مال بھی واپس کیا گیا۔

سیدہ رقیہ کا نکاح بھی مکہ میں حضرت عثمان بن عفان سے ہوا تھا یہ پہلا جوڑا ہے جس نے حضور کی تحریک اسلامی کے تقاضے سے راہِ خدا میں پہلے پہل اکٹھے ہجرت کی۔ ۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے بعد سہ ماہی میں حضور نے اپنی صاحبزادی ام کلثوم کا نکاح بھی باشارۃ الہی حضرت عثمان ہی سے کر دیا۔ اسی دوہرے تعلق کی بنا پر وہ ذوالنورین کہلائے۔

سیدہ فاطمہ کو حضور نے حضرت علیؑ کے نکاح میں دیا۔ گویا ابوالعاص کے علاوہ تحریک اسلامی کے دو بڑے

لیڈر اور حضور کے رفقاءے خاص نبی تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ ان ازدواجی رابطوں کے ذریعے حضور کے ساتھ گہری قرابت رکھتے تھے۔ یہ قرابت اسلام کے عظیم کام کو چلانے میں مدد تھی۔

### (۵) حضور کے ازدواجی تعلقات :

حضور کے ازدواجی تعلقات کے موضوع پر چونکہ متعصب مستشرقین نے اعتراضات کا ایک خازنار پیدا کر دیا ہے۔ اور ان کی وجہ سے ہمارے اندک ایک عنصر اس حقیقت واقعی پر مارے شرم کے زمین میں گڑ گڑ جاتا ہے کہ حضور نے متعدد نکاح کیے اور اسلام نے تعداد ازدواج کو ردارکھا۔ اس لیے ایک مختصر تمہیدی نوٹ میں ہمیں بعض توضیحات کرنی ہیں۔

پہلی بات یہ ذہن نشین کرنے کی ہے کہ انسانیت کا پہلا دور تاریخ (جسے ہم حضور کے زمانے تک پیدا ہوا پاتے ہیں) تکثیر نسل کا دور ہے۔ زمین کے قطعات حسب ویران پڑے تھے جہاں آبادی تھی وہاں بھی چھوڑی تھی۔ اور رزق کے ذرائع و وسائل کا میدان بھی کھلا پڑا تھا۔ بالکل فطری طور پر نوع انسانی میں ازویاد نسل کا چرچا پورے ذرے کے کام کر رہا تھا۔ اسی لیے اس دور کے کسی بھی تمدن کو نہیں اور کسی بھی مذہب کو دیکھیں، انسانیت معاشرہ میں تعداد ازدواج بہت بڑے بڑے پیمانوں پر پوری طرح موج رہا ہے۔ خود شائع انبیاء نے بھی اس کی اجازت دی اور بہت سے جلیل القدر انبیاء علیہم السلام جن میں خود انبیاء سے نبی اسرائیل نمایاں ہیں ان کے پاس کتبہ۔ اکاؤں کا انبیاء سے ذاتی رجحان اور مخصوص حالات کی بنا پر گھر بار کے بلعینوں سے کنارہ کشی اور جتنی ہی بڑے پنہاں سے کوئی نہ دلتی تھی۔ مگر اکثریت نے متبادل زندگی اختیار کی۔ اس دور کے اختتام کی حیرت انگیز نسل اور تعداد ازدواج کے اسی دور کے آخر میں آتے ہیں۔ اس دور کے لیے پہلی مرتبہ فرمان الہی سے تعداد ازدواج پر پابندی عائد ہوئی۔ حضور نے جو بھی شادیوں کیں وہ اسی اجازت سے کیں۔ جو شریعت الہیہ میں چلی آ رہی تھی۔

۱۔ اس پابندی کی حقیقت بھی اتنی ہے کہ تعداد ازدواج کی ایک طرح تو آخری حد پار تک مقرر کی گئی اور اس کے بعد عدالتی بھاری ذمہ داری کا احساس دلا کر ایک زوجگی کے حق میں ترجیحی نذر اختیار کیا گیا۔ لیکن تعداد ازدواج کو حرام نہیں ٹھہرایا گیا۔ اس نئی گنجائش کی ضرورت بعض بہ وجہ سے تھی اور رہے گی۔ مثلاً اولین وجہ یہ ہے کہ اسلام شہوت رانی اور بھاری کا کام سدا بہ کرتا چاہتا ہے اور اس کے لیے کرے انتہا کرتا اور سنگین سزائیں مقرر کرتا ہے۔ ایسے نظام میں ان لوگوں کے لیے راستہ رکھنا ضروری تھا جو جسمانی یا ذہنی ساخت کی وجہ سے نیز جنسی رجحان رکھتے ہوں۔ اس حقیقی ضرورت کو مغربی تمدن میں نظر انداز کرنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک زوجگی کے ساتھ نہ صرف دانشمندی رکھنے کی گنجائش نکالی گئی۔ بلکہ تجویز گری کا نظام بھی قائم ہوا اور اتنا پھیل چکا ہے کہ اس سے باقی اگلے صفحہ پر۔



دوسری بات یہ سامنے رہے کہ حضور کے اکثر بیشتر نکاح جنسی داعیہ کے زیر اثر نہیں بلکہ سخریک اور ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے پیش نظر عمل میں آئے۔ ان کی نوعیت یہی ہے حضور کا اپنا ارشاد محفوظ ہے کہ "صالی فی النساء من حاجۃ دارمی۔ روایت سہل بن سعد) یعنی میرے اندر عورتوں کے لیے کوئی جنسی طلب موجود نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ صحیح معنوں میں شادیاں حضور نے وہی کی ہیں۔ ایک حضرت خدیجہ سے، دوسری حضرت عائشہ سے۔ بقیہ نکاحوں کے لیے بعض اہم اجتماعی مصالح داعی ہوتے رہے۔ اور ان مصالح کی خاطر حضور نے اپنی مصروف ترین زندگی اور انتہائی فقیرانہ معاشرت پر بھاری بوجھ ڈال کر انسانیت کے لیے قربانی دی ہے۔

خیال کیجئے کہ ایک نوجوان جو ۲۵ برس تک عفت مآبی اور حیاداری کا نمونہ اس معاشرے میں پیل کرتا ہے جس میں شراب اور زنا کلچر کے بڑے قابل فخر پہلو بنے ہوئے ہوتے۔ ۲۵ برس کو پہنچ کر بھی وہ لذت پسندی کا عام معیار چھوڑ کر کسی نوعر حسینہ کے بجائے ۴۰ سال کی ایک بیوہ کا انتخاب کرتا ہے کیونکہ اس کے نسب العین میں وہی زیادہ مدد ہو سکتی ہے۔ اور پھر ازدواجی لحاظ سے عمر کے بہترین ۲۵ برس اسی ایک خاتون کے ساتھ گزار کر پچاس سال پور کر لیتا ہے۔ کیا اس کے بارے میں وہ گھٹیا باتیں سوچی جاسکتی ہیں۔ جن کا پھر چارٹرمنین نے کیا ہے۔ پھر ازدواج کی اشریت کا دور ۵۵ سے ۵۹ سال کا دور ہے۔ عرب جیسے گرم ملک کے لحاظ سے اس عمر میں جنسی رجحانات انحطاط کی طرف جا چکے ہوتے ہیں۔ پھر خود ازدواج کی عمروں کو دیکھیے تو دد کے علاوہ بقیہ کی عمریں بوقت نکاح ۲۰ سال سے اوپر تھیں۔ اور پانچ کی عمریں تو ۲۶ تا ۵۰ برس تھیں۔ کیا حضور کے لیے نوجوان ترین اور حسین ترین لڑکیوں کی کمی تھی ؟

بقیہ مغز گزشتہ سجات پانا مشکل ہو گیا ہے یہ نیز آزاد محبت کے نام سے زنا بالرضا کا ایک طوفان اُدر رہا ہے اس حالت کو محدود تعدد ازدواج کے اسلامی قانون کے مقابلے میں دیکھیے کہ کون سی صورت بہتر ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اولاد کی فطرت خواہش یک زوجگی سے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ تیسری وجہ ایک عورت کی مستقل مرینا نہ حالت ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے اسے طلاق دے کر مصیبت میں ڈالے بغیر اس کا شوہر فطری تقاضوں کو پورا کر کے۔ چوتھی وجہ اس گنجائش کو چھوڑنے کی یہ ہے کہ بسا اوقات خاندانوں کی سیاست، انتقاموں کے چکر، وراثت کے جھجیلے، یتیموں اور جوانوں کی کفالت کے مسائل کسی خاص صورت نکاح ہی سے حل ہو پاتے ہیں۔ مثالیں موجود ہیں (قدیم بھی اور تازہ ترین بھی) کہ سلطنتوں، وزارتوں، قیادتوں کے استحکام کے لیے کبھی کبھار کوئی رشتہ ازدواج ہی واحد ذریعہ بنتا ہے۔

پھر ایسا گھٹیا اعتراض اٹھانے والوں کو سوچنا چاہیے تھا کہ وہ ہستی جس نے اپنے سر پر اتنے بڑے کام کا بوجھ اٹھایا تھا کہ نہ دن کو سکون میسر تھا اور نہ رات کو آرام کا کوئی لمحہ اور وہ مجسمہ عفت و حیا کہ جس نے انسانیت کو پردے کا عظیم بارکت قانون عطا کیا (خود اس قانون پر بھی یورپ کے لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں) اور آدم زاد کو قلب و نظر پر قابو رکھنا سکھایا۔ اور وہ ہستی کہ جس کے اوقات کا زیادہ حصہ ریاست اور معاشرہ کے وسیع مسائل میں کھپ جاتا تھا اور جس کے نجی اوقات پیروں کو متورم کر دینے والے لمبے لمبے قیامِ صلوة میں صرف ہوتے تھے آخر کیسے اس کے بارے میں وہ فضول باتیں سوچی جاسکتی ہیں۔ پھر لذت پسند بادشاہوں اور ناسخوں کی سی کوئی ریاست اس میں نہیں دکھائی دیتی۔ نہ وہ جابر و ظالم ہے نہ اسے شراب اور موسیقی اور ناخبرہ لباسوں کے دلچسپی ہے۔ بلکہ اُن نے معاشرہ کو ان نفسانیت انگیز تفریحات سے پاک کیا۔ نہ اُس نے ازواج کو دنیوی عیش و عشرت کے مسائل شراہم کر کے دیے۔ اور نہ رشیم اور سونے سے ان کے بدنوں کو سجا یا۔ بلکہ اپنی درویشانہ زندگی کے رنگ سے ان کو بھی رنگ دیا۔ پھر ان کی ایسی ناز برداری کبھی نہیں کی کہ ان کی خوشنودی تحریک کے مفاد پر مقدم ہو جائے یا ان کے سے ادنیٰ اصول بھی ترک کرنا پڑے بلکہ ایسے موقعوں پر ان کی سختی سے تادیب کی۔ اور ایک موقع پر ان کو ایک معیار بلند کرنے کے مطالبے پر ہی صاف صاف اُن سے کہ دیا کہ اس فقیری میں ساتھ دے سکو تو ہتھیار رخصت کیے دیتا ہوں۔ کیا یہ سارے احوال مل جل کر ان لغو اعتراضات کا پوری طرح قلع قمع نہیں کر دیتے۔ حضور کے متعدد نکاح جن خاص ضرورتوں پر مبنی تھے وہ یہ تھیں :-

● قبائلی نظام کا خاصا ہے کہ دائرہِ عصبیت بڑا محدود ہوتا ہے اور اُس کو دیکھ کر لوگوں کو یہ گمان رکھی جاتی ہیں۔ قبائلی ذہن اپنے اور پرانے ہیں پورے تقصب کے ساتھ ذوق ارتقا کے بغیر۔ ان کے غلبے ہونے سے بے شمار قبائل کو جوڑنے کے لیے یہاں انسانیت کی نظر کی ضرورت تھی۔ وہاں ان کی ایسے تعلق رکھتی۔ جو سب کے لیے نہیں تو بیشتر اہم قبائل کے لیے اپنائیت رکھتی ہو۔ عرب میں قحط و اسیرانہ زندگیوں کو ختم کرنا کسی ایسے شخص کے لیے تو سرے سے ممکن ہی نہ تھا جس کا اپنا کوئی قبیلہ نہ ہو۔ بلکہ عزیز قبیلہ نہ ہو۔ کامیابی سے تمہیں تک لے جانے کے لیے بین القبائلی روابط کی ضرورت تھی۔ یہ سیاسی ضرورت تھی۔ اور اس کے علاوہ علاقہ کے لیے داعی بنی۔

مثلاً اُمّ المؤمنین حضرت جویریہ کے معاملے کو لیجیے۔ یہ بنو نضیر کے قبیلے کی خاتون تھی۔ جو ان کے طاقتور تھا۔ اور ڈاکہ زنی اور لوٹ مار میں معروف۔ خود حضرت جویریہ کا والد نامی ریحان تھا۔ اسلامی معاہدے کے بعد قبیلہ نے شروع ہی سے سخت عداوت اختیار کی۔ یہ نہ نفلہ کو قبول کرنے پر تیار تھے۔ نہ معاہدہ روابط کے لیے آمادہ بلکہ مخالفت کے ہر محاذ پر موجود۔ آخر اس قبیلہ کو فوجی طاقت سے دبا گیا۔ حضرت جویریہ قبیلوں میں انہیں حضور

اُن کا نکاح ہوا۔ توجاعت کے لوگوں نے پورے قبیلہ کے قیدیوں کو رہا کر دیا کہ یہ لوگ رسولِ خدا کے سسرالی رشتہ دار بن گئے ہیں اور اب ہم اُن کو قید میں نہیں رکھ سکتے۔ اس نکاح کی برکت دیکھیے کہ پورا قبیلہ رہزنی چھوڑ کر امن پسند اور مطیع نظام بن گیا۔ اب مدینہ کی حکومت کا قائد ان کا اپنا عزیز تھا۔

اسی طرح اُمّ المؤمنین حضرت میمونہ کے معاملہ کو لیجیے۔ نجد کا علاقہ جہاں انتہائی سیاسی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ قریش کا ایک تجارتی راستہ عراق جانے کے لیے ادھر سے بھی گزرتا تھا، وہاں دعوت کے لیے اس کی زمین بے حد سنگلاخ ثابت ہوئی۔ یہاں کے لوگوں نے ایک دعوتی و تعلیمی وفد کے ستر قیمتی افراد کو شہید کر دیا تھا پھر متعدد بار اہل نجد نے اسلام کے خلاف فتنہ انگیزیاں کی تھیں۔ حضرت میمونہ سردارِ نجد کی اہلیہ کی بہن تھیں حضور سے اس نکاح کے ہوتے ہی فضا بدل گئی۔ اور نجد مدینہ کے زیر اثر ہوتا گیا۔ علاوہ ازیں اُن کی متعدد بہنیں نہایت ممتاز سرداروں سے بیاہی ہوئی تھیں۔

پھر اُمّ المؤمنین اُمّ حبیبہ کے بارے میں غور کیجیے۔ کہ یہ قریش کے سردارِ اعلیٰ ابوسفیان کی صاحبزادی تھیں۔ اس نکاح کے بعد ابوسفیان پھر کبھی حضور کے مقابلے پر میدان میں نہیں آیا اور اُس کا زور مخالفت ٹوٹ گیا۔ بڑی حد تک اس نکاح نے فتح مکہ کا راستہ ہموار کر دیا۔

اسی طرح حضرت صفیہ کو لیجیے۔ یہ ایک اونچے یہودی سردار (حیتی ابن اخطب) کی صاحبزادی تھیں اُن کے خاندانی مرتبے کے پیش نظر یہ کسی طرح موزوں نہ ہوتا کہ اُن کو کسی معمولی گھر میں جگہ ملتی، حضور نے اُن سے نکاح کیا۔ تو پھر یہود کبھی مخالفانہ محاذ کا احیاء کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ حضرت صفیہ حضور کے اذن سے یہودی اعزہ کی مانی خدمت بھی کرتی رہتی تھیں۔

حضرت حفصہ کے نکاح کے پس منظر میں دوسرے محرکات کے علاوہ ایک سبب یہ بھی کام کر رہا تھا کہ اسلامی معاشرہ کے لیے جن رفقاء نے خاص کو حضور نے اپنا مشیر بنا کر قیادت کی ترتیب دی۔ ان میں سے چار سرکردہ ساتھیوں سے آپ نے گھر سے ذاتی نلاق قائم کیے۔ حضرت ابو بکرؓ کے گھر سے آپ نے نکاح کیا۔ حضرت عثمانؓ کو یکے بعد دیگرے دو صاحبزادیاں نکاح میں دیں۔ حضرت علیؓ کے گھر کو جناب فاطمہؓ سے زینت بخشی۔ اندر ہی صورت حضرت عمرؓ کو اس حلقہ قرابت سے باہر نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ حضور نے اُن کی صاحبزادی کو بھی اپنے نکاح میں لے لیا۔ اس طرح حضور نے مرکزی کڑی بن کر مستقبل کے ان قائدین کو باہم دگر مربوط کر دیا۔

اسی طرح حضرت سوہ بنت زعمہ کا تعلق بنو عدی بنو نجار (مدینہ) سے تھا۔ ان کا پہلا نکاح سکران بن عمرو سے ہوا تھا۔ اور اسمیل بن عمرو جو معاہدہ حدیبیہ کے وقت قریش کے نمائندے تھے، سکران کے بھائی تھے سکران نے حبش میں انتقال کیا۔ تو حضور نے ایک طرف تو اُن کی تالیفِ قلب کے لیے اور دوسری طرف حضرت خدیجہ

کے انتقال کے بعد اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے نکاح کر لیا۔ یہ واقعہ دسویں سال نبوت کا ہے حذرت سودہ کی عمر بوقت نکاح حضور کے برابر یعنی ۵۰ برس تھی۔ بعد میں انہوں نے ازدواج کے جسمانی ندمان سے بے نیازی اختیار کرنی تھی۔

— حضور نے ازدواجی رابطوں کو قائم کرنے میں ایک اور سہم بلکہ ناگزیر ضرورت ہے کہ نوجوانوں کے لیے خاص خیال بھی رکھا ہے۔ تحریک اسلامی کامیابی سے اپنے مرحلہ جمعی طے کر سکتی ہے۔ یہ سب کچھ دونوں کے ساتھ کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حلقے میں بھی متوازی طور پر کام جاری ہو۔ یہ کام بغیر اس کے کیسے ہو سکتا تھا کہ عورتوں کی رہنمائی اور تعلیم کے لیے خود انہی کی نسیف میں سے کچھ فزین خواتین کو بہتر قیام اور کاموں کے تیار کر دیا جائے۔ اسلامی نظام حجاب کے ساتھ یہ ضرورت صرف دائرہ ازدواج ہی میں پوری ہو سکتی ہے۔ یہ ضرورت خود کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھر کی مستورات کو تحریک اسلامی کی ندرت کے لیے تیار کرے اور انہیں نفاذ کے لیے زیادہ بڑی ذمہ داری ہے۔ کہ وہ اپنے گھر کو نمونہ کا گھر بنا سکے۔ اور اپنے گھر میں اسلامی تعلیم و تربیت کے لیے تیار کرے۔ یہی ضرورت ہے جس کے تحت خود قرآن میں حضور کو تیار کرنا اور انہیں تعلیم و تربیت کے لیے تیار کرے۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ کے علاوہ حذرت حفصہ اور سہیلہ بھی تیار ہوئیں۔ ان کی قیادت کے قابل بنیں اور بقیہ ازواج نے بھی اخلاقی حیثیت سے اپنے آپ کو قابل تعلیم و تربیت بنا لیا۔

— بااوقات ازدواجی روابط میں حضور کو دوسرے ذائقے کی تائید قلب کا نتیجہ ہوا۔ انہوں نے عورتوں کو مثلاً بنی بچھو بھی زیادہ حضرت زینب بنت جحش کا نکاح خود آپ ہی سے باہر راہ میں عداوت سے بچھو کر لیا۔ کہ نامزدانی امتیازت کی تاب مدد بنیں تو تباہی و بربادی و قسمتی سے تادم ہو گیا۔ وراثت میں انہوں نے زینب کی دل شاکلی میں ہے اور حضور اس میں اپنی ذمہ داری بھی محسوس کرتے ہوں گے۔ یہ نکلان کے لیے ایک شکل میں تلافی فرما سکتے تھے۔ مگر جاہلیت کی ایک غلط روایت حامل خلیفہ زینب کو تباہ کر دیا۔ اور وہ جاہلیسی صورت میں باپ بیٹے کے سے حقوق ہم سامنے میں تے تے تھے۔ اس روایت کو انہوں نے رد کیا اور باذن خاتون حضرت زینب کو آپ کے نکاح میں دیا۔

پوپ نے ام حبیبہ بنت ابوسفیان کے نکاح کی بیانیہ سعادت میں کی ہے اور اس میں اس کے نکاح کی تھی۔ یہ عیبر اللہ کے باہر ہی ہوں تھیں۔ اور انہی کے ساتھ جنت لڑے حمل میں وہاں موجود انہی کی پوری تھی۔ شہر بوشی میں بند ہو گیا۔ ام حبیبہ نے اسلام پر ثابت دل کیا۔ یہ حال کو اب اللہ ہی میں شہر کا تیار کرنا اور پھر مہمان دوہر آمد مرقا حضور نے فی حدیث میں انہوں نے امیرہ صفدی کو شاہ شجاعتی کے پاس نکاح کا پیغام دے کر بھیجا۔ ام حبیبہ کو اطلاع پہنچی تو انہوں نے انہوں کو سنا کہ وہ سنا کے والی شہر کی زندگی داپنے لیا۔ اس سے آپ

شاہِ نجاشی نے خود نکاح پڑھایا۔ اُمّ حبیبہ نے اپنے ماموں کے لڑکے خالد بن سعید بن ابی العاص کو وکیل بنایا۔ چار سو دینار مہر شاہِ نجاشی نے اپنے ہاں سے ادا کیا۔ اور صیافت کی۔ بعض روایات کے بموجب مدینہ میں تجدیدِ نکاح کی گئی اور ولیمہ ہوا۔

اسی طرح اُمّ المساکین زینب بنت خزمیرہ بن الحارث ہلالیہ (بنی بکر بن ہوازن) حضور کے پھوپھی زاد عبداللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں۔ ان کی شہادت (غزوہ اُحد) میں ہوئی تو حضور نے ان کو بیوگی سے نکال کر اپنے حرم میں لے لیا۔ ظاہر بات ہے کہ یہ خالص گھریلو معاملہ تھا اور تالیفِ قلب کے ساتھ اس میں خاندانی پہلو بھی ملحوظ ہونگے۔

بروٹے تحقیق جملہ گیارہ نکاح حضور نے کیے۔ اس سے زائد کی کمزور روایات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتیں ان میں سے حضرت خدیجہ قبل ہجرت (دسویں سال نبوت میں) اور زینب بنت خزمیرہ صرف ۳ ماہ ازدواجِ نبوی میں رہ کر ۳۷ میں فوت ہوئیں۔ حضور کی عمر کا بالکل آخری دور ہے جس میں کل ۹ ازدواجِ مطہرات بیک دم حرم میں تھیں اور ان میں سے بھی ایک (حضرت سودہ) دنیوی رغبتوں سے بالکل بے نیاز ہو گئی تھیں۔ لیکن جب قانونِ الہی نے پابندی عائد کر دی تو اس کے بعد پھر آپ نے کوئی نکاح نہیں کیا۔ نام مسلمانوں کے مقابلے میں قانون نے ایک استثنا آپ کو دیا۔ عام مسلمانوں کو تو یہ حکم تھا کہ اگر چار سے زیادہ کسی کی بیویاں ہوں تو وہ زائد تعداد کو طلاق دے دے۔ لیکن حضور کو اجازت دی گئی کہ زائد ازدواج کو پاس رکھیں۔ اس استثنا کی وجہ یہ تھی کہ ازدواجِ النبوی کو ضروریاتِ دینی کے تحت اہمات المؤمنین قرار دے کر محرمات میں داخل کر دیا گیا تھا۔ اب اگر ان میں سے کچھ کو حضور سے طلاق دلوائی جاتی تو وہ بالکل تنہا ہو کے رہ جاتیں۔

اب حضور کے ازدواجی علاقہ کی سیاسی اہمیت کو دیکھیے کہ ان کی وجہ سے ایک طرف مکہ کے قبائل اور ہماجر برادری سے اور دوسری طرف عام قبائل عرب سے قائم نظام کو جو رشتہ یگانگت حاصل ہوا۔ اس کی وسعت ظاہر کرنے کے لیے ہم متعلقہ خاندانوں اور قبائل کے نام درج کرتے ہیں۔ بنی اسد بن عبد العزیٰ - ۲۔ بنی عامر بن لوی - ۳۔ بنی تمیم - ۴۔ بنی عدی - ۵۔ بنی مخزوم - ۶۔ بنی امیہ - ۷۔ بنی اسد بن خزمیرہ - ۸۔ بنو مصطلق - ۹۔ یہود عرب - ۱۰۔ بنو کلاب۔ کلب و سلیم - ۱۱۔ بنو کنندہ۔

ان قبائل کے علاقوں کو اگر جغرافیائی تقسیم کے لحاظ سے دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ فی الواقع حضور کی شخصیت بین القبائلی درجہ پر آگئی تھی جو تمام بڑے بڑے قبائل کے لیے مرکزی حیثیت رکھنے کی وجہ سے اس عظیم وحدت کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی جس کا نقصان اسلامی تحریک کرتی تھی۔ بے شمار مزاحمتوں اور باغیانہ عزائم کو ان تعلقات نے ختم کر دیا۔ بلکہ بہت ہی دیرینہ تاریخی عداوتیں تک بے اثر ہو گئیں سوچیے کہ

ایک عظیم نسب العین جس سے ساری انسانیت کو بہرہ مند ہونا تھا — ایک نظام عدل و امن اور ایک نامیادہ  
رابطہ اخوت کیا اتنی قیمتی چیز نہ تھا کہ اس کے لیے اگر تعدد ازدواج سے عرب کے قبائلی ماحول میں راستہ ہموار  
ہونا ہو تو کیا جائے۔ پھر پورے عرب کو وحدت اور نظم اور امن اور تمدن کی راہ پر ڈالنے کے لیے اگر یہ تدبیریں  
طیور پر مفید رہی تو آخر اس پر سے دے کیوں؟

درحقیقت دیکھا جائے تو یہ حضور کا ایثارِ عظیم تھا۔ کہ آپ نے انسانی سبداقی کے مشن کو کامیاب کرنے  
کے لیے اپنی وسیع مصروفیات کے ساتھ آخری عمر میں عیال داری کا اتنا بوجھ اٹھایا۔ اور اپنے عالمِ فقر جس کو مشکوں  
سے اہل بیت کے نان و نفقہ کے انتظامات کیے اور گھر داری کے کتنے جھمیالوں کو اپنے سر لیا۔ کوئی آدمی تصور  
نہیں کر سکتا۔ کہ ان سارے حالات کی کجانی سے کسی آدم زاد کو کوئی لمحہ عشرت تو کجا سکون کی کوئی گھڑی بھی  
سکتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اپنے اعلیٰ مقصد کی خاطر حضور کا یہ ایثار تھا کہ تعدد ازدواج کا ہر تھکان  
گویا جہاں تک تحریکِ اسلامی کے سیاسی پیوند نسق ہے۔ محض انسانیت کے وسیع ذوق اور وسیع  
تذوق لہتے صاف کیے ہوں گے۔ اور عوام کے لیے اسلام کی طرف بڑھنا سانا کر دیا ہوگا۔

عوام خود آگے بڑھتے ہیں :

کسی بھی اصولی انقلابی تحریک کی حرح محسوس انسانیت کے کہتا ہے کہ وہ بڑھنے اور بڑھنے والی  
ہوتی ہے۔ ایک وہ دور جب کہ سدھی تحریک خود عوام کے قریب باجا کر ان کو سنا کر ان کی نفسی اور  
عوام خود آگے بڑھنے لگے۔ در اسلام کے دروازے پر خود دستک دینے لگے۔ اور خود  
دور دور تو وسیع ہوتا ہے۔ اور یہ جب آچکنا ہے۔ تو پھر تمام جمعیں متحد ہوتی ہیں۔ اور  
چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر اس دور تک پہنچنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروں نے  
جنین کیے اور خون پسینہ ایک کر دیا۔ ایک طرف فوری دعوت سے میدان میں آنا شروع کر دیا اور  
مانڈ ہے۔ دوسری طرف اندلی دہرے ہیں دھاک دھاک دھاک اور انسان کو اس  
تیسری طرف سیاسی بصیرت کے نکاح سے اپنا لگا کر دیا کہ ہم لوگ معاشرے کی راہ راہ کو  
ہیں۔ اور چوتھی طرف میدان کارزار میں اپنا لوہا منوا لیا کہ ہم میں آتوں سے ٹٹے ہیں اور  
چبوا سکتے ہیں۔ دماغوں کو متاثر کیا۔ دلوں کو جھنجھوڑا۔ جذبات کو ساگر بنا۔ سعادت مند اور  
لگایا۔ غیر جنگ پسند قبائل کو معاہداتی نظام میں منسلک کیا اور جناب جو مخالفین کا جہلی رزم اور  
تب کہیں بنا کر وہ وقت آیا کہ عوام ہر چار جانب سے نئے مکرز امید۔ مدینہ۔ کی طرف  
یہ دور اس سال سے شروع ہوتا ہے جسے عام الوفود کا عنوان دیا گیا ہے یعنی وہ سال جس میں  
عرب کے گوشے گوشے سے قبائل نے اپنے وفود بھیجے۔ قبائل اسلام کے لیے سیاسی اتحاد

باندھنے کے لیے، محض تحقیق و تفتیش اور حالات کو سمجھنے کے لیے!! ہر طرف اسلام کی پائیں پیدا ہو گئی۔ ایک حرکت اور ایک بل چل کا آغاز ہو گیا۔ یہ دور فتح مکہ کے بعد کے تین سالوں ۵-۹ھ پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ گویا محسنِ انسانیت کی کاشت کردہ فصل کے برگ و بار لانے کا موسم تھا۔ گواجمالی ہیں ملحوظ ہے۔ لیکن سیرت کا یہ باب اتنا اہم ہے کہ وفود کا تذکرہ سامنے آنا چاہیے۔ کیونکہ وفود کی آمد اور ان کی بات چیت اور ان کے تاثرات میں نہایت ہی مفید اسباق ملتے ہیں پھر یہی بیان اس حقیقت کو واضح کر سکتا ہے کہ کس طرح عوام الناس چاروں طرف سے آ کر اسلام کے قدموں میں گرے۔ سیرت کی مختلف قدیم کتابوں میں مدینہ آنے والے وفود کی تعداد کم سے کم ۱۵ اور زیادہ سے زیادہ ۱۰۴ ملتی ہے۔ ہم ان میں سے صرف اہم اور نمایاں وفود کا تذکرہ کریں گے۔ ان میں سے بھی تفصیل صرف دو چار وفود کے متعلق دی جا رہی ہے۔ عام الوفود سے قبل ۸ھ میں ہی اکادکا وفود آنے لگے تھے۔ سو وہیں سے آغاز کرتے ہیں۔

### (۱) وفد قبیلہ مزینہ :

یہ بہت بڑا قبیلہ تھا اور اوپر جا کر اس کا سلسلہ نسب قریش سے مل جاتا تھا۔ مشہور صحابی نعمان بن مقرن اسی قبیلے سے تھے۔ ۸ھ میں اس قبیلہ کے چار سوا افراد کا عظیم وفد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اسلام کا بیمان باندھا۔ غالباً مدینہ آنے والا سب سے پہلا نمائندہ عوامی وفد ہی تھا۔ مدینہ سے واپسی پر ان کو نذرانہ کے طور پر کھجوریں دی گئیں۔

### (۲) وفد قبیلہ بنو تمیم :

یہ وفد بھی ابتدائی دور میں آیا۔ اور بڑے کٹر و فتر سے آیا۔ قبیلہ کے بڑے بڑے رؤسا (افرع بن حابس) زبرقان، عمرو بن الہنہ، نعیم بن یزید اور عیینہ بن حصن فزاری) خود شریک وفد تھے۔ اس وفد کی وجہ سے خاصی رونق رہی۔ اس وفد کے افراد مسجد میں داخل ہوئے تو بڑے اظہر طریقے سے حجرے کے قریب آواز دی۔ محمد اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) باہر آؤ! چنانچہ وحی الہی (الحجرات) نے ان کو شائستگی کا درس بھی دیا۔ یہ لوگ یوں تو اسلام کو دل دے کے ہی گھروں سے چلے تھے۔ مگر ابھی عربی مفاخرت کا زنگ مزاجوں میں باقی تھا۔ انہوں نے خواہش کی کہ فریفتین کے خلیب اور شعراء مجمع میں وضاحت اور معنی آفرینی کے جوہر دکھائیں۔ درحقیقت غز کے بعض اونچے قبائل کسی قیادت کو جھبی قبول نہ کئے تھے کہ اس کی ذہنی برتری کے وہ قائل ہو جائیں جنہوں نے بھی اس مخاطبہ اور مفاخرت کی دعوت کو مصلحت دیکھ کر قبول کر لیا۔

عطار دین حاجب بنو تمیم کا نامور خطیب تھا۔ اس نے اپنے قبیلہ کی قیادت و سیادت اور دولت و باہ کو تقریر میں پیش کیا۔ اور کہا کہ ہماری ہمسری کا جسے دعویٰ ہو وہ ایسے خصائص و اوصاف سامنے لائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارے سے اسلامی تحریک کے ایک خطیب ثابت بن قیس جو ابی  
تقریب کے بیٹے اٹھے۔ انہوں نے ایک پرزور خطبہ میں یکے سے رنگِ مفاخرت کے پردے میں دعوت کا پسو  
نمایاں کیا۔ اور اسی کو اسلامی معاشرہ کا سرمایہ افتخار قرار دیا۔ چند جملے اصل عربی میں دیکھیے۔ کیا بانگی ہے:-

”الحمد لله الذي السموت والارض خشيته. قضى فيهن امره و وسع  
كبريته علمه..... ثم كان من قدرته ان يجعلنا ملوكا و صغرى من

خير خلقه رسولا. كرمه نسباً و صدقه حديث و قنطرة حيا.

ثم دعانا من ابى لا يمان به ف من برسور يمد مهابجرون من قومه

و ذوى رحمته. كبريت من حيا و حسن بنا من وسوفا و خير من من

فنا لا..... فنحن نصر الله و ذرى رسوله.

پچھ تمہم کے ممتاز شاعر برق بن بن بدر نے قصیدہ پڑھا۔ اس کا سہ پہلے

نخن كبريت حيا يعنى ذمت من مبريت و مابى مبريت

جمہ اشعار ہیں اور کوئی قبیلہ ہماری جسد بخیر نہیں رکھتا۔ ہمیں دیکھو اور تمہیں

تعمیر کرتے ہیں۔

اسلامی تحریک کے نقاد بنی شاعر نے کہا کہ موجودہ نئے ڈھنگ کے لوگوں نے ان کے

ٹھوکھانے اس شخص کی شاعری کو جو بپتھی ہے۔ ان کے ہاں ان کے ہاں ان کے ہاں ان کے ہاں

کیا کہ ہمارے خطیب و شاعر سے رسول خدا کے خطیب سے کیا فرق ہے۔ ان کے ہاں ان کے ہاں

اسلام کے مابہ رحمت ہیں گئے۔

(۳) وفد بنی عبد القیس :

علاقہ بحرین میں دعوتِ اسلامی کا آغاز بڑھ گیا۔ ان کے ہاں ان کے ہاں ان کے ہاں

لکا۔ ششم میں تیرہ آریوں کا وفد مدینہ آیا۔ حضور کے چچے یہ انہوں نے سب تیار کیا اور ان کے

آراہیں۔ تو حضور نے ”مصر حبا۔ لاجنا۔ ی و لانا۔ می کہہ کر ان کی دعا سنائی اور ان کے

دنخواست کی گئی کہ چونکہ ہمارا علاقہ زیادہ دور ہے۔ اور راستے میں کفارِ ظلم کی جاویریں ہیں۔ ان کے

مہینوں کے علاوہ غم نہیں کر سکتے۔ لہذا ہمیں چند نقیب باقی بتا دیجئے۔ جن پر ہم ہر بندہ ہیں۔ اور اپنے

لوگوں کو بتائیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید نماز، روزہ اور ادا کے نفس کی انہیں فرمائی اور اللہ سے

سے اجتناب کے لیے چار قسم کے مروجِ ظاہر و باطنی تہمتیں لکھ کر ان کے ہاں ان کے ہاں



بحرین کی جاہلی ثقافت کے متعلق حضور کی معلومات سن کر بڑے حیران ہوئے۔ لیکن آخر نظام حیات کو زیرِ زیر کردینے والی تحریک کا سربراہ کارزیر دعوت علاقوں کے حالات سے بے خبر رہ کر کام کیسے چلا سکتا ہے حضور کی معلومات کچھ تو ذاتی سفروں سے ماخوذ تھیں۔ اور پھر مکہ اور مدینہ کے مرکزی مقامات پر گوشے گوشے کے لوگ آتے تھے۔ اور ان سے بہت کچھ حالات علم میں آتے تھے۔

اس وفد میں ایک شخصیت جبارود بن العلاء کی بھی تھی۔ جبارود مسیحی تھا۔ اس نے عرض کیا کہ میں ایک مذہب پر چل رہا ہوں۔ اسے چھوڑ کر اگر آپ کے دین پر آؤں تو کیا آپ صامن بنتے ہیں (یعنی کوئی آخری وبال تو نہ آئے گا) حضور نے فرمایا: ہاں میں صامن ہوں۔ کیونکہ جس دین کی طرف میں دعوت دیتا ہوں۔ یہ تمہارے مذہب سے افضل ہے۔ جبارود فوراً مسلمان ہو گیا۔ اور اس کے ہم مذہب ساتھی بھی حلقہ اسلامی میں داخل ہو گئے۔

#### (۴) نمائندہ بنو سعد (بن بکر) :

قبیلہ نے صنمام بن ثعلبہ کو نمائندہ بنا کر مدینہ بھیجا۔ یہ شتر سوار عجب سادہ بدویانہ انداز سے مسجد نبوی میں آیا۔ اور اصحاب نبی سے پوچھا: تم میں سے عبدالمطلب کا فرزند (یعنی اولاد) کون ہے؟ لوگوں نے حضور کی طرف اشارہ کیا۔ کہ وہ گورے چہرے والے ہیں رسول خدا! پاس پہنچا اور کہا: اے عبدالمطلب کے بیٹے! کچھ باتیں سختی سے پوچھوں گا۔ بُرا نہ منانا! حضور نے اجازت دی۔ پھر اس نے قسم دلا کر دین کی چند بنیادی باتوں (توحید، رسالت، نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ) کے بارے میں پوچھا۔ کہ کیا آپ ایسا کہتے ہیں؟ حضور تصدیق فرماتے گئے۔ سارے جواب لے کر کہا۔ میرا نام صنمام بن ثعلبہ ہے۔ مجھ کو میری قوم نے بھیجا ہے۔ میں جاتا ہوں۔ اور جو کچھ تم نے بتایا ہے اس میں نہ میں ذرہ بھر اضافہ کروں گا، نہ کمی۔ اور اونٹ پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد حضور نے فرمایا۔ کہ اگر یہ سچ کہتا ہے تو اس نے فلاح پائی۔

واپس جا کر اس نے قوم میں طوفانی انداز سے دعوت دی کہ لوگو! میں خدا اور اس کے رسول پر ایمان لایا ہوں۔ لات و عزی وغیرہ کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ لوگوں نے ڈرایا کہ تم پر ایسی باتوں کی وجہ سے ان بتوں کی مار نہ پڑے اور خون یا جزام نہ ہو جائے۔ صنمام نے کہا: خدا کی قسم! یہ نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر! شام ہونے سے پہلے پہلے سارا قبیلہ اسلامی تحریک میں شامل ہو گیا۔

۱۔ محققین کی رائے ہے کہ راویوں کے تسامح سے حج کا ذکر یہاں شامل ہو گیا ہے۔ کیونکہ حج کی فرضیت بعد میں ہوئی۔ بصورت دیگر اس وفد کا وقت آمد بعد کا ہونا چاہیے۔

## (۵) وفد اشعرین (مبن)

مبن کا یہ ایک معزز قبیلہ تھا اور ابو موسیٰ اشعری اسی کے ایک فرد تھے۔ ان تک دعوتِ حق کی در میں عیشیل  
دوسی اور مہاجرین حبشہ کے واسطے سے پہنچ چکی تھی۔ متاثرین میں سے تین اشخاص ہجرت کا عزم باندھ کر مدینہ  
چلے کہ حضور سے فیضان حاصل کریں گے اور تحریکِ حق کو نقادان بہم پہنچائیں گے۔ بحری سفر تھا۔ راستے میں  
مخالف ہوا چلی اور جہاز حبش کے ساحل سے جا لگا۔ وہاں یہ لوگ ہجرت ادنیٰ کی سعادت پانے والی اسلامی  
جماعت سے جا ملے۔ کچھ زمانہ وہاں رہ کر جعفر طیار کی رفاقت میں چند نو مسلم حبشیوں کو بھی ساتھ لے کر مدینہ  
کو روانہ ہوئے۔ اور فتحِ خیبر کے موقع پر (۳۱ھ) بارگاہِ رسالت میں جا حاضر ہوئے۔ ان کے جذبہ بے اختیار ہوئے  
تھا کہ منزلِ مقصود پر پہنچے تو یہ نعمتِ مسرت زبانوں سے بول پڑتا تھا کہ :-

عَدَا سَلَفِي لِحَبِيْبَةٍ      كَلِّمْ بِمَنْ يَنْفِقُ رَفِيقُوْنَ مِنْ بَنِي سُلَيْمِ  
مَحْمَدًا وَحَزْبَهُ      يَعْنِي مُحَمَّدًا صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَعْدَ بْنَ زَيْدٍ

حضور کو اطلاع ہوئی۔ تو احباب سے کہا: تمہارے ہاں مبن سے کچھ لوگ آئے ہیں انہماک سے  
یہ لوگ سنتِ یقینِ القلب اور نرم دل ہوتے ہیں۔ پھر فرمایا: ایمان ہے تو مبن کا احکامات سے  
مجھ سے زیادہ ہے۔ ان کو بھی سوائے انہماک سے تو اس سے کچھ نہیں آئے۔

یہ ایک صحیح ہے

## (۶) وفدِ دوس (مبن)

مبن ہٹا چکے ہیں کہ طفیل دوسی مد کے ابتدائی در دعوت کے سبب انہماک سے مدینہ  
سے کام کیا۔ اور ان کے والد اور بیوی تو فوراً ان کے ساتھ ہو گئے۔ کچھ دور سے مدینہ کی طرف  
بڑے بھاری اخلاقی انحطاط میں پڑ گیا تھا۔ در بکار کی پھیل گئی تھی۔ ایسے حالات میں ان  
جو شیلے بن کی وجہ سے کام آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ حضور سے آکر ملے اور قوم کی اس حالت کو دیکھ کر  
ان کو نرم اور دعوت کی تلقین کی در دوس کی علاج کے سے شہ سے دعوتی سے تو تیس دن  
توڑتے کھتے گئے۔ در دوس میں ثمت سے مدروں میں اسلام کی شعاعیں۔ غلام اور غلامیوں  
ہیں۔ نامزدان ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ اور انہماک میں حضرت کو جو جیسی میں تھا

## (۷) وفدِ صداء :

اس قبیلہ میں سے پہلے پہل زیادہ من تھے۔ اور انہماک سے مدینہ کی طرف  
اس نے جا کر کچھ اثر ڈالا۔ شہ میں داتا دیوں ہ ایک روز سے قبیلہ

ان کے میزبان تھے۔ انہوں نے کھانے کے علاوہ ان کے لیے کپڑوں کا انتظام بھی کیا۔ ان لوگوں نے حضور کے ہاتھ پر اسلامی تحریک میں شرکت کی بیعت باندھی۔ اور قبیلہ کی طرف سے بھی تعاون کی پیش کش کی۔ اس وفد کے واپس جانے پر کام تیزی سے ہوا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر اس قبیلے کے ایک سردار مذکورہ پہنچے۔

فتح مکہ سے قبل کے دور میں یہی وفد ایسے سامنے آتے ہیں۔ کہ جن کا تذکرہ تاریخ میں محفوظ ہے۔ فتح مکہ کے بعد تو گویا ایک عوامی سیلاب تھا۔ جو ہر چار طرف سے اسلام کا ساتھ دینے کے لیے اُٹھ پڑا۔ ۹ھ اور ۱۰ھ میں کثیر تعداد میں وفد مدینہ پہنچے ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

### (۸) وفد ثقیف (طائف)

حضور جب فتح مکہ کے سفر سے واپس ہوئے تو عروہ بن مسعود ثقفی حاضر ہو کر حلقہ اسلامی میں داخل ہوئے اور بنو ثقیف میں دعوت پھیلانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ حضور نے ثقیف کے کبر و عذور کے پیش نظر احتیاط کا مشورہ دیا۔ اور اندیشہ ظاہر کیا کہ وہ لوگ تمہیں قتل نہ کریں۔ حضرت عروہ کو اپنے اثر و رسوخ پر بڑا اعتماد تھا۔ لہذا باصرار کام کرنے کی اجازت لی۔ واپس جاتے ہی مکان کی چھت پر کھڑے ہو کر اسلام کی پکار بلند کی۔ ان کی توقع کے خلاف ہر طرف سے نادک اندازی شروع ہو گئی اور ایک تیر کھا کر وہ شہید ہو گئے۔ بنو ثقیف کرنے کو تو یہ حرکت کر بیٹھے۔ مگر اس ظالمانہ اقدام نے ان کے ضمیروں میں حرکت بھی پیدا کر دی۔ وہ معاملہ کو ٹھنڈے دل سے سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ مہینہ پھر بعد انہوں نے ایک اجتماع کیا۔ جس میں صورت حال کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر اس سوال پر غور کیا گیا کہ آیا ہم لوگ پورے عرب کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جو اسلام کے زیر نگین ہو چکا ہے۔ بالآخر طے پایا کہ مدینہ میں کسی نمائندہ کو بھیجا جائے۔ بعد میں پورا وفد تیار کیا گیا۔ عثمان بن ابی العاص۔ اوس بن عوف اور بہز بن خزیمہ (بنی مالک میں سے) اور حکم ابن عمر بن دہب اور شرجیل ابن غیلان (حلیف قبیلوں کی طرف سے) وفد میں شریک ہوئے۔ عبد یلیل سردار طائف ان کو لے کر مدینہ گیا۔ یاد کیجیے کہ یہ وہی عبد یلیل ہے جس نے بارہ سال قبل حضور کی دعوت سننے سے انکار کر دیا تھا اور ارباب نشوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا تھا۔

تبوں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی پر یہ وفد مدینہ پہنچا۔ ان کے لیے مسجد کے متصل خیمہ نصب کیا گیا۔ خالد بن سعید بن العاص فریقین کے درمیان ذریعہ گفتگو بنے۔ ان لوگوں نے عجب عجب شرطیں پیش کیں۔ ایک شرط یہ تھی کہ تین برس تک ان کا بت "لا دت" منہدم نہ کیا جائے۔ پھر اس مدت کو گھٹاتے گھٹاتے وہ ایک مہینہ تک لائے۔ یہ بت جس جا مذہبیت کا مظہر تھا۔ وہ اندر سے مان نہیں رہی تھی۔ انہوں نے یہ اندیشہ پنہاں ظاہر کر دیا کہ ہمارے بٹوں کو اگر کہیں معلوم ہو گیا کہ ان کو توڑا جانے والا ہے تو ممکن ہے کہ وہ تمام باشندوں کا خاتمہ کر دیں۔ حضرت عمرؓ یہ سن رہے تھے۔ ان سے چُپ نہ رہا گیا۔ عبد یلیل کو مخاطب کر کے کہا۔

مکیسی جہالت کی باتیں کر رہے ہو۔ تمہارے یہ معبود تو محض پتھر ہیں: "عبد البیل نے جہنما کر کہا۔" اس نے اپنے بھائی  
 ہم تم سے بات کرنے نہیں آئے۔ ہمارا معاملہ رسول اللہ سے ہے۔ بہر حال حضور نے یہ شرط جیسا کی قیمت  
 پر قبول نہ کی۔ تو وہ اس پر راضی ہو گئے کہ انہدام کی کارروائی ہم سے نہ کرائی جائے۔ بلکہ حضور اپنے آدمی  
 بھیجیں۔ چنانچہ ابوسفیان بن حرب اور مغیرہ بن شعبہ کو نامزد کر لیا گیا۔

پھر انہوں نے کہا کہ ہمیں نماز ادا کرنے کے سستی رکھنا ہمارے حضور کے نام پر ہے۔ انہوں نے  
 نماز نہیں اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

ایک رکنِ وفد نے یہ بھی درخواست کی کہ رسول خدا ﷺ میں لالی ایسا سود بیچیں۔ اس پر  
 ہمارے لیے کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ پھر وہ بسنے لگے۔ اگر اچھا یاد رکھیں تو ان دنوں یہ سود بیچنے والے  
 اسی طرح شراب پینے کی چھوٹ مانگی۔

انہوں نے ایسا کھنا لویا کہ رسول خدا سے لونی وہاں لگا بھی صبر نہ کیا۔ ان دنوں یہ سود بیچنے والے  
 سود خرید سکتا تھا۔ کہ جو چیز چاہے چھوٹے سے اور بڑے پیرا سود بیچ سکتا تھا۔ ان دنوں یہ سود بیچنے والے  
 آیات پڑھ کر بتاتے گئے کہ یہ تو اللہ کی سابت ہے۔ وہ ان سے کہتا تھا کہ ان دنوں یہ سود بیچنے والے  
 تو پھر اہل وفد مشورہ کر کے اس کی بجائے پیچھے رہ گئے۔ ان دنوں یہ سود بیچنے والے  
 مکہ والوں کا سا ہوتا۔ مجبوراً ان سے گت کر لیا۔ ان دنوں یہ سود بیچنے والے  
 دے دی۔ یعنی چھوڑتے گئے۔ ان دنوں یہ سود بیچنے والے  
 جائے گا۔ لیکن حضور کی توقع کے مستحق رہیں۔ ان دنوں یہ سود بیچنے والے  
 ہونے لگے۔

وفد میں ایسا ایک آدمی بھی تھا جس نے ان دنوں یہ سود بیچنے والے

شریعت کے حکم سے ان دنوں یہ سود بیچنے والے

والس پہلے تو اپنے بھائی سے ان دنوں یہ سود بیچنے والے

نامیوں کیوں کہ ان دنوں یہ سود بیچنے والے

مردوں کے لئے ان دنوں یہ سود بیچنے والے

میں ان دنوں یہ سود بیچنے والے

میں ان دنوں یہ سود بیچنے والے

ان دنوں کے لئے ان دنوں یہ سود بیچنے والے

حضرات نے جب کارروائی شروع کی۔ تو عورتوں اور بچوں کا ہجوم یہ دیکھنے کے لیے اکٹھا ہو گیا۔ کہ ان پر کیا گزرتی ہے۔ بعض عورتیں ڈر کے مارے رو رہی تھیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ زمین و آسمان کا نظام نہ ٹوٹ جائے انہوں نے شعر گا گا کر بہن بھی کیے کہ ”لوگوں پر روؤ کہ ان بندوقوں نے اپنے بت دشمنوں کے حوالے کر دیے اور آڑے نہ آسکے۔“

وہی طائف جو ایک دن داعی مسوق پر پتھر پھینک رہا تھا، آج اسی کے اشارے سے ان کا جاہلی نظام خود ان کی آنکھوں کے سامنے مسمار کیا جا رہا تھا۔

دیکھیے کہ طائف عرب کے جاہلی نظام کا ایک خاصا گڑھ تھا اور حضور نے محاصرہ کرنے کے بعد محض اس خیال سے چھوڑ دیا تھا کہ اسلام کے ملک گیر ماحول کے اندر اب بنو ثقیف اپنا الگ جزیرہ بنا کے تو رہ نہیں سکتے۔ مگر عورتیں کیوں ہو۔ مگر اگر نظامِ حق کے آگے سزنگوں ہو گیا۔ تو طائف جو مکہ کے تابع رہا ہے۔ اس کی گردن تار کے آڑی رہ سکتی ہے۔ اگر کوئی جنگ پسند فاتح ہوتا تو ایک بار فوج کشی کرنے اور طائف کو محاصرہ میں لینے کے بعد کم سے کم اپنے وقار ہی کی خاطر معرکہ کی تکمیل کرتا۔ لیکن حضور کو چونکہ قوت کا استعمال بجز ناگزیر صورتوں کے ناپسند تھا، اس لیے محاصرہ اٹھالیا۔ اور مہم نامکمل چھوڑ دی۔ مقصود یہی تھا کہ بعد میں جب ثقیف حالات کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کریں گے۔ تو رغبت سے اطاعت کا راستہ اختیار کر لیں گے۔ اور ایک تعمیری اسلامی انقلاب کے لیے یہی صورت زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔ بعد میں یہی ہوا۔

### (۹) وفدِ بنی حنیفہ :

یہ لوگ علاقہ یمامہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان تک اسلام ٹہامہ بن اثال کی دعوت سے پہنچا۔ اور پھر یہ لوگ خود مدینہ آ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے۔ اور اسلامی تحریک کے سائے میں داخل ہوئے۔ اسی وفد کے ساتھ میلہ کذاب بھی آیا تھا۔ اُس نے ادھر ادھر کی باتیں کیں کہ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ بات طے کریں کہ اپنا جانشین مجھے بنائیں گے تو میں بیعت کروں گا۔ دراصل نبوت محمدی کی عظیم الشان کامیابیوں کو دیکھ کر اس حنفی کے منہ میں پانی بھرانے لگا تھا۔ اور اس نے نہ جانے کب سے یہ سوچنا شروع کر دیا ہو گا کہ کچھ ادبی عبارات کو اگر بطور الہام پیش کیا جائے اور مقابلے پر ایک علم نبوت بلند کر دیا جائے تو کچھ کھیل بنا یا جاسکتا ہے۔ مگر وہ نہیں سمجھ رہا تھا کہ کردار کی وہ قوت کہاں سے آئے گی جو بیس برس سے مخالفتوں کی زہرہ گداز وادماں طے کر رہی تھی۔ انہی خیالات کی وجہ سے اس کا ذہن سوداگرانہ بن گیا تھا۔ اس کا منشا یہ تھا کہ یا تو مجھ سے

حضور نے اس کا ذہن پرھ لیا۔ اور کھجور کی جو چھڑی اس وقت ہاتھ میں تھی اسے آگے کر کے فرمایا کہ میں

تو اس چھپڑی کے دینے کی شرط پر بھی بیعت نہیں لینا چاہتا۔ یعنی اسلام کو فی بیئے کی دکان نہیں ہے۔ کہ جس کی جنس تجارت کو بیچ کر کسی کو ذاتی نفع کمانا ہو اور سودے کر کے بیعت لے اور لوگوں کو جماعت میں شریک کرے۔ یہ حق کو حق ماننا ہو، وہ اس کی علمبرداری کو اپنا ذاتی فرض مان کے آئے۔ کسی پر عسان دھرنہ کیا معنی :  
 وفد واپس چلا گیا۔ واپس جا کر مسیلمہ نے واقعی علیہ نبوت بلند کر دیا۔ اس کی شریعت میں نماز معادہ بھی رواج  
 شہاب اور زنا حدل۔

### (۱۱) وفد بنی طے :

قبیلہ طے کے لوگ زید الخلیل کی سرکردگی میں حاضر ہوئے۔ یہی اگر مصلی اللہ علیہ وسلم سے ان لوگوں کے ساتھ اسلام کا کلمہ حق پیش کیا۔ اور انہی نظام حیات کی دعوت دی۔ بعد از بیعت ان لوگوں کو وہاں سے لے کر انہیں کیا۔ زید الخلیل و جن کا نام حضور نے زید الخیر کر دیا، شاعر و شہسب بھی تھے۔ اور ہادہ بھی تھا جو طے کے لوگوں میں فرمایا۔ کہ عرب کے جس بھی شخص کی تعریف میرے سامنے کی گئی اس کو دیکھنے پر اس کے شہر پر آ کر اس شخص متشنی ہے کہ جو کچھ سنا تھا اس سے اسے بڑھ کر پایا۔

عدی بن حاتم بھی اسی قبیلے کے سرداروں میں سے تھے۔ انہیں عیسائیوں سے مل کر اسلام لایا۔

ان کے دل میں ایک طوفان عناد بھرا تھا۔ مقابلہ کی تیاری میں تھے۔ یہی چاہتے تھے کہ ان لوگوں کو اسلام سے

جانشینی تو بھاگ کے شام چلے گئے۔ ان کی بیوی اور بچے ان کے ساتھ تھے۔ ان لوگوں کو ان کے

اور مجموعی کردار سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے عدی کو ان کے ہونے پر حیرت و حیرت سے دیکھا۔

نبی اللہ علیہ وسلم سے ہامو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھی وہی شخص تھا جس نے ان لوگوں کو اسلام لایا۔

سوال یہ تھا کہ یہ شخص محض ایک بادشاہ ہے یا نبی ؟ پیچھے تو مسہرہ کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

اور عدی کو اپنے گھر کی طرف سے پھلے۔ رات کے میں ایک بڑا سیاہے کے رسول خدا سے مل گیا۔

کافی وقت آسے دیا۔ اور پوری موجودہ حالت کی۔ پتہ لگے۔ تو پوری پرستی کے ساتھ ان لوگوں کو

ان لوگوں سے عدی کو یقین ہو گیا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں اور محض ان لوگوں کو اسلام لایا۔

سے میری توفیق والا ہے۔

در ان گفتگو میں شہسب نے کہا کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ اس کے بعد ان لوگوں کو اسلام لایا۔

تو ان سے عداوت آیا۔ عدی ان لوگوں میں سے تھے۔ ان لوگوں کو اسلام لایا۔

نی کامیابی سے عملی اسانات کافی تعداد میں ہوئے۔ اور ہادہ بولی کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔

نے فرمایا۔ شاید تمہیں اسلام میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا ہو۔ اس کے بعد ان لوگوں کو اسلام لایا۔

نے فرمایا۔ شاید تمہیں اسلام میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا ہو۔ اس کے بعد ان لوگوں کو اسلام لایا۔

کی قسم! عنقریب وہ وقت آنے والا ہے کہ ان لوگوں کے اندر دولت کے فوارے چھوٹیں گے۔ یہاں تک کہ اسے لینے والے نہیں ملیں گے۔ اور اگر تم کو یہ چیز اسلام میں آنے سے روکتی ہے کہ مسلمانوں کی تعداد کم ہے۔ اور ان کے مخالفین بہت ہیں، تو میں تمہیں بتاتا ہوں کہ خدا کی قسم! وہ وقت آنے والا ہے کہ تم سُن لو گے کہ ایک عورت تنہا اپنے اونٹ پر سوار ہو کر قادیسیہ سے اس مسجد کی زیارت کے لیے چلی اور بحیرت پہنچی۔ یا شاید تمہارے لیے یہ خیال مانع ہے کہ سلطنت اور اقتدار دوسروں کے پاس زیادہ ہے۔ سو خدا کی قسم! ایسا عنقریب ہوگا کہ تم خود سُن لو گے کہ سرزمین بابل کے قصور اسپید مسلمانوں نے فتح کر لیے۔ اس پہلو سے جب عدی کے شبہات کا ازالہ ہو گیا تو انہوں نے فوراً اپنے آپ کو تحریکِ اسلامی کے حوالے کر دیا۔ اس گفتگو سے ذیل کے اہم نتائج نکلتے ہیں۔

• اسلام صرف اخلاقی اصلاح ہی کی دعوت نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے پروگرام میں معاشی فلاح بھی شامل ہے۔ اور سیاسی انقلاب بھی۔ وہ آخرت کی بھلائی کو دنیوی معاملات کی درستی سے الگ کر کے نہیں لیتا۔

• حضورِ تحریکِ اسلامی کے بعید ترین مستقبل کا پیشگی تصور رکھتے تھے اور شروع سے آپ کے سامنے یہ بات تھی کہ کن مصلحوں سے ہو کر کدھر کو جانا ہے۔

• تحریکِ اسلامی کی ایک ضرورت یہ ہے کہ وہ لوگوں پر اپنی عملی کامیابی کے امکانات واضح کرے اور ان کو مطمئن کرے کہ پیش نظر انقلاب واقع ہو سکتا ہے ورنہ عوام کا ایک بڑا عنصر اس کی دعوت کی صداقت کو جاننے کے باوجود بھی باہر کا کھڑا رہے گا۔

• اسلامی تحریک اگر تکمیلی مدارج تک پہنچ جائے۔ تو اس سے لازماً یہ نتیجے نکلنے چاہئیں کہ (۱) معاشی ذرائع و وسائل اتنی ترقی کر جائیں اور ان کو ایسے صحیح عادلانہ طریق سے تقسیم کیا جائے۔ کہ معاشرے میں کوئی محتاج نہ رہے (۲) سیاسی لحاظ سے اتنی مضبوط حکومت پیدا ہو کہ مخالفین اسے ترنوالہ نہ بنا سکیں۔ بلکہ اللادہ بر مخالف طاقت کا زور توڑ سکے۔ (۳) داخلی امن کا معیار یہ ہونا چاہیے کہ اگر ایک عورت بھی ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک تنہا سفر کرے اور انسانی آبادیوں اور دیرانوں سے گزرے تو اس کی جان، عزت اور مال کو کسی طرف سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ یہی ایک اسلامی نظام سلطنت کی خوبیاں ہیں۔

(۱۱) وفدِ نبی الحارث (یا نبی الحارث) بن کعب :

یہ علاقہ نجران کے لوگ تھے۔ ان اطراف میں حضرت خالد بن ولید نے (سنہ ۶) میں بہ طور خاص جا کر اسلام کی دعوت دی تھی۔ انہوں نے اُن کے سامنے اعلان کیا۔ کہ اسلام لاؤ تو امن پاؤ گے۔ انہوں نے دعوت قبول کر لی۔ حضرت خالد ان کو معتقدات اور احکام کی تعلیم و تربیت دینے کے لیے کچھ عرصہ بٹھرے اور

حضور کو بذریعہ خط کامیابی کی اطلاع دی۔ مدینہ سے اس خط کے جواب میں حکم گیا کہ واپس آ جاؤ اور قبیلے کے پند سرکردہ افراد کو ساتھ لے آؤ۔ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔

یہ قبیلہ اپنے دورِ جاہلیت میں بھی کچھ اچھی اقدار رکھتا تھا۔ چنانچہ وفد آیا۔ تو حضور نے بات چیت کے دوران میں پوچھا کہ کیا وجہ ہے کہ تم لوگ اپنے دشمنوں کے خلاف میدانِ جنگ میں ہمیشہ کامیاب ہوتے رہے ہو اور تمہیں کبھی شکست نہیں ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ ہم لوگ کسی کے خلاف خود جا رہا نہ اقدام نہیں کرتے، اپنے کے لیے مجتمع ہو جائیں تو پھر تفرقہ میں نہیں پڑتے بلکہ اتحاد رکھتے ہیں اور اپنی طرف سے کبھی کسی ظلم کی ابتداء نہیں کرتے۔ حضور نے ان کی اس حکمتِ عملی کی تصدیق کی۔

وفد کے ایک ممتاز فرد قیس بن حسین کو ان لوگوں پر امیر مقرر کیا گیا۔

### (۱۲) وفدِ نجران :

محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے قلم کو بھی بڑے پیمانے پر ذریعہ دعوتِ تالیف و ترویج قرار دیا۔ ان کے کو مکاتیبِ روانہ فرمائے۔ چنانچہ نجران کے عیسائیوں کو بھی خط کے ذریعے کلمہ حق پہنچایا۔ انہوں نے اس خط سے منع سے کام لے کر پہنچانے کی بات حضور نے ان لفظوں میں پہنچائی کہ ”برا بھرا ہمتی اور پختہ دل سے اللہ کے نام سے آغاز کرتا ہوں۔ پھر اس کے بعد میں تم کو بندوں کی عبادت سے خدا کی عبادت میں آمادہ کروں گا اور تمہیں بندوں کی آفاتی سے خدا کی آفاتی کی طرف پکارتا ہوں۔ اگر تم اس سے انکار کرو گے تو اللہ تم سے انتقام لے گا اور تمہیں اللہ سے بھی انکار کرو۔ تو اعدا بن جاؤ گے۔“ اس خط کے سبب نجران کے عیسائیوں نے اسلام کی دعوت کو قبول کیا اور ان کے لیے پیغمبرِ مہربان صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسجد بنوائی اور ان کے لیے ایک کتب خانہ بھی بنوائی۔ اس نے پیغمبرِ مہربان صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں آ کر اللہ کی رضا حاصل کی۔

لے اس خط کا جو متن ابنِ ہشام نے دیا ہے۔ اس میں حضرت خالد بن ولیدؓ اپنے نئے نئے مسلمانوں کو اللہ کی عبادت میں حوالہ دیتے ہیں۔ اور اسی ضمن میں یہ فقہ آتا ہے کہ میں ان کو اسلام کی باتیں سکھانوں گا۔ لیکن اس کے بعد اس خط کے دو حصوں میں دو اور پھر وہ بیان کرتے ہیں کہ حضور کے ارشاد کے مطابق میں یہ کام کر رہا ہوں۔ اس واقع اور دو حصوں میں ان کی باتیں سکھا رہا ہوں۔ اور اس کے نتیجے کی نسبت کی تعلیم دے رہا ہوں۔ پھر اس خط کے آخر میں ان کے لیے ایک ریکارڈ ملتا ہے وہ سنتِ رسول کو اسلام کے ایک اساسی ادارے کی حیثیت سے واجب القبول قرار دیتے ہیں۔ ان مقامات پر بھی اس قسم کے ہم حوالے کثرت کے ہوتے ہیں۔ ان کو جمع کرنے کی ضرورت ہے۔ اور انہی مقامات سے سکا تو یہ مواد اپنی کتاب ”رسول اور سنت“ میں شامل کر دوں گا۔



کیا۔ وادی میں تہتر بستیاں تھیں اور آبادی اتنی تھی کہ ایک لاکھ سپاہ نکل سکتی تھی۔ بہت بھاری اجتماع منعقد ہوا۔ یہ امکان اکابر کے پیش نظر تھا کہ شاید یہ وہی آخری نبی موعود ہیں جو بنو اسمعیل میں سے اٹھنے والے ہیں۔ مشورہ عام کے بعد قرار دیا یہ ہوئی کہ اکابر کا ایک وفد مدینہ جائے۔ اور صاحب مکتوب سے بات چیت کرے۔ اور جائزہ لے۔ چنانچہ شرجیل، عبداللہ اور حبار کو خصوصیت سے نامزد کیا گیا۔ یہ پہلا وفد تھا جو سیاسی اطاعت اور ٹیکس ادا کرنے کے وعدے پر ایک فرمان امن و حقوق حاصل کر کے واپس ہوا۔

وفد فرمان حاصل کر کے واپس ہوا تو اسقف اور اعلیٰ سردار اس کے استقبال کے لیے بہت دور تک آئے۔ فرمان راستے ہی میں اسقف کو پیش کر دیا اور وہ اسے چلتے چلتے پڑھنے لگا۔ اس کا چچرا بھائی بشر بن معاویہ بھی فرمان کی طرف اس درجہ متوجہ ہوا کہ اونٹنی سے گر پڑا۔ اس کی زبان سے نکلا: "براہو اس شخص کا جس کی وجہ سے ہم مصیبت میں پڑ گئے ہیں" ظاہر ہے کہ اس کا اشارہ کدھر تھا۔ اسقف نے سختی سے کہا: "یہ کیا کہہ رہے ہو۔ خدا کی قسم! وہ تو نبی مرسل ہے" اب بشر کے دل میں انقلاب آ گیا۔ اور اس نے یہ عزم ظاہر کیا کہ "اچھا تو اب خدا کی قسم یہ نافرمانی کا پالان اس کی بارگاہ میں جا کر ہی اتاروں گا" اسقف اس کے پیچھے پیچھے اونٹنی دوڑاتا ہوا پکارتا رہا۔ کہ بیری بات تو سنو۔ میرا مدعا تو سمجھو، میں نے کسی مصلحت سے وہ فقرہ کہہ دیا تھا۔ بشر نے ایک نہ سنی اور کہا تو یہ کہا کہ "تمہارے ذہن سے اتنی بڑی غلط بات نکل ہی نہیں سکتی" اپنی دھن کا پکا بشر محسن انسانیت کی خدمت میں جا کر اسلام لایا۔ وہیں مقیم ہو گیا۔ اور خدا تعالیٰ نے اس کو مرتبہ شہادت نصیب کیا۔ اس سے ملتا جلتا واقعہ کرز بن علقمہ کے نام سے بھی مذکور ہے۔

وفد مقامی سرداروں سمیت واپس پہنچا تو وہاں کے ایک اور تارک الدنیا راہب کے کانوں میں سارے حالات و واقعات کی بھنک پڑی۔ اور اسے معلوم ہوا کہ ایک نبی ایسا ایسا اٹھا ہے۔ یہ بھی والہانہ جذبے سے شرمسار ہو کر مدینہ کو روانہ ہو گیا۔ ایک پیالہ، ایک عصا ایک چادر حضور کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کر کے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا۔ پھر مدینہ میں کچھ عرصہ کھٹ کر اسلام کے نظام فکر و عمل کی تعلیم حاصل کی۔ اور حضور سے اجازت لے کر واپسی کا وعدہ کر کے نجران گیا۔ لیکن حضور کی زندگی میں واپس پہنچ نہ سکا۔

کچھ مدت بعد نجران کا اسقف ابوالمحارث جو شاہ قسطنطنیہ کی نگاہ میں بہت محترم تھا۔ اور عیسائیوں میں اس کی کرامت کے چرچے رہتے تھے، پھر ایک وفدے کر مدینہ پہنچا جس میں علاقہ کا عیسائی مفتی و جج ایہم نیز عبدالمسیح عاقب اور ۲۴ دوسرے اکابر شامل تھے۔ واضح رہے کہ یہ اسقف درحقیقت بنو بکر بن وائل کا ایک عربی فرد تھا۔ مگر نصرا نیت میں داخل ہو کر اس نے علم اور عبادت کے لحاظ سے اتنی ترقی کی کہ یہ خود عیسائیوں کا معتد ترین پیشوا بن گیا۔

یہ لوگ چند روز دینہ میں مقیم رہے۔ ان کو مسجد نبوی میں اپنے مذہب کے مطابق ادا ثے نماز سے بعض صحابہ نے روکا لیکن حضور نے اجازت دی۔

ان کی آمد پر مقامی یہودیوں نے بھی بڑی سرگرمی دکھائی اور بیچ میں دخل انداز ہو ہو کر مختلف بحثیں اٹھائیں۔ عقیدہ تثلیث اور مسیح علیہ السلام کی حیثیت تو زیر بحث آئی ہی تھی اور قرآن نے ان مسائل میں وفد کو روشنی بہم پہنچائی۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہود نے یہ شوشہ اٹھالیا کہ حضور خود عیسیٰ علیہ السلام کی جگہ لے کر اپنی پرستش کرتا چاہتے ہیں۔ اس کا جواب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور نے دیا کہ کوئی شخص جسے اللہ نے کتاب، حکم اور نبوت سے سرفراز کیا ہو، لوگوں سے یہ کہنے کا مجاز نہیں ہے کہ میرے بندے بن جاؤ پھر یہود اور اہل وفد کے درمیان یہ بحث بھی چلی کہ ابراہیم علیہ السلام کس مذہب پر تھے۔ ایک فریق کہتا عیسائے تھے۔ دوسرے فریق کا دعویٰ تھا، یہودی تھے (نعوذ باللہ) کلام الہی نے اس کی تردید بڑے سادہ اور غیر مناظرانہ طریق سے کر دی کہ "ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ناحق کیوں الجھتے ہو تو رات اور نیکل دونوں ہی ان کے بعد نازل ہوئیں (جن سے یہودیت اور نصرانیت کا سلسلہ نکلا) وہ تو نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ وہ سے غوص کے ساتھ مسلم تھے۔ اور وہ مشرکوں میں کبھی شامل نہ تھے۔ ابراہیم کے طریقہ پر صحیح معنوں میں کار بند ہیں" نبی اور ان پر ایمان لانے والے لوگ ہیں "خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقام کو واضح کیا کہ "عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک آدم علیہ السلام کی طرح ہے"

یہ دونوں میں خود بھی کسی قدر اپنے تعصبات کے لیے تعصب موجود ہو گا۔ اور باوقار بزرگ نیک بانی

سے بھی پرانے غلط نظریات سے دل چمکتا ہے۔ لیکن یہود کی شرانگیزیوں نے اس کیفیت کو بڑھا دیا ہو د فضول بحثیں اور ان کی وجہ سے پیدا ہونے والی سبب دھرمی قبول حق میں آڑے آ رہی ہوگی۔ اسی لیے قرآن نے ایک انتہائی فیصلہ کن صورت ان کے سامنے مبالغہ کی رکھی۔ حضور کو ٹکڑا کر ان لوگوں سے یہ کہہ دو کہ "اڈیم اپنی اولادوں اور اپنی مستورات کو بلا لیں اور خود بھی میدان میں آجئیں پھر خدا سے اپنے بارے میں فیصلہ چاہیں اور جھوٹے کے خلاف خدا کی لعنت کی دعا کریں۔ جب کبھی کسی پیکر راستی پر جھوٹ کا الزام دیا جائے۔ تو اس کے لیے اس سے بڑھ کر اذیت ناک صورت کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ ایسا ہی وہ طرہ تھا جبکہ حق تو الٰہی نے یہ صورت فیصلہ تجویز کی کہ فریقین علیٰ رؤس الاشهاد خدا کا فیصلہ طلب کریں۔ اگلی صبح کو حضور اپنی پیاری بچی فاطمہ اور محصوم نو اسول اور حضرت علیؑ کو ساتھ لے کے نکلے۔ مدینہ کے لیے یہ کتنا بڑا واقعہ ہو گا کہ ایک داعی حق اپنی کل کائنات مبالغہ کی بساط پر لے آیا۔ کتنے بڑے یقین کا مظاہرہ تھا۔ عیسائی ارکان وفد پیچ گئے کہ اگر واقعی یہ خدا کے نبی ہوئے تو ہمارا نام و نشان نیک و نیک ہائے کائنات نے سیاسی طاقت کی پیش کش کی اور حضور کے اختیار پر چھوڑا کہ ٹیکس (جزیرہ) کی جو مقدار آپ مناسب

سمجھیں برات رات میں تجویز فرمادیں۔ انہوں نے حضور کی شانِ حلیمی پر پورا بھروسہ کیا۔ اگلے روز فرمان لکھ دیا گیا۔ جس میں ان کو پوری فرائض دلی سے مذہبی آزادی اور سماجی خود مختاری دی گئی کہ ان کے افراد اور املاک جن حالات پر ہیں اسی پر قائم رہیں گے۔ ان کے موجودہ حقوق میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے گی۔ ان کے مذہبی پیشواؤں (اسقف اور راہب) میں سے کسی کو نہ بدلا جائے گا۔ اور نہ ان کے قبضے سے مذہبی اموال و اوقاف کو نکالا جائے گا۔ جاہلیت کے گزشتہ دور کے جرائم پر کوئی گرفت نہ ہوگی۔ فوج ان کی زمین میں داخل نہ ہوگی۔ ذمیوی بادشاہتوں کے طریق پر ان سے کوئی بیگار نہیں لی جائے گی۔ ظالم و مظلوم کے درمیان انصاف ہوگا۔ کوئی شخص سود کھائے تو اس فعل کی ذمہ داری نہیں لی جاسکتی۔ کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم میں ماخوذ نہ ہوگا۔ اتنی بڑی آبادی سے صرف دو ہزار اوقیہ مالیت کے تحتے (اباس) بطور سالانہ ٹیکس مقرر کیے گئے۔

ان دونوں وفد کے حالات کچھ گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ بظاہر زیادہ گریما گری دوسرے ہی وفد کی آمد پر ہوتی ہوگی۔ لیکن مذکورہ بالا فرمان غالباً پہلے وفد نے ہی حاصل کیا ہوگا۔ کیونکہ دوسرا فرمان سیاسی سے زیادہ مذہبی حقوق سے متعلق ہے اور اس میں خطاب اسقف اور راہبوں سے ہے۔ اس فرمان میں اہل نجران کو زیادہ سے زیادہ حد تک مذہبی آزادی دی گئی اور ان کے کھیسائی نظام میں عہدِ عدالت کی ضمانت دی گئی۔ یہ فرمان بھی منجملہ ان شہادتوں کے ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور سیاسی دائرے میں صرف نظامِ حکومت کی اطاعت کا تقاضا رکھتے تھے اور نہ کسی گروہ کو اس کے مذہب سے باز رکھتے تھے۔ اور نہ اسلامی عقائد جبراً منواتے تھے۔ بلکہ اقلیتوں کو زیادہ سے زیادہ حد تک مذہبی آزادی عطا فرماتے تھے۔ تخریبِ اسلامی افراد میں ایمان و نظریات کی تبدیلی تو صرف دلیل کے زور سے چاہتی تھی، البتہ اپنا نظامِ اجتماعی وہ سیاسی قوت سے نافذ کرتی تھی۔ چنانچہ دیکھیے، کہ فرمانِ ادل میں سود خواری کو ذمہ سے باہر رکھا گیا۔ اور اس کی حیثیت قانونِ ملکی کے خلاف جرم کی رہی۔ مذہب اس کا اصل موضوعِ بحث ہی نہ تھا۔ کیونکہ وہ مذہب سے بہت سے زیادہ بڑی چیز تھی۔ اس فرمان سے جو خود حضور نے صادر کیا اور جس کی حیثیت آئندہ کے لیے رسولِ خدا کی قائم کردہ ایسی نظیر کی ہے جو امت کے لیے واجب الاتباع قانون کا مقام رکھتی ہے۔ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب پر چلنے والی اقلیتوں کے لیے کتنا زیادہ فیاض ہے۔ مشکل ہی سے کوئی دوسرا نظام تمدن اقلیتوں کے لیے اتنی فیاضی کی مثال پیش کر سکے گا۔

دوسرے وفد نے روانگی کے وقت حضور سے درخواست کی کہ اپنا کوئی قابلِ اعتماد افسر جزیہ کی وصولی کے لیے ہمارے ساتھ روانہ فرمائیے۔ حضور نے ابو عبیدہ بن جراح کو بھیجا اور فرمایا کہ یہ شخص امینِ امت سے حضرت ابو عبیدہ

نے جزیہ کی فراہمی کے ساتھ ساتھ علاقہ میں دعوتِ حق کو پھیلانے کا کام بھی سرگرمی سے کیا اور لوگ بکثرت اسلامی حلقہ میں شریک ہو گئے۔

واضح رہے کہ نجران کی آبادی کے دو بڑے گروہ تھے۔ ایک نصاریٰ، دوسرے اہلِ حق۔ نصاریٰ نے سیاسی اطاعت پر معاملہ کر لیا۔ لیکن اہلِ حق کو اسلام کے سایہِ رحمت میں آگئے۔

قیاس یہ ہے کہ پہلا وفد ۹ھ کے اواخر میں اور دوسرا ۱۰ھ کے اوائل میں آیا ہوگا۔ کیونکہ تاریخی ماخذ میں دونوں ہی سال مذکور ہیں۔

## ۱۲۔ وفد بنو اسد

بنو اسد نامی قبیلہ جنگی مہمات میں قریش کا بڑا اہم دست و بازو تھا۔ ۹ھ میں اس قبیلہ کی سفارت مدینہ پہنچی اور انہوں نے اپنا اسلام پیش کیا۔ عربوں کے اندازِ غرور کی بو اس میں موجود تھی۔ اس لیے احسانِ دین کے انداز میں ارکانِ وفد نے حضورؐ سے کہا کہ آپ نے کوئی مہم تو ہماری طرف بھیجی نہ تھی۔ ہم تو از خود اسلام لائے ہیں۔ اس ذہنیت کو توڑنے کے لیے وحی الہی نے حضورؐ سے کہلوا یا کہ لا تمستوا عسی لا تمکرو یعنی اپنے اسلام لانے کا احسان میری ذات پر نہ دسرو۔ یہ تو اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس قبیلہ نے یہ نسیب کیا۔ پھر اس وفد نے زندوں سے مال لینے کی کمانت (امورِ آئندہ کی پیشگوئیاں کرنا) اور خوب اعلیٰ یعنی قیمت یا نرخ مقرر کرنے کے بعد گاہک جنس یا زمین کو دوسرے کنکری مارا اور جس مال کو اکثری دیا وہ اس کا ہو جاتا، کے بارے میں حکم دریافت کیا۔ حضورؐ نے تینوں امور کی مخالفت فرمائی۔ اکثری انہوں نے نخط یا تحریر کے بارے میں سوال کیا کہ یہ جائز ہے یا ناجائز حضورؐ نے فرمایا کہ یہ تو کسی نہ کسی نبی کی جان زبرد فن ہے۔ اور اس سے اچھا علم اور کیا ہوگا۔

اس قبیلہ سے بھی نبوت کا ایک مدعی کاذب ملکہ بن خویلد مخالفتِ عدیلتی کے دور میں اٹھا تھا۔

## ۱۳۔ وفد بنو فزارہ

یہ ایک مضبوط اور سرکش قبیلہ تھا۔ عینیبہ بن حصن اسی کے ایک فرد تھے ۱۰ھ میں حضورؐ حبیب تبوک سے واپس آ رہے تھے تو ان کے وفد نے آکر اسلام کی بیعت کی۔ رسولِ خدا نے ان لوگوں سے علاقہ کے عام معاملات پوچھے تو انہوں نے قحطِ سالی کا رونا دیا۔ اور درجہ بھرے انداز میں کہا کہ یا رسول اللہ! ہماری بستیاں تباہ ہو گئیں، مویشی ہاک ہو گئے۔ باغ اُجڑ گئے۔ بال بچے سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ خدا سے آپ ہمارے لیے سفارش کیجیے۔ اور خدا آپ سے ہماری سفارش کرے۔

حضورؐ نے ٹوکا کہ خدا کے پاس تو میں سفارش کرتا ہوں۔ مگر وہ کون ہو سکتا ہے کہ جس کے آگے خدا نے

ذوالجلال سفارش کرے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور اس کی عظمت جلال سارے آسمان و زمین کو احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔ پھر آپ نے ان کے لیے بارانِ رحمت کی دعا کی۔ جو قبول ہوئی۔

### ۱۴۔ وند بنو عامر

یہ خاندان عرب کے مشہور قبیلہ قیس عیلان کی شاخ تھا۔ اس میں تین بڑے سردار تھے۔ عامر بن طفیل اور بن قیس اور جبار بن سلمی۔ اچھا خاصا بڑا وند ان سرداروں کی معیت میں آیا۔ اہل الذکر دونوں سردار باہ طلب تھے۔ خصوصاً عامر پہلے ہی شریندی دکھا چکا تھا۔ اس وقت بھی یہ دونوں باہم ایک خوف ناک سازش تسل بنا کے آئے تھے۔ وند حضور کی خدمت میں پہنچا۔ تو حضور کو "سیدنا" کہہ کر مخاطب کیا۔ حضور نے اس اندازِ تکلم کی تردید کرتے ہوئے فرمایا: "السید اللہ" (آقا تو خدا ہی ہے) انہوں نے پھر کچھ تعریفی کلمات کہے۔ حضور نے پھر متنبہ کیا کہ دیکھو بات آتے ہوئے خیال رکھنا چاہیے کہ شیطان کہیں بسکانہ لے ہائے۔ کتنا اہتمام تھا وہاں کہ تعلق و ستائش کے دروازے نہ کھلنے پائیں۔ عامر بن طفیل نے حضور کے کام کو مجرد ایک سیاسی ملک گیری اور سلطنت سازی کا کام سمجھتے ہوئے باقاعدہ سودا کرنے کے لیے شرائط رکھیں کہ:

(۱) اہل باد یہ پر آپ حکومت کریں اور شہر میرے زیر اقتدار ہوں۔

(۲) یا اپنے بعد مجھے جانشین نامزد کیجیے۔

(۳) ورنہ میں غطفان کو لے کر چڑھائی کروں گا۔ عامر نے اربد کو اس پر تیار کر رکھا تھا کہ میں تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو باتوں میں لگا رکھوں گا۔ اور تم موقع پا کر کام تمام کر دینا۔ مگر رعب نبوت کے سبب سے اربد بالکل ساکت و سارست رہا۔ دونوں ناکام واپس ہوئے۔ حضور کی نگاہ نے ان دونوں کے دلوں کو پڑھ لیا تھا۔ سو آپ نے دعا کی کہ اے خدا! ان کے شر سے بچاؤ۔ زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ نامرطاعون کے حملہ کا شکار ہو گیا۔ اور اربد بن قیس پر بجلی گری اور اسے خاکستر کر گئی۔

### ۱۵۔ وفدِ غدرہ :

مصر میں اس قبیلہ کے بارہ افراد حاضر ہوئے۔ حمزہ بن نعمان بھی ان میں شامل تھے۔

انہوں نے اپنا تعارف کرایا۔ کہ ہم لوگ غدرہ کی اولاد میں سے ہیں۔ جو ماں کے واسطے سے قصی کے بھائی تھے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی مسرت سے اہلاً و سہلاً کہہ کر خیر مقدم کیا۔ ان سب نے اپنے اسلام کے لیے کھول دیے۔ ان کو حضور نے مژدہ سنایا کہ تم سب سخت ہو جاؤ گے گا۔ اور ہر قتل ملک کو چھوڑ کر پھا جائے گا۔ ان لوگوں کو حضور نے کامیابیوں سے اخبار غیب درایت کرنے سے منع کیا۔ اور بحر ابراہیمی قربانی کے دوسری تمام رسمی اور ادائیگی قربانیوں سے رک دیا۔ روانگی کے دن غدرہ کو معمول کے مطابق زاد راہ دیا گیا۔

#### ۱۶۔ وفد بلی:

اس قبیلے کا علاقہ بڑی سیاسی اہمیت رکھتا تھا۔ یہ لوگ مشرق وسطیٰ کے علاقوں میں مہاجرین کے لیے اپنے فرد قبیلہ ثریف بن ثابت بلوی کے ہاں ٹھہرے اور انہی نے حضور کے سامنے تعارف کیا۔ محسن انسانیت نے ان کو مہربان کیا۔ اور یہ سب داخل اسلام ہوئے۔ تین دن تک یہ وفد ٹھہرا۔ پھر روانگی کے وقت حضور نے ان کو زاد راہ اور کچھ عینات دیے۔

#### ۱۷۔ وفد کندہ:

علاقہ میں کا ایک ممتاز قبیلہ تھا۔ حضرت شعث ابن قیس اسی قبیلہ کا سردار تھا۔ وفد سے ملنے کے بعد جو ایک علی درجہ کے رشتہ جتھے پہن کر ہرم نبوت میں پہنچے۔ باتیں ہوئیں۔ حضور نے دریافت کیا۔ کیا تم لوگ مسلمان ہو چکے ہو؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ حضور نے بڑے تعجب سے پوچھا کہ پھر یہ رشتہ کیوں ہو چکا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ان لوگوں نے فوراً رشتہ پورا پارہ پارہ کر کے اپنے باپوں سے الگ کر دیا۔

#### ۱۸۔ وفد ازد:

جنی ازد بھی علاقہ میں رہتے تھے۔ ان کا سردار عبد اللہ ازدی کی قیادت میں آیا۔ ان لوگوں نے دین اسلام پر بیک کہی۔ حضرت صدیق اکبر کے امیر مقرر ہوئے۔

#### وفد جریش:

یمن کے اکثر علاقے اور اضلاع اسلامی سلطنت کا حصہ بن چکے تھے۔ لیکن بیح بیح میں سرکش عناصر بھی تھے۔

شہر حرش ایسے ہی قبائل کے قبضے میں تھا۔ اور یہاں مضبوط حفاظتی قلعہ موجود تھا۔ سرکش طاقتوں کو ہموار کرنے کے لیے حضرت سرد ازدی کو جن کا اُپر ذکر ہو چکا ہے، قبیلہ کی فوجی قیادت بھی سونپی اور ملحقہ علاقہ کے قبیلوں کو نظامِ اسلامی کا مطیع بنانے کے لیے فوجی کارروائی کی اجازت بھی دی۔ انہوں نے حرش والوں کو لمبے محاصرے کے بعد شکست دی۔ اس کارروائی کے بعد حرش والوں کا وفد مدینہ آیا۔

### ۱۹۔ وفدِ ہمدان :

یہ وفد ایک سو بیس آدمیوں پر مشتمل تھا۔ اور اس میں مالک بن نمط، ابو ثور، مالک بن انفع سلمانی، عمیر بن مالک خارقی (یا عمرو بن مالک) اور صنم بن مالک جیسے نمایاں افراد شامل تھے۔ مالک بن نمط نے بارگاہِ نبوت میں رجزیہ اشعار پڑھ کر وفد کی طرف سے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ حضورؐ نے انہی کو قبیلہ کی مسلم جماعت کا امیر مقرر کیا۔ ہمدان کے علاقہ میں پہلے حضرت خالد کو دعوتی اور تعلیمی مشن پر مقرر کیا گیا مگر چھ ماہ تک کامیابی نہ ہوئی۔ پھر حضرت علیؑ کو حضورؐ نے اپنا خصوصی خط دے کر بھیجا۔ جاتے ہی حضرت علیؑ نے نماز کے بعد خطِ مجمع عام میں سنایا۔ اور اسے سنتے ہی کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے۔ حضرت علیؑ نے بذریعہ خط حضورؐ کو روداد لکھ بھیجی اسے پڑھ کر حضورؐ سجدے میں گر گئے۔ سر اٹھایا۔ تو فرمایا: السلام علی ہمدان

### ۲۰۔ قاصد فرودۃ الجذامی :

فرودۃ معان کے مقام پر سلطنتِ روم کی طرف سے علاقہ کے گورنر تھے اور اس علاقہ میں شام اور عرب دونوں طرف کے حصے شامل تھے۔ ان تک دعوتِ پہنچی تو اپنے عمدہ وجاہ کو خطرے میں ڈال کر داخل اسلام ہوئے۔ قاصد کے ذریعے اپنے اسلام کی اطلاع بھی حضورؐ کو دی۔ اور ایک سفید خچر بطور ہدیہ روانہ فرمایا۔ جب رومی حکومت کو اطلاع ہوئی تو ان کو گرفتار کر کے مقامِ عفر میں صلیب پر لٹکا یا گیا۔ مگر اتنا مضبوط ایمان خدانے اپنے اس بندے کو عنایت کیا کہ خوشی خوشی تختِ حکومت سے اٹھ کر تختہ وار پر جا کھڑا ہوا۔

### ۲۱۔ وفدِ تحجیبؑ :

۱۱۔ اسی قبیلہ کا ایک بدبخت فرد کنانہ بن بسر حضرت عثمان کا قاتل ہوا۔ ملتے جلتے نام کا دوسرا قبیلہ تحب ہے جس کا تعلق حمیر کے خاندان سے ہے اور حضرت علیؑ کا قاتل ابنِ لمم اس دوسرے قبیلہ سے تھا۔ کتابوں میں ان ناموں کا التباس پایا جاتا ہے۔

یہ یمن کے خاندانِ کندہ کا ایک ذیلی وفد تھا۔ یہ پہلے سے اسلام لایچکے تھے۔ اور اپنے آپ کو اس کے تقاضا کے سانچے میں عملاً ڈھال رہے تھے۔ تیرہ افراد شریکِ وفد ہو کر آئے اور اپنے ساتھ زکوٰۃ کے اموال اور مویشی بھی از خود لائے۔ عرض کی کہ اللہ کا حق حاضر ہے۔ حضور نے فرمایا کہ اموال واپس لے جاؤ۔ اور مقامی مستحقین پر صرف کرد۔ انہوں نے بیان کیا کہ مقامی مستحقین کو دسے دلا کر یہ اموال بچ رہے ہیں۔ اس موقع پر حضرت صدیق اکبرؓ کی زبان سے بے ساختہ نکلا: ”یا رسول اللہ! عرب کا کوئی وفد تجیب کی شان کا نہیں آیا، حضور نے فرمایا: ہاں اب خدا کے امتیاز میں ہے وہ جس کے لیے بھلائی کا مادہ فرماتا ہے۔ اس کا دل ایمان کے لیے کھول دیتا ہے۔“

ان لوگوں نے کچھ سوال کیے۔ اور ان کے جواب بارگاہِ رسالت سے لکھوا لیے۔ پھر یہ اس نوا میں جواب دیں۔ پس ہو گئے کہ اپنے قبیلے کے لوگوں کو یہاں کی معلومات اور اخبار و احوال بآگاہ کریں۔

ان کے ساتھ بنی اُبیری کا ایک نوجوان بھی تھا۔ جسے وفد سے پہلے اس قبیلہ اور اس نوجوان کے چچا کا تھا۔ اسے حضور نے بطورِ خاص بلایا۔ اس نے عرض کی کہ میری لہرت ایک تھا جسے آپ میرے لیے حضرت صدیق اکبرؓ فرمائی۔ حضور نے بطورِ خاص دعا فرمائی۔ یمن میں جب آگے چلے آراء داد پھیلے۔ تو اس نوجوان سے پوچھے جیسے تم سنبھالے رکھا۔

اس وفد کو بھی زادِ راہ بطورِ مدد عطا ہوا۔

## ۲۲ - وفد بنی سعد بن زہیم (قضاء)

اس قبیلہ کے چند آدمی وفد کی صورت میں مدینہ پہنچے۔ ان میں بعض افراد غلام اور شعور رکھنے والے تھے۔ انہوں نے عرض کی تھی۔ اور بعض سیاسی حالات کی وجہ سے تابع ہوئے تھے۔ یہ حال انہوں نے دستِ نبوت پر جھٹکتی ہوئی عرض کی کہ تم سے حضرت بلالؓ نے چاندی کی صورت میں زادِ راہ دیا۔ ان کی واپسی پر سارے قبیلہ نے دعوتِ اسلام قبول کر لی۔

## ۲۳ - وفد بہراء :

یہ بھی علاقہ یمن کا ایک قبیلہ تھا۔ تیرہ آدمیوں کا وفد مرکزِ اسلام میں بھیجا۔ یہ لوگ پہلے سے تقاضا کرتے رہے۔ نبوت کے انوار دیکھ کر یقین سے سالِ مال ہوئے اسلام قبول کیا۔ اور نجد میں قیام کرنے کے واسطے وادعایِ حکام کیلئے اور پھر واپس چلے گئے۔ ان کو بھی معمول کے مطابق زادِ راہ عنایت ہوا۔



## ۲۲ - وفد ذی مرہ :

اس قبیلہ سے بھی تیرہ افراد کا وفد اسلامی دار الحکومت میں پہنچا جس کے سردار عارث بن عوف تھے انہوں نے حضور سے اپنا تعارف کراتے ہوئے بیان کیا کہ ہم لوتی بن غالب کی اولاد ہیں۔ اور آپ سے نبی تعلق رکھتے ہیں۔ حضور نے ان کے علاقے کا حال پوچھا تو انہوں نے قحط سالی کا خوف ناک نقشہ کھینچ کر دعا کی درخواست کی۔ واپس پہنچے پر معلوم ہوا کہ عین دنائے رسول ہی کے دن بارش ہوئی۔ اور زمین سرسبز و شاوہاب ہو گئی۔ نظام اسلامی کا علم حاصل کرنے کے لیے یہ وفد بھی چن روز مقیم رہ کر رخصت ہوا۔ اور زاوراہ سے نوازا گیا۔

## ۲۵ - وفد خولان :

دس آدمیوں کا یہ وفد ایمان سے مالا مال ہو کر بڑے مخلصانہ جذبات کے ساتھ بارگاہ نبوت میں پہنچا۔ یہ لوگ جاہلیت میں "عم انس" نامی بت کی پوجا کرتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اب صرف معمر نسل کے کچھ لوگ عم انس سے عقیدت رکھتے ہیں لیکن ہم واپس جا کر اس بت کا خاتمہ کر دیں گے۔ پھر انہوں نے پرانے قصبے بیان کیے کہ عم انس کے نام پر کتنی کتنی بڑی قربانیاں دی جاتی تھیں۔ اور کیا کیا رسوم ادا ہوتی تھیں۔ دوران قیام میں انہوں نے نئی اسلامی زندگی کے بارے میں ہمزوی علم حاصل کیا اور جاتے ہوئے ان کو بھی زاوراہ عطا ہوا۔

## ۲۶ - وفد محارب :

یہ لوگ اسلام سے قبل نہایت تند خو اور بد اخلاق تھے۔ ابتدائی درجہ دعوت میں جب حضور نے قبائل میں جا جا کر پیغام حق دیا تھا۔ تو ان کے ہاں بھی پہنچے اور انہوں نے ناشائستہ رویہ اختیار کیا تھا۔ دس افراد کا وفد تائب ہو کر حاضر ہوا۔ ایک مجلس میں حضور نے بغور ایک شخص کو دیکھ کر پہچانا تو اسے تنبیہ ہوا وہ خود ہی بولا کہ حضور شاید میرے بارے میں کچھ خیال فرما رہے ہیں۔ آپ مجھ سے ایک بار عکاظ میں ملے تھے اور میں نے آپ سے بڑی گھٹیا گفتگو کی تھی۔ اور آپ کا پیغام سبوندے طریقے سے رد کر دیا تھا۔ یا رسول اللہ! ہمارے ساتھیوں میں سے کوئی ہم سے زیادہ آپ کا اور اسلام کا دشمن نہ تھا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایمان و اطاعت کی توفیق دی۔ پھر اس نے اپنی سابق غلطی کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست کی۔ حضور نے فرمایا۔ کہ اسلام دور کفر کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

## ۲۷ - وفد غسان :

غسان اگرچہ نسلاً عربوں کا قبیلہ تھا۔ مگر مذہب نصرانیت اختیار کر کے قیصر کی طرف سے عربی علاقہ پر حکمران تھا۔ ساتھ میں اس قبیلہ کے تین افراد مدینہ آ کر حضور کے دست مبارک پر اسلام لائے۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے خاندان کے لوگ تو موجودہ جاہ و شہم کو چھوڑ کر مشکل ہی سے قبولِ حق کریں گے۔ حضور نے انہیں زاوراہ دے کر رخصت

کیا۔ انہوں نے جا کر دعوت دی۔ مگر بنے تیجر ہی۔ تینوں نے حالات سے مجبور ہو کر اپنا اسلام پوشیدہ رکھا۔ ان میں سے ایک صاحب جنگ یرموک کے موقع پر حضرت ابو عبیدہ سے ملے اور اپنے اسلام پر قائم ہونے کی خبر دی۔ بقیہ درنوں کا پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا۔

### ۲۸۔ وفد سلمان :

سات آدمیوں کا وفد مدینہ آیا جس میں حبیب ابن عمر بھی شامل تھے۔ ان کے دریافت کرنے پر حضور نے بتایا کہ نماز کو ٹھیک وقت پر ادا کرنا سب سے بہتر عمل ہے انہوں نے بھی نخط سالی کا حال بیان کر کے دعا کی درخواست کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور بعد میں تصدیق ہوئی کہ اسی روز بارانِ رحمت کا نازل ہوا۔

### ۲۹۔ وفد بنی عیس :

یہ بھی علاقہ یمن کا قبیلہ تھا۔ ان کا وفد بھی شام میں آیا۔ ان لوگوں نے دریافت کیا کہ ہم نے معنیٰ اسلام سے نثار ہے کہ جو ہجرت کرے اس کا اسلام قبول نہیں ہوتا۔ ہم لوگوں کا حال یہ ہے کہ مالِ مویشی ہی ہمارا ذریعہ معیشت ہیں۔ اب اگر ہجرت کرنا ہزری ہو تو ہم ان کو بیچ کر آجائیں۔ جذبہ ایمان دکھیے کہ ایک اشارے پر اپنے اموال اور اپنا علاقہ چھوڑے پر تیار ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ جہاں رمو خدا سے ڈرتے رمو در حقیقت صورت معاند یوں بنتی کہ ابتدائی دور میں جب مرکز اسلام کو مضبوط کرنے کے لیے قوت کو یکجا کرنا اور ایک جہ میں کام کرنے کے لیے انرا کاتیار کرنا مستطاب تھا۔ تو ہجرت کر کے مرکز میں آنا فرس کیا گیا۔ یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ اور بعد میں قوت ہ لاک بھر میں پھیلے رہا اور اپنے اپنے علاقہ میں دعوت کو پھیلانا ضروری تھا۔ تو ہجرت کو از نہایت سائق کو اتنی دھجرتہ بعد الفتح کا حکم اسی دور سے دور سے متعلق ہے۔

### ۳۰۔ وفد غامد :

شام میں غامد کا وفد آیا جو دس افراد پر مشتمل تھا۔ یہ سب کے سب اسلام میں داخل ہونے کے ارادے سے آئے تھے۔ اقی بن کعب کو حضور نے امور فرمایا کہ ان کو قرآن کی تعلیم دیں۔ پھر ان کو راہ دے کر رخصت فرمایا۔

### ۳۱۔ وفد بنی المنتفق :

اس قبیلہ میں سے ہنیک بن عاصم اور اخیطہ بن عامر بصورت وفد مرکز اسلام میں پہنچے۔ بعد میں پہنچے تو حضور خطبہ دے رہے تھے۔ خطبہ کے ختم ہونے پر اخیطہ نے کمرے جو کر قیامت اور حجت و روزخ کے متعلق کچھ سوالات کیے اور حضور نے تفصیل سے جواب دیے۔ پھر انہوں نے انبیاء اور اسلاف کے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں۔ ایک سوال براہ راست حضور سے یہ کیا کہ آیا آپ کو علم غیب حاصل ہے؟ حضور نے جواب دیا کہ غایب غیب خدا تعالیٰ ہی کے قبضے میں ہیں۔

## ۳۲ - وفد عبدالقیس ۲

پہلے وفد عبدالقیس کا ذکر ہو چکا ہے۔ جو ۵۷ھ میں آیا تھا۔ ان کا دوسرا وفد جو چالیس افراد پر مشتمل تھا  
سلسلہ میں مدینہ حاضر ہوا۔

## ۳۳ - طارق بن عبداللہ اور اس کے ساتھی۔

یہ طارق بن عبداللہ شخص ہیں جنہوں نے سوق المجاز میں وہ منظر بھی دیکھا تھا کہ حضور تباہل میں دعوت دیتے  
پھر رہے ہیں اور آپ ہی کا سا چچا پیچھے پیچھے کنکریاں پھینکتا ہوا کہتا جاتا ہے کہ لوگو! اس پر ایمان نہ لانا۔ یہ (غزوہ بائد)  
جھوٹا ہے۔ پھر یہی طارق بن عبداللہ ربذہ سے ایک گروہ کے ساتھ کھجوروں کی خریداری کے لیے مدینہ آئے۔ ان  
کی اقامت گاہ پر حضور کا گزر ہوا۔ آپ نے ان کا اتا پتا پوچھا اور مدعاٹے سفر معلوم کیا پھر ایک اونٹ کا سودا کیا۔  
اور قیمت بھجوا دینے کا وعدہ کر کے چلے آئے۔ بعد میں طارق اور اس کے ساتھیوں کو کھٹکا ہوا کہ بغیر جان پہچان کے  
ہم نے اونٹ دے دیا۔ نہ جانے کیا صورت ہو۔ اس قافلے کی ایک معزز خاتون نے کہا کہ اس شخص کا چہرہ روشن  
میں نے دیکھا تھا۔ وہ کبھی دھوکا کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ قیمت ادا نہ کرے تو میں صائم ہوں۔ تھوڑی دیر میں  
آدمی آیا اور اونٹ کی قیمت کی کھجوریں اگے ادا کیں اور بدیر کی اگے دیں۔ ان لوگوں کے دل مفتوح ہو گئے۔ بعد میں  
یہ شہر میں آئے۔ تو مسجد میں حضور خطبہ دے رہے تھے اور صدقہ کی تاکید فرما رہے تھے۔ اس طرح ان کے دلوں  
میں اسلام کی دعوت کو راستہ ملا۔

## ۳۴ - عمرو بن معدیکرب نمائندہ بنی زبید :

بنی زبید کے لوگوں تک جب نظام نو کے چرچے پہنچے تو انہوں نے اپنے سردار عمرو بن معدی کرب سے  
کہا کہ ہم سنتے ہیں کہ قریش میں سے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نامی نبی کریم حجاز میں اٹھا ہے۔ تم جاؤ اور جا کر معلوم کرو۔  
اگر وہ تمہاری رائے میں واقعی نبی ہو تو پھر ہم سب ایمان لائیں۔ چنانچہ یہ شخص آیا اور اس نے اسلام قبول کیا حضور  
کے انتقال کے بعد اس نے ارتداد کیا۔

## ۳۵ - قاصد من جانب ملوک حمیر :

حمیر ایک شاہی خاندان تھا۔ اس کی طرف سے قاصد ایک خط لایا۔ اس خط میں حوث بن عبدالکلال بنعیم  
بن عبدالکلال۔ نعمان قبیل ذور عین۔ معافر اور ہمدان کے قبول اسلام اور تکبیر شکر کی اطلاع تھی۔ حضور نے اس  
کے جواب میں ایک تفصیلی فرمان ملوک حمیر کے نام بھجوایا۔ اس میں ان کو بنیادی احکام لکھوائے۔ مسلمانوں سے ذکوۃ  
لینے اور غیر مسلموں سے ٹیکس (جزیہ) وصول کرنے کی ہدایات درج کرائیں۔ نیز لوگوں کی مذہبی آزادی کا حق ثبت فرمایا  
اور وناحت کی کہ جو لوگ یہودی یا نصرانی رہنا چاہیں۔ ان کا مذہب جبراً تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔ اسی کے ساتھ

ساتھ فرمان میں لکھوایا کہ زرعہ ذی یزن کی طرف ہمارے نمائندہ افسر — معاذ بن جبل، عبداللہ ابن زبیر مالک بن ابیہ، عقبہ بن نمر، مالک بن مرہ اور کچھ دوسرے لوگ روانہ کیے جا رہے ہیں۔ اس جماعت کے سربراہ معاذ بن جبل ہیں۔ یہ ہمارے احکامات پہنچائیں گے اور صدقہ و جزیہ کی رقم جمع کر کے لائیں گے۔

### ۳۶ - وفدِ نخب :

یہ بھی یمن ہی کا ایک قبیلہ تھا۔ یہ اکثر روایات کے بموجب آخری وفد ہے جو اللہ (محرّم) میں مریض آیا اس میں دو سو آدمی شریک تھے۔ دراصل یہ لوگ حضرت معاذ بن جبل کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کر چکے تھے۔ یوں کے انقلاب نے تقاضا کیا تو یہ مرکز اسلام میں پہنچے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنا اسلام پیش کیا ایک رکن وفد نے اپنے خوابوں کی تعبیریں دریافت کیں اور مختصر قیام کے بعد واپس ہو گئے۔

ان وفد کی آمد اس کثرت سے اور اتنی پے در پے ہوئی ہے کہ صحیح معنوں میں بَيِّدُ خُلُوفٍ فِي دِينِ اللَّهِ فَوْجًا کا مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ درحقیقت انسانی فطرت خود حق کی طرف جھکاؤ رکھتی ہے اور پھر محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف قرآن کے استدلالی زور اور دل گداز اسلوب بیان کے ساتھ حق کو پیش کیا تھا۔ بلکہ اپنی مقدس سیرت اور عملی زندگی سے اس کی صداقت کا ایسا کامل مظاہرہ کیا تھا کہ انسانیت رام ہو۔ نہ بغیر نہ رہ سکی۔ عوام انسان کے راستے میں رکاوٹ بنتی تو سابق جاہلی قیادت تھی۔ وہ جب ہٹ گئی اور ساتھ ہی جب ان کو یہ عینیت ہو گئی۔ ان کی اسلامی طاقت ایک مسبوطا عاقت ہے اور اس کے ہاتھوں سے واقعی خیر و فلاح پھیلے۔ وہی سبب اور کوئی سبب سبک سر کے آگے جہ نہیں سکتا۔ تو پھر ان کے سینے سچائی اور نیکی کے پیغام کے لیے پوری راج محسوس تھے۔ انہوں نے خود اپنے اندر سے اس نور صداقت کی پیاس محسوس کی۔ اس پیاس سے بیتاب ہو ہو کر مدینہ کی طرف چلے۔ وہیں سے ساغر بھر بھر کے پئے۔ اور پھر جا کر اپنے اپنے علاقوں اور قبیلوں میں ختم کے ختم لندھا دیے۔

یوں اُجبالا پھیلتا چلا گیا۔ اور ظلمتیں کافور ہوتی چلی گئیں۔

### بین الاقوامی دعوت کا آغاز :

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ جس جماعت کو تحریک اسلامی چلانے کی سعادت حاصل ہوئی اس کا دائرہ قومی و ملکی ہی نہ تھا۔ بلکہ وہ ایسی خیر امت تھی۔ جو اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے مرتبے پر فائز کی گئی تھی۔ اور جسے شہداء علی الناس قرار دیا گیا تھا۔ یعنی تمام انسانیت کو حق اور راستی عدل اور اخوت کے نظام کا راستہ دکھانے والی جماعت — اہل عرب کی اصلاح و تربیت اور ان کی ریاستی سطح پر تنظیم فی نفسہ آخری مقصود نہ تھی۔ بلکہ پیش نظر یہ تھا کہ ایک اسلامی ریاست اُٹھے اور تمام ذرائع و وسائل کو کام میں لا کر دنیا بھر کی قوموں اور مملکتوں کو نظام حق کی دعوت دے۔ آخر وہ کروڑوں بندگانِ خدا جو اس دورِ بادشاہت میں چھوٹے چھوٹے مہبذوں اور خانہ دلوں کے آفت

نے پس رہے تھے اور جنہیں نہ سوچنے کی آزادی مہیا تھی۔ نہ معاشی فراغت حاصل تھی اور نہ جن کے کچھ سیاسی حقوق تھے۔ ان کی مطلوبہ حالت سے کوئی بھی تحریک اصلاح کیسے آنکھیں بند کر سکتی ہے۔ کسریٰ کے نام ارسال کردہ خط میں حضور نے خود ہی اپنی دعوت کے بین الاقوامی پیمانے کو ان الفاظ سے اُجاگر کر دیا ہے۔ کہ

فَاتَىٰ اِنَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِلَى النَّاسِ " یعنی میری حیثیت یہ ہے کہ میں سارے انسانوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

حق تعالیٰ نے بادشاہوں اور مذہبی طبقوں کے ہاتھوں علاقائی قومیتوں میں بٹی ہوئی انسانیت کے لیے بین الاقوامی دور کا افتتاح خود محسن انسانیت ہی کے ہاتھوں کرایا۔ اور ایک کلمہ صداقت جبرانی، نسلی، لسانی اور سیاسی حد بندیوں کو توڑتا ہوا بہت جلد وقت کی معلوم و مربوط دنیا کے تینوں براعظموں پر چھا گیا۔ سلسلہ انبیاء کے خاتمہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بین الاقوامی دعوت کے ساتھ ٹھیک ایسے زمانے میں کھڑے کیے گئے جب کہ زمانے کی چند ہی کڑوں کے بعد بارود اور پریس اور بھاپ کی طاقتوں کا ظہور ہونے والا تھا۔ اور معمورہ ارضی سے ذرائع و وسائل کے بل پر ایک شہر کی طرح مربوط ہو جانے والا تھا۔ پانچ سات سو سال تاریخ کی دستوں میں کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتے۔ حضور ایسے زمانے میں مبعوث ہوئے کہ جس کے چند ہی صدیوں بعد دنیا کے سرے مادی لحاظ سے مل جانے والے تھے۔ اس موقع کے آنے سے مناسب وقت پہلے اسلام کے نظام حق کی بین الاقوامی دعوت اُٹھادی گئی۔ تاکہ انسانیت جوں جوں مادی طور پر قریب ہوتی جائے۔ ذہنی لادری نظریاتی اور اخلاقی و مقصدی لحاظ سے بھی ایک رشتے میں پروٹی جا سکے۔ بیچ کا یہ وقت دعوت کے پلانے اور اقوام عالم کے دوروں کے لیے تیار کرنے کو بمشکل کافی ہو سکتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بین الاقوامی دور کا دھارا مسلم انقلابی قوت کے قبضے سے نکل کر مادہ پرستی کی رود گاہ میں چلا گیا۔ کیونکہ یہ قوت اس وقت تک تاریخ میں ایک مؤثر مقام رکھنے کے باوجود اپنی انقلابی دعوت کا زر رکھو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی نئے دور کو انسانیت کے احترام، بنی نوع آدم کی مساوات، اجتماعی رابطے کے لیے جمہوری تصورات، عقلی و تجربی علوم کی قدر و قیمت کا احساس، تسخیر قوی کا جذبہ، بین الاقوامی حقوق اور معاہدات کا احترام، خیال اور رائے کی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق کا شعور، انصاف کے اساسی اصول اور بعض دوسری قیمتی اقدار بالواسطہ اسلامی تحریک سے ہاتھ آئیں۔ اگرچہ وہ مادہ پرستانہ ذہنیت کی زد میں آ کر دھنلا بھی گئیں۔ پھر بھی دور حاضر کے تمدن میں خیر و خوبی کا جو محفوظ اثبت عنصر پایا جاتا ہے۔ وہ محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے کام کا مرہونِ منت ہے۔ اس کا اعتراف بعض انصاف پسند مستشرقین نے خود بھی کیا ہے۔

پس تحریک اسلامی اپنی اصولی فطرت کے لحاظ سے تقاضا کرتی تھی کہ اس کی دعوت کی کرنیں عرب کی

مردوں میں پابند نہ رہیں۔ بلکہ زہین کے گوشے گوشے تک پہنچیں۔ اس کے ساتھ ساتھ عملی سز ورت بھی ہی تھی۔ کہ اسلام عرب کے ارد گرد بھی نور افگن ہو۔ ورنہ نظریہ حقنی اساس پر ایک نظام کا مجرد عرب میں سلامتی سے چلنے رہنا ممکن نہ تھا۔ جب کہ اسلامی ریاست اس نظریہ کی مخالف طاقتوں کے گہرے میں گھری رہے۔ خصوصاً یام سامنے رہے کہ رومی اور ایرانی حکومتیں ہمیشہ عرب پر سیاسی ہوس کی نگاہ جمائے رہیں۔ اس ایک کے بغیر علاقے ان کے قبضے میں رہے اور عرب قبائل کو انہوں نے خرید خرید کر استعما میں رکھا۔ رومی حکومت سے تو مدینہ کا تصادم شروع بھی ہو چکا تھا۔

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار کار ہمارے سے جیران کن ہے کہ تیرہ برس کی مدت میں ابتدائی دعوت دے کر افراد کا تیار کرنے کا کام مکمل فرمایا۔ اور پھر آٹھ برس کے اندر اندر اسلامی ریاست عملاً زمین کے نقشے پر کھڑی کر کے مخالفت کے سارے محاذ توڑ دیے اور پھر اپنی زندگی ہی میں دعوت کی ہر سی اس پاس کی مسظنوں میں پہنچا دیں۔

صلح حدیبیہ کے بعد انہوں نے اندرون ملک کے تصادموں سے فراغت دے کر حضور کے لیے یہ موقع ڈالا کیا کہ عرب سے باہر بھی کام کی ابتدا کر دی جائے۔ عمرہ القضاء ادا کرنے کے فوراً بعد یعنی یکم محرم سن ۶۲۸ء کو حضور نے لفظ مسظنوں کے حکمرانوں کو اسلامی نظام کا پیغام خصوصی قاصدوں کے ذریعے بجا لیا۔ یہ بات ان کے دور میں قابلِ جو معاہدہ ہوتی۔ کہ حضور نے دوسرے ملکوں کے عوام تک کلمہ حق پہنچانے کے بجائے آخری وقت کے دوروں کو یوں مناسب فرمایا۔ اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ عوام الناس کے کوئی شہر، محلہ، اس دور کے بادشاہوں کے مقابلے میں نہ تھے اور انہیں وہ اساسی آزادی ہی مہیا نہ تھی جس کے سارے اردہ اپنے رہنے کے لیے کوئی فیصلہ کر سکیں۔ پھر یہ بادشاہتیں اس امر کا موقع دینے یہ بھی قطعاً تیار نہ تھیں کہ دوسرے ملکوں کے عوام کو ان کی رعیت سے میل جول رکھیں اور ان کو موجودہ مذہب سے برکشتہ کریں۔ ان کے سیاسی اقتدار سے وہ مذہب کے بل پر ہی چل رہے تھے۔ اور وہ مذہبی پیشواؤں کے طبقتوں کا تعاون حاصل کر کے حکم انی کر رہے تھے۔ یہ وہاں صرف تبدیل مذہب کا معاملہ نہ ہو۔ بلکہ انسان کو من حیث النکل بدل جانا ہو۔ اس لیے حملے اور قتل ان کے ذوق اور معیارات ہی بیکسر تبدیل کیے جانے ہوں۔ درہمیں دعوت حق فتنوں کرنے والوں میں سے تھا کہ نظام کے نہایت باغیانہ رجحان پیدا کر کے نئے نظام کی اقامت کا القادنی داعیہ اہل جانا ہو۔ وہاں کیسے ممکن تھا کہ بادشاہتیں اپنے عوام میں اسلامی دعوت کو چب چاپ پھیلنے کا موقع دیتیں۔ اس دور کی بادشاہی قیادت ہوا باخداوند بنی ہیتی تھی اور نیچے ایک پتہ بھی اس کی ہدایت کے بغیر نہیں مل سکتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر نہ صرف یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کو مخاطب خود زمانہ روزوں کو بنا دیا ہے۔

نامہ ہائے مبارک میں صراحت سے ان کو پوری قوم کا نمائندہ قرار دے کر عوام کے برے اور بھلے کی ذمہ داری ان پر ڈالی۔ حضور نے مختلف تاجداروں کو ”عظیم الروم“ ”عظیم فارس“ ”عظیم القبط“ یعنی فلاں اور فلاں قوم کے سربراہ کارکہہ کے مخاطب فرمایا۔ پھر کسریٰ اور مقوقش کو صراحتاً لکھا کہ اگر تم دعوت قبول نہ کرو۔ تو عیدک اثم المجوس عیدک اثم اهل القبط۔ یعنی تم پر پورے مجوسیوں اور تمام قبطیوں کی غلط روی کا وبال عاید ہوگا۔

تاجداروں کو خطوط لکھتے ہوئے حضور نے ایک طرف مروجہ آداب کا اہتمام کیا۔ یعنی بطور خاص مہر کرنے کے لیے انگلیٹھی بنوائی اور اس میں ”محمد رسول اللہ“ کے الفاظ کندہ کرائے دوسری طرف اپنا ایک خاص اسلوب و نچ پیدا کیا۔ ہر خط کا آغاز خدائے رحمن و رحیم کے نام سے فرمایا۔ پھر مرسل کی حیثیت سے اپنا اسم مبارک لکھوایا۔ پھر مکتوب الیہ کا نام۔ پھر کم سے کم اور انتہائی محتاط اور چھپے تلے الفاظ میں مدعا بیان فرمایا۔ اس دور کے لحاظ سے جو سفارتی زبان آپ نے خطوط کے لیے اختیار کی ہے وہ حضور کی ذہنی برتری کو ہمارے سامنے واضح کر کے آج بھی حیران کر دینے والی ہے۔ مثلاً انہی خطوط میں کمال ایجاز دکھاتے ہوئے یہ جملہ آپ نے لکھوایا ”اَسْلِمَ نَسْلِحًا“ اسلام لاؤ۔ سلامتی پاؤ گے۔ بلاغت کا کمال یہ ہے۔ کہ اس کے معنی وہ بھی ہیں، اور یہ بھی ہیں کہ اطاعت کرو تو سلامتی پاؤ گے۔ خود سلامتی پاؤ گے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ یہی سلامتی کا مسلک ہے اور دوسرا مفہوم اچھی خاصی سیاسی دھمکی آپ نے اندر رکھنا ہے۔ یعنی اگر نہ مانو گے تو پھر خیر نہیں صرف دو لفظ ہیں اور ان کے معانی کی وسعتوں کو دیکھیے۔ اسی طرح فغایات اثم المجوس یا اثم اهل القبط کے جملے میں لفظ اثم کا دوسرا مفہوم ہے۔ مذہبی بھی سیاسی بھی ایک یہ کہ تم پر قوم کا وبال عند اللہ ہوگا یا آخرت میں ہوگا۔ دوسرا یہ کہ سیاسی حیثیت سے تمہیں کیفر کردار سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان دو معنی الفاظ کے استعمال سے حضور کا منشا ہرگز یہ نہیں تھا کہ بات غیر واضح رہے اور (غوز باللہ) کسی ہیر پھیر سے کام لیا جائے۔ بلکہ دونوں کلمات سے بیک دم ہر دو مفہوم سامنے رکھنے مطلوب تھے۔ یہ فصاحت و بلاغت کا کمال ہے کہ اتنے کم الفاظ سے اتنے وسیع معانی حاصل ہوں۔ علاوہ ازیں ہر حکمران کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے مذہب اور اس کے مخصوص حالات کو پیش نظر رکھ کر مختلف عبارات سے کام لیا۔ یہ نہیں کہ ایک ہی سپاٹ مضمون نقل کر دیا گیا ہو۔ پھر آپ نے ہر حکمران کی طرف اس کی قومی زبان جاننے والا سفیر نامزد کر کے روانہ کیا۔ دعوت کے علاوہ ان خطوط کی ترسیل کا ایک بڑا مدعا یہ بھی تھا کہ آس پاس کے حکمرانوں کو یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ اب عرب پہلے کی طرح کی کوئی کھلی چراگاہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک باضابطہ حکومت کے

۱۔ تجارتی سفروں میں ہمیشہ آمدورفت رکھنے کی وجہ سے ملحقہ ممالک کی بولیاں جاننے والے صحابی موجود تھے بعض کو حضور نے حکم خاص سے کسی زبان کے سیکھنے پر مامور بھی فرمایا۔

زیرِ نظام ہے۔ ایک کارِ مذاہمت موجود ہے۔ جو ہر لحاظ سے چوکس اور مضبوط ہے وہ کسی پرانی سلطنت سے دبنے والی بھی نہیں۔ بلکہ وہ چیلنج کر رہی ہے۔ اور چیلنج کرنے کا دم خم اس میں موجود ہے۔

اب ہم مجدداً روادِ بیان کرتے ہیں۔ کہ کس طرح ایک ایک حکمران تک نامہ دعوت پہنچایا گیا اور نتیجہ کیا نکلا۔

(۱) اصم (یا اسمہ) بن ابجر نجاشی، شاہِ حبش کے دربار میں عمرو بن امیہ صغریٰ کے ہاتھ حضورؐ نے ایک مکتوب دعوت بھیجا۔ اس مکتوب میں مہاجرین حبش کو خط سے پہلے حبش روانہ کرنے کا حوالہ بھی ہے۔ خصوصاً حضرت جعفرؓ کا ذکر ہے۔ اور ان کو آرام سے رکھنے کی تلقین فرمائی ہے۔ پھر اس میں اسلام کی دعوت، شاہ کو بھی دی گئی ہے۔ اور اس کے معرفتِ عمامہ سلطنت (جنودک) کو بھی۔

نجاشی پہلے ہی اسلام سے متاثر تھا۔ حضرت جعفر کے ہاتھ یہ بھی علی الاعلان اسلام کی بیعت کی اور اس کی عدع ایک تفصیلی خط کے ذریعے حضورؐ کو بھجوائی۔ اپنے بیٹے۔ ہا کو سفیر بنا کر بھیجا۔ یہ پیش کش بھی کی کہ اگر ارشاد ہو تو میں خود حاضر بارگاہِ جو جاؤں۔

(۲) مغز بن ساری بحرن کے علاقے کا حکمران تھا۔ ورنہ شاہِ فارس کا باجگزار تھا۔ بن حنفہ ہی کے ہاتھ حضورؐ نے نامہ دعوت بھیجا۔ مندر نے اسلام کے نور کو قبول کیا اور اس کی رعیت میں سے بھی ایک عدد مکتوب میں دیکھا جوتی۔ اس نے بھی جوابی خط میں اپنا اسلام پیش کیا اور رعیت کے بارے میں بتا کر کہہ دیا کہ میں اسلام کے لیے تھل گئے ہیں۔ میں بعض مخالفین ہیں اور یہودیوں کی رہنمائی میں ہیں۔ یہ سب لوگ بارگاہِ نبویؐ کو جولوگ یہودی و نصرانی رہنا چاہیں ان پر عیسائی عاید ہوگا اور وہ اپنے مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں۔

(۳) جبیر اور عبد جندی کے دو بیٹے تھے۔ جن کا اقتدار عمان میں چلتا تھا۔ عمرو بن عاص کے ہاتھ نامہ دعوت بھیجا گیا۔ عمرو بن عاص پہلے چھوٹے بھائی عبد سے ملے تو اس نے بڑی حویل گفتگو کی۔ اور ان سے خاصی معاونت حاصل کی کہ سب کچھ مسلمان ہو گیا ہے اور پھر بھی اس کی قوم نے اسے بادشاہت پر قائم رکھا ہے۔ بیشپ پادری میں کاڑھٹ نہیں ڈال سکے۔ اور ہر قیل روم نے بھی اس واقعہ کا علم ہو جانے کے باوجود کوئی اقدام نہیں کیا۔ بلکہ نجاشی نے اسلام لانے کے بعد ہر قیل کو خراج دینا بھی بند کر دیا ہے۔ پھر حضرت عمرو بن عاص سے اس نے نبی اکرم صلی اللہ

لہ اغلب یہ ہے کہ یہ وہ نجاشی اول نہیں ہے جس کے سامنے مہاجرین کا معاملہ پیش ہوا تھا۔ اور وہ مسلمان ہوا۔ اور اس کی

غائبانہ ناز جنازہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی یہ ہم اس کے بعد تخت نشین ہوا۔ بہ حال یہ عمل اختلاف ہے۔



علیہ وسلم کی خاص خاص تعلیمات دریافت کیں۔ اس گفتگو سے اس کے اندر ایک دلولہ تو پیدا ہو گیا اور اس نے بحسرت کہا کہ کاش کہ میرا بڑا بھائی بھی مان جائے۔ اور ہم دونوں مدینہ جا کر اسلام میں داخل ہوں۔ پھر دربار لگایا گیا۔ اور دونوں بھائیوں کی موجودگی میں سفیر مدینہ نے سر بہر خط پیش کیا دونوں بھائیوں نے پڑھا۔ پھر کچھ سوالات کیے۔ جن کے جواب میں حضرت عمر بن غاص نے بتایا کہ قریش نے چارو ناچار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اختیار کرنی ہے اور حضور کی جماعت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جنہوں نے غور و فکر اور شعور و فہم کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ان کی دعوت کو قبول کیا ہے۔ اور پھر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حضور کے گرد اکٹھے ہوئے ہیں پھر دو ایک روز تک جیفر بادشاہ حبش میں رہا۔ بالآخر یہ دونوں بھائی اسلام کے سایہ رحمت میں داخل ہوئے اور ان کے ساتھ رعیت کا ایک حصہ بھی صداقت کے نور سے بہرہ مند ہوا۔

(۴) منذر بن حارث بن ابو شمر دمشق کا حاکم تھا۔ شجاع بن وہب الاسدی اسلامی حکومت کے سفیرین کے اس تک پہنچے۔ پہلے تو نامہ مبارک کو دیکھ کر وہ بھنپا۔ مگر بعد میں توازن بحال کر لیا۔ مصلحتاً سفر مدینہ کو باعزاز رخصت کیا۔ البتہ اسلام قبول نہ کیا۔

(۵) ہوزہ بن علی پیامہ کا حاکم تھا۔ اور عیسائیت کا پابند۔ مدینہ سے سلیط بن عمرو دعوتی خط لے کے گئے اس نے بھی حضور کے کام کو دنیوی سیاست کا مفہوم دیا اور سودا کرنے کے لیے شرط رکھی کہ اسلامی حکومت میں آدھا حصہ میرا ہو۔ بعد میں جلد ہی اس کا پیمانہ عمر لبریز ہو گیا۔ حضور تک رواد پہنچی تو فرمایا کہ وہ ایک انگل بھریا ایک کھجور برابر زمین مانگے تو میں نہیں دے سکتا۔ اسلامی نظام جس سرزمین پر قائم ہوتا ہے۔ اس کا توفیرہ درہ ایک مقدس امانت ہوتا ہے۔

(۶) جنیح بن منی مقوقس اسکندریہ و مصر کا تاجدار تھا اور مذہباً عیسائی۔ حاطب بن ابی بلتعہ کو حضور نے اس کے دربار میں روانہ کیا۔ انہوں نے خط پہنچانے کے بعد گفتگو بھی کی۔ اور ایسے بے باکانہ انداز میں کی کہ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس مضبوط ذہن و کردار کی ہستیاں حضور نے اسلام کے سانچے میں ڈھال کر پیدا کیں۔ حاطب نے مقوقس کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سرزمین میں پہلے بھی ایک شخص گزرا ہے۔ جو اناد بکم الاعلیٰ کا لغو لگایا کرتا تھا۔ آخر وہ خدا کے غضب کا شکار ہوا۔ پس لازم ہے کہ آپ لوگ دوسروں سے عبرت پکڑیں۔ البتہ نہ ہو کہ دوسرے آپ لوگوں سے عبرت حاصل کریں۔ پھر عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کی برتری دلائل سے کر دانتی کی۔ پھر یہ بھی کہا کہ ہم آپ کو حضرت مسیح ہی کے پیش کردہ صحیح دین کی طرف بلا رہے ہیں۔ یعنی یہ کوئی نئی راہ نہیں۔ مقوقس اسلام قبول کرنے پر تو آمادہ نہ ہوا۔ مگر اس نے نامہ نبوت کا بڑا احترام کیا اسے ہاتھی دانت کے ڈبے میں رکھوا کر خزانے میں محفوظ کر دیا۔ حضور کے لیے مخالف بھجوائے۔ جن میں دلدل نامی مشہور نجر بھی شامل

تھا۔ خط کے جواب میں یہ بھی لکھا کہ مجھے معلوم ہے کہ نبی آخر زمان کی آمد باقی ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ وہ ملکِ شام میں اٹھیں گے۔

(۷) ہرقل یا قیصر رومی سلطنت کے مشرقی حصے کا تاجدار تھا اور قسطنطنیہ اس کا دار الحکومت تھا۔ حبیب بن خلیفہ کلبی کو حضور نے نامہ مبارک دے کر اس کے دربار میں بھیجا۔ دخیہ بیت المقدس کے مقام پر جا کر اس سے ملے۔ سفیر مدینہ کے اعزاز میں ہرقل نے بڑا بھاری دربار منعقد کیا اور نبی اکرم کے بارے میں تفصیلاً دریافت کیں۔ پھر دریافت کرایا کہ اگر مکہ کا کوئی اور آدمی اس علاقے میں آباد ہو تو اسے پیش کیا جائے۔ تفاق کی بات کہ حضور کے مخالف محاذ کا فاتر ابوسفیان انہی دنوں تجارت کے سلسلہ میں شام میں پہنچا تھا۔ اسے مع تجارتی ساتھیوں کے دربار میں لایا گیا۔ ہرقل نے ان لوگوں سے کہا کہ میں ابوسفیان سے کچھ سوالات کروں گا۔ اگر کوئی بات غلط ہو تو تم لوگ تباہینا۔ ابوسفیان کا اپنا قول تھا کہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ ساتھی میرے جھوٹ کو ظاہر کر دیں گے تو شاید میں اس موقع پر کچھ باتیں گھڑتا۔ لیکن خدا نے صورتِ حالات ایسی پیدا کر دی کہ رسولِ خدا اور سدا کے دشمن کی زبان سے بھی سچ نکلا۔ پھر قیصر نے حضور کے خاندان، نسب، خدق، حضور کے رفقاء کے تحریک کے حالات اور ان کی رفتار ترقی، جنگوں میں مسلم جماعت کی پوزیشن اور اسلام کی تعلیمات اور دوسری کچھ چیزیں دریافت کیں۔ ساری باتیں سن کر کہا کہ "ابوسفیان! اگر تم نے سچ سچ جواب دیے ہیں تو وہ شخص ایک روز اس جاگہ کا مالک ہوگا۔ جہاں میں بیٹھا ہوا ہوں۔ کاش میں حاضر خدمت ہو سکتا۔ اور اس نبی کے پاؤں دھویا کرتا۔ اس کے بعد نامہ مبارک پڑھا گیا جس پر درباری بہت شپٹائے۔ کیونکہ ہرقل کی ذہنی کیفیت نے انہیں بوکھلاہٹ میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے مکہ والوں کو تیزی جلدی بابر نکال دیا۔

اس مکالمہ نے خود ابوسفیان کے دل پر اسلام کی عظمت کا نقش ثبت کر دیا۔

(۸) خسرو پرویز کسریٰ ایران کی بہت بڑی سلطنت کا حکمران تھا۔ یہ زرتشت کے مذہب کا پیرو تھا حضور نے عبداللہ بن رواحہ کو سفیر بنا کر اس کی طرف نامہ دعوت بھیجا۔

خسرو کسریٰ کے جس تخت پر بیٹھا تھا، مشکل ہی سے نشہ پندار اس کی بصیرت کو کام کرنے کا موقع دے سکتا تھا۔ غصے میں پھیر گیا اور نامہ نبوت کو یہ کہہ کر چاک کر دیا کہ ہماری رعیت کا ایک ذریعہ جزا دکھاتا ہے۔ کم بخت کو پوری طرح معلوم نہ تھا کہ عرب کتنے بڑے انقلاب سے گزر رہے ہیں۔ اور کیسی بھاری نظریاتی توجہ نشوونما پا رہی ہے اس نے اپنے گورنر زمین باذان کو نامور کیا کہ مکتوب نگار کو فوراً گرفتار کر کے حاضر کر دو۔ باذان نے ایک فوجی دستہ اس مہم پر روانہ کیا۔ یہ جب طائف پہنچا تو وہاں کے اکابر بہت خوش ہوئے۔ کہ اب ان کے محبوب جاہلی نظام کے حریف کا (نعمت باللہ) خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ دستہ مدینہ پہنچا اور ان کے سردار نے حضور تک

مدعا پہنچایا۔ حضور نے فرمایا کہ کل صبح آ کر پھر ملو۔ صبح یہ لوگ حاضر ہوئے تو حضور نے ان کو خبر دی کہ آج رات خدا نے تمہارے بادشاہ کی مہلت حیات ختم کر دی ہے اور وہ اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے۔ جاؤ اور جا کر تحقیق کر لو۔ اس پیش گوئی کی صحت معلوم ہونے اور محسن انسانیت کی تعلیم اور کردار کا حال جاننے پر باذان اسلامی نظامِ انوثت میں شریک ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ دربار اور علاقے کے بہت سے لوگ بھی ایمان سے مالا مال ہوئے۔

حضور نے کسریٰ کے رویتے کی روداد سن کر فرمایا: "صَرِّقٌ مَدَكَةٌ" یعنی اس نے میرے خط کو چاک چاک کر کے درحقیقت اپنی سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ حضور کے الفاظ میں قصداً یہ الٰہی بول رہی تھیں۔ دس پندرہ برس کے اندر اندر چار پانچ ہزار برس کی قدیمی سلطنت — مہنبوط اور وسیع اور بڑے بڑے مٹا کھ باٹھ رکھنے والی سلطنت — اسلام کے قدموں میں مفتوح پڑی تھی۔ ذہنی الباقع طوائف الملوکی ہی نے اسے اس انجام تک پہنچایا۔

علاوہ ازیں جن دوسرے چھوٹے چھوٹے والیوں کا ساتھ دیا گیا، ان میں سے ایک، توفروہ بن عمر رومی سلطنت کا گورنر تھا۔ جس نے اسلام قبول کر کے نہ صرف ہماری پرلاست ماری بلکہ جان بھی شہادت حق میں لگا دی۔ دوسرا نجد کا حکمران ثامہ تھا جو سلسلہ میں اسلام میں داخل ہوا، تیسرا جبلہ غسانی مسلمان ہوا۔ چوتھا دوسرا الجندل کا حاکم اکیدر بھی مسلمان ہوا۔ پانچواں ذوالکلاح حمیری جو قبیلہ حمیر کا بادشاہ تھا اور اپنے آپ کو خدا کہلاتا اور لوگوں سے سجدے کراتا تھا۔ آخر کار یہ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔ اور دوبرناروقی میں بادشاہت چھوڑ کر رہبانہ زندگی بسر کرنے کے لیے ماریہ آ گیا۔ اس نے اسلام لانے کی خوشی میں اٹھارہ ہزار غلام آزاد کیے تھے۔

اوپر کے واقعات سے ظاہر ہے کہ دعوتِ حق کے اس قلمی محاذ سے بھی بڑے اہم نتائج پیدا ہوئے اور یہ تدبیر فروغِ اسلام میں مثبت مدد ہوئی۔ اولاً یہ ہوا کہ اردگرد کی سلطنتوں میں اسلام کا پیغام بر حیثیت ایک موضوع اور بحث کے جا پہنچا اور محدود حلقوں میں سہی، اس پر سوچا جانے لگا۔ پھر یہ اسلام کی صداقت اور اس کے مطابق فطرت ہونے کا ایک ثبوت سے کہ اہل جاہ و اقتدار کی ایک اچھی خاصی تعداد ایسی حالت میں مسلمان ہوئی، جب کہ مسلم جماعت تمدنی لحاظ سے بہت پیچھے تھی۔ ان لوگوں کے ساتھ ان کے زیر اثر عوام میں بھی اسلام کو راستہ ملنے لگا۔ مکاتیبِ نبوی کے جو مخاطب اسلام میں نہیں آسکے۔ ان کے ذہنوں پر بھی خاصے اچھے اثرات پڑ گئے۔ پھر اس بین الاقوامی دور کے افتتاح سے خود اندرون ملک بھی فضا ہوا رہنے میں مدد ملی۔ سب سے بڑا فائدہ اس مہم کا یہ ہوا کہ مسلم جماعت کے سامنے ایک وسیع دائرہ کار شروع ہی سے آ گیا اور اسے

سب العین قومی دہلی بھیانے سے بہت بڑا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب میں اسلامی سلطنت کے چھا جانے کے باوجود ان لوگوں نے کمریں نہیں کھولیں۔ عیش و تنعم میں نہیں پڑے۔ ان میں یہ اطمینان پیدا نہ ہوا کہ کرنے کا کام ہونے مکمل کر دیا۔ کلمہ حق سے ان کی لگن گھٹنے نہیں پائی۔ بلکہ ان کا شرار آرزو پہلے سے زیادہ چمکنے لگا۔ پھر سفارتی معادلات میں اپنے رفقہ کو ڈال کر حضور نے ان کو آنے والی ذمہ داریوں کے لیے اچھی خاصی تربیت دے لی۔ وہ اجنبی عقائد میں پہنچے۔ ٹھانڈے دارنمدیوں کے دائروں میں داخل ہوئے۔ مرعوب کفن شاہی درباروں میں پہنچے، بدمذہبی مجلسوں میں نہیں مکالمہ و بحث کا تجربہ ہوا۔ وقت کے حکمرانوں اور درباریوں کی نفسیات سمجھنے کا ان کو موقع ملا اور کچھ جس اطمینان، مضبوطی، اپنے مسک کی برتری کے شعور، اپنی سادگی اور بدویت کے ساتھ اپنی عزت کے حساس در بیان کے لیے جس جراتِ اظہار کا انہوں نے مظاہرہ کیا۔ اس نے ان کی صلاحیتوں کو اور زیادہ اجاگر کر دیا۔ اور ان کا کردار اور مزاج زیادہ نکمرا گیا۔

بین الاقوامی دشمنی کی یہ نغمہ جس کا حضور نے آغاز کیا تھا۔ سے تمہیں دینے کی سعادت آپ کے ہاں رہی۔ رفقہ اور آپ کی تربیت دادہ جماعت کے حصے میں آئی۔

### رد عمل کی آخری لہر:

کوئی انقلاب سارے مرحلے کشمکش کو پار کر کے اور پرانی قیادتوں کا زور توڑ کر جب نیا دور آتا ہے تو وہیں داخل ہوتا ہے تو اس ہمیابی پر مارے حسد کے بعض دواں ہمت لوگ ندرسی بنا کر بڑھتے۔ جتنے ہیں، جتنے کوئی موقع آتا ہے، جب یہ آخری جسارت سے کام لے کر سیدِ تغیر کے آگے تھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہی ہی صورتِ سامی انقلاب کو پیش کی رفتار اور بیود و صحرائی قبائل کو معافی نہ دیا جاتا ہے۔ ٹوٹ گیا۔ اور عوامِ اسلام کی طرف بڑھنے لگے اور سلام عوام میں نفوذ کرنے لگا۔ نوحی سلطنت کی ایک شہرہ آفاق لہر ہوئی۔ ایک نئی صورت میں اٹھی۔ کچھ لوگوں نے یوں سوچا کہ ایک شخص کھٹا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کیا، انہی لوگوں کو اپنے ساتھ لیا۔ کشمکش کی اور آج وہ سارے عرب کا حکمران بن چکا ہے۔ لوگوں نے ہم بھی جی سکتے ہیں۔ خصوصاً جب یہ لوگ صدقہ زکوٰۃ کے امولِ اشراف کو دینے جاتے دیکھتے ہوں گے۔ تو ان کے مومنوں میں دینی حیرت ہوگا۔ ان کے سامنے ایسے عنانہ تھے۔ جو چاروں طرف سے ہوجائے تھے۔ مگر ان کے دواں میں مخالفت۔ وہ بھی کھول رہا تھا۔ ان کو سمیٹ کر انہوں نے بازی کھیلنا چاہی۔ وہ یہ بات خوب سمجھتے تھے کہ سب جاہلی تہذیب اور مشرکانہ نیابت پر شانہ نظریات کے بل پر تو کوئی کام نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ فضائل توحیدِ باری تعالیٰ و روحی و ربوبت اور آخرت کے عقائد پوری طرح چھا گئے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی دکالوں میں انہی لیبوں کے ساتھ سودا کر لوگوں کو دھاندلنے کی کوشش کی۔ مگر یہ سبہ زخوف نہ جانتے تھے کہ سکتے ہیں کہ جیسے صرف ایک نسل نفس ہانی نہیں ہوتی

اس کے لیے کھری دھات کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اسلام کے سکہ میں جو دھات استعمال ہوتی تھی، وہ فی نفسہ بھی بہترین تھی (نخیار کھد فی الاسلاہ، نخیار کھد فی الجاہلیہ)، اور پھر اُسے دس بیس برس تک بھٹیوں اور کٹھالیوں میں سے گزارا گیا تھا۔ مگر بندگان ہوس کی نگاہیں کبھی گہرائی تک نہیں جاتیں۔ وہ اپنی پسند کے مفاد کو دیکھتی ہیں۔ اور اس قیمت میں جو قربانیاں دینی پڑتی ہیں، ان پر کبھی توجہ نہیں کرتیں۔ غرض تاریخ میں یہ جو ہوتی آتی ہے کہ ہر عظیم شخصیت کا منہ چڑانے کے لیے کچھ ووں فطرت لوگ نمودار ہو جایا کرتے ہیں۔ اور ہر عروج پذیر تحریک کے آسمان گیر علم کے مقابلے پر بعض سفد عناصر چمپھڑوں کی جھنڈیاں بنا کے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بالکل ایسا ہی تاجر عرب میں بھی پیش آیا۔ ایسے شرسپندوں کا مختصر تذکرہ کیا جانا ضروری ہے۔

۱۔ پہلے ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ایک وفد کے ساتھ میلہ بن حبیب (جو کذاب کہلاتا ہے) مدینہ آیا تھا۔ مرکز اسلام کی ہماہمی کو دیکھ کر اس کی ہوس اقتدار میں اُبال آیا ہوگا۔ اس نے حضور کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں وہی شرکت اقتدار کا معاملہ چھیڑا۔ اور دھمکی بھی دی۔ حضور نے سختی سے اُسے مسترد کیا۔ بھنا کر اس نے نبوت کا علم بلند کر دیا۔ ادیب وہ تھا ہی۔ قرآن کی آیات کے طرز کو سامنے رکھ کر مقفی عبارتیں گھڑ گھڑ کے صحرائی عوام کو سنا تا اور چونکہ بعض لوگ ابھتی تک جا بلتیت سے ذہنی وابستگی رکھتے تھے۔ اور ان کی تعلیم و تربیت اسلامی نظام کے مطابق نہیں ہو پاتی تھی۔ نیز علاقائی اور قبیلوی عصبیت بھی ابھی باقی تھی اس لیے اسے کچھ نہ کچھ پیروکار بھی مل گئے۔ پھر چونکہ اس کی وحی نے نماز معاف کر دی اور اس کی شریعت نے زنا اور جوئے کو جائز کر دیا تھا۔ اس لیے تمام کا تمام فاسق مزاج عنصر اس کے گرد جمع ہو گیا۔ خیال کیجیے کہ یہ طاقت تھی جو اسلامی تحریک کے مقابلے پر لائی جا رہی تھی۔ دور صدیقی میں اس کا خاتمہ ہوا۔

۲۔ ایک عورت میلہ کے علاقے کے پڑوس میں سے اُٹھی جس کا نام سجاح تھا۔ اس نے بھی زنا نہ نبوت کا اولین علم بلند کیا۔ میلہ نے اس سے ملاقات کی۔ اور افہام و تفہیم کے لیے تنہائی میں گفتگو قرار پائی۔ میلہ نے شیطانی وحی کے ایسے فحش پارے پیش کیے کہ سجاح جنس کی رو میں بہہ گئی۔ اور اس کا وجود میلہ میں ضم ہو گیا بعد میں میلہ قتل ہوا، وہ تائب ہو کر مرتے دم تک اسلام پر قائم رہی۔

۳۔ حجۃ الوداع کے بعد یمن کے زرنیز اور سیاسی اہمیت رکھنے والے علاقے میں اسود عنسی نے ادعا شے نبوت کے پیرائے میں علم بغاوت بلند کیا۔ اس کا اصل نام ذوالنہار عہلہ بن کعب تھا۔ قبیلہ مذحج سے اسے پیروکار ملے۔ اور نجران میں بھی اس کے اثرات پھیلے۔ اس کے اثر کی بڑی وجہ اس کے جادو منتر وغیرہ کا چلن تھا۔ اسلامی حکومت کے بعض سول افسروں اور دعوتی اور تعلیمی کارکنوں کو اس نے تہ تیغ کر لیا۔ اور بعض کو اپنے علاقے سے نکال دیا۔ حضور نے آس پاس کے افسروں کو قوت اکٹھی کر کے اس بغاوت کے فرو کرنے کا فرمان بھیجا

اس نے ایک ایرانی النسل مسلمان کو قتل کرا کے اس کی خوب رو بیوی کو زبردستی گھر میں ڈال لیا تھا۔ یہ ناتواں اپنے ایمان میں پختہ تھی۔ اور اسی کی امداد سے اسلامی حکومت اسود پر قابو پانے میں کامیاب ہوئی۔ حضور کے نذر آخرت سے دو ایک روز قبل یہ فتنہ گر ہلاک ہوا اور پھر اس کی بن سری فوج کو باسانی ختم کر دیا گیا۔ لیکن اس کے پھیلائے ہوئے فتنے کے اثرات حضور موت سے طائف تک پھیلے اور ان کا ازالہ بھی درسد لقی ہی کے آغاز میں ہوا۔

۴۔ ان مثالوں کو دیکھ کر طلحہ بن خویلد اسدی کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اس نے بھی جلی نبوت کے بن پر بازی مار لینا چاہی۔ اپنے قبیلے بنو غطفان میں سے اسے پیر مارے۔ اس نے بھی حضور کو خط لکھ کر امداد میں سے حصہ مانگا تھا۔ اس کے فتنے کا قلع قمع بھی درسد لقی میں ہوا۔

۵۔ ۶۔ ان کے لقیط بن مالک ازدی کو جب ہوزہ بن علی کی جانشینی ملی تو اس کے دماغ میں جی کہہ اٹھانے لگا تھا۔

دراصل یہ مختلف افراد مختلف علاقوں میں اس لیے اٹھے کہ ان کو اپنے ارد گرد جاہلیت پرستوں بطور ناقہ اسلام قبول کرنے والوں، پرانے جرائم پیشہ فاسقوں، زنا، شراب، بھوسے اور سود خواری کے متوالوں، ایک مادی دنیا کی اطاعت کے مقابلے میں، اپنے قبیلے کی سر بندگی چاہنے والوں، پھیر زکوٰۃ دیتے ہوئے در زکوٰۃ کے اموں کو سہینہ جاتے دیکھتے ہوئے اندر ہی اندر کڑھنے والوں نیز ہنر مندوں کی موٹی موٹی قیادت کے ماتمیوں کی ایک چھٹی خاصی آواز دہنہ دیتی تھی۔ اس تعداد کو یہ لوگ حرکت میں سے آئے اور ان کے طفیل جاہلیت کی دہلیزوں میں موٹی موٹی ٹوت کے سب کو روک سنبھالا گیا۔

لیکن حضور کی تیار کردہ قیادت نے حارت کی ثوت ناک نزاکت کے باوجود بڑے مضبوط ہتھیاروں سے فتنوں کا سر کچلا اور عرب کے ایک متنفس کو نظم میں کس دیا۔

## تحریک اسلامی کا اجتماع عظیم :

حج اسلام کی ایک عظیم درجے کی بنیادی عبادت ہے ہرم پاک جو دعوت ابراہیمی کا مرکز تھا اور جس کے ذریعے پر دین کی تاریخ کے قیمتی نقوش ثبت ہیں جس کی فضا میں ابراہیم و خلیل علیہما السلام کی دعائیں رچی بسی ہیں اور پھر جس کے پورے ماحول میں خود محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامہ حیات کے ابواب بھڑکے ہوئے ہیں وہ ہر شے کے لیے اسلامی دعوت اور تحریک کا عالمی مرکز اور قبلہ قرار پایا۔ ہر صاحب توفیق مسلمان کے لیے علم بھر میں کم از کم ایک بار اس مرکز پر مقررہ ایام حج میں حاضر ہونا، شعاثر و مناسک ادا کرنا، قربانی کی سنت ابراہیمی کو تازہ کرنا انبیاء کی تاریخ کے نقوش اور برکات سے بہرہ اندوز ہونا دنیا بھر سے آنے والے نظریہ حق کے علمبرداران اسلامی نظام اخوت کے رفقا سے رابطہ پیدا کرنا، اور ہر طرف سے منہ موڑ کر کامل عاجزی کے ساتھ اپنے آپ

کو خدا کے سپرد کر دینا فرض ہے فرضیت حج کا یہ حکم ۹۷ھ میں نازل ہوا۔

حضور نے اسی سال حضرت ابو بکر صدیق کو امیر حج بنا کر تین سو رفا کے ساتھ مکہ روانہ فرمایا کہ وہ ان کو اپنی امارت میں حج ادا کرائیں۔ برسبیل تذکرہ اس حج کے بارے میں چند اہم باتیں درج کی جاتی ہیں۔ کیونکہ دینی اور سیاسی دونوں لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت تخریبِ اسلامی کی تاریخ میں ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق کی امارت کے ساتھ حضرت علیؓ کو ایک دوسری ذمہ داری سونپی کہ وہ سورہ برات (پہلی ۴۰ آیات) حج کے اجتماع میں سنائیں اور حکمِ خداوندی کے مطابق ضروری اعلانات لوگوں تک پہنچادیں۔ قابلِ اعلان امور یہ تھے۔ کہ ایک تو سابق جابلانہ شرک پر قائم رہ کر جن لوگوں نے حضور یا اسلامی ریاست سے معاہدہ کر کے مفادات محفوظ کر رکھے تھے۔ ان کے سامنے اعلان کر دیا گیا کہ چار ماہ کی مہلت ہے۔ اس کے بعد تمام ایسے معاہدات بحکمِ خداوندی کا عدم ہو جائیں گے اس دوران میں وہ اپنے لیے راہِ عمل خود طے کر لیں۔ ان کو اس ریاست کی شہریت ترک کر دینی ہے یا جنگ کرنی ہے یا پھر اسلامی ریاست کے اندر بحیثیتِ مسلم کے رہنا ہے۔ یعنی اب ریاست و ریاست کا کوئی موقع نہ تھا۔ اور اسلامی حکومت اپنے حدود میں خود مختاری کے جزیرے قائم رکھ کر اپنے تقاضے پورے نہیں کر سکتی تھی۔ ایسے معاہدات کو ختم کرتے ہوئے بھی برسرِ عام اعلان کرایا جانا ضروری ہوا۔ اور پھر چار مہینے کی کافی مہلت دوسرے فریقوں کو دی گئی۔ یہ رعایت بھی دی گئی کہ اگر کوئی مشرک اس مدت میں مدینے آ کر اسلام کو سمجھنا چاہے تو اس کو بحفاظت آنے جانے کا موقع ہوگا۔ پھر مشرکین میں سے بھی ان لوگوں کو انکے رعایت دی گئی جنہوں نے دیانت داری سے ایفاءِ عہد کیا تھا۔ ان کے معاہدات کو ان کی مقررہ مدتوں تک کے لیے بحال رکھا گیا۔ اصل زدان مشرکین پر تھی جنہوں نے اسلام کے مخالف دشمنی اور جنگ کے خوف ناک محاذ بنائے۔ تصادم کرتے ہوئے ساری اخلاقی حدیں توڑ دیں۔ پھر قول و قرار سے بار بار پھرے اور بر قسم کے لحاظ و مرآت کو بلائے طاق رکھ دیتے رہے۔ یہ وہ مشرک تھے جنہوں نے راہِ حق کو روکنا چاہا جنہوں نے دینِ حق میں عیب نکالے۔ جنہوں نے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر سے نکالنے کے منصوبے باندھے اور جنہوں نے جنگ و جدل میں پہل کی۔ دوسرا اعلان یہ کیا گیا۔ کہ آئندہ حرمِ پاک اور مساجد کی تولیت کسی مشرک کو نہ سونپی جائے گی۔ تیسرا اعلان یہ تھا کہ آئندہ کوئی مشرک حدودِ حرم میں داخل نہ ہو۔ اسی ضمن میں حضرت علیؓ نے حضور کی یہ توضیح بھی پہنچادی کہ اب سے کوئی شخص سابق مشرکانہ طریق پر عریاں ہو کر طوافِ کعبہ نہیں کر سکے گا۔ چوتھا اعلان خدا کی طرف سے چار مہینوں کی حرمت کے ثابت ہونے کا کیا گیا۔ اور ان مہینوں میں من مانی تبدیلیاں کرنے کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ سلسلہ کلام میں یہ حقیقت پوری طرح کھول کر سنادی گئی کہ خدا نے اپنے رسول کو اس لیے برپا کیا ہے کہ وہ اس دینِ حق کے نظام کو زندگی کے تمام گوشوں پر پوری طرح غالب کر دے اور یہ کام اسے

مشرکین کی نگواری کے علی الرغم سر انجام دیتا ہے۔

بعض لوگ حضرت علیؑ کی اس بصیرت سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں۔ حالانکہ بات سرف سرف تھی  
یعنی کہ حضورؐ نے جہاں حضرت، ابو بکر صدیقؓ کو دائرۃ امانت، اس اپنا نام۔ بنا یا تھا۔ وہاں حضرت علیؑ کو اپنی  
نمائندہ، شخصی سیکرٹری یا بطور غیر خصوصی ایک اہم ذمہ داری سونپی۔ بعد ان کے بیٹے، مامور کیا تھا۔ ان لوگوں کی مثل  
حکومتوں کے معاملات پر ہے وہ دانتھیں ہیں کہ بعض لوگوں میں بھی بلاشبہ خلیفہ راشد پر مابقیہ دیگر لوگوں کے نسبت  
یا گورنر موجود ہوتا ہے۔ مگر کسی خصوصی ضرورت کے نتیجے میں یہ نکتہ نظر برآوا کر لیا جاتا ہے۔

یہ ہم اس عظیم الشان اجتماع حج کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس اجتماع میں حضورؐ نے ایک لمحہ  
بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ اور اس میں اس شان کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس اجتماع میں حضورؐ نے  
موجود ہوئے۔ اس لئے یہاں نسبتاً زیادہ ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہاں تک کہ اس اجتماع میں حضورؐ نے  
انقلاب کے گہرے پانی کے تاشکے، طرفت سے اس اجتماع میں حضورؐ نے ایک لمحہ شرکت فرمائی۔ اور اس میں  
میں بھی مختلف اشخاص کی بیعتیں انکرا کر دیں۔ اور ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔ اور ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔  
حضورؐ نے اس اجتماع میں حضورؐ نے ذی الشریطہ سے اعتراف کیا۔ اور ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔ اور ان کے ساتھ  
ایک ایسی جو بزرگ، باجی میں حضورؐ نے اپنے سے اجتماع کرنے کو ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔ اور ان کے ساتھ  
بیتک اللہم بیئتک

”ہم حاضر ہیں، اسے ہمارے اتنا بہتر سے نہیں کرتے۔ اور ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔ اور ان کے ساتھ  
میں حاضر ہیں۔ محمدؐ میرے پیچھے ہے۔ نعمت تو ہر جگہ ہے۔ اور ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔ اور ان کے ساتھ  
تیرا کوئی شریک نہیں۔“

پھر رات بھر جب بھی کسی شیارے سے چڑھنے کو چاہتے تھے، ان لوگوں نے ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔ اور ان کے ساتھ  
موجودین کا کاوان خدا بند کرنا۔ اور ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔ اور ان کے ساتھ  
لگے کے قریب جا کر ذی طوی میں کچھ دیر قیام فرمایا۔ پھر ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔ اور ان کے ساتھ  
کاہ کی باہرٹی جانب سے داخل ہوئے۔ طوائف کیا۔ خداوند تعالیٰ نے ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔ اور ان کے ساتھ  
کر کے خدا کی توحید کی پک۔ پھر بندگی کو یاد دلایا۔ اور ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔ اور ان کے ساتھ  
سے گئے۔ پہاڑی پر چڑھ کر نشا و نما کی، اور ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔ اور ان کے ساتھ  
یک ایک چم کو دہراتے جاتے تھے اور اس ناپید کے خدا کو ایک بار دیکھا، اور ان کے ساتھ بیعت نہ کی۔ اور ان کے ساتھ  
رہتے۔



غور کیجیے۔ کیا سماں ہوگا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دل اس منظر کو دیکھ کر کیا کیفیت محسوس کرتا ہوگا۔ آج گویا ساری عمر کی کاشت کاری کے نتیجہ میں ایک فصل پورے جو بن کے ساتھ لہلہا رہی تھی۔ ایک لاکھ چوالیس ہزار ریا بعض روایات کے بموجب ایک لاکھ چوبیس ہزار کا ایک آہنگ مجمع زمین پر اپنی مثال آپ تھا۔ جماعت کے لوگوں کی آنکھیں جب اس محبوب ہستی کو پہاڑی کی بلندیوں پر اتنے مجمع کثیر کے درمیان دیکھتی ہوگی تو ان کے دلوں کی پرداز کہاں تک نہ ہو رہی ہوگی۔

### اسلامی تحریک کا بین الانسانی منشور :

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو خطبے اس موقع پر دیئے۔ پہلا عرفات کی پہاڑی سے ۹ ذی الحجہ کو دوسرا ۱۰ ذی الحجہ کو منامیں۔ ان خطبوں کے بعض مضامین روایات میں باہم دگر مل جمل گئے ہیں۔ یہ خطبات کئی حیثیتوں سے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ اولاً حضور نے جماعت کے سب سے بڑے دینی اجتماع میں خطاب فرمایا اور ایسے دور میں فرمایا جب کہ آپ کا پیش کردہ کلمہ حق تناور درخت بن کر برگ بار لانے لگا تھا۔ شدید مخالفتوں سے گزر کر اتنی عظیم کامیابی بجائے خود سیرت و کردار کا ایک امتحان ہوتی ہے۔ اگر اس موقع پر کوئی دنیا پرست شخصیت ہوتی۔ اور محض ایک سیاسی بازی کھیلنے والی کوئی فاتح طاقت ہوتی تو عیش و عشرت کے اسباب جمع کر کے ان سے حصول لذت کے علاوہ آج اس کے سر میں غرور کی ایسی ہوا بھرتی کہ وہ اپنی خدائی جمانے اور اپنی بڑائی کا کلمہ بلند کرنے پر اتر آتا۔ حضور کے بجائے کوئی دوسرا انسانیت زدہ شخص اس مقام پر پہنچتا تو مذہبیت کا سارا جھوٹا ملمع اتر جاتا اور کامیابی کی اس منزل میں اس کی روح پہاں بے نقاب ہو جاتی۔ مگر یہاں پہلے سے بڑھ کر عجز تھا اور پہلے سے زیادہ خدا کے لیے حمد و شکر کے ترانے تھے۔ ثانیاً چونکہ حضور کی فراست نبوت سمجھ رہی تھی کہ جماعت سے خطاب کا یہ آخری موقع ہے۔ اس لیے گویا الوداعی وصیتیں فرمائیں جن کا ہر ہر لفظ بیش قیمت ہے۔ ثالثاً ملکی کام کے اہم تکمیلی مرحلے پر آجانے کے بعد ہی موقع تھا کہ تحریک اسلامی کی طرف سے انسانیت کے نام کوئی پیغام اور کوئی منشور دیا جاتا۔ سو آپ نے اس فریضے کو باحسین و جودہ ادا کیا۔ رابعاً یہ خطبے حضور کے کمالِ خطابت اور آپ کی شانِ فصاحت کے بھی نادر نمونے ہیں۔ اور ان کے ذریعے اس مقام کی شخصیت کی عظمتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

یہ پیش نظر رہے کہ ان خطبوں کا ایک حصہ مخصوص ملکی حالات و مسائل سے متعلق ہے اور ایک حصہ بین الانسانی منشور پر مشتمل ہے۔ نفس مضمون خود ہی اس تقسیم کو واضح کر دے گا۔

### خطبہ عرفات :

تمام تعریفیں صرف اللہ ہی کے لیے ہیں۔ ہم اسی کی حمد کرتے ہیں۔ اسی سے مدد طلب کرتے

ہیں۔ اسی سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔ اور اسی کے حضور اظہارِ ندامت کرتے ہیں۔ ہم اپنے دلوں کی فتنہ انگیز یوں اور اپنے اعمال کی برائیوں کے مقابلے میں اسی کی پناہ مانگتے ہیں۔ جسے اللہ سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دے اسے کوئی دوسرا گمراہ نہیں کر سکتا اور جسے وہی ہدایت کی توفیق نہ دے اسے کوئی راہِ راست پر نہیں چلا سکتا۔

— اور میں اعلان کرتا ہوں اس حقیقت کا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ وہ اکیلا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور میں اعلان کرتا ہوں اس حقیقت کا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔

— اللہ کے بندو! میں تم کو اسی کی عبادت کی نصیحت کرتا ہوں اور ترغیب دلاتا ہوں۔

— میں آغازِ کلام اس بات سے کرتا ہوں جو باعثِ خیر ہے۔

— اس (تمہید) کے بعد (میں کہتا ہوں کہ) — اے لوگو! میری باتیں غور سے سنو۔ میں تم کو وحشت

سے بتانا ہوں۔ کیونکہ میں ایسا نہیں سمجھتا کہ اس سال کے بعد میں تم سے اس مقام پر ملاقات کر سکوں۔

— اے لوگو! تمہارے خون اور تمہارے مال تمہارے لیے (باہم دگر) حرام کر دیے گئے ہیں

تا آنکہ تم اپنے رب کے حضور جا کے پیش ہو جاؤ۔ — جیسے کہ تمہارے اس مہینے میں اور تمہارے اس شہر میں تمہارا یہ دن حرام ہے۔

— آگاہ رہو کہ میں نے بات پہنچا دی! اے اللہ تو خود گواہ رہیو!!

— سو جس کسی کے قبضے میں کوئی امانت ہو تو اسے اس کے مالک کو ادا کر دے۔

— دورِ جاہلیت کی سودی رقمیں کا عدمِ کردی گئیں۔ اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن

عبدالطلب کے سودی مطالبات کو کاعدم کرتا ہوں۔

— دورِ جاہلیت کے تمام خوتوں کے مطالبات قصاص کا عدم کر دیے گئے اور سب سے پہلے

میں عامر بن ربیعہ بن حارث بن عبدالطلب کے خون کا مطالبہ ساقط کرتا ہوں۔ — دورِ جاہلیت کے تمام اعزازات

اور مناصب کا عدم کیے جاتے ہیں ماسوائے سدانۃ الکعبہ کی دیکھ بھال کا شعبہ (اور سفایۃ حاجیوں کے

یہ شعبہ آبرسانی کے)۔

— قتلِ عمد کا قصاص لیا جائے۔ — شبہ قتلِ عمد جو لاکھٹی یا پتھر (کی ضرب) سے وقوع میں آئے

اس کی ذمیت سواؤنٹ مقرر کی جاتی ہے۔ جو اس میں اضافہ کرے۔ سودہ اہلِ جاہلیت میں شامل ہوگا۔

— اے لوگو! شیطان (نظامِ حق کے چھٹا جانے کے بعد) اس بات سے تو تا امید ہو گیا ہے

کہ اب تمہاری اس سرزمین میں اس کی عبادت کی جائے گی۔ لیکن وہ اس پر بھی خوش ہوگا کہ اس کے علاوہ ان دوسرے گناہوں میں اس کی اطاعت کی جائے۔ جن کو تم ہلکا سمجھتے ہو۔

— اے لوگو! مہینوں (یعنی حرام مہینوں) کا ادل بدل کفر کے طرز عمل میں اضافہ ہے۔ اور اس کے ذریعے کفار اور زیادہ گمراہی میں پڑتے ہیں کہ ایک سال کسی مہینے کو حلال کر دیتے ہیں اور دوسرے سال حرام کھڑا لیتے ہیں۔ تاکہ (آگے پیچھے کر کے) خدا کے حرام کردہ مہینوں کی فقط گنتی پوری کر دیں۔

— یقیناً آج زمانہ پھر پھر اسی حالت پر آ گیا ہے۔ جو اس وقت تھی۔ جب کہ خدا نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ یعنی اللہ کی بارگاہ میں مہینوں کی تعداد قطعی طور پر بارہ ہے۔ اور جب سے اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے یہ تعداد اس کی کتاب (نوشتہ تقدیر) میں اسی طرح ثبت ہے۔ ان میں چار مہینے حرام ہیں — نین منواتر، یعنی ذوقعدہ، ذی الحجہ اور محرم، اور ایک ایکلاگ، یعنی رجب جو جمادی الاخریٰ اور شعبان کے درمیان ہے۔

— آگاہ رہو کہ میں نے بات پہنچادی اے اللہ تو خود بھی گواہ رہیو!!

— اے لوگو! تمہاری خواتین کو تمہارے مقابلے میں کچھ حقوق دیے گئے ہیں۔ اور تمہیں ان کے مقابلے میں حقوق دیے گئے ہیں۔ ان پر لازم ہے کہ وہ تمہاری خواب گاہوں میں تمہارے علاوہ کسی کو نہ آنے دیں۔ اور کسی ایسے شخص کو (گھر میں) تمہاری اجازت کے بغیر داخل نہ ہونے دیں جس کا داخل ہونا تمہیں پسند نہ ہو۔ اور کسی بے حیائی کا ارتکاب نہ کریں۔ اگر وہ کوئی ایسی بات کریں تو تم کو اللہ نے اجازت دی ہے کہ (ان کی اصلاح کے لیے) ان کو جدا کر سکتے ہو۔ خواب گاہوں سے الگ کر سکتے ہو۔ اور ایسی بدنی سزا دے سکتے ہو جو نشان ڈالنے والی نہ ہو۔ پھر اگر وہ باز آجائیں اور تمہاری اطاعت میں چلیں تو قاعدے کے مطابق ان کا نان و نفقہ تمہارے ذمہ ہے۔ یقیناً خواتین تمہارے زیر نگین ہیں جو اپنے لیے بطور خود کچھ نہیں کر سکتیں۔ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر اپنی رفاقت میں لیا ہے۔ اور ان کے جسموں کو اللہ ہی کے قانون کے تحت تصرف میں لیا ہے۔ سو خواتین کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔ اور بھلے طریق سے ان کی تربیت کرو۔

— آگاہ رہو کہ میں نے بات پہنچادی۔ اے اللہ تو خود بھی گواہ رہیو!!

— اے لوگو! مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ کسی شخص کے لیے اس کے بھائی کا مال (لینا) اس

کی رضامندی کے بغیر جائز نہیں ہے!

— آگاہ رہو کہ میں نے بات پہنچادی۔ اے اللہ! تو خود بھی گواہ رہیو!!

— سو میرے بعد کہیں (اس اخوت کو ترک کر کے) پھر کافرانہ ڈھنگ اختیار کر کے ایک دوسرے

کی گردنیں نہ کلٹنے لگنا۔

\_\_\_\_\_ میں تمہارے درمیان ایک ایسی چیز چھوڑے جا رہا ہوں کہ جب تک اس پر کار بند ہو گے

کبھی راہِ راست سے نہ ہٹو گے۔ وہ ہے اللہ کی کتاب!!

\_\_\_\_\_ آگاہ رہو کہ میں نے بات پہنچا دی۔ اے اللہ تو خود بھی گواہ رہیو!!

\_\_\_\_\_ اور تم لوگوں سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا۔ تو اب تم بتاؤ کیا کہو گے؟

لوگوں نے پکار کر کہا: "ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے پیغام پہنچا دیا امت کو نصیحت کرنے کا حق ادا کر دیا۔ حقیقت سے سارے پردے اٹھا دیے۔ اور امانتِ الہی کو ہم تک کلمۃ پہنچا دیا؟"

\_\_\_\_\_ اے اللہ! تو گواہ رہیو! اے اللہ! تو گواہ رہیو! اے اللہ! تو گواہ رہیو!!

\_\_\_\_\_ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ یہ باتیں غیر جانہ لوگوں تک پہنچا دیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگوں

کے مقابلے میں بعض غیر حاضر لوگ ان باتوں کو زیادہ اچھی طرح یاد رکھیں اور ان کی شفاعت کریں۔

\_\_\_\_\_ اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے میراث میں سے ہر ورثہ کے لیے شہادت کردہ حسدہ ضرور

کردیا ہے۔ اور ایک تہائی مال سے زائد کی وصیت کرنے جائز نہیں ہے

\_\_\_\_\_۔ سچ اس کا جس کے بستہ پر نکاح میں، تو نہ ہو ورنہ کسے سے ہے۔

\_\_\_\_\_ جس نے اپنے باپ کے بچانے کسی دوسرے کو باپ پڑا دیا۔ یا کسی خادم سے

آقا کے عداوت کسی اور کو آقا بنا کر کیا۔ تو ایسے شخص پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی طرف سے عداوت

ہے۔ اس سے اقیامت کے دن کوئی بدلہ یا عفو قبول نہ ہوگا۔

\_\_\_\_\_ تم پر اللہ کی طرف سے سزا مہنتی ہو۔ اور اس کی رشتیں نامزد ہوں

**خطبہ منیٰ :**

\_\_\_\_\_ اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں آنے والا نہیں ہے اور تمہارے بعد کوئی اور اللہ

پر پناہ کی جانے والی ہے۔ پس غور سے سنو اور اپنے رب کی عبادت میں لگے رہو۔ نماز اچھو نہ دو اور

ماہِ رمضان کے روزے رکھتے رہو۔ اپنے اموال کی زکوٰۃ دلی رغبت سے ادا کرتے رہو۔ اپنے

حرمِ پاک کا حج کرتے رہو اور اپنے امرا و حکام کی اطاعت پر کار بند رہو۔ تاکہ اپنے رب کی رحمت

میں جاہِ پاکو۔

\_\_\_\_\_ بین الانسانی منشور ہونے کے لحاظ سے ان خطبوں میں جو کچھ محسنِ انسانیت نے پیش فرمایا ہے۔

انسانی کاوشیں اس سے آگے کچھ سوچ نہیں سکیں۔ بلکہ کوئی دوسرا نظام تمدن وہ معیار انسانیت عملاً پیدا نہیں کر سکا۔ جو اس منشور میں دیا گیا ہے۔ اس میں خدا کی توحید کے انقلابی عقیدے کا اعلان ہے۔ اس کی عبودیت کو نظام حیات کی روح کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اس میں مسلمانوں کے لیے ایک دوسرے کے جان و مال محترم بھڑائے گئے ہیں اور قتل کا قصاص لینا لازم کر دیا گیا ہے۔ اس میں سود خواری کے جاہلی نظام کو ملیا میٹ کر دینے کا فیصلہ ہے۔ اس میں دورِ اسلام سے قبل کے انتقامی چکر کو توڑ دیا گیا ہے۔ اس میں جاہلیت کے اعزازات اور مناصب کو ختم کیا گیا ہے۔ اس میں زوجین کے حقوق ہیں۔ اس میں خاندانی نظام کی بنا محکم کی گئی ہے۔ اس میں خواتین کو اللہ کی امانت قرار دے کر ان سے حُسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے اور ان کے زیرِ نگیں ہونے کا لحاظ دلایا گیا ہے۔ اس میں دینِ حق کے علمبرداروں کے درمیان اخوت کا رشتہ لازم قرار دیا گیا ہے۔ کتابِ الہی کو نظامِ اسلامی کا ضابطہ اساسی قرار دیا گیا ہے۔ وحدتِ رب اور وحدتِ آدم علیہ السلام کی بنا پر وحدتِ انسانیت کا تصور دیا گیا ہے اور وطنی و نسلی تفریقوں کو بے وقعت بنا دیا گیا ہے اور اس میں عزت و عظمت کا معیار خدا پرستانہ اور متقیانہ کردار کو معین کیا گیا ہے۔

جب کبھی بھی اور جہاں کہیں بھی اسلامی تحریک چلے گی۔ اور نظامِ حق استوار ہوگا۔ اس کی بنیادیں بہر حال انہی اٹل نظریات و تصورات پر رکھی جائیں گی۔ یہ منشور اسلام کا بنیادی منشور ہے۔ اور اس کی طرف انسانیت کو بلایا جاسکتا ہے۔ ان کلماتِ حقیقتِ افروز سے ہٹ کر زندگی کا جو نقشہ بھی بنایا جائے گا۔ وہ غیر اسلامی ہوگا۔ اور کوئی سچا مسلمان اس پر مطمئن اور راضی نہیں ہو سکتا۔ یہی منشور کسوٹی ہے جس پر ہم مسلمان اپنی ہر قیادت کے کارنامے کو پرکھ سکتے ہیں۔ اور اپنی ایک ایک حکومت کے اقدامات کی جانچ کر سکتے ہیں یہ منشور آئینہ ہے۔ جس میں ہمیں اپنے چہرے بھی دکھائی دے سکتے ہیں۔ اور جس میں ہم غیر اسلامی تمدنوں کی حقیقت کا عکس بھی دیکھ سکتے ہیں۔

یہ ہمارے محبوبِ نبیؐ کا آخری پیغام ہے اور اس میں ہم ہی مخاطب بنائے گئے ہیں۔ اس کی نوعیت پیغمبر پاک کی وصیت کی سی ہے۔ اس کے ایک ایک بول پر حضورؐ نے درد بھرے انداز سے آواز بلند کی ہے۔ کہ میں نے بات پنچا دی ہے۔ چاہیے کہ اسے پڑھ کر ہماری رو میں چونک جائیں۔ ہمارے جذبے جاگ اٹھیں۔ ہمارے دل دھڑکنے لگیں۔ اور ہم اپنی اب تک کی روش پر نادم ہو کر اور کافرانہ نظاموں کی مرعوبیت کا قلاوہ گردنوں سے نکال کر محسنِ انسانیت کا دامن تقاضا لیں۔ اس مشن کو لے کے اٹھ کھڑے ہوں جس کی کامیابی کے لیے حضورؐ نے وہ آذینیں بھگتی ہیں کہ اتنے بڑے صبر اور حلم کی مثال نہیں ملتی۔

حضورؐ نے حج کے تمام ارکان و مناسک باطنیان ادا فرمائے۔ جماعت کے عام لوگوں سے بکثرت

میل جول رہا۔ لوگوں نے اس موقع پر کثرت سے مسائل پوچھے۔ اور بالآخر طواف وداع کے بعد اس مبارک سفر سے واپسی ہوئی۔

یہ تھا نظامِ دینی کی تکمیل کا منظر اور یہ تھا اتمامِ نعمت کا واضح سماں!! — یہ سوا ڈیڑھ لاکھ انسانوں کا انبوه جس نے رضا کارانہ اور والہانہ جذبہ سے آیا تھا اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہوگی اس بات کی کہ اسلامی تحریک نے اصل معرکہ رائے عام کے میدان میں سر کیا۔ اور قلوب کے اندرون سے تبدیلی پیدا کر کے باہر کا سارا نقشہ زندگی بدل دیا۔

### محسنِ انسانیت کے بعد :

یہاں تک تو اس کام کا نقشہ ہم نے عرض کیا ہے جو حضور نے اپنی قیادت میں سر انجام دیا۔ اس کے جلد ہی بعد حضور کا وصال ہوا۔ مگر آپ کی تربیت دادہ جماعت نے اسے جاری رکھا اور اسلامی تحریک دس پندرہ برس میں وسیع خطوں میں چھا گئی۔

حجۃ الوداع میں جس انداز سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حصہ لیا۔ اپنی جماعت سے جس طرح خطاب فرمایا۔ لوگوں کو جس طرح مختلف تاکیدیں اور وصیتیں کیں وہ سب بتاریخی تخیل کے حضورِ اجتماعی طور پر بودع کہہ رہے ہیں۔ واپسی میں غدیر خم (ایک تالاب) کے پاس پڑاؤ ڈالا اور وہاں پھر ایک خطاب خاص رفقاء سے کیا۔ اس میں وہی الوداعی رنگ اور زیادہ اُبھر آیا۔ بول ایسے ہیں کہ ان کو سن کر دلوں پر رقت طاری ہو گئی ہوگی۔ پہلے اپنی محکمہ سنت کے مطابق خدا کی حمد و ثنا کی۔ پھر فرمایا :

”اس کے بعد کہنا یہ ہے کہ، اے لوگو! میں بہر حال ایک انسان ہوں۔ شاید جلد ہی میرے پاس خدا کا (بلاوائے کر) قاصد آ پہنچے اور میں بسیک کہوں۔ میں ذمہ داری کے دو بوجھوں کے اندر چھوڑے جا رہا ہوں۔ اُن میں سے ایک خدا کی کتاب ہے جس میں منابطہ، عدل اور روشنی و حکمت ہے سو خدا کی کتاب کو محتام لو۔ اور اسی سے بہتائی حاصل کرو۔ نیز پھر قرآن کی طرف بہت ہی ترغیب و تشویش دلائی، پھر فرمایا۔ اور دوسرے میرے گھر کے لوگ ہیں اپنے گھر کے لوگوں کے بارے میں میں تمہیں خدا ہی کی یاد لاتا ہوں۔“

اس خطبہ میں حضور نے ایک تو ان صناعتوں کا دروازہ بند کیا۔ جو انبیاء کو فوق البشر و غیر بشریہ دے دے والوں نے پیدا کیں۔ اور جن کی انتہا یہ ہوئی کہ جو بستیاں خدا کو لَمْ یَلِدَا وَ لَمْ یُولَدَا کی شانِ صمدیت کے ساتھ منوانے آئی تھیں، غلو پسندوں نے انہی کو اٹھا کے خدا کی اولاد اور خدائی میں شریک بنا ڈالا۔ نیز ان کو قانونِ موت سے ماوراء فرض کر کے غیبوت کے تصورات تراشے اور ان کے لیے حیاتِ جسمانی و عنصری کے دوام کے

عقیدے پیدا کیے۔ حضور نے رخصت کا لمحہ آنے سے قبل رفقاء کو آگاہ کر دیا کہ میں انسان ہوں اور انسانوں کی طرح موت کا قانون مجھ پر بھی نافذ ہوگا۔ پھر تاکید یہ فرمائی کہ کتاب الہی کو اساسی ضابطہ حیات کی حیثیت سے قائم رکھنا، اسی سے رہنمائی لے کر زندگی کا نظام چلانا۔ یہ تم لوگوں کے لیے بہت بوجھل ذمہ داری ہے۔ اس لیے اس ذمہ داری کا اچھی طرح احساس کرو۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنے اہل و عیال، اپنے گھروالوں اور اپنے ان قریبی عزیزوں کے بارے میں بغیر کسی صراحت کے توجہ دلائی کہ ان سے متعلق بھی تم پر کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ ایک طرف حضور کے اہل و عیال آپ کی سچی زندگی سے شاید اور آپ کے معمولات کو قریب سے دیکھنے والے اور آپ کی تعلیمات کے پوری طرح امانت دار تھے۔ اور اس لحاظ سے وہ اُمت کے لیے ایک قیمتی ذریعہ تعلیم تھے۔ دوسری طرف حضور نے ان کے لیے خزانے جمع کیے۔ نہ میراث سمیٹی۔ نہ جائیداد بناٹی بلکہ زندگی میں بھی ان کو درویشانہ معاشرت سے گوارا۔ اور ان کا مستقبل بھی بغیر کسی سرد سامان کے اللہ کے حوالے کر دیا۔ ظاہر بات ہے کہ حضور کے بعد ان کے بارے میں جماعت پر بڑی بھاری ذمہ داری نازل ہوئی تھی۔ مگر حضور کو فقیر غیور نے اجازت دے دی کہ باقی اشارے سے آگے جائے۔

اسی خطبے میں یا اس کے بعد جماعت سے ایک بات اور بھی حضور نے فرمائی جس کے لیے ایک غیر معمولی ضرورت داعی ہوئی تھی۔ قصہ یوں ہوا کہ جو حضرات صحابہ جناب علی مرتضیٰ کے ساتھ میں بھیجے گئے تھے کسی بات پر ان کا حضرت علی سے کھچاؤ ہو گیا۔ درحقیقت بڑے بڑے کام کرنے کے دوران میں مزاجوں کے فرق کے ساتھ ریلوں کے اختلاف کے بہت ہی سخت مواقع آتے ہیں۔ کبھی بحثوں میں تلخی بھی آجاتی ہے اور اس کی وجہ سے دلوں پر کچھ دیر کے لیے تکدر بھی رہ جاتا ہے۔ انسانوں سے بنی ہوئی جماعتیں چاہے وہ خالص دینی خدمات کے لیے بنی ہوں اور چاہے ان کی قیادت پر انبیاء جیسی منتخب روزگار ہستیاں کیوں نہ موجود ہوں، یہ ممکن نہیں ہے کہ انسانی فطرت اپنے گوناگوں داعیات و محرکات سے خالی ہو کر بالکل سپاٹ بن جائے۔ اختلافات آراء کی نیرنگیاں اور جذبات کے مدوجز بہترین اور صالح ترین معاشروں میں بھی ہو سکتے ہیں۔ اور اسی لیے بڑے بڑے کام وہی عالی ظرف لوگ انجام دے سکتے ہیں جو ناگوار یوں کے باوجود ایک دوسرے سے سازگاری کر سکیں۔ ناگواریاں صحابہ کرام کی جماعت میں کبھی کبھار اُبھریں۔ مگر یہ انہی ہستیوں کے ظرف تھے کہ پھر بھی ان میں سازگاری قائم رہی۔ اور تکدر آیا تو عارضی نوعیت کا آیا۔ کچھ ایسی ہی صورت اس معاملہ میں بھی پیش آئی تھی خصوصاً حضرت بریدہ کے دل پر اختلاف کا اثر اتنا شدید تھا کہ انہوں نے بارگاہ رسالت میں شکایت کر دی۔ مگر حضرت علی جیسی درجہ اول کی شخصیت کے بارے میں شکایات کا پیدا ہونا، دیر تک قائم رہنا۔ پرورش پانا، ذاتی رنج میں بدل جانا۔ اور پھر حضور کے سامنے پیش بھی ہوتا ذرا سخت نوعیت رکھتا تھا۔ سن کر حضور کو دلی اذیت ہوئی اور چہرہ کا رنگ متغیر

ہو گیا۔ اس پس منظر کے ساتھ آپ نے اپنے معمول کے مطابق کسی کا نام لیے بغیر جماعت سے فرمایا:  
 ”جس کا میں رفیق ہوں، علیؓ بھی اس کا رفیق ہے۔ اے اللہ! جو علیؓ کو دوست رکھے تو  
 بھی اُسے دوست رکھ اور جو علیؓ سے دشمنی رکھے تو بھی اس سے دشمنی رکھ!“

بڑی صاف بات تھی کہ حضورؐ نے پاک تحریک میں تن من دھن لگائے بیٹھے تھے تبیں اسی میں حضرت  
 علیؓ نے بھی متاع حیات کی بازی لگا رکھی تھی۔ ایک ہی دعوت کے داعی، ایک ہی مشن کے علمبردار، ایک ہی  
 ذہن۔ سب سے سچنے والے، ایک ہی رُخ پر چلنے والے — اور پھر وہ باہم دُکڑاویسے فریاد قریبی بھی کہ دونوں  
 کہہ دریاں پانی نہ گزرا سکتا ہو — کیسے اس بات کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ کہ دونوں میں سے ایک سے تو محبت  
 رکھی جائے اور دوسرے سے تکدر ہو۔ ٹھیک وہی دلیل جو

ہم اپنی جاتی سبکے ہی تو حضورؐ اور آپ کے قریب ترین تربیت یافتہ صحابوں کے بارے میں پائی جاتی ہے۔ اگر  
 دُکڑاوی جماعت جو عقیدہ، اصول اور مقصد کے رشتہ اخوت میں پروٹی ہوتی تھی اور پھر اس میں سے وہ  
 عقیدہ اتار بیٹھے ہوتے اپنے گرد جمع کر کے قیادت کے لیے تربیت، اہم ذی ہائی تھی۔ اس میں تقاضا کیا گیا  
 ہے ساتھ محبت، اور اسی کے ساتھ رنج رکھنے کا موقع کیسے اکل سکتا تھا جو انور کو اذیت اور دُکڑاوی سے  
 کہیں جماعت کو اپنے لیے ہر سوال تو یہی تھی کہ اس میں جہاز اخوت کی اساسی قدر ہے، ایک طرف سے  
 سے ہونے پر اور دُکڑاوی سے بچنے کی بھی بات ہے۔ نیز باہر کا اخوت نہ تھی کہ وہ اس پر اپنے  
 اور تربیتوں کو چھوڑ دے۔ اگرچہ یہی وہی تھی کہ اس میں کوئی نہ کرے کیسے جدا ہو گا۔ ہر شخص کو  
 پہلے لکھی دے، اور آپ اسی ہوش میں تھے کہ اب سارا بارگاہ جماعتی اور اخوتی ہے۔  
 اور سب سے اور آئی یہ جماعت کو صرفہ کے لیے قیادت کی اتنا تھا کہ یہ بچھڑا دینا ہو گا۔  
 اپنے عقیدہ تازین ساتھیوں کو شریک کر کے بڑی لمبی تربیت دی تھی اور جس کے ایک ایک فرد سے دُکڑاوی  
 تھی۔ بنا بریں آپ نے بڑے سخت انداز میں تنبیہ کی۔ لوگوں نے نہ مانا نہ اس میں سے کیسے جانستیں کر  
 کھ سرفہ برآمد کر لیا۔

مشنایہ بات چیل لگی۔ ورنہ ہمارا اصل مشن یہ دیکھنا تھا، کہ حضورؐ پر حجۃ الوداع کے پورے مشن میں  
 ساری طاری۔ ہرگز اب اُدھر کا بلاوا جلا آنے والا ہے۔ اسی تاثر کے ساتھ آپ نے مخالفانہ آکھیں  
 فرمائیے۔

ماہِ صفرؑ کے آغاز ہی سے سفرِ آخرت کے لیے محسنِ انسانیت کی رُوحِ پاک نے تیاران  
 شروع کر دیں۔ ایک روز اُحدِ ثراہب لے گئے اور شہدائے اُحد کے لیے نہرِ سجود ہو کر دنا کی۔ واپس آ کر بھیز دل



کا خطبہ دیا۔

لوگو! میں تم سے پہلے رخصت ہونے والا ہوں۔ اور خدا کے سامنے تمہارے متعلق شہادت دینے والا ہوں۔ واللہ! میں حویں کو تر کو یہاں سے دیکھ رہا ہوں۔ مجھے سلطنتوں کے خزانوں کی کنجیاں تفویض کر دی گئی ہیں (یعنی مختلف ممالک دعوتِ حق کے نتیجے میں فتح ہونے والے ہیں) مجھے یہ اندیشہ نہیں کہ تم میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے۔ ڈر یہ ہے، کہ دنیوی مفاد کی کشمکش میں نہ پڑ جاؤ۔

پھر آدھی رات کو گورستانِ بقیع میں جا کر اہل قبور کے لیے دعاء مغفرت فرمائی اور فرمایا کہ ”ہم بھی جلد ہی تم سے آٹنے والے ہیں۔“ پھر ایک روز بطورِ خاص رفقاءِ جماعت کو جمع کیا اور خطاب فرمایا کہ:

”مرحبا! اے مسلمانو! اللہ تمہیں اپنی رحمت میں رکھے۔ تمہاری شکستہ دلی دُور فرمائے۔ تمہیں رزق دے، تمہاری مدد کرے۔ تمہیں عروج دے، تمہیں باطن و امان رکھے۔ میں تم کو اللہ کے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔ اور تم کو اللہ ہی کی نگرانی میں سوچنا ہوں، تم کو اسی سے ڈراتا ہوں کیونکہ میں گھلا گھلا متنبہ کرنے والا ہوں۔ دیکھو، اللہ کی بستیوں میں اس کے بندوں کے درمیان تکبر اور سرکشی کی روش اختیار نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اور تمہیں فرمایا ہے:

آیت تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ . . . . . (تلاوت فرمائی) کہ یہ آخرت کا گھر، ہم ان لوگوں کے لیے خاص کریں گے۔ جو زمین میں سرکشی اور فساد مچانے کی نیت نہ رکھتے ہوں۔ اور عاقبت (کی کامیابی) تو ہم ہی متقین کے لیے! — سلام ہو تم سب پر اور ان سارے لوگوں پر جو اسلام قبول کرے میری بیعت میں داخل ہونگے“

گورستانِ بقیع سے واپسی پر ہی ہلکا ہلکا دردِ سر شروع ہوا۔ پھر صفر کی انتیسویں تاریخ کو ایک حناہ کے ساتھ جاتے آتے ہوئے اس میں شدت آئی۔ مرض کے ابتدائی ہلکے چھلے کے دوران میں گیارہ روز تک مسجد میں تشریف لا کر خود ہی نماز کی امامت فرماتے رہے۔ شدتِ مرض میں گھر کے اندر بالکل صاحبِ فرائض رہنے کی مدت ایک ہی ہفتہ ہے۔ تکلیف بڑھنے پر ازواج سے اجازت لے کر حضرت عائشہؓ ہی کے حجرے میں آگئے۔ مرض الموت میں بھی تحریکِ حق کی ذمہ داریاں پوری طرح سامنے رہیں۔ قبولِ درموتہ کے معرکے حصولِ مقصد کے لحاظ سے ابھی تکمیل طلب تھے۔ اگر ذرا بھی ڈھیل برتی جاتی تو مخالف سلطنتِ شیر، یوحانی، اسی حالت میں تاریخ ۲۶ صفر لوگوں کو غزوہٴ روم کی تیاری کا حکم دیا اور دوسرے دن حضرت اسامہؓ، زید کو اس مہم کا افسرِ اعلیٰ مقرر فرمایا۔ فرمایا: جاؤ، اللہ کے نام سے۔ اپنے باپ کے مقامِ شہادت تک پہنچو۔ اور جو خدا

کا انکار کرے۔ اس پر حمدہ کر دے۔ اپنے ہاتھوں سے علم تیار فرما کر بریدہ بن خصیب اسلمی کو سو نپا دو ایک آدمیوں نے حضرت اسامہ کی کم عمری (اور کچھ خاندانی مرتبے) کی بناء پر چھ میگوئیاں کیں کہ ایسے ایک لڑکے کو بڑے بڑے مساجد میں داخلہ پر امیر کیوں مقرر کیا گیا ہے۔ حضور نے سنا تو سخت رنجیدہ ہوئے اور سخت تکلیف کے باوجود

سر پر پٹی باندھ کر مسجد میں تشریف لائے۔ اور ٹھیک غدیر خم کے سے انداز میں خطاب کیا کہ :  
 ”مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے اسامہ کے متعلق ایسی ایسی باتیں کہی ہیں۔ اس سے پہلے اس کے باپ کے امیر مقرر ہونے پر بھی تم لوگ اعتراض اٹھا چکے ہو۔ حالانکہ خدا کی قسم وہ اس منصب کا مستحق تھا۔ اور اس کے بعد اس کا بیٹا بھی اس کا اہل ہے۔ وہ زید بن حارثہ بھی ہم کو سب سے زیادہ محبوب تھا۔ اور اس کے بعد اس کا بیٹا (اسامہ بن زید) بھی ہمیں سب سے زیادہ محبوب ہے۔“

اس سے قبل (وفات سے پانچ یوم پہلے) سات مشک پانی ڈلوایا۔ اس غسل سے طبیعت ذرا ہلکی ہوئی تو سہارا لے کر مسجد میں تشریف لے گئے اور وہاں مقعد کے ساتھیوں سے آخری خطاب فرمایا :  
 تم سے پہلے ایسے لوگ گزرے ہیں۔ جنہوں نے انبیاء و صلحاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا۔ تم ایسا نہ کرنا۔ میری قبر کو میرے بعد سجدہ گاہ نہ بنا لینا۔ اس گروہ پر اللہ کا سخت غضب مقدر ہوا جس نے قبور انبیاء کو سجدہ گاہ بنا دیا۔ میں تمہیں اس سے منع کر رہا ہوں۔ دیکھو میں نے بات پہنچا دی۔ الہی تو خود اس کا گواہ ہے۔“  
 پھر نماز پڑھائی اور نماز کے بعد پھر فرمایا :

”میں تم کو انصار کے حق میں خاص تاکید کرتا ہوں۔ یہ لوگ میرے جسم کے پیر ہیں اور میرے لیے زاد راہ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے حصے کی ذمہ داریاں پوری کر دیں اور اب (تم پر) ان کے حقوق باقی ہیں دوسرے لوگ پھیلے گئے اور یہ جہاں کے تہاں ہی رہ جائیں گے۔ ان میں سے اچھا کام کرنے والوں کی قدر کرنا اور خیر ش کرنے والوں سے درگزر کرنا۔“

خدا نے اپنے بندے کو اختیار دیا۔ کہ وہ چاہے تو دنیا دہانیا کو قبول کر لے اور چاہے تو وہ کچھ قبول کرے۔ جو خدا کی بارگاہ میں سے تو اس بندے نے وہی کچھ انتخاب کر لیا جو اس کے لیے خدا کی بارگاہ میں ہے۔

یوں تو اس زمانے کی ساری گفتگوؤں میں الوداعی رنگ جھلک رہا تھا۔ لیکن آخری فقرے میں شاہ

راہی صریح تھا۔ جسے حضرت ابو بکر صدیقؓ فوراً پاگئے۔ اور زار و قطار رونے لگے۔

نماز کی جماعت میں شرکت سے جب معذوری ہو گئی تو حضرت ابو بکرؓ کو اپنی جگہ امامت پر مامور فرمایا۔ اور مرض کی شدت بڑھنے سے جماعت میں اضطراب بڑھتا گیا۔ اور لوگ پریشانی میں بار بار مسجد کا چکر لگاتے تھے۔ لیکن وہابی کے لیے حضور حضرت علیؓ اور حضرت فضل ابن عباس کے کندھوں کا سہارا لے کر پاؤں گھسیٹتے ہوئے مسجد میں تشریف لائے۔ اور منبر کے نچلے زینے پر بیٹھ کر بالکل آخری خطاب یہ فرمایا کہ :

” لوگو! مجھے خبر ملی ہے۔ کہ تم میری موت سے ڈرتے ہو۔ جتنے بھی انبیاء مبعوث ہو چکے ہیں کیا کوئی بھی ان میں سے ہمیشہ زندہ رہا۔ میں خدایا سے ملنے والا ہوں۔ اور تم بھی خدا سے ملنے والے ہو۔ میں وصیت کرتا ہوں کہ مہاجرین اولین کے ساتھ بھلائی کرو۔ اور میں وصیت کرتا ہوں کہ مہاجرین آپس میں حسن سلوک کریں۔ پھر سورہٴ عصر پڑھ کر فرمایا : تمام معاملات خدا کے حکم پر چلتے ہیں۔ جس کام میں تاخیر ہو اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ کسی کی عجلت پسندی کی وجہ سے خدا جلدی نہیں کرتا۔ اور میں وصیت کرتا ہوں کہ انصار کے ساتھ بھلائی کرو۔ انہوں نے تم سے پہلے مدینہ کو اپنا وطن بنایا اور ایمان کو اپنے اوپر لازم کر لیا۔ کیا انہوں نے پھلوں میں تم کو اپنا شریک نہ بنایا؟ کیا انہوں نے تمہاری خاطر مکانوں میں وسعت نہ دی؟ کیا انہوں نے باوجود احتیاج کے تم کو اپنے آپ پر ترجیح نہ دی؟ دیکھو اپنے آپ کو ان پر ترجیح نہ دو۔ سُنو کہ میں پہلے جاتا ہوں اور تم بھی مجھ سے آملو گے۔ جو حق پر ملنے کا وعدہ ہے۔“

ان خطبات کو مختلف روایات میں مختلف اوقات سے منقول کیا گیا ہے۔ مگر ایک رائے یہ بھی پائی جاتی ہے اور شاید امر واقعہ یہی ہو۔ کہ یہ ساری باتیں ایک ہی خطبہ میں کہی گئی ہیں۔

سوموار کے روز مزاج اقدس نے آخری بار سنبھالا لیا۔ مسواک کی۔ پردہ اٹھا کر صحابہ کی جماعت کو دیکھا اور مسکرائے۔ اس کے چند ہی لمحوں بعد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : ” (یٰٰ اَبَانِ الرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی) تین بار

۱۔ تاریخ کے بارے میں بڑا قابل بحث اختلاف ہے ۲۰۱-۱۲-۱۳ ربيع الاول کی روایات ہیں۔ لیکن ہجری اور عیسوی کیلنڈر کے لحاظ سے جب دوسرے اہم واقعات کی تاریخوں اور دنوں سے تطبیق دی جاتی ہے تو حسابی پیچیدگیاں سامنے آتی ہیں مشورۃً ۱۳ ربيع الاول ہے بحث و تمیض کے امور کو ہم آئندہ کے لیے مؤخر چھوڑ رہے ہیں۔

فرمایا۔ اور حضرت عائشہ کی آغوش میں سر رکھے رکھے خدائے حقیقیہ سے جاملے "آہ! ہم سب کے سب خدایہ کے مملوک ہیں اور ہمیں بھی پلٹ کر اسی کے حضور جانا ہے"

آج وہ ہستی دنیا سے رحمت ہو رہی تھی جس نے انسانیت کو حیات نو سے مالا مال کیا۔ اور جس نے زندگی کے قافلے کو راہزوں کے زخے سے نکال کر سراطِ مستقیم پر لانے کے لیے خوفناک اذیتیں سہیں۔ کشمکش کے سنگین مراحل پار کیے۔ مشکلات کے پہاڑ کاٹے اور پھر اس کارنامے کا کوئی صلہ و سوا نہیں کیا۔

یہ سانچہ کتنا بڑا ہوگا۔ ان رفیقوں کے لیے — عمر بھر کے ساتھیوں کے لیے — جو حضور کو ایک نظر دیکھنے سے بھی نئی طاقت حاصل کرتے تھے۔ ان کی نگاہوں میں زمین و آسمان گم گئے ہونگے۔ تاریخ میں زلزلہ آگیا ہوگا! حضرت عثمانؓ پر سکنت طاری ہو گیا۔ حضرت علیؓ بے حس و حرکت ہو گئے۔ حضرت عبداللہ بن ابیہ کا دل ایسا تنگ ہوا کہ اسی صدمہ سے انتقال کر گئے۔ حضرت عمرؓ عقلی توازن کھو بیٹھے۔

یہ عظیم صدمہ یوں بھی ایک کوہِ غم تھا، مسیبت یہ کہ یہ نہایت ہی خطرناک حالت میں پیش آیا۔ جب کہ ایک طرف رومی حکومت کی طرف سے جنگ کا خطرہ موجود تھا اور اسی لیے جیشِ امامہ روانہ ہو رہا تھا۔ دوسری طرف فتنہ ارتداد اور مانعین زکوٰۃ کی شورش تھی۔ تیسری طرف تحریکِ اسلامی اردگرد کی سلطنتوں کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ ہکا سا چیلنج بھی دے چکی تھی۔ اور داخلی مشکل یہ کہ نفاق کی دہی ہوئی روکے بھرانے کا اندیشہ تھا۔

حضورؐ کی تربیت کا کمال تھا کہ آپ کی تربیت دارہِ جماعت نے اپنے جذبات، پرلور قابلو پایا۔ اور اس اور انتشار کا شکار ہونے سے بچ کر اپنی اہم ذمہ داریوں کی انجام دہی کی فکر کی محسنِ انسانیت جیسی ہستیوں کی وفات پر۔ نچر نہ کرنے سے زیادہ عظیم ذمہ داری جانثینوں پر یہ ہوتی ہے کہ وہ اس تحریک اور نظام کے تحفظ و استحکام کی فکر کریں جس کا شیرازہ ایسے ہی لمحوں پر غفلت اور کوتاہی کرنے سے بکھر بھی سکتا ہے۔ وہ ہستی جو برسوں پورے کام کی روح رواں بنی رہتی ہے۔ اور تمام ساتھیوں کے کامل اعتماد اور گہری محبتوں کا مرکز ہوتی ہے، اس کے ٹھٹھ جانے سے بڑا بھاری خدا اچانک پیدا ہو جاتا ہے۔ جسے اگر برکت ٹھیک سے نہ بھریا جائے تو بڑے خوف ناک نتائج پیش آسکتے ہیں۔ حضورؐ کی تیار کردہ جماعت نے اپنے احساں ذمہ داری اور اپنی منبسطی کردار کا بے مثل ثبوت اس واقعہ سے پیش کیا کہ فوراً اس خلاء کو بھریا۔ اور نظم کے بندھن ڈھیلے نہ پڑنے دیے۔

جانثینی کے لیے کوئی کشمکش نہیں ہوتی۔ تلوار نہیں چلی۔ شور و ہنگامہ نہیں ہوا۔ سفیفہ بنی ساعدہ میں جماعت کے اربابِ صل و عقد کے درمیان ایک مختصر سی گفتگو کے بعد — جس نے اتنا بھی طول نہیں کھینچا اور جس میں اختلافی رنگ اتنی دیر بھی قائم نہیں رہا۔ جتنا کہ آج معمولی معمولی نوعیت کی انجمنوں کے عہدوں کے لیے ہوتا ہے — اسلام کی شورانی جمہوریت کے تحت حضرت ابو بکر صدیقؓ کا انتخاب عمل میں آیا۔ جس کی توثیق

مسجد نبوی کے اجتماع عام میں پوری جماعت کے عوامی اجتماع نے بشرح صدر کر دی۔

حضور کے بعد حضور کے عظیم دعوتی نصب العین کو پھیلانے اور حضور کی آغاز کردہ مہمات کو تکمیل تک پہنچانے میں جس عزم و بصیرت اور حسن کردار کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے زرین خدمات انجام دیں۔ اور جس شان سے حضرت فاروقؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ اور صفیہؓ قیادت کے دوسرے اکابر صحابہ نے اپنا بھرپور تعاون حضور کے جانشین امیر جماعت کو ہم پہنچایا، اس کی مثالیں انسانیت کے پاس کم ہی ہوں گی۔ محسن انسانیت کے تیار کردہ انسان نے ثابت کر دیا کہ وہ بہترین نمونہ انسانیت ہے۔ وہ بے لوث کردار رکھتا ہے وہ ذہانت و بصیرت میں اپنا نمونہ آپ ہے۔ اور سخت ترین حالات میں اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہونے والا نہیں۔

چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ حضور کی تربیت دی ہوئی اس جماعت اور اس کی قیادت نے چند ہی برس میں اسلامی تحریک کی شعاعیں دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیں۔ اور اسلامی نظام عدل کا سایہ رحمت جس رفتار سے حضور نے خطہ ارضی پر پھیلا یا تھا۔ اس میں قطعاً کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

## اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ!

دنیا میں اگر آج ہم مسلمانوں کا وجود ہے تو یہ اسی ہستی کی جانفشانیوں کے طفیل ہے۔ آج اگر سچائی اور نیکی کا کلمہ ہمارے سینوں میں نور افگن ہے تو یہ اسی مقدس وجود کا فیضان ہے۔ آج اگر زندگی کی صلاح و فلاح کے لیے ایک اصولی ضابطہ انسانیت کے سامنے موجود ہے۔ تو یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ آج اگر زندگی کا ایک بہترین نمونہ و معیار ہماری نگاہوں کے سامنے پر تو انداز ہے۔ تو یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا پیش کردہ ہے۔ آج اگر ہمارے سینوں میں تحریک اسلامی کے احیاء کے دلوں کے دروٹ لے سکتے ہیں، تو اسی محبوب شخصیت کی قربانیوں کی جذبہ انگیز یاد ہی۔ سے لے سکتے ہیں۔ آج اگر ہم اسلامی انقلاب برپا کرنے کا انداز و اسلوب سیکھ سکتے ہیں تو اسی خدائی رہنمائی کش کش کی روداد ہی سے سیکھ سکتے ہیں۔ آج اگر ابنائے آدم کو حقیقت کی شعور افزا کرنیں۔ اخلاق کی لازوال قدریں اور زندگی کی فلاح کے اہل اصول ہاتھ آسکتے ہیں۔ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ ہی سے ہاتھ آسکتے ہیں۔ محسن انسانیت جیسا داعی اور معلم اور مربی اور قائد اگر نہ مبعوث ہوا ہوتا۔ تو کبھی وہ کارِ عظیم اس دورِ ظلمت و جہل میں سرانجام نہ پاسکتا۔ حضور ہی سارے انقلاب کی روح تھے۔

ہمارے لیے اور تمام انسانوں کے لیے محسن انسانیت نے اپنے آپ کو جن زہرہ گداز مخالفتوں کے سامنے کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف کش کش کرتے ہوئے جان جو کھوں کے جو مراحل طے کیے اور کوئی قیمت وصول کیے بغیر اپنا

سب کچھ جس طرح اسلامی نظام کی امانت میں لگا دیا۔ اور پھر ایک دور تاریخ پیدا کیا۔ ایک پاکیزہ تمدن کو وجود دیا۔ ایک عظیم الشان اُمت برپا کی۔ انکار و علوم کی نئی دنیا میں پیدا کر دیں۔ اس کا زمانہ کے لیے ہمارا روٹنگار دنگٹا اپنے اور انسانیت کے محسن اعظم کا ممنون ہے۔ ہمارے بس میں نہیں کہ اس جذبہ ممنونیت کے مطابق اتنے بڑے انسان کا کسی ادنیٰ درجے میں بھی کوئی بدلہ حضور کو ادا کر سکیں۔ اس لیے اے خداوندِ برتر ہم عاجز بندے تجھی سے یہ درخواست کرتے ہیں تو ہمارے جذبہ افتنان کو قبول فرما کر اپنے نزاۃ رحمت سے ہمارا بدلہ ادا فرما۔ حضور کی روح پر رحمتیں نازل فرما۔ برکات بھیج، سلامتی کی پھواریں برسائے، درجات و مراتب کو باند فرما اور حضور کی دعوت اور پیغام اور تحریک کو پھر عروج دے۔ اور اسے تویح عطا فرما۔ اور اپنے زیادہ سے زیادہ بندوں کو اسلامی نظام کے سایہ رحمت سے بہرہ مند کر۔ تجھی سے یہ درخواست بھی ہے۔ کہ راقم الحروف کو، اور ایک ایک مسلم بندے کو اس سعادت کی توفیق دے کہ حضور کی دعوت کی مقدس امانت کے سچے امانت دار بنیں۔ اسے بنی نوع انسان تک پہنچائیں۔ حضور کی جاری کردہ تحریکِ حق کو پھر ایک زندہ حقیقت بنائیں۔ اور ان من دھن صرف کر کے حضور کے پیش کردہ نظام میں ان کو زمین پر استوار کر دیں۔ حضور کے مشن کی تکمیل میں حصہ لینا بھی حضور کی ممنونیت کا بہترین اظہار ہے۔

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ :

## کام ابھی باقی ہے

یہ اللہ ہی کا احسان ہے کہ اُس نے مجھ جیسے ادنیٰ بندے سے یہ مبارک خدمت لی کہ میں اس اعلیٰ ترین بندے کی سیرت اور کارنامہ حیات کی ایک جھلک پیش کرنے میں کامیاب ہو، اس خدمت کی انجام دہی میں میں اپنے فاضل پیش روؤں کا بے حد شرمندہ احسان ہوں کہ جنہوں نے اس موضوع پر نہایت اعلیٰ معیار کی دیسچ تصانیف چھوڑی ہیں۔ علاوہ ازیں دورِ حاضر کے دو اصحاب تحقیق مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا بہت ہی زیادہ ممنون ہوں کہ ان کے ہاں سے مجھے وہ خاص تحریک انگیز نقطہ نظر ہاتھ آیا۔ جس نے سیرت کے مہبت سے نئے پہلو میرے سامنے منکشف کیے۔ اور میں اُمید کرتا ہوں کہ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین کے سامنے فکر و کادش کی کچھ نئی راہیں کھل سکیں گی۔ علاوہ ان اصحاب کے میں اپنے ان خاص محبتوں کا بارِ احسان بھی اپنے کندھوں پر محسوس کرتا ہوں جنہوں نے بار بار ہمت افزائی کی۔ اور متواتر مجھے اس خدمت کے لیے اکسایا۔ انہی خاص محبتوں میں سے ایک شخصیت اس کتاب کے ناشر کی ہے جو بالکل غیر کاروباری ذہن کے ساتھ بار بار اس کی تکمیل کی تمنائے بے تاب لیے ہوئے مجھ سے ملتے رہے۔ اور راہوارِ قلم کو رواں کراتے رہے۔ خدا ان سارے بزرگوں اور احباب کو جزائے خیر دے۔

اب تک یہ کام جن حالات میں ہوا ہے وہ بالکل ناگفتنی ہیں۔ کتنی ہی بار اسے ہاتھ میں لیا۔ لیکن چند روز کے کام کے بعد تعطل کے لمبے لمبے وقفے حائل ہوتے رہے۔ بسا اوقات مہینوں ایک سرف نہیں لکھا جاسکا۔ مگر مسافر شوق تھا کہ جیسے بار بار گرنے پر کوئی غیر مرئی طاقت پھر اٹھا دیتی رہی۔ ایک دن یکایک ذہن میں یہ خیال افغان ہوا کہ غالباً اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی کہ جس عظیم ہستی کی زندگی کا عکس دنیا کو دکھانے چلے ہو۔ اس

کے تجربوں سواں، ہزاروں حصہ تو نہیں بھی چکھنا چاہیے۔ ورنہ نخریر میں وہ روح کیسے آئے گی۔ اس خیال نے ارادے کو اتنی مضبوطی دی کہ جب بھی اپنے آپ سے کام لینا ممکن ہوا۔ ہر طریق سے لیا۔ کتاب کا نصف آخر لیا۔ ہے کہ جس کا بیشتر حصہ بستر پر لیٹ کر لکھا گیا ہے۔ گویا میں نے اپنی ہستی کو اس کام میں بالکل نچوڑ نچوڑ کر صرف کیا ہے۔ بنا بریں توقع ہے کہ خدا سے قبول فرمائے گا۔ اور ذریعہ خیر و نلاح بنائے گا۔

کام ہو ہو چکا یہ اس سے بہت کم ہے کہ جو مجوزہ خاکہ کے مطابق کرنا باقی ہے۔ غالباً در تین چاروں تک پھیلے گا۔ اس وقت در حقیقت ایک ہی طویل بحث پیش کیا ہے جو اپنی جگہ مفصل اس لحاظ سے تو ہے کہ اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روداد کشمکش بڑی حد تک آگئی ہے مگر یہ دوسرے پہلوؤں سے تشنہ بھی ہے۔ کیونکہ سیرت پاک کے بہت سے اہم گوشوں کو سرے سے اس میں چھیڑا ہی نہیں گیا۔ اس وجہ سے یہ اندیشہ بھی ہے کہ بعض اصحاب اس کے مطالعہ سے کسی غلط فہمی میں پڑیں۔ اسی لیے ہفتہ کام کا خاکہ پیش کر دینا ضروری ہے۔ وہ حسبِ دیں ہے۔

\_\_\_\_\_ اس جغرافیائی و تمدنی ماحول کی عکاسی جس میں حضور کی بعثت ہوئی

\_\_\_\_\_ حضور کے پیغام در نشیب وعلیوں کی وضاحت \_\_\_\_\_ اس حقیقت کی تفسیر کرنا ہے

انسانی زندگی میں کیا بنیادی تبدیلیاں کرنے آئے تھے۔ نیز حضور کی دعوت کی نوعیت و درجہ کا بیان کیا تھا :

\_\_\_\_\_ حضور کی قیادت و بصیرت و سیاسی حکمت کا مطالعہ

\_\_\_\_\_ حضور کی دعوت کے نتیجے میں آیا انسان بناؤ۔

\_\_\_\_\_ خواتین نے کس طرح حضور کی جدوجہد میں تعاون کیا

\_\_\_\_\_ ایک مقل جلد میں حضور کے پورے تعمیری کارنامہ کی رودادوں کا ایک ایسا سہارا

ارادہ ہے کہ دورِ حاضر میں اس کے عملی رہنمائی حاصل کی جاسکے۔ زندگی کے ایک ایک شعبے کو جن نے نمودار

پر، جس حکمت اور تدبیر سے حضور نے استوار کیا۔ اسے متعدد مقامات میں لایا جائے۔ مثلاً اسلامی حکومت کی

اشاعت۔ معاشرے کے بالغوں اور نئی نسلوں کے لیے نظامِ تعلیم کی تاسیس، عہد نامہ کی تعبیر معاشی و سماجی

ترقی، دفاعی تنظیم اور اس کے استعمالات۔ سیاسی ہیئت کی تشکیل نو، معاشرت اور ثقافت کی تجدید۔ اسلامی نظام

عدل کا نفاذ۔ صفِ قیادت کی تربیت، بین الاقوامی تعلقات کی استواری اور دوسرے مختلف تعمیری اقدامات و فن

کی اصولی مدد اور ان کی عملی تدابیر کے ساتھ کھول کر بیان کیا جائے۔



\_\_\_\_\_ حضور کی اسلامی حکومت کی دفاعی اور فوجی کارروائیوں کی تفصیلی روداد۔

\_\_\_\_\_ عین ممکن ہے کہ ایک مستقل جلد میں معترضین کے اعتراضات پر بحث کی جائے۔ نیز واقعات اور شخصیتوں اور اہم تاریخوں کے تعین میں روایات کے جو اختلافات پائے جاتے ہیں ان پر تحقیقی نظر ڈالی جائے۔

\_\_\_\_\_ سیرت نبوی کے مآخذ اور اس موضوع پر اب تک کے علمی کاموں پر کسی قدر ناقدانہ نظر ڈالی جائے گی۔

\_\_\_\_\_ ساتھ کے ساتھ متعدد اہم نقوشوں کی تیاری مد نظر ہے جن کو سامنے رکھنے سے واقعات زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آسکتے ہیں۔ اس میدان میں کچھ نہ کچھ کام — اور خاصا قیمتی کام — ہو چکا ہے۔ ارادہ ہے کہ اسے اور آگے بڑھایا جائے۔ بعید نہیں کہ محسن انسانیت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت اور تحریک اسلامی کے متعلق ایک مستقل اٹلس مرتب ہو جائے۔ کتاب میں شامل ہونے والی متفرق معلومات کو ایک بڑے دیواری نقشہ سیرت میں یکجا کر دینے کا خیال بھی ہے۔

\_\_\_\_\_ اس کتاب کے تراجم کم سے کم انگریزی، عربی، بنگلہ اور ہندی میں کرانے کی تمنا ہے اس طرح اس کا دائرہ اثر وسیع ہو جائے گا۔

خدا سے دعا ہے کہ وہ ان ارادوں کو جامہ عمل پہنانے کی توفیق دے۔ اور اس عظیم کام کے لیے جن حالات اسباب کی ضرورت ہے وہ اپنے خزانہ رحمت سے ہم پہنچائے۔

نعتیہ صدیقی — جمعۃ المبارک۔ مارچ ۱۹۶۱ء

## واقعات سیرت پاک کی ترتیبِ زمانی

کتاب کے اصل مباحث میں جہاں بڑے پیمانے پر فی الجملہ ترتیبِ زمانی ملحوظ رہی ہے، وہاں تفصیل میں اسے نظر انداز کر کے موضوعات و مباحث کے تحت مختلف زمانوں کا ارتقائی مواد اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ لیکن تاریخ اور سیرت و سوانح کے میدان میں واقعات کی ترتیبِ زمانی کو بجائے خود بڑی اہمیت حاصل ہے، لہذا اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ذیل کا نقشہ بطور ضمیمہ شامل کتاب کیا جا رہا ہے۔ اس نقشہ کی بڑی افادیت یہ ہے کہ ایک نظر میں سیرت پاک کے مجملہ اہم واقعات سامنے آجاتے ہیں۔

واضح رہے کہ مختلف اہم تاریخوں اور دنوں کے تعیین میں حسب ذیل وجوہ سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بعثت سے قبل کے واقعات کو عام الفیل یا حضور کے سالِ میلاد سے بیان کیا جاتا ہے اور ان سالوں کو عیسوی شمسی سال سے تطبیق دی جاتی ہے۔ عام الفیل سلمہ اور سالِ میلاد سلمہ اگرچہ فی الجملہ منطبق ہیں لیکن عام الفیل کا آغاز واقعہ فیل کے دن (۱۰ محرم بروز جمعرات) سے ہوتا ہے اور سالِ میلاد اس سے ۵۰ یا ۵۱ دن (تقریباً دو ماہ بعد) شروع ہوتا ہے ہر دو سنین کے اس فرق کو مورخین اور راویان یا تو سرے سے نظر انداز کر جاتے ہیں یا یہ واضح نہیں کرتے کہ اُنہوں نے سال کا کونسا آغاز اختیار کیا ہے۔ پھر ایک طرف سال کا آغاز ربیع الاول سے ہو رہا ہے اور دوسری طرف مرد جمہ قمری سال محرم سے محسوب ہوتا ہے۔ اس طرح حسابی الجھنیں بڑھ جاتی ہیں۔ مثلاً اگر میلادی سلسلہ نہیں محرم سے شمار کریں تو ہجرت چودھویں میلادی سال میں ہوئی۔ لیکن اگر سال ربیع الاول سے محسوب کریں تو تیرھویں سال میلاد میں ہوئی۔ مورخین نے دونوں ہی سال لکھے ہیں۔

ہجری تقویم کو باقاعدہ طور پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں تاریخ ۶۰ ہجری (آخری سلسلہ بروز جمعرات) اختیار کیا۔ اس سے قبل ہجری تقویم نہ تو منضبط تھی۔ اور نہ واقعات کا تعیین وقت اس کے مطابق کرنے کا اہتمام تھا۔ چنانچہ صحاح کے دفاتر ہجری تقویم سے بے نیاز ہیں۔ ہجری تقویم کو اختیار کرنے

کے بعد سابق واقعات کی ترتیب زمانی اس کے تحت معین کی جانے لگی۔

پھر ہجرت سے جو قمری سال شروع ہوتا ہے وہ بھی دو طرح محسوب کیا جاسکتا ہے :- ایک یوں کہ ماہ ہجرت (ربیع الاول) سے شمار کریں اور دوسرے یوں کہ سالوں کی گنتی اگرچہ ہجرت کے سال سے کی جائے لیکن سال کی ابتداء قمری سال کے مروجہ ماہ آغاز (محرم) ہی سے کی جائے، یعنی اولین سال ہجرت صرف دس ماہ کا گنا جائے (ربیع الاول تا ذی الحجہ) محدثین، سیرت نگاروں اور تاریخی ماخذ میں سال ہجری کو ان دونوں صورتوں میں یا گیا ہے لیکن اس امر کی تصریح کم ہی صورتوں میں کی گئی ہے کہ سال کو کس نہج سے محسوب کیا گیا ہے۔

پھر بعض روایات میں تاریخ کے ساتھ جو یوم مذکور ہے ان کا باہمی انطباق نہیں ہوتا۔ دونوں میں سے جس پہلو سے وثوق یا روایات کا اتفاق پایا جاتا ہے اسے بنیاد بنا کر دوسرا پہلو حساب سے طے کیا جاتا ہے۔

سب سے بڑی مشکل تقویموں اور مختلف سلسلہ سین کے انطباق سے پیدا ہوتی ہے، کیونکہ ماخذ میں کسی ایک تقویم یا سلسلہ سین کی پابندی نہیں کی گئی۔ تقویموں کا یہ ہیر پھیر اس وجہ سے بھی بڑھ جاتا ہے کہ متعدد شمسی تقویموں کے علاوہ خود عیسوی تقویمیں بھی دوہری رائج رہ چکی ہیں۔ ایک شمسی، دوسری قمری۔ مزید مشکل یہ کہ عیسوی اور دوسری تقویموں کے نظام تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ اب کئی صدی بعد جب تاریخوں اور دنوں کی تطبیق کا حساب لگایا جاتا ہے تو متعدد پہلوؤں سے اختلاف کی راہیں نکل آتی ہیں۔

بعض واقعات اور اقدامات کو زمانی تعین کے ساتھ اہم روایات میں بیان ہی نہیں کیا گیا۔ بلکہ قرآن اور حدیث شریف کے دفا ترکی روشنی میں صرف اتنی ہی بات طے ہو سکتی ہے کہ کوئی واقعہ فلاں واقعہ سے پہلے یا بعد رونما ہوا۔ لیکن متعدد واقعات مثلاً تیمم کی اجازت، متعہ کی حرمت، احکام حجاب کے نفاذ اور بعض غزوات و سرایا معاہدات کے متعلق بلا تعین تاریخ محض سرسری ترتیب زمانی قائم کرنے میں بھی روایات متباہن ہیں۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سیرت پاک کے جہاں تفصیلی واقعات کی ترتیب زمانی کو قطعی تعین تاریخ کے ساتھ پیش کرنا مشکل ہے۔ بڑے بڑے محققین جن میں صرف سیرت نگار ہی نہیں، مفسرین، محدثین اور فقہاء سبھی شامل ہیں، بکثرت اختلافات رکھتے ہیں اور ہر نقطہ نظر کے حق میں اور اس کے خلاف ہی چوڑی مدلل بحثیں موجود ہیں۔

مؤلف محسن انسانیت نے اپنے مطالعہ کی حد تک ان اختلافات اور تقویمی حسابات میں کادش کر کے کوئی ایک صورت اس نقشہ میں طے کر دی ہے اور اہم اختلافات کو اشارہ درج کر دیا ہے لیکن نہ تو پورے اختلافی نقطہ ہائے نظر کو یہاں درج کر کے قاری کو پریشان کرنا مناسب تھا اور نہ ہی گنجائش تھی کہ متقدمین اور متاخرین کی تفصیلی بحثیں پیش کی جائیں۔ یہ کام اگر کیا بھی جائے تو بالکل الگ سے کرنے کا ہے۔

اس نقشہ میں ہجرت سے قبل کے واقعات کو یا تو نام الفیل اور سال میلاد کے حساب سے درج کیا گیا ہے یا سال بعثت کے حساب سے کہیں کہیں حضور کی عمر مبارک ہی کو تعین وقت کا پیمانہ بنایا گیا ہے

(۱) پیدائش حضور موسم بہار میں دوشنبہ کے روز (اس دن پر اتفاق ہے)۔  
تاریخ ۹ ربیع الاول سنہ  
عام الفیل واقعہ فیل سے  
۵۰ روز بعد مطابق ۲۲ اپریل  
۱۵۱۱ھ یکم جمادی الثانی  
بوقت صبح صادق (قبل از طلوع  
آفتاب)  
مشہور نام ۱۲ ربیع الاول ہے۔

طبری و ابن خلدون نے ۱۲ ربیع الاول اور ابوالمقداد نے ۱۰ تاریخ کی روایت کی ہے مگر چونکہ دن کے دوشنبہ ہونے پر اتفاق ہے اور دوشنبہ ۹ ہی کو آتا ہے اس لیے محمد طلعت بک عرب روضہ تاریخ دول الحرب والاسلام کی تائید میں قاضی سلیمان منصور پوری (مؤلف رحمۃ اللعالمین نے تقویوں کے حساب میں عرقریزی کرتے ہوئے ۹ ہی کے حق میں رائے دی ہے۔ مصر کے مشہور بہت دان محمود پاشا نے ریاضیاتی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ حضور کا یوم ولادت ۹ ربیع الاول ہے جسے پاشا نے مؤلف نے ۲۰ اپریل سنہ سے مطابقت دی ہے۔  
مادمہ شبلی نے بھی اسی تحقیق کو قبول کیا ہے  
۲۲ اپریل کا تعین اگر گورین ردل سنہ مطابق ہے جس کے تحت ستمبر ۱۵۱۱ء کی نیویسوی تقویم کا حساب چلا۔ قدیم تقوینی قاعدہ کے مطابق اس دن ۹ اپریل ۱۵۱۱ء جوین کی تاریخ متعین ہوئی ہے۔ ایک اختلاف یہ بھی ہے کہ ولادت حضور واقعہ نام الفیل سے ۵۰ روز بعد ہوئی یا ۵۵ روز بعد۔ بظاہر حساب ۵۰ روز کے حق میں ہے۔

مولانا عبدالرؤف دانا پوری (مؤلف صحیح السیر نے ۸ یا ۱۲ ربیع الاول دو تاریخیں لکھی ہیں۔ مگر

نہ تو ماخذ روایت پر گفتگو کی ہے نہ تقویوں کے سلسلہ میں تفصیل پیش کیا ہے۔ بعض نے یکم محرم کا تعیین بھی کیا ہے اور عیسوی تقسیم کے لحاظ سے ۱۲ اور ۱۵ فروری کی تاریخیں ذکر کی ہیں۔

ابن اسحاق کے نزدیک ربیع الاول کی بارہویں رات گزرنے پر حضورؐ کی ولادت ہوئی۔

ہماری رائے میں محققین کا پلہ ۹ تاریخ کے حق میں بھاری۔

پیدائش کے ۳،۲ روز بعد سے ثویبہ (جو ابولہب کی کنیز تھی) کا دودھ حضورؐ لے کچھ وقت پیا۔ باقاعدہ دو روز رضاعت آپؐ نے دائی حلیمہ سعدیہ کے صحرائی گھر میں گزارا۔

(۲) رضاعت بر عمر چار ماہ

(۳) حضورؐ کی والدہ کا انتقال بر عمر ۶ سال

(۴) حضورؐ کے دادا کا انتقال بر عمر ۶ سال ۱۰۰ دن

(۵) پہلا سفر شام بر عمر ۱۲ سال ۲ ماہ

بعیت جناب

(ابوطالب)

(۶) حرب فجار میں بر عمر ۱۵ سال (یا

شکرک بارادل کچھ زائد)

(۷) حرب فجار میں کچھ عرصہ بعد وقت کا

شکرک بارادلم تعیین نہیں۔

(۸) حلف الفضول ایک بر عمر ۱۶ سال

اصلاحی انجمن میں ریکٹ

(۹) دوسرا سفر شام تاجرانہ

حیثیت میں بر عمر ۲۳ یا ۲۴ سال

(۱۰) ازدواجِ حضرت بہ عمر ۲۵ سال ۱۰۵۶ھ دن  
خدیجہؓ سے

(۱۱) غیبی اسرار کے ظہور ، سال قبل بعثت  
کا آغاز بہ عمر ۳۳ سال

(۱۲) تکویم بہ عمر ۳۵ سال

تعمیرِ حرم کے سلسلے میں حجرِ اسود نصب کرنے پر حجاب  
ہوا۔ تو سب نے حضورؐ کو امین قرار دیتے ہوئے حکم  
بنایا اور معاملہ بخوبی طے ہو گیا۔

(۱۳) بعثت بہ عمر ۴۰ سال ۱۱ دن

۹ ربیع الاول ۱۱ھ

سال میلاد مطابق ۱۲ فروری

۱۱ھ بروز دوشنبہ

اس تاریخ کے تعیین میں بھی خاصا اختلاف ہے۔ ایک  
روایت یہ ہے کہ بہ عمر ۴۰ سال ۶ ماہ ۶ دن (قمری تقویم)  
اور ۳۹ سال ۲ ماہ ۶ دن (شمسی تقویم) بعثت کا فرمان  
حرام میں نازل ہوا۔ چنانچہ بعض نے ۲۵ رمضان اور  
بعض نے ۱۳ ربیع الاول کی تاریخیں دی ہیں اور عیسوی  
تقویم کے لحاظ سے ۱۲ فروری کے بالمقابل ۶ اگست  
۱۱ھ کی تاریخ بھی مذکور ہے۔ مگر یہ سارے اختلافات  
تقویمی حسابات کی پیچیدگی سے پیدا ہوئے ہیں۔ نیز  
النباس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فرمانِ بعثت اور آغاز  
نزولِ قرآن کے زمانے روایات میں گڑبگڑ ہو گئے ہیں  
صاحب زاد المعاد نے ۸ تاریخ لکھی ہے۔ اگر دوشنبہ  
تقویمی حسابات سے ۹ تاریخ کو پڑتا ہے۔

فرمانِ بعثت کی صورت یہ ہوئی کہ روح الامین

نے تم میں سامنے آکر مخاطب کیا کہ "بشارت قبول

فرمائیے! آپ اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریل ہوں۔

اسی واقعہ پر آپؐ کو اضطراب ہوا اور حضرت خدیجہؓ نے

نسکین پڑی۔

(۱۴) فرضیت نماز (فجر و عصر) ۹ ربیع الاول

کی دو رکعتیں، بروز بعثت

- (۱۵) آغاز نزول قرآن ۱۸ رمضان ۱۰ سال بعثت  
اس موقع پر سورہ علق نازل ہوئی۔ طبری نے ۱۷ یا ۱۸  
بروز جمعہ (وقت شب) مطابق  
دونوں تاریخیں لکھی ہیں۔ مگر تقویمی حساب سے جمعہ ۱۸  
۱۷ اگست ۶۱۰ء  
ہی آتا ہے۔
- (۱۶) خفیہ دعوت کا ۱۰ سال بعثت  
دور  
خانہ ارقم مخزومی واقع کوہ صفا تحریک اسلامی کا مرکز  
بنا اور تقریباً ۴۰ افراد اس قدر میں اسلام لائے نماز  
شہر سے باہر خفیہ طور پر پڑھی جاتی۔
- (۱۷) اعلان نبوت - ۱۰ سال بعثت  
(پہلا خطاب عام) (اداخل میں)
- (۱۸) مخالفت کا پہلا دور ۱۰ سال بعثت  
(استہزاد پر دیکھو  
اور بلکا تشدد)
- (۱۹) شدید مخالفت کا ۱۰ سال بعثت  
دور (عام مظالم)
- (۲۰) ہجرت حبشہ رجب ۱۰ سال میلاد  
۱۰ سال بعثت
- (۲۱) حضرت حمزہؓ و حضرت  
عمرؓ کا قبول اسلام ۱۰ سال بعثت
- (۲۲) حضورؐ کی خاندان یکم محرم ۱۰ سال میلاد  
بنو ہاشم سمیت ۱۰ سال بعثت بروز  
نظر بندی (مقام) ۱۰ سال شنبہ  
شعب ابی طالب میں
- (۲۳) مقاطعہ و نظر بندی ۱۰ سال بعثت کے آواخر یا  
کا خاتمہ ۱۰ سال بعثت کے اوائل میں
- (۲۴) عام الحزن جناب ۱۰ سال بعثت  
الوطالب و حضرت  
الوطالب کی وفات کے ۳ یا ۵ روز بعد حضرت خدیجہؓ  
نے ماہ رمضان میں داعی اجل کو لبیک کہی۔

	غدیر شجرہ کی وفات	
(۲۵)	سفر طائف	جمادی الاخریٰ ۵ھ میلاد سنہ بعثت
		دوسری روایت ۲۶-۲۷ شوال سنہ بعثت کی ہے۔
(۲۶)	معراج	۲۶ رجب ۵ھ میلاد سنہ بعثت بروز دوشنبہ (شب)
(۲۷)	فریخت نماز پنجگانہ	۲۶ رجب ۵ھ میلاد سنہ بعثت بروز دوشنبہ (شب)
(۲۸)	مدینہ میں اسلام کا آغاز	ذی الحجہ ۵ھ میلاد سنہ بعثت
		ایاس بن معاذ نے اسلام قبول کیا۔
(۲۹)	وفدِ مدینہ (۱۶ افراد) کا قبولِ اسلام	ذی الحجہ ۵ھ میلاد سنہ بعثت
(۳۰)	بیعت عقبہ اولیٰ (۱۲ افراد)	ذی الحجہ ۵ھ میلاد سنہ بعثت
(۳۱)	بیعت عقبہ ثانیہ (۴۵ افراد)	ذی الحجہ ۵ھ میلاد سنہ بعثت
(۳۲)	ہجرت	
	۱۔ مکہ سے غار ثور	۲۶ سفر (شب) ۵ھ میلاد سنہ بعثت
	۲۔ غار ثور سے ردانگی	یکم ربیع الاول بروز دوشنبہ مطابق ۱۹ ستمبر ۶۱۰ء
	۳۔ قبا میں ورود	۸ ربیع الاول ۵ھ میلاد سنہ بعثت مطابق ۲۳ ستمبر ۶۱۰ء بروز دوشنبہ
	۴۔ قبا سے مدینہ کو ردانگی۔ مدینہ میں داخلہ	۱۲ ربیع الاول ۵ھ سنہ بعثت بروز جمعہ
		جمعہ نو سالہ کی بستی میں ادا کیا گیا۔ ایک قوی روایت یہ بھی ہے کہ قبا میں ۱۲ روز قیام ہوا۔



صحیح بخاری میں قیام مدت "بضع عشورہ لیلة" مذکور ہے۔ چنانچہ بعض روایات میں مدینہ پہنچنے کی تاریخ ۲۲ ربیع الاول آتی ہے۔

- |      |  |  |
|------|--|--|
| (۲۳) | تاسیس مسجد نبویؐ                                     | ربیع الاول ۱ھ                          |
| (۳۳) | فرض نماز میں اضافہ                                   | ربیع الثانی ۱ھ                         |
| (۳۵) | ہاجرین و انصار میں مواخات۔                           | پہلی سہ ماہی ۱ھ                        |
| (۳۶) | اسلامی ریاست کا قیام مدینہ کی آبادی کا دستوری معاہدہ | وسط ۱ھ                                 |
| (۳۷) | نظام دفاع برسر عمل ہوا                               | وسط ۱ھ ہجرت کے ساتویں ماہ کے شروع میں۔ |
- ظہر، عصر اور عشا کی چار چار رکعتیں فرض ہوئیں۔
- اجتماع مواخات بر مکان حضرت انس اس میں حضورؐ کے سامنے ۹۰ ہاجرین و انصار حاضر تھے۔
- فوجی مظاہرہ اور طلاہ گری کئے لیے پے در پے تین دستے روانہ کئے گئے (۱) ساتویں ماہ ۳۰ افراد کا دستہ حضرت حمزہ بن عبد المطلب کی سرکردگی میں مقام سیف البحر تک گیا (۲) آٹھویں ماہ (شوال) ۶۰ یا ۸۰ سواروں کا دستہ عبیدہ بن الحارث کی سرداری میں بہ جانب رابع بھیجا گیا۔ (۳) نویں ماہ (ذی قعدہ) سعد بن وقاص ۲۰ سواروں کا دستہ لے کر خرازم تک گئے اس کے بعد ودان کی جانب حضورؐ بہ نفس نفیس ایک جماعت کے ساتھ تشریف لے گئے اس عملی و دفاعی صورت حالات کے پیش نظر ہم اس نظریہ سے اتفاق نہیں کر سکے۔ کہ اذن جہاد کی مشہور آیت ۱۱۰ میں نازل ہوئی۔ درحقیقت ۱ھ میں عملاً قتال کرنے کا فیصلہ

ہوا۔ اس سے قبل عملی تصادم سے اجتناب رہا۔  
 لیکن نظامِ دفاع کی تشکیل کے لیے کسی نہ کسی فرمان  
 الہی کو لازماً محرکِ اول ہونا چاہیے یہی وجہ ہے کہ  
 ہم اذنِ جہاد کی آیت کا نزولِ ہجرت سے قبل قرار  
 دیتے ہیں اس کا مدعا یہ تھا کہ اسلامی جماعت کا ذہن  
 دعوت کے ذوقِ صبر سے آنے والے ددِ جہاد کی  
 ذمہ داریوں کی طرف منتقل ہو اور وہ نئے مرکز میں پہنچ  
 کر فوراً دفاعی تفسیر کا آغاز کر دیں۔

(۳۸) حضور کے حرم میں سوال شد

حضرت عائشہ رضی

کی تشریف آوری

ددا کا بر کا قبول (۳۹)

اسلام

۱۔ عبداللہ بن سلام

(سابق یہودی)

۲۔ ابو قیس صرصر بن

ابی انس (سابق

عیسائی) اہلب

(۳۰) فرمانِ جہاد (عملی ۱۲۔ صفر ۲ھ یا

کارروائی کرنے ہجرت کے سال ۲ھ

کی اجازت) ایوم بعد۔

(۳۱) حضور کا اولین صفر ۲ھ ہجرت

فوجی و سیاسی سفر کے بارہویں

غزہ و دان ماہ ہیں۔

(۳۲) بیرونی قبائل سے صفر ۲ھ جمادی الاخریٰ

مورخین کے بیانات سے یہ بھی متنباور ہوتا ہے کہ

کہ مجیدی جہینی رئیس جہینہ سریتہ بنی صمرہ سے قبل  
مدینہ سے حلیفانہ رابطہ رکھتا تھا۔

معابدانہ تعلقات ۲۳  
— بنی صمرہ

— باشندگان بواط

— بنو مدلج

(۲۳) کرز بن جابر فری

کی ڈاکہ زنی ربیع الاول ۲۴

(دشمن کی اولین درازدگی)

(۲۴) واقعہ نخلہ اوخر رجب ۲۴

(اسلامی فوجی دستے

کی پہلی سرحدی جھڑپ

(۲۵) سلمان فارسی کا اسلام ۲۵

(۲۶) اذان کا آغاز ۲۶

(۲۷) فرضیت زکوٰۃ ۲۷

(۲۸) تحویل قبلہ ۱۵ شعبان ۲۸

بروز شنبہ

(۲۹) فرضیت صوم یکم رمضان ۲۹

ماہ رمضان چار شنبہ

چونکہ معرکہ بدر کی تاریخ یعنی ۱۲ رمضان کو زیادہ تر  
روایات سے جمعہ کا دن ثابت ہے اس لیے حساب  
سے یکم کو چار شنبہ ہونا چاہیے۔ اسی لیے ہم نے وہ  
روایت چھوڑ دی ہے جس میں یکم رمضان کو یک شنبہ  
محبوب کیا جاتا ہے۔

(۵۰) عید الفطر کی نماز

باجامعت کی

لدائی و صدقہ فطر یکم شوال ۲۹

کے حکم کا نفاذ

(۵۱) معرکہ بدر پہلی ۸ رمضان ۲۹ بروز

عجیب المصنوع ہے کہ معرکہ بدر کے دن اور تاریخ پر تو زیادہ تر

اتفاق ہے لیکن مدینہ سے روانگی کی تاریخ بعض نے ۱۲ اقرار دی ہے، بعض نے ۸۔ جنہوں نے ۸ تاریخ لکھی ہے وہ دو شنبہ دسیر، کا دن ذکر کرتے ہیں حالانکہ، اگر جمعہ ہو تو ۸ کو کسی طرح پیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ہم نے ۸ رمضان کی روایت میں چار شنبہ اور ۱۲ کی روایت میں یک شنبہ درج کیا ہے۔ البتہ اگر اس روایت کو اہمیت دی جائے جس کی رو سے، ۱۱ رمضان کو سہ شنبہ قرار دیا گیا ہے تو یکم در آٹھ کو یک شنبہ کا دن ہونا چاہیے۔

باقاعدہ جنگ، چار شنبہ یا ۱۲ رمضان  
— مدینہ سے روانگی ۱۲ بروز جمعہ ۲۰ رمضان  
— معرکہ کارزار ۱۳ بروز دو شنبہ  
— مدینہ میں فاتحاً داخلہ

- (۵۲) ازدواج حضرت جنگ بدر کے  
علیؑ و فاطمہؑ بعد ۱۲
- (۵۳) محاصرہ بنو قریظہ وسط شوال تا محرم ذیقعدہ  
۱۲
- (۵۴) حضور کا نکاح  
حضرت حفصہؑ ۱۲  
بنت عمرؓ سے
- (۵۵) ازدواج حضرت عثمان و امّ کلثوم ۱۲  
بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
- (۵۶) امتناع شراب کا ابتدائی حکم ۱۲
- (۵۷) کعب بن اشرف کا خاتمہ ۱۲
- (۵۸) ولادت جناب امام حسنؑ ۱۵ رمضان ۱۲

(۵۹) غزوة اُحد

— مدینہ سے روانگی ۵ شوال ۳؎ بعد نماز جمعہ

— معرکہ کارزار ۶ شوال بروز شنبہ

— حمراء الاسد تک

لشکر ابوسفیان کا ۷ شوال بروز یکشنبہ

تغائب

ملاحظہ ہو: آل عمران (۱۳۰)

(۶۰) سو و خواری کے ترک غزوة اُحد کے

کے لیے ابتدائی متصلاً بعد

نصیحت

(۶۱) یتامی کے بارے غزوة اُحد کے

میں احکام متصلاً بعد

(۶۲) وراثت کے مفصل ۳؎ معرکہ اُحد

قانون کا اجراء کے بعد

(۶۳) قانون الدواج

حقوق الزوجین

۳؎

مشرک عورتوں

سے نکاح کی

مانعت

یوم اُحد کو بیوہ ہوئی تھیں ان کی عدت ۳؎

میں جی بھی پوری ہو سکتی ہے جب کہ حمل کی صورت

ہو۔

(۶۴) حضور کا نکاح آواخر ۳؎

زینب بنت خزیمہ

ام المساکین سے

(۶۵) حادثہ رجب دس سفر ۳؎

ارکان کے دعوتی

و تعلیمی وفد کا

قتل

- (۶۶) غزوة بنو نضیر بربیع الاول ۳ھ
- (۶۷) ام المومنین زینب بنت خزیمہ کا انتقال ۳ھ ادائل
- (۶۸) حکم حجاب کا نفاذ یکم ذیقعدہ ۳ھ بروز جمعہ
- (۶۹) حرمت شراب کا قطعی قانون نافذ ہوا ۳ھ
- (۷۰) غزوة بدر الاخریٰ ذیقعدہ ۳ھ
- (۷۱) غزوة دوامۃ الجندل بربیع الاول ۳ھ
- (۷۲) غزوة بنو مصطلق ۳ شعبان ۳ھ
- (۷۳) حکم تیمم کا نزول غزوة بنو مصطلق کے سفر میں
- (۷۴) حضور کا ازدواج شعبان ۳ھ
- حضرت جویریہ سے
- (۷۵) واقعہ انکب شعبان ۳ھ
- (۷۶) زنا - قذف اور رعاء کے فوجداری قوانین ۳ھ
- کا لعاذ - نیز پردے (واقعہ انکب کے بعد کے تفصیلی احکام
- (۷۷) غزوة احزاب شوال یا ذی قعدہ ۳ھ
- (۷۸) وفد دوس کی مدینہ میں آمد ۳ھ
- (۷۹) بنو قریظہ کی سرکوبی ذوالحجہ ۳ھ
- (۸۰) حضور کا ازدواج جناب زینب بنت جحش سے ۳ھ

یہ ازدواج نبوی میں صرف دو تین ماہ رہیں۔

بوسفیان اپنے چیلنج کے مطابق مقابلہ پر نہ آیا۔  
تصادم نہیں ہوا

یہ ۴۰... ۸۰ مسلمہ خاندانوں کا عظیم وفد تھا

- (۸۱) ثمامہ بن اثال حنفی ۶ھ
- رئیسِ نجد کا اسلام
- (۸۲) معاہدہ حدیبیہ ذیقعدہ ۶ھ
- حدیبیہ سے مدینہ ذی الحجہ ۶ھ
- میں واپسی
- (۸۳) خالد بن ولید اور
- عمر بن العاص کا ۶ھ
- اسلام
- (۸۴) بین الاقوامی دعوت یکم محرم ۶ھ
- کا آغاز (سلاطین بروز چہار شنبہ کے نام خطوط)
- (۸۵) غزوة خیبر محرم ۶ھ
- (۸۶) حضور کا نکاح محرم ۶ھ
- حضرت صفیہ سے
- (۸۷) مراجعت ہاجرین فتح خیبر کے موقع پر
- عیشہ ۶ھ
- (۸۸) آزاد مسلم کیپ کا ۶ھ کے
- قیام (بمقام سیف آغاز میں البحر)
- (۸۹) سیف البحر کا سفر ۶ھ
- قریشی قافلے پر چھا
- (۹۰) عمرہ القضاء ذی قعدہ ۶ھ
- (۹۱) نکاح و طلاق کے ۶ھ

مکہ میں جو مسلم نوجوان سناٹے جا رہے تھے معاہدہ حدیبیہ کے مطابق ان کو حضور مدینہ میں جگہ نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ پہلے ابو جندل و ابولصیر اور بعد میں دوسرے لوگ بھاگ کر سیف البحر کے مقام پر جا پہنچے اور وہاں آزاد مسلم کیپ قائم کیا۔

تفصیلی قوانین کا نفاذ

(۹۳) حضور کا نکاح حضرت

میمونہ سے (مکہ میں)

(۹۴) جبلہ غسانی کا اسلام

(۹۵) غزوہ موتہ جمادی الاولیٰ ۶۲۵ھ

(۹۶) مشرکین مکہ کی طرف

سے معاہدہ حدیبیہ

کی مخالفت دزدی

(۹۷) غزوہ فتح مکہ

— مدینہ سے ۱۰ رمضان ۶۲۴ھ بروز

روانگی چہار شنبہ

— مکہ میں فاتحانہ ۲۰ رمضان

داخلہ

دوسری طرف خاص مضمون پر دائرہ بندی بھی ہے کہ  
حضور ۱۸ رمضان تک مدینہ میں تھے۔ اس لیے  
۲۹ یا ۳۰ کو ہونا چاہیے۔

— سریہ خالد بن

بدر بنت خالد بن عزی

واقع نخلہ

— سریہ عمرو بن

العاص برائے بدر

بتحانہ سواع

— سریہ سعد اشہلی

برائے بدر بتحانہ مناة

— قیام مکہ ۹ شوال تک

— غزوہ خیندہ ۶ ماہ شوال ۶۲۵ھ

(حائل پہنچنے تک) روز کی مدت

برائے دیگر ۱۸ شوال تک



مکحول کی روایت کے مطابق ۳۰ روز محاصرہ جاری رہا۔

— محاصرہ طائف ادا خزشوال تا ادا اہل ذیقعدہ تقریباً ۱۸ یا ۲۰ روز

— جعرانہ میں تقسیم

غنائم کے بعد عمرہ ذی قعدہ ۱۰ھ

جعرانہ

سودی مطالبات قانوناً کا عدم کر دیے گئے (ملاحظہ ہو:۔ البقرہ ۲۶۸)

(۹۸) سود کے قطعی انساد بہ موقع فتح مکہ

کا قانون ۱۰ھ

(۹۹) وفد صداء کی مدینہ میں آمد ۱۰ھ

(۱۰۰) حضرت زینب بنت

حنصور کا انتقال

جناب ابراہیم فرزند ۱۰ھ

حنصور کا انتقال

(۱۰۱) تنظیم زکوٰۃ :-

محصلین صدقہ کا ابتدائے محرم

اولین تقریر ۹ھ

(۱۰۲) غزوہ تبوک: رجب ۹ھ مطابق

جیش عسرت کی روانگی نومبر ۶۳۰ء مدینہ سے

روانگی بروز جمعرات

ایک روایت کے مطابق ۱۰ھ میں غزوہ تبوک سے قبل یہ حکم آیا۔

(۱۰۳) جزیرہ کا حکم بہ زمانہ تبوک

(۱۰۴) مسجد منار جباردی ٹی غزوہ تبوک سے دراپسی کے بعد

(۱۰۵) اکیڈروائی دومتہ الجندل

کا اسلام ۹ھ

قصیدہ بانٹ سعاد لکھ کر پیش کیا۔

(۱۰۶) کعب بن زبیر کی

عضو طلبی اور قبول اسلام ۹ھ

(۱۰۷) چند دفود جو اس

سال مدینہ آئے۔

— وفدِ عذرہ مفر ۹ھ

— وفدِ بی ربيع الاول ۹ھ

— وفدِ خولان شعبان ۹ھ

— وفدِ ثقیف ۹ھ

(۱۰۸) فرنیٹ حج : ذی الحجہ ۹ھ

اولین حج ربامارت دوشنبہ یا سہ شنبہ

حضرت ابو بکر صدیق

(۱۰۹) اعلان برأت بذریعہ

حضرت علیؓ۔ کفار کے

غیر موقت معادلات ۱۰ ربيع الثانی

کا خاتمہ اعلان برأت ۱۰ھ

کے مطابق

فرنیٹ حج کے تعیین وقت میں بھی روایات ۱۰ھ  
 ۱۰ھ، ۱۰ھ، ۱۰ھ، ۱۰ھ کے بارے  
 میں موجود ہیں مگر ہم نے اپنی دانست میں مزاج صورت  
 کو لے لیا ہے۔ ایک دلچسپ صورت یہ بھی ہے کہ  
 یہ حج کفار کے تقویمی نظام کے تحت نون دیا نوند  
 کے مہینوں کی وجہ سے ذی قعدہ میں ہوا تھا۔ لیکن  
 اس روایت کا پہلو کمزور ہے۔ اعلان برأت سے  
 متعلق بھی اختلاف ہے کہ یوم عرفہ کو نون یا یوم نحر  
 کو۔ ہمارے نزدیک یوم الحج الاکبر کے قرآنی الفاظ  
 کافی ہیں۔ احادیث کو دیکھیں تو بھی یوم نحر کے حقی  
 میں پڑا بخاری ہے۔

بقیہ دفود میں سے اکثر ۱۰ھ میں اور کچھ ۱۰ھ  
 میں مدینہ آئے مگر ان کی آمد کے وقت کا صحیح تعیین  
 مشکل ہے۔

(۱۱۰) وفدِ محارب {

وفدِ محامد

وفدِ خولان شعبان ۱۰ھ

وفدِ نبیان رمضان ۱۰ھ

وفدِ بنی حارث بن کعب شوال ۱۰ھ

” ” وفدِ سلا ماں

(۱۱۱) حضور کا آخری رمضان

میں ۲۰ روزہ اعتکان رمضان ۱۰ھ

(۱۱۲) حضور سے میلہ

کذاب کی مراسلت

(۱۱۳) حجتہ الوداع :-

— مدینہ سے روانگی ۲۶ ذی قعدہ سنہ

بروز شنبہ ماہین ظہر وعصر

— ذوالحلیفہ میں شنبہ و یک شنبہ کی

قیام درمیانی شب

— احرام بندی یک شنبہ (بوقت ظہر)

— ذی طویٰ میں شب یک شنبہ ۴ ذی الحجہ

نزدول و قیام سنہ

— ذی طویٰ سے ۵ ذی الحجہ - نماز صبح

مکہ کو روانگی کے بعد -

— مسجد حرام میں ۵ ذی الحجہ بوقت ضحیٰ

داخلہ

— مکہ سے باہر ۸ ذی الحجہ تک

قیام

— منیٰ کو روانگی ۸ ذی الحجہ بروز جمعرات

بوقت ضحیٰ

— منیٰ سے عرفہ کو ۹ ذی الحجہ بروز جمعہ طلوع

روانگی آفتاب کے بعد

— خطبہ حج (عرفہ) ۹ ذی الحجہ بروز جمعہ بعد

زوال آفتاب

— دقوت عرفہ ۹ ذی الحجہ بروز جمعہ بعد

نماز ظہر وعصر

— عرفہ سے روانگی ۹ ذی الحجہ بروز جمعہ بعد

بجانب مزدلفہ عذوب آفتاب

(اس معاملے میں بھی اختلاف ہے مگر ہم نے صحیح

ترین روایت اختیار کی ہے)

ثنیۃ العلیلا کی طرف سے جو حجوں کی بندی پر ہے

حضور مکہ میں داخل ہوئے -

باب بنی عبدمناف (باب بنی شیبہ) سے حضور

داخل ہوئے -

جملہ اصحاب حضور کے ساتھ مقیم رہے - قیام شبانہ

مناہیں فرمایا -

براستہ منب قریۃ نمرہ (عرفات سے بجانب مشرق)

تشریف لے گئے وہیں قبۃ کھڑا کیا گیا - تصوی نامی تاقہ

پر سے یہ عظیم خطبہ نشر فرمایا -

یہاں حضور نے گریہ دزاری سے مغرب تک دعا

فرمائی -

مازین کے راستہ سے واپسی فرمائی

یہاں حضور نے گریہ دزاری کے ساتھ تسبیح تکبیر اور تہلیل فرمائی۔

مزدلفہ سے مشعر حرام ۱۰ ذی الحجہ بروز شنبہ نماز صبح کے بعد

— مشعر حرام سے ۱۰ ذی الحجہ قبل منیٰ کو روانگی طلوع آفتاب

— رمی جمار " بعد طلوع آفتاب

تا بہ صبحی

خطبہ منیٰ یوم ۱۰ ذی الحجہ بوقت

الغمر صبحی

— قربانی بعد خطبہ

قربانی کے یکصد اونٹوں میں سے ۱۶۳ اونٹ اپنے دست مبارک سے ذبح کیے اور بقیہ کو حضرت علیؓ کے سپرد کیا۔ اس کے بعد منیٰ راس کر آیا۔

مکہ میں پہنچ کر ظہر سے قبل طواف صافہ فرمایا شب منامیں گزار دی

— منیٰ سے مکہ کو ۱۰ ذی الحجہ بعد

روانگی حلق راس

— مکہ سے منیٰ کو واپسی آخری یوم

دوسرا خطبہ منیٰ یوم الرؤس (۱۱ ذی الحجہ)

— منیٰ سے محصب ۱۳ ذی الحجہ بروز

یا ابطح کو روانگی سہ شنبہ

— مکہ سے واپسی ۱۳ ذی الحجہ کی درمیانی شب

(۱۱۴) وفد نخع وسط محرم ۱۱ھ

(۱۱۵) ہمیش اسلام کی

ترسیل کا حکم ۲۶ صفر ۱۱ھ

(۱۱۶) حضور کے مرض او آخر صفر ۱۱ھ

وفات کا آغاز (اعلیٰ ۲۹ کو)

(۱۱۷) اشتداد مرض کا

زمانہ (حضرت عائشہؓ کے حجرے میں وفات تک کے سات دن اقامت)

اس خطبہ کا ذکر ابوداؤد کی روایت میں ہے رات کو مکہ جا کر طواف وداع فرمایا

یہ آخری وفد تھا جو حضورؐ کی زندگی میں آیا۔

یہ آخری فوجی مہم ہے جس سے بے حضور نے مکہ دیا۔

مختلف روایات میں سے صحیح ترین یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضورؐ کی مدت علالت ۱۳ روز تھی

روایات میں متعدد خطابات کا ذکر ہے مگر اغلب یہ ہے کہ مختلف امور اسی خطبہ میں ارشاد فرمائے گئے۔

پیر کا دن متفق علیہ ہے مگر تاریخوں میں اختلاف ہے یکم و ۲ بھی مروی ہیں اور ایک حساب سے ۱۲ بھی نکلتی ہے۔ اصل اشکال یہ ہے کہ ۹ ذی الحجہ کو جمعہ کا دن قطعاً ثابت ہے اور اس لحاظ سے حساب لگائیں تو ۱۲ ربیع الاول کو ما سوا اس نادر صورت کے دو شنبہ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ کہ متواتر تین مہینے تیس دنوں کے ہوں۔ لیکن ایک رائے یہ ہے کہ بطور شاذ ایسا بھی ہو سکتا ہے اور دوسری تاویل یہ ہے کہ مکہ اور مدینہ میں موسمی وجوہ سے رویت ایک دن آگے پیچھے ہو سکتی ہے۔

(۱۱۸) مسجد میں آخری وفات سے ۵ روز قبل نماز باجماعت و بروز جمعرات آخری خطاب نمازِ ظہر۔

(۱۱۹) وصال ۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ دو شنبہ بوقتِ چاشت

(۱۲۰) تدفین ۱۳ ربیع الاول بروز شنبہ

۱۴ ربیع الاول چہار شنبہ

کی درمیانی شب

حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں قبر مبارک بنی۔

## اولیات و تقدیات

پہلا حکم بعثت —

مورخہ ۹ ربیع الاول ۱۱ سال میلاد

اولین نزول قرآن —

سورہ معلق مورخہ ۱۸ رمضان ۱۱ سال بعثت کو نازل ہوئی۔

راہِ حق میں حضور کا اولین حلقہ رفاقت —

(۱) خواتین میں سے حضرت خدیجہ طاہرہ کو مقامِ سبقت حاصل ہوا۔

(۲) پختہ شعور آزاد مردوں میں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اولیت

کا شرف پایا۔

(۳) فوجیہ جوانوں میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ پیش پیش رہے۔

(۴) زیر نگین طبقہ میں سے حضرت زید بن حارثہ حضور کے آزاد کردہ غلام

کو تقدیم ملا۔

حضرت خدیجہ کے بعد سب سے پہلی خاتون جو اسلامی تحریک کے دائرہ میں داخل ہوئیں۔

لبابہ بنت الحارث زوجہ حضرت عباس۔

دایہ ارقم کے دورِ دعوت میں اولین بیعت اسلام کرنے والے صحابی۔

عاقل بن بکیر۔

اولین مرکزِ تحریک —

دایہ ارقم واقعہ کوہِ صفا۔

سب سے پہلا خطاب نام۔

کوہ صفا پر (۳۰ سال بعثت)

سب سے پہلی آیت جس پر کفار میں شدید برہمی پیدا ہوئی —

”انکم انتم نوما لتعبداون من دون اللہ حصب جہنم“

حضور کے بعد سب سے پہلے اسلام کا اظہار کرنے والے صحابی —

حضرت خباب بن الارت تمیمی۔

سب سے پہلا اسلامی گھرانہ:

خاتہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

سب سے پہلی خاتون جو مسلم والدین کے سائے میں بچپن ہی سے اسلام کی اٹھان اٹھیں۔

حضرت خاتہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔

اسلام کی حمیت کے تحت پہلا اتفاقی قتل۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کے ہاتھوں ہوا۔ واقعہ یہ تھا کہ شہر ~~مکہ~~ باہر

مسلم جماعت مسرووف نماز تھی اور کفار نے شرارت کی۔ حضرت سعد نے ایک

بڑی اٹھا کر ان کی طرف پھینکی وہ ایک کافر کو جا کر لگی اور وہ ختم ہو گیا۔

سب سے پہلا جوڑا جو بالفاظ حضور حضرت لوط و ابراہیم علیہم السلام کے بعد اعدا کی

راہ میں ہجرت کے لیے نکلا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ و حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا اسلام کی خاطر حبشہ

روانہ ہوئے۔

اسلامی تحریک کی تاریخ میں اولین جھنڈا لہرایا گیا۔

بریدہ اسلمی کے ہاتھوں، سفر ہجرت میں۔

کعبۃ اللہ میں سب سے پہلے کلمہ اسلام کو با آواز بلند پکار کر مار کھانے والے صحابی —

حضرت ابوذر غفاری۔

وہ ہستی جس نے پہلی بار اپنے اسلام کا پُر زور طریق سے اعلان کرایا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ

وہ ہستی جس کے قبول اسلام سے پہلی بار کعبۃ اللہ میں ادائے نماز کا آغاز ہوا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ

وہ ہستی جس کے قبولِ اسلام پر کفار نے پہلی بار محسوس کیا کہ تحریکِ اسلامی زور پکڑ گئی ہے

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ

سب سے پہلا مسلم انصاری سردار جس نے مکہ والوں کے ہاتھوں مار کھائی۔

حضرت سعد بن معاذ

اولین جان جو حرم میں راہِ حق میں قربان ہو گئی۔

عاصم بن ابی ہالہ۔

اولین خاتون جو انتہائی مظلومانہ انداز سے اسلام پر قربان ہوئی۔

حضرت سمیۃ (حضرت یاسر کی اہلیہ اور حضرت عمار کی والدہ)

سب سے پہلا شخص جس نے بنو ہاشم کے مقابلے میں قریش کے معاہدہِ مقاطعہ کو ختم کرنے کی تحریک

ہشام بن عمرو بن ربیعہ۔

اولین مرد مومن جس نے اپنی ایک آنکھ صداقت کے لیے قربان کر دی۔

عثمان بن مظعون (قریش کی مجلس میں بنوں نے بسید کے سامنے اس کے

ایک معرہ سے اختلاف کیا۔ اس پر ان کی آنکھ پھوڑ دی گئی)

سب سے پہلا مہاجر مدینہ

حضرت ابو سلمہ

اولین عداۃ ارتداد

عبید بن جحش حبشہ میں ہجرت کر کے جانے کے بعد نیسانی ہو گیا۔

اسلام کے لیے سب سے پہلا تیر چلانے والے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص نے سریہِ عبداحارث میں بقیع ثنیۃ المرہ دشمن پر تیر چھینکا

مگر دشمن بچ نکلے۔

اسلام کی حمایت میں سب سے پہلے تلوار اٹھانے والے۔

حضرت زبیر بن العوام

ہجرت حبشہ ثانیہ میں اولین مہاجر۔

حضرت جعفر بن ابی طالب۔

مدینہ کا پہلا نوجوان جو حضور کی دعوت سے متاثر ہوا۔

سوید بن صامت



اولین انصاری صحابی جن کا مدینہ میں ہجرت کے بعد انتقال ہوا  
کلثوم بن الہدم حن کے مکان واقع قبا میں حضور نے ہجرت کے بعد چند روز قیام  
فرمایا تھا۔

سب سے پہلے ہاجر جن کا مدینہ میں انتقال ہوا۔

حضرت عثمان بن مظعون

حمیت اسلام کے تحت پہلا شخصی قتل — (عورت)

عصماء بنت مروان خطیبہ قبیلہ کونبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بھڑکاتی  
تھی اور بدگوئی کرتی تھی۔ اس کے نو مسلم بھائی حضرت عمیر بن عدی الخظمی  
نے کسی موقع پر جوش میں آکر اس کا خاتمہ کر دیا (رمضان ۳ھ)

حمیت اسلام کے تحت پہلا شخصی قتل — (مرد)

ابو غفلہ یہودی حضور اور مسلمانوں کے خلاف بدزبانی کر کے لوگوں کو اشتعال

دلاتا تھا۔ عالم بن عمیر انصاری نے غیرت میں آکر اس کا خاتمہ کر دیا۔

مدینہ میں اولین معلم اسلام کی ماموریت

حضرت مصعب بن عمیر کو (ابن ام مکتوم کی معیت میں) حضور نے وفد

انصار کے ساتھ روانہ کیا (۳ھ سال بعثت)

بیعت عقبہ ثانیہ میں سب سے پہلے بیعت کرنے والے انصاری صحابی۔

براد بن معرور

مدینہ میں پہلا اجتماعی درس قرآن۔

مسجد نبی رزق میں دیا گیا (غالباً یہ باقاعدہ مسجد نہ تھی بلکہ عبادت کے لیے

ایک جگہ مقرر کر لی گئی تھی)

سب سے پہلی باقاعدہ مسجد کی تعمیر۔

مسجد قبا جو مورخہ ۸ تا ۱۱ ربیع الاول ۳ھ سال بعثت ۳ھ میں تعمیر ہوئی

اولین جمعہ جو حضور کی امامت میں ہوا۔

مورخہ ۱۲ ربیع الاول ۳ھ کو بنی سالم کی آبادی میں پہلا جمعہ پڑھا گیا جس میں

بک صد علمبرداران اسلام شریک تھے۔

مدینہ کا قبیلہ جو پورے کا پورا بیکدم اسلام میں داخل ہوا۔

بنی عبدالاشہل (صرف ایک آدمی اس سعادت سے بعد میں ممکن ہوا)

سب سے پہلا فوجی دستہ جو اسلامی ریاست کی طرف سے طلایہ گردی کے لیے نکلے۔

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی کمان میں پہلا دستہ ہجرت کے ساتویں ماہ

کے اوائل میں بھیجا گیا اور سیف البحر تک گیا۔

نظام رماح کے تحت پہلا فوجی علم اٹھانے والے صحابی :-

بنی مرثد الغنوی برائے سریرہ بیف البحر (مذکورہ بالا)

حضورؐ کا بہنشن نفیس پہلا فوجی و سیاسی اقدام

غزوہ دوان (غزوہ ابواء) ہجرت کے بارہویں ماہ یعنی صفر میں۔

مدینہ میں حضورؐ کا مقرر کردہ پہلا مقام نامہ۔

حضرت سعد بن عبادہ (بہ سفر غزوہ دوان مذکورہ بالا)

حضورؐ کی ریکاب میں توہین شرف منبر دہری۔

حضرت حمزہؓ (بہ غزوہ دوان)

قریش کی طرف سے اسلامی ریاست پر پہلی بار دراز دستی

کر رہا بنی جابر فزری کا فوجی ڈاکہ (ربیع ثانی ۱۰ھ)

پہلی سرحدی جھڑپ جس میں اسلامی فوجی دستے کے ہاتھوں ایک دشمن فرزدک ہوا۔

سریرہ نخدہ وقوع ماہ جب ۱۰ھ رو قد بن عبداللہ تمیمی کے تیرے

پہلا موقع جب کہ مال غنیمت اور قبیلہ مدینہ میں رائے گئے

سریرہ نخدہ (مذکورہ بالا)

طریق اذان کا آغاز۔

۱۱ھ

کعبۃ اللہ میں سب سے پہلی اذان۔

فتح مکہ (۱۱ھ) کے موقع پر حضرت بلالؓ نے کسی۔

سب سے پہلا کذاب جس نے حضورؐ کے مقابلے پر جھوٹی نبوت کا علم بند کیا۔

مسئلہ کذاب۔

آواہنِ تحریری ابانِ امام جو حضور کی طرف سے جاری ہوا۔

سرافتہ بن جعشم کے لیے رشتہ ہجرت میں

دنیا کا سلا باقائدہ تحریری دفتار دستور۔

سلسلہ مدینہ میں حضور کی قیادت میں مرتبہ دنا فدا ہوا۔

مدینہ سے باہر اسلامی ریاست کا پہلا حلیفانہ معاہدہ۔

بنیِ ضمیرہ کے سردار عمرو بن فحشیٰ ضمری سے۔ یا۔ قبیلہ بنیِ ضمیرہ بن بکر بن

عبدمناف سے۔

اولیٰ بن صلیب جو قبولِ اسلام کے مقدس جرم میں دی گئی۔

حضرت خبیث بن عدی وزید بن وثنہ کو (بمقام تنقیح منسل بہ مکہ)

مدینہ میں بیور کی پہلی باغیانہ دغدارانہ کا مدد دانی۔

بنو قینقاع نے ایک مسلم خاتون کو سر بازار برہنہ کر دیا اور بلوہ ہو گیا۔

پہلا آزاد اسلامی کیمپ۔

سیف البحر میں حضرت ابو بصیرؓ و ابو جندلؓ نے قائم کیا

فتح مکہ کے موقع پر اولین شخص جو اسلام میں داخل ہوا۔

ابو سفیانؓ بن حارث بن عبدالمطلب

پہلا باقاعدہ جنگی مرکز۔

غزوة بدر (رمضان ۲)

پہلا غزوة جس میں مہاجرین کے ساتھ انصار بھی شامل تھے۔

غزوة بدر

میدانِ بدر میں اسلامی لشکر کے تین اولین مبارز۔

حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت عبیدہؓ بن حارث بن عبدالمطلب

معرکہ بدر کا سب سے پہلا دشمن مقتول۔۔۔

اسود بن عبدالاسد (مبارزت سے قبل)

معرکہ بدر کا سب سے پہلا مسلم شہید۔

مجمع مولانا عمر بن الخطابؓ۔

مدینہ میں فتح بدر کا مزوہ پہنچانے والا اولین قاصد

زید بن حارثہ

پہلی بار دو گانہ عید الفطر پڑھا گیا۔

یکم سوال ۱۲۷

اسلامی ریاست کا پہلا سفیر جسے راستہ میں شہید کیا گیا۔

حارث بن عمیر ازدی کو موتہ کے شامی حاکم شترجیل بن عمرو غسانی نے قتل کر دیا۔

بہادری کا ادبین خطاب جو حضور کی طرف سے ارزانی ہوا۔

حضرت خالد کو "سیف اللہ" کا خطاب دیا گیا (جنگ موتہ جوادى الاولیٰ ۱۲۷)

سرکاری مکاتیب اور دستاویزوں پر مہر کے نشان کی ابتداء۔

یکم محرم ۱۲۷

اسلامی نظام کے تحت پہلا سیاسی واقعہ تکمیل

اسلامی ریاست اور بنو قریظہ کے درمیان (۱۲۷)

اسلامی دور میں پہلے صحابی جو عمر بنے گئے۔

سعد بن معاذ

حضور کے لیے اولین شاہی برید

شاہ نجاشی نے روانہ کیا

مشرکین عرب میں سے اولین شخص جس کا ہر یہ حضور نے قبول فرمایا۔

ابوسفیان (ہ زمانہ صلح حدیبیہ)

پہلا سابق نظام جسے سالانہ شکر بنایا گیا۔

زید بن حارثہ، سر یہ موتہ

پہلا غزوہ جس میں بیت المال کا خمس نکالا۔

غزوہ بنو قینقاع یا غزوہ بنو قریظہ

لا الہ الا اللہ پکارنے والے دشمن کے قتل کا اولین حادثہ

سر یہ جوینہ رمضان ۱۲۷ میں اسامہ بن زید کے ہاتھوں نیک بن

مردوں کی بانٹھی۔

پہلا موقع جب کہ جماعت کی بھاری اکثریت وقتی طور پر بے اطمینانی میں مبتلا ہوئی۔

صلح حدیبیہ

حصنوں کے ہاتھوں پہلا زخمی و مقتول۔

حارث بن العنمہ (غزوہ اُحد)

پہلا شہید جنتی جس نے نہ کوئی نماز پڑھی، نہ روزہ رکھا۔

اصیرم (بنی عبدالاشہل)، غزوہ اُحد کے روز ایمان لا کر سیدھے شریک

جہاد ہوئے اور شہادت پائی۔

پہلا شہید راہِ حق جس نے موت سے قبل نماز ادا کرنے کی سنت کا آغاز کیا

حضرت خبیثؓ

واقعہ بدرِ معونہ کے سب سے پہلے شہید

سحرا مؓ بن لمحان (حضرت انس کے ناموں)

سب سے پہلی صلوٰۃ خوف پڑھی گئی۔

غزوہ عسفان۔۔۔ یا۔۔۔ غزوہ ذات الرقاع

پہلا نمازی جس نے تین تیر کھائے مگر نماز نہیں توڑی۔

عباد بن بشر (غزوہ ذات الرقاع)

مدینہ میں ارتداد کا اولین حادثہ۔

حارث بن سوید بن صامت اگرچہ معرکہ اُحد میں بہ حیثیت مسلم شریک ہوا

مگر مجذربن زیاد بلوی کو قتل کر کے ماتہ بھاگ گیا۔ بعد میں مدینہ آیا اور گرفتار

ہو کر قتل ہوا۔

پہلا مسلمان جو غلطی سے میدانِ جنگ میں مسلمان کے ہاتھ سے مارا گیا۔

ہشام بن اصابہ (عبادہ بن صامت کے ہاتھوں)

پہلی بار دشمن کا جاسوس گرفتار کر کے قتل کیا گیا۔

غزوہ بنی مصطلق میں

پہلا نوجوان جس نے اپنے منافق باپ کو قتل کرنے کی پیش کش حصنوں کے سامنے کی

طلحہ بن عبداللہ بن ابی

حضرت عائشہؓ کو قصہ انگ سے طلوع آرتے والا اولین ذریعہ

اعظم مسطح بن اثاثہ

حضرت عائشہؓ کی عصمت و عفت کی پہلی شہادت

مردوں میں سے ——— اسامہ بن زیدؓ

عورتوں میں سے ——— بریرہؓ

ازواج میں سے ——— حضرت زینب بنت جحشؓ

قدح کی اولین مدجاری کی گئی۔

حسان بن ثابتؓ ثابت مسطح بن اثاثہؓ نے بنت جحش پر

معرکہ جس میں پہلی بار متعدد نمازیں پہلے درجے قضا ہوئیں۔

غزوہ خندق

دشمن کا اندر توڑنے کے لیے پہلی بار کامیاب سفارتی تدبیر

نعمان بن مسعود کے ذریعے غزوہ خندق میں زیر عمل آئی۔

چلا تیر نماز جس نے تین تہاؤں کو قوس کی حمایت کو جسے اس کر دیا

سلمہ بن اکوعؓ

پہلا موقع جب کہ حضورؐ کی زبان سے بے ساختہ جہز صادر ہوا۔

غزوہ حنین میں لشکر میں سہ اسمیٰ پھیلے اور حضورؐ تھکے آسید حجر کی پشت

پر سے آپؐ نے پکارا۔

أنا النبي لا كذب

أنا ابن عبد المطلب

پہلی بار مستقل عالمین صدقہ کا تقرر

عمر ۹۵ میں

پہلی بار اسلامی فوج نے قلعہ ثعلب کے لیے منجیق کا استعمال کیا۔

غزوہ طائف میں۔

قیدیوں کا اولین تبادلہ ہوا۔ اسلامی حکومت اور اہل مکہ کے درمیان ہوا۔

سر پہ نخلہ کے دو مشترک قیدی عتاب بن عبد اللہ اور حکم بن ایسان کے پاس

میں سعد بن ابی وقاص اور عقبہ بن غزوہ کو رہائی دلائی گئی۔

پہلا غزوہ جس میں گھوڑوں کے سہام مجاہدین کو دیئے گئے۔

غزوہ بنی قریظہ

پہلی بار جزیرہ یمنے کا حکم نازل ہوا

غزوہ تبوک سے کچھ قبل۔

جزیرہ کا اولین معاملہ طے پایا۔

حاکم درمہ الجندل سے (بہ سفر غزوہ تبوک)

جزیرہ کی پہلی بڑی مقدار طے پائی۔

بخران کے عیسائیوں نے اسلامی حکومت کو دو ہزار حدّہ سالانہ اور بوقت ضرورت

جنگی سامان عاریتہ دینے کا معاہدہ طے کیا۔

اولین اور واحد ہستی جسے صلح حدیبیہ کے معاملہ میں پورا اطمینان حاصل رہا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

اولین ہستی جس نے صلح حدیبیہ کے بعد غرہ حلق میں جماعت کے تائل کرنے پر حضور کی

بہت بندھائی۔

اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ

اولین موقع جب کہ بارگاہ رسالت سے شاعر نے انعام حاصل کیا۔

فتح مکہ کے بعد کعب بن زبیر نے حاضر ہو کر عفو طلبی کے لیے قصیدہ بانس سعاد

پڑھا اور حضور نے اپنی ادا عطیہ کے طور پر دی۔

اولین موقع جب کہ حضور نے قنوتِ ازلہ پڑھی۔

رجیع اور بنر معونہ کے حادثوں کے بعد جن میں تعلیمی رنود کے پیش قیمت افراد کو

دشمنوں نے شہادت کے گھاٹ اتار دیا تھا (۳۷)

پہلا موقع جب کہ مسلم خواتین میدان جنگ میں پہنچیں

غزوہ احد ۳ھ

پہلا حکمران جو حلقہ بلوش اسلام ہوا

اسم بن ابجر شاہ حبش

پیدا شخص جو حضور کی نگاہ میں سنی کوئی انفریشن سے بھی کم نہ ہو  
 نبیلہ کے کا سردار زید خیر۔ (ایق نام زید خلیل)  
 پیدا غیر عرب نو مسلم جو اسلام لانے کی وجہ سے حبیب رسالت ہو گیا  
 فردہ بن عمرو الجذامی۔ نوری حکومت روم پر اپنے تمام سب اور۔ معام معان۔  
 معرکہ احد میں شہر کین کا پیدا مبدوز۔

دللمحہ

معرکہ احد میں مارا زنت کا جناح نون کرنے و۔ پیدا  
 حنیف۔ نون رضی لدعدتہ

آن کا پیدا دشمن مقتوا

تللمحہ

پیدا قتادہ فخر ہوتا۔ نو کی لگا دہیں محبوب شہر  
 آمدہ بن ابوزہبازہ کا حضور کی مور سے نون کرنا

اسلام میں پیار حج

سے اہل سنت و کفر سونوں سے

پہلی غیر ملکی جنگ

جنگ موتہ۔ جمادی الاخریٰ سے

تفینت ہیں سے اسام کی تعلیم مانا سلا کرنے کے سے نون نون

عروہ بن مسعود اقصیٰ۔



## تحریک اسلامی کا عدوی نشوونما

\* سنہ ۱۹۰۶ء کی اسلامی تنظیم کا آدھن حلقہ رفاقت۔

(۱) حضرت خدیجہؓ (۲) حضرت ابوبکرؓ (۳) حضرت علیؓ (۴) حضرت زید بن عارثہؓ

\* حضرت ابوبکرؓ صدیق کی مساعی دعوت سے مرحلہ اول میں قبول کرنے والے پانچ رفقاء۔

(۱) حضرت زبیر بن العوام (۲) حضرت عثمانؓ بن عفان (۳) حضرت عبدالرحمن بن عوف (۴)

حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ (۵) حضرت سعد بن وقاص۔

\* دعوت کے ابتدائی سہ سالہ دور میں حلقہ اسلامی میں داخل ہونے والے ۴۶ سابقوں۔

(۱) جناب بن اللات تمیمی (۲) سعید بن زیدؓ (۳) فاطمہ بنت الخطاب (۴) لبابہ بنت الحارثؓ

زوجہ حضرت عباس (۵) عبداللہ بن مسعودؓ (۶) عثمان بن مظعونؓ (۷) ارقم بن ابی الارقمؓ

مخزومیؓ (۸) ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی (۹) ابو عبیدہ بن عامر بن الجراحؓ (۱۰) قدامہ بن ظعونؓ

۱۰ دار ارقم کے دور سے پہلے مسلمان ہوئے۔

۱۱ حضرت خدیجہؓ کے بعد سب سے پہلے اسلام لانے والی خاتون۔

۱۲ قبول اسلام میں بعض روایات کے بموجب چھٹا نمبر تھا۔

۱۳ قبول اسلام میں چودھواں نمبر تھا۔

۱۴ قبول اسلام میں گیارہواں نمبر یا بارہواں نمبر مگر حاکم کی روایت کے لحاظ سے ساتواں نمبر

۱۵ درحقیقت یہ صحابی عثمان بن مظعون، عبیدہ بن الجون، عبدالرحمن بن عوف اور ابوسلمہ کے ساتھ اٹھے ہی دار ارقم میں اسلام لائے تھے (بروایت ابن حجر)

۱۶ حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمان ہوئے۔

(۱۱) عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب (۱۲) جعفر بن ابی طالب (۱۳) اسماء بنت عمیس (۱۴) عبد اللہ  
 بن جحش (۱۵) ابوالاحمد بن جحش (۱۶) سائب بن عثمان بن مظعون (۱۷) مطلب بن ازہر (۱۸) رماہ  
 بنت ابی عوف ابیہ مطلب بن ازہر (۱۹) حضرت عمیر بن ابی وقاص (سعد بن وقاص کے بھائی  
 (۲۰) اسماء بنت ابی بکر (۲۱) عائشہ بنت ابی بکر (۲۲) حضرت عیاش بن ابی ربیع (ابوجہل کے  
 بھائی) (۲۳) اسماء ابلیہ عیاش (۲۴) سلیط بن عمرو (۲۵) مسعود بن ربیع (۲۶) خنیس بن حذافہ (۲۷)  
 عامر بن ربیع (۲۸) حاطب بن الحارث جعی (۲۹) فاطمہ بنت محمل بیہ حاطب (۳۰) خطاب بن  
 الحارث (۳۱) فکیہہ ابلیہ خطاب (۳۲) معمر بن حارث (۳۳) نعیم بن عبدالقدیر بن عدی (۳۴)  
 خالد بن سعید بن العاص (۳۵) ایبہ (یا ایمنہ) بنت خلف بیہ خالد بن سعید (۳۶) حاطب بن  
 عمرو (۳۷) ابو حذیفہ بن غلبہ بن ربیع (۳۸) داؤد بن عبداللہ طلیف بن عدی (۳۹) خالد بن حزام  
 (حضرت خدیجہ کے بھتیجے) (۴۰) نامر بن مالک (۴۱) عاقل بن بکیر (۴۲) خالد بن بکیر (۴۳)  
 نامر بن بکیر (۴۴) عمار بن یاسر (۴۵) سمیہ والذہ عمار (۴۶) صہیب بن سفیان رومی مولیٰ بن  
 جذعان -

\* ہجرت حبشہ اولیٰ کے لیے مکہ سے جانے والوں کی تعداد

۱۲ مرد اور ۴ خواتین، محمد ۱۶ نفوس -

۱۰ حضرت ابوبکرؓ کی روایت کے موجب دارالرقم کے دور سے پہلے اسلام لائے۔  
 ۱۱ بروایت ابن اسحاق دارالرقم کے دور سے قبل مسلمان ہوئے۔  
 ۱۲ حضرت عمرؓ سے پہلے مسلمان ہوئے اور یہی ان کی ہمیشہ کو قرآن پڑھتے تھے و اتقوا فی روایت  
 کے موجب دس آدمیوں کے بعد اور بروایت ابن خثیمہ ۳۸ - فراد کے بعد ایمان سے پہلے  
 ہوئے۔

۱۳ چوتھے یا پانچویں نمبر پر اسلام لائے مگر باپ کے ڈر سے ایمان کو مخفی رکھا۔

۱۴ بروایت امام زہری اسلام لانے میں ۲۲ واں نمبر۔

۱۵ گیارہواں نمبر۔

۱۶ دارالرقم میں سب سے پہلی بیعت انہوں نے کی۔

۱۷ ۲۵ واں یا ۲۶ واں نمبر۔

۱۸ انہوں نے اپنے والد کے ساتھ ہی بیعت کی۔

\* ہجرت حبشہ ثانیہ کے وقت کل تعداد مہاجرین ۔

۸۲ نفوس

اس وقت مکہ میں رہ جانے والوں کی تعداد کم سے کم مہاجرین حبش کے برابر ضرور ہوگی اس لیے مجموعی تعداد سو اسو ہوگی ۔

\* مدینہ میں دعوت حق کے آئین علمبرداروں کا حلقہ

یہ کل ۸ افراد تھے جنہوں نے پہلے پہل حضورؐ سے بیعت کی (۱) راء بن مغزور (۲) کعب بن مالک (۳) ابوالہیثم مالک بن تیمان (۴) اسد بن زرارہ (۵) رافع بن مالک بن عجلان (۶) قطبہ بن نامر بن حدیدہ (۷) عقبہ بن عامر بن زید (۸) جابر بن عبد اللہ ۔

عام روایت کے بموجب عقبہ کے مقام پر اولین بیعت اسلام ۶ افراد نے کی تھی ۔ واقعہ کی روایت ہے کہ اسد بن زرارہ اور ذکوان بن عبد القیس عقبہ اولی سے قبل اسلام لائے تھے ۔

\* دوسری بیعت عقبہ کے شرکاء ۔

کل ۱۲ افراد اس مبارک موقع پر فیض ایب ہوئے ۔ بجز جابر بن عبد اللہ کے مذکورہ بالا انصاری بھی دوبارہ آئے اور اپنے ساتھ مزید پانچ افراد کو اسے نئے آنے والے پر تھے (۱) معاذ بن حارث (۲) خوف بن حارث (۳) ذکوان بن عبد القیس (۴) زید بن اعلبہ (۵) عویمر بن مالک ۔

\* تیسری بیعت عقبہ کے شرکاء ۔

اس موقع پر ۷۲ مرد و زن حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلامی تحریک کے علمبردار بنے ۔

\* مکہ کے آخری دور (بہ زمانہ بیعت عقبہ ثانیہ) میں علمبردارانِ حق کی کل تعداد (تقریباً) — مہاجرین حبشہ (۸۲) اور بیعت عقبہ کے انصاری شرفاء (۷۲) کے علاوہ مسلمانوں کی کچھ تعداد مکہ میں موجود تھی ۔ اسی طرح مدینہ میں چند ایسے مسلمان بھی ہو سکتے ہیں جو ۱۳ سال بعثت کے حج میں شریک نہ ہو سکے ہوں ۔ اس طرح انرازا کل تعداد دو اڑھائی سو قرار پا سکتی ہے اس میں اگر نجران اور قبایہ غفار (آدھا قبیلہ جاہلی اسلام میں داخل ہوا) اور یمن کے نو مسلموں کی تعداد بھی شامل کرنی جائے ۔ تو سر زمین عرب میں اسلامی انقلاب کے داعی کسی طرح تین سو سے کم نہ ہوں گے ۔

\* ہجرت کے فوراً بعد مدینہ کی جماعت اسلامی کی تعداد (اندازاً) ۔

یہ ثابت ہے کہ بنو سالم کی آبادی میں اولین جمعہ پڑھا گیا تو ایک صد مسلمان اس میں

شریک ہوئے تھے۔ شریک نہ ہو سکنے والوں (خصوصاً عورتوں اور مریموں) کی تعداد کا تصور بھی رکھیں تو کم سے کم تین صد مسلمان مدینہ کی آبادیوں میں موجود ہونے چاہئیں۔ یہ بھی ثابت ہے کہ حضور نے مہاجرین و انصار کی مواخات بالکل ابتدائی دور میں قائم کی اور اس کے لیے پہلا اجتماع جو طلب کیا گیا اس میں ۹۰ افراد شریک تھے جن میں دونوں فریق تقریباً نصف نصف شریک تھے۔ اس اجتماع میں انصار میں سے اغلباً صاحب حیثیت رفقہاء کو لایا گیا تھا جو اپنے معاشی حالات میں ایک ایک مہاجر کے لیے گنجائش نکال سکتے ہوں۔ علاوہ ازیں اس میں خواتین شریک نہ تھیں اس اجتماع سے بھی اوپر ہی کے انداز کی تصدیق ہوتی ہے۔

\* غزوہ بدر کے وقت مدینہ میں مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ۔

یہ معلوم ہے کہ انصار میں اسلام نہایت تیزی سے پھیلا اور کوئی خاص مزاحمت اور وخرج کے قبائل میں موجود نہ تھی۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ ہجرت سے غزوہ بدر تک کے درمیانی زمانے میں اکادکا مہاجرین برابر آتے رہے اور ان کی تعداد بھی کچھ نہ کچھ رہی۔ یہاں تک کہ غزوہ بدر ریا بواۃ میں دو صد مہاجرین حضور کے ہمراہ تھے۔ اسی طرح غزوہ ذوالعشیر میں بھی مدینت کی رو سے ۱۵۰ اور درممد کے درمیان یعنی ان ابتدائی مہمات میں حضور صرف مہاجرین ہی کو لے کے نکلا کرتے تھے۔ کیونکہ بیعت عقبہ کے ماتحت انصار نہ صرف مدینہ میں عاؤ کرنے کے مکلف تھے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر مہاجرین میں سے دو صد مجاہد نکلتے بنے تو حملہ تعداد کچھ زائد ہوگی۔ کم از کم ڈھائی سو کا اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ انصار کی تعداد مقابلاً

لہ یوں تو کسی آبادی کے مردوں ۴ جہتی تناسب ۱/۲ اور ۱/۲ ہونا چاہیے۔ مگر دو امر تیز چنی چنی ہیں مہاجرین مدینہ کے معاملے کو مختلف بنا دیتے ہیں۔ اولاً یہ کہ عرب میں یوں بھی قبائل کے مردوں میں سے ہر کوئی پیکر ہوتا تھا۔ اور اتنی ہی بہت کم نفوس کو حاصل ہوتا تھا۔ پھر مہاجرین تو ایک ایسی و تقویٰ مدح سے وہاں تھے جس کی خاطر وہ اپنے آپ کو زندگی و موت کی فیصلہ کن کشمکش سے دوچار پاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں کئی افراد کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہوگی۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ جب مہاجرین کے پورے اہل و عیال ساتھ نہ گئے خواتین کا تناسب بھی کم تھا۔ اور بڑے بوجھ بھی زیادہ تر مکہ میں رہ گئے تھے۔ اور وہ بھی

نے اوپر کا اندازہ قائم کیا ہے۔

دگنی ہونی چاہیے۔ یعنی جملہ تعداد ۸۰۷۰۰ حصہ ہوگی۔

غزوہ بدر کے شرکاء کی تعداد بعض اصحاب کے لیے مغالطہ کا موجب ہو سکتی ہے۔ ہماری تحقیق کے بموجب حضور جب مدینہ سے چلے گئے تو کوئی باقاعدہ جنگی معرکہ پیش نظر نہ تھا۔ بلکہ اصل مدعا قافلہ کی مزاحمت تھا۔ نیز جلدی میں اقدام کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سواروں کی تعداد کے علاوہ اسلحہ کی مقدار انتہائی کم تھی۔ حالانکہ مدینہ کی مسلم آبادی اس سے کئی گنا زیادہ سواروں اور اسلحہ کا انتظام باسانی کر سکتی تھی۔ پس فوجی دستہ بھی ممانہ الحصول تعداد سپاہ سے بہت کم تھا۔ یہ حقیقت اسی بات سے ظاہر ہے کہ اس میں کل ۸۶ مہاجر تھے۔ حالانکہ طلایہ گردی کی سابق مہمات میں ان کی تعداد ۲۰۰ تک سامنے آتی ہے۔ پس ہمارے اندازے کے مطابق غزوہ بدر کے متصل زمانے میں مدینہ میں مسلم آبادی کی تعداد ۸۰۷۰۰ سو کے لگ بھگ تھی۔ جس میں سے ۵۰۴ سومردان جنگی لکھے جاسکتے تھے۔ لیکن معرکہ بدر میں پوری جنگی تعداد اس لیے شریک نہ ہو سکی تھی کہ نفیر عام نہ تھی۔ بلکہ فوری طور پر ایک دستہ نسبتاً محدود مقصد کے لیے حضور کے ساتھ روانہ ہوا۔

ہمارے اس تخمینے کا ثبوت غزوہ بنو قینقاع سے بھی ملتا ہے۔ غزوہ بدر کے فوراً بعد (شوال ۲ھ) اس گستاخ اور بغاوت پسند یہودی قبیلہ کا محاصرہ کیا گیا اور عاجز ہو کر انہوں نے حدود مدینہ سے نکل جانا قبول کیا۔ روایات سے ظاہر ہے کہ اس قبیلہ کی جنگی قوت ۶۰۰ جوانوں پر مشتمل تھی۔ ان کو پندرہ روز محاصرے میں رکھ کر پوری طرح زچ کر دینے کے لیے اسلامی فوج ایک مناسب تعداد پر مشتمل ہونی چاہیے۔ کم سے کم اندازہ ۵۰۴ سومردان جنگی کا لکایا جاسکتا ہے۔

۱۔ مورخین کی روایات مدینہ میں تین مردم شماروں کا پتہ دیتی ہیں جو حضور نے وقتاً فوقتاً کرائی تھیں۔ پہلی مرتبہ تعداد ۵ سو تھی۔ دوسری مرتبہ ۸۰۷۰۰ سوار اور قیسری مرتبہ ہزار یا قدرے زائد۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ اولین مردم شماری یا توجہ جبرین کی نوآباد کاری کے وقت کی گئی ہوگی یا دفاعی تنظیم کا آغاز کرنے کے وقت۔ اس کے بعد کوئی بڑا عملی اقدام کرنے سے پہلے (جس کا وقت قریش کے شامی قافلہ سے تعرض کرنے کا ہی ہو سکتا ہے) پھر قوت کا جائزہ لیا گیا ہوگا۔ تیسرا جائزہ غالباً ایک سال بعد جب کہ ابوسفیان کی طرف سے انتقامی حملے کے چیلنج کا وقت قریب ہوگا، لیا گیا ہوگا۔ واللہ اعلم

\* معرکہ بدر کے دور میں کرۃ ارضی پر مسلمانوں کی مجموعی تعداد (تخمیناً) مدینہ کے سات اٹھ سو افس کے ساتھ اگر ہم حبشہ میں مقیم ہاجرین حبشہ کے مکتوبہ سے نئے نو مسلموں، نجران، یمن، قبیلہ غفار، بحرین اور دوسرے قبائل میں پائے جانے والے متفرق مسلمانوں کی تعداد سامنے رکھیں تو اغلباً جملہ عددی قوت ایک ہزار یا اس سے کچھ زائد ہوگی۔

\* مختلف معرکوں اور مہمات میں عمیرہ اراکین سلام کی عددی قوت۔

غزوة اُحد :	۶۵۰ تا ۷۰۰	باختلاف روایات
غزوة بدر :	۵۱۰	غزوة بدر، غزوة بدر کے بغیر
غزوة دومتہ البندول :	۱۰۰۰	غزوة دومتہ البندول (تصادم کے بغیر)
غزوة الخزاب	۳۰۰۰	
سفر حدیبیہ	۲۰۰	
غزوة خیبر	۲۰۰۰	غزوة خیبر، غزوة خیبر کے بغیر
سریہ کوثہ	۳۰۰۰	
غزوة فتح مکہ	۱۰۰۰۰	
غزوة تبوک و مائتہ مائت	۲۰۰۰۰	
غزوة تبوک	۲۰۰۰۰	
شراکے حجۃ الوداع	۲۵۰۰۰ تا ۳۰۰۰۰	

تحریک اسلامی کے مددی نشورنما کا بڑا ہینے ہوئے میں ہمیں پوری زما لوجہ جانی ہے کہ سنو کی انقلابی جدوجہد میں عوامین شروع سے حصہ دار رہی ہیں دراصلوں نے تاریخ کا رخ موڑنے کے لیے ہر مرحلے میں پنا فرما کر انجام دیا ہے۔ مکہ کے سنگین ہند

۱۰ اسلامی تحریک کی مددی قوت کا اندازہ بعد کے اوزار میں مہمات اور معرکوں کے شرکاء کی تعداد ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔

۱۱ عبداللہ بن ابی کے تین سونفاق زدہ ساتھیوں کے الگ ہو جانے کے بعد۔

۱۲ بعض روایات میں اس سے بھی زائد تعداد بیان کی گئی ہے۔

میں وہ شریک تھیں۔ ہجرتوں میں مردوں کے ہم سفر رہیں، معرکہ ہائے جہاد میں انہوں نے اپنا ساتھ ادا کیا۔ بلکہ خواتین کے لیے یہ بات بہت بڑا سرمایہ فخر ہے کہ حضور پر سب سے پہلے ایمان لائے، حضور کی ڈھارس بندھانے اور حضور کو پورا تعاون پیش کرنے والی ہستی بھی ایک خاتون ہی کی تھی، یعنی حضرت خدیجہ! حقیقت یہ ہے کہ حضور جس ہمگیر اسلامی تبدیلی کو رد نہ کرنے اٹھے تھے وہ بغیر خواتین کے تعاون کے پوری شان سے نہ شکل ہی پیدا ہو سکتی تھی۔ گھروں کا محاذ اگر کسی بدو جہد سے بے تعلق ہو تو کام کی رفتار بے حد گر جاتی ہے۔ حضور کی تحریک اسلامی نے مردوں کی طرح عورتوں سے جذبات، اموال، محنتوں اور قربانیوں کا بھرپور خراج وصول کیا۔ اس موضوع پر درحقیقت ایک مستقل مقالے کی ضرورت ہے، مگر اس وقت اسے مؤخر کر رہا ہوں۔ یہاں اجمالاً اس تناسب کو دکھانا چاہتا ہوں جو خواتین کو تحریک اسلامی میں حاصل تھا۔ ابتدائی ۲ سال کے سابقون الاولون (کل تعداد ۵۶) میں سے ۱۲ خواتین تھیں۔ ہجرت حبشہ اولیٰ و ثانیہ میں علی الترتیب ان کی تعداد ۵، ۷، ۱۰ تھی۔ بیعت عقبہ اللہ کی مجلس میں ۲ انصاری خواتین شامل تھیں۔ حضور سے قبل مدینہ کو ہجرت کرنے والے ہاجرین میں کم از کم ۱۰ خواتین کا شامل ہونا ثابت ہے۔

ذیل میں ہم اسلامی تحریک کی عددی قوت کے نشور، ا کے چند گراف پیش کرتے ہیں تاکہ ایک نظر میں اندازہ ہو جائے۔

## چند کتب حوالہ

بدقسمتی سے حسب ضرورت ذخیرہ کتب مزاحم نہ تھا۔ جیسا کہ ایسے بڑے کام کے لیے  
مزدوری تھا۔ تاہم جو کتابیں سامنے ہیں۔ ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

\_\_\_\_\_ تفسیر ابن کثیر

\_\_\_\_\_ تفسیر القرآن - سید ابوالاعلیٰ مودودی

\_\_\_\_\_ بیحج مسلم - شرح : سراج الوماج

\_\_\_\_\_ مشکوٰۃ شریف - شرح : اشعة اللمعات

\_\_\_\_\_ کنان ابن دوز

\_\_\_\_\_ تمائل ترمذی

\_\_\_\_\_ ریاض الصالحین

\_\_\_\_\_ زاد المعاد - علامہ حافظ بن القیم

\_\_\_\_\_ المواہب المدینہ - احمد الخطیب قسطلانی

\_\_\_\_\_ یرت البنی - ابن بشام

\_\_\_\_\_ تحقیق و ترتیب الاسناد محمد محی الدین عبد الحمید ربیع ازہری

\_\_\_\_\_ کتاب الاموال از ابو عبید القاسم بن سلام

\_\_\_\_\_ رحمة المعالین از جیش قاضی شاہ محمد سلیمان سلطان مفسور پوری

\_\_\_\_\_ فتح البیر - از مولانا عبدالرؤف دانا پوری

\_\_\_\_\_ یرت البنی - از علامہ شعی نعمانی

\_\_\_\_\_ سیرت المصطفیٰ - از مولانا محمد ادریس کاندھلوی



- \_\_\_\_\_ سیرت خاتم الانبیاء - از مفتی محمد شفیع صاحب
- \_\_\_\_\_ قصص القرآن (جلد چہارم) از مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاری
- \_\_\_\_\_ ارض القرآن - از ندیم سید بلیمان ندوی
- \_\_\_\_\_ تاریخ اسلام (جلد اول) از مولانا عبدالقیوم ندوی
- \_\_\_\_\_ فجر الاسلام - از احمد ابن مصری -
- \_\_\_\_\_ فقہ السیرة - محمد الغزالی -
- \_\_\_\_\_ نشر نطیب فی ذکر النبیؐ المحبیب

از مولانا اشرف علی تھانوی

\_\_\_\_\_ عمدۃ الاخبار فی مدنیۃ المختار

از علامہ شیخ احمد بن عبد الحمید عباسی

- \_\_\_\_\_ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی - از ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی
- \_\_\_\_\_ عہد نبوتی کے میدان ہتھے جنگ " " "
- \_\_\_\_\_ عہد نبوتی کا نظام حکمرانی " " "
- \_\_\_\_\_ سیرت ایک - از بشیر محمد شارق

(Mohammad at Macca) فتکری واٹ  
(Mohammad at Madina)

(Spirt of Islam) از جٹس سیدائیرنلی

(Mohammad the Prophet) از مولوی محمد علی ایم - اسے

(Life of Mohammad) از حافظ غلام سرور

(Mohammad the Prophet). از ایف کے خان ڈرانی